ماہنامہ

الفرقان

لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے

لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، اور اصل یہ

اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی

اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی

زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں، ہم اس کا

عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فاطر السمٰوٰت والارض انت ولیّی فی الدنیا والآخرۃ

توفنی مسلما والحقنی بالصالحین

"ادارہ الفرقان"

مدیر و مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی تالیفات

تاریخ دعوت و عزیمت (جلد اول)

ناظرین الفرقان اس کتاب کی اہمیت سے واقف ہیں یہ صرف فاضل مصنف کا شاہکار ہی نہیں ہو بلکہ اس کو اس دور کی عظیم ترین کتاب کہا جا سکتا ہو ابھی صرف پہلی جلد شائع ہوئی ہے۔ قیمت سے (۴/-/-)

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر

یہ کتاب اس قسم کی تصنیفوں میں ہو جو مردہ قوموں کو زندہ کر دیتی ہیں، اس کے کئی عربی اڈیشن مصر میں نکل چکے ہیں بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہو کہ مشرق و مغرب کے علمی اور اسلامی حلقوں کو اس کتاب سے زیادہ دورِ حاضر کی کسی تصنیف نے متاثر نہیں کیا۔ قیمت مجلد للعہ (۴/۵/-)

اصلاحیات

مولانا کے چند منتخب اصلاحی مضامین اور دعوتی تقریروں کا مجموعہ، ہر شخص کے پڑھنے اور سننے کے لائق۔ قیمت۔

دو ہفتے ترکی میں

مولانا ندوی نے بلاد اسلامیہ ممالک کے اپنے تازہ دورے میں دو ہفتے ترکی میں بھی گزارے اور خالص اسلامی نقطۂ نظر سے ترکی کو جاننے سمجھنے اور صحیح حالات و امکانات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ مولانا نے اس سفر میں یا بعد میں جو روزنامچہ لکھا تھا جو کتابی شکل میں آ گیا ہے تاثرات اور معلومات و مشاہدات کا آئینہ ہو۔ ہر صاحب ذوق مسلمان سے اس کے مطالعہ کی سفارش کی جا سکتی ہو۔ قیمت

سلسلۂ تجدید دین کی چار کتابیں

یعنی حکیم الامت حضرت تھانوی کی دینی اصلاحات و تجدیدات نئے قالب اور نئی زبان میں۔ از مولانا عبد الباری صاحب ندوی ان کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اصل دین کیا ہے اور ہم نے اس سے بے تعلقی اختیار کر کے اپنے کو اس کی برکتوں اور خدائی رحمتوں سے کس قدر محروم کر لیا ہو۔

معارف الحدیث (جلد اول)

تالیف:۔ مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان لکھنؤ

یعنی۔ احادیث نبوی کا ایک جدید مجموعہ اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ، جو دور حاضر کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ذہنی اور فکری سطح کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے اس کتاب میں کیا ہو اور اس کی کیا خصوصیات ہیں؟ ——— اس کا صحیح اندازہ تو مطالعہ سے ہی ہو سکتا ہو، پھر بھی یہ ایک خصوصیت یہاں قابل ذکر ہو کہ احادیث نبوی کی جو اصل غرض و غایت و روح ہو (یعنی ارشاد و ہدایت اور اصلاح و تربیت) مؤلف نے پوری کوشش کی ہو کہ یہی اس کتاب کی بھی رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے اصل مخاطبین (صحابہ کرام) پر جو اثرات ان ارشادات کو سن کر پڑتے تھے انکا کوئی عکس اس کتاب کے ناظرین پر بھی پڑے ——— اسی کے ساتھ ہر حدیث سے متعلق ان سوالات کے پورے تشفی بخش علمی و تحقیقی جوابات بھی دیے گئے ہیں جو آج کل کے بگڑے ہوئے ذہنوں میں احادیث نبوی کے متعلق پیدا ہوتے ہیں۔

شروع میں مؤلف کے دیباچہ کے علاوہ استاذ حدیث حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب اعظمی کا ایک بسیط محققانہ مقدمہ بھی ہے جس میں صرف قرآن مجید سے بتلایا گیا ہو کہ دین میں حدیث و سنت کا کیا مقام ہو اور جو لوگ حدیث و سنت کے حجت دینی ہونے کے منکر ہیں وہ قرآن حکیم کے متعدد نصوص و بینات سے منحرف ہیں ——— یہ مقدمہ اگرچہ صرف ۳۲ صفحے کا ہے لیکن اپنے وزن کے لحاظ سے ضخیم کتابوں پر بھاری ہو اور منکرین حدیث پر اللہ کی حجت ہے ——— کتابت و طباعت کا معیار بھی نہایت اعلیٰ ہے۔

قیمت غیر مجلد ۱۲/ (۳/۲/-) مجلد للعہ (۴/۵/-)

(۱) جامع المجددین

اس میں خصوصاً اعمال ظاہری کی صلاح و صلاح پر بحث ہو جو شریعت کا خاص موضوع ہے۔

قیمت مجلد صہ (۵/-/-)

(۲) تجدید تصوف و سلوک

اس کا موضوع انسانوں کی قلبی باطنی یا اخلاقی اصلاح ہو اس میں تصوف کے متعلق موافقین و مخالفین کی تمام غلط فہمیوں اور غلط تعبیروں کو دور کر کے بتلایا گیا ہو کہ تصوف دراصل نام ہو عین اسلام بلکہ کمال اسلام کا

قیمت مجلد صہ (۶/-/-)

(۳) تجدید تعلیم و تبلیغ

اس میں دین کی تعلیم و تبلیغ کا مکمل نظام بتلایا گیا ہو۔

قیمت مجلد ے (۳/-/-)

(۴) تجدید معاشیات

معاشیات کے موضوع پر خالص ایمانی نقطۂ نظر سے اس دور کی یہ واحد تصنیف ہو جس میں معاشیات کے نو پید انظریوں اور نعروں سے مرعوب ہوئے بغیر بلکہ ان کو محض فریب ثابت کرتے ہوئے رزق و معاش سے متعلق خالص اسلامی تعلیم کو پیش کیا گیا ہے

قیمت مجلد عہ (۲/۲/-)

ملنے کا پتہ کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

جلد ۲۴ | بابت ماہ صفر ۱۳۷۶ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۵۶ء | نمبر (۲)

اگر اس دائرہ میں سُرخ نشان لگا ہو! تو اس کا مطلب یہ ہو کہ آپ کی مدت

خریداری ختم ہوگئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لئے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا پرچہ بصیغہ وی۔پی ارسال کیا جائے گا ـــــ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۱۴۔تاریخ تک پہنچ جانا چاہیئے

پاکستان کے خریدار: ۔ اپنا چندہ سکرٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں

تاریخ اشاعت: ۔ رسالہ ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵۔ تاریخ کو روانہ کردیا جاتا ہو۔ اگر ۲۵ر تک کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔ اگلے رسالہ کے ساتھ مکرر بھیجدیا جائے گا، اس سے پہلے مطلوب ہو تو ۲ر آنے کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں۔

مقام اشاعت: ۔ دفتر ماہ نامہ "الفرقان" کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

اس دفعہ ربیع الاول کا مبارک مہینہ جس میں رحمتِ الٰہی نے عالم انسانی کو انسانیت کے سب سے بڑے محسن اور اپنے سب سے برگزیدہ رسول کے ورودِ مسعود سے نوازا، بدقسمتی سے ایسے وقت میں آیا ہے جب کہ ہمارے ملک میں اس معظم ہستی کی توہین کا ایک دل آزار واقعہ تازہ ہے۔

ہم ہر سال اس موقع پر آپ کی سال گرہ کا جشن مناتے ہیں اور اس سال بھی منائیں گے، غالباً اس سے زیادہ مناسب موقع سال بھر میں اس بات کے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ہم اس ملک میں (جس میں ہمیں انشاء اللہ العزیز بہر حال رہنا ہے) تحفظِ ناموسِ رسالت کے مسئلہ پر سوچیں۔

سوچنے کی باتیں دو ہیں (۱) ایک یہ کہ کیا اہانت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مستقل سدباب کسی تدبیر سے ہو سکتا ہو؟ (۲) دوسرے یہ کہ اگر نہیں ہو سکتا یا جب تک نہیں ہو سکتا اس وقت تک ایسے مواقع پر ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیئے۔ ہماری بڑی غلطی ہے کہ متعدد بار ایسے واقعات پیش آجانے کے باوجود ہم نے اجتماعی طور پر اب تک اس مسئلہ میں کوئی فیصلہ نہیں کیا، اس کا نتیجہ یہ ہو کہ جب کبھی ہماری بدقسمتی سے ایسا کوئی واقعہ رونما ہوتا ہو تو پوری قوم کا کوئی ایک متفقہ طرزِ عمل نہیں ہوتا، بلکہ ہر مقام پر مقامی لوگ عین وقت پر جس طرح سمجھ میں آتا ہے کر لیتے ہیں وہ وقت قدرتی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ٹھنڈے دل سے سوچنا اور سارے متعلقہ پہلوؤں پر غور کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی، چنانچہ اکثر مقامات پر ایسا طریقہ اختیار کر لیا جاتا ہے جس سے اپنے جذبات کی تسکین تو کسی حد تک ہو جاتی ہے مگر فائدہ کچھ نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات اُلٹا نقصان ہو جاتا ہے اور ناکردہ گناہ سر لگ جاتے ہیں۔

ہم میں سے ہر ایک کی خواہش قدرتی طور پر یہ ہوگی کہ کوئی تدبیر ایسی [illegible] نی چاہیئے کہ اس طرح کے دل آزار اور ننگ انسانیت واقعات کا اعادہ ہمارے وطن میں نہ ہو —— ملک کی موجودہ فضا کو دیکھتے ہوئے یہ چیز مشکل ضرور ہو مگر ناممکن نہیں۔ تحفظ ناموس رسالت سے جس قدر دلچسپی کا اظہار ہم کرتے ہیں اگر عملاً اس کا اسی قدر حق ادا کرنے کیلئے ہم تیار ہو جائیں تو یہ مشکل ایک نہ ایک دن آسان ہو کر رہے گی۔

یہ کام جس پروگرام کے ذریعہ انجام پا سکتا ہے اس کے کئی جز و ہیں۔

(۱) جیسا کہ عام طور پر سوچنے والوں کا احساس ہے ان واقعات کا جلدی جلدی اعادہ پیشوایان مذاہب کی توہین کے متعلق قانون کے ناقص ہونے کا بھی نتیجہ ہے۔ اگر قانون کی موجودہ خامیاں دور کر کے اس بارے میں ایک سخت قانون بنا دیا جائے تو ایک حد تک قانون کی سختی بھی اس لعنت کا سدباب کر سکتی ہے۔ اس لئے بلا تاخیر پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ قانون میں ضروری ترمیم و اضافہ کرانے کی کوشش کی جائے، خوشی ہے کہ اس سلسلہ میں کام شروع ہو گیا ہے اور حکومت بھی بظاہر اس کے لئے آمادہ ہے۔ قانون میں سختی آجانے سے ایسے واقعات میں کمی ضرور آجائے گی۔ مگر یہ سمجھنا کہ مکمل انسداد ہو جائے گا سراسر غلط فہمی ہو گی کیسے کیسے سخت قوانین جرائم کے لئے موجود ہیں مگر جرائم بہر حال ہوتے ہیں اور تنہا قانون کبھی بھی جرائم کو نہیں روک سکتا اس لئے ہمیں اس فوری کام کے ساتھ چند کام اور بھی کرنا ہوں گے۔

(۲) اس زمانہ میں اہانت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارتکاب کرنے والوں میں ایسا تو شاید ہی کوئی ہو جو خود آپ کی ذات سے عناد کی وجہ سے ایسا کرے۔ اس لئے کہ تیرہ سو برس پہلے گزری ہوئی ہستی سے اس زمانہ کے کسی شخص کو عناد ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ خصوصاً ایسے ملک میں جس کو اس ذات سے براہ راست کسی قسم کا واسطہ بھی نہیں پڑا۔ اس لئے ایسی حرکتیں بظاہر دو ہی سبب سے ہو سکتی ہیں — ایک جہالت اور سیرت طیبہ سے ناواقفیت یا غلط واقفیت — دوسرے آنحضرتؐ کے نام لیواؤں سے عناد۔ کہ ان کو تکلیف پہنچانے یا چھیڑنے کے لئے ان کے پیشوا کی توہین کی جائے۔

پس اس پروگرام کا دوسرا جزو یہ ہونا چاہیے کہ آنحضرتؐ کے متعلق وسیع پیمانہ پر صحیح واقفیت پیدا کرانے اور آپ کی سیرت کے بارے میں صحیح معلومات عام کرنے کی کوشش کی جائے، اس کے لئے جو ذرائع اس زمانہ میں مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں وہ سب استعمال کئے جائیں۔ ملک کی تمام زبانوں میں سیرت پر مختلف طبقات کی ذہنی سطح کے مطابق چھوٹی چھوٹی کتابیں اور پمفلٹ شائع کئے جائیں اور انھیں پھیلانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے، ان میں ایک بات ملحوظ رکھی جائے کہ انداز تبلیغی اور وعظی نہ ہو بلکہ محض تاریخی اور معلوماتی۔

واضح ہے کہ یہ بڑا کام انفرادی کوششوں سے انجام نہیں پا سکتا بلکہ ایک مضبوط ادارے کی ضرورت ہو گی۔ تحریری جدوجہد کے علاوہ جہاں ممکن ہو اس قسم کی تقریروں سے بھی کام لیا جائے اور مناسب تقریبات سے مخلوط اجتماعات اس غرض کے لئے منعقد کئے جاتے رہیں۔

۳ — تیسرا جزو — اور یہی پروگرام کا سب سے اہم اور مؤثر جزو ہے — یہ ہے کہ ہم مسلمان کے

نام سے اب تک جس زندگی کا اپنے ہمسایوں کو مشاہدہ کراتے رہے ہیں اس کو بدل کر ایک حقیقی مسلمان اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سچے پیرو کی سی زندگی پیش کریں، یہ زندگی انسانیت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے، اور جس کسی میں انسانیت کی قدر کا ایک ذرہ بھی موجود ہے وہ کبھی انسانیت کا یہ اعلیٰ نمونہ پیش کرنے والی قوم سے عناد نہیں رکھ سکتا، اس کے بعد صرف وہی لوگ عناد میں مبتلا رہ سکتے ہیں جن میں انسانیت شناسی کا کوئی ذرہ موجود نہ ہو ــــ اور ایسے لوگ گنتی کے بس چند ہی ہوتے ہیں۔ جو عام قدر شناسی کے بعد اس قسم کی حرکتیں مشکل ہی سے کر سکتے ہیں۔

اپنی زندگی میں یہ تبدیلی بڑے عزم اور حوصلہ کو چاہتی ہے، مگر موجودہ معاندانہ فضا کو ختم کرنے کا بس یہی ایک راستہ ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ یہ کوششیں جب تک رنگ لائیں اس وقت تک کے عرصہ میں، جو یقیناً کافی طویل ہوگا، ہمارا طرزِ عمل کیا ہو؟ اور ان مکروہ واقعات کا خدانخواستہ اگر اعادہ ہو تو ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر ہمارا مقصد یہ ہو کہ حکومت ایسی حرکتوں پر اپنے قانونی حدود و اختیارات کے مطابق پوری پوری کارروائی کرے تو ہمیں یہ بات بطور ایک اصول کے طے کر لینی چاہیئے کہ حکومت کو اپنے فرض سے گریز کے کسی بہانہ اور مسئلہ کو پس پشت ڈال دینے کا موقع نہیں دینگے، حکومت کن کن چیزوں کو اس طور پر استعمال کر سکتی ہے؟ یہ باتیں اب تک کے تجربات سے بہت کچھ ظاہر ہو چکی ہیں، اب تک ہر بار یہ ہوا ــــ اور کچھ مسئلہ ہی ایسا جذباتی ہو کہ قابو میں رہنا مشکل ہو جاتا ہے ــــ کہ ہم نے واقعہ کی خبر پاتے ہی احتجاجی جلسے، جلوس، ہڑتالیں اور حکومت کی مذمت شروع کر دی اور یہ سب کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنا فرض ادا کرے، اہل حکومت بالکل بے نفس ہوتے تو دوسری بات تھی مگر ایسا نہیں تھا، اس لئے انھوں نے اس سے چڑھ کر اپنا فرض ادا کرنے کے بجائے الزام دینا شروع کر دیا کہ احتجاج کرنیوالوں کا اصل مقصد ملزم کو سزا دلوانا اور قانونی کارروائی کرانا نہیں ہو بلکہ حکومت کے خلاف شورش اور بے اعتمادی پھیلانا ہے، ورنہ انھیں یہ چاہیئے تھا کہ واقعہ کو بلا کسی شور و شغب کے ہمارے علم میں لاتے اور پھر اگر ایک معقول مدت کے اندر حکومت اس پر کوئی کارروائی نہ کرتی تب وہ حکومت کی مذمت اور عوامی احتجاج کے طریقے اختیار کرتے ــــ پس اب یہ صورت ہو گئی کہ ہم الٹے ملزم بن گئے اور قاضی خود مدعی کے خلاف مدعی بن گیا اور اصل مقدمہ اس نئے مقدمہ کے نیچے جا پڑا۔ اب ہم ہزار صفائی پیش کریں لیکن حکومت اگر اس نئے مقدمہ سے کر فائدہ اٹھانا طے کرے، یا بغیر کسی ارادہ کے محض چڑھ کر ہماری بات سننے پر آمادہ نہ ہو تو پھر اُسے کوئی قائل نہیں کر سکتا۔

اس لئے ہمیں یہ طے کر لینا چاہیئے کہ اب حکومت کو اس قسم کا کوئی موقع نہیں دینا ہو جب اس قسم کی کوئی بات خدانخواستہ علم میں

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

معارف الحدیث

سلسل

قناعت و استغناء اور حرص و طمع :-

جن اخلاق کی وجہ سے انسان اللہ تعالیٰ کا محبوب اور اس دنیا میں بھی بہت بلند ہو جاتا ہے، اور دل کی بے چینی اور کڑھن کے سخت عذاب سے بھی اسکو نجات مل جاتی ہے ان میں سے ایک قناعت اور استغنا بھی ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ بندہ کو جو کچھ ملے اس پر وہ راضی اور مطمئن ہو جائے اور زیادہ کی حرص و لالچ نہ کرے ___ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندہ کو قناعت کی یہ دولت عطا فرمائے بلاشبہ اسکو بڑی دولت عطا ہوئی اور بڑی نعمت سے نوازا گیا ___ اسکے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات ذیل میں پڑھیے :-

(۱۷۸) عن عبد اللہ بن عمرٍو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
قَدْ اَفْلَحَ مَنْ اَسْلَمَ وَ رُزِقَ كَفَافًا وَ قَنَّعَهُ اللّٰهُ بِمَا آتَاهُ ___ رواہ مسلم

(**ترجمہ**) حضرت عبد اللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کامیاب اور بامراد ہوا وہ بندہ جس کو حقیقت اسلام نصیب ہوئی اور اس کو روزی بھی بقدر کفاف ملی اور اللہ تعالیٰ نے اسکو اس قدر قلیل روزی پر قانع بھی بنا دیا۔ (صحیح مسلم)

(**تشریح**) بلاشبہ جس بندہ کو ایمان کی دولت نصیب ہو اور ساتھ ہی اس دنیا میں گزارہ کا کچھ ضروری سامان بھی، اور پھر اللہ تعالیٰ اس کے دل کو قناعت اور طمانیت کی دولت بھی نصیب فرما دے تو اسکی زندگی بڑی مبارک اور بڑی خوشگوار ہے اور اس پر اللہ کا بڑا ہی فضل ہے ___ یہ قناعت اور دل کی طمانیت وہ کیمیا ہے جس سے فقیر کی زندگی بادشاہ کی زندگی سے زیادہ لذیذ اور پر مسرت بن جاتی ہے ع

این کیمیائے ہستی قاروں کند گدا را

آدمی کے پاس اگر دولت کے ڈھیر ہوں لیکن اس میں اور زیادہ کے لیے طمع اور حرص ہو اور وہ

اس میں اضافہ ہی کی فکر اور کوشش میں لگا رہے اور "ھل من مزید" ہی کے چکر میں پڑا رہے تو اسے کبھی قلبی سکون نصیب نہ ہوگا اور وہ دل کا فقیر ہی رہے گا۔ برخلاف اس کے اگر آدمی کے پاس صرف جینے کا مختصر سامان ہو مگر وہ اس پر مطمئن اور قانع ہو تو فقر و افلاس کے باوجود وہ دل کا غنی رہے گا اور اسکی زندگی بڑے اطمینان اور آسودگی کی زندگی ہوگی ـــــ اس حقیقت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسری حدیث میں ان الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے:-

(۱۷۹) عن ابی هریرة عن النبی صلی الله علیه وسلم قَالَ لَیْسَ الْغِنٰی عَنْ کَثْرَةِ الْعُرُوْضِ وَلٰکِنَّ الْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ ـــــ رواه البخاری

(ترجمہ) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا دولتمندی مال و اسباب سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اصلی دولتمندی دل کی بے نیازی ہے (صحیح بخاری)

اور اس سے بھی زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ یہی حقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کو مخاطب بنا کر اس طرح سمجھائی ـــــ

(۱۸۰) عَنْ ابی ذرؓ قَالَ قَالَ لی رسول الله صلی الله علیه وسلم یَا اَبَا ذَرٍّ تَقُوْلُ کَثْرَةُ الْمَالِ الْغِنَا قُلْتُ نَعَمْ، قَالَ تَقُوْلُ قِلَّةُ الْمَالِ الْفَقْرُ؟ قُلْتُ نَعَمْ، قَالَ ذَالِكَ ثَلَاثًا۔ ثُمَّ قَالَ الْغِنٰی فِی الْقَلْبِ وَالْفَقْرُ فِی الْقَلْبِ، ـــــــــ (رواه الطبرانی فی الکبیر)

(ترجمہ) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن مجھ سے ارشاد فرمایا، ابوذر! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مال زیادہ ہونے کا نام تونگری ہے؟ میں نے عرض کیا ہاں حضور (ایسا ہی سمجھا جاتا ہے) پھر آپ نے فرمایا کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ مال کم ہونے کا نام فقیری اور محتاجی ہے؟ میں نے عرض کیا ہاں حضور! (ایسا ہی خیال کیا جاتا ہے) یہ بات آپ نے مجھ سے تین دفعہ ارشاد فرمائی ـ اسکے بعد ارشاد فرمایا اصلی دولتمندی دل کے اندر ہوتی ہے اور اصلی محتاجی اور فقیری بھی دل ہی میں ہوتی ہے ـ (معجم کبیر الطبرانی ـ جمع الفوائد)

(تشریح) حقیقت یہی ہے کہ تونگری اور محتاجی خوشحالی اور بدحالی کا تعلق روپیہ پیسے سے زیادہ آدمی کے دل سے ہے۔ اگر دل غنی اور بے نیاز ہے تو آدمی نجنت اور خوشحال ہے اور اگر دل حرص و طمع کا گرفتار ہے

تو دولت کے ڈھیروں کے باوجود وہ خوشحالی سے محروم اور محتاج و پریشاں حال ہو۔ سعدی علیہ الرحمہ کا مشہور مصرعہ ہو "تونگری بدل ست نہ بمال"

(۱۸۱) عن ابی سعید الخدری اِنَّ نَاساً مِنَ الْاَنْصَارِ سَاَلُوا رسُولَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم فَاَعْطَاھُمْ، ثُمَّ سَاَلُوْہُ فَاَعْطَاھُمْ حَتّٰی اِذَا نَفِدَ مَا عِنْدَہٗ قَالَ مَا یَکُوْنُ عِنْدِیْ مِنْ خَیْرٍ فَلَنْ اَدَّخِرَہٗ عَنْکُمْ وَمَنْ یَّسْتَعْفِفْ یُعِفَّہُ اللّٰہُ وَمَنْ یَّسْتَغْنِ یُغْنِہِ اللّٰہُ وَمَنْ یَّتَصَبَّرْ یُصَبِّرْہُ اللّٰہُ وَمَا اُعْطِیَ اَحَدٌ مِنْ عَطَاءٍ اَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ۔ (رواہ ابوداؤد)

(**ترجمہ**) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ انصار میں سے کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دفعہ کچھ طلب کیا، آپ نے ان کو عطا فرمادیا (لیکن ان کی مانگ ختم نہیں ہوئی) اور انھوں نے پھر طلب کیا آپ نے پھر ان کو عطا فرمادیا، یہاں تک کہ جو کچھ آپکے پاس تھا وہ سب ختم ہوگیا اور کچھ نہ رہا، تو آپنے ان انصاریوں سے فرمایا، سنو! جو مال و دولت بھی میرے پاس ہوگا اور کہیں سے آئے گا میں اسکو تم سے بچاکر نہیں رکھوں گا اور اپنے پاس ذخیرہ جمع نہیں کروں گا (بلکہ تم کو دیتا رہوں گا لیکن یہ بات خوب سمجھ لو کہ اس طرح مانگ مانگ کر حاصل کرنے سے آسودگی اور خوش عیشی حاصل نہیں ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ) جو کوئی خود عفیف بنناچاہتا ہو یعنی دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے اپنے کو بچانا چاہتا ہو تو اللہ تعالیٰ اسکی مدد فرماتا ہے اور سوال کی ذلت سے اس کو بچادیتا ہو، اور جو کوئی بندوں کے سامنے اپنی محتاجی ظاہر کرنے سے بچنا چاہتا ہو یعنی اپنے کو بندوں کا محتاج اور نیازمند بنانا نہیں چاہتا تو اللہ تعالیٰ اس کو بندوں سے بے نیاز کردیتا ہو، اور جو کوئی کسی کٹھن موقع پر اپنی طبیعت کو مضبوط کرکے صبر کرنا چاہتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو صبر کی توفیق دیدیتا ہے (اور صبر کی حقیقت اسکو نصیب ہوجاتی ہو) اور کسی بندہ کو بھی صبر سے زیادہ وسیع کوئی نعمت عطا نہیں ہوئی۔ (سنن ابی داؤد)

(**تشریح**) اس حدیث کا خاص سبق یہی ہو کہ بندہ اگر چاہتا ہو کہ وہ دوسرے بندوں کا محتاج نہ ہو اور ان کے سامنے اس کو دست سوال دراز کرنا نہ پڑے اور مصائب و مشکلات اس کو اپنی جگہ سے ہٹا نہ سکیں تو اسے چاہیئے کہ اپنی استطاعت کی حد تک وہ خود ایسا بننے کی کوشش کرے، اگر وہ ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ

اس کی پوری پوری مدد فرمائے گا اور یہ سب چیزیں اس کو نصیب ہو جائیں گی۔

حدیث کے آخری حصہ میں فرمایا گیا ہے کہ "کسی بندہ کو صبر سے زیادہ وسیع کوئی نعمت عطا نہیں ہوئی" واقعہ یہی ہو کہ "صبر" دل کی جس کیفیت کا نام ہے وہ اللہ تعالیٰ کی نہایت وسیع اور نہایت عظیم نعمت ہے اسی لیے قرآن مجید کی آیت "واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ" میں "صبر" کو صلوٰۃ یعنی نماز پر بھی مقدم کیا گیا ہے۔

(۱۸۲) عَنْ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ قَالَ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَعْطَانِي ثُمَّ سَأَلْتُهُ فَاَعْطَانِي ثُمَّ قَالَ لِي يَا حَكِيْمُ اِنَّ هٰذَا الْمَالَ خَضِرٌ حُلْوٌ فَمَنْ اَخَذَهٗ بِسَخَاوَةِ نَفْسٍ بُوْرِكَ لَهٗ فِيْهِ وَمَنْ اَخَذَهٗ بِاِشْرَافِ نَفْسٍ لَمْ يُبَارَكْ لَهٗ فِيْهِ وَكَانَ كَالَّذِيْ يَاكُلُ وَلَا يَشْبَعُ وَالْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلٰى قَالَ حَكِيْمٌ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَالَّذِيْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَا اَرْزَأُ اَحَدًا بَعْدَكَ شَيْئًا حَتّٰى اُفَارِقَ الدُّنْيَا۔ (رواہ البخاری ومسلم)

(ترجمہ) حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مال طلب کیا آپ نے مجھے عطا فرما دیا، میں نے پھر مانگا آپ نے پھر عطا فرما دیا، پھر آپ نے مجھے نصیحت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ اے حکیم یہ مال سب کو بھلی لگنے والی اور لذیذ و شیریں چیز ہے پس جو شخص اس کو بغیر حرص اور طمع کے سیر چشمی اور نفس کی فیاضی کے ساتھ لے اس کے واسطے اس میں برکت دی جائے گی اور جو شخص دل کے لالچ کے ساتھ لے گا اس کے واسطے اس میں برکت نہیں ہوگی اور اس کا حال جوع البقر کے اس مریض کا سا ہوگا جو کھائے اور پیٹ نہ بھرے ــــ اور اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ (یعنی دینے والے کا مقام اونچا ہے اور ہاتھ پھیلا کر لینا ایک گھٹیا بات ہو لہٰذا جہاں تک ہو اس سے بچنا چاہیے) ــــ حکیم بن حزام کہتے ہیں کہ (حضور کی یہ نصیحت سن کر میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! قسم ہے اس پاک ذات کی جس نے آپ کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہو اب آپ کے بعد مرتے دم تک میں کسی سے کچھ نہ لوں گا۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) اسی حدیث کی صحیح بخاری ہی کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حکیم بن حزام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جو عہد کیا تھا اس کو پھر ایسا نباہا کہ حضور کے بعد حضرت ابوبکر صدیق اور

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے اپنے اپنے دورِ خلافت میں (جب کہ سب ہی کو وظیفے اور عطیے دیے جاتے تھے) ان کو بھی بلا کر بار بار کچھ وظیفہ یا عطیہ دینا چاہا لیکن یہ لینے پر آمادہ ہی نہیں ہوئے ——— اور فتح الباری میں حافظ ابن حجر نے مسند اسحاق بن راہویہ کے حوالہ سے نقل کیا ہو کہ شیخین کے بعد حضرت عثمان اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے زمانہ خلافت و امارت میں بھی انھوں نے کبھی کوئی وظیفہ یا عطیہ قبول نہیں کیا یہاں تک کہ حضرت معاویہ کے دورِ امارت میں ایک سو بیس (۱۲۰) سال کی عمر میں ۵۴ھ میں وفات پائی۔

(۱۸۳) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ خَطَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ إِيَّاكُمْ وَالشُّحَّ فَإِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِالشُّحِّ أَمَرَهُمْ بِالْبُخْلِ فَبَخِلُوْا وَأَمَرَهُمْ بِالْقَطِيْعَةِ فَقَطَعُوْا وَأَمَرَهُمْ بِالْفُجُوْرِ فَفَجَرُوْا ——— (رواہ ابوداؤد)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن خطبہ دیا اور اس میں ارشاد فرمایا کہ حرص و طمع سے بچو کیونکہ تم سے پہلی قومیں اسی حرص سے تباہ ہوئیں، اسی نے ان کو بخل کرنے کو کہا تو انھوں نے بخل اختیار کیا، اسی نے ان کو قطع رحمی یعنی حقوق قرابت کی پامالی کے لیے کہا تو انھوں نے قطع رحمی اختیار کی، اس نے ان کو بدکاری کے لیے کہا تو انھوں نے بدکاریاں کیں۔"

(سنن ابی داؤد)

(تشریح) یعنی حرص و طمع صرف ایک بری خصلت ہی نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ سے انسانی معاشرہ میں دوسری بھی نہایت تباہ کن خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں جو بالآخر قوموں کو لے ڈوبتی ہیں، اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ اس خطرناک اور تباہ کن جذبہ سے اپنے دلوں اور سینوں کی پوری پوری حفاظت کریں۔

(۱۸۴) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَرُّ مَا فِيْ رَجُلٍ شُحٌّ هَالِعٌ وَجُبْنٌ خَالِعٌ ——— (رواہ ابوداؤد)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سے سنا آپ ارشاد فرماتے تھے کہ انسان میں سب سے بری بات گڑھا دینے والی حرص اور گھبرا دینے والی بزدلی ہو۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) یہ حقیقت ہے کہ حریص اور لالچی آدمی ہر وقت اس غم میں گھلتا اور گڑھتا رہتا ہو کہ یہ نہیں ملا، وہ نہیں ملا، فلاں کے پاس یہ ہے میرے پاس یہ نہیں ہے، اسی طرح زیادہ بزدل آدمی خواہ مخواہ موہوم خطرات سے بھی ہر وقت گھبراتا رہتا ہے اور اس کو اطمینان کے سانس لینے نصیب نہیں ہوتے۔ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے انسان کے دل کی ان دونوں کیفیتوں کو بدترین کیفیت تبلایا، اور فی الحقیقت یہ بدترین اور ذلیل ترین خصلتیں ہیں۔

(۱۸۵) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لَا يَجْتَمِعُ الشُّحُّ وَالْإِيمَانُ فِي قَلْبٍ وَاحِدٍ۔ (رواہ النسائی)

(ترجمہ) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا حرص وطمع اور ایمان ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ (سنن نسائی)

(تشریح) ظاہر ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالےٰ کی سچی معرفت اور اس کی ذات وصفات پر حقیقی ایمان نصیب ہوگا، اس کو اس پر توکل اور اعتماد بھی ہوگا، اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ اس کو ملے گا اس کا دل اس پر راضی اور مطمئن بھی رہے گا اور ایسے دل میں حرص اور طمع جیسی خلاف ایمان خصلتوں کے لیے یقیناً کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ الغرض یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ حرص وطمع کی بیماری حقیقت ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی — پس اگر کوئی شخص اپنے دل میں حرص اور طمع کا جذبہ محسوس کرتا ہے تو اسے سمجھنا چاہیے کہ ابھی حقیقی ایمان اس کو نصیب نہیں ہوا ہو، اور اگر وہ اس دولت سے محروم نہیں رہنا چاہتا ہے تو پھر اس قلبی اور روحانی بیماری کے علاج کی اس کو فکر کرنی چاہیے — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرح کے ارشادات کا منشا اور مقصد یہی ہوتا ہے کہ اس قسم کے بیمار اپنے مرض کی سنگینی کو سمجھیں اور اس کے علاج کی فکر کریں۔

آفتاب رسالت کا طلوع

از ڈاکٹر محمد آصف قدوائی، ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی۔

ولادت تا ہجرت

(۱)

[سیرت نبویؐ کے مختلف پہلوؤں پر ہمارے مخلص اور محترم دوست ڈاکٹر محمد آصف صاحب قدوائی کے چند مقالے اس سے پہلے "الفرقان" میں شائع ہو چکے ہیں، آج جو مقالہ نذر ناظرین کیا جا رہا ہے یہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اس میں ولادت نبوی سے لے کر ہجرت مدینہ تک کے سوانح و واقعات تاریخی ترتیب کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ ہجرت کے بعد کے حالات و واقعات انشاءاللہ آئندہ اشاعت ہی میں پیش کئے جا سکیں گے]

شرق اوسط کی اہمیت عہد حاضر کی سیاست ہی کی پیداوار نہیں ہے۔ پرانی دنیا میں بھی اسے مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

اس خطہ کا قلب وہ حصہ ہے جو خلیج فارس، بحیرۂ عرب، بحیرۂ قلزم اور بحیرۂ روم سے قریب قریب گھرا ہوا ہے، یہ علاقہ پرانی دنیا کے وسط میں یورپ، ایشیا اور افریقہ کے مقام اتصال پر واقع ہے، اسی لئے اسے پرانے زمانہ میں "دنیا کی ناف" کہتے تھے۔

قدیم ترین زمانہ سے اس جزیرہ نما میں بڑی بڑی تہذیبیں پیدا ہوتی رہیں اور ایشیا کے دوسرے ملکوں اور یورپ اور شمالی افریقہ میں جو مختلف تہذیبیں پروان چڑھیں وہ یہاں آکر ایک دوسرے سے

گلے ملتی رہیں، جب بحیرۂ روم اور بحر ہند کے درمیان ساری تجارت خشکی کے راستہ سے ہوتی تھی، اس وقت شام، فلسطین، حجاز، یمن اس بڑی شاہراہ پر واقع تھے جو مغرب سے مشرق کو ملاتی تھی اور یہاں کے لوگوں کو دنیا کے تمام حصوں سے تعلقات پیدا کرنے اور ان پر اثر ڈالنے کے ایسے مواقع حاصل تھے جو دوسری قوموں کو نہیں تھے، بین الاقوامی تہذیب اور عالمگیر انسانی برادری کا تصور اگر دنیا میں کہیں پیدا ہو سکتا تھا تو اسی وسطی خطہ میں، چنانچہ چھٹی صدی عیسوی میں پیغمبر اسلام نے دنیا کو امن و اخوت کا مژدہ یہیں سے سنایا

اسلام سے پہلے عرب میں کبھی کوئی باقاعدہ حکومت نہیں قائم ہوئی تھی، ظہور اسلام کے وقت اسکے سرحدی علاقے ــــ اور ملک بھر میں وہی خطے سرسبز اور شاداب تھے ــــ غیروں کے قبضہ میں تھے۔ شمال میں حدود شام پر روما کی مشرقی شاخ سلطنت قسطنطنیہ کا اقتدار تھا اور مشرق میں یمن، عمان اور بحرین فارس کے زیر نگیں تھے، وہاں کے عرب رؤسا کی حکمرانی بس برائے نام تھی، ملک کے اندر بھی ایرانیوں کا اثر رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا، اس کا اندازہ اس فرمان سے ہوتا ہے جو ۶ھ میں شاہ ایران نے آنحضرت صلعم کے متعلق یمن کے ایرانی گورنر کے نام جاری کیا تھا کہ "میرے غلام کو جو حجاز میں مدعی نبوت بنا ہے گرفتار کر کے میرے پاس بھیجدو"

عربوں کا سیاسی اور معاشرتی نظام قبائلی طرز کا تھا۔ وہ متعدد قبیلوں میں بٹے تھے اور ہر قبیلہ کا ایک الگ سردار تھا۔ شمال میں بکر، شیبان، تمیم، تغلب، جذام، بنو حنیفہ، طے، اسد، ہوازن، اوس، خزرج، ثقیف اور قریش وغیرہ آباد تھے۔ جنوب میں حمیری، اذواء، اور اقیال کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں، پہاڑوں اور صحراؤں میں خود مختار جرائم پیشہ قبائل کی ٹکڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ رہزنی اور غارتگری ان کا ذریعۂ معاش تھا، سب سے زیادہ طاقتور یہودی تھے جو شام اور فلسطین پر مسیحی رومیوں کے تسلط کے بعد وسط ملک میں پھیل آئے تھے۔ ملک کی زیادہ تر تجارت ان کے قبضہ میں تھی اور انہوں نے شام سے مدینہ تک قلعے تعمیر کر لئے تھے جو گوداموں کا بھی کام دیتے تھے اور چھاؤنیوں کا بھی۔

عرب قبائل مستقل آپس میں لڑا کرتے تھے، معمولی معمولی باتوں پر ان میں جنگ و جدال کا ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو برسوں ختم ہونے کو نہ آتا تھا، ان خانہ جنگیوں کے باعث بہت سے قبیلے ٹوٹ ہی گئے تھے اور جو بچے تھے ان کی بھی حالت تباہ تھی۔

رہزنی اور لوٹ مار کو الگ کر دیا جائے تو لوگوں کا ذریعہ معاش تجارت تھی لیکن جہاں بدامنی کا یہ

حال ہو وہاں تجارت کیا فروغ پا سکتی ہے۔ تجارتی قافلوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا سخت دشوار تھا۔ معدیہ تھی کہ حیرۃ کے عرب بادشاہ تک کا تجارتی سامان آسانی سے منڈیوں میں نہیں پہنچ پاتا تھا، اکثر طاقتور قبیلے برسوں اپنے مقدس شہروں کا رُخ نہ کر پاتے تھے۔

مذہب کے معاملہ میں عام رجحان بُت پرستی کی طرف تھا۔ ارواح خبیثہ سے لیکر چاند سورج تک سبھی کی پرستش کی جاتی تھی اور ان کے ناموں پر انسانوں تک کی قربانی کی جاتی تھی، زراعت میں زمین کا بہترین حصہ ان کے لئے وقف کر دیا جاتا تھا۔ خود خانہ کعبہ ـــــ دنیا کے بتکدہ میں پہلا وہ گھر خدا کا ـــــ تین سو ساٹھ دیویوں اور دیوتاؤں کا استھان بن گیا تھا۔

یوں تو عربوں میں ایک مدت سے یہودیت، مجوسیت، اور مسیحیت کا چرچا تھا، لیکن ان کا کوئی مفید اثر ان کے اخلاق وعادات پر نہیں پڑ سکا تھا جیسا کہ سر ولیم میور نے لکھا ہے "مدۃ العمر سے مکہ اور کل جزیرۂ نما روحانی غنودگی کے عالم میں تھے، یہودیت، مسیحیت اور فلسفہ نے جو ادنیٰ اور عارضی اثر عرب ذہن پر ڈالا تھا وہ بس ان لہروں کی طرح تھا جو کبھی کبھی جھیل کی سطح پر نمودار ہو جاتی ہیں، سطح کے نیچے کا جمود ویسے ہی قائم رہا تھا"[1]

عرب کے باہر دنیا کی حالت بھی کچھ اچھی نہ تھی، فارس اور روم، یہی اس زمانہ کی دو بڑی طاقتیں تھیں، فارس کی سلطنت عراق سے لیکر ہندستان کی سرحد تک پھیلی تھی، اور یورپ، ایشیا اور افریقہ تینوں براعظموں پر رومیوں کا غلبہ تھا، ان دونوں سلطنتوں میں برابر جنگیں ہوا کرتی تھیں جن سے ان کے وسائل کی بربادی ہوتی رہتی تھی اور دنیا کا امن چین غارت ہوا کرتا تھا۔

فارس میں بعثت سے قبل قباد اوّل بن فیروز کی حکومت تھی۔ اسکی نااہلی سے تنگ آ کر رعایا نے قید کر دیا، قباد نے بھاگ کر تاتاریوں میں پناہ لی اور ان کی مدد سے دوبارہ تخت وتاج حاصل کیا، چھٹی صدی کے وسط میں قباد کی جگہ نوشیرواں نے لی۔ اس کا عدل مشہور ہے مگر درحقیقت اس کے ہاتھوں لاتعداد بے گناہ موت کے گھاٹ اُترے، اس کا بیٹا نوشزاد تثلیث پرستی کی طرف مائل تھا وہ اس کی پاداش میں قید ہوا اور بالآخر زردشتیوں سے جنگ کرتا ہوا مارا گیا، ۵۷۹ء میں نوشیرواں کی موت کے بعد ہرمز چہارم تخت نشین ہوا مگر بدنظمی اور سیاسی انحطاط کی روز افزوں ترقی کو وہ بھی نہ روک سکا۔

---

(۱) سر ولیم میور: "لائف آف محمد"

رومیوں کی عالمگیر سلطنت جو یونانیوں کے زوال کے بعد قائم ہوئی تھی، چھٹی صدی عیسوی کے شروع میں مشرقی اور مغربی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی اور مشرقی بازو کے فرمانروا قسطنطین نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا، اس کی وفات کے بعد خانہ جنگیوں کی آگ بھڑکی، اس طوائف الملوکی سے فائدہ اٹھا کر دور دراز کے صوبوں نے بغاوت کر دی اور سلطنت کا مغربی حصہ بالکل جدا ہو گیا۔ اُدھر گوتھ اور ونڈال جیسی وحشی قوموں نے قتل و غارت کا وہ بازار گرم کیا کہ پانچویں صدی ختم ہوتے ہوتے سلطنت روما کا وہی حال ہو گیا جو عام طور پر ہر سلطنت کا ایسے سورج کے غروب ہونے کے وقت ہو جایا کرتا ہے۔

ساتویں صدی کی ابتدا میں رومیوں پر ایرانیوں نے اتنا سخت حملہ کیا کہ آناً فاناً اناطولیہ، شام، فلسطین اور مصر ان کے قبضہ سے نکل گئے اور دار السلطنت قسطنطنیہ کو ایرانیوں نے گھیر لیا، مجبور شہنشاہ ہرقل نے ایرانی سپہ سالار کی صلح کی انتہائی توہین آمیز شرطوں کے سامنے سر جھکا دیا اور کثیر المقدار سونا چاندی کے علاوہ ایک ہزار ناکتخدا لڑکیاں بھی ایرانیوں کے حوالہ کیں، روحانی، اور اخلاقی طور پر دنیا سچ مچ ایک ظلمت کدہ تھی، یورپ پر قرون وسطیٰ کا اندھیرا چھایا تھا ایران پر مزدکیت مسلط تھی اور ہندستان پرانک عہد کی تاریکی میں بھٹک رہا تھا۔

یہودیت کو جو فروغ داؤد علیہ السلام کے عہد میں حاصل ہو گیا تھا وہ بالکل عارضی ثابت ہوا اور ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ کے دور ہی میں ان کی تاریخ مظلومی اور جلاوطنی کی داستان بننا شروع ہو گئی تھی، پہلی صدی عیسوی میں فلسطین ان سے خالی ہو گیا تھا اور چوتھی صدی کے آغاز میں قسطنطین اعظم کے عیسائی ہو جانے کے بعد ان کی قومیت کہیں بھی تسلیم نہیں کی جاتی تھی، عہد سلیمانی ہی میں ان میں بت پرستی رائج ہو گئی تھی، وہ صحیفۂ ربانی یعنی توریت سے محروم ہو چکے تھے اور حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز راہبوں کے فیصلوں پر مبنی تھی جو شرعی فتاویٰ کا کاروبار کرتے تھے، انبیاء کی تکذیب، سود خوری، تجارت میں بے ایمانی، عہد شکنی، محسن کشی اور منافقت ان کے نسلی کردار کی خصوصیتیں بن گئی تھیں، قرآن مجید میں ان کی اخلاقی پستی کی بار بار مذمت کی گئی ہے۔

وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ
اور وہ ناحق پیغمبروں کو مار ڈالتے ہیں،

ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ۝
اس لئے کہ وہ نافرمان اور حد سے بڑھنے والے ہیں۔

(سورہ بقرہ)

سَمّٰعُونَ لِلْكَذِبِ أَكّٰلُونَ
وہ جھوٹ باتوں کے سننے والے اور مال حرام کے

لِلسُّحْتِ (سورہ مائدہ)	بڑے کھانے والے ہیں۔
وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (سورہ مائدہ)	اور تو ان میں سے اکثر کو دیکھے گا کہ گناہ اور تعدی کی طرف بڑی تیزی سے بڑھتے ہیں۔
وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (سورہ نساء)	اور چونکہ وہ سود خوری کرتے ہیں حالانکہ ان کو سود سے منع کر دیا گیا تھا اور چونکہ یہ لوگوں کا مال خورد برد کر جاتے ہیں

مسیحیت آئی تھی بت پرستی کا انسداد کرنے مگر خود اس کا شکار ہو گئی تھی، حضرت عیسیٰ کی تشریف بری کے بعد ان کے شاگردوں میں ایسے گہرے اختلافات پیدا ہوئے کہ انھوں نے مذہب کو کئی ٹکڑوں میں بانٹ ڈالا۔ پولس اور اس کے بعد اس کے شاگرد رشید پطرس نے حضرت عیسیٰ کی تعلیمات میں رومیوں کی اصنام پرستی اور یونانیوں کی افلاطونیت کا رنگ بھر کر توحید کی جگہ تثلیث کو رائج کیا، جگہ جگہ مذہبی کاونسلیں قائم ہوئیں اور روما، قسطنطنیہ، شام اور مصر کے اہل کلیسا ایک دوسرے پر خارج از دین ہونے کے فتوے دینے لگے، نوبت مناظروں سے گزر کر جنگ و جدال تک پہنچی اور چھٹی صدی کی ابتدا میں عیسائیوں میں آپس میں ایسا تصادم ہوا کہ کم و بیش ایک لاکھ عیسائیوں کو جلاوطن ہونا پڑا،

سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ :۔ "مسیحیت (خود) ساتویں صدی میں مجہول، کمزور اور ناکارہ تھی"[1]

اور ایڈورڈ گبن نے اس کی تشریح یوں کی ہے کہ "ساتویں صدی میں احمق عیسائیوں نے کفر سے کھلی ہوئی مشابہت پیدا کر لی تھی، وہ اپنی منتیں ان تمام بتوں کے حضور میں پیش کرتے تھے جو مشرقی عبادت گاہوں کی تفضیح کا سبب بنے ہوئے تھے اور انہی کے ناموں پر خلوت و جلوت میں قسمیں کھاتے تھے، خدائے قادر و توانا کا تخت شہیدوں، ولیوں اور فرشتوں کے ہجوم سے تاریک ہو رہا تھا۔"[2]

اس وقت تیسرا بڑا مذہب مجوسیت یعنی آتش پرستی تھی جو ایرانیوں میں شروع سے جاری تھی اور ان کی عظیم الشان سلطنت قائم ہو جانے پر اس کی سرحدیں بھی دور دور تک پھیل گئی تھیں، زردشت نے روشنی اور تاریکی کی دو علیحدہ حیثیتوں پر خیر و شر کی جدا گانہ حیثیتیں قیاس کر کے ان کے الگ الگ خدا یزدان اور اہرمن تصور کر لئے تھے، اس کے بعد مانی نے مسیحیت کے اشتراک سے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی جس کا

---

(۱) لائف آف محمد　(۲) ایڈورڈ گبن "ڈکلائن اینڈ فال آف دا رومن امپائر" حصہ دوم

اصل الاصول یہ تھا کہ ظلمت یعنی بدی پر دائمی فتح پانے کی ایک ہی صورت تھی کہ نسل انسانی کا سلسلہ منقطع کردیا جائے اور انسان کامل تجرد کی زندگی بسر کریں، ترک ازدواج کے اس انوکھے فلسفہ کا ردعمل ضروری تھا اور پھر ایرانی جیسی قوم میں جہاں جنسی معاملات میں سدا سے آزادی چلی آرہی تھی اور باپ کا بیٹی کو اور بھائی کا بہن کو زوجیت میں لے لینا ایک معمولی بات سمجھی جاتی تھی، چنانچہ ایرانی وقار کے ڈھلتے ہوئے عہد میں بعثت محمدی سے کچھ قبل مزدک نے زر، زمین زن کی مشترک ملکیت کا اعلان کیا، اور عیش پرست امراء اور عوام دونوں نے اس کی دعوت پر لبیک کہا، زر اور زمین کے معاملہ میں اسکی تعلیم تو کچھ زیادہ مقبول نہ ہوئی مگر ہوسنانی اور آوارگی کا بازار خوب گرم ہوا اور ظلم و استبداد کی بھی حد نہ رہی۔

ہندستان مہابھارت کی ہوشربا جنگ کے بعد ویران ہوگیا تھا، کہا جاتا ہے کہ یہ جنگ چار سال (۱۴۰۰ ق م) یعنی چودھویں صدی قبل مسیح تک ٹھنی رہی تھی اور سارے ملک میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جس نے کسی ایک فریق کی طرف سے اس میں حصہ نہ لیا ہو، چھٹی صدی ق-م میں گوتم بدھ نے ہندستان کو امن آزادی کا نیا پیغام دیا، اس کے عروج کا زمانہ قریب قریب پانچویں صدی عیسوی تک رہا جس کے بعد کچھ تو اس کی ترک دنیا اور گداگری کی تعلیم اور کچھ برہمنوں کی مخالفت کے باعث بدھ مت کو دیس نکالا مل گیا اور پرانک عہد کا آغاز ہوا، یہ دور ہندستان کی تاریخ کا سب سے ناقص دور تھا۔ برہمنوں نے خود کو کل قانونی اور اخلاقی قیدوں سے آزاد کرلیا تھا، ان کو کسی حالت میں بھی موت کی سزا نہیں دی جا سکتی تھی، جب کہ اچھوتوں کے لئے برہمنوں کو چھو لینا بھی سزائے موت کا حکم رکھتا تھا، برہمن کو گالی دینے والے کی زبان کاٹ ڈالی جاتی تھی، اونچی ذات کا مرد ہر نیچی ذات کی عورت سے ہمبستر ہوسکتا تھا۔ امراء کے یہاں ناچ گانے کی محفلیں آراستہ رہتی تھیں اور شاہراہوں پر آوارہ مزاج لوگوں کے ہجوم لگے رہتے تھے۔ ایک عورت کے متعدد شوہر ہوسکتے تھے، عورتوں کو مردوں کا غلام سمجھا جاتا تھا اور وہ جوئے تک میں ہاری جاتی تھیں مندروں کے پجاری عقیدت مندوں کو لوٹتے تھے، جمادات و نباتات کی پرستش ہوتی تھی، خبیث روحوں پر عقیدہ رکھا جاتا تھا اور وباؤں کے زمانہ میں انہی سے رجوع کیا جاتا تھا۔[1]

رات کے بطن سے دن، تاریکی کے بطن سے نور پیدا ہوتا ہے، دنیا کی یہ زبوں حالی دراصل اسکی حیات نو کا پیش خیمہ تھی، تاریخ تمدن کے ایک ماہر نے اس مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔ "معلوم ہوتا تھا

(۱) آر-سی- دت: "بھارت پرکاش"

کہ جس عظیم الشان تہذیب کو دنیا نے چار ہزار برسوں میں تعمیر کیا تھا وہ تخریب کی آخری حد کو پہنچ گئی تھی اور انسانیت اس دور کی طرف پھر لوٹ جانا چاہتی تھی جس میں نظم و نسق انجانی چیز تھے اور ہر قبیلہ اپنے ہمسایہ کے خون کا پیاسا رہتا تھا، پرانی قبائلی بندشیں ڈھیلی پڑ چکی تھیں، اس لئے قدیم شہنشاہی طریقے کارگر نہ ہوتے تھے، مسیحیت نے جو نئے اصول چلائے تھے وہ امن و اتحاد پیدا کرنے کے بجائے منافرت اور بدامنی کے محرک نکلے تھے، یہ دور بڑا المناک تھا، تہذیب کا دیو پیکر درخت جس کی شادابی عالم در کنار تھی اور جس کی شاخیں ادب اور سائنس کے بیش بہا پھل لایا کرتی تھیں اب خشک ہو رہا تھا، اس کے تنے کی قوت نمو زائل ہو چکی تھی ...... جنگوں نے اسکی جڑوں کو برباد کر ڈالا تھا۔ اور وہ محض فرسودہ رسموں اور کھوکھلے رواجوں کے سہارے کھڑا تھا۔ ہر وقت اس کے گر پڑنے کا خطرہ تھا، کیا کوئی ذی روح تمدن ایسا تھا جس کے ذریعہ نوع انسانی کو ایک بار پھر یکجا کر کے تہذیب کو بچایا جا سکتا تھا؟ ضرورت اسکی تھی کہ یہ تمدن نئے طرز کا ہو کیونکہ پرانے تصورات اور رسومات مر چکے تھے اب ان کے نمونہ پر دوسرے اصول اور طریقے مرتب کرنے کے لئے صدیاں درکار تھیں (۱)

چنانچہ چھٹی صدی عیسوی کے آخری ثلث میں عرب کے قبیلہ قریش کی ہاشمی شاخ کے عبد اللہ بن عبد المطلب کے گھرانے سے **آفتاب رسالت طلوع ہوا** جس نے آن کی آن میں تاریخ انسانی کی رات کو دن میں بدل دیا۔

۲

شہنشاہ کونین سیدنا و مولانا حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت کے بارہ میں مختلف روایتیں ہیں۔ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کی تحقیق ہے کہ آپ موسم بہار میں دوشنبہ کے دن ۹۔ ربیع الاول عام الفیل، مطابق ۲۲۔ اپریل ۵۷۱ء و یکم جیٹھ سمت ۶۲۸ بکرمی کو صبح صادق کے بعد اور طلوع آفتاب کے قبل مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے تھے۔ (۲)

آپ ماں کے پیٹ ہی میں تھے کہ یتیم ہو گئے تھے اور چھ سال کی عمر میں جب والدہ ماجدہ بھی انتقال فرما گئیں تو دادا نے آپ کو اپنے آغوش تربیت میں لیا، دو برس بعد وہ بھی دنیا سے منھ موڑ گئے۔ آپ کی کفالت و تربیت کی ذمہ داری آپ کے چچا ابو طالب نے لی، وہ اپنے یتیم بھتیجے پر بیحد مہربان تھے، ہر وقت

(۱) ماخوذ از ریکانسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹ ان اسلام، از ڈاکٹر محمد اقبال (۲) رحمۃ للعالمین۔

اپنے ساتھ رکھتے، ساتھ ہی کھلاتے اور ساتھ ہی سُلاتے۔

چونکہ اس زمانہ میں عربوں میں تعلیم کا دستور نہیں تھا، اس لئے آپ اُمّی ہی رہے، سِن شعور کو پہنچکر جب کسب معاش کی فکر ہوئی تو آپ بھی اپنے خاندانی پیشے تجارت میں داخل ہو گئے، سرمایہ کی کمی کی وجہ سے ذاتی کاروبار ممکن نہ ہو سکا، دوسروں کی شرکت میں کام شروع کیا، تھوڑے ہی دنوں میں لوگ آپ کے قول کی سچائی، وعدہ کی پابندی اور معاملت کی صفائی کا دم بھرنے لگے، آپ کا لقب ہی "امین" پڑ گیا، تاریخ اور احادیث کی کتابوں میں اس دور سے تعلق رکھنے والی بیسیوں روایتیں پائی جاتی ہیں جو آپ کے اعلیٰ خصائل کی شہادت دیتی ہیں، ایفائے عہد کے سلسلہ میں عبداللہ بن ابی الحمس کی روایت نے تو ضرب المثل کی شکل اختیار کر لی ہے، انھوں نے آپ کے ساتھ خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کیا تھا، کچھ بات ہو چکی تھی۔ کچھ باقی تھی کہ وہ پھر آنے کا وعدہ کر کے کہیں چلے گئے، اتفاق سے یہ بات ان کے ذہن سے اُتر گئی، تیسرے دن جب وعدہ یاد آیا تو گھبرا کے جائے مقررہ پر پہنچے، آپ کو اُسی جگہ منتظر پایا۔ دوسرا ہوتا تو کیا کچھ نہ کہتا۔ آپ نے صرف اتنا کہہ کر بات ختم کر دی "تم نے مجھے زحمت دی۔ میں تین دن سے یہیں تمہارا انتظار کر رہا ہوں"[1]۔

کچھ عرصہ بعد حضرت خدیجہؓ کے ساتھ آپ کا عقد ہو گیا، عقد کے موقع پر آپ کے چچا ابوطالب نے خطبہ پڑھا، انھوں نے کہا: "تحقیق محمد بن عبداللہ میرا بھتیجا ایسا جوان ہے کہ قریش میں کوئی دوسرا مرد اس کے مقابلہ کا نہیں ہے اور وہی سب سے فائق اور ممتاز ہے، اگرچہ اس کے پاس مال و متاع کم ہے"[2]

حضرت خدیجہؓ ایک دولت مند بیوہ تھیں، چنانچہ شادی کے بعد آنحضرت صلعم کو فکر معاش سے رہائی مل گئی اور آپ اپنا وقت غور و فکر اور لوگوں کی خدمت کرنے میں صرف کرنے لگے۔ ملک کی بدامنی کی طرف بھی آپ نے توجہ فرمائی اور کچھ بااثر لوگوں کو ساتھ ملا کر ایک انجمن قیام امن کی خاطر قائم کی، اس انجمن کے ممبروں کو اس بات کا حلف لینا پڑتا تھا کہ "خدا کی قسم ہم سب مل کر ایک ہاتھ بنجائینگے اور وہ مظلوم کے ساتھ رہ کر اس وقت تک ظالم کے خلاف اٹھا رہے گا جب تک ظالم مظلوم کا حق ادا نہ کر دے"[3]۔ عہد نبوت میں آپ اکثر فرمایا کرتے تھے "کہ اگر آج بھی کوئی اس انجمن کے نام پر مدد کے لئے پکارے، تو میں سب سے پہلے جاؤں گا"[4]۔

(۱) ابوداؤد جلد ۲، صفحہ ۳۲۶ (۲) ریاض محمدیہ، صفحہ ۱۷ (۳) روضۃ الانف (۴) رحمۃ للعالمین جلد ۱ صفحہ ۴۴

پینتیس برس کی عمر میں خانۂ کعبہ میں حجر اسود نصب کرنے والا واقعہ پیش آیا جس نے آپ کی عدل نوازی، فراست اور مصالحہ کیشی پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

آپ کا بچپن اور شباب، دونوں بے داغ گزرے۔ یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ قبل بعثت بھی آپ تمام مشرکانہ رسوم اور دوسرے عیوب سے بالکل الگ رہے، آپ کے اس دور کے سارے احباب پاکیزہ اور اچھے لوگ تھے، سب سے زیادہ گہرے تعلقات حضرت ابوبکرؓ سے تھے جو برسوں شریک زندگی رہے تھے۔ سر ولیم میور بھی جو اسلام اور پیغمبر اسلام کی قدح کرنے والے مصنفوں کی پہلی صف میں شمار کئے جاتے ہیں یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ "ہماری تمام تصنیفات محمدؐ کے چال چلن کی عصمت اور ان کے اطوار کی پاکیزگی میں جو اہل مکہ میں کمیاب تھیں متفق ہیں"[1]۔

بے داغ جوانی اور پاکیزہ اخلاق، بالخصوص عرب کے اُس فسق و فواحش کے ماحول میں، بڑی چیزیں تھیں، مگر جس کے مقدر میں کونین کی رہنمائی ہو اُسے کچھ اور بھی درکار تھا۔ اسکی جستجو میں آپ کا انہماک بڑھتا گیا حتیٰ کہ دنیا کے مشغلے ہیچ نظر آنے لگے۔

مکہ سے تین میل پر ایک غار تھا جسے حرا کہتے ہیں، آنحضرت صلعم کے دل کی اُداسی جب زیادہ بڑھی تو آپ وہاں جا کر کئی کئی دن قیام فرمانے لگے، کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جاتے اور جب وہ ختم ہو جاتا تو گھر جا کر پھر لے آتے اور عبادت میں مشغول ہو جاتے ..... یہ عبادت کیا تھی؟ وہی جو آپ کے جد امجد حضرت ابراہیمؑ نے نبوت سے پہلے کی تھی یعنی "غور و فکر اور عبرت پذیری"[2]۔

"ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں ٹامس کارلائل نے اس عبادت کی یوں وضاحت کی ہے "سفر و حضر میں ہر جگہ محمدؐ کے دل میں ہزاروں سوال اُٹھتے رہتے تھے۔ میں کیا ہوں؟ یہ لاتناہی عالم کیا ہے؟ زندگی کیا ہے؟ موت کسے کہتے ہیں؟ میں کن چیزوں پر اعتقاد رکھوں؟ کیا کروں؟ کیا غار حرا کی چٹانوں یا طور کی چوٹیوں یا صحراؤں کے سکوت نے ان سوالوں کا جواب دیا؟ نہیں۔ گردش کرتا ہوا نیلا آسمان، چکر لگاتے ہوئے دن رات، چمکتے ہوئے ستارے سب ان کا جواب دینے سے قاصر رہے[3]۔

آخر ایک دن فرشتۂ غیب نے اسرار نبوت کے لئے آپ کا سینہ کھول دیا، اُس نے آواز دی۔

---

(۱) لائف آف محمدؐ (۲) سیرۃ النبی جلد ۱ صفحہ ۲۰۱ (۳) ہیروز ایز آ پرافٹ، محمدؐ

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ　　"پڑھ اس خدا کے نام سے جس نے کائنات کو پیدا کیا"　　(سورہ علق)

آپ جلال الٰہی سے کانپ اُٹھے، سیدھے گھر آئے اور چادر اوڑھ کر لیٹ گئے، بیوی سے زیادہ راز کی بات سننے کا اور کون مستحق ہو سکتا تھا، آپ نے حضرت خدیجہؓ سے سارا واقعہ بیان کیا اور فرمایا مجھے اپنی جان کا ڈر ہے" حضرت خدیجہؓ نے ڈھارس بندھائی، انھوں نے کہا "آپ تردّد نہ فرمائیں، آپ مہمان نواز ہیں، اقربا کی مدد کرتے ہیں، بیواؤں، یتیموں اور بیکسوں کی دستگیری کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، خدا آپ کا ساتھ نہ چھوڑے گا"

حضرت خدیجہؓ کے ایک چچازاد بھائی ورقہ تھے جو بڑے ذی علم اور توریت اور انجیل کے ماہر تھے بیچاری آنحضرتؐ کو ان کے پاس لے گئیں، انھوں نے واقعہ کی کیفیت سُنی تو کہا "یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ پر اترا تھا۔ تو آپ کو مبارک ہو کہ خدا نے آپ کو اپنا نبی بنایا ہے، عنقریب آپ کو تبلیغ کا حکم ملے گا، پھر ساری قوم آپ کی دشمن ہو جائے گی، کاش میں اس وقت جوان ہوتا۔[1]

یہ واقعہ ۹ ربیع الاول سنہ ۴۱ میلادی مطابق ۱۲ فروری سنہ ۶۱۰ء کو بروز دوشنبہ پیش آیا تھا جب (قاضی سلیمان منصورپوری کے حساب سے) آپ کی عمر چالیس سال ایک دن کی تھی[2]

۳

جوناتھن سوِفٹ نے یہ بات بہت دلچسپ کہی ہے کہ تم میں جب کوئی غیر معمولی آدمی ابھرے تو تم اُسے اس علامت سے پہچان سکتے ہو کہ دنیا بھر کے گدھے اس کی مخالفت میں صف بستہ ہوں گے۔

آنحضرت صلعم انسانی فطرت کی اس خصوصیت سے واقف تھے، چنانچہ جب آپ کو تبلیغ کا حکم ملا تو آپ نے تدریج اور تدبیر سے کام لیا اور پہلے ان ہی لوگوں کو دین قیم پر لانے کی کوشش کی جو آپ سے بہت قریب تھے، یہ آپ کی بیوی حضرت خدیجہؓ، چچازاد بھائی حضرت علیؓ، آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید اور دیرینہ رفیق حضرت ابوبکرؓ تھے جو سنتے ہی ایمان لے آئے۔

حضرت ابوبکر بڑے فیاض، صائب الرائے اور ذی اثر تھے۔ اچھے اچھے لوگ اُن سے مشورہ کیا کرتے تھے، وہ اسلام لائے تو ان کو دیکھ کر مکہ کے کچھ اور معززین بھی مسلمان ہو گئے، ان میں حضرت عثمانؓ

(۱) صحیحین ملخصاً　　(۲) رحمۃ للعالمین جلد ۱، صفحہ ۵۲

جو بعد کو خلیفۂ سوم ہوئے، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص جن کے ہاتھوں ایران فتح ہوا، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف شامل تھے۔ ان کے بعد مردوں میں حضرت ابو عبیدہؓ، حضرت عامرؓ بن عبد اللہ، حضرت عبد الاسد بن بلال، حضرت عثمانؓ بن مظعون او حضرت ارقمؓ اور عورتوں میں حضرت عباس کی بیوی ام الفضل، حضرت ابو بکرؓ کی صاحبزادی اسماءؓ اور حضرت فاروقؓ کی بہن فاطمہؓ کو مسلمان ہونے کا شرف نصیب ہوا۔ یہ وہ لوگ تھے جو فطرت کی سلامتی، معقولیت اور حق پسندی میں ممتاز تھے،

سارا کام نہایت احتیاط اور خاموشی سے ہوا، اور رازداران خاص کے علاوہ کسی کو اسکی خبر نہ ہوئی، نمازیں چھپکر گھروں کے اندر یا پہاڑوں کی گھاٹیوں میں ادا کی جاتی تھیں، ایک روز آنحضرت صلعم اور حضرت علیؓ کسی گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ آپ کے چچا اور حضرت علیؓ کے والد ابو طالب آنکلے، انھیں اس نئے طرز کی عبادت پر تعجب ہوا، نماز کے بعد انھوں نے پوچھا کہ "یہ کون دین ہے"؟ آنحضرت صلعم نے جواب دیا۔ "ہمارے دادا ابراہیمؑ کا بھی دین تھا"۔ ابو طالب نے کہا "میں تو اسے اختیار نہیں کر سکتا لیکن تم کو اجازت ہے"۔(۱)

تین برس تک اسلام کی اشاعت اسی طرح چپکے چپکے ہوتی رہی اور تیس آدمی اس کے حلقہ میں داخل ہوئے، چوتھے سال حکم الٰہی صادر ہوا فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (جو تجھے حکم دیا گیا ہے وہ بالاعلان کہہ دے) اور یہ بھی تاکید کر دی گئی کہ رشد و ہدایت کی راہ پہلے گھر، پھر کنبہ اور قبیلہ سے گزر کر عوام الناس تک پہنچتی ہے۔ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (اور اپنے قرابت داروں کو اللہ سے ڈرا)

چنانچہ آپ نے اپنے گھر پر دعوت کا انتظام کیا اور عبد المطلب کے کُل خاندان کو مدعو کیا، کھانے کے بعد آپ نے ایک مختصر سی تقریر کی، آپ نے فرمایا۔ "میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جس میں دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی ہے۔ اس بارِ عظیم کو اٹھانے میں کون میرا ساتھ دیگا"؟ ——— محمدؐ بن عبد اللہ اور یہ دعوے! سننے والوں پر سناٹا چھا گیا۔ یکایک حضرت علیؓ نے اُٹھ کر کہا۔ "اگرچہ مجھ کو آشوب چشم ہے اور میری ٹانگیں پتلی ہیں اور میں سب سے زیادہ نو عمر ہوں مگر میں آپ کا ساتھ دوں گا"۔ اس وقت حضرت علیؓ کا سن شریف محض تیرہ سال تھا۔ لوگ ان کا مذاق اُڑانے لگے، کچھ لوگوں نے

(۱) سیرۃ النبی جلد ۱ صفحہ ۲۰۷

ابوطالب سے کہا۔" لو، اپنے بھتیجے اور بیٹے کا حکم سُن لیا۔ اب اس کے خلاف نہ کرنا"۔ اور اس تمسخر اور ناگواری کی فضا میں مجلس برخواست ہوگئی۔

کچھ روز بعد آپ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر قریش کو آواز دی اور جب لوگ جمع ہوگئے تو آپ نے فرمایا۔" تم میری بابت کیا رائے رکھتے ہو، مجھے سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا؟" آپ کی ساری زندگی انھی میں گزری تھی، وہ آپ کے صحیفۂ حیات کے ایک ایک باب سے واقف تھے۔ سب ایک زبان ہوکر بولے۔" ہم نے کبھی تمھارے منھ سے کوئی جھوٹی یا بیہودہ بات نہیں سُنی۔ ہم جانتے ہیں کہ تم سچے اور امین ہو"۔ تب آپ نے فرمایا۔" اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے دشمن کا لشکر چھپا ہوا ہے تو کیا تم میری بات مان لوگے؟" لوگوں نے جواب دیا۔" ہم تم کو سدا سے سچا سمجھتے آئے ہیں، تم اونچی جگہ پر کھڑے ہو اور پہاڑ کے اس طرف کا حال دیکھ سکتے ہو، جو ہماری نظروں سے اوجھل ہے"۔ آپ نے فرمایا۔" تو پھر میں یہ کہتا ہوں کہ خدا ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے، موت برحق ہے اور مرنے کے بعد اُسی کے سامنے حاضر ہونا ہے، اگر ان باتوں پر ایمان لاؤگے تو فلاح پاؤگے اور دنیا اور آخرت میں سرخرو ہوگے ورنہ تم پر بڑا عذاب نازل ہوگا"۔ لوگ یہ سن کر بہت برہم ہوئے۔ انھوں نے کہا۔" کیا ہمیں اسی لئے بُلایا تھا؟ بیکار ہمارا وقت برباد کیا"۔ اور منتشر ہوگئے۔

مسلمانوں کی تعداد اب چالیس سے کچھ اوپر ہوگئی تھی، ایک دن آپ نے کعبہ میں جاکر توحید کا اعلان کردیا جو قریش کے نزدیک سب سے بڑی توہین تھی، وہ ہر طرف سے آپ پر ٹوٹ پڑے، حضرت حارث گھر پر تھے۔ ان کو خبر ہوئی تو دوڑے ہوئے آئے اور آنحضرت صلعم کو بچانا چاہا۔ مگر ان پر اتنی تلواریں پڑیں کہ گر کر وہیں شہید ہوگئے۔ یہ پہلا خون تھا جو اسلام کی راہ میں بہا۔

خانۂ کعبہ میں کلمۂ حق کا اعلان گویا قریش کو کھلا چیلنج تھا، عرب میں مکہ کی عظمت کعبہ ہی کے سبب سے تھی، قریش اس کے مجاور اور کلید بردار تھے۔ اس طرح عربوں پر ان کی ایک قسم کی مذہبی حکومت تھی، وہ آل اللہ یعنی خاندان الٰہی کہلاتے تھے۔ اپنے آبائی عقائد کے خلاف جو سُنا تو آگ بگولہ ہوگئے اور سُنا بھی تو کس سے؟ ایک ایسے شخص سے جو پیدا ہونے سے پہلے یتیم ہوگیا تھا، جس کے پاس اتنا پیسہ نہ تھا کہ خود اپنا روزگار کرسکتا، جس کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی ـــــ یہ آخری بات کچھ کم اہم نہ تھی، کیونکہ تمام جاہل قوموں کی طرح عرب بھی اولاد نرینہ کو فضیلت اور آخرت کی خوش نصیبی کی نشانی سمجھتے تھے۔

قریش کہتے تھے کہ اگر ان میں نبی کو مبعوث ہونا ہی تھا تو یہ منصب قبیلہ کے کسی رئیس کو ملتا۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (سورہ زخرف)

اور انھوں نے کہا کہ قرآن کو اترنا تھا تو ان دونوں شہروں (مکہ و طائف) میں سے کسی رئیس پر اترنا تھا۔

دو چار کو چھوڑ کر اسلام کے ابتدائی ذرینہ معمولی ہی قسم کے آدمی تھے جن کی نہ تو قبیلہ میں کوئی ممتاز حیثیت تھی اور نہ وہ مال و دولت ہی کے مالک تھے، رؤسائے قریش ان کو دیکھتے تو ہنسکر کہتے

اَهٰۤؤُلَاۤءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا (سورہ انعام)

یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے ہم کو چھوڑ کر احسان کیا ہے۔

وہ تو خیریت یہ ہوئی کہ بعثت سے کچھ قبل ہی قریش میں فجار کی زبردست جنگ ہو چکی تھی، جس میں اس کثرت سے کشت و خون ہوا تھا کہ طرفین نے ہار جیت کا انتظار کئے بغیر گھبرا کر صلح کر لی تھی اس کے زخم ابھی تازہ تھے ورنہ دعوت دین کے ساتھ ہی مکہ میں حشر برپا ہو جاتا۔

چنانچہ قریش نے ضبط و تحمل سے کام لیا اور ان کے ایک وفد نے ابو طالب کے پاس جا کر آنحضرت صلعم کی شکایت کی، ابو طالب نے سمجھا بجھا کر واپس کر دیا، مگر جب آنحضرت کی مساعی میں کمی کے بجائے ترقی ہی ہوتی گئی تو وہ پھر ابو طالب کے پاس گئے اور اس مرتبہ زیادہ صاف باتیں کیں، انھوں نے کہا۔ "تمہارا بھتیجہ ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتا ہے۔ ہم کو احمق ٹھہراتا ہے اور ہمارے آدمیوں کو گمراہ کرتا ہے۔ اب تک ہم نے بہت ضبط کیا مگر اب بات حد سے تجاوز کر رہی ہے۔ اس لئے یا تو تم بیچ سے ہٹ جاؤ یا کھل کر میدان میں آجاؤ تاکہ ہم میں سے ایک کا فیصلہ ہو جائے"۔

ابو طالب ایک تجربہ کار آدمی تھے، انھوں نے معاملہ کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے رسول اللہ صلعم کو سمجھایا کہ جان عم، میں بڈھا ہو چکا ہوں۔ میرے اوپر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ میں اٹھا نہ سکوں"۔

آپ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ فرمایا "خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند لا کر رکھ دیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا۔ میرا بھروسہ خدا پر ہے جو یا تو اس کام کو پورا کرائے گا یا میں خود اس پر نثار ہو جاؤں گا"۔

دل سے نکلی ہوئی بات سیدھی ابو طالب کے دل میں اتر گئی۔ انھوں نے کہا۔ "جاؤ جب تک

یرے دم میں دم ہے کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتا،،[1]

حضور سرورِ کائنات مکہ کے گلی کوچوں میں گھوم پھر کر تبلیغ کرتے۔ بازاروں اور میلوں میں تشریف لیجاتے اور لوگوں کو دین کی باتیں سمجھاتے، ان کو جمادات اور نباتات سے منھ موڑ کر حقیقی معبود سے رشتہ جوڑنے کی نصیحت فرماتے، زنا سے روکتے، جُوا کھیلنے سے منع کرتے، خوش خلقی، عدل اور احسان کا سبق سکھاتے۔ فرماتے کہ لوگوں کو چاہیئے کہ اپنے جسموں کو نجاست سے، زبان کو گندی باتوں سے اور دلوں کو جھوٹے عقیدوں اور کمینی خواہشوں سے محفوظ رکھیں''۔

آپ تبلیغ کے لئے نکلتے تو مخالفوں کی ٹولیاں ساتھ ہو جاتیں۔ جب آپ تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو یہ آپ کا مذاق اُڑاتے اور قہقہے لگاتے اور اتنا شور مچاتے کہ بات کرنا مشکل ہو جاتا۔ ابولہب لوگوں سے کہتا: ''بھائیو! اس کی باتوں پر دھیان نہ دو، اس بیچارے کو جنون ہو گیا ہے''۔ اور کوئی کہتا کہ محمد شاعر ہو گئے ہیں اور یہ سب ان کی شاعری ہے''۔[2]

قریش کی مخالفت روز بروز بڑھتی گئی، وہ آپ کے راستہ میں کانٹے بچھاتے، جسم مبارک پر نجاست ڈالتے، گالیاں دیتے اور اکیلے دکیلے مسلمانوں کو پا جاتے تو ان کو مارتے پیٹتے اور ذلیل کرتے۔ ایک روز آپ خانۂ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ عقبہ نے آپ کے گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچی کہ آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے، ابوجہل نے آپ کے سر پر پتھر کھینچ مارا۔ حرم کعبہ میں ایک دفعہ سجدہ میں گئے تو اس نے آپ کی پیٹھ پر اونٹ کی اوجھڑی رکھ دی۔

حضرت بلالؓ اُمیہ بن خلف کے غلام تھے۔ امیہ نے ان کے مسلمان ہونے کو سُنا تو آپے سے باہر ہو گیا اور ان کے گلے میں رسّی ڈال کر بازاری لڑکوں کے ہاتھ میں دی کہ ان کو پہاڑیوں پر گھسیٹتے پھرو یہ سزا ختم ہوئی تو ان کو وادیٔ مکہ کی گرم ریت پر لٹایا گیا اور تپتے ہوئے پتھر سینہ پر رکھے گئے۔ یہ عمل ہفتوں جاری رہا، بالآخر حضرت ابوبکرؓ نے انھیں خرید کر آزاد کیا۔[3]

حضرت خباب بن الارت بھی ایک غلام تھے، وہ مسلمان ہوئے تو گھر والوں نے زمین پر انگارے بچھا کر ان کے اوپر انھیں لٹا دیا، ایک شخص سینہ پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں، یہاں تک کہ انگارے بجھ گئے۔ حضرت خبابؓ نے ایک عرصہ بعد یہ واقعہ حضرت عمرؓ سے بیان کیا اور پیٹھ کھول کر دکھائی

(۱) امام بخاری، کتاب التاریخ۔ (۲) ابن ہشام (۳) طبقات ابن سعد، جلد ۳

تو وہ بالکل مبروصوں کی سی معلوم ہوتی تھی[1]۔

حضرت ابوفکیہہ کے سینے پر اتنا بھاری پتھر رکھا گیا کہ ان کی زبان نکل پڑی[2]۔

حضرت عثمانؓ صاحب حیثیت تھے، دوسرے نہ بول سکے تو خود ان کے چچا نے کھجور کے تتے سے باندھ کر ان کو خوب مارا[3]۔

حضرت زبیر اسلام لائے تو ان کے چچا نے چٹائی میں لپیٹ کر ان کی ناک میں دھواں دیا[4]۔ سعید بن زید رسیوں میں جکڑ کر ڈال دیے گئے[5] اور مصعب بن عمیر کو ان کی والدہ نے گھر سے نکال دیا[6]۔

یہ چند مثالیں ہیں ورنہ ایسے واقعات تو ہر روز ہوا کرتے تھے، مسلمان یہ سب سہتے تھے اور ثابت قدم رہتے تھے، ایک مسلمان بھی ان ہولناک مظالم سے ڈر کر ایمان کے راستہ سے نہ ہٹا۔ علامہ شبلی نے گاڈفری ہگنس کی کتاب "اپالوجی" سے ذیل کی عبارت ترجمہ کرکے نقل کی ہے[7]۔

"عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمدؐ کی تعلیمات نے اس درجہ نشہ دینی اپنے پیرووں میں پیدا کیا جس کو عیسیٰؑ کے ابتدائی پیرووں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے، جب عیسیٰؑ کو سولی پر لیگئے تو ان کے پیرو بھاگ گئے۔ ان کا نشہ دینی جاتا رہا، اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چل دیے.. ... .. برعکس اس کے محمدؐ کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آئے اور آپکے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر آپ کو غالب کیا۔"

قریش کی بے رحمیوں سے تنگ آکر حضرت خبابؓ نے ایک دن رسول اللہؐ سے عرض کیا کہ آخر آپ ان سفاکوں کے حق میں بددعا کیوں نہیں فرماتے تو آپ کا چہرہ سرخ ہوگیا، ارشاد ہوا کہ "تم سے پہلے ایسے لوگ گزر چکے ہیں جن کے سر پر آرے چلائے گئے اور جن کے جسم چیر ڈالے گئے مگر وہ اپنے فرض سے باز نہ آئے۔ خدا اس کام کو پورا کرائے گا[8]۔"

جبر و تعدی کے ساتھ قریش نے مصالحت اور مفاہمت کی بھی کوششیں جاری رکھیں۔ ان کو خیال ہوا کہ شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دولت و ثروت کی خواہش میں اپنی ایک علیحدہ جماعت بنانا چاہتے ہیں، اس بنا پر انھوں نے عتبہ بن ربیعہ کے ذریعہ آپ کے پاس کہلا بھیجا کہ اگر تم مکہ کی ریاست یا کسی بڑے گھرانے میں شادی کرنا یا دولت چاہتے ہو تو ہم اس پر راضی ہیں۔ ہمارے عقائد کی مخالفت چھوڑ دو اور

(۲۱) اعجاز التنزیل، صفحہ ۵۳ (۳) طبقات ابن سعد، جلد ۳، تذکرہ صحابہ بدر (۴) تاریخ طبری (۵) صحیح بخاری (۶) اعجاز التنزیل (۷) سیرۃ النبی جلد ۱، صفحہ ۲۳۳ (۸) صحیح بخاری۔

جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو قوم کے سرداروں نے آپ کو خانہ کعبہ میں گفتگو کے لئے مدعو کیا۔ آپ خوشی خوشی تشریف لے گئے، وہاں قریش نے کہا محمد! تمھاری وجہ سے ہم جتنی پریشانی میں مبتلا ہو گئے ہیں کوئی قوم اپنے کسی فرد کی بدولت نہ ہوئی ہو گی، تم عذاب جان بن گئے ہو، اس سے قبل ہم نے جاہ و دولت کی پیشکش کی گروہ تمھیں منظور نہ ہوئی، تم کہتے ہو کہ تمھیں کوئی آسمانی چیز نظر آتی ہے جو تم کو ان نئی باتوں کی تعلیم دیتی ہے یقیناً وہ کوئی جن یا بھوت پلیت ہے۔ کسی نے تم پر جادو یا ٹوٹکا کر دیا ہے ہم سے مفصل بیان کرو تاکہ تمھارے علاج کا انتظام کیا جائے۔ ہم خود کل مصارف برداشت کریں گے۔"

آنحضرت صلعم نے جواب دیا "تمھاری محبت کا شکریہ، مگر جو کچھ تم نے کہا ہے اس کو میری حالت سے کوئی مناسبت نہیں ہو۔ جو تعلیم مجھے دی جاتی ہے وہ کسی جادو یا ٹوٹکے کے اثر سے نہیں ہو اور نہ کوئی جن ہی مجھ پر غالب آگیا ہے، میں خدا کے فضل سے بالکل تندرست ہوں، میری دعوت کے پیچھے کوئی دنیوی غرض بھی نہیں ہو۔ خدا نے مجھے تمھاری ہدایت کے لئے اپنا نبی بنا کر بھیجا ہے مجھ پر اپنی کتاب اتاری ہے اور مجھے اپنا بشیر اور نذیر بنایا ہے۔ میرا کام تم تک اپنے رب کا کلام پہنچا دینا ہے۔ اب مانو یا نہ مانو یہ تمھارا فعل ہے۔ اگر مانو گے تو یہ تمھارے لئے دنیا و آخرت کا سرمایہ ہو اور اگر رد کروگے تو میں اللہ کے حکم کا انتظار کروں گا کہ وہ میرے اور تمھارے لئے کیا فیصلہ کرتا ہے۔"

قریش:۔ "اچھا اگر یہی ہے تو ایک بات سنو۔ تم جانتے ہو کہ ہمارے یہاں پانی کی کتنی کمی ہے زمین بھی ہمارے پاس کم ہے، تم اپنے خدا سے دعا کرو کہ ان پہاڑوں کو یہاں سے ہٹا دے تاکہ ہمارے شہر کا میدان کھل جائے اور یہاں ایسی نہریں جاری کر دے جیسی کہ شام اور عراق میں ہیں، نیز ہمارے خاندان کے مردہ سرداروں کو دوبارہ زندہ کر دے تاکہ ہم ان سے دریافت کر سکیں کہ خدا کے یہاں تمھارا کوئی رتبہ بھی ہے یا نہیں؟"

پیغمبر صلعم:۔ "میں ان باتوں کے لئے نہیں مبعوث ہوا ہوں پیغمبروں کا کام ہدایت دینا ہوتا ہو۔"

قریش:۔ "اگر تم ہمارے لئے کچھ نہیں کر سکتے تو نہ سہی۔ خود اپنے لئے خدا سے سوال کرو کہ وہ ایک فرشتہ تم پر تعینات کر دے جو تمھارے ساتھ رہا کرے اور تمھاری نبوت کی تصدیق کیا کرے۔"

پیغمبر صلعم:۔ "میں خدا کے یہاں کوئی اختیار نہیں رکھتا ہوں۔"

قریش:۔ "تم کہتے ہو کہ تمھارا خدا قادر مطلق ہے اور ہمارے دیوی دیوتا جھوٹے ہیں، پھر تمھارا

خدا ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا کیوں نہیں گرا دیتا جو ہم اپنی آنکھوں سے اپنی مخالفت کا انجام دیکھ لیں"۔

پیغمبر صلعم :۔ "خدا بیشک ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ چاہے تو ایسا کر سکتا ہے۔ اب یہ اسکی خوشی کہ کرے یا نہ کرے"۔

قریش :۔ "کیا تمھارے خدا نے تم کو پہلے سے مطلع کر دیا تھا کہ ہم کیا کیا پوچھیں گے اور تم کیا کیا جواب دو گے۔ دیکھو آج ہم نے اپنے عذر صاف صاف بیان کر دئے۔ اب ہم قسم کھاتے ہیں کہ اس نئی تعلیم کی اشاعت ہرگز ہرگز نہ ہونے دیں گے۔ یا تم کو ختم کر ڈالیں گے یا خود مٹ جائیں گے"۔

گفتگو یہیں تک پہنچی تھی کہ ایک شخص نے اٹھ کر کہا۔ "ہم ملائکہ کی عبادت کرتے ہیں اور کریں گے جو خدا کی بیٹیاں ہیں" ایک دوسرے نے کہا "ہم کو تمھاری باتوں پر ذرا بھی اعتماد نہیں ہے۔ ہم صرف اس وقت قائل ہوں گے جب تمھارا خدا خود ہمارے سامنے آجائے گا" آنحضرتؐ کا پھوپھی زاد بھائی بولا "دیکھو تمھاری قوم نے پہلے کچھ اپنے لئے سوال کئے ان پر تم رضامند نہ ہوئے، پھر اس نے چاہا کہ تم خود اپنی بابت کچھ علامتیں ظاہر کرو اس پر بھی تم تیار نہ ہوئے، آخر میں تم سے یہاں تک درخواست کی گئی کہ اس عذاب الٰہی کا تھوڑا سا نمونہ ہی دکھا دو جس سے تم ہر وقت ڈرایا کرتے ہو۔ وہ بھی تمھیں منظور نہ ہوئی اب میں تمھاری تقریر سننے کو مطلق تیار نہیں ہوں خواہ تم ہماری آنکھوں کے سامنے سیڑھی لگا کر آسمان ہی پر کیوں نہ چڑھ جاؤ یا فرشتے تمھاری رسالت کی گواہی کیوں نہ دیں[1]"۔

قریش کی روک ٹوک اور ان کے طیش و غضب کے باوجود اسلام کا دائرہ پھیلتا گیا۔ ازدشنوءہ کے ضماد اور غفار کے ابوذر جیسے سرداران قبیلہ اور امیر حمزہ اور عمر بن خطاب جیسے سرداران جلیل کا مشرف با سلام ہونا ایک طرف مسلمانوں کی تقویت کا باعث ہوا تو دوسری طرف قریش کے تہرنے اور شدت اختیار کرلی۔

۴

یہ صورت دیکھ کر آنحضرت صلعم نے اجازت دیدی کہ صحابہ میں جن کا جی چاہے ترک وطن کر کے حبش چلے جائیں جہاں کے فرمانروا نجاشی کی شریف النفسی اور انصاف پروری کی بڑی شہرت تھی، چنانچہ ۵ سنہ نبوی میں گیارہ مرد اور چار عورتوں کا چھوٹا سا قافلہ چھپتا چھپاتا حبش پہنچ گیا، قریش کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے

(۱) قرآن مجید کی متعدد سورتوں مثلاً بنی اسرائیل، رعد، اعراف، انعام، عنکبوت میں اس مناظرہ کا تذکرہ موجود ہے تفصیل کے لئے رحمۃ للعالمین جلد اول ملاحظہ ہو۔

نجاشی کے پاس سفارت بھیجی کہ مسلمان مہاجروں کو واپس کردے مگر وہ اس پر آمادہ نہ ہوا۔

قریش نے جوش عداوت میں یہ فیصلہ کیا کہ آنحضرت صلعم کے سارے خاندان کو محصور کرکے تباہ کردیا جائے محرم ۷ نبوی میں تمام قبائل نے مل کر خاندان ہاشم کی مکمل ناکہ بندی کردی اور ان سے رشتہ، ناطہ، کھانا پینا، بولنا چالنا، خرید و فروخت غرض ہر طرح کے تعلقات منقطع کرلئے، ابوطالب مجبور ہوکر اپنے خاندان سمیت مکہ کی ایک گھاٹی شعب ابوطالب میں پناہ گزیں ہوگئے، قریش نے غلہ وغیرہ بند کردیا، ان لوگوں نے طلح کے پتے کھا کھا کر بسر کی۔ حضرت سعد کا بیان ہے کہ " ان دنوں ایک بار سوکھا چمڑا ہاتھ آگیا تھا میں نے اُسے دھوکر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا" نبی صلعم کے عزم میں اس پر بھی کمی نہ آئی۔ حج کے ایام میں (قریش اس مہینہ میں لڑنا حرام سمجھتے تھے) جب مکہ میں باہر کے لوگ آتے تو آپ گھاٹی سے نکل کر تبلیغ فرمایا کرتے۔

تین سال تک بنو ہاشم نے اس حصار میں بسر کی، آخر صبر و استقلال نے فتح پائی اور دشمنوں ہی کو ترس آیا، ہشام عامری جو خاندان ہاشم کا قریبی رشتہ دار تھا اور ان کو چوری چھپے کھانے کا سامان بھیجتا رہتا تھا زہیر کے پاس جو عبدالمطلب کے نواسے تھے گیا اور کہا: " کیوں زہیر تم کو یہ پسند ہے کہ تم کھاؤ، پیو اور ہر قسم کا لطف اٹھاؤ اور تمھارے ماموں کو ایک دانہ تک نصیب نہ ہو"۔ آخر کار قریش کے چند سردار ہتھیار باندھ کر بنی ہاشم کے پاس گئے اور ان کو درہ سے نکال لائے۔[1]

مکہ والوں سے مایوس ہوکر آپ نے شہر سے نکل کر تبلیغ کرنے کا ارادہ کیا اور پیادہ پا طائف تشریف لے گئے، وہاں ظالموں نے آپ کے پاؤں پر اتنے پتھر مارے کہ خون جوتوں میں جم گیا، زخموں سے چور ہوکر جب آپ بیٹھ جاتے تو وہ ہاتھ پکڑ کر کھڑا کردیتے اور پھر پتھراؤ کرتے، عاجز آکر آپ نے ایک مکان کے احاطہ میں پناہ لی، بدمعاشوں کا مجمع وہاں بھی پہنچ گیا اور آپ کو اتنا مارا کہ بیہوش ہوکر گر پڑے حضرت زید ساتھ تھے، اُنھوں نے آپ کو پیٹھ پر اُٹھایا اور آبادی کے باہر لے گئے۔ وہاں آپ کو ہوش آیا۔ یہ سب برداشت کرنے کے بعد بھی آپ کو اپنے کام میں مطلق کامیابی نہیں ہوئی تھی اور طائف میں ایک شخص بھی مسلمان نہیں ہوا تھا۔ آپ کا دل بھر آیا اور ہاتھ اُٹھا کر آپ نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا کہ:-

" اے اللہ اپنی ناتوانی اور بے بسی اور لوگوں کے ہاتھوں جو میری تحقیر ہوئی ہو اسکی

---

(۱) طبقات ابن سعد و سیرۃ النبی جلد اول۔

میں تجھ سے فریاد کرتا ہوں، تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

درماندوں اور عاجزوں کا مالک ہے، میرا مالک تو ہی ہے، تو مجھے کس کے سپرد کرتا ہے؟ بیگانہ اور ترشرو کے سپرد؟ یا اس دشمن کے سپرد جو بہت با اختیار ہو؟ لیکن اگر تو مجھ سے خفا نہیں ہو تو مجھے کسی بات کا ڈر نہیں ہو، مگر تیری عافیت میرے لئے زیادہ کشادہ ہے، میں اس بات سے کہ تیرا غضب یا تیری ناراضمندی مجھ پر نازل ہو تیری ذات کے نور کی پناہ چاہتا ہوں جس سے تمام تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور دنیا و آخرت کے بھی کام بنجاتے ہیں، مجھے صرف تیری خوشنودی اور تیری رضامندی درکار ہے، تو ہی میرا سہارا ہے اور تیرا ہی مجھے خوف ہے۔[1]"

اور حضرت زید سے آپ نے فرمایا "میں اہل طائف کی بربادی کے لئے کیوں دعا کروں، اگر یہ ایمان نہیں لاتے تو کیا ہوا۔ ان کی آئندہ نسلیں انشاء اللہ خدائے واحد کی عبادت کرنے والی ہوں گی۔[2]"

یہ تو آنحضرت صلعم کا معمول تھا ہی کہ حج کے زمانہ میں جو قبیلے مکہ آتے تھے آپ ان کے پاس جا کر دین کی دعوت دیتے تھے۔ سنہ ۱۰ نبوی میں مدینہ سے آئے ہوئے چھ اشخاص اسلام میں داخل ہوئے اور اس طرح اس مبارک شہر میں اسلام کی کرنیں پہنچنا شروع ہوئیں۔

یہ لوگ اپنے یہاں کے یہودیوں سے سنتے آئے تھے کہ ایک نبی کا ظہور ہونے والا ہو اس لئے انہوں نے نبی صلعم کی باتیں سنتے ہی یہ کہہ کر ایک ساتھ بیعت کر لی کہ "جلدی کرو۔ کہیں یہودی ہم پر سبقت نہ لے جائیں، دوسرے سال مدینہ منورہ کے بارہ اشخاص نے بیعت کی، بیعت کی شرطیں یہ تھیں۔[3]

(۱) ہم تنہا ایک خدا کی عبادت کریں گے اور کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔

(۲) ہم چوری اور زنا نہ کریں گے۔

(۳) ہم اپنی اولاد (یعنی لڑکیوں) کو قتل نہ کریں گے

(۴) ہم کسی پر جھوٹی تہمت نہ لگائیں گے نہ چغلی کھائیں گے۔

(۵) ہر اچھی بات میں نبی کی اطاعت کریں گے۔

لوٹتے وقت آنحضرت صلعم نے ان کی تعلیم کے لئے مصعب بن عمیرؓ کو ان کے ساتھ کر دیا، یہ بڑے

---

(۱) طبری (۲) صحیح مسلم بروایت حضرت عائشہؓ (۳) زاد المعاد

امیر گھرانے کے فرزند تھے، گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتے تو آگے پیچھے غلام چلتے تھے، دو سو روپیہ سے کم قیمت کی پوشاک نہیں پہنتے تھے، مگر داخل اسلام ہونے کے بعد ان کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ بدن پر صرف ایک کمبل ہوتا تھا جسے کانٹوں سے اٹکا لیا کرتے تھے۔

(۵)

نبوت کے تیرھویں سال اللہ تعالیٰ نے آپ کو ملکوت السمٰوٰت والارض کی سیر کرائی، یہ بحث اکثر سننے میں آتی ہو کہ معراج جسمانی تھی یا روحانی، بیداری کی چیز تھی یا خواب کی، جمہور کا مذہب یہی ہے کہ جسمانی تھی اور بیداری کی حالت میں واقع ہوئی تھی۔

ہم کو اس سلسلہ میں ابن اسحاق کی یہ بات بہت پسند آئی کہ خدا قادر مطلق ہو وہ اپنے بندہ کو رات کے وقت لے گیا، جس طرح چاہا اور جیسے چاہا تاکہ وہ اس کے پروردگار کی نشانیوں میں سے جو چاہے دکھائے یہاں تک کہ آپ نے خدا کی شان اور اس کی قدرت کے عظیم الشان مناظر دیکھے، جو کچھ دیکھے اور اس قدرت کو دیکھا جس سے وہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔(۱)

اسی مافوق الفہم سفر کے موقع پر کائنات کے محافظ نے آپ کو ہجرت کی دعا کا الہام کیا یا حکم دیا اگلے سال مدینہ کے بہتر آدمیوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، اس موقع پر آپ نے ان سے چند سوالات بھی کئے۔

آپ نے پوچھا:- "کیا تم اشاعت دین میں میری مدد کروگے اور اگر میں تمہارے شہر میں آ بسوں تو تم میرے اور میرے ساتھیوں کے ساتھ اپنے ہی لوگوں جیسا برتاؤ کروگے"؟

جواب میں مدینہ والوں نے دریافت کیا کہ اس کے معاوضہ میں انھیں کیا ملے گا؟

آپ نے فرمایا "خدا کی خوشنودی"۔

ان لوگوں نے عرض کیا "یارسول اللہ! ایسا تو نہ ہوگا کہ جب قوت و اقتدار حاصل ہو جائے تو آپ ہم کو چھوڑ کر اپنے وطن چلے آئیں"؟

آپ نے مسکرا کر فرمایا:- "نہیں تمہارا خون میرا خون ہے۔ میرا جینا اور مرنا تمہارے ساتھ ہوگا"

آپ کے چچا حضرت عباسؓ جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے آپ کے ساتھ تھے۔

انھوں نے انصار سے کہا محمدؐ اپنے خاندان میں معزز اور محترم ہیں۔ دشمنوں کے مقابلہ میں ہم ہمیشہ ان کیلئے

---

(۱) سیرۃ ابن ہشام باب الاسراء ۔ سیرۃ النبی

سینہ سپر رہے اب وہ تمھارے پاس جانا چاہتے ہیں۔ اگر مرتے دم تک ساتھ دے سکو تو ٹھیک ہے ورنہ ابھی جواب دے دو"

انصار نے وعدہ کر لیا اور جوش میں آکر کہا "ہم لوگ تلواروں کی گود میں پلے ہیں"۔

یہ سارا واقعہ قریش کا ایک شخص ٹیلہ کی آڑ سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا "بھائیو! ہمارے خلاف جنگ کے مشورے ہو رہے ہیں" اس پر انصار کو طیش آگیا اور انھوں نے آنحضرت صلعم سے عرض کیا "اگر رسول اللہ اجازت دیں تو ہم ابھی ان کو اپنی تلواروں کے جوہر دکھادیں گے" لیکن آپ نے اجازت نہ دی۔ آپ نے فرمایا مجھے جنگ کا حکم نہیں ہو۔ اس کی باتوں کی پرواہ نہ کرو"۔[1]

نبی صلعم نے صحابہ کو مکہ سے ہجرت کر جانے کی اجازت دیدی۔ قریش نے روک ٹوک تو بہت کی، مگر چوری چھپے رفتہ رفتہ اکثر صحابہ مدینے چلے گئے۔ اکابر میں صرف حضور سرور کائنات، حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ رہ گئے، قریش نے سوچا کہ آپ کو قتل کر ڈالنے کا یہ بہترین موقع ہے اور اس پر غور کرنے کے لئے دارالندوہ میں جو ان کا دارالشوریٰ تھا خفیہ اجلاس کیا۔ ہر قبیلہ کے سردار نے اس میں شرکت کی اور مختلف رائیں پیش کیں۔ ایک نے کہا "محمدؐ کے گلے میں طوق اور زنجیر ڈال کر کسی مکان میں قید کردو تاکہ سسک سسک کر مر جائے"۔ دوسرا بولا "یہ مناسب نہ ہوگا۔ محمدؐ کے قید کی خبر چھپ نہ سکے گی اور مدینہ والے آکر اسے چھڑا لے جائیں گے"۔ ایک تیسرے شخص نے یہ تجویز پیش کی کہ "محمدؐ کو کسی سرکش اونٹ پر بٹھا کر یہاں سے نکال دو۔ کہیں اور جا کر جئے یا مرے، ہماری تو جان چھوٹے"۔ اپنے کو نجدی ظاہر کرنے والے ایک بڈھے نے اعتراض کیا کہ "معلوم ہوتا ہے تم محمدؐ کی دل آویز باتوں کو بھول گئے ہو۔ دو چند جملے بول کر جسے چاہتا ہو اپنا لیتا ہے۔ وہ جہاں بھی جائے گا اپنے ہمدرد پیدا کرے گا اور پھر تم سے بدلہ لے گا"۔ آخرش ابو جہل کی یہ تجویز سب کو پسند آئی کہ "ہر قبیلہ سے ایک شخص منتخب کیا جائے اور سب مل کر ایک ساتھ محمدؐ پر حملہ کردیں۔ اس طرح اس کا خون تمام خاندانوں اور قبیلوں میں بٹ جائے گا اور مسلمان تمام خاندانوں اور قبیلوں سے بدلہ لینے کی ہمت نہ کر سکیں گے"۔[2]

چنانچہ رات میں ان لوگوں نے آنحضرت صلعم کا مکان گھیر لیا، عرب زمانۂ جاہلیت میں بھی زنانہ مکانوں میں گھسنا معیوب سمجھتے تھے، اس لئے وہ باہر ٹھہرے رہے کہ صبح آپ باہر نکلیں گے تو حملہ کیا جائے گا۔

---

(۱) طبقات ابن سعد (۲) صحیح بخاری، باب الہجرت۔

آپ کی امانت کا اتنا شہرہ تھا کہ مخالفت اور مخاصمت کے باوجود اکثر اہل مکہ آپ کے پاس اپنی امانتیں رکھواتے تھے۔ جب آپ کو خطرہ کا احساس ہوا تو آپ نے یہ سب امانتیں نام بنام حضرت علیؓ کے سپرد کیں کہ صبح جا کر انھیں واپس کر آنا، پھر سورہ یٰسین پڑھتے ہوئے مکان سے باہر تشریف لائے اور رات کے سایہ میں قریش کے حصار سے نکل گئے اور مدینہ روانہ ہو گئے، صبح ہونے پر قریش کو خبر ہوئی تو انھوں نے دُور دُور تک خاک چھان ماری مگر آپ کو نہ پا سکے۔

اکثر مغربی مصنفوں نے ہجرت کے لئے FLIGHT (بمعنی فرار) کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے آپ کے میدان چھوڑ کر بھاگ نکلنے کی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ قطعی غلط ہے۔ مکہ سے وقتی طور پر مسلمانوں کا ہٹ جانا ایک دفاعی اقدام تھا تاکہ مدینہ میں اپنا ایک مرکز بنا سکیں جہاں نہ قریش کی عظمت، اقتدار اور عالمگیر اثر سے ٹکراؤ ہوتا تھا اور نہ خاندانی رقابتیں ہی دین کی راہ میں رخنے ڈالتی تھیں، مشہور عالم عیسائی عرب مؤرخ ہٹّی نے ہجرت کی بابت لکھا ہے کہ اس کا منصوبہ بھی محض مکہ سے بھاگ جانے کے لئے نہ تھا بلکہ دو برس کے مسلسل غور و خوض کا نتیجہ تھا، میجر جنرل اکبر خاں کے نزدیک بھی ہجرت دفاعی سیاست کا ایک نادر نمونہ تھی (۱)

اور بعد کے واقعات نے تو اس حقیقت کو اتنا نمایاں کر دیا کہ اب کسی شک کی گنجائش ہی نہیں۔

(باقی)

(۱) حدیث دفاع۔ صفحات ۹۷ تا ۱۱۷

عالمِ اسلام کی تعمیرِ نو

(از:- مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

یہ وہ مضمون ہے جو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ۲۵ر جون ۱۹۵۶ء کو موتمر اسلامی دمشق کے اجلاس میں پڑھا تھا، اس اجلاس میں مراکش سے لیکر انڈونیشیا تک کے ممتاز علماء و زعماء و اہل فکر شریک تھے، یہ مضمون عام طور پر پسند کیا گیا اور موثر ثابت ہوا۔ الفرقان میں اس کا ترجمہ جو مولوی احسان الحق متعلم دار العلوم ندوۃ العلماء کا کیا ہوا ہے شایع کیا جا رہا ہے ——————

——————— (مدیر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین محمد وآلہ وصحبہ ومن تبعھم باحسان الیٰ یوم الدین۔

فلسطین کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس پر کچھ کہنا اور بولنا بڑی سعادت کی بات ہے، پھر یہ سعادت کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے جب یہ گفتگو اس مقام پر ہو جہاں محض اسی مسئلے پر غور و فکر کے لیے عالم اسلام کا جوہر اور انتخاب موجود ہو، اور اس عزم و ارادہ کے ساتھ جمع ہوا ہو کہ اس سلسلہ میں کچھ فیصلہ کن اور فوری اقدامات عمل میں لانے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں آپ کی باوقار شخصیتوں کو مخاطب کرنا دراصل عالم اسلام کے قلب و دماغ کو مخاطب کرنا ہے، اس نعمت کی بڑی ناشکری اور ناقدری ہوگی، اگر میں اس وقت حق و صداقت کے خلاف بات کہوں، لہٰذا آپ مجھے اجازت دیجیے کہ آپ کے سامنے کچھ بے لاگ طریقہ پر عرض کردوں، مختصر الفاظ میں مگر صراحت کے ساتھ۔

ہمیں اس بات کی مسرت ہے کہ ہم نے عقدۂ فلسطین کے سلجھانے میں حکومتوں، فوجی طاقت

اور اسلحہ و وسائل سے زیادہ عالم اسلام اور اس کے اسلامی شعور پر اعتماد کیا ہے، یہ بات واضح طور پر ایک واقعہ کی طرح ہمارے سامنے آچکی ہے، اس سلسلہ میں ہمارے قائدین و مفکرین نے جو کچھ کہا اور لکھا ہے، اگر وہ سب میں یہاں نقل کروں تو دفتر کے دفتر تیار ہو جائیں۔

یہ وہ چیز ہے جس سے ہمارے چہرے روشن اور ہمارے سر بلند ہوتے ہیں، ایک صحیح مقدمہ کی شان یہی ہے کہ اکثریت و طاقت کے بجائے اس کے بارے میں فہم عام اور زندہ و بیدار احساس پر اعتماد کیا جائے، جس شخص کو اپنے برسر حق اور مظلوم ہونے کا یقین ہوتا ہے اور وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اس کا مطالبہ بالکل حق بجانب ہے اور اس کا بھی یقین رکھتا ہے کہ حق کے حامی و مددگار اور مظلوم کا ساتھ دینے والے ہر زمانہ میں پائے جاتے ہیں۔ اس کو حکومتوں اور طاقتوں سے زیادہ اپنی صداقت پر حق کی حمایت اور انسانی ضمیر کی بیداری پر اعتماد ہوتا ہے، دراصل ہمارا یہ اعتماد اس بات کا اعلان ہے کہ ہم انسانی ضمیر اور اسلامی شعور پر عقیدہ رکھتے ہیں یہ اس بات کا بھی اعلان ہے کہ فلسطین ــــــ جو کہ قبلہ اول وہ مقام ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سفر معراج کی پہلی منزل تھی۔ صرف اہل فلسطین سے ہی تعلق نہیں ہے، اور نہ صرف عربوں سے، بلکہ تمام عالم کے مسلمانوں کا اس سے تعلق ہے اور وہ سارے عالم اسلام کی چیز ہے۔

یہ عالم اسلام جس پر ہمارا سہارا و اعتماد ہے، یہ تو وہ طویل و عریض آبادی ہے جو جزائر شرق الہند سے مراکش کی آخری حدوں تک پھیلی ہوئی ہے، اور جس کی تشکیل ایک ایسی برادری اور جمعیت سے ہے جو ایک عقیدہ اور ایک پیغام پر جمع ہونے والی جماعتوں میں دنیا کی سب سے بڑی جماعت ہے، یہ عالم اسلام اس کا مستحق ہے اور اس کا پورا پورا اہل ہے کہ صرف فلسطین جیسے کسی ایک مسئلہ میں نہیں، بلکہ نوع انسانی کی ہر ہر مشکل میں اس کی طرف رجوع کیا جائے، ہر ظلم و زیادتی کے انسداد میں اس سے مدد لی جائے، ہر غصب شدہ حق کے واپس دلانے میں اس کا سہارا لیا جائے، اور ہر ظالم اور سرکش سے بدلہ لینے میں اس کا دامن پکڑا جائے۔

لیکن بزرگانِ محترم! ذرا مجھے پوچھنے دیجئے کہ عالم اسلام سے آپ کیا مراد لیتے ہیں۔ کیا اس سے آپ ایک عام انسانی مجموعہ مراد لیتے ہیں جو ایک وسیع رقبہ میں آباد ہے اور جو بالکل اسی ڈھرے پر زندگی گذار رہا ہے جس پر دنیا کی اور قومیں، نہ عقیدہ میں کوئی فرق

نہ اعمال و اخلاق میں۔ میں آپ کو ایسی خام خیالی اور سطحی فکر و نظر سے بہت بالاتر سمجھتا ہوں، بھلا وہ انسان جن کے پاس نہ کوئی عقیدہ و ایمان ہو، اور نہ کوئی دعوت و پیغام، جن کو انسانی مجموعہ کا نام دینے کے مقابلے میں جانوروں کا گلہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا، ان کو قضیہ فلسطین سے کیا تعلق ہو سکتا ہے، اور اس مشکل عقدہ کی کشاد میں ان سے کسی فائدہ کی کیا امید، جبکہ اسکی بنیاد محض عقیدہ، محض احساس اور محض جذبہ پر ہے۔

پھر وہ کیا چیز ہے جس کی بنیاد پر ہم نے عالم اسلام کا سہارا لیا ہے، میں خود آپ کی طرف سے جواب دیتا ہوں اور آپکے دل کی ترجمانی کرتا ہوں کہ ہمارا اعتماد اور ہمارا سہارا درحقیقت وہ قوت ہے، جو کرہ ارضی پر بسنے والی اس عظیم امت کے نفوس میں خفتہ و پوشیدہ ہے، اور یہ وہ قوت ہے جس نے زمانہ ماضی میں بڑے بڑے معجزات رونما کئے ہیں، اور جس میں آج بھی اسکی صلاحیت و اہلیت ہے، یہ وہ محیر العقول قوت ہے جس نے قوموں کی تاریخیں بدل دی ہیں، جس نے تمدن کا رخ کہیں سے کہیں پھیر دیا ہے، کہنا چاہیے کہ تاریخ و تمدن کی بنیاد اسی پر ہے، آپ کو یاد ہوگا، یہی وہ قوت تھی جس نے اس پورے کے پورے ملک کو ظالم رومیوں کے پنجے سے آزاد کیا تھا، پھر اس میں ایک نئی روح پھونکی اور ایک نئی روشنی سے منور کیا، اس مقدس سرزمین کے قدیم تقدس کو چار چاند لگائے اس قوت نے کبھی موانع کو موانع نہیں جانا، شکست و ہزیمت کا اس نے منھ نہیں دیکھا، اعداد و شمار کے لفظوں سے وہ بیگانہ تھی، اور اسباب و وسائل کی منطق سے بے بہرہ، اس طاقت کا نام ادیان و نفسیات کی مختصر و بلیغ اصطلاح میں "ایمان" ہے۔

یہ ایمان اور وہ چیزیں جو اس کا نتیجہ ہیں یعنی ایک خاص طرز کی زندگی، اور مخصوص طرز کے اخلاق و عادات یہی اس عالم اسلامی کی پہچان اور اس کی اصل طاقت اور سرمایہ ہے اور تاریخ اس کی شاہد ہے کہ انسان اس سے بڑی قوت کا کبھی انکشاف نہیں کر سکا، زمانہ نے جس کا لوہا مانا ہے اور جس کے سامنے بڑی بڑی طاقتوں نے سپر ڈال دی وہ یہی ہے، یہی طاقت ہے جو حکومتوں کو جنم دیتی ہے، قوموں کو وجود بخشتی ہے، وہ حیات انسانی کی قسمت پر پڑے ہوئے بھاری قفلوں کے لیے شاہ کلید ہے۔ آپ یقین مانیے کہ آپکے اس پر اعتماد کرنے کے معنی ہیں کہ آپ نے انسانی قوتوں میں سے سب سے عظیم قوت پر اعتماد کیا ہے۔ اس سے بڑی قوت انسان کے قبضہ و قدرت میں نہ رہی ہے نہ ہوگی، آپ نے جب اس کو پالیا تو گویا وہ شاہ کلید پالی جس سے ہر قفل بآسانی کھولا جا سکتا ہے، اس موقع پر میں آپ سے یہ دریافت کرنے کی جرأت کروں گا کہ یہ عالم اسلام جس پر ہم اس قدر اعتماد کر رہے ہیں آپ حضرات نے اسکا جائزہ

لینے کی زحمت گوارا فرمائی ہے اور کیا آپنے اس قوت ایمان اور اس اسلامی شعور کا بھی اندازہ لگایا ہو جو اس عالم اسلامی کی اصل طاقت اور مسئلہ فلسطین کا حل ہو اور کیا جو انقلابات اور نئی نئی تبدیلیاں عالم اسلام میں رونما ہوئی ہیں اور بعض طاقتور عناصر و عوامل نے اس آخری دور میں اس دنیائے اسلام پر اثر ڈالا ہو وہ آپ کی نظر میں ہیں؟

میری صاف بیانی اور تلخ گوئی کو آپ معاف کریں، مجھے اندیشہ ہو کہ آپ کو اس کا موقع نہیں ملا ہو میرا خیال ہو آپکے تصور میں وہ عالم اسلام ہو جو تاریخ کے اوراق میں پایا جاتا ہو یا آپکے ذہنوں اور آپ کی خیالی دنیاؤں میں بستا ہے موجودہ دنیا میں اس کا کہیں وجود نہیں ـــــ وہ خوش منظر و دلفریب عالم جو غیور و خوددار ہو، جو نہ خود ظلم کرتا ہو نہ کسی چیز پر ظلم روا رکھتا ہے، وہ انسانی دنیا جو نہ دوسروں کا حق لیتی ہو اور نہ اپنے جائز حق سے دست بردار ہوتی ہے ـــــ وہ انسانی بستی جس کے ایک گوشہ سے ایک سن رسیدہ عورت پکارتی ہے، اے معتصم کہاں ہو، تو دوسرے گوشہ سے معتصم کی صدا بلند ہوتی ہو، لبیک لبیک! ـــــ وہ عالم کہ جس کا ہر ہر فرد اس وسیع کائنات کے ایک ایک بالشت کا خود اپنے کو جوابدہ سمجھتا ہے اور تمام عالم اسلام کو اسکی عظیم وسعت کے باوجود ایک وطن اور ایک ملک سمجھتا ہو، اور اس امت کو ایک جسم اور ایک بدن، بالکل اس طرح کا انسانی جسم کہ جس کے ایک عضو میں درد ہوتا ہے تو تمام بدن بے خوابی اور حرارت میں مبتلا ہو جاتا ہے ـــــ وہ عالم کہ جس کا ہر ہر فرد اللہ کی راہ میں شہید ہونے کا اس طرح مشتاق و متمنی ہوتا ہے جس طرح کوئی زندگی کا۔

حضرات! یہ ہو اس عالم کی تصویر جہاں کبھی بھی فلسطین جیسا غم انگیز سانحہ نہیں ہو سکتا اور اگر ہو جائے تو جلد سے جلد اور تھوڑی سے تھوڑی مدت میں اس کا مداوا ہو جاتا ہو۔

لیکن بزرگو! آج کا عالم اسلام، غلط نہ ہو گا اگر میں کہوں کہ بغیر ہمارے علم و احساس کے وہ اپنی روح بہت کچھ کھو چکا ہو اور کھوکھلا ہو گیا ہو۔ اس میں وہ عناصر نہیں رہے جن سے عالم اسلام، عالم اسلام بنتا ہو۔ وہ عناصر ہیں ایمان بالغیب بن دیکھی اور غیبی حقیقتوں پر ایسا یقین جس کے سامنے وہ یقین بھی گرد ہو جو تجربہ و مشاہدہ سے مادہ پرستوں کو مادی اشیاء پر حاصل ہوتا ہو۔ دنیا کی چند روزہ حیات پر آخرت کی ابدی و دائمی زندگی کو ترجیح دینا، زخارف دنیا اور ان سے لطف اندوزی کو دل میں جگہ نہ دینا۔ حق پر استقامت اور اس کے لیے جان کی بازی لگا دینا، اور آخری چیز دینی حمیت اور

خود داری :- درحقیقت اپنے اندر ان چیزوں کا فقدان اور یہ اندرونی انقلاب اس رسوائی و ہزیمت کا سبب بنا ہے جو عالم اسلام کو زندگی کے ہر میدان میں بار بار اٹھانی پڑی ہو، اور یہی اس المیہ (ٹریجڈی) کا حقیقی باعث ہو جو عالم اسلام کو پیش آیا ہے۔

یہ ہو وہ عالم اسلام جو ہمارے آپکے سامنے ہو، لیکن ہم سمجھتے رہے کہ یہ وہی قرن اول کی اسلامی دنیا ہو، ہم اسی خوش گمانی میں تھے کہ حادثات کا ہم پر نرغہ ہوا اور ہم نے بڑی امیدوں سے اسکی طرف ہاتھ پھیلائے، نو وارد مشکلات و مسائل کے حل کے لیے اس سے قوت و مدد چاہی مگر افسوس ع

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا

عالم اسلام ہمارے تصور کے خلاف ایک نیا عالم نظر آیا، ہم نے ٹٹولا تو ہماری مصیبتوں اور مشکلوں کا اس میں کوئی علاج نہ تھا، یہ ایک دردناک حقیقت کا انکشاف تھا جس نے ہمارے حواس مختل کر دیے، ہماری امیدوں پر پانی پھر گیا ۔ پانچ سال پہلے میں نے یہی بات لکھی تھی، آج بھی وہ دہرائی جاسکتی ہے اور میں سمجھتا ہوں اس میں کسی رد و بدل کی اب بھی ضرورت نہیں۔

"ایک وقت آیا جب عالم اسلام نے اس معنوی قوت سے بے التفاتی برتی مزید کے لیے فکر و اہتمام الگ رہا، باقی ماندہ کی حفاظت بھی نہ کی، آبیاری کی فکر نہ کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ان معنویات کا سرچشمہ خشک ہو گیا، پھر معرکے پیش آنے شروع ہوئے، عالم اسلام کو ان میں گھسنا پڑا، کچھ جھٹکے اور دھکے بھی لگے اس وقت ضرورت پڑی ایمان کی، صبر کی، ثابت قدمی اور بلند حوصلگی کی، مصائب و شدائد پر تحمل و برداشت رکھنے والی قوت کی، عالم اسلام بڑا پر امید تھا، سمجھ رہا تھا یہ قوتیں مسلمانوں کے نفوس میں پوشیدہ ہیں، بڑا خوش خوش ان کو لینے بڑھا لیکن وائے ناکامی جسے پانی سمجھ رہا تھا وہ سراب سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔

کسراب بقیعۃ یحسبہ الظمآن ماء احتی اذا جاءہ لم یجدہ شیئا

"مانند سراب صحرا کہ جسے پیاسے نے پانی سمجھا لیکن جب قریب آیا تو وہاں کچھ نہ پایا"

اس وقت اس نے محسوس کیا کہ اس روحانی اور حقیقی قوت کی ناقدری کرکے اور اس کو ضائع کرکے اس نے کیسی غلطی کی ہو، اپنے پر کیسا ظلم اور اپنے ساتھ کیسی ناانصافی اور زیادتی کی ہے اب لاکھ سر ارتا ہے کہ ترکش میں ایک تیر بھی ایسا نکل آئے جو اس معنوی قوت کا مداوا ہو سکے اور اس کی ضرورت کو

کسی حد تک پورا کر سکے، مگر ترکش ایسے ہر تیر سے خالی ہے۔

بیچارے نے معرکوں کا سامنا کیا، اس خوش گمانی میں کہ مسلمان سینہ تان کر کھڑے ہو جائیں گے اسلام کی مدافعت اور نصرت کے لیے دوڑ پڑیں گے۔ سرزمین مقدس کی حمایت وحفاظت میں سینہ سپر ہو جائیں گے، اللہ اس کے رسول اور ان کی عزت وناموس کے لیے سر بکف ہو جائیں گے، سارے کے سارے ممالک اسلامیہ میں غصہ کی آگ بھڑکنے لگے گی، جوش وحمیت کا سمندر تلاطم میں آجائے گا، مگر چشم حسرت دیکھتی کیا ہے کہ کوئی واقعہ اور کوئی حادثہ بھی عالم اسلام پر اثر انداز نہ ہو سکا، نہ اس میں گرمی پیدا ہوئی، نہ غصہ آیا، نہ شعلے اٹھے، نہ آگ بھڑکی، اسلام کی مدافعت ونصرت اور مقامات مقدسہ کی حمایت وحفاظت کے لیے سینہ سپر کون ہوتا، نیند کے ماتوں نے آنکھ کھول کر بھی نہ دیکھا، جو امیدیں لگائی گئی تھیں سب نقش برآب ثابت ہوئیں۔ کہیں معمولی سی صدائے احتجاج بلند ہو گئی اور بس ہمیشہ کی طرح عالم اسلام اپنے روز وشب کے کام انجام دیتا رہا، اپنی خواہشات ولذات میں اسی طرح مست و مشغول، حوادث سے اس طرح بیگانہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، اس وقت محسوس ہوا کہ عالم اسلام اپنی دینی حمیت کو کھو چکا ہے، اور جہاد کی آگ اس میں اگر سرد نہیں ہوئی ہے تو عنقریب سرد ہو جانے والی ہے، اس وقت ساری دنیا نے دیکھ لیا، سمجھ لیا اور جان لیا کہ عالم اسلام پہلے سے بہت بدل چکا ہو اہیں اب وہ روح اور جوش زندگی باقی نہیں رہا ہے جس کے لیے عالم اسلام مشہور تھا۔[1]

شاید اس موقع پر بعض فاضل احباب فرمائیں گے کہ عالم اسلام کی یہ نہایت تاریک اور مایوس کن تصویر پیش کی گئی ہے ان کو خیال ہو گا کہ مجھ پر کچھ "قنوطیت" کا غلبہ ہو اور میں زندگی کے تاریک پہلوؤں ہی کو دیکھتا ہوں۔

حضرات! میں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا ہو کہ عالم اسلام کی حقیقی اور واقعی تصویر آپ کے سامنے رکھ دی ہو اور اس کے کمزور پہلو کو اجاگر کیا ہے تاکہ آپ اپنی توجہ اس کی طرف مبذول کریں، میں سمجھتا ہوں اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی یہی ہے کہ عالم اسلام کی صحیح اور حقیقی تصویر سامنے لائی جائے جو ہر طرح کی رنگ آمیزی اور زیبائش سے مبرا ہو، خصوصاً اس محفل اور اس مجمع کے سامنے کہ جس کو عالم اسلام کا ایک طبی بورڈ کہنا بجا ہو گا۔

لیکن اس کے بعد میں یہ بھی کہتا ہوں کہ عالم اسلام اپنے ضعف وشکستگی اور اپنی اس خامی اور

---

[1] ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین ص ۲۳۹-۲۴۰ طبع ثانی

کوتاہی کے باوجود اس کی بھی صلاحیت رکھتا ہو کہ ایک بار پھر وہی قرن اولیٰ کا عالم اسلام بن جائے۔ اسی طرح صحیح وسالم، اور صحتمند و تندرست، جس میں زندگی اور زندہ دلی موجیں مار رہی ہو جس کا سہارا لینا صرف کسی ایک مشکل میں نہیں بلکہ تمام انسانی مشکلات میں بالکل بجا اور درست ہو، خواہ وہ مشکل مسئلہ فلسطین کی طرح کتنی ہی پرپیچ اور دشوار کیوں نہ ہو۔

اس میں کچھ مبالغہ نہیں عالم اسلام قرن اولیٰ کا عالم اسلام بن سکتا ہو اور کیوں نہیں جبکہ نبوت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ اس کا رشتہ قائم اور مستحکم ہو، زندگی اور روشنی کے اس سرچشمہ سے اس نے اپنے کسی دور میں بھی کامل بے تعلقی اختیار نہیں کی، اور اب بھی وہ اس سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہے۔ اور اس کو اپنے لیے باعث فخر اور اپنا طرۂ امتیاز سمجھتا ہے، اسکا معاملہ ان قوموں اور انسانی برادریوں کی طرح نہیں ہے کہ جن کا تعلق نبوت اور آسمانی پیغامات سے کبھی کا ختم ہو چکا ہو۔

وہ بھولا ہوا ضرور ہے مگر یہ بھی ہے کہ یاد دہانی کیجائے تو اس کو فوراً یاد آجاتا ہے وہ سویا ہوا ہے مگر اس طرح کہ جھنجھوڑا جائے تو فوراً بیدار ہو جاتا ہے، اس میں کبھی بغاوت و سرکشی نہیں پیدا ہوئی، وہ کوتاہ عمل ضرور ہو، مگر اس کو اسکا اعتراف بھی ہے اور وہ اس پر نادم و شرمندہ بھی ہے، وہ خطاکار و غلط کار ہے مگر اس کو اس پر اصرار نہیں، اس کے خاکستر کے اندر محبت کی چنگاریاں ہیں اور اور اس کے دل کی گہرائیوں میں ایمان کی جڑیں اور عشق کی حرارت ہے، افسوس ہے کہ اس کو عرصہ سے محبت اور ایمان کی زبان میں (جو اس کے ساز فطرت کو چھیڑنے والی زبان ہو) عرصہ سے خطاب نہیں کیا گیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے اندر زندگی کی کوئی لہر پیدا نہ ہوئی اور وہ ان مانوس صداؤں کو سمجھ نہ سکا جو صرف مادہ پرست قوموں کے لیے وضع کی گئی ہیں۔

میرے محترم و معزز بزرگو! ضرورت اسی کی ہو کہ عالم اسلام کے ایمان کو آواز دی جائے اور اس کو ابھارا جائے، اس میں نئی امنگ اور نئی زندگی پیدا کی جائے، اس کے اخلاق و اعمال کا احیاء کیا جائے، ببانگ دہل کہتا ہوں، اسے کسی نئے دین اور نئے نظریہ کی قطعاً ضرورت نہیں، اس کو صرف نئے ایمان کی ضرورت ہے، نیا اور طاقتور ایمان، ابدی حقائق پر، ابدی عقائد پر، ابدی پیغام پر، ابدی دین پر، جی ہاں ابدی دین پر، خدا نہ کرے کہ میں دین کو قدیم بتلاؤں، میں اس سے خدا کی

پناہ چاہتا ہوں اور کانوں پر ہاتھ دھرتا ہوں، دین میں قدیم وجدید کی تقسیم نہیں۔ وہ کبھی قدیم نہیں ہوا۔ اس میں کسی جدت کی ضرورت نہیں، وہ ہمیشہ ایک رہا ہے، ایک رہے گا، وہ ابدی و دائمی چیز ہے ـــ جس چیز کے لیے میں جدید کا لفظ بول رہا ہوں وہ ایمان ہے، یہ کبھی پرانا اور بوسیدہ ہو جاتا ہے، قوت وطاقت ختم ہو چکی ہوتی ہے، کسی دشمن کا مقابلہ کرنے اور شدائد کے تحمل کی اس میں تاب نہیں ہوتی، لیکن ایک ایمان وہ ہوتا ہے جس میں تازگی وشگفتگی پائی جاتی ہے، جس میں زندگی وحرارت ہوتی ہے۔

اس امت کی اولین پیش رو جماعت کی خصوصیت اور اسکی طاقت کا راز ہی یہ تھا کہ وہ ایک جدید اور تازہ ایمان کی حامل تھی جبکہ اس وقت کی دوسری قومیں مضمحل و بوسیدہ اور خستہ و شکستہ ایمان رکھتی تھیں، یہ سسکتا اور دم توڑتا ایمان ان کے نوخیز ایمان کی تاب نہ لاسکا، قدیم و دیرینہ سال دنیا نے ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے، اور پابجولاں قدموں میں آپڑی، اور نئے ایمان کی حامل یہ جماعت عالم پر اس طرح طلوع ہوئی جس طرح روز سویرے آفتاب طلوع ہوتا ہے اور دیکھتے دیکھتے سارے عالم پر اور دنیا بھر کے اندھیرے پر اپنی روشنی، فتح اور عالمگیری کا سکہ بٹھا دیتا ہے۔

آج نئے نئے فتنے ہیں، نئے نئے حالات وحوادث ہیں، نئے نئے معرکے اور نئے نئے مقابلے ہیں، ان کے مقابلے کے لیے ایمان بھی نیا ہونا چاہیئے، کوئی شبہ نہیں کہ عالم اسلام اب بھی ایمان کے ایک عظیم سرمایہ کا مالک ہے، وہ بنیاد جس پر محل کی تعمیر ممکن ہے، اس امت کے خرابات میں اب بھی موجود ہے، جب کہ دوسری قوموں نے اس کو کھو دیا ہے اور ان کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں امت کے معماروں کو چاہیئے، موقع سے فائدہ اٹھائیں اور جلد سے جلد اسلام کا محل تعمیر کرلیں۔

ہاں تو بات صرف اتنی ہے میرے محترم بزرگو! کہ عالم اسلام کو صرف اپنا ایمان زندہ کرنا ہے، اس میں نئی اور تازہ روح ڈالنے کی ضرورت ہے، اس ایمان میں کہ اللہ ہی اس کا معبود، کارساز اور مالک ہے ـــ اس ایمان میں کہ تمام انبیاء ورسل اللہ کی طرف سے آئے، اس کے بھیجے ہوئے آئے، اور جو کچھ انھوں نے کہا اور بتلایا بالکل حق اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے، اور اب "دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل" صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہی ہمیشہ کے لیے ہدایت کا منبع و سرچشمہ اور نجات اخروی کا واحد وتنہا راستہ ہیں، اور جس نے اس در کو چھوڑا وہ کبھی گمراہی سے

نہیں نکل سکتا اور راہ نہیں پاسکتا

محمد عربی کہ آبروئے ہر دو سرا است کسیکہ خاک درش نیست خاک بر سر او

——— اور اس ایمان میں کہ تمام عالم کے نیست ہو جانے کے بعد ایک دن آئے گا جب وہ اللہ کے سامنے پیش ہوگا، حساب وکتاب ہوگا، نیک و بد اعمال کی جزا و سزا ملے گی، جنت یا دوزخ میں جانا ہوگا، ان تمام ایمانیات میں زندگی اور روح ڈالنے کے بعد ایمان واقعی ایمان ہوگا، وہ صرف دیکھنے کا یا کہنے کا ایمان نہ ہوگا، یہ ایمان جب نفوس میں کروٹ لے رہا ہوگا اور صورت حقیقت بن چکی گی، اور تمام زندگی پر ایمان چھایا ہوگا اس وقت ہر مشکل خود بخود حل ہو جائے گی، اور ہر قفل آسانی سے کھل جائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ عالم اسلام اس سلسلہ میں بڑا مظلوم ہے، اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں یہ ناواقفیت دو طرح کی ہے، بعض لوگ وہ ہیں جن کے ذہنوں میں اسلام کا کبھی کا خوبصورت نقشہ بیٹھا ہوا ہو، اور وہ اس میں مست ہیں، اس کے ساتھ انتہائی خوش گمانی میں ہیں اور اس پر وہ بوجھ لادتے ہیں جو اس بیچارے کے بس کا نہیں، اور اس سے اس چیز کا مطالبہ کرتے ہیں جو اس کے دامن میں نہیں، اسکی مثال ایسی ہو کہ کوئی درخت پر توجہ اور دھیان نہ دے اور پھلوں کی امید لگائے، انھوں نے اس کے ایمان وعقیدہ کی تو کبھی خبر نہیں لی اور چاہتے ہیں اعمال مومنین صادقین کے ظہور میں آئیں ——— وہ کچھ ظہور میں آئے جو اسلام کی نسل اول سے ظاہر ہوا تھا،

وہ جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے براہ راست تربیت یافتہ نفوس قدسیہ سے ظاہر ہوا تھا شجاعت وایثار کے نادر نمونے اور وہ غیر معمولی اعمال جن کو سن کر دنیا ابھی تک انگشت بدنداں اور تاریخ سر بگریباں ہے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو اسکی اصل فطرت اور مزاج وطبیعت سے ناآشنا ہو، اس کے شاندار ماضی اور اسکی تاریخ سے ناواقف ہے، اس کے اندر جو صلاحیتیں اور قوتیں ودیعت ہیں اسکو وہ بھولے ہوئے ہیں، اور انھیں ان خزانوں کا اندازہ نہیں جو اس کی زمین میں مدفون ہیں، وہ اس سے مایوس ہیں، حالانکہ وہ صلاحیت سے لبریز ہو اور تھوڑی سی صحیح کوشش سے وہ ایک نیا عالم

بن کر نمودار ہو سکتا ہے۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

وہ اس کے ساتھ وہ معاملہ کرتے ہیں جو کسی ایسی قوم کے مناسب ہو جو نہ کوئی دین رکھتی ہے نہ کوئی عقیدہ، ایسی امت کہ جو نہ کسی رسول پر ایمان رکھتی ہو اور نہ کسی کتاب اور قانون و شریعت کی حامل ہو، اس کی مشکلات کا علاج ان طریقوں سے کرتے ہیں جنھیں جاہلی قومیں اختیار کرتی ہیں، ان کا ذہن اس طرف نہیں جاتا کہ اس کے عقدوں کی کشاد کے لیے دین و عقیدہ پر نظر کریں، ایمان کو اجاگر کریں اور اس کو زندہ و بیدار کریں ــــ عالم اسلام کے یہ دونوں ہی نادان دوست ہیں وہ اپنی اس ناواقفیت کی وجہ سے عالم اسلام کی طرف سے پریشان اور عالم اسلام ان کی وجہ سے سخت تکلیف میں مبتلا ہے۔ وہ عرصہ سے ان کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے۔

دراصل حقیقت حال ان دونوں نظریات و خیالات کے بین بین ہے، نہ تو یہ سمجھنا صحیح ہے کہ عالم اسلام کا ایمان اور تعلق مع اللہ عصر اول کے عالم اسلام کی طرح ہے۔ لہٰذا اس سے ان اعمال و خوارق کے ظہور کی توقع کی جائے جو ایک ایسے ایمان کا نتیجہ ہیں جو عمیق و راسخ اور ریشہ ریشہ میں پیوست ہوتا ہے، اور نہ یہ تصور صحیح ہے کہ اور قوموں کی طرح وہ بھی بس ایک قوم ہو، جاہلی امتوں سے اسے کچھ امتیاز حاصل نہیں، لہٰذا اس کی مشکلات کا حل بھی انھیں مادی راستوں اور خود ساختہ آلات سے کیا جائے جو ان قوموں کا وطیرہ ہے، غلط اور بہت غلط، اپنی تمام خرابیوں کے باوجود یہ امت کبھی ایسی نہیں ہو سکتی، وہ مومن ہو اور ہمیشہ سے ہے، بس میں یہی کہوں گا کہ اس کے ایمان کو تازہ اور نیا کرنے کی ضرورت ہے، ایک بار ابھارنے اور جوش میں لانے کی ضرورت ہے، حرکت دینے اور جھنجھوڑنے کی ضرورت ہے، اور پھر اس کو منظم کرنے اور کام میں لانے کی ضرورت ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ ہم اس نقطہ کے قریب پہونچ گئے ہیں، اور اس حیثیت سے فلسطین کا مسئلہ بہت مبارک ہے جس کی بدولت ہمیں توفیق ہوئی کہ اس عالم کی طرف توجہ کریں، اس سے ہم تعارف حاصل کریں اس کی وجہ سے ہمیں ایک نئے عالم اسلام کا انکشاف ہوا اور ہمیں اسکی صحیح صورت حال کا صحیح اندازہ ہوا، اسکی کمزوریاں معلوم ہوئیں اور اسکی حقیقی ضروریات و مسائل کا علم ہوا۔

پس بزرگو اور دوستو! ہمیں چاہیے کہ اس عالم کو اپنی اصلی ہیئت پر لانے اور اس کے ایمان اور

اخلاق و اعمال کو دوبارہ زندہ کرنے میں لگ جائیں، یہ عالم اسلام کی تجدید و احیاء کا مقدس اور اہم ترین کام ہے، ہم اس بات کو اچھی طرح سمجھیں اور اس کا یقین کریں کہ قوی اور جاندار ایمان، اور مختلف ملکوں میں بسنے والے تمام اسلامی حصّوں اور اسلامی جماعتوں میں صحیح اسلامی شعور ہی وہ چیزیں ہیں جن سے فلسطین کے مشکل مرحلہ کو طے کیا جاسکتا ہو، یہ نہ صرف اسی مسئلہ کا حل ہے بلکہ عالم اسلام کے ہر درد کی دوا ہے، یہی چیز ہے جو فلسطین کے معرکہ میں بھی غلبہ و فتح کی ضامن ہوسکتی ہے اور اس کے علاوہ دوسرے معرکوں میں بھی فتح کی کنجی ہے آنے والے تمام خطروں سے حفاظت اسی سے ممکن ہے اور ہر عزت و برتری، اور فلاح و نجاح کی اسی سے توقع ہے۔

پس عالم اسلام کے اہل الرائے، مفکرین و مبصرین جن کی ایک معتد بہ تعداد اس جگہ جمع ہے اس بات کو سمجھیں اور غور کریں کہ اس مبارک تحریک کو کس طرح شروع کریں، اور کس طرح اسلام کی صحیح دعوت، اور صحیح ایمانی زندگی کی بازگشت کی عظیم مہم کا آغاز کریں، انھیں سوچنا ہے کہ خود مسلمانوں کے اندر ایمان کا بیج کیسے بوئیں اور ٹھنڈے دلوں اور بے حس جسموں میں دینی جذبات کی آگ کیسے بھڑکائیں، اس دعوت الی اللہ، ایمان بالرسول کا وہ طریق اختیار کریں جو عہد اول میں اختیار کیا گیا تھا، اور جس نے ایک نئے عالم کی تعمیر کی تھی۔

اس عظیم الشان اسلامی موتمر کے کرنے کا کام اس وقت یہی ہو کہ سارے عالم اسلام میں اپنے داعی پھیلادے جو زمین کے گوشہ گوشہ میں پھیل جائیں، اور ایک مستقل تحریک اور دعوت کے علمبردار ہوں، یہ دعوت اسلامی اور حرارت ایمانی کا ایک شعلہ جوالہ اور ایک متحرک و سرگرم سفر کاروان ہو۔ اس طرح موتمر فلسطین کا مسئلہ بھی حل کرسکتی ہے اور عالم اسلام میں ایک نئی زندگی پیدا کرسکتی ہو جس میں ہر مشکل اور ہر مسئلہ سے عہدہ برآ ہونے کی مستقل صلاحیت و طاقت ہو گی۔

"سیّد احمد شہید" پر ایک زائرانہ نظر

(از مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہوی)

[مہر صاحب کی کتاب "سید احمد شہید" پر ایک مفصل تبصرہ ہم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے شائع کر چکے ہیں، مولانا نسیم احمد صاحب فریدی کا یہ تبصرہ اپنی نوعیت میں اس سے مختلف ہے اس میں پوری کتاب پر تو صرف ایک زائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ باقی تبصرہ کا تعلق صرف ایک خاص بحث سے اور بعض جزئیات کی تحقیق و تصحیح سے ہے ——— ادارہ]

مجاہد جلیل حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی رح پر دورِ حاضر میں ایک خاص ترتیب اور سلیقے کے ساتھ سب سے پہلے ان کے ہی خانوادے کے ایک ذی علم، روشن خیال اہل قلم نے ایک گلدستۂ معلومات سیرت احمد شہید رح کے نام سے پیش کیا تھا — جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اور مجھ کو ہر ایک ایڈیشن کے مطالعے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اتفاق سے میرے مطالعے میں اُس کتاب کا وہی نسخہ آتا رہا جس کو امروہہ کے ایک بہترین ادیب اور ماہر تاریخ و انساب برادرم حکیم سید حسن مثنیٰ صاحب رضوی مدظلہ کی نظر سے گذرنے کا پہلے موقع ملتا تھا اور جس پر جا بجا ان کے حاشیے اور افادات درج ہوتے تھے۔ میں نے کبھی بچپن میں سوانح احمدی کا مطالعہ کیا تھا اور اس کے مطالعہ سے حضرت سید صاحب اور ان کے رفقاء کی عقیدت کا اچھا خاصہ نقش میرے قلب پر موجود تھا۔ اسکے بعد اس شستہ و رفتہ عنبریں تحریر نے جس کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے قلم مشکبار نے مرتب کیا تھا اور جس میں سلجھا ہوا پرتاثیر انداز تھا، میرے نقوشِ عقیدت کو اور زیادہ ابھار دیا — اللہ تعالیٰ شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ گزشتہ سے پیوستہ سال اتفاق سے میرے پاس "سید احمد شہید رح" مؤلفہ مہر صاحب کا ایک نسخہ آیا جس کو میری معرفت ایک عزیز کے

پاس پہونچا تھا۔ اس نعمت غیر مترقبہ کے حصول سے بڑی مسرت حاصل ہوئی، پہلے میں نے مطالعہ کیا، پھر حکیم صاحب موصوف نے اُسے دیکھا، وہ اس کتاب کے بہت ہی منتظر و مشتاق تھے۔ حکیم صاحب نے اس پر کئی جگہ اپنے نوٹ بھی درج کیے تھے، خیال تھا کہ اسی وقت اپنے خیالات قلمبند کروں لیکن موقع نہ ملا۔ آخرکار وہ کتاب میرے پاس سے چلی گئی، اور میں اسی دُھن میں رہا کہ کسی طرح مجھے یہ کتاب پھر ہاتھ آئے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے دوبارہ ایک نئی جلد مہیا کرادی۔ میرا ارادہ تھا کہ اس کتاب پر مبسوط تبصرہ لکھوں، دل کھول کر اس کی تعریف کروں، جرأت کے ساتھ اس کتاب کے ایک دو مقام کے متعلق اپنی رائے ظاہر کروں، کہیں کہیں جو اس میں قابل اصلاح پہلو ہیں دوسرے ایڈیشن کے لیے ان کی نشان دہی کروں، مگر اس وقت عدیم الفرصت ہوں، علاوہ ازیں جو تازہ تاثرات بوقت مطالعہ تھے وہ بھی کچھ مدہم پڑ گئے ہیں، خیر جتنا کچھ ہو سکتا ہے اس وقت لکھ رہا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ "سید احمد شہیدؒ" جناب غلام رسول مہرؔ کی بیس پچیس سال کی علمی و تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ ہے — جس سال یہ کتاب شائع ہوئی ہو اگر یہ کہا جائے کہ اس سال ہند و پاکستان میں اردو زبان میں کوئی کتاب اس شان و شوکت کی شائع نہیں ہوئی تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔ سید احمد شہیدؒ کا ذکر خیر اور مہرؔ جیسے تجربہ کار اور پختہ نگار ادیب کے قلم سے نورٌ علیٰ نور اور سونے پر سہاگہ کا مصداق ہے۔ ع

ذکر اس "مجاہدؒ" کا اور پھر بیاں "اُن" کا —

جس طرح ایک عمدہ مشاق غزل گو آخر میں میدان منقبت میں گامزن ہو کر کامیاب طریقے پر حق منقبت ادا کرتا ہے اور تغزل کی چاشنی سے اپنے کلام کو نوازتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح مہرؔ جیسے زریں نگار اہل قلم نے اپنی صحافی کہنہ مشقی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسا اچھا شاہکار پیش کیا ہے جس نے دنیائے تاریخ و سیاست میں ایک دھوم مچادی اور "نقاش اول" (مولانا علی میاں مدظلہ) سے بھی داد تحقیق حاصل کر لی — (ملاحظہ ہو تبصرہ مندرجہ الفرقان ربیع الثانی ۱۳۷۵ھ)

اگرچہ طرز تحریر میں وہ حلاوت وہ فصاحت و بلاغت آمیز انداز، وہ "جامعیت و مانعیت" اور خیر الکلام ما قل و دل والا معاملہ تو نہیں ہے جو حضرت ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی تحریر میں پایا جاتا ہے لیکن پھر بھی خاص ادیبانہ طرز میں سادہ مگر پُرشکوہ الفاظ میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنا، علمی مضامین کو سنجیدگی و شگفتگی کے ساتھ پیش کرنا، تاریخی کڑیوں کا ملانا، نازک مرحلوں پر اشہب قلم کو

تعمیر دینا، الجھی ہوئی اور مدت کی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانا پھر ایک خاص ترتیب کے ساتھ مورخانہ انداز میں ایک ضخیم مجموعہ پیش کرنا یہ حضرت مہر کا ہی حصہ ہے، خصوصاً ہجرت سے لے کر واقعہ شہادت تک کے واقعات مرتب کرنے میں تو وہ بالکل منفرد سے معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے واقعی بڑی جستجو، بڑی تلاش، بڑی کاوش سے جزئیات تک مہیا کیے ہیں، غیر معروف مقامات کا پتہ چلایا ہے، نقشے کھینچ کر ان مقامات کا اندراج کیا ہے۔ قریب قریب ہر اہم مقام جنگ پر وہ خود سفر کر کے پہونچے ہیں، اس کا محل وقوع دیکھا ہے اور اس کی لفظوں میں تصویر کشی کی ہے۔

میں سچے دل سے اس بات کو عرض کر رہا ہوں کہ مجھے اس کتاب نے بہت فائدہ پہونچایا ہے۔ اور میری محسن کتابوں میں سے ایک یہ کتاب بھی ہے ——— بوقت مطالعہ میرے دل میں بار بار یہ تمنا ابھرتی تھی کہ کاش دینی و مذہبی کام کرنے والا ہر مسلمان، ہر اصلاحی جماعت کا ممبر، ملت بیضا کی سرسبزی و شادابی کا خواہاں، ہر فرد اور فروغ دین مبین کا متلاشی ہر شخص اس کتاب کو ایک مرتبہ ضرور دیکھ لے تاکہ اس کے سامنے بھی اتباع شریعت و سنت، ایثار و قربانی، اخلاق کی فراوانی، حکمت و موعظت اور احیاء دین کے صحیح صحیح نمونے آجائیں۔

مسئلہ غیبوبت، سید شہید رح کے اصل نصب العین اور چند دیگر اہم مسائل پر بالکل انوکھے انداز میں لکھا ہے، حقیقت واقعہ کو خوب خوب ظاہر کیا ہے۔ دلائل سے، براہین و شواہد سے مدتوں کے پڑے ہوئے غلط پردوں کو چاک کیا ہے، "جعلسازیوں" پر بڑی چابکدستی سے "عمل جراحی" فرمایا ہے۔ واقعات کو یکجا کرنے اور اصل واقعہ کا پتہ چلانے میں مہر صاحب نے بے مثال محنت و جستجو سے کام لیا ہے، سفر ہجرت میں جو انداز بیان ہے وہ اتنا موثر، دلنشین اور دلآویز ہے کہ ناظر کتاب کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا وہ بھی حضرت سید شہید رح کے قافلے کے ساتھ چل رہا ہے، پھر صبح شہادت کا منظر اتنا رقت انگیز ہے کہ بے اختیار دریائے دل میں طغیانی آجاتی ہے اور طفل اشک آنکھوں میں آکر مچلنے لگتے ہیں۔

مہر صاحب کو سید صاحب، اُن کے خاندان اور اُن کے رفقاء سے جو عقیدت و محبت ہے وہ جگہ جگہ اُن کے قلم سے مترشح ہو رہی ہے ——— وہ لاہور میں بیٹھے ہوئے دیار حبیب (رائے بریلی) کا بھی جگہ جگہ خلوص کے ساتھ ذکر کرتے ہیں ——— جذب و کیف کے بہت سے نمونے دکھا آگر

عدم گنجائش وقت مانع ہے۔ صرف ایک نمونہ پیش کرتا ہوں" سید احمد علی شہید" خواہر زادہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی شہادت پر مہر صاحب کی چند سطریں پڑھ لیجئے۔

" سید احمد علی کا سنگ چقماق خراب ہو گیا اور بندوق سے کام لینے کی کوئی صورت نہ رہی تو نالی ہاتھ میں لے کر بندوق کو لٹھ کے طور پر استعمال کرنے لگے۔ اس طرح بھی کئی دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ آخر نیزوں، تلواروں اور گولیوں کے زخموں سے چور ہو کر گر گئے۔ گرتے ہی روح اعلیٰ علیین میں پہونچ گئی، غور فرمایئے، کہاں رائے بریلی اور کہاں پھولڑہ۔ پھر اہل و عیال کہیں بھائی اور دوسرے اقربا کہیں، دو فرزند ہندستان میں، ایک جگر بند امب میں۔ تنہا پھولڑے میں جان دی۔ وقت رخصت نہ کسی عزیز کا چہرہ دیکھا نہ اپنا چہرہ کسی عزیز کو دکھایا۔ نہ کسی کی بات سنی نہ اپنی بات سنائی نہ اس مبارک ساعت میں ایسا کوئی خیال دل میں گزرا، وہ جلیل المنزلت ماموں بھی دور بیٹھا تھا، جس کی دعوتِ حق نے جہاد فی سبیل اللہ کی آرزو سے دل کا گوشہ گوشہ معمور کر دیا تھا۔ راویوں نے لکھا ہے کہ بے شمار زخم لگے تھے لیکن سب جسم کے اگلے حصے میں تھے۔ پچھلے حصے میں خراش تک نہ آئی تھی۔ جن "بزرگانِ ملت" نے سوا سو سال تک سید صاحبؒ اور ان کے ساتھیوں کو ناقابل ذکر طعنوں کا ہدف بنائے رکھا، ان میں سے کتنے ہیں جن کی سرگزشتہائے حیات میں کلمۂ حق کی سربلندی کے لیے اس نوع کے ایثار کی خفیف سی جھلک بھی مل سکتی ہے"؟ — (ص ۴۰۱ جلد دوم)

اس کتاب کی حقیقی تعریف کرنے کے لیے کسی سالک راہ ادب ہی کا قلم درکار ہے۔ آسمانِ صحافت کا مہر مبین لائق صد مبارکباد ہے کہ اس نے اپنی چمک دمک سے نظروں کو خیرہ کر دیا۔ مگر یہ مہر مبین کہیں کہیں ابر آلود ہوتا بھی نظر آیا ہے، شاید یہ نظر بد سے بچنے کی کوئی قدرتی تدبیر ہو۔ اس ابر آلودگی کو میں بہت ہی مجبور ہو کر اور دل کے تقاضوں کے بعد ظاہر کر رہا ہوں ورنہ اس پہلو کو نہ دکھاتا۔

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کی حیثیت تعلیم دین کی طرح، روحانیت، تنظیم امت اور دینی جد و جہد میں بھی" نظام شمسی" کی تھی یا نہیں؟ یہ ایک بحث ہے جو کتاب میں آئی ہے اور جس کو مہر صاحب نے بالقصد ایک" مرحوم مجاہد" کی" افراط" کے جواب میں چھیڑا ہے،

مگر افسوس، خود مہر صاحب جواب دیتے دیتے "تقریظ" کی وادیوں میں "گلگشت" فرمانے لگے۔
اس موقع پر اعتدال قائم رہتا تو کیا اچھا ہوتا ۔۔۔ اگر کسی صاحب نے سید شہیدؒ کی شخصیت کے کسی خاص پہلو پر اپنی رائے پیش کی تھی تو اس کا جواب یہ تو نہیں ہونا چاہیے تھا کہ سید صاحبؒ کا حضرت محدث دہلوی سے کنکشن ہی ختم کرنے کی غیر محسوس کوشش کی جائے۔ بیشک حضرت سید شہیدؒ عبقری خصوصیات کے مالک اور یگانۂ روزگار شخصیت تھے ان میں جو خوبیاں تھیں وہ اظہر من الشمس ہیں، لیکن خدارا یہ تو دیکھو کہ حضرت سید شہیدؒ کے بزرگوں کا تعلق قدیم سے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے چلا آرہا ہو۔ خود سید شہیدؒ کے بڑے بھائی کا شاہ عبدالعزیزؒ سے علمی و روحانی تعلق ہے، اکبرآبادی مسجد جو ولی اللّٰہی جماعت کا مرکز تھی سید صاحب اس میں بیٹھ کر دینی جد و جہد کے نقشوں کو مرتب کرتے ہیں۔ اس کے بعد دوآبے کا سفر ہے، یہ دوآبے کا علاقہ وہ علاقہ ہے جس میں حضرت شاہ صاحبؒ کے رشتے دار، مرید، شاگرد اور حلقۂ اثر کے حضرات خاص طور پر پائے جاتے تھے، ویسے اُن کا اثر کشمیر سے دکن اور سورت سے کلکتہ تک بلکہ بیرون ملک میں بھی تھا، کیونکہ اُن کے شاگردوں اور مریدوں کا حلقہ نہ صرف برِ اعظم ہند میں تھا بلکہ دیگر ممالک میں بھی ان کی علمیت و روحانیت کا لوہا ماننے والے موجود تھے۔

اُن کے بھتیجے شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ تحریک کے اہم بازو ہیں، ان کے داماد مولانا عبدالحئی بڈھانوی اور ان کے چچا شاہ اہل اللہ کے پوتے مولانا محمد یوسف پھلتی سید صاحبؒ کی دینی تحریک کے خاص ارکان ہیں ۔۔۔ اگر عسکری واقفیت حاصل کرنے یا کسی اور مصلحت سے نواب امیر خاں کے لشکر سے تعلق پیدا کرنا حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے ایماء سے نہ بھی مانا جائے جیسا کہ مہر صاحب کو بہت زیادہ اصرار ہے اور اشارۂ غیبی ہی کے ماتحت لشکر امیر خاں میں جانا تسلیم کر لیا جائے (حالانکہ اشارۂ غیبی میں یہ ممانعت ہرگز نہ تھی کہ اپنے پیر و مرشد سے تفصیلی پروگرام ہرگز طلب نہ کرنا) تو اس کا وہ کیا جواب عنایت فرمائیں گے کہ دوآبے کا سفر تحریص و ترغیب جہاد کے سلسلے میں کس کے ایماء سے شروع ہوا تھا؟ خود مہر صاحب مقر و معترف ہیں کہ

بعض اصحاب سے معلوم ہوا کہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے دوآبے کے دورے

سے بیشتر جگہ جگہ خط بھی لکھ دیئے تھے اور پیغام بھی بھجوا دیئے تھے کہ سید صاحب "ہمارے ..." ان کی تواضع میں کوئی کوتاہی نہ کرنا، یہ یقیناً درست ہوگا اس لیے کہ یہ دورہ شاہ عبدالعزیزؒ ... کے مشورے سے شروع ہوا تھا" (ص ۱۲۰ جلد اول)

مگر جب یہ لکھتے ہی مہر صاحب کو خیال آ جاتا ہو کہ یہ تو پھر وہی بات آ گئی جس سے تعلق ٹونک کے معاملے میں اور ہر ایسے موقع پر پہلو تہی کی تھی تو اب ان کا قلم یہ لکھنے پر مجبور ہوتا ہے ـ "لیکن مختلف مقامات پر خدمت دین اور شگفتگی اسلامیت کا جو جذبۂ صادقہ پیدا ہوا وہ خدا کے کرم کے بعد حضرت سید صاحبؒ کی روحانی برکات اور دل آویزی اور احیاء اسلامیت کا کرشمہ تھا۔"

اس "حصر و انحصار" پر اکتفا نہ کر کے مقطع میں سخن گسترانہ بات پڑ آتی ہے، فرماتے ہیں۔

"شاہ عبدالعزیزؒ کے خطوط و پیغامات مختلف حلقوں میں شناسائی کا ذریعہ ضرور بن سکتے تھے۔ لیکن دل افروز نتائج و ثمرات صرف سفارشوں سے پیدا نہیں ہوتے" میں نہیں سمجھتا کہ آخر مہر صاحب کی اتنی کوشش اس امر کے ثابت کرنے میں کیوں ہے کہ سید صاحب جو پیغام دین لے کر اٹھے تھے یا جو تحریک انھوں نے چلائی تھی وہ محض ان کے الہام ہی پر مبنی تھی۔ اور کوئی اس معاملۂ خاص میں رہنما، مشیر، سرپرست، اور ایما کنندہ نہیں تھا اور وہ کیوں ولی اللٰہی خاندان سے سلسلۂ تحریک کو علیحدہ کرنا چاہتے ہیں؟۔

میں نہایت صفائی سے کہتا ہوں کہ وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے، سنجیدہ مؤرخ پھر بھی یہی رائے ظاہر کرے گا کہ سید صاحبؒ کی تحریک کا رشتہ براہ راست شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے جڑتا ہے، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات مہر صاحب کی نظر گرامی سے گذر چکے ہوں گے ـــ ان جذبات کا شاہ عبدالعزیزؒ برادران کے واسطے سے ان کے روحانی فرزند حضرت سید صاحبؒ پر اور ان کے بھتیجے شاہ محمد اسمٰعیل پر اثر پڑنا کوئی بعید از عقل بات ہے۔ یا اس سے کوئی سید صاحب کی تنقیص ہوتی ہے؟۔

میں مہر صاحب سے اس صاف گوئی کی معافی چاہتا ہوں اور ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس سلسلے میں نظر ثانی کریں، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، حضرت سید شہیدؒ میں کوئی

مغائرت ظاہر کرنا یہ کوئی اچھی کوشش نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک دونوں بزرگ واجب التعظیم ہیں اور اگر ہم شاہ عبدالعزیزؒ کو اُس آنکھ سے دیکھیں جس آنکھ سے سید صاحبؒ اور اُن کے خاندان نے دیکھا تھا تو ہم بھی اس ذات کو منبع حسنات اور مرکز خیرات تصور کرنے پر مجبور ہوں گے اور ہمیں ذرا شبہ نہ ہوگا کہ جس شخصیت کو اللہ تعالیٰ نے سید صاحبؒ کی روحانی تربیت کے لیے منتخب کیا تھا اسی شخصیت کے محسوس و غیر محسوس برکات ہیں جو سید صاحب کے کارناموں میں جلوہ گر ہیں۔ ہاں بقول مہر ــــــ "خدا کے فضل و کرم کے بعد" ــــــ خود روح شہیدؒ سے معلوم کرنے کی کسی میں صلاحیت ہو تو شاید وہ اس شعر کے مفہوم کو ادا کرے ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

اب میں چند باتوں کی تصحیح کی طرف اور متوجہ ہوتا ہوں۔

(۱) ۶۲۷ھ (۱۲۳۰ء) میں سید قطب الدینؒ نے وفات پائی۔ [جلد اول صفحہ ۳۱]

صحیح یہ ہے کہ سید قطب الدین کی ولادت ۵۸۱ھ میں ہوئی اور وفات ۶۶۷ھ میں بعمر ۸۶ سال۔ (آئینہ اودھ بحوالہ بحر الانساب)

(۲) انھوں نے (سید محمد نعمانؒ نے) سیرت علمیہ کے نام سے اپنے جد امجد کے حالات میں ایک کتاب مرتب کی تھی۔ (صفحہ ۵۳ جلد اول)

صحیح یہ ہے کہ سید محمد نعمانؒ کی کتاب کا نام اعلام الہدیٰ ہے۔ اس پر حکیم سید فخر الدین حسنیؒ نے اضافہ کیا اور ایک مستقل کتاب لکھی جس کا نام سیرت علمیہ ہے، بعدہٗ ان کے صاحبزادے مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رائے بریلویؒ نے تذکرۃ الابرار کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں مذکورہ بالا دونوں کتابوں کے مضامین لیے اور اضافہ بھی کیا۔

(از افادات حکیم سید حسن مثنیٰ رضوی مدظلہ)

(۳) سید محمد ثابت بن سید محمد حیا بن سید محمد ہدیٰ بن سید علم اللہؒ [جلد اول صفحہ ۸۰]

سید محمد حیا اور سید محمد ہدیٰ کے درمیان سید محمد ثنا کا اضافہ ہونا چاہیے۔

(از افادات حکیم سید حسن مثنیٰ رضوی مدظلہ)

(۴) مولانا عبدالحیؒ شاہ عبدالعزیزؒ کے بھانجے اور داماد تھے۔ [جلد اول ص ۱۱۶]
شاہ صاحبؒ مولانا عبدالحیؒ کے پھوپھا تھے۔ ماموں نہ تھے۔ [ازافادات رضویہ]

(۵) جلد اول میں ص ۱۱۵ پر حضرت شاہ اہل اللہ کو (جن کا مزار پھلت ضلع مظفر نگر میں ہے) حضرت شاہ ولی اللہ کا برادر اکبر لکھا ہے حالانکہ وہ برادر کوچک تھے ۔۔۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ایک علاتی بھائی تھے جن کا نام صلاح الدینؒ تھا اور پھلت کی خاتون، مکرمہ معظمہ فخر النساء بنت شیخ محمد پھلتیؒ (خلیفہ شاہ عبدالرحیم فاروقی محدث دہلویؒ) کے بطن سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بعدہٗ حضرت شاہ اہل اللہؒ مصنف چہار باب و تکملۂ ہندیہ (در علم طب) پیدا ہوئے۔

[ماخوذ از یادداشت بر سر ورق انفاس العارفین قلمی در کتب خانۂ دارالعلوم دیوبند]

(۶) ص ۵۲۔ جلد اول کے حاشیہ پر لکھا ہے ۔۔۔ سید معصوم احمد اور سید مصطفےٰ سید صاحب کے ہم خاندان تھے۔ پورا شجرہ مجھے معلوم نہیں۔

پورا شجرہ یہ ہے ۔۔۔ سید معصوم احمد بن مولانا سید محمد واضح بن سید محمد صابر بن سید آیت اللہ بن سید علم اللہؒ [ازافادات رضویہ]

(۷) جلد اول ص ۴۲ پر سید آیت اللہ کے یہاں بیٹوں کے نام ہیں وہاں ایک بیٹے کا نام بجائے سید محمد حسن کے سید محمد احسن ہونا چاہیے۔ (افادۂ رضویہ)

(۸) ع سید صاحب کے رفقاء کا جتنا سامان تھا اس کی پہچان یہ تھی کہ ہر رنگ پر ۱۲۷ کا ہندسہ لکھدیا گیا۔ (یعنی سید صاحب کے اسم احمد کے عدد از روئے ابجد) ص ۲۲۴ جلد اول

۔۔۔ سید احمد کے عدد ۱۲۷ ہیں نہ کہ فقط احمد کے۔

(۹) جلد دوم ص ۱۷۵ کے حاشیہ پر ہے ۔۔۔ قادر آباد ۱۲۳۱ھ کی طغیانی میں بہہ گیا تھا۔" لیکن ۔۔۔ تاریخ تناولیاں ص ۶۲ پر ہے کہ طوفان مشہور ۱۲۳۸ھ میں آیا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب

(۱۰) فہرست غازیان میں مقام موراداں کو موراین لکھا ہے اور مولوی محمد حسن (رام پور منہیاران والے) کو پھلت کی فہرست میں شامل کر دیا ہے یا ممکن ہے اس نام کے پھلت کے

ع ۵۔ تبصرہ نگار نے اپنے ایک مکتوب میں اطلاع دی ہو کہ یہ استدراک کتاب کے پہلے ایڈیشن پر کیا گیا تھا۔ بعد میں ایک دوسرا نسخہ سامنے آیا جو غالباً کسی دوسرے ایڈیشن کا ہو اس میں اس غلطی کی تصحیح مصنف نے خود کر دی ہو!

بھی کوئی غازی ہوں، لیکن رام پور منیہاران کے جانباز مجاہد شہید بھولڑہ کا نام کہاں گیا؟
(۱۱) حاجی سید عبدالرحیم ولائتیؒ کا نام فہرست شہداء میں نہیں ہے۔ غازیوں کی فہرست مندرجہ ص۲۱۵ (جلد ثانی) میں حاجی عبدالرحیم ولائتیؒ کا نام موجود ہے، بتواتر ثابت ہے کہ حاجی عبدالرحیم ولائتی خلیفہ حضرت شاہ عبدالباری صدیقی امروہیؒ ہمراہی حضرت سید شہیدؒ راہ حق میں شہید ہوئے۔ انوار العارفین مولفہ حافظ محمد حسین چشتیؒ مرادآبادی میں ان کی شہادت کی تصریح ہے اور وفیات الاخیار میں سنہ وفات ۱۲۴۶ھ ہی درج ہو اگرچہ مہینہ رمضان کا بتایا ہے۔ سلسلۂ صابریہ امدادیہ کے تمام شجروں میں ان کو شہید لکھا ہے اور ۱۲۴۶ھ سن شہادت مانی ہے۔ صاحب انوار العارفین نے سید صاحبؒ اور حاجی عبدالرحیم فاطمی کے تذکروں میں ۲۷ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ تاریخ شہادت لکھی ہے، مہر صاحب نے ۲۴ ذی قعدہ تاریخ شہادت تحریر فرمائی ہو، تواریخ عجیبہ (سوانح احمدی) سے مہر صاحب کی پیش کردہ تاریخ کی ہی تائید ہوتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اب میں جنگ بھولڑہ سے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں۔ مہر صاحب کو اس بات کا اقرار ہے کہ میں بھولڑہ کو دیکھ نہ سکا، یہ تفصیلات مختلف اصحاب سے معلوم ہوئیں، کہہ نہیں سکتا کہ انھیں ٹھیک ٹھیک بیان کرسکا ہوں یا نہیں؟ (ص۱۷۲ جلد دوم بر حاشیہ)
ص۱۸۰ پر لکھتے ہیں کہ — یہ معلوم نہ ہوسکا کہ کل کتنے غازی شہید ہوئے۔
ص۱۸۳ پر طرف ثانی کے مقتولوں کی تعداد سے اپنی لاعلمی کا اظہار فرمایا ہے۔
ص۱۸۴ پر ہزارہ گزیٹیر کی بیان کردہ تاریخ کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "نہ غازیوں کو شکست ہوئی نہ ایک ایک غازی کٹا"۔

میں چاہتا ہوں کہ تاریخ تناولیاں سے اس جنگ کا حال بقدر ضرورت نقل کردوں۔
تاریخ تناولیاں سید مراد علی بن عنایت علی متوطن قدیم علی گڈھ، منشی سرحد چوکی دربند ضلع ہزارہ کی تالیف ہے، مؤلف ہر ۲ ۱۸۸۱ء میں سرحد علاقہ تنول پر مامور کیا گیا تھا اس نے عمر رسیدہ اشخاص کی زبانی جنگ تناولیاں کے حالات سن سن کر ایک مختصر سی کتاب کی شکل میں ۱۸۸۴ء میں ان کو مرتب کیا اور اسی سن میں مطبع کوہ نور پنجاب میں چھپکر یہ کتاب شائع ہوئی کتاب کی

عبارت مسجع ومقفیٰ اور پر تکلف ہے، خود مؤلف سرکار دولتمدار (انگریز) کا انتہائی خیر خواہ ہے۔ اسی بنا پر مجاہدین کا ادب واحترام اس کے پیش نظر نہیں، جگہ جگہ غازیوں خصوصاً حضرت سید شہیدؒ کے تذکرے میں گستاخی کا لہجہ اختیار کیا ہے ۔۔۔ پھر بھی تناولیوں سے متعلق واقعات کا اندازہ اس کتاب سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

یہ کتاب چہار باب پر مشتمل ہے

جنگ پائندہ خاں کا حال اس طرح شروع کرتا ہے

راویانِ معتبر بچشم دیدہ نقل کرتے ہیں کہ ۱۸۳۰ء میں خلیفہ سید احمد نے ..... یار محمد خاں حاکم پشاور و کوہاٹ برادر دوست محمد خاں والی کابل کو بہ پشت گری لشکر غازیان شکست دی اور ملک پشاور و کوہاٹ پر قبضہ کر کے اپنے تھانہ جات مقرر کیے اور بہ لقب سید بادشاہ مشہور ہوا ..... (پھر جنگ انب کا تذکرہ کر کے لکھتا ہے) الغرض ملک تنول پر حکومت خلیفہ کی ایک چھ ماہی مع الخیر گذری اور معاملہ یعنی محصول ایک فصل کا خلیفہ نے وصول کیا، یہ حال دیکھ کر پائندہ خاں کا دم ناک میں آیا۔ سخت گھبرایا، ہر طرح ذہن لڑایا، کچھ نہ بن آیا، آخر ایک عجز آمیز خط بطلب کمک سردار ہری سنگھ کے نام جو اس وقت بخوف ..... خلیفہ احمد مع لشکر قلعہ مانسہرہ میں مقیم تھا، ارسال کیا۔ (اس کے بعد چند شعر ہیں) جب یہ خط سردار کی نظر سے گذرا کہ گرگ باراں دیدہ تھا، اول جمیع پہلو اس نے بتامل تمام سوچے، یہاں تک کہ رائے متین نے یوں مشورہ دیا کہ خلیفہ سید احمد اور پائندہ خاں اپنے دونوں دشمن ہیں اور خلیفہ ملک تنول کو فتح کر چکا ہے۔ آئندہ ملک پکھلی میں ہاتھ ڈالے گا، ملک ستانی کا حوصلہ نکالے گا، پائندہ خاں کو کمک دے کر خلیفہ سے لڑوانا عین مصلحت اور محض صلاح وقت ہے، بہر حال ایک نہ ایک دشمن نابود ہو گا، ہر طرح اپنا سود ہو گا .....

..... نشیب و فراز سوچ سمجھ کر جواب لکھوایا ؎

نہیں ہے کمک سے مجھے انحراف	ولے بات سن لے مری صاف صاف
کہ اپنے جہاں داد فرزند کو	یہاں بھیجدے مدتِ چند کو
برسم گرو وہ رہے میرے پاس	کہ ہم تم رہیں روز و شب بے ہراس
یقیں جاننا جب وہ آیا یہاں	اسی وقت کردوں گا لشکر رواں

پسر کو نہ بھیجا گر اے نامدار
تو پھر کس کی فوج اور کہاں اعتبار

سوائے اس کے پرگنہ پھلڑہ کا جس پہ ہندستانی مجاہدین قابض ہیں بذات خاص لڑ بھڑ کے خالی کرا دوں گا۔ قصہ کوتاہ بقول صاحب الغرض مجنون۔ تنگ آمد بجنگ آمد سردار موصوف نے اپنے فرزند دلبند جہاں داد خاں کو برہم گرو (گروی) سردار ہری سنگھ کی خدمت میں بھیجدیا۔ تب سردار مذکور نے دو پلٹن جنگی مع سامان جنگ پائندہ خاں کی مدد کو روانہ کیں اور خود مع سردار مہا سنگھ اور فوج کثیر سکھاں کے مانسہرہ سے پھلڑہ بارادہ جنگ ہندوستانیاں شتاشب راہ پیما ہوا، جب یہ خبر اس طرف پہونچی مولوی احمد علی اور انکے ہمراہی ہندوستانیوں نے بصواب دید سربلند خاں و مدد خاں و محمد عباس اتالیق گذر دریائے سرن پر ناکہ بندی کی عاقبت الامر اسی گذر پر دونوں لشکر ملاقی ہوئے اور طرفین سے خونریزی اور کشتن و کوشش بروئے کار آئی، ہندوستانیوں نے اندازہ شجاعت دو مرتبہ لشکر مہا سنگھ کو پسپا کر دیا اور کسی قدر جوان سکھوں کی طرف سے کام میں آئے اس واقعات کو دیکھ کر سردار ہری سنگھ سپہ سالار مہا سنگھ پر خشمناک اور بذات خود حملہ آور ہوا۔ بسبب ہجوم و غلبۂ سکھاں ہندوستانیوں کو کنارہ دریائے سرن سے ہٹنا پڑا۔ ایک صاف میدان میں سروں کو کف دست پر رکھکر گرم خریداریٔ جنس مرگ ہوئے اسوقت سربلند خاں اور سردار مدد خاں اور محمد عباس اتالیق نے مولوی احمد علی کو متفق اللفظ باصرار تمام سمجھایا۔ سمجھایا کہ مولانا آج جنگ بے رنگ ہو گیا جانے قضا کا کیا نیرنگ ہو عرصۂ حیات تنگ ہو بہتر یوں ہو کہ یہاں سے کنارہ کش ہو کر خلیفہ صاحب کی خدمت میں چلئے بعد صلاح و مشورہ باتفاق ہمدگر جیسا مناسب وقت ہوگا عمل میں آئیگا، احمد علی کے سر پر قضا کھیل رہی تھی صاف انکار کیا، مجبوراً تینوں ناصحوں نے مولوی سے ایک نوشتہ لکھوالیا تاکہ ان پر خون مولوی کی تہمت نہ آئے بلند کوہ پر چڑھ کر تماشہ دیکھتے رہے، سکھوں نے ہر چہار طرف سے ہندستانیوں کو گھیر لیا۔ طرفین دل کھول کر خوب لڑے دل کا بخار خوب نکالا۔ لشکر سکھاں پیادہ و سوار چار ہزار سے کم نہ تھا اور ہندوستانی بیچارے کل پانچسو آدمی باایں ہمہ قریب ایک ہزار سکھ کے کھیت رہے۔

ہندستانیوں کی کچھ نہ پوچھئے سب کے سب مع مولوی احمد علی کے زندگی سے سیر میدان میں ڈھیر ہوئے صرف دو ہندوستانی رامپور کے لڑکے نہایت چالاک و .... مثل (فیل) مست عرصۂ نام و ننگ میں جھومتے رہے جو سامنے آیا عدم کا رستہ بتایا (انکے بعد یہ دونوں بھی بہادری کے جوہر دکھا کر شہید ہو جاتے ہیں، خاصی تفصیل سے ان کی بہادری کو پیش کر کے آخر میں لکھتے ہیں،)

مولوی احمد علی کی قبر پھلڑہ میں ہے، سردار ہری سنگھ فتح کے جوش میں شادیانے بجوا کر اور اپنے مردوں کو گاڑ داب کر مانسہرہ واپس گیا۔ [از صفحہ ۴۷ تا ۵۲]

انوار العارفین مؤلف کی نظر سے نہیں گزری، اس کتاب میں صفحہ ۵۱۵ سے صفحہ ۵۲۲ تک حضرت سید صاحبؒ کا ذکر خیر ہے۔ صاحب انوار العارفین نے حضرت سید شہیدؒ اور حضرت مولانا شہیدؒ کو بچپن میں دیکھا ہو، چنانچہ لکھتے ہیں۔ "چوں در مراد آباد تشریف آوردند راقم خرد سال بود صور شمائل ایشاں و آنجناب در حفظ نماندہ" ایک جگہ حضرت سید احمد شہید کی تاثیر کا حال ان الفاظ میں لکھا ہے۔

"آنجناں ہمت باطن بر خاص و عام ریختند کہ مسلمان و یار ہندیاں برادر برادر را و پسر مادر و پدر را و پدر، پسر و دختر را و زوج زوجہ را گذاشتہ ہمراہ آنجناب شد"

ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ۷ صفر ۱۲۴۳ھ کو مسلمانان مراد آباد نے مبلغ تین ہزار ستتر روپے آٹھ آنے حضرت سید احمد شہیدؒ کی خدمت میں بطور ہنڈوی بھیجے تھے اور یہ سب سے پہلی ہنڈوی تھی جو ہندوستان سے پہونچی تھی، چنانچہ لکھتے ہیں۔ "از جواب خط ہنڈوی آنجناب معلوم گردید کہ اول ہنڈوی مسلمانان مراد آباد رسید۔"

انوار العارفین سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت سید شہیدؒ و مولانا شہیدؒ شاہجہانپور بھی تشریف لے گئے ہیں۔ اور یہ تشریف آوری غالباً اسی سفر میں ہوئی ہو جس میں دہلی سے وطن کی طرف مراجعت میں امروہہ مراد آباد رامپور وغیرہ تشریف لے گئے تھے۔ جناب خلیل احمد صاحب شاہجہانپوری کے ذکر میں تحریر فرماتے ہیں۔

"در آں زمانہ کہ جناب سید احمد از دہلی در شاہجہانپور تشریف بردند مولوی محمد اسمٰعیل و آنجناب برائے ملاقات ایشاں (خلیل احمد خاں) آمدند" الخ

آخر میں اتنا اور عرض کردوں کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کا امروہہ تشریف لانا بالکل معلوم نہ تھا اتفاق کی بات کتاب سید احمد شہیدؒ کے حاصل ہونے سے چند روز پیشتر میں دل ہی دل میں کہتا تھا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا قافلہ سب ہی جگہ گیا امروہہ نہ آیا اس پر افسوس بھی ہوتا تھا۔

اسی عرصہ میں جناب حکیم سید حسن مثنیٰ صاحب کی زبانی اتنا معلوم ہوا کہ حضرت مولانا شہیدؒ امروہہ تشریف لائے ہیں اور ان کے غالباً دو وعظ امروہے میں ہوئے ہیں جن میں ایک مسجد بصری بیگم میں ہوا اس وعظ میں نکاح بیوگان کی ترغیب تھی، اس وعظ کا امروہے میں بڑا چرچا ہوا۔ پھر کتاب سے یہ معلوم کرکے خوشی کی انتہا نہ رہی کہ حضرت سید احمد شہیدؒ قدس سرہ بھی امروہہ تشریف لائے تھے۔ فہرست شہداء میں امروہے کے بھی دو شہیدوں کا اندراج ہو۔ امروہے میں بالکل اس کا علم نہ تھا، مہر صاحب کی محنت و کاوش کی پھر داد دیتا ہوں کہ انھوں نے ایسے جزئیات تک کا کھوج لگایا ہے کہ ہر ایک کی دسترس وہاں تک نہیں ہو سکتی۔ سینکڑوں صفحات میں چند باتیں قابل اصلاح ہوں تو کوئی ایسی بات نہیں ہو۔ کتاب مجموعی حیثیت سے آب زر سے لکھنے کے قابل ہو۔ اللہ تعالےٰ مؤلف کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین ——

(بقیہ مضمون صفحہ ۴)

آئے تو چند نمائندہ حیثیت کے لوگ متعلقہ حکومت کے اعلیٰ ذمہ داروں سے ملیں یا ان کو کسی اور مناسب ذریعہ سے مطلع کریں اور ان کا ابتدائی جواب لیں، پھر ایک ضروری مدت کارروائی کے لئے دیں، اس مدت میں کوئی اقدام نہ ہو تو یاد دہانی کریں اور پوری طرح اتمام حجت کے بعد کوئی دوسرا قدم اٹھائیں۔

یہ طریقہ کار جب ہی چل سکتا ہے جب کہ بات عوام میں نہ لائی جائے۔ عوام میں لانے سے فائدہ کچھ نہیں نقصانات بہت ہیں جو حالیہ واقعہ میں خاص کر اتنے ظاہر ہو چکے کہ اب مزید اظہار کی حاجت بالکل نہیں اس سلسلہ کا ایک مزید نقصان جسے عام طور پر لوگ نہیں محسوس کر رہے ہیں حالانکہ وہ تمام نقصانات سے اہم ہے۔ یہ ہے کہ بار بار ایسی چیزوں کے علم میں آنے سے ناموس رسولؐ کے بارے میں مسلم عوام کا وہ تیز حس طبعی طور پر کمزور پڑ جائیگی جو بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔ اس سرمایہ کو بہت ہی آخری وقت میں اور کامیابی کے روشن امکانات دیکھ کر کام میں لانا چاہئے ورنہ موجودہ حالات میں اس کے ناکامیاب استعمال سے بہت ہی برے اثرات امت پر مرتب ہو سکتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کی عادت پڑ گئی ہے کہ وہ ایسے واقعات سب سے پہلے عوام کے علم میں لاتے ہیں وہ ان تجربات کے بعد بھی اپنی اس عادت کو ترک نہ کریں اس لئے اس بات کی کوشش ہونا چاہئے کہ عوام اس طرز عمل کی غلطی کو محسوس کر لیں اور ان لوگوں کی ہمت افزائی نہ کریں جو یہ غلط طرز عمل اختیار کرتے ہیں انھیں بتانا چاہئے کہ یہ طرز عمل اور تمام وجوہ سے غلط ہونے کے علاوہ قرآنی تعلیم کے بھی خلاف ہے، قرآن مجید میں اس عادت کو سخت غلط ٹھہرایا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے:-

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (سورہ نساء)	اور جب انھیں کسی خطرے یا اطمینان کی کوئی اطلاع ملتی ہے تو وہ اس کی تشہیر کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ اس قسم کی بات کو رسولؐ یا دوسرے ذمہ دار لوگوں کو پہنچا دیتے تو (بہتر تھا اس لئے کہ پھر) یہ بات ان کے

ایسے لوگوں کے علم میں آتی جو اس کی تہہ کو پہنچ سکتے اور اس پر صحیح رائے قائم کر سکتے۔

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ
اور ان کی دینی دعوت

(تالیف مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی)

یہ کتاب دراصل مولانا ممدوحؒ کی سوانح حیات ہے جس میں انکے ذاتی حالات اور سوانح کے علاوہ انکی مشہور دینی و اصلاحی دعوت کو بھی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے جو بلاشبہ اس دور کی نہایت وسیع اور گہری دینی و اصلاحی تحریک ہے۔ شروع میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کا مبسوط مقدمہ ہے جس میں کتاب و سنت کی روشنی میں انبیاء علیہم السلام کے اصول دعوت کی تشریح کر کے دکھلایا گیا ہے کہ اس دینی تحریک کو اسوۂ انبیاء سے کس درجہ مطابقت ہے۔

کتابت و طباعت اعلیٰ کاغذ نفیس

قیمت (عہ)

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ

(مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی)

آج مولانا مرحوم اس دنیا میں نہیں ہیں، لیکن اگر کوئی انھیں جاننا اور انکی باتیں اور ہدایتیں سننا چاہے تو حضرت مرحوم کے اس مجموعہ ملفوظات کا مطالعہ کرلے جو دین کے حقائق و معارف کا عجیب و غریب گنجینہ ہے۔

اس سے مولانا مرحوم کی دینی دعوت کی روح و حقیقت اسکے اصول و مقاصد اسکی گہرائیاں بھی معلوم ہوں گی اور یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ تفقہ فی الدین اور معرفت و یقین میں مولاناؒ کا مقام کتنا بلند تھا اور امت مسلمہ کے امراض کی مولانا نے کتنی صحیح تشخیص کی تھی۔

کاغذ، کتابت طباعت اعلیٰ

قیمت

ڈیڑھ روپیہ (عہ)

تصوف کیا ہے؟

اردو میں تصوف پر اچھی اچھی کتابیں شایع ہو چکی ہیں لیکن یہ کتاب اپنے اختصار کے ساتھ انصاف و تحقیق اور مباحث کے سلجھاؤ کے لحاظ سے یقیناً ممتاز ہے۔ اور ہمارا ذاتی تجربہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے اللہ کے سیکڑوں بندوں کے خیالات تصوف کے بارے میں صحیح ہوئے ہیں۔

یہ دراصل تصوف سے متعلق مقالات کا ایک مجموعہ ہے جن کے لکھنے والے مولانا محمد منظور صاحب نعمانی، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی، مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی ہیں۔

کاغذ، طباعت، بہترین

قیمت ایک روپیہ چار آنے (عہ)

مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ۱۳ تبلیغی تقریریں

جو ہندستان و پاکستان کے مختلف شہروں کے اہم تبلیغی اجتماعات میں کی گئی تھیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اس تبلیغی جد و جہد کا کیا مقصد و نصب العین اور اس کے کیا اصول ہیں اور مسلمانوں کے لیے اسکا پیام کیا ہے اور دنیا اور آخرت میں اس سے کن نتائج کی توقع ہے ـــــ اس دینی دعوت و تحریک کے بارے میں ناواقفی کی وجہ سے بعض حلقوں میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں ان سب کا جواب بھی ان تقریروں میں مل جاتا ہے ان میں سے بعض تقریروں کے مخاطب غیر مسلم حضرات بھی ہیں۔ ان تقریروں سے یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں دین کی دعوت و تبلیغ کا انداز کیا ہونا چاہیے۔ ۲۰۵ صفحات کاغذ معمولی مجلد مع گرد پوش قیمت

امام ولی اللہ دہلویؒ اور ان کا فلسفہ

(از حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ)

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے علوم و معارف اور ان کے فلسفہ پر نہایت گہرا علمی مقالہ ہے اور ان کی علمی خصوصیات اور ان کے فلسفہ کی بنیادوں کو سمجھنے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے جس میں پانچ باب ہیں پہلے باب میں شاہ صاحب کی تعلیم و تربیت اور حرمین کے اساتذہ و مشائخ سے استفادہ و تحصیل کا بیان ہے دوسرے اور تیسرے باب میں علوم قرآن و حدیث میں انکی تجدیدات اور خاص نظریات کی تشریح کی گئی ہے اور چوتھے اور پانچویں باب میں علی الترتیب فقہ اور تصوف کے بارے میں ان کے خاص مجتہدانہ نظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن صرف اہل علم اور عربی داں حضرات کے مطالعہ کے لائق ہے۔

کاغذ سفید چکنا، قیمت: ایک روپیہ (عہ)

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

Regd No (A-353)

کلمہ طیبہ کی حقیقت

از افادات مولانا محمد منظور نعمانی

اس رسالہ میں اسلام کے کلمۂ دعوت لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ
رَّسُولُ اللہ کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ دلنشین اور مؤثر انداز
میں کی گئی ہے کہ سطر سطر کے مطالعہ سے نور یقین میں اضافہ
ہوتا ہے اور ایمان تازہ ہوتا ہے، اردو زبان میں کم از کم ہمارے
علم میں توحید و رسالت کے متعلق کوئی اور ایسا محققانہ اور جامع
رسالہ موجود نہیں ہے جس سے عقل اور جذبات اور دل و دماغ
یکساں طور پر متاثر ہوں ——— تازہ اڈیشن — قیمت ۸؍

ملنے کا پتہ: کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ

اسلام کیا ہے

تالیف مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان لکھنؤ

مصنف نے ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں کی دینی ضرورت اور خاص وقتی تقاضوں کو
سامنے رکھ کر توجہ اور محنت سے یہ کتاب لکھی ہے، اسلامی تعلیمات پر ایسی مفید اور جامع کتاب اردو
زبان میں کم از کم ہمارے علم میں نہیں ہے، اسلام کے متعلق ضروری واقفیت حاصل کرنے کے لیے ہی
نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کتاب کا مطالعہ اور اس پر عمل ان شاء اللہ کافی
ہے، اسلام کی ضروری تعلیمات کو بیس سبقوں کی شکل میں مرتب کر کے اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے
ہر سبق اپنے موضوع پر ایک مستقل مضمون اور مؤثر خطبہ ہے، زبان کو آسان بنانے کی خاص
کوشش کی گئی ہے کہ بے پڑھے لوگ اور کم عمر بچے بھی آسانی سے سمجھ سکیں، خود پڑھ کر ایمان تازہ
کیجیے، بیوی بچوں کو پڑھا کر انھیں پکا اور کامل مسلمان بنائیے، مسجدوں اور مجمعوں میں سنا کر
تبلیغ کا حق ادا کیجیے، اور مسلمانوں میں ایمانی روح اور دینی زندگی پیدا کرنے کا بے انتہا ثواب
حاصل کیجیے، اور اگر آپ کا کوئی غیر مسلم دوست اسلام کو جاننا اور سمجھنا چاہے تو اس کے ہاتھ
میں بھی بے تکلف یہی کتاب دیجیے ...... کاغذ و طباعت اعلیٰ

ملنے کا پتہ: کتب خانہ الفرقان، گوئن روڈ لکھنؤ

قیمت مجلد دو روپیہ آٹھ آنے
اور بلا جلد کاغذ معمولی ایک روپیہ آٹھ آنے

ماہنامہ

الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے

لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے اور وہ اصل یہ

اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی

اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی

زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم اس کا

عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فاطر السموات والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرۃ

توفنی مسلما والحقنی بالصالحین

"ادارۂ الفرقان"

مدیر و مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی تالیفات

تاریخ دعوت و عزیمت (جلد اوّل)

ناظرین الفرقان اس کتاب کی اہمیت سے واقف ہیں یہ صرف فاضل مصنف کا شاہکار ہی نہیں ہے بلکہ اس کو اس دور کی عظیم ترین کتاب کہا جا سکتا ہے ابھی صرف پہلی جلد شائع ہوئی ہے۔ قیمت سے (/ ۴ /)

سلسلۂ تجدید دین کی چار کتابیں

یعنی حکیم الامت حضرت تھانوی کی دینی اصلاحات و تجدیدات نئے قالب اور نئی زبان میں۔ از مولانا عبد الباری ندوی

ان کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اصل دین کیا ہے اور ہم نے اس سے بے تعلقی اختیار کرکے اپنے کو اس کی برکتوں اور خدائی رحمتوں سے کس قدر محروم کر لیا ہے۔

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر

اس کتاب ... کی تصنیفوں جیسی ہے جو مردہ قوموں کو زندہ کر دیتی ہیں ... عربی اڈیشن مصر ... ہو کر ... علمی اور اسلامی حلقوں کو اس کتاب سے زیادہ دور حاضر کی کسی تصنیف نے متاثر نہیں کیا۔ قیمت مجلد للعہ (۴ / ۹ /)

اصلاحیات

مولانا کے چند منتخب اصلاحی مضامین اور دعوتی تقریروں کا مجموعہ۔ ہر شخص کے پڑھنے اور سننے کے لائق۔ قیمت (۱ / ۸ /)

دو ہفتے ترکی میں

مولانا ندوی نے اسلامی ممالک کے اپنے تازہ دورے میں دو ہفتے ترکی میں بھی گزارے اور خالص اسلامی نقطۂ نظر سے ترکی کو جاننے سمجھنے اور صحیح حالات و امکانات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ مولانا نے اس سفر میں پابندی سے روزنامچہ لکھا تھا جو کتابی شکل میں آ گیا ہے۔ تاثرات اور معلومات و مشاہدات کا آئینہ ہے۔ ہر صاحب ذوق مسلمان سے اس کے مطالعہ کی سفارش کی جا سکتی ہے۔

قیمت مجلد (۱ / ۸ /)

(جلد اوّل)

معارف الحدیث

تالیف: مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان لکھنؤ

یعنی۔ احادیث نبوی کا ایک جدید مجموعہ اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ، جو دور حاضر کے تعلیمیافتہ مسلمانوں کی ذہنی اور فکری سطح کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے اس کتاب میں کیا ہے اور اس کی کیا خصوصیات ہیں؟ —— اس کا صحیح اندازہ تو مطالعہ سے ہی ہو سکتا ہے، پھر بھی یہ ایک خصوصیت یہاں قابل ذکر ہے کہ احادیث نبوی کی جو اصل غرض و غایت اور روح ہے (یعنی ارشاد و ہدایت اور اصلاح و تربیت) مولف نے پوری کوشش کی ہے کہ یہی اس کتاب کی بھی رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے اصل مخاطبین (صحابہ کرام) پر جو اثرات ان ارشادات کو سن کر پڑتے تھے ان کا کوئی عکس اس کتاب کے ناظرین پر بھی پڑے —— اسی کے ساتھ ہر حدیث سے متعلق ان سوالات کے پورے تشفی بخش علمی و تحقیقی جوابات بھی دیے گئے ہیں جو آج کل کے بگڑے ہوئے ذہنوں میں احادیث نبوی کے متعلق پیدا ہوتے ہیں۔

شروع میں مولف کے دیباچہ کے علاوہ استاذ حدیث حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب اعظمی کا ایک بسیط محققانہ مقدمہ بھی ہے جس میں صرف قرآن مجید سے بتلایا گیا ہے کہ دین میں حدیث و سنت کا کیا مقام ہے اور جو لوگ حدیث و سنت کے حجت دینی ہونے کے منکر ہیں وہ قرآن حکیم کے کتنے نصوص و بینات سے منحرف ہیں —— یہ مقدمہ اگرچہ صرف ۲۲ صفحے ہے لیکن اپنے وزن کے لحاظ سے ضخیم کتابوں پر بھاری ہے اور منکرین حدیث پر اللہ کی حجت ہے —— کتابت و طباعت کا معیار بھی خاصا اعلیٰ ہے

قیمت غیر مجلد سے (3/12/-) مجلد للعہ (۴ / ۸ /)

(۱) جامع المجددین

اس میں خصوصاً اعمال ظاہری کی صلاح و اصلاح پر بحث ہے جو شریعت کا خاص موضوع ہے۔

قیمت مجلد صہ (5/-/-)

(۲) تجدید تصوف و سلوک

اس کا موضوع انسانوں کی قلبی باطنی یا اخلاقی اصلاح ہے اس میں تصوف کے متعلق موافقین و مخالفین کی تمام نئی پرانی غلطیوں اور غلط فہمیوں کو دور کر کے بتلایا گیا ہے کہ تصوف دراصل نام ہے عین اسلام بلکہ کمال اسلام کا

قیمت مجلد صہ (5/-/-)

(۳) تجدید تعلیم و تبلیغ

اس میں دین کی تعلیم و تبلیغ کا مکمل نظام بتلایا گیا ہے۔

قیمت مجلد سے (3/-/-)

(۴) تجدید معاشیات

معاشیات کے موضوع پر خالص ایمانی نقطۂ نظر سے اس دور کی یہ واحد تصنیف ہے جس میں معاشیات کے نو پید نظریوں اور نعروں سے مرعوب ہوئے بغیر بلکہ ان کو محض فریب ثابت کرتے ہوئے رزق و معاش سے متعلق خالص اسلامی تعلیم کو پیش کیا گیا ہے

قیمت مجلد (/ ۸ / ۵)

ملنے کا پتہ کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

الفرقان

لکھنؤ

ماہنامہ

شرح چندہ

ہندستان میں سالانہ .... عشر

پاکستان میں سالانہ .... ے

ششماہی (ہر دو) ے

اعزازی خریداروں سے

سالانہ .... عشر

غیر ممالک سے

سالانہ دس شلنگ

قیمت فی کاپی آٹھ آنے ۸ر

جلد ۲۴ | بابت ماہ ربیع الثانی ۱۳۷۶ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۵۶ء | نمبر (۴)

اگر اس دائرہ میں سُرخ نشان لگا ہو! تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی۔ پی ارسال کیا جائے گا۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۲۰ر تاریخ تک پہونچ جانا چاہیے۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیج دیں۔

تاریخ اشاعت:۔ رسالہ ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو روانہ کیا جاتا ہے اگر ۳۰ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں اگلے رسالہ کے ساتھ مکرر بھیجدیا جائے گا اس سے پہلے مطلوب ہو تو ۲ر کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں۔

مقام اشاعت:۔ دفتر ماہنامہ "الفرقان" کچہری روڈ۔ لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

نگاہِ اوّلیں

گذشتہ ماہ، ان صفحات میں، سیرت کے جلسوں کے سلسلہ میں صرف ایک شہر لکھنؤ کی مثال دیتے ہوئے لکھا گیا تھا کہ نہایت محتاط اندازہ میں یہاں کے مسلمانوں کا پچاس ساٹھ ہزار روپیہ ہر سال اس مد میں ضرور صرف ہو جاتا ہے ——— ابھی ان حروف کی سیاہی بھی شاید خشک نہ ہونے پائی تھی کہ ۱۹ دسمبر کے (مقامی) "قومی آواز" میں ایک باخبر مقامی ذریعہ کے حوالہ سے پورے وثوق کے ساتھ یہ تفصیلی رپورٹ شائع ہوئی کہ:-

"امسال شہر میں دو ڈھائی مہینے کے اندر تقریباً ۱۲ سو محافل میلاد النبیؐ، سیرت کے جلسے اور مشاعرے منعقد ہو چکے ہیں۔

ان تقاریب سے لکھنؤ میونسپلٹی کو لاؤڈ اسپیکروں کے پرمٹ جاری کرنے کے سلسلہ میں تقریباً چھ ہزار روپیہ کی آمدنی ہوئی۔ اور اسی طرح یو۔پی الیکٹرک سپلائی کمپنی کو ان محفلوں میں بجلی سپلائی کرنے کے سلسلے میں کم از کم پچاس، ساٹھ ہزار روپیہ سے زیادہ کی آمدنی ہوئی۔ اور ابھی تک ان تقریبوں کا سلسلہ جاری ہے۔" (ا، ن، س)

معلوم ہوا ہو کہ ہمارا اندازہ تو اس سلسلے کے اخراجات کی طرف ایک کے واقعی خرچے سے بھی کچھ کم ہی تھا ہم تمام اخراجات کو پچاس ساٹھ ہزار میں محدود کر رہے تھے وہاں صرف بجلی کا خرچ پچاس ساٹھ ہزار سے زیادہ نکلا۔ اور اس بجلی کے خرچ میں بھی صرف کرنٹ کا خرچ شامل ہے۔ باقی، یہ وہ کنٹرکٹرس جنھوں نے ان محافل میں برقی آرائش کا انتظام کیا۔ ہزاروں قمقمے اور جھاڑ فانوس لاکر سجائے، انھوں نے اپنی انتظامی محنت اور متعلقہ سامان کی سپلائی کے کیا چارجیز (charges) کیے اس سب کا حساب اس "پچاس ساٹھ ہزار سے زیادہ" میں شامل نہیں ہو۔ اب آپ خود کوئی اندازہ کر لیجیے کہ جب ساٹھ ستر ہزار کے درمیان تو صرف میونسپلٹی اور الیکٹرک سپلائی کمپنی کی نذر ہو گئے تو باقی مصارف کا میزان کیا ہو گا؟ ——— بارہ سو تک تو گنتی ان محفلوں کی پہونچ چکی ہے۔ اور سلسلہ ابھی جاری ہے ——— تو کم و بیش ڈیڑھ ہزار تو آپ فرض کر ہی سکتے ہیں۔

ڈیڑھ ہزار جلسوں اور محفلوں کے لیے اندازہ کیجیے کہ

(۱) برقی آرائش کا سامان سپلائی کرنے اور اُسے سجانے والے کنٹریکٹروں نے کیا چارج کیا ہوگا؟

(۲) فرش فروش، دریاں، شامیانے اور قالین وغیرہ سپلائی کرنے والے کنٹریکٹروں نے مجموعی طور پر کم سے کم کیا وصول کیا ہوگا؟

(۳) لاؤڈ اسپیکروں کا کرایہ ۲۵ نشستوں اور ۱۵ اعلانات کے لیے، کیا رہا ہوگا؟

(۴) بعض مشاعروں میں جو بیرونی شعرائے کرام اور دوسرے معزز مہمان آتے ہیں۔ ان کی فیسیں، مصارف سفر اور میزبانی کے اخراجات کل ملکر کتنے ہوں گے؟۔

(۵) اور ان بعض محفلوں کی پبلیسٹی کے لیے جو خاصے شاندار پیمانے پر چھوٹے بڑے پوسٹروں اور ہینڈبلوں کا اہتمام کیا جاتا ہو۔ اس کا خرچ تو رہا ہی جا رہا ہو ــــ یہ تو موٹی موٹی مدیں ہیں! اور ایک مد متفرقات کی بھی ہوا کرتی ہے، اس کا بھی کچھ حق رکھیئے!ــــ اِن سب اخراجات کا میزان اگر اوپر کے ساتھ ستر ہزار کے ساتھ ملا دیا جائے تو کیا مجموعی میزان ایک لاکھ سے کسی طرح بھی کم ہوگا؟۔

اب ذرا غور فرمایئے کہ جب صرف ایک شہر کے ان جلسوں اور مشاعروں پر جب سالانہ کم از کم ایک لاکھ خرچ ہو رہا ہے تو کل ہندستان میں اس مد کے اخراجات کا کل میزان کیا بیٹھے گا؟ــــ نہ سہی ہر شہر میں اس پیمانہ پر، لیکن کچھ نہ کچھ تو ہوتا ہی ہے!۔

اور اس لاکھوں روپے کے صرف کا حاصل کیا ہوتا ہے؟ــــ کتنے لوگوں کے دلوں میں ایمان کی روشنی داخل ہوتی ہے؟ کتنوں کا سویا ہوا ایمان جاگ اٹھتا ہے؟ کتنوں میں اُسوۂ رسول کا عشق پیدا ہوتا ہے؟ کتنے سیرت رسول کو رہنمائے حیات بناتے ہیں؟ اور کتنوں کی زندگی میں دینی رجحان رونما ہوتا ہے؟۔ کم از کم لکھنؤ کی حد تک تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہاں جو محفل جتنے بڑے پیمانہ کی ہوتی ہے، حاصل کے اعتبار سے وہ اتنی ہی صفر۔ یہاں جو محفلِ میلاد سب سے زیادہ کثیر المصارف ہوتی ہے، وہ ایک خالص ادبی انجمن کے زیر اہتمام شروع ہوئی ہے، اور ــــ انجمن کے بعض اراکین سے کسی درجہ کے ذاتی روابط کی بنا پر اگرچہ ہم پر بیحد شاق ہے اور ان کے لیے بھی خلاف توقع مگر ــــ ہم یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ شعر و ادب کی رنگین وادیوں میں رہنے والوں نے یہ ایک بڑے پیمانہ پر اپنی ادبی تفریح کا سالانہ مشغلہ نکالا ہو اور اس کا خرچ عام مسلمانوں کی جیبوں پر ڈالنے کے لیے اسے محفلِ میلاد کا رنگ دیدیا ہے۔ (اور سیرت کے جلسوں کو ایک ایسی رنگین بدعت سے آشنا کر دیا ہے جس کے بعد ان جلسوں سے رتی برابر دینی فائدہ کی توقع بھی عبث ہو)

اس محفل میں پہلے سیرت پر دو ایک تقریریں ہوتی ہیں۔ اور اس کے بعد مشاعرہ شروع ہوتا ہے۔ جو صبح صادق تک چلتا ہے۔ شہر بھر کے جتنے شاعر و متشاعر ہیں وہ سب مشقِ سخن فرماتے، اور داد پانے کے لیے تشریف لاتے ہیں کلام ضرور نعتیہ ہوتا ہے ـــــ مگر بس یہ کہ

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
ایک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

اور سننے والوں کی بھی نظر (الا ماشاء اللہ) بس حسنِ شعری اور خوش گلوئی پر ہوتی ہے۔ چنانچہ پوری محفل پر "سامعہ نوازی" اور اس "نوازش" سے "لطف و نشاط" اندوزی کی ایک فضا طاری ہو جاتی ہے۔ اور اٹھتے اٹھتے، یہ مجمع بیانِ سیرت اور نعت و منقبت کے سارے تقاضوں کو غرقِ جامِ کیف و نشاط کر کے اٹھتا ہے ـــــ اور جبکہ راہ میں مؤذن شہادتِ ان لا الٰہ الا اللہ وان محمد رسول اللہ کا تقاضائے صبحگاہی یاد دلاتا ہوا ملتا ہے تو سوائے چند ان خوش نصیبوں کے جو عمر بھر کی پابندی سے اس صدا پر قدم اٹھانے کے عادی ہو گئے ہیں، باقی سب "دلدادگانِ محفلِ رسالت" قضائے فریضہ استراحت کے لیے قدم بڑھائے چلے جاتے ہیں۔ اور اس محفل کا اگر انھیں کچھ یاد رہتا ہے تو بس یہ کہ فلاں نے کیسے پڑھا؟

یہ ہو اس ہزاروں روپے کے صرف کا حاصل!

ہمارا روئے سخن اس وقت بیانِ سیرت (نہ کہ بیانِ ولادت!) کی سادہ، وبے مشاعرہ مجلسوں کی طرف نہیں ہو۔ ہماری گفتگو یہاں صرف اسی قسم کی محفلوں سے متعلق ہے، جن کا حاصل بجز لطف انجمن آرائی اور غفلت افزائی کچھ نہیں۔ اور جن کا خرچ بے پناہ! ـــــ اور اب انھیں کا رواج عام ہو رہا ہو۔ لکھنؤ میں تو دیکھتے دیکھتے یہ رواج جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا ہو۔ اور ایک سال کی محافلِ سیرت کی جو ڈیڑھ ہزار کے قریب گنتی، صرف اسی بدعتِ خوش رنگ کا طفیل ہے ـــــ لذتِ شعر و نغمہ ہی کی اس تازہ لت نے محافلِ سیرت کا یہ غیر معمولی رجحان پیدا کیا ہے۔ ورنہ ان دو تین سال میں مسلمانانِ شہر کی ذاتِ رسالت سے وابستگی میں کوئی غیر معمولی اضافہ نہیں ہو گیا ہے! ـــــ اور لکھنؤ کی رہنمائی میں یوپی کے بعض دوسرے شہر بھی اسی رواج کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ اور قریب ہے کہ ہر جگہ کے طالبانِ لذتِ شعر و نغمہ و لذتِ انجمن آرائی، اپنے لکھنوی بھائیوں کی طرح اپنے اس ذوق کی تسکین کے لیے یہی راستہ (باقی ۵۵ پر)

پیغمبرِ اسلام اور انسانی اخلاق

(از ڈاکٹر محمد آصف صاحب قدوائی، ایم اے، پی، ایچ، ڈی)

[سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر ڈاکٹر صاحب کے چند مقالے الفرقان میں پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مقالہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔]

إِنَّكَ لَعَلىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ

(بے شک تم اخلاق کے بڑے درجہ پر ہو)

انسان معاشرہ میں پیدا ہوتا ہے اور اسی میں جیتا اور مرتا ہے۔ ارسطو نے اُسے "معاشرتی جانور" کہا ہے۔ ماں کے آغوش سے لے کر لحد کے آغوش تک اس کی زندگی معاشرہ کے علاقوں اور رابطوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ ان علاقوں اور رابطوں کی اُسے ہر وقت ضرورت ہے، یہ اس کی بشریت کے اجزا ہیں۔ ان کو توڑ کر وہ ایک انسان کی طرح زندگی نہیں بسر کر سکتا ہے۔ ارسطو ہی کا قول ہے کہ "جسے معاشرہ کی حاجت نہ ہو وہ یا خدا ہے یا درندہ"۔ انسان نہیں۔

ہماری اس خصوصیت نے ہمارے وجود کے گرد حقوق اور فرائض کا ایک وسیع جال بُن دیا ہے ہم پر ہمارے گھر کے حقوق ہیں، ہمارے محلّہ کے حقوق ہیں، ہمارے شہر، ہمارے ملک اور کل دنیا کے حقوق ہیں اور ان سب پر ہمارا حق ہے، جو شخص ان حقوق اور ذمہ داریوں کو برتنے میں جتنا زیادہ کامیاب ہو اُسے اتنا ہی زیادہ شریف، شائستہ اور معیاری شہری سمجھا جاتا ہے۔

ایک فرد اور دوسرے فرد یا افراد اور معاشرہ کے رشتوں اور تعلقات کو عدل و انصاف اور ہمدردی اور سلامتی کی بنیادوں پر رکھنے کے لیے دو چیزیں ہیں، قانون اور اخلاق، ہماری نجی اور

اجتماعی زندگی کی عافیت اور اُس کے صاف ستھرے پن کا انحصار انھیں پر ہے۔

دُنیا کے سارے مذہبوں نے اپنی بنیاد اخلاق پر رکھی ہے، اسلام نے تو ایک طور پر اخلاق کی اہمیت کو عبادت سے بھی بڑھا دیا ہے، اور جبکہ کفر و شرک کے علاوہ ہر گناہ کو خدا کے نزدیک معافی کے قابل قرار دیا ہے، باہم انسانوں کے اخلاقی فرائض کی کوتاہی کی معافی ان بندوں کے ہاتھ میں رکھی ہے جن کے حق میں وہ ظلم ہوا ہو۔

اسلام اخلاقِ حسنہ کو ایمان کی پہچان اور اس کے نتائج و ثمرات بتاتا ہے۔ جس مسلمان کے اخلاق جتنے اچھے ہوں اتنا ہی اُس کا ایمان مضبوط اور اس کی عبادت مقبول ہوگی۔ لیکن اگر کوئی شخص ایمان کا تو دعویدار ہو اور خدا کی عبادت کا بھی اہتمام رکھتا ہو مگر اخلاق کی دولت سے محروم ہو اور اہل و عیال، اعزہ و اقربا، دوست و احباب، پڑوسی، اہلِ وطن اور ساری انسانی برادری حتیٰ کہ جانوروں تک سے جو اس کا تعلق ہے اُسے بحسن و خوبی انجام نہ دیتا ہو تو یہ عملی ثبوت اس بات کا ہوگا کہ اس کا ایمان، اس کی زبان سے اُتر کر اس کے نفس کی گہرائیوں تک نہیں پہونچا ہو گویا کہ ہمارے اخلاق، ہماری ایمانی حالت کی کسوٹی ہیں۔ ہم اپنے اخلاق کے آئینہ میں اپنی روح کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں اس طرح کے مضامین بکثرت آئے ہیں۔

"مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہو۔"

"اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا بندہ وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔"

"لوگوں کو قدرتِ الٰہی کی طرف سے جو چیزیں عطا ہوئی ہیں اُن میں سب سے بہتر اچھے اخلاق ہیں۔"

"تم میں سب سے زیادہ پیارے اور مجھ سے سب سے قریب وہ ہیں جو تم میں خوش خُلق ہیں، اور مجھے ناپسند اور قیامت میں مجھ سے دور وہ ہوں گے جو تم میں بد اخلاق ہوں۔"

"جس کی نماز اس کو بُرائی اور بدی سے باز نہ رکھے اس کی نماز نماز ہی

نہیں۔"

"میں حسنِ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔"

"اچھے خلق ہی کو اسلام کہتے ہیں۔"

حسنِ اخلاق کے پایہ اور مرتبہ کا اندازہ اوپر کی ان احادیث سے ہو گیا ہو گا۔ اچھے اخلاق ایمان کے لوازم ہی نہیں بلکہ وہ انسان کو اُن بلندیوں تک بھی پہونچا دیتے ہیں جن تک وہ کثرتِ عبادت کے ذریعہ پہونچ سکتا ہے ۔ ارشادِ نبویؐ ہے۔

"انسان حسنِ خلق سے وہ درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر نماز پڑھنے سے ملتا ہے۔"

"قیامت کی ترازو میں حسنِ خلق سے زیادہ بھاری اور چیز نہ ہوگی۔"

"اچھے اخلاق والا دُنیا اور آخرت کی نیکیاں لے گیا۔"

"آنحضرت صلعم کے عہدِ مبارک میں دو صحابی بیویاں تھیں۔ ایک دن بھر روزہ رکھتیں اور رات بھر عبادت کرتیں، صدقہ دیتیں، مگر زباں دراز ایسی تھیں کہ پڑوسیوں کے دل چھلنی کیے رہتیں، دوسری بیوی صرف فرض نماز پڑھتیں اور غریبوں کو کپڑے بانٹ دیا کرتیں۔ مگر ایذا اُن سے کسی کو نہ پہونچتی، حضورؐ سے ان دونوں کی بابت پوچھا گیا تو آپ نے پہلی کی بابت فرمایا کہ اس میں کوئی نیکی نہیں، وہ اپنی بدخلقی کی سزا بھگتے گی۔ اور دوسری کی بابت فرمایا کہ وہ جنتی ہوگی۔"

اسلام کی دوسری تعلیمات کی طرح اس کی اخلاقی تعلیم بھی حیرت انگیز طریقہ پر جامع اور مکمل ہے، اور دوسری صفت اس کی یہ ہے کہ اسلام نے اخلاقِ حسنہ کی غرض و غایت تمام تر خدا کی خوشنودی ٹھہرائی ہے، اس طرح اچھے اور پاکیزہ اخلاقی خصائل و افعال کی نوعیت بھی عبادت کی ہو جاتی ہے، اور وہ ہر قسم کی دُنیوی، نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک اور بلند ہو جاتے ہیں اسلامی نقطۂ نظر سے اچھے اور بُرے کاموں کا مدار نیت یعنی قلبی ارادہ یا کیفیت پر ہے، نتیجہ اتنی اہم چیز نہیں ہے، ذاتی نفع، ریاکاری، نمائش، فخر، لالچ، خوشامد اور اس قبیل کے دوسرے محرکات اگر کسی بظاہر اچھے سے اچھے کام کے پیچھے ہوں تو اس میں کوئی خوبی نہ رہے گی۔ نہ اللہ کی نظر میں اور

نہ ہماری آپ کی نظروں میں ——— اور اللہ کی نظر میں تو نیکی کے وہ کام بھی جو انسان اپنے ضمیر کی تسکین یا روحانی مسرت یا وجدان یا افادۂ عام کی غرض سے انجام دے اور اس کے حکم کی حیثیت اور آخرت کے اجر و ثواب کی نیت اس میں ملحوظ نہ رکھے بے وقعت اور بے قیمت ہی رہیں گے۔

انسانی فطرت کی رنگارنگی، طبائع کا تنوع اور ایک ہی واقعہ یا حالات سے مختلف لوگوں کے متاثر ہونے کی کیفیات میں جو اختلاف ملتا ہے اُس کا اقتضا یہ ہے کہ ہمارا نظام اخلاق ایسا متوازن اور معتدل ہو کہ اس میں نرم و گرم، جمالی و جلالی دونوں قسم کی قوتوں کا مناسب امتزاج پایا جاتا ہو وہ ایک طرف اگر فولاد کی صلابت رکھتا ہو تو دوسری طرف ماں کے دل کا گداز بھی۔ وہ طاقت اور سختی کا بھی مظہر ہو اور مسکنت اور عاجزی کا بھی، کوہ گراں بھی ہو اور آبِ رواں بھی، شعلہ بھی ہو اور شبنم بھی؛ نہ وہ شروع سے آخر تک مسیحیت کی انفعالیت اور عاجزی ہی کی تشریح ہو اور نہ شریعتِ موسوی کی قانونیت اور سختی ہی کی توضیح، بلکہ ان دونوں کو اپنے آغوش میں لے کر ایک ایسا توسط اور توازن پیدا کرے کہ امن و عدل، بلند ہمتی و استقلال، قوت و حرکت، آزادی و حق گوئی، عزم و وقار، عاجزی و فروتنی، رحم و عفو، حلم و بردباری، صبر و سکون، رفاقت و محبت، استغنیٰ، قناعت، توکل، سخاوت، عصمت، حیا، شجاعت، مردانگی، سیر چشمی، بلند نظری، غرض تمام انسانی اوصاف اس میں نمایاں ہوں۔ جو غضب و شہوت کی قوتوں کا استیصال نہ کرے، کیونکہ اس طرح یہ دُنیا ایک وسیع قبرستان ہو کر رہ جائے گی۔ اور نہ ان کو ہوا ہی دے کہ ہم سب درندوں کی سطح پر اُتر آئیں۔ بلکہ ان کی صحیح تربیت کا انتظام کرے۔ اور انھیں افراط و تفریط کا شکار نہ ہونے دے۔ پیروانِ مسیحیت نے غضبی اور شہوانی قوتوں کو بنفسہٖ بُرا قرار دے کر ایک بڑی غلطی کی ہے نطشے نے اسی لیے مسیحی فلسفۂ اخلاق سے منھ پھیر لیا تھا۔ جب تک پروٹسٹنزم نے اس رہبانی اخلاقیت کے خلاف بغاوت کر کے نفس کے اُن اجزا کو تمدن اور اخلاق میں مناسب جگہ نہ دی، یورپ کے ذہن پر ایک طرح کا جمود چھایا رہا۔

ان قوتوں میں بذاتِ خود کوئی بُرائی نہیں ہے، دراصل ان ہی سے شجاعت، حوصلہ مندی، استقلال، پامردی، محبت اور بہت سی دوسری اچھائیاں اُبھرتی ہیں، جن کے بغیر ہماری زندگی پھیکی اور بدمزہ ہی نہیں، بلکہ دُنیا کے قریب قریب سارے اونچے اُصول بے جان کے قالب بن جائیں گے بُرائی ان کے غلط استعمال سے پیدا ہوتی ہے، چنانچہ ضرورت ان کے استعمال کا صحیح موقع اور محل مقرر

کرنے کی ہے، اور ان راستوں کے تعین کی جن میں بہہ کر حیات و قوت کے یہ دھارے معاشرہ کی شادابی اور نکھار کا سبب بن سکتے ہیں۔ ان کو خشک کرنے کی نہیں، کیونکہ ان کے خشک ہونے سے تہذیب مرجھا جائے گی۔ اور دنیا ویران ہو جائے گی۔ اسلام کی اخلاقی تعلیم کا یہی مشارہ ہو اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

دوسری خصوصیت اسلامی تعلیم کی اس کی ہمہ گیری اور تمام اچھائیوں اور برائیوں کے سارے جزئیات کی احاطہ بندی ہے جبکہ دوسرے اخلاقی معلموں نے اپنی ہدایتیں صرف ایک قوم یا زمانہ کی اصلاح تک محدود رکھیں، اسلام کے پیغمبر نے کل قوموں اور زمانوں کے حالات ملحوظ رکھ کر اخلاقی اصلاحات کی فہرست مرتب کی، سارے محاسن اور مفاسد کھول کر بیان کیے، ایک کا حکم دیا۔ دوسرے سے منع کیا۔ یہاں تک کہ اخلاقی اور نفسیاتی کیفیتوں اور حالتوں کا کوئی گوشہ توجہ اور ہدایت کا محتاج نہیں رہا ——— جیسا کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے۔ "اسلام نے اپنے اصول و احکام کی تفصیل اس وسعت اور جامعیت کے ساتھ کی ہے کہ برائیوں کا کلی استیصال ہو گیا ہے اور نیکیوں کے مظاہر عام ہو گئے ہیں۔ اس کے برخلاف دوسرے مذاہب نے ان کلیات کے جزئیات کی نہایت نامکمل اجمالی تشریح کی ہے[۵]"

اسلامی اخلاقیات کی ایک اور خوبی جو اسے دوسرے مکاتب اخلاق پر فوقیت دیتی ہے اسکے معلم کا وہ عظیم الشان اسلوب تعلیم ہے جس کی مثال تاریخ کو لاکھ کھنگالیے، کہیں نہیں ملتی۔ آپ نے قول کے ساتھ عمل کو اتنے مکمل طریقہ پر ملا لیا تھا کہ آپ کی ذات مبارک قرآن مجید کی جیتی جاگتی، زندہ و تابندہ تفسیر بن گئی تھی۔

جس کے سپرد نوع انسانی کی تعلیم اور تزکیہ ہو وہ خود اگر زندگی کے تمام نشیب و فراز اور معاشرہ کے پیچ و خم سے ہو کر نہ گذرے تو اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہو سکتا ہے، کیونکہ پھر اس کی تعلیم عملی حیثیت رکھنے کے بجائے علمی اور نظریاتی یعنی اصولوں کا گلدستہ بن جائے گی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں ہم کو ایک بے مثال جامعیت ملتی ہے، آپ کی سیرت سے زندگی کے تمام پہلو اُبھرتے

۵؎ سیرۃ النبی، جلد ششم، ص ۱۱۵۔

ہوئے نظر آتے ہیں۔ آپ کی زندگی میں ظلم کے پہاڑ بھی ٹوٹے، مصیبتوں اور آزمائشوں کی آندھیاں بھی آئیں، ناکامیوں کا اندھیرا بھی چھایا، اور فتحمندی اور کامرانی کے شادیانے بھی بجے، تعت حکومت کے پرچم بھی لہرائے اور مسرتوں کے پھول بھی کھلے، آپ نے دوستی بھی برت کر دکھائی اور دشمنی بھی، جنگیں بھی لڑیں اور صلح و آشتی کے عہدنامے بھی کیے۔ دن دن بھر روزے رکھے اور رات رات بھر نمازیں بھی پڑھیں اور ملکی اور سیاسی گتھیاں بھی سلجھائیں۔ غار حرا میں خلوت نشین اور ماہ رمضان میں معتکف بھی رہے۔ اور خانگی زندگی کا لطف بھی اٹھایا۔ دین پاک کے سب سے بڑے مبلغ، ہادی اور رہبر کا فرض بھی انجام دیا۔ اور مسلمانوں کی آزاد ریاست کی داغ بیل بھی ڈالی۔

نرمی اور سختی کے موقع اور محل کو بھی رسول اللہ صلعم خوب پہچانتے تھے۔ جہاں حدود الٰہی کے ٹوٹنے کا سوال ہوتا تھا، وہاں آپ سختی کرنے میں تامل نہ فرماتے تھے اور جہاں مستحبات اور اخلاقی فضائل اور رذائل ہی سے تعلق ہوتا تھا وہاں آپ نرمی ہی سے کام لیتے تھے، حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے کبھی اپنی ذات کے لیے کسی سے بدلہ نہیں لیا۔ مگر جو کوئی شریعت کی حد توڑتا تھا اُسے سزا دیتے تھے۔

ایک بار قریش کی ایک خاتون چوری کے جرم میں پکڑی گئیں، بعض عزیز ترین صحابہ نے ان کی سفارش کرنا چاہی تو آپ نے اُن کی نہ سُنی اور فرمایا: "تم سے پہلے کی قومیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ جب ان میں معمولی لوگ گناہ کرتے تھے تو اُن کو سزا دی جاتی تھی۔ اور جب بڑے لوگ کرتے تھے تو ان کا جرم نظر انداز کر دیا جاتا تھا ـــــ اسی موقع پر یہ بھی فرمایا ـــــ کہ خدا کی قسم اگر میری بیٹی بھی کبھی یہ جرم کرے تو میں اللہ کے قانون کے مطابق اس کا ہاتھ کاٹ ڈالوں گا۔

اسی طرح نرمی کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ مسجد نبویؐ میں ایک بدوی آیا۔ اتفاق سے اُسے پیشاب کی حاجت ہوئی تو وہ وہیں مسجد کے صحن میں پیشاب کرنے لگا، صحابہ نے یہ دیکھ کر چاروں طرف سے اُسے ڈانٹنا شروع کیا، آپ نے روکا اور فرمایا کہ تم سختی کے لیے نہیں بلکہ نرمی کے لیے بھیجے گئے ہو، اس کے بعد اس بدوی کو بلا کر سمجھایا کہ یہ مساجد عبادت کے گھر ہیں، یہاں نماز پڑھی جاتی ہے، یہ پیشاب پیخانہ کی جگہ نہیں ہے۔ اور لوگوں سے فرمایا کہ اس پر پانی بہا دو۔

(۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی بابت حضرت عائشہ صدیقہ سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے ساری داستان ایک جملہ میں کہہ دی۔ انھوں نے کہا۔

"آپ کا اخلاق من وعن قرآن تھا۔"

ایک اور موقع پر آپ نے ذرا تفصیل سے بتایا کہ

"آنحضرت صلعم کی عادت کسی کو برا کہنے کی نہ تھی، آپ برائی کرنے والے کے ساتھ بھی برائی نہیں کرتے تھے، بلکہ اسے معاف کر دیتے تھے، جب آپ کو کسی دو باتوں میں اختیار دیا جاتا تھا تو ان میں جو آسان ہوتی اُسے اختیار کرتے تھے، بشرطیکہ اس میں کوئی گناہ کا شائبہ نہ ہو کیونکہ گناہ سے آپ بہت دور رہتے تھے، کبھی اپنے ذاتی معاملہ میں انتقام نہیں لیا۔ لیکن جو احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتا اس سے خدا خود انتقام لیتا تھا (یعنی احکام ربانی کے مطابق آپ اسکی سزا مقرر کرتے تھے) آپ نے نام لے کر کبھی کسی مسلمان پر لعنت نہیں کی، اور کسی غلام یا لونڈی یا کسی عورت یا خادم یا جانور کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا۔ آپ کسی کی درخواست رد نہیں فرماتے تھے بشرطیکہ وہ ناجائز نہ ہو۔ آپ جب گھر میں تشریف لاتے تو مسکراتے ہوئے آتے۔ دوستوں میں بھی پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے، باتیں اس طرح ٹھہر ٹھہر کر کرتے تھے کہ کوئی یاد رکھنا چاہے تو رکھ سکے۔

حضرت علی مرتضیٰؓ آغاز نبوت سے لے کر وفات تک برابر آپ کے ساتھ رہے تھے۔ ان سے حضرت امام حسینؓ نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات کے متعلق پوچھا تو انھوں نے کہا کہ

"آپ خندہ جبین و نرم خو تھے، سخت مزاج اور سنگدل نہ تھے، نہ شور و غل کرتے تھے نہ کوئی برا کلمہ منھ سے نکالتے تھے، نہ عیب جو اور سخت گیر تھے کوئی بات ناپسند ہوتی تو اغماض فرماتے تھے، آپ نے اپنے نفس سے یہ تین باتیں بالکل خارج کر دی تھیں:- (۱) بحث و مباحثہ (۲) بے ضرورت باتیں کرنا (۳) بے مطلب کی بات میں پڑنا۔ دوسروں کے متعلق بھی تین باتوں سے پرہیز کرتے تھے۔

(۱) کسی کو بُرا نہیں کہتے تھے۔ (۲) کسی کی عیب گیری نہیں کرتے تھے، (۳) کسی کی ٹوہ میں نہیں لگتے تھے، دوسروں کے منھ سے اپنی تعریف سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ نہایت فیاض، نہایت راست گو، نہایت نرم طبع اور نہایت خوش صحبت تھے، اگر کوئی دفعتاً سامنے آجاتا تھا تو مرعوب ہو جاتا تھا، لیکن جیسے جیسے آشنا ہوتا جاتا آپ سے محبت کرنے لگتا۔"[۱]

ہند بن ابی ہالہ گویا آپ کے آغوش کے پروردہ تھے۔ اُن کا بیان ہے کہ:-

"آپ نرم خو تھے، سخت مزاج نہ تھے، کسی کی توہین روا نہیں رکھتے تھے چھوٹی چھوٹی باتوں پر اظہار شکر فرماتے تھے، کسی چیز کو بُرا نہیں کہتے تھے، کھانا جس قسم کا سامنے آتا تناول فرماتے تھے اور اُس کو بُرا نہ کہتے۔ اگر کوئی کسی امر حق کی مخالفت کرتا تو آپ کو غصہ آجاتا، مگر اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی آپ کو غصہ نہیں آیا نہ کسی سے انتقام لیا۔"[۲]

حضرت انسؓ جو خادم خاص تھے کہتے ہیں کہ:

"میں نے دس برس تک آپ کی خدمت کی مگر آپ نے کبھی کسی معاملہ میں باز پرس نہیں فرمائی۔"[۳]

مالک بن حویرث جو بیس دن تک آپ کی صحبت میں رہے کہتے ہیں کہ "آپ حلیم اور رقیق القلب تھے۔"[۴]

حجۃ الاسلام امام غزالیؒ 'کیمیائے سعادت' میں تحریر فرماتے ہیں:-

"آپ مویشیوں کو خود چارہ ڈال دیتے۔ گھر میں جھاڑو دے لیتے، بکری دودھ لیتے، خادموں کو اُن کے کاموں میں مدد دیتے، ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیتے، بازار سے سودا خرید لاتے، ادنیٰ و اعلیٰ کو پہلے خود سلام کرتے، کوئی ساتھ ہو لیتا تو اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے، غلام و آقا، حبشی و ترک میں فرق نہ کرتے،

۱؎ شمائل ترمذی ۲؎ ایضاً ۳؎ صحیح مسلم ۴؎ صحیح بخاری۔

رات دن کا لباس ایک ہی رکھتے، کیسا ہی حقیر شخص دعوت دیتا فوراً قبول فرمالیتے، جو کھانا سامنے رکھ دیا جاتا رغبت سے کھالیتے، رات کے کھانے سے صبح کے لیے اور صبح کے کھانے سے رات کے لیے اٹھا نہ رکھتے، نیک مزاج، نرم خو، کشادہ دل اور خندہ جبین تھے مگر زور سے نہیں ہنستے تھے، اندوہ گین تھے مگر ترشرو نہ تھے۔ سخی تھے مگر فضول خرچ نہ تھے۔"

اور حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے کہ:-

"کنبہ والوں اور خادموں پر بہت زیادہ مہربان تھے۔ زبان مبارک پر کبھی کوئی گندی بات یا گالی نہیں آئی۔ کسی پر لعنت نہیں کرتے تھے، دوسروں کی ایذا رسانی پر صبر فرماتے تھے۔ کنبہ کی اصلاح اور قوم کی درستی پر بہت توجہ فرماتے تھے ہر شخص اور ہر چیز کی قدر و منزلت سے آگاہ تھے، آسمانی بادشاہت پر ہمیشہ نظر جمائے رہتے تھے۔"

صحیح بخاری میں ہے کہ:

"آپ اطاعت شعاروں کو بشارت سنانے والے، گناہ گاروں کو ڈرانے والے اور بے خبروں کو ہوشیار کرنے والے خدا کے بندے اور رسول تھے، تمام معاملات اللہ پر چھوڑنے والے تھے۔ نہ درشت خو تھے نہ سخت گو، بدی کے بدلے میں بدی نہ کرتے تھے۔ معافی مانگنے والوں کو معاف فرمادیتے تھے اور گناہ گاروں کو بخش دیتے تھے۔ ان کا کام مذاہب کی کجیوں کو مٹانا تھا۔ ان کی تعلیم اندھوں کو آنکھیں اور بہروں کو کان عطا کرتی تھی۔ آپ تمام خوبیوں سے آراستہ جامع اوصاف حمیدہ تھے۔ سکینت ان کا لباس، نیکی ان کا شعار، تقویٰ ان کا ضمیر، حکمت ان کا کلام، عدل ان کی سیرت، راستی ان کی شریعت اور ہدایت ان کی رہنما تھی۔ آپ ذلت دور کرنے والے، گمناموں کو رفعت بخشنے والے، مجہولوں کو طاقت دینے والے، قلت کو کثرت اور تنگدستی کو غنا سے بدلنے والے تھے۔"

مشہور انگریز ادیب ٹامس کارلائل نے لکھا ہے کہ:

"آپ کا گھر بار معمولی اور کمتر لوگوں کے طرز کا تھا، اور آپ کی عام غذا جو کی روٹی اور پانی، اکثر آپ کے چولھے میں ہفتوں آگ نہیں روشن ہوتی تھی، آپ کے سیرت نگار فخریہ بیان کرتے ہیں کہ آپ اپنے ہاتھ سے جوتے گانٹھ لیتے اور کپڑوں میں پیوند لگا لیا کرتے تھے .... کسی طرح دارا شہنشاہ کی اتنی اطاعت نہیں کی گئی جتنی کہ اس شخص کی اس کے اپنے ہاتھ سے سی ہوئی عبا میں ہوتی تھی۔"

اور رومیوں کے انحطاط و زوال کا شہرۂ آفاق مورخ ایڈورڈ گبن لکھتا ہے کہ:

"اپنی دنیوی طاقت کے عروج پر بھی محمدؐ کی شرافت نفس نے شاہانہ تزک و احتشام روا نہ رکھا، خدا کا پیغمبر گھر کے ادنیٰ کام اپنے ہاتھ سے کرتا تھا۔ آگ روشن کرتا تھا، جھاڑو دیتا تھا، بھیڑوں کا دودھ دوہتا تھا اور اپنے کمبل اور جوتوں کی خود مرمت کر لیا کرتا تھا، تارک الدنیا راہبوں کے مجاہدوں سے نفرت کرتے ہوئے آپ بلا تصنع اور تکلف ایک عرب اور سپاہی کی طرح سادہ غذا استعمال فرماتے تھے۔ خاص خاص مواقع پر آپ صحابہ کی دل کھول کر ضیافت کرتے تھے۔ مگر نجی زندگی میں اکثر آپ کے گھر میں ہفتوں چولھا نہیں جلتا تھا۔"

فرانسیسی مورخ پروفیسر سیڈیو نے اخلاق و عادات نبوی کا ذکر کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی ہے:

"آپ خندہ رو، ملنسار، اکثر خاموش رہنے والے، بکثرت ذکر خدا کرنے والے، لغو اور بیہودہ باتوں سے نفرت کرنے والے، بہترین رائے رکھنے والے تھے ....

"آپ نہایت منصف مزاج تھے، مسکینوں سے محبت کرتے تھے، غریبوں میں رہ کر خوش ہوتے تھے، تنگدست کو اس کی تنگ دستی کی وجہ سے نہ تو حقیر اور نہ بادشاہوں کو ان کی بادشاہت کی بنا پر برتر سمجھتے تھے۔"

قرآن مجید کے انگریز مترجم اور مفسر مارماڈیوک پکتھال نے یہ الفاظ لکھے ہیں:

"عرب پر حکمراں ہو جانے کے بعد بھی آپ اپنے پیروؤں سے برادرانہ انداز سے ملتے رہے۔ آپ کو نقیبوں اور پہرہ داروں کی ضرورت نہ تھی۔ اپنے

لوگوں میں سادگی اور آزادی سے گھومتے پھرتے تھے، ایک رہنما کی حیثیت سے، ایک مصلح کی حیثیت سے، اور ایک آزمائے ہوئے دوست کی حیثیت سے۔"

جرمن مصنف ڈاکٹر گستاف وائل نے لکھا ہے کہ:

"محمدؐ اپنی قوم میں ایک روشن مثال تھے، آپ کا کردار پاک اور بے داغ تھا۔ لباس اور غذا میں ایک انوکھی سادگی تھی۔ مزاج میں اتنی سادگی اور بے تکلفی تھی کہ اپنے ساتھیوں سے کوئی خاص تعظیم وتکریم قبول نہیں فرماتے تھے۔ اور اپنے غلام سے کوئی ایسی خدمت نہ لیتے تھے جو خود انجام دے سکتے، آئے دن آپ بازاروں میں سودا خریدتے، اور گھر میں کپڑوں میں پیوند لگاتے اور بکری دوہتے نظر آتے تھے، ہر وقت ہر شخص کی آپ تک رسائی ہو سکتی تھی۔ بیماروں کی عیادت کرتے تھے اور ہر ایک سے ہمدردی رکھتے تھے۔ آپ کی سخاوت اور خیر وخیرات کی کوئی حد نہ تھی۔ باوجود ان بے اندازہ تحائف کے جن کی آپ پر ہر وقت بارش ہوا کرتی تھی آپ نے نہایت مختصر ترکہ چھوڑا اور وہ بھی بیت المال کو ہبہ فرما گئے تھے۔"

اور واشنگٹن اِروِنگ کا یہ بیان ہے:

"اپنے انتہائی قوت واقتدار کے دور میں بھی آپ نے وضع قطع، اور اخلاق وعادات میں وہی سادگی قائم رکھی جو پریشانی اور بے طاقتی کے زمانہ میں آپ کا وصف رہی تھی۔ شاہانہ کرّوفر تو بڑی بات ہے۔ اگر کسی مجلس میں آپ کے ساتھ کچھ خصوصیت کا برتاؤ کیا جاتا تو وہ بھی آپ کو بہت ناگوار ہوتا تھا۔"

اس طرح کی شہادتیں اور بیانات کہاں تک نقل کیے جائیں، دراصل ان کا سلسلہ لامتناہی ہے۔ (باقی)

ارشاداتِ خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ

مکتوبات کے پیرایہ میں

—— ۱۲ ——

(مترجمہ :- مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہی)

مکتوب (۱۱۲) شیخ محمد شریف کابلی کے نام ——

بعد الحمد والصلوٰۃ واضح ہو —— سنا گیا ہے کہ تم نے اپنے پیر و مرشد مولانا محمد صدیق کو رنجیدہ کر دیا ہے ان کی شان میں گستاخیاں اور بے ادبیاں تم سے سرزد ہوئی ہیں اور تمھارے سابق طرزِ عمل میں تغیر پیدا ہو گیا ہے۔ مولانا تم سے اس درجے ناراض ہیں کہ معاملہ "سلب اجازت" تک پہونچ گیا ہے —— وہ تواضع، نیستی اور خدا طلبی جو تم سے ظاہر ہوا کرتی تھی اس کے پیش نظر یہ امور بہت ہی بعید اور محلِ تعجب ہیں —— پیر و مرشد سے جو رشتہ توڑا ہے اب کس سے جوڑ لگانا ہے؟ ...... کیا مصیبت ہے، رعایتِ حقوق دنیا سے بالکل ہی رخصت ہو گئی —— جب تم جیسے آدمی سے یہ نا ملائم حرکات سرزد ہوں پھر دیگر اہل ارادت پر کیا اعتماد رہ سکتا ہے —— آئندہ جو بھی روحانی نشو و نما حاصل کر کے مخلوق میں مقبول ہو جایا کرے گا یا اپنے حالات باطنیہ کچھ اچھے محسوس کرے گا وہ اسی طرح پیر و مرشد سے ترک تعلق کر لیا کرے گا —— اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون ——

چاہیئے تو یہ تھا کہ ان ترقیات کے مشاہدے کے بعد "رابطۂ محبت" اور "رسوخِ عقیدہ" مرشد کے ساتھ اور زیادہ ہو جاتا، انکساری اور خاکساری کا معاملہ بیش از بیش کیا جاتا کیوں کہ یہ دولت روحانی اور یہ "صفا و قبول" مرشد کے ہی انوار و برکات کا صدقہ ہے نہ یہ کہ گردن کشی اور رعونت کا مظاہرہ ہو ...... نفحات میں ایک درویش کا یہ مقولہ نقل کیا گیا ہے کہ جو "شخص تیرے مرشد کو رنجیدہ کرے اور تو اس شخص سے اپنے تعلقات

اچھے رکھے تو تجھ سے کتا اچھا ہے" ــــ چہ جائیکہ مرید خود اپنے پیر کو رنجیدہ کرے ــــ تم نے جو کچھ سوچا ہے غلط سوچا ہے جلدی تدارک کرو اور مولانا کو راضی کرو جس طرح بھی ہو سکے ــــ اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اگر مولانا راضی ہیں ہم بھی راضی ہیں ورنہ ہم بھی ناراض ہیں ــــ ہماری رضا مولانا کی رضامندی کی فرع ہے ــــ ایک شخص نے بیان کیا ہے کہ تمھارا سرہند آنے کا ارادہ ہے۔ مولانا کو راضی کیے بغیر تمھارا سرہند آنا بالکل بیکار ہے۔ یہاں آؤ گے تو پھر پشاور کو واپس ہونا پڑے گا اور ان کو راضی کرنا ضروری ہوگا۔ جب مولانا لکھ دیں گے کہ ہم فلاں سے راضی ہو گئے اس کے بعد ہم بھی راضی ہو جائیں گے خواہ سرہند آؤ یا نہ آؤ ــــ یہ جو کچھ لکھا گیا ہے تمھاری بہبودی کے لیے ہے برا نہ ماننا۔

؎ من انچہ شرط بلاغ است با تو می گویم　　　تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

نصیحت بظاہر کڑوی ہوتی ہے لیکن سعادت مند وہ ہو جو اس تلخی کو شکر کی طرح استعمال کر لے اور حلاوت معنوی سے بہرہ ور ہو......

مکتوب (۱۱۴) مولانا محمد صدیق پشاوری کے نام ــــ

بسم اللہ الرحمن الرحیم ــــ صحیفۂ گرامی نے خوش وقت کیا...... ملا محمد شریف کابلی کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ اب اس کی بہت کچھ اصلاح ہو گئی ہے اور اس نے اپنے پچھلے (غلط) طرزِ عمل کو تبدیل کر دیا ہے۔ اس صورت میں اس امر کی گنجائش ہے کہ اس کی سابقہ غلطیوں کو معاف کر دیا جائے......

...... والسلام علیکم وعلی من لدیکم ــــ

مکتوب (۱۱۸) مولانا محمد صدیق پشاوری کے نام ــــ

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ــــ مکتوب مرغوب جو ارسال کیا تھا پہونچا خوش وقت کیا۔ حضرت حق سبحانہ طریقۂ مرضیہ میں استقامت نصیب فرمائے اور "وصولِ مطلب ارجمند" کے موانع سے محفوظ رکھے ــــ تم نے لکھا تھا کہ حسب الحکم طالبین کے کام کو سرگرمی سے انجام دے رہا ہوں۔ کوئی طالب تاثیر سے خالی نہیں رہتا اکثر طالبین پہلی توجہ ہی میں متاثر ہو جاتے ہیں۔ الحمد للہ ــــ تم اس نعمت عظمیٰ کا شکر بجالاؤ البتہ تکبر اور گھمنڈ سے بچتے رہنا ــــ اس امر کو جو کہ "مقام دعوت" ہے عظیم الشان سمجھنا ــــ اور ہمیشہ اس بات کا اقرار کرتے رہنا کہ میں کما حقہ اس کو انجام نہ دے سکا ــــ طالبین کے حالات کی جانچ پڑتال رکھنا اور ان پر توجہات مبذول کرنا ایک بڑی عبادت ہے تم اس سے تساہل نہ برتنا ــــ اس کام سے

فارغ ہونے اور ادائے حق کے بعد بقدر طاقت دوسری طاعتوں "درس داد کار" میں مشغول ہوا کرو۔
ان احب عباد اللہ الی اللہ من حبب اللہ الی عبادہ۔۔۔ (اللہ کے نزدیک محبوب ترین بندہ وہ ہے جو اللہ کے بندوں میں اللہ کو محبوب بنائے اور اللہ کی محبت پیدا کرائے)۔۔۔۔۔

مکتوب (۱۱۹) مولانا محمد امین کے نام۔۔۔

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ۔۔۔ مکتوب مرغوب وصول ہو کر باعثِ مسرت ہوا۔۔۔۔۔۔۔ تم نے (منجملہ اور باتوں کے) یہ بھی دریافت کیا تھا کہ ان دو آیتوں کے مفہوم میں تطبیق کس طرح ہو گی؟

(۱) قُل کُلٌّ من عند اللہ (کہہ دیجئے کہ ہر ایک امر اللہ کی طرف سے ہے)۔

(۲) ما اصابک من حسنۃٍ فمن اللہ وما اصابک من سیئۃٍ فمن نفسک (جو پہونچی تجھ کو نعمت پس وہ اللہ کی طرف سے ہے ۔۔۔ اور جو پہونچی تجھ کو محنت و بلا پس وہ تیرے نفس کی طرف سے ہے)۔

(اس کا جواب یہ ہے کہ) سیئات (جس سے اس جگہ بلیات مراد ہیں) کا پیدا کرنا اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے لیکن یہ بندے کے اعمالِ بد کی سزا ہے وہ اپنی بد اعمالی سے مورد بلا و مصیبت ہو جاتا ہے چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ فرمایا ۔۔۔ جب کسی مسلم کو کوئی مصیبت پہونچتی ہے حتیٰ کہ کانٹا لگے یا جوتی کا تسمہ ٹوٹے یہ اس کے گناہ کی سزا ہوتی ہے اور اللہ جو معاف کر دیتا ہے وہ تو بہت ہی زیادہ ہے"۔۔۔ پس "خلقِ بلا" اور "ایصالِ بلا" کے لحاظ سے قل کل من عند اللہ فرمایا گیا اور بندے نے گناہوں کے ذریعے جو اس بلا و مصیبت کو کھینچ بلایا ہے اس کے لحاظ سے فمن نفسک فرمایا پس اب کوئی بھی تعارض باقی نہ رہا ۔۔۔ بخلاف "حسنہ" کے کہ وہ محض فضل رب ہو۔ بندے کے تمام اعمال خیر صرف اس کے وجود کی نعمت کا بھی بدلہ نہیں بن سکتے چہ جائیکہ خدا کی دوسری ان گنت نعمتیں ۔۔۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ۔۔۔ لا یدخل الجنۃ احدٌ الا برحمۃ اللہ قیل ولا انت قال علیہ وآلہ الصلوٰۃ والسلام ولا انا ۔۔۔ (جنت میں نہیں داخل ہو گا کوئی بھی مگر اللہ کی رحمت سے ۔۔۔ عرض کیا گیا اور آپ بھی؟ فرمایا ہاں میں بھی اللہ کی رحمت ہی سے داخل جنت ہوں گا)۔

جو کچھ بندے کے اچھے اعمال کی جزا میں دنیا وعقبیٰ کی نعمتیں قرآن واحادیث میں ذکر کی گئی ہیں وہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم ہی ہے جو بندے کے عمل کو اس درجے پر پہونچا دیا۔

؎ چشم دارم کہ دہد اشکِ مرا حسنِ قبول آنکہ درساختہ است قطرۂ بارانی را

مکتوب (۱۲۰) مولانا محمد حنیف کے نام۔۔۔

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ۔۔۔ صحیفہ شریفہ پہونچا باعث بہجت ومسرت فراواں ہوا۔ حق تعالیٰ مدارجِ قرب میں ترقیاتِ بے اندازہ عطا فرمائے۔۔۔۔۔

تم نے (مضامین کے) "مسودات جدیدہ" طلب کیے تھے اگر توفیق ہوئی تو کسی دوست سے کہوں گا کہ ان میں سے جو حصہ قابل نقل ہو نقل کرکے تم کو بھیجدیں۔۔۔۔۔۔ تم نے جو کچھ اپنے مریدوں کے حالات لکھے ہیں ان سے بہت خوشی ہوئی ۔۔۔ تمام احوال سنجیدہ ومقبول ہیں۔۔۔ اللہ تعالیٰ ترقیات عنایت فرمائے اور مطلب حقیقی تک پہونچائے ۔۔۔ چوں کہ "ایام اعتکاف" ہیں اور امور ضروریہ درپیش۔۔۔ اس لیے کچھ زیادہ تحریر نہیں کرسکتا۔ ضروری جوابات پر اکتفار کیا گیا ہے ۔۔۔ ربنا اتمم لنا نورنا واغفر لنا انک علیٰ کل شئ قدیر

مکتوب (۱۲۲) مولانا محمد صدیق پشاوری کے نام۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ مقصود حصول نسبت ہے۔ اس کا علم ہونا یہ ایک علیحدہ امر ہے اگر یہ علم دیدیا گیا ہے فبہا ورنہ مضائقہ نہیں ہے ۔۔۔ نسبت جب دشواری سے حاصل ہوتی ہے تو اسکی قدر وعزت سمجھ میں آتی ہے اور سہولت وجلدی سے ہاتھ لگ جاتی ہے تو اس کی چنداں قدر وعزت نہیں ہوتی ۔۔۔ جو بھی اس سلسلہ میں جلدی کرتا ہے بوالہوس ہے ۔۔۔ طالب نہیں ۔۔۔ ایسا شخص قابل ہمنشینی بھی نہیں ۔۔۔ لوگ طلب دنیا میں کیا کچھ پاپڑ نہیں بیلتے ؟ طلب حق تعالیٰ تو بہت زیادہ مشقت کی مستحق ہے ۔۔ بزرگان دین نے تو بڑی بڑی ریاضتیں برداشت کی ہیں اور عمریں گزاردی ہیں۔

؎ اوحدی شصت سال سختی دید تا شبے روئے نیک بختی دید

۔۔۔۔۔۔ حضرت شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے عوارف المعارف میں خوارق وکرامات کے ذکر کے بعد لکھا ہے ۔۔۔ کہ "یہ خوارق وکرامات "مواہب الٰہی" ہیں کبھی کسی جماعت کو ان سے مشرف کردیتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس جماعت سے اعلیٰ ایک جماعت ہو اس کے

پاس خوارق وکرامات میں سے کچھ بھی نہیں ہوتا" اس کے بعد شیخ الشیوخ نے لکھا ہو کہ "یہ تمام خوارق وکرامات ذکر الٰہی اور حضور قلب کے مقابلے میں کم درجہ ہیں"۔

مکتوب (۱۲۸) حافظ عبدالغفور کے نام

تم چوں کہ فقرائے شکستہ حال سے اللہ کے لیے محبت رکھتے ہو اس لیے امید ہو کہ یہ محبت نتیجہ بخش ثابت ہو اور "کشائشِ کار" ہو جائے ــــ "درجۂ فنا و بقا" سے پہلے گوناگوں حالات جو بعض طالبین کو اثنائے سلوک میں رونما ہوتے ہیں وہ مقصود نہیں ـ غیر حق ہیں ــــ طالب حق کو ما سوی اللہ سے اعراض ضروری ہے تاکہ توجہ پراگندہ نہ ہو جائے ــــ پس جو احوال وکیفیات کا طالب ہو وہ ما سوا میں گرفتار ہو ـ ہاں فنا و بقا مقاصد میں سے ہیں ان کی تحصیل میں کوشش کرنا اور ان کی دریوزہ گری کرنا اہم شئے ہو ــــ کیوں کہ ولایت "فنا و بقا" سے ہی مربوط ہے اور معرفت جو کہ تخلیق انسانی کا مقصود ہے اسی مقام سے وابستہ ہے ــــ وہ ولولۂ شوق اور شعلۂ عشق جو عالم مجاز میں ظاہر ہوا کرتا ہے راہِ حقیقت میں درکار نہیں۔ حقیقی عشق ومحبت کا اس ذات سے تعلق ہے جو "بے کیف وبے چوں" ہے اسی لیے اس عشق میں بھی (زیادہ تر) "بیچونی" کی کیفیت ہے اسی بنا پر بعض نے اس عشق کو "ارادہ وطاعت" سے تعبیر کیا ہے ــــ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ محبت حقیقی "بچوں وکیف" کے لباس میں جلوہ گر ہو جاتی ہے اور گرمی نعرہ وزاری پیدا کر دیتی ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس طرح ظاہر نہیں ہوتی اپنی بے کیفی کی حقیقت پر ہی قائم رہتی ہے بلکہ یہ بھی روا ہوتا ہے کہ بعض اوقات محبت کی نفی ہو رہی ہو اور فی الحقیقۃ محبت درجۂ کمال پر ہو ــــ تم نہیں دیکھتے کہ عالم مجاز میں کسی شخص کو کوئی چیز اپنے نفس وذات سے زیادہ محبوب نہیں جس چیز کو بھی ــــ مال، بیوی، بچوں میں سے، دوست رکھتا ہے اپنی ذات کے لیے ہی دوست رکھتا ہے اس کے باوجود اپنے نفس کی محبت میں اس سے کوئی نعرہ اور کوئی شوق ظاہر نہیں ہوتا ــــ سب سے زیادہ اپنے نفس وذات سے محبت ہونے کے متعلق جو میں نے کہا وہ عالم مجاز کی بات ہے ورنہ عالم حقیقت میں محبوب حقیقی اپنی ذات سے بھی زیادہ محبوب ہوتا ہے ــــ فنا اسی محبت حقیقی کا اثر ہو ــــ ع گر ایں سودا بجاں بودے چہ بودے

محبت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی قبیل سے ہو، چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے ــــ

(حضور فرماتے ہیں) لن یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من نفسہ واھلہ والناس اجمعین (اوکما قال) (تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن کامل نہیں ہو سکتا

جب تک میں اس کے لیے اس کے نفس اس کے اہل و عیال اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب و عزیز نہ بن جاؤں)

شیخ طریقت چونکہ نائب مناب رسولؐ ہے اور واسطۂ فیض الٰہی ہے ۔۔۔ اس کی محبت کا بھی یہی عالم ہونا چاہیئے ـــــ والسّلام

مکتوب (۱۳۴) مولانا حسن علی کے نام ـــ

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ـــــ حضرت حق سبحانہ تم کو جادۂ شریعت و سنت مصطفےٰ علیہ الصلوٰۃ والسّلام پر مستقیم و مستدیم رکھے ـــــ مخدوما ـــــ ہمارے بزرگوں نے عملِ سنت کو اختیار اور بدعت سے اجتناب کیا ہے وہ امور جو دین میں (غلط طریقے) داخل کرلیے گیے ہیں ہر چند باطن کے لیے نافع معلوم ہوں وہ ان پر عمل نہیں کرتے اور اتباعِ سنت کو اگرچہ صورتاً باطن کے لیے سود مند نہ دکھائی دے ہاتھ سے نہیں جانے دیتے .... والسّلام علیکم وعلی من لدیکم ـــ

مکتوب (۱۴۰) شیخ علیم جلال آبادی کے نام ـــ

بعد الحمد والصلوٰۃ وتبلیغ الدعوات ـــــ یہاں کے فقراء کے احوال و اوضاع مستوجب حمد ہیں امید کہ احبائے دور افتادہ بھی "نہج صلاح" اور متابعتِ سید کائنات فخر موجودات علیہ افضل الصلوات واکمل التحیات ـــــ پر ظاہراً و باطناً مستقیم ہوں گے ـــــ متابعت رسولؐ کے چند درجات و مراتب ہیں ـــ حضرت قبلۃ الواصلین (حضرت مجدد الف ثانیؒ) نے مکتوب (۵۴) جلد ثانی میں متابعت کے سات درجے قرار دیئے ہیں۔

پہلے دو درجے کسبی ہیں کہ اعمالِ ظاہرہ و باطنہ سے تعلق رکھتے ہیں درجہ سوئم من وجہ کسبی ہے اور من وجہ وہبی' اس لیے کہ مبادی و مقدمات اس کے کسبی ہوتے ہیں ـــ درجۂ چہارم وہبی ہے لیکن اعتقاد و عمل کو اس کے حصول میں دخل ہے درجۂ پنجم و ششم اس سے بھی بالاتر ہے درجۂ ہفتم کے متعلق کیا لکھوں (کہ وہ تو بالاتر سے بالاتر ہے) والسّلام

مکتوب (۱۴۲) محمد کاشف کے نام ـــ

بعد الحمد والصلوٰۃ وتبلیغ الدعوات ـــــ ...... تم نے دوسرا استفسار یہ کیا تھا کہ وتروں کے بعد سجدہ درست ہو یا نہیں؟ ـــ فقیر نے اس سوال کا جواب اس سے پہلے بھیج دیا تھا

تعجب ہو کہ وہ جواب نہیں پہونچا ـــــ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ ہمارا عمل اور ہمارے حضرت (حضرت مجدد رح)
کا عمل نہیں ہے۔ علمار نے اس کو منع کیا ہے، نہیں کرنا چاہیئے ـــــ کتاب سنن الہدیٰ میں ہے ـــــ
صلوٰۃ الوتر کے بعد دو سجدے جو آیۃ الکرسی پڑھ کر بلاد ہند میں رائج ہیں ان کی کوئی اصل اخبار و آثار سے
نہیں ہے فقہ میں بھی اس کی کوئی روایت نہیں ہے اہلِ عبر کا بھی اس پر عمل نہیں بلکہ شافعیہ اس کی حرمت
کے قائل ہیں اور اکثر حنفیہ اس کو بالکل جانتے تک نہیں میں نے فقہائے مدینہ سے ان دونوں سجدوں
کے متعلق دریافت کیا انھوں نے بھی ان میں کراہت نقل کی ہے۔"

مکتوب (۱۴۵) محمد عاشور بخاری کے نام۔

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ـــــ صحیفہ شریفہ نے خوش وقت
کیا ـــــ حضرت حق جل مجدہٗ تم کو گرفتاری ماسوائے کلیتہً آزاد کرے، مدارج قرب میں ترقیات
بخشے اور برکاتِ کلمۂ طیبہ سے سیراب کرے ـــــ اہل اللہ کے یہاں یہ امر مسلّم ہے کہ "تنویرِ باطن" کے لیے
اس کلمۂ مبارکہ سے بہتر کوئی کلمہ نہیں ہے۔ اس کے جزءِ اوّل سے "سالکِ مستعد" مطلوبِ حقیقی کے ماسوا کی
نفی اور جزءِ دوم سے معبودِ برحق کا، اثبات کرتا ہے اور یہی تمام سلوک کا خلاصہ ہو۔

تا بجاروب لا نروبی راہ ✲ نرسی در سرائے الا اللہ

تم نے ایسے نصائح طلب کیے ہیں جو تہذیبِ اخلاق پر مشتمل ہوں ـــــ
مخدوما! کتب شرعیہ اور احادیث نبویہ علی وجہ الکمال، تہذیب اخلاق کی ضامن ہیں ـــــ
بمقتضائے "شریعتِ غرّا" عمل کرو اور سنن مصطفےٰ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کو تمام امور میں پیشوا قرار دو۔ نجات
اُخروی اور درجات قُربِ الٰہی کا وصول اسی سے وابستہ ہے، تعمیر اوقات میں انتہائی سعی کرو کیوں کہ
وقت بہت ہی زیادہ عزیز شے ہو یہ لایعنی امور میں صرف نہیں ہونا چاہیئے، مخلوق سے میل جول بقدر
ضرورت ہو۔ قدرِ حاجت سے زائد ملنا جلنا اس راہ میں "درندۂ مہلک" ہے ـــــ شب زندہ داری اور
گریۂ سحری کو غنیمت شمار کرو۔ لذاتِ فانیہ میں کھپ جانے سے بچتے رہو، یہ امرِ باطن کو بے رونق اور مکدر
کر دیتا ہے۔ ہر کسی سے خنداں روئی اور کشادہ پیشانی سے پیش آؤ۔ "امر معروف" اور "نہی منکر" کو اچھی
طرح انجام دو، اس میں کوتاہی نہ ہونا چاہیئے ـــــ طعام، منام اور کلام میں حد اوسط کی رعایت کرنا
چاہیئے۔

۵ بخند آں بخور کز دہانت برآید   بخند آنکہ از ضعف جانت برآید

مکتوب (۱۴۶) مولانا محمد صدیق پشاوری کے نام

الحمد للہ فی السراء و الضراء ـــــ جو کچھ محبوب حقیقی جل سلطانہ کی طرف سے آئے وہ نظر محب میں بلکہ نفس الامر میں رعنا و زیبا ہے۔ محب اس کے "ایلام" (الم پہونچانے) سے بھی ایسی ہی لذت حاصل کرتا ہے جیسا کہ اس کے "انعام" سے ـــــ انعام کو اس کا ظہور جمال سمجھتا ہے اور ایلام کو مظہر جلال۔ (غرضکہ) دونوں کو اس کی صفت کمال تصور کرتا ہے۔ صفت کو زینۂ موصوف جانتا ہو نیز صفت سے موصوف کی طرف مائل ہوتا ہے ـــــ فرزند دلبند کے انتقال پر رضا و شکیبائی اختیار کرو بلکہ چونکہ یہ محبوب حقیقی کا فعل ہے اس لیے اس سے لذت گیر ہوجاؤ اور فعل کو "زینۂ وصول فاعل" بنا دو ـــــ چیں بر جبیں ہونے اور بے صبری کرنے کی کہاں گنجائش ہے؟ وجود فرزند سے جس طرح متمتع ہوتے تھے اور اس کو "ظہور نعمت حق" تصور کرتے تھے بعینہ اسی طرح اس کے گم ہوجانے (مرجانے) سے بھی خوش وقت رہو اور اپنے حق میں "تربیت جلالی" جانو ـــــ نیز اس درد و الم میں جو کہ "دریچۂ رضامندی محبوب حقیقی" ہے ـــــ اپنی سعادت کو مضمر سمجھو ـــــ اس دنیا کی مصیبتیں ہر چند بظاہر جگر کو چھیل دینے والی اور مستقل زخم ہیں لیکن بنظر حقیقت مرہم اور راحت ہیں، قرب و ترقیات کا سبب ہیں، کسی نے کیا خوب کہا ہو۔

با درد بساز چوں دوائے تو منم   در کس منگر چو آشنائے تو منم
گر بر سر کوئے عشق ما کشتہ شوی   شکرانہ بدہ کہ خوں بہائے تو منم

تعددِ ازدواج پر عدالتی پابندیاں اور ان کے نتائج

(از مولانا امین احسن صاحب اصلاحی)

[حکومت پاکستان نے پچھلے دنوں زن وشو کے معاملات میں پیدا شدہ خرابیوں اور نا انصافیوں اور ان کے اسباب کا جائزہ لینے اور اصلاحی سفارشات پیش کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا تھا۔ اس کی رپورٹ پر معاصر ترجمان القرآن لاہور بابت اکتوبر ۵۶ء میں مولانا امین احسن صاحب کا تبصرہ (قسط ۲) شائع ہوا ہے۔ تبصرہ کا ایک حصہ جو تعدد ازدواج سے متعلق ہو ہم ان صفحات میں نقل کر رہے ہیں، تاکہ ہندستان میں تعدد ازدواج پر عدالتی پابندیاں عائد کرنے کے موئیدین اس کی قباحتوں کا کچھ اندازہ کرسکیں ——— ادارہ]

تعداد ازدواج کے متعلق کمیشن کی سفارش یہ ہے کہ یہ قانون بنا دیا جائے کہ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے کسی شخص کو شادی بیاہ کی عدالت سے اجازت حاصل کئے بغیر کسی اور عورت سے نکاح کرنے کا حق نہ ہوگا۔

عدالت یہ اجازت کسی شخص کو تین باتوں کا اطمینان کر لینے کے بعد دے گی:-

ایک یہ کہ دوسری شادی کے لئے کوئی عقلی جواز موجود ہے۔ مثلاً یہ کہ بیوی بانجھ ہے، یا فاترالعقل ہے یا کسی مزمن بیماری میں مبتلا ہو یا اسی قسم کا کوئی اور معقول سبب موجود ہے۔ مجرد یہ بات کہ دوسری عورت جوان اور خوبصورت ہے، یا یہ کہ مرد اپنی پہلی بیوی پر قناعت نہیں کرسکتا کمیشن کے نزدیک کوئی معقول سبب نہیں ہے۔

دوسری یہ کہ مرد کی مالی پوزیشن ایسی ہے کہ وہ بیک وقت دو کنبوں کی کفالت کا بوجھ اٹھا سکتا ہے اور اس دوسری شادی سے اس کی سابق بیوی اور اس کے بچوں کے اس معیار زندگی میں کوئی فرق پڑنے کا اندیشہ نہیں ہے جس کے وہ عادی ہیں۔

تیسری یہ کہ اگر پہلی بیوی مرد کے دوسری شادی کر لینے کی صورت میں علٰحدہ قیام کی طالب ہے تو مرد اس کے لئے کیا ضمانت دیتا ہے، اس کے لئے عدالت یہ بھی کرسکتی ہے کہ مرد کی تنخواہ یا اس کی آمدنی کا ایک مناسب حصہ عورت کو براہ راست ملا کرے۔

کمیشن نے اپنی سفارشات کی تائید میں جو دلیل دی ہے وہ یہ ہو کہ قرآن نے تعدد ازدواج کی اجازت صرف ایک جگہ سورۂ نسا میں دی ہے اور یہ اجازت ایک ہنگامی ضرورت کے موقع پر یتیموں اور بیواؤں کا مسئلہ

حل کرنے کے لئے عدل کی نہایت کڑی شرط کے ساتھ دی تھی اب تجربہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسلمانوں نے اس اجازت سے نہایت غلط فائدہ اٹھایا ہے جس کے سبب سے عورتوں کے حقوق تلف ہو رہے ہیں۔ اس وجہ سے حکومت کا، جو معاشرتی عدل کی ذمہ دار ہے، یہ فرض ہے کہ وہ اس اجازت پر ایسی پابندیاں عائد کر دے جن سے موجودہ خرابیوں کی ممکن حد تک اصلاح ہو سکے، کمیشن نے اپنے اس نقطۂ نظر کی تائید میں یہ بھی کہا ہے کہ بیماری پیدا ہو جانے کے بعد اس کے علاج کی فکر کرنے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ بیماری کے سبب ہی کا خاتمہ کر دیا جائے۔

سورۂ نساء کی آیت سے متعلق کمیشن کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ وہ ایک ہنگامی ضرورت کے موقع پر مسلمانوں کو تعدد ازدواج کی اجازت دینے کے لئے نازل ہوئی تھی، حقیقت یہ ہے کہ اسکی اجازت تو پہلے ہی سے موجود تھی، چنانچہ اسی اجازت کے تحت خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں ایک سے زیادہ بیویاں تھیں اور صحابہ میں سے بھی بہت سے لوگوں نے ایک سے زیادہ نکاح کر رکھے تھے، اس آیت نے اجازت دی نہیں بلکہ سابق اجازت سے اُس ایمرجنسی میں فائدہ اٹھانے کی مسلمانوں کو ہدایت کی جس سے اس وقت مسلمان دوچار تھے اور مزید براں اس نے سابق اجازت پر چند پابندیاں بھی عائد کر دیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد یہ نہیں ہوا کہ یتیموں اور بیواؤں کی مصلحت کے تحت مسلمانوں نے ایک سے زیادہ نکاح کرنے شروع کئے ہوں بلکہ ہوا یہ کہ جن کے نکاح میں چار سے زیادہ عورتیں تھیں انھوں نے ان کو طلاق دیدی اور جو لوگ عدل کا اہتمام نہیں کر رہے تھے وہ عدل کا اہتمام کرنے لگے۔

اس وجہ سے یہ کہنا تو بالکل ہی غلط ہے کہ اس آیت نے مسلمانوں کو محض یتیموں اور بیواؤں کی مصلحت کے تحت ایک سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت دی تھی۔ اگر کہی جا سکتی ہے تو یہ بات کہی جا سکتی ہو کہ مسلمانوں کو تعددِ ازدواج کی جو اجازت پہلے سے حاصل تھی، اس آیت نے اس اجازت کو ایک خدمت اور ایثار کے لئے استعمال کرنے کی تلقین کی، وہ یہ کہ وہ اس کو یتیموں کی مصلحت کے لئے استعمال کریں اور حتی الامکان ان کی ماؤں سے نکاح کریں تاکہ یتیموں کا مسئلہ بھی حل ہو اور بیواؤں کی امداد اور پرورش کی بھی ایک صورت پیدا ہو۔

اسلام نے تعدد ازدواج کی اجازت صرف یتیموں ہی کی مصلحت کے تحت نہیں دی ہے بلکہ بہت سی مصلحتوں کے تحت دی ہو جن میں بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے:-

(۱) بعض اوقات دین کے مصالح کا تقاضا ہوتا ہے کہ ایک شخص ایک سے زیادہ شادیاں کرے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد نکاح کئے اور ان میں سے کسی ایک نکاح میں بھی یتامیٰ کی مصلحت کا کوئی سوال نہیں تھا، البتہ

بحیثیت مجموعی دین کی مصلحت آپ کے تعدد ازدواج میں نمایاں نظر آتی ہے۔ سورۂ احزاب میں حضورؐ کی ازواج کو جو نصیحتیں اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت دین کی جو ذمہ داری آپ پر ڈالی گئی تھی، اس میں آپ کی ازواج مطہرات بھی شریک تھیں، ان کو یہ ہدایت ملی ہوئی تھی کہ تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور حکمت کی جو باتیں پڑھی جاتی ہیں ان کا چرچا کرو"۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ خواتین کے طبقہ میں شریعت کی باتیں زیادہ تر امہات المؤمنین ہی کے ذریعہ سے پہنچیں، عموماً وہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خواتین کے درمیان واسطہ بنتی تھیں اور آپ سے دین کو سیکھ کر امت کی بہنوں، بیٹیوں کو سکھاتی تھیں۔ اس سلسلہ میں ازواج مطہرات کا سب سے بڑا ایثار جس کے بارِ ممنونیت سے کسی شخص کی بھی گردن نہیں اُٹھ سکتی، یہ ہو کہ ان کی زندگی کا کوئی حصہ بھی پرائیویٹ نہیں رہ گیا۔ جو باتیں میاں اور بیوی کے درمیان راز ہوتی ہیں اور کسی کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ انکی ٹوہ لگائے اور نہ کوئی از خود ان کو ظاہر کرنا پسند کرتا ہے، ازواج مطہرات کی وہ باتیں بھی امت کی تعلیم کے لئے لوگوں کے سامنے آئیں اور یہ انھی چیزوں کی برکت ہے کہ ہماری پرائیویٹ زندگی کے نہاں خانوں میں بھی تزکیہ کی روشنی داخل ہوئی، خصوصیت کے ساتھ اس تعلیم و تزکیہ میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا جو حصہ ہے اسکی شکرگزاری کے حق سے نہ تو عورتیں کبھی سبکدوش ہوسکتی ہیں اور نہ مرد۔

۲۔ بعض اوقات قومی اور سماجی مصالح کا تقاضا ہوتا ہے کہ مرد ایک سے زیادہ شادیاں کریں اسکی بہترین مثال خود سورۂ نساء کی مذکورہ آیت ہی میں ہے۔ جب جنگ کے سبب سے یتیموں اور بیواؤں کا مسئلہ اسلام کے سامنے آیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ ان کو معاشرہ میں باعزت جگہ دلانے کے لئے تعدد ازدواج کی موجودہ اجازت سے فائدہ اُٹھایا جائے، آج بعینہ یہی مسئلہ انگلستان اور یورپ کے بہت سے ملکوں میں پچھلی دو جنگوں کے سبب سے پیدا ہو گیا ہے اور اس نے ان کے پورے سماجی نظام کو تہ و بالا کر دیا ہے لیکن وہاں کے لال بجھکڑ لوگ ساری ذلتیں جھیل رہے ہیں، گلی گلی عورتیں ماری ماری پھر رہی ہیں لیکن یک زوجگی کا قانون ان کے پاؤں میں ایک ایسی زنجیر بن کے رہ گیا ہے کہ اسکی اصلاح کے لئے کوئی قدم اُٹھانا ان کے لئے ناممکن ہے، آج انگلستان وغیرہ میں اس قانون کے سبب سے عورتوں کا جو حال ہے اس کا اندازہ ایک نامہ نگار کے مندرجہ ذیل بیان سے کیجئے:۔

"۱۹۱۴ء اور ۱۹۳۹ء کی عالمگیر جنگوں نے انگلستان میں عورتوں کا تناسب مردوں سے زیادہ کر دیا ہے، چنانچہ یہاں اکثر عورتیں شادی کا ارمان دل ہی میں لئے ہوئے بوڑھی ہو جاتی ہیں۔

یوں تو وہ زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہوتی رہتی ہیں لیکن زندگی کا حقیقی سکون انھیں میسر نہیں آسکتا۔ لندن کے ایک پادری صاحب کہتے ہیں کہ آج کل اگر غلطی سے کسی دوشیزہ کو شادی شدہ سمجھ لیا جائے تو وہ چند لمحوں کے لئے باغ باغ ہو جاتی ہے۔"

اکثر کنواری لڑکیوں نے زندگی کا مقصد ہی شادی سمجھ رکھا ہے، وہ شادی کے لئے ماری ماری پھرتی ہیں اور انھیں جو لڑکا بھی مل جاتا ہے اسے اپنا ممکن شوہر سمجھنا شروع کر دیتی ہیں۔ پادری صاحب مزید فرماتے ہیں:۔

"جو دوشیزائیں مسز کہلا سکتی ہیں وہ اپنے آپ کو اعلیٰ وارفع سمجھنا شروع کر دیتی ہیں، اور احساس برتری کے مرض کا شکار ہو جاتی ہیں، وہ اُن سہیلیوں کو ذرا نفرت سے دیکھنا شروع کر دیتی ہیں جن کو شوہر نہیں ملتے۔ عام لڑکیاں جب ایک دوسرے سے ملتی ہیں تو سب سے پہلے ان کی نگاہیں دوسری کی انگلی میں "شادی کی انگوٹھی" تلاش کرتی ہیں، ان حالات میں لڑکیاں شادی کے خیال ہی سے محبت شروع کر دیتی ہیں"۔

"پادری صاحب نے گلہ کیا ہو کہ لڑکی جونہی پندرہ کے سن میں پہنچتی ہے اسے شادی کا خیال ستانا شروع کر دیتا ہے۔ دراصل یہ شکایت فضول ہے، انگلستان اور یورپ میں مردوں کی کمی ایک مسئلہ بن چکی ہے اور مغربی تہذیب میں بے راہ روی کے جو گھناؤنے مظاہرے نظر آتے ہیں اسکی وجہ یہی مردوں کی کمی ہے، عورت کی شادی کی خواہش ایک قدرتی خواہش ہے لیکن مغرب کے داناؤں نے اس کا علاج یہ نکالا ہے کہ مرد شادی تو ایک ہی کرے لیکن عیاشی جتنی عورتوں سے چاہے کرے، مغربی تہذیب، مذہب اور قانون یہ تو برداشت کر لیتے ہیں کہ شادی شدہ مرد داشتہ رکھے لیکن دوسری شادی، ان کے نزدیک معیوب اور خلاف تہذیب ہے"۔

لندن میں تمام ملک سے لڑکیوں کے کھنچ کھنچ کر جمع ہونے کے اسباب اور وہاں ان کے مشاغل کی تفصیل نامہ نگار یوں بیان کرتا ہے:۔

"گھر میں ماں "بوائے فرینڈ" سے ملنے پر اعتراض کرتی تھی، یہاں ترقی کے مواقع زیادہ ہیں منگیتر سے جھگڑا ہو گیا تھا، ایکٹرس بننے کا شوق بھی صاحبزادیوں کو پڑتا ہے اور کچھ دنیا دیکھنے گھر سے نکل کھڑی ہوتی ہیں اور پھر یہاں پر سیکڑوں شناخون والے "لائنز" اور اے، بی، سی

سستے کھانے والے ریستوران ہیں، جہاں ہزاروں لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ "وول ورتھ" اور "اسپنسر اینڈ مارکس" کے وسیع و عریض اسٹوروں میں شاپ گرل بن سکتی ہیں۔ ہوٹلوں میں "ویٹرس" بن سکتی سکریٹری بن سکتی ہیں اور فوٹوگرافوں کے "ماڈل" اور ہندستانی اور پاکستانی شہزادوں کے "حرم" کی زینت ـــ"

"ان میں سے اکثر چار پانچ پونڈ سے لے کر سات آٹھ پونڈ فی ہفتہ تک کماتی ہیں جس سے بمشکل اپنا ضروری خرچ چلاتی ہیں اور جنھیں کچھ بچا کر اپنے بوڑھے ماں باپ کو بھی بھیجنا ہوتا ہے وہ زندہ رہنے کے لئے پوری غذا بھی نہیں کھا سکتیں ..... اور تقریباً تمام ہی شام کو تفریح کے لئے "شکار" کی تلاش میں رہتی ہیں جو انھیں پکچر دکھادے، ریستوران میں ایک وقت کا کھانا کھلادے، یا کسی اچھے کافی ہاؤس میں کافی کی ایک پیالی ہی پلادے اور انھیں اس "آزادی" اور "دنیا دیکھنے" کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے"

"یہاں عورت آزاد ہے لیکن اسکی حالت قابل رحم ہے۔ یہاں عام عورت کی کوئی عزت نہیں، کوئی مقام نہیں، اگر وہ مشرق کی "مظلوم عورت" کی "جیل کی زندگی" کی ایک جھلک دیکھ لے تو آزادی اور مساوات سے فوراً توبہ کرلے، یہاں ہزاروں عورتیں ساری عمر گھر اور اولاد کو ترستے ہوئے زندگی بسر کر دیتی ہیں۔ اور انھیں اپنی مظلومی اور کس مپرسی کا پورا احساس ہے۔"

یہ ہے انگلستان اور یورپ کے اکثر ملکوں کے معاشرہ کا حال۔ قوم کی قوم آبرو باختہ بن کر رہ گئی ہے۔ عفت اور پاکدامنی کا تصور بھی ذہنوں سے غائب ہو چکا ہے، مرد عورت کے تعاقب سے چیخ اٹھے ہیں اور عورت نے مرد کی جستجو میں شرم و حیا کے سارے پردے اٹھا دئیے ہیں، یہ سب کچھ صاحب لوگوں کو گوارا ہے لیکن اگر نہیں گوارا ہے تو تعدد ازدواج جو اس مشکل کا واحد حل ہے۔

بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ اگر کسی آفت کے سبب سے عورتوں کی تعداد زیادہ ہو جانے کی صورت میں تم مردوں کو یہ اجازت دیتے ہو کہ وہ ایک سے زیادہ شادیاں کریں تو یہی اجازت تمھیں عورتوں کو اس صورت میں دینی چاہیے جب کسی آفت ارضی و سماوی کے سبب کسی ملک میں عورتوں کی تعداد کم ہو جائے اور مرد زیادہ ہو جائیں، یہ اعتراض ہمارے نزدیک بالکل بے حقیقت ہے۔ جہاں تک قدرت کا تعلق ہے وہ اس معاملہ میں کبھی ایسا عدم توازن پیدا نہیں ہونے دیتی جس کا علاج خود اس کسر و انکسار سے نہ ہوتا رہے جو

اس کے اپنے نظام میں واقع ہوتا رہتا ہے، وہ عورتوں اور مردوں کو پیدا بھی ایک خاص تناسب کے ساتھ کرتی ہے اور اسکی طرف سے جو بیماریاں اور آفتیں آتی ہیں وہ مارتی بھی عورتوں اور مردوں کو ایک خاص تناسب ہی کیساتھ ہیں، وہ نہ تو پیدا کرنے میں کبھی یہ شکل اختیار کرتی ہے کہ کسی قوم میں عورتیں ہی عورتیں پیدا ہو جائیں، مرد پیدا ہی نہ ہوں، یا اتنی کم تعداد میں پیدا ہوں کہ قوم کے لئے ان کی کمی ایک مسئلہ بنجائے اور نہ اس نے مارنے میں کبھی یہ صورت اختیار کی ہے کہ چن چن کر مردوں کو مار دے اور عورتیں بچی رہ جائیں، یہ صورت تو تاریخ میں جب کبھی پیدا ہوئی ہے کسی جنگ ہی کے سبب سے پیدا ہوئی ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ جنگ کے لئے فطری طور پر مرد ہی موزوں بھی ہے اور اسی کو یہ کام کرنا بھی پڑتا ہے، عورت کے لئے یہ کام نہ تو موزوں ہی ہے اور نہ کبھی مردوں کی غیرت نے یہ گوارا ہی کیا ہے کہ وہ جنگ اور دفاع کی ذمہ داریاں عورت پر ڈال دیں، اسلام ایک دین فطرت ہے اس وجہ سے اس نے تو یہ پسند کیا ہے کہ عورتیں جنگ کے لئے نکلیں اور نہ یہ اجازت دی ہے کہ دشمن قوم کے بچوں اور ان کی عورتوں کو قتل کیا جائے۔ اسلام کے قانون جنگ میں عورت غیر مصافی آبادی سے تعلق رکھتی ہے اس وجہ سے ایک اسلامی حکومت میں جنگ کے سبب سے عورتوں کی تعداد کے کم ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، البتہ جن قوموں نے آج عورت کو بھی محاذ جنگ پر لا کھڑا کیا ہے ان کے ہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے لیکن وہ بھی اس صورت میں جب مرد گھروں میں گھس کر بیٹھ رہیں اور جنگ کا کام صرف عورتیں ہی سنبھالنے پر مجبور کر دی جائیں۔ اگر اس چیز کی وجہ سے یہ سوال کسی قوم کے اندر پیدا ہوا تو اس کے حل کرنے کی ذمہ داری خود اس پر ہے نہ کہ اسلام پر جو اس صورت حال ہی کو سرے سے خلاف فطرت قرار دیتا ہے۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر انگلستان اور یورپ کے ممالک میں مردوں کی کمی اور عورتوں کی زیادتی کے سبب سے ایسی صورت پیدا ہو گئی ہے کہ تعدد ازدواج کے بغیر وہاں کا معاشرتی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تو وہاں اسکی اجازت ہونی چاہیے لیکن ہمارے معاشرہ میں جہاں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابل میں کچھ کم ہی ہے یہ اجازت کیوں دی جائے؟ اس کے جواب میں گزارش ہے کہ اگر ہمارے ہاں عورتوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے تو یہاں تعدد ازدواج کا رواج کہاں زیادہ ہے؟ خود کمیشن نے جو اس بیماری کا انسداد کرنے کیلئے آستینیں چڑھائے ہوئے ہے، اپنی اسی رپورٹ میں صاف الفاظ میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ہمارے معاشرہ میں تعدد ازدواج کا رواج بہت کم۔ اگر کم ہے اور یقیناً کم ہے تو آخر اس شد و مد سے اس کے خلاف محاذ

قائم کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی ہے؟ اگر آپ کہتے ہیں کہ اس کا رواج کم سہی لیکن اس کے سبب معاشرہ میں بعض ناانصافیاں پائی جاتی ہیں، تو کوشش ان ناانصافیوں کو دور کرنے کی کیجئے ....

.... نہ کہ چند بے انصافیوں کو دور کرنے کے لئے ہزاروں فتنوں کے دروازے کھول دیجئے، یہ ناانصافیاں تو جیسا کہ ہم آگے چلکر واضح کریں گے اس اجازت کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ تمام تر ہمارے موجودہ نظام اور موجودہ معاشرہ کی غفلتوں کا نتیجہ ہیں، پھر اپنی حماقتوں کی اصلاح کرنے کے بجائے یہ اسلام کی "اصلاح" کی کوشش کیوں کی جارہی ہے؟

۳۔ بعض اوقات ایک شخص محض اپنے گھر کے نظم کو ٹھیک رکھنے اور اپنے آپ کو کسی عفیفہ کو تہمتوں اور بدگمانیوں سے بچانے کے لئے مجبور ہوتا ہے کہ ایک سے زیادہ شادیاں کرے، فرض کیجئے ایک شخص کے گھر میں ایک بیوہ ہے، اسکے بچے ہیں جن کا ولی یہی شخص ہے، عورت اپنے بچوں کے خیال سے یا کسی دوسرے سبب سے یہ پسند نہیں کرتی کہ کسی اور خاندان میں نکاح کرے اور یہاں نکاح کے بغیر رہنے میں اندیشہ ہو کہ وہ کہیں کسی فتنہ میں نہ پڑجائے یا بیجا بدگمانیوں کا ہدف بنے، ان مختلف اسباب سے یہ شخص اس عورت سے نکاح کرلیتا ہے، اسلام میں یہ بات نہایت پسندیدہ اور اخلاق اور مروت دونوں اعتبار سے نہایت اعلیٰ ہے لیکن کمیشن کے نزدیک یہ ایک جرم ہے۔

۴۔ بعض اوقات ایک شخص اپنے اخلاقی تحفظ کے لئے مجبور ہوتا ہے کہ ایک سے زیادہ شادیاں کرے فرض کیجئے ایک شخص ہو، اسکی بیوی کمزور صحت کی ہے، وہ زیادہ اولاد کا بوجھ برداشت نہیں کرسکتی، میاں بیوی برتھ کنٹرول کو بھی ناجائز سمجھتے ہیں، شوہر آوارگی اور بدچلنی پر بھی راضی نہیں ہے یا فرض کیجئے ایک شخص ہے اس کا دل کسی عورت پر آگیا ہے، وہ محسوس کرتا ہے کہ اگر اسکے ساتھ نکاح نہ کرلیا تو وہ کسی فتنے میں مبتلا ہوجائیگا یا وہ اپنے اندر مفرط جنسی جذبہ رکھتا ہے، لیکن اسلام کے اخلاقی حدود کا سختی کے ساتھ پابند ہے ایسی صورتوں میں مغربی سوسائٹی تو مرد کو قحبہ خانوں، نائٹ کلبوں اور عیاشی کے دوسرے اڈوں کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور جو عورت بھی اس سے اختلاط پر راضی ہوجائے اس سے آزادانہ تمتع کی اجازت دیتی ہے، لیکن اسلام اس کو ان ساری حرکتوں پر سخت سے سخت دنیوی سزا کی دھمکی اور اخروی عذاب کی وعید سناتا ہے، البتہ اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ عدل کی شرط پوری کرسکتا ہو تو ایک سے زیادہ شادیاں کرلے۔

اس پر بعض لوگ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ اگر کسی مرد کے مفرط جنسی جذبہ کی رعایت میں اس کو ایک سے

زائد نکاح کی اجازت دی جا سکتی ہے تو یہی جذبہ اگر کسی عورت کے اندر مفرط حد تک ہو تو اسے بھی ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت ہونی چاہیئے، یہ اعتراض جن لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے وہ علم الحیات کے مبادی تک سے ناواقف ہیں، ایک مرد اگر ہزار عورتوں کے پاس بھی جائے تو وہ ان سب کو حاملہ کر سکتا ہے لیکن ایک عورت خواہ کتنے ہی مردوں کے پاس چلی جائے، بہرحال وہ حاملہ ایک ہی مرد سے ہوگی، یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ ایک مرد کی کئی بیویاں ہونا تو فطرت کے مطابق ہے مگر ایک عورت کے کئی شوہر ہونا مطابق فطرت نہیں ہے علاوہ بریں ایک مرد کے کئی عورتوں کے پاس جانے کی صورت میں یہ بات یقینی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ اولاد اسی کی ہے لیکن ایک عورت اگر کئی مردوں کے پاس جائے تو یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ اولاد ان میں سے کس کی ہے، اس طرح کثرت زوجات سے تو خاندانی زندگی کا نظام درہم برہم نہیں ہوتا مگر کثرت ازواج سے وہ درہم برہم ہو جاتا ہے اسلام چونکہ کسی بوالفضول آدمی کے دماغی بحران کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ فاطر کائنات کا مقرر کیا ہوا دین فطرت ہے اس لئے وہ ان فطری حقائق کی بنا پر مرد کے مفرط جنسی جذبہ کے لئے تو دو یا زائد شادیوں کی اجازت دیتا ہے لیکن اگر کسی عورت میں طبعاً یہ خواہش اعتدال سے زیادہ ہو تو اسے صبر کی تلقین کرتا ہے، یا حد سے حد یہ کہ وہ ایک سے خلع لیکر دوسرے سے نکاح کر لے، واقعہ یہ ہے کہ جو عورت حاملہ ہوتی ہے، بچے جنتی ہے، دودھ پلاتی ہے، گھر گرہستی کی ذمہ داریوں میں مشغول رہتی ہے اور اپنا فاضل وقت کسی اچھے کام میں صرف کرتی ہے اس پر شاید ہی کبھی اتنا اضطراب طاری ہوتا ہو کہ وہ حدود توڑنے پر آمادہ ہو جائے اور ایک اسلامی معاشرہ میں ایک پسندیدہ عورت کے یہی اوصاف ہیں۔ رہی وہ عورت جو نہ حاملہ ہوتی ہے، نہ بچے جنتی ہے، نہ دودھ پلاتی ہے اور نہ اس کے ذمہ گھر گرہستی کی کوئی ذمہ داری ہو بلکہ بناؤ سنگار کرکے وہ صرف سیر سپاٹے میں مشغول رہتی ہو، مردوں سے آزادانہ اختلاط رکھتی ہے، رقص خانوں، کلبوں، سینماؤں اور مخلوط مجالس اور تقریبات میں گلچھرے اڑاتی ہے اور اپنا بہت سا وقت جنسی افسانوں اور ناولوں کے پڑھنے اور ریڈیو کے عشقیہ گانے سننے میں گزارتی ہے اس میں بلاشبہ مفرط جنسی جذبہ بھڑک اٹھتا ہے، مگر اس کی تسکین کی ذمہ داری نہ اسلام نے لی ہے اور نہ کوئی اور لے سکتا ہے۔

بعض لوگ یہ بھی پوچھتے ہیں کہ اگر اسلام میں عورت کو ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت نہ دینے کی وجہ مرد کی غیرت ہے تو یہ غیرت عورت میں بھی موجود ہے بلکہ مرد سے کچھ زیادہ ہی ہے، پھر مرد کو ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت کیوں دیدی گئی؟ آخر اس چیز کو عورت کی غیرت کس طرح برداشت کر سکتی ہے؟ یہ اعتراض محض اس وجہ سے

پیدا ہوا ہے کہ لوگ عورت کے لئے اس ممانعت کا سبب صرف مرد کی غیرت ہی کو سمجھتے ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ اسکا سبب مرد کی غیرت بھی ہو اور عورت کی غیرت کے مقابل میں مرد کی غیرت چونکہ سخت جارحانہ مزاج رکھتی ہے اس وجہ سے وہ نسبتاً زیادہ قابل لحاظ بھی ہے لیکن اس ممانعت کے اصل اسباب وہ ہیں جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں خصوصیت کے ساتھ اس سے مقصود اختلاط نسب سے معاشرہ کو بچانا ہے، اگر اختلاط نسب سے معاشرہ کو محفوظ نہ رکھا جائے تو پھر ہمارا معاشرہ انسانی معاشرہ نہیں رہے گا بلکہ حیوانی گلوں سے بھی بدتر ہو جائے گا۔

الغرض تعدد ازدواج کی اجازت کا کوئی ایک ہی سبب نہیں ہے بلکہ اس کے بہت سے اسباب ہیں جن کا صحیح صحیح اندازہ کوئی عدالت نہیں کر سکتی۔ ہر شخص اپنے متعلق زیادہ بہتر طریقہ پر خود ہی فیصلہ کر سکتا ہے، رہی یہ بات کہ چونکہ عام طور پر لوگ ان شرائط کی پابندی نہیں کر رہے ہیں جو تعدد ازدواج پر اسلام نے عائد کی ہیں اس وجہ سے حکومت کو حق ہے کہ وہ اس اجازت پر مزید پابندیاں عائد کر دے یا اس اجازت کو سرے سے منسوخ ہی کر دے تو یہ بات کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔

اولاً تو ایک چیز پر اسلام نے جو شرطیں عائد کی ہیں ان کے علاوہ اس پر مزید شرطیں عائد کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔ اہتمام اس کا ہونا چاہئے کہ جو شرطیں اسلام نے عائد کی ہیں وہ پوری کی جائیں نہ کہ ان پر کچھ اور قیدوں اور شرطوں کا اضافہ کیا جائے۔ اگر خیال یہ ہے کہ ان اضافوں کے بغیر اسلام کی عائد کردہ شرطیں پوری کرائی ہی نہیں جا سکتیں تو یہ اسلام کا نقص ہوا اور اس بات کو صرف وہی لوگ صحیح مان سکتے ہیں جو اسلام کو ایک دین کامل نہ مانتے ہوں، اسی طرح کے اضافوں سے تو یہودیوں نے اپنی شریعت کو اصرو اغلال کا ایک مجموعہ بنا کے رکھ دیا اور حضرت نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت میں سے ایک اہم مقصد ان اصرو اغلال سے دنیا کو نجات دینا بھی تھا، کمیشن ایک طرف تو یہودیوں کی اس روش پر ماتم کرتا ہے اور دوسری طرف اسی یہودیت کی پیروی خود کر رہا ہے۔

اسلام نے اضطرار کی حالت میں کوئی حرام چیز کھا لینے کی اجازت دی ہے لیکن اس اجازت کے ساتھ غیر باغ ولا عاد کی قید بھی لگائی ہے، یعنی کوئی شخص اگر حرام کھانے پر مجبور ہی ہو جائے تو نہ تو وہ اس حرام چیز کو خواہش اور رغبت کے ساتھ کھائے اور نہ سدرمق سے زیادہ کھائے۔ معلوم ہے کہ بہتیرے لوگ اس شرط کا اہتمام نہیں کرتے بلکہ کسی معمولی سے عذر کو بھی بہانہ بنا کر خدا کی اس قائم کردہ حد سے بالکل بے پروا ہو جاتے ہیں، اب کیا یہ بات جائز ہو گی کہ ایک قانون بنا دیا جائے کہ کوئی شخص جب تک سرکاری ڈاکٹر یا کسی مجسٹریٹ سے

اضطرار کا سرٹیفکیٹ نہ حاصل کرلے اس وقت تک وہ اس اجازت سے فائدہ نہ اٹھائے ؟ اسلام نے بعض حالتوں میں وضو کی جگہ تیمم کی اجازت دی ہے ۔ معلوم ہے کہ بہت سے لوگ اس اجازت سے بھی غلط فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ کیا اس کے سد باب کے لئے ایک مزید قید کا اضافہ کردیا جائے کہ جب تک قاضی شہر کسی شخص کو تیمم کی اجازت نہ دے اس وقت تک کوئی شخص تیمم کی اجازت سے فائدہ نہ اٹھائے ۔ اسلام نے میاں بیوی کو اجازت دی ہے کہ ایک مہر مقرر ہو جانے کے بعد اپنی باہمی رضامندی سے اس میں کمی بیشی کرسکتے ہیں ۔ معلوم ہے کہ اس باہمی رضامندی پر بسا اوقات کچھ رسم و رواج وغیرہ اور بعض دوسرے عوامل بھی اثر انداز ہوجاتے ہیں جس سے رضامندی حقیقی رضامندی باقی نہیں رہتی ، کیا اس کی وجہ سے یہ بات جائز ہوگی کہ اس معاملہ کو بھی اٹھاکر عدالت کے حوالہ کردیا جائے کہ جب تک وہ اس رضامندی کو رضامندی تسلیم نہ کرے اس وقت تک فریقین کو باہم کوئی تصفیہ کرنے کا حق نہ ہو ۔

ثانیاً غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ اگر لوگ اسلام کی اس اجازت سے غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں تو کیوں اٹھا رہے ہیں ؟ کیا اسلام کی یہ اجازت ہی غلط ہے ؟ یا اس نے جن شرائط سے مشروط کیا ہے وہ شرطیں ہی ناکافی اور ناقص ہیں ؟ یا اس کے اسباب کچھ اور ہیں ؟ جہاں تک اجازت اور اس کے شرائط کا تعلق ہے کمیشن نے (با دل ناخواستہ سہی) اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ اجازت مصلحت پر مبنی ہے اور اسکی شرطیں بھی عورت کے حقوق کیلئے ناکافی نہیں تھیں البتہ اس کو یہ شکایت ہے کہ لوگ اس اجازت سے غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اسکی شرطیں پوری نہیں کر رہے ہیں ۔ اب آئیے غور کیجئے کہ اگر لوگ یہ شرطیں پوری نہیں کر رہے ہیں تو کیوں نہیں کر رہے ہیں ۔ ہمارے نزدیک اسکی دو وجہیں ہیں :-

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ عام جہالت کے سبب سے نہ عورتوں کو اپنے حقوق کا علم ہی ہے اور نہ ان کے تحفظ کا احساس ۔ انگریزوں کے دور حکومت میں تو اس علم و احساس کے پیدا ہونے یا پیدا کئے جانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا ، انھوں نے تو ملک کے ایک بڑے حصہ میں عورتوں کو بالکل برادریوں کے رسم و رواج پر چھوڑ رکھا تھا ، جس کے سبب سے وہ ہندو عورتوں کی طرح بالکل اپنے خاندانوں کے رحم و کرم پر تھیں نہ ان کے کوئی حقوق تھے اور نہ ان کے اندر حقوق کا احساس پیدا کرنے کی کسی کو فکر تھی ، پاکستان بننے کے بعد خدا خدا کر کے اتنا ہوا کہ ملک کے اکثر حصوں میں میراث سے متعلق اسلامی قانون نافذ ہوگیا لیکن ان کے اندر حقوق کا احساس پیدا کرنے کے لئے حکومت کی سرپرستی میں اگر کوئی کام ہوا ہے تو وہ اپواکی تنظیم ہے

جس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ عورتوں میں بے پردگی اور بے حیائی پھیلائی جائے اور ان کو مغربی عورتوں کی ریس کرنے کی تربیت دی جائے اور یہ کام بھی زیادہ تر اونچے درجہ کے خاندانوں کی بیگمات ہی کے اندر ہو رہا ہے۔ اس تنظیم کے ذریعہ سے اگر عورتوں کو کوئی سبق ملتا ہے تو یہ ملتا ہے کہ انھیں پریڈ کس طرح کرنی چاہیے اور سلامی کس طرح دینی چاہیے، رہی یہ بات کہ اسلام میں ان کے حقوق و فرائض کیا ہیں تو اس پر وہ غور کرنا اس وجہ سے غیر ضروری خیال کرتی ہیں کہ اسلام ان کے نزدیک خود ایک بیماری ہے جس کو جلدی سے جلدی دور کرنے کی وہ کوشش کر رہی ہیں۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر کسی میں اپنے حقوق کا احساس بھی ہو تو اس ملک میں اس کے حاصل کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں انگریزوں نے جو عدالتی نظام قائم کیا تھا (اور وہی اب تک جاری ہے) اس کے متعلق کمیشن نے خود نہایت پرسوز الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ اس سے کسی کمزور اور غریب کے لئے انصاف حاصل کرنا نا ممکن ہے۔ اگر کبھی اپنا حق حاصل کرنے کے لئے کسی مظلوم عورت اور اس کے اولیاء نے ان عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹایا بھی تو مدتوں کی دریوزہ گری اور ذلت و خواری کے بعد نقصان مایہ و شماتت ہمسایہ کے سوا کچھ پلے نہ پڑا، ورنہ سوچنے کی بات ہے کہ اسلام کے یہی قوانین اس زمانہ میں بھی تھے جب دنیا میں اسلام کا نظام قائم تھا۔ آخر اس زمانہ میں تعدد ازدواج کی عام اجازت کے باوجود کسی مرد کی یہ جرأت کیوں نہ ہو سکی کہ وہ کسی عورت کا کوئی معمولی سے معمولی حق بھی تلف کر سکے۔ ہر شخص کو پتہ تھا کہ اگر اس نے کوئی زیادتی کی تو اس حکومت میں وہ یہ زیادتی اس کے لئے مہنگی پڑے گی، اس نظام حکومت کا مزاج یہ ہے کہ اس میں ایک بے اثر سے زیادہ با اثر کوئی نہیں ہے، اگر وہ مظلوم ہے اور ایک با اثر سے زیادہ بے اثر کوئی نہیں ہے، اگر وہ ظالم ہو، اس میں ایک کمزور سے کمزور عورت کے لئے بھی نہ صرف قاضی القضاۃ کی عدالت عالیہ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں بلکہ خود صدر ریاست کے باب عالی پر بھی وہ جب چاہے دستک دے سکتی ہے اور کسی حاجب و دربان کی مجال نہیں ہے کہ اسے روک سکے، پھر ہر شخص کو یہ بھی پتہ تھا کہ ہر عورت یہ جانتی ہے کہ اسلام نے اس کو کیا حقوق دئے ہیں اور اس پر کیا ذمہ داریاں ڈالی ہیں۔ اس وجہ سے آسانی کے ساتھ اس کے حقوق غصب کرنے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا تھا، عورت بغیر کورٹ فیس داخل کئے، بغیر کسی درخواست پر کوئی اسٹامپ لگائے اور بغیر کسی وکیل صاحب کی جیبیں گرم کئے اپنا مقدمہ خود لڑ سکتی تھی اور اگر عدالت اس کے مقدمہ کو اچھی طرح سمجھنے

کے لئے کسی مدد کی محتاج ہوتی تھی تو اس کا بوجھ اس پر ڈالے بغیر خود اس کا انتظام کر لیتی تھی اگر عورتوں کے اندر ان کے حقوق کا علم و احساس آج بھی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور حقوق حاصل کرنے کا انتظام بھی سستا اور سہل مہیا کر دیا جائے تو کس کی مجال ہے کہ وہ اسلام کی ایک اجازت سے فائدہ تو اٹھائے لیکن اسلام نے اس سلسلہ میں جو ذمہ داریاں عائد کی ہیں وہ پوری نہ کرے۔

کمیشن نے اپنے نقطۂ نظر کی حمایت میں ایک نکتہ یہ بھی بیان کیا ہے کہ بیماری کا راستہ کھول دینے کے بعد علاج کا مشورہ دینے سے زیادہ دانشمندانہ طریقہ یہ ہے کہ سرے سے بیماری کے اسباب ہی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ کمیشن کا مطلب یہ ہے کہ تعدد ازدواج کی اجازت دے دینے کے بعد اس کے سبب پیدا شدہ ناانصافیوں کے ازالہ کی تدابیر سوچنے کے بجائے صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس اجازت ہی پر ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں کہ کسی تعدی یا ناانصافی کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو۔ یہ نکتہ ہے تو لطیف لیکن کمیشن نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ خود تعدد ازدواج کی اجازت بھی درحقیقت بہت سی اجتماعی عائلی اور شخصی بیماریوں کے سدباب کے لئے ہے، اگر آپ نے تعدد ازدواج سے پیدا شدہ بیماریوں کے علاج کے لئے سرے سے تعدد ازدواج ہی کو کالعدم قرار دیدیا تو پھر آپ کے معاشرہ میں، آپ کے خاندانوں میں اور آپ کی قوم میں وہ ساری بیماریاں پھوٹ پڑیں گی جن کو یہ تعدد ازدواج کی اجازت روکے ہوئے ہے لیکن ان وباؤں کی کمیشن کو تو اس وجہ سے کوئی فکر نہیں ہے کہ یہ ساری چیزیں تہذیب جدید کی رحمتیں اور برکتیں ہیں اور کمیشن کی دلی آرزو ہے کہ یہ رحمتیں اور برکتیں زیادہ سے زیادہ مقدار میں پاکستان میں برسیں اور لوگ ان سے فیضیاب ہوں۔

یہاں تک ہم نے ان دلائل کا جائزہ لیا ہے جو کمیشن نے اپنی سفارش کی تائید میں پیش کئے ہیں اب ہم وہ نتائج پیش کرنا چاہتے ہیں جو کمیشن کی اس سفارش کے قانون کی صورت اختیار کر لینے کے بعد سامنے آئیں گے۔

۱۔ جب کسی شخص کے لئے اس بات کا امکان باقی نہیں رہے گا کہ وہ جب تک اپنی پہلی بیوی کو بانجھ یا مدقوق یا فاتر العقل نہ ثابت کرے اس وقت تک دوسری شادی کر سکے تو لازماً دوسری شادی کے خواہشمندوں کا رجحان یہ ہو گا کہ وہ کسی طرح اپنی پہلی بیویوں سے جان چھڑائیں اور اس کا ممکن راستہ جو وہ سوچ سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ وہ ان کو طلاق دے دیں، اس طلاق کی راہ میں اگرچہ کمیشن نے بہت سی

رکاوٹیں ڈال دی ہیں، مثلاً یہ کہ اگر کوئی شخص بغیر کسی "سبب معقول" کے طلاق دے تو اس پر عورت کے عقد ثانی یا مدت حیات تک کے لئے اسکی کفالت کا بار ڈالا جا سکتا ہے لیکن ان رکاوٹوں کے باوجود نکاح جدید کے شوقین یا ضرورت مند راہ نکال ہی لیں گے، اگرچہ انھیں پہلی بیوی کو بر سر عدالت رسوا ہی کرنا پڑے، نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ بہت سی عورتیں جو آج اپنے گھروں میں رہ بس رہی ہیں وہ مطلقہ ہو کر اپنے گھروں سے نکلنے پر مجبور ہوں گی اور مطلقہ بھی بدنام اور عدالت سے مستند مطلقہ جن سے کوئی دوسرا مرد نکاح کرنے کی جرات مشکل ہی سے کر سکے گا۔

۲۔ اگر کوئی شخص اپنی پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسرا نکاح کرنا چاہے گا اور عدالت اس کے بیان کردہ وجوہ کو ناکافی سمجھ کر اسے ایسا کرنے کی اجازت نہ دے گی تو قانون کی اس مزاحمت سے مجبور ہو کر وہ اپنے ارادہ نکاح سے تو باز آجائے گا لیکن اپنی بیوی کو اپنے لئے ایک لعنت کا طوق سمجھنے لگے گا، یہ عورت اسکی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکے گی اور جب بھی اس کے چہرے پر اسکی نظر پڑے گی وہ یہ خیال کریگا کہ یہی بلائے جان ہے جس کے سبب سے وہ اپنے ایک جائز ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکا ممکن ہے بعض قانونی رکاوٹوں یا کسی ذاتی اور خاندانی مصلحت کی وجہ سے وہ اسکو طلاق نہ دے لیکن بیوی صاحبہ کو تھوڑے ہی عرصہ میں یہ تجربہ اچھی طرح ہو جائے گا کہ شوہر کی محبت عدالت اور قانون کے زور سے حاصل نہیں کی جا سکتی، شوہر کے دوسرا نکاح کر لینے کے بعد تو اس کا بہت امکان تھا کہ وہ اسکا پہلے سے بھی زیادہ خیال کرنے لگتا، اور اگر زیادہ محبت نہ کرتا تو کم از کم اس کے ساتھ انصاف ہی کرتا، لیکن اس صورت حال کے پیدا ہو جانے کے بعد تو وہ اس کو اپنی راہ کا صرف ایک پتھر ہی سمجھے گا، اور ہر وقت اسکی دلی آرزو یہی ہو گی کہ کب یہ پتھر اس کے راستہ سے ہٹے۔

۳۔ اور اگر وہ شخص شریعت اور اخلاق کی پابندیوں سے بالکل آزاد ہوگا (اور اس زمانہ میں زیادہ اشخاص ایسے ہی ہوں گے) تو وہ اپنی خواہشوں کی تکمیل میں دوسرے ناجائز راستے پیدا کرلے گا اور یہ راستے اس زمانہ میں ہر طرف کھلے ہوئے ہیں، وہ بیوی تو ایک ہی رکھے گا لیکن تعلقات دوسری کسی عورت یا عورتوں سے پیدا کریگا ان کے پیچھے اپنا ایمان و اخلاق برباد کریگا، اپنی عزت و شہرت تباہ کریگا، اپنی بیوی بچوں سے غفلت برتے گا اور اپنا مال دوسری جگہ لٹائے گا، بیوی صاحبہ اس پہلو سے تو شاید مطمئن ہوں کہ گھر میں کوئی باضابطہ سوکن وہ نہیں لا سکا لیکن حقیقت یہ ہو گی کہ نہ جانے کتنی ناجائز سوکنیں شوہر کے

دل اور اس کے مال میں ان کی شریک بن جائیں گی اور اس وقت کوئی جسٹس عبدالرشید اور کوئی خلیفہ عبدالحکیم ان سوکنوں سے نجات دلانے کے لئے سامنے نہیں آئیں گے اور نہ ان کے مقابل میں میاں کی تنخواہ کا کوئی حصہ ان بیوی اور ان کے بچوں کے لئے مخصوص کرا سکیں گے۔

۴۔ مردوں کی اس آزادی کا جو اثر عام معاشرہ پر پڑیگا وہ تو پڑے ہی گا، اس کا سب سے زیادہ خطرناک اثر گھروں پر پڑیگا۔ جن گھروں کے مرد یہ روش اختیار کریں گے ان گھروں کی عورتیں بھی آہستہ آہستہ اسی راہ پر چل پڑیں گی، جب وہ دیکھیں گی کہ میاں نے اپنی دل بستگی کے سامان اور پیدا کرلئے ہیں تو وہ اپنی دل بستگی کے سامان تلاش کرنے نکلیں گی، ممکن ہے شروع شروع میں کچھ حجاب سا ہو لیکن زیادہ زمانہ نہیں گزرے گا کہ وہ اپنے شوہروں سے بھی زیادہ بیباک ہو جائیں گی اور پھر ان کی اولاد کے لئے تو سب سے زیادہ جانی پہچانی ہوئی راہ یہی ہوگی، الغرض زیادہ عرصہ نہیں گزریگا کہ مغربی معاشرہ کی تمام لعنتیں ہمارے معاشرہ پر بھی مسلط ہو جائیں گی اور اس طرح مسلط ہو جائیں گی کہ پھر ان سے چھٹکارا حاصل کرنا ناممکن ہو جائے گا۔

۵۔ یہ قانون تعدد ازدواج کی برائی کو (اگر وہ برائی ہے) تو روکنے میں ذرا بھی کامیاب نہیں ہوگا، البتہ بہت سی عورتوں کو عدالتوں سے پاگل اور مدقوق ہونے کا سرٹیفکٹ دلوا دیگا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرہ کے غریب طبقوں میں تو تعدد ازدواج کا رواج بہت کم، بلکہ مفقود ہے، زیادہ تر، بلکہ تمام تر وہ خوشحال طبقہ میں پایا جاتا ہے، یہ قانون اس طبقے کو اس اجازت سے فائدہ اٹھانے میں مانع نہیں ہو سکتا کیونکہ کمیشن نے اس کے لئے دو شرطیں رکھی ہیں اور ان دونوں شرطوں کو پورا کرنا غربا اور عوام کے لئے تو بیشک ناممکن ہے لیکن خوشحال لوگ بڑی آسانی کے ساتھ یہ دونوں شرطیں پوری کر سکتے ہیں، ایک شرط تو یہ ہے کہ دوسری شادی کا خواہشمند عدالت کے سامنے یہ ثابت کر سکے کہ وہ دونوں کنبوں کی کفالت کا بندوبست ان کے معیار زندگی کے مطابق کر سکتا ہے۔ دوسری یہ کہ وہ اپنی موجودہ بیوی کو بانجھ یا مدقوق یا پاگل ثابت کر دے، جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے اس کی ضمانت دے دینا تو کسی خوشحال آدمی کے لئے مشکل ہے ہی نہیں، رہی دوسری چیز تو کسی دماغی امراض کے ہسپتال یا کسی ڈاکٹر سے بیوی کے لئے مدقوق یا پاگل ہونے کا سرٹیفکٹ حاصل کر لینا اس زمانہ میں کسی صاحب مال کے لئے کیا مشکل ہو۔ یہ نہ خیال کیجئے گا کہ میں محض صورت حال کو خوفناک دکھانے کے لئے

قیاس کے گھوڑے دوڑا رہا ہوں بلکہ اس طرح کے واقعات ہمارے ہاں ہوتے رہتے ہیں آج اگر کم ہو رہے ہیں تو اسکی وجہ یہ ہے کہ اسکی ضرورت کم پیش آتی ہے لیکن ضرورت ایجاد کی ماں ہے جب اسکی ضرورت پیش آئے گی تو آپ یقین کریں کہ اس کی بہت سی راہیں کھل جائیں گی، ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے کہ اخبارات میں یہ خبر چھپی تھی کہ ایک صاحب اپنی بیوی کو جو بیچاری اچھی خاصی تھی کار میں لاد کر لاہور کے مینٹل ہاسپٹل میں اس کے پاگل ہونے کا سرٹیفکٹ حاصل کرنے کے لئے لئے جا رہے تھے اور وہ غریب چیخ چیخ کر فریاد کر رہی تھی کہ یہ ظالم مجھے دیوانی ثابت کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ میں بالکل تندرست اور ہوش وحواس سے ہوں۔ لیکن شوہر صاحب اور ان کے مددگار اعزا اسکی اس چیخ پکار ہی کو اسکے پاگل ہونے کے ثبوت میں بطور دلیل پیش کر رہے تھے۔ لاہور کے ایک معاصر نے اس واقعہ کا حوالہ دیکر مجھ سے یہ سوال کیا ہو کہ "اگر میں کمیشن کی ان سفارشات کا مذہب کے خلاف ہونے کے سبب مخالف ہوں تو مردوں کے اس طرح کے مظالم کے سدباب کی میرے نزدیک کیا تدبیر ہے"۔ حالانکہ یہ سوال مجھ سے پوچھنے کا نہیں ہے بلکہ میاں عبدالرشید اور خلیفہ عبدالحکیم صاحب سے پوچھنے کا ہے جنھوں نے بڑی کاوش سے اپنی مزید بہت سی بہنوں کو پاگل بنوانے کی راہ کھولی ہے یا پھر اپوا کی ان بیگمات سے پوچھنے کا ہے جو کمیشن کی اس رپورٹ پر سر دُھن رہی ہیں اور بے قرار ہیں کہ انکی آزادی کا یہ چارٹر کب سفارش کے درجہ سے ترقی کر کے قانون کا مرتبہ حاصل کریگا۔

اسبابِ زوالِ اُمّت ___ اور مذہب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

[اس سال اپریل میں چند دن کے لیے لاہور جانا ہوا۔ وہاں والد ماجد کے ایک قدیم دوست (جو پاکستان ریلوے میں ایک بڑے عہدیدار ہیں) سے ملاقات ہوئی۔ عرصہ سے الفرقان ان کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ الفرقان کے بارے میں دریافت فرمانے لگے۔ مارچ کا شمارہ میرے پاس تھا وہ میں نے پیش کر دیا۔ اس میں پرویز صاحب کے نظریہ اتباع سنت پر میرے تنقیدی مقالہ کی پہلی قسط تھی۔ اسے دیکھ کر وہ ایک کتاب لائے کہ کچھ دن ہوئے کراچی جانا ہوا تھا۔ وہاں بعض احباب پرویز صاحب کے "معارف قرآنی" کی مجلس میں لے گئے۔ اور اس دن کے لکچر کی مناسبت سے پرویز صاحب کی کتاب "اسباب زوال امت" انھوں نے خریدلی کہ ذرا تفصیل سے پرویز صاحب کے خیالات کو جان سکیں ___ فرمانے لگے کہ کتاب پڑھ کر اس نتیجہ پر پہونچا کہ میرا ڈیڑھ روپیہ ضائع گیا۔ لیکن اب اگر تم اس کو لے جاؤ اور اس پر تنقید کرو تو میں سمجھوں گا کہ قیمت وصول ہوگئی۔ میں وعدہ کر کے کتاب لے آیا تھا۔ آج موقع ملا ہے کہ اس وعدہ کا ایفاء کردوں۔ ___ ع]

کتاب شروع سے آخر تک دیکھی۔ حاصل کتاب یہ ہے کہ مسلمانوں کے زوال اور ان کی ذلت و پستی کا واحد سبب ان کی موجودہ مذہبیت ہے۔ اصل دین جو قرآن نے پیش کیا تھا وہ عزت و سربلندی کے اعلیٰ منازل کا ضامن ہے لیکن عرصہ ہوا کہ مسلمانوں نے اسے چھوڑ دیا اور "دین" کے بجائے "مذہب" اختیار کر لیا۔ یہی مذہب ان کی ساری تباہی کا ذمہ دار ہے۔

"مذہب" سے کیا مراد ہے؟ اور وہ کیونکر امت کی موجودہ ذلت و خواری کا ذمہ دار ہے؟ اور "دین" سے کیا مراد ہے؟ اور وہ کیونکر عزت و سربلندی کا ضامن ہے؟

مذہب سے مراد؟ "مذہب سے" پرویز صاحب کی مراد ہو - دین کا وہ "غلط" تصور جو آج پایا جاتا ہے ـــ جس کی ابتداء بخیال پرویز صاحب، قرن اول کے بعد سے ہو گئی تھی ـــ اور وہ نقشۂ زندگی جو اس تصور کے اثر سے وجود میں آیا۔

اس تصور میں، آخرت، دنیا سے بالکل الگ اور ہر شخص کی بعد مرگ والی زندگی تھی جس میں کامیابی اور خوش عیشی کا طریقہ اس دنیا میں عزت و سرفرازی کے طریقے سے بالکل جدا تھا ـــ اور وہیں کی کامیابی مقصود زندگی! ـــ اور اس کے حصول کے طریقہ کا نام دین ـــ چنانچہ مسلمان اس عالم کی خوشحالی و سرفرازی کے طریقے اختیار کرنے سے دستبردار ہو گیے۔ جس کا لازمی نتیجہ ذلت و بدحالی تھا جو رفتہ رفتہ سامنے آ گیا۔

دین سے مراد؟ اس کے برعکس قرآن کا پیش کردہ نظریہ یہ تھا کہ دنیا اور آخرت کی زندگی میں کوئی دوئی نہیں، اور دین ان دونوں ہی میں (بیک وقت) کامیابی عطا کرنے والے نظام عمل کا نام ہے

استدلال[1] قرآن فرماتا ہے:-

الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ـ

اس ارشاد میں ایمان و تقویٰ اختیار کرنے والوں کو صرف آخرت کی نہیں بلکہ دنیا اور آخرت دونوں میں رس و کامرانی کی خوشخبری دی گئی ہے ـــ اور یہ معلوم ہے کہ "ایمان و تقویٰ" ہی کا نام دین ہے۔

قرآن صرف اتنا ہی بتانے پر اکتفا نہیں کرتا کہ دین، دنیا و آخرت دونوں میں سرفرازی کا ذریعہ ہے، بلکہ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ انھیں لوگوں کی کوششیں ٹھکانے لگیں گی اور انھیں کو عمل کا پھل ملے گا جو دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی اور خوشحالی مدنظر رکھتے ہیں۔

---

[1] واضح رہے کہ خود پرویز صاحب نے دعویٰ اور دلیل اس انداز میں پیش نہیں کیا ہو بلکہ انھوں نے اپنی ایک خاص ترتیب سے بات کہی ہو۔ لیکن ہمارے سامنے جب تنقید کا سوال آیا تو ضروری ہوا کہ ان کا استدلال منطقی ترتیب پر سامنے آئے۔ چنانچہ ہم نے ان کے دلائل کو سمجھنے کی کوشش کی اور جو کچھ اخذ کیا وہی یہاں استدلال کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہو۔ ہم نے اپنی دانست میں پرویز صاحب کی ترجمانی میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہو۔ اور کوشش کی ہے کہ ان کے استدلالی مواد کو زیادہ سے زیادہ طاقتور انداز میں پیش کریں۔

وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِمَّا كَسَبُوا۔ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ۔

اس سے بھی زیادہ وضاحت کی خاطر وہ کہتا ہے کہ جو لوگ آخرت کے یکسر منکر ہوں اور ان کی تگ و دو صرف دنیا کے لیے ہو۔ ان کی آخرت اگرچہ برباد ہو مگر دنیا میں انھیں کچھ نہ کچھ مل رہے گا۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ۔ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ۔ الآیۃ۔

لیکن جو آخرت کو تو مانتے ہوں مگر دنیا سے بالکل الگ ایک دنیا۔ ہر فرد کی بعد از مرگ دائمی زندگی۔ اور سمجھتے ہوں کہ یہاں کی زندگی کو وہاں کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ دنیاوی زندگی میں کامیابی کی راہ اور ہو اور اخروی زندگی میں کامیابی کی راہ اور۔ دونوں جہاں کا الگ الگ قانون ہے۔ وہ اگرچہ طالب آخرت ہوں مگر ان کو نہ کچھ دنیا میں ملنا ہو۔ نہ آخرت میں! دنیوی خسران پر تو وہ خود راضی ہوئے ہی تھے۔ آخرت میں بھی ان کے لیے ذلت و خواری کے سوا کچھ نہیں! ——— اس لیے کہ یہ شرک ہے۔ یہ کفر بعد الایمان ہے اور اسی کا نام "ایمان ببعض الکتاب" اور "کفر ببعض" ہے ——— اور ان سب باتوں کا نتیجہ قرآن نے صاف صاف لفظوں میں دنیا و آخرت دونوں کی بربادی۔ دونوں میں ذلت و خواری اور عذاب الیم میں گرفتاری بتایا ہو۔

پس اب یہ بات تو واضح ہوگئی کہ دین سے مراد کوئی ایسا ہی نظام زندگی ہو سکتا ہو جو آخرت کے ساتھ ساتھ دنیا میں بھی خوشحالی و سرفرازی کا ضامن ہو۔ کوئی ایسا نظام عمل جس سے دنیاوی زندگی کی کامیابی کا کوئی تعلق نہ ہو۔ ہرگز خدا کا پسندیدہ اور قرآن کا پیش کردہ دین نہیں کہلا سکتا۔

اب سوال یہ رہجاتا ہے کہ ایسا نظام زندگی اور ضابطۂ عمل کیا ہو سکتا ہو؟ جو دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کا ضامن ہو۔

اس سوال پر غور کرتے وقت یہ حقیقت پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ جہاں تک دنیا کا تعلق ہے۔ اس میں عزت و خوشحالی حاصل کرنے کا ایک ہی قانون ہے۔ جو ازل سے چلا آرہا ہے اور جس میں کبھی فرق نہیں ہوتا۔ یہاں جس کسی کو عزت و خوشحالی ملتی ہے اسی قانون پر عمل کرنے سے ملتی ہے۔

دنیاوی عزت وخوشحالی کیا ہے ؟ یہ کہ انسان کو سامانِ زیست پوری فراوانی اور آزادی کے ساتھ حاصل ہو۔ نہ کسی بالادست قوت کی محتاجی ہو اور نہ اس کا خوف سر پر سوار! اس شان کا سامان زیست اور قوت وثروت جس کے بعد نہ کسی کی محتاجی رہے اور نہ کسی کا خوف۔ حاصل ہونے کا واحد راستہ تسخیر فطرت کی جدوجہد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کے خزانے سامان زیست اور اسباب قوت سے بھر رکھے ہیں۔ اور انھیں طبعاً انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے۔ یہ کائنات جن قوانین کے ماتحت چل رہی ہو ان میں سے ایک یہ اٹل قانون ہے کہ اسباب زیست وہی پا سکتا ہو جو تسخیر فطرت کی جدوجہد کرے، یہ ہے دنیاوی زندگی میں عزت وخوشحالی کے حصول کا قانون، جس کا اتباع کیے بغیر کوئی فرد اور کوئی قوم اس دنیا میں عزت وخوشحالی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔

اس تجربی حقیقت کو اگر اس قرآنی تصریح کے ساتھ ملایا جائے کہ دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کا ایک ہی قانون ۔۔۔ اور ایک ہی طریقہ ہے۔ اور وہی دین ہے۔ الگ الگ قانون اور طریقہ کار ماننا شرک ہے۔ تو (جو سوال ماقبل میں اٹھایا گیا تھا اس کا) جواب قدرتی طور پر یہ نکلتا ہے کہ ایسا نظام عمل جو دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کا ضامن ہو وہی ہو سکتا ہو جو تسخیر فطرت اور اسباب زیست وسامان قوت کے حصول کی جدوجہد پر مشتمل ہو!

لیکن یہاں ایک دوسرا سوال پیدا ہو جاتا ہے، اور وہ یہ کہ تسخیر فطرت کی جدوجہد کو آخرت کی کامیابی سے کیا تعلق ؟ تسخیر فطرت کی جدوجہد سے عزت وخوشحالی کا حصول، آپ کو خود تسلیم ہے کہ ایک طبعیاتی قانون ہے۔ اس کا عمل عالم طبیعی ہی تک تو محدود ہوگا۔ لیکن جب انسان اس عالم کو چھوڑ گیا اور ایک دوسرے عالم میں پہونچ گیا تو اس جدوجہد کے نتیجہ میں اسے وہاں کیوں کر عزت وخوشحالی حاصل ہو جائے گی ؟ ـــــــ کس منطق سے ؟؟ اور کس اصول سے ؟؟؟

سوال بڑا ٹیڑھا ہے! منزل کے قریب پہونچ کر گاڑی اٹکی جا رہی ہے۔ اور لب بام سے دو چار ہی ہاتھ ڈوبے کمند جواب دے رہی ہے! ـــــــ ایک طرف یہ طے ہو کہ دنیوی عزت وخوشحالی کے حصول کا واحد طریقہ تسخیر فطرت کی جدوجہد ہے۔ دوسری طرف یہ طے کیا جا چکا ہے کہ دنیاوی عزت وخوشحالی اور اُخروی کامیابی کا راستہ ایک ہی ہے۔ اور تسخیر فطرت کی جدوجہد سے آخرت کی کامیابی کا جوڑ کسی منطق سے لگ نہیں رہا۔ بظاہر بڑی مشکل ہے جو لاینحل نظر آ رہی ہے!۔

مگر نہیں! پرویز صاحب کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ کوئی منطق ساتھ نہیں دیتی نہ دے! اللہ نے انھیں "بصیرت قرآنی" تو دی ہے۔ اور وہ بصیرت ایسے عقدوں کو چٹکی بجاتے میں حل کر دیتی ہے۔ چنانچہ اب وہ بصیرت حرکت میں آئی۔ اور ایک نکتۂ معرفت بیان ہوا ـــــــ اور سارے اشکالات کافور! ارشاد ہوا ـــــــ کہ

"اس میں شبہ نہیں کہ قرآن انسان کی پیدائش سے لیکر اس کی طبیعی موت تک کے عرصہ کو دنیا کی زندگی قرار دیتا ہو اور موت کے بعد پھر زندہ ہونے کو حیات اخروی سے تعبیر کرتا ہے۔ لیکن (اور یہ "لیکن" بہت اہم ہے) ...."

"قرآن نے دنیا اور آخرت کے الفاظ کو صرف اسی مفہوم کے لیے استعمال نہیں کیا۔ بلکہ اصطلاحی طور پر ان الفاظ کو اور معنوں میں بھی استعمال کیا ہو۔" (ص ۲۸-۲۹)

دنیا اور آخرت کے وہ اصطلاحی معنی کیا ہیں۔ جو پرویز صاحب کی بصیرت خاص پر منکشف ہوئے ہیں۔ (اسی طبیعی زندگی کا) حال اور مستقبل!

لیجئے اب ساری مشکل دور ہوگئی! جب آخرت کی زندگی عالم طبیعی سے باہر کی کوئی زندگی نہ رہی تو اب وہ اعتراض پیدا ہی نہیں ہوتا جو "باعث پریشانی قلب و نظر" بن رہا تھا، اور جس نے پرویز صاحب کے استدلال میں ایک شدید الجھن ڈالدی تھی۔

مگر اب ایک اور اعتراض اٹھ رہا ہو۔ اور وہ یہ کہ جب بعینہ وہی نظام عمل جو دنیوی عزت و خوشحالی کا ضامن ہے، آخرت کی کامیابی کا بھی ضامن ٹھہرا۔ تو پھر قرآن کے اس اعلان کے کیا معنی ہیں (جسے آپ اپنے استدلال میں استعمال کر آئے ہیں):

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا ـــــــ ؟

جس سے معلوم ہوا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنھیں دنیا (حال) کی تو کامیابی نصیب ہوگی مگر آخرت (مستقبل) میں تباہ حال رہیں گے۔ جب آخرت کی کامیابی بھی اسی طبیعی قانون سے وابستہ ہو جس کا اتباع دنیا کی کامیابی کے لیے شرط ہے تو پھر یہ کیسے ہوسکتا ہو کہ کسی کے حق میں اس اتباع کا طبیعی نتیجہ آخرت میں ظاہر ہونے سے رہ جائے؟ کیا کسی کے لیے آخرت میں کامیابی کا قانون کچھ اور رہو اور

کسی کے لیے کچھ اور؟

اس کے جواب میں پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ نادانو! تم قرآن کا مطلب نہیں سمجھے۔ اس آیت میں "العاجلة" سے مراد ہے مفاد عاجلہ۔ یعنی فوری، پیش پا افتادہ (یعنی صرف اپنا) مفاد۔ اور اسکے مقابلہ میں آگے جو "الآخرة" آیا ہے (ومن اراد الآخرة وسعى لها سعيها فاولئك كان سعيهم مشكورا۔) اس سے مراد ہو اپنے بعد آنے والی پوری انسانیت کا مفاد! ——— تو قرآن کا کہنا یہ ہے کہ جو لوگ تسخیر فطرت کی جد وجہد صرف اپنے لیے کرتے ہیں، ان کے پیش نظر صرف اپنا مفاد اور اپنی خوشحالی ہوتی ہے۔ ان کا حال تو روشن ہو جاتا ہے مگر مستقبل تاریک ہوتا ہے، اس کے برعکس جو لوگ بعد میں آنے والی پوری انسانیت (مستقبل) کی خوشحالی کو اپنا مقصود بناتے ہیں ان کا حال اور مستقبل دونوں روشن ہو جاتے ہیں۔ جس طرح ایک کسان اپنی فوری راحت کے لیے اپنے بیج والا غلہ پسا کر گھر لے آئے تو اس کے کچھ دن تو آرام سے کٹ جائیں گے اور فوری راحت مل جائے گی۔ مگر مستقبل کی خوشحالی سے وہ کوسوں دور ہو جائے گا۔ اس کے برعکس دوسرا کسان جو بیج والا غلہ مٹی میں ملا کر چلا آتا ہو۔ اس کو کچھ دن تو پریشانی ہوگی مگر فصل آتے ہی خوشحالی کا ایک ایسا دائرہ قائم ہو جائے گا جس میں حال اور مستقبل دونوں ملتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔ اب اس کے پاس آرام سے کھانے کے لیے بھی ہوگا اور آئندہ کی فصل اگانے کے لیے بھی! حال بھی بہتر اور مستقبل بھی روشن ——— "وكان سعيهم مشكورا"۔

اس تقریر دلپذیر پر کچھ اور سوالات بھی اٹھتے ہیں۔ مگر سر دست سلسلہ سوالات بند کیجیے اور پرویز صاحب کی استدلالی جد وجہد کو نتیجہ خیز ہو جانے دیجیے۔ باقی گفتگو پھر ہوتی رہے گی۔

ہاں تو پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ آخرت (آنے والی انسانیت) کو نظر انداز کرنے والے (منکر آخرت) اور پوری نسل انسانی کی فلاح کو مقصود بنانے والے (مؤمن بالآخرة) دونوں کا عمل تسخیر فطرت کی جد وجہد تک تو ظاہر ہے کہ یکساں رہے گا، البتہ اس جد وجہد کی کامیابی اور متاع زیست کی تحصیل کے بعد قدرتی طور پر ان کے طرز عمل میں فرق ہو جائے گا۔ جن کے پیش نظر صرف اپنا آپ تھا وہ اس حاصل شدہ سامان سے صرف خود فائدہ اٹھائے گا۔ اور جس نے بعد میں آنے والی پوری انسانیت کے مفاد کے لیے یہ پاپڑ بیلے تھے وہ اس حاصل شدہ متاع کو عام نوع انسانی میں اس طرح تقسیم کر دے گا کہ ہر فرد کی بنیادی ضروریات پوری ہوں اور تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کے نشو و نما کا سامان فراہم ہو۔ (کہ یہی عملی

صورت ہے بعد میں آنے والی انسانیت کے پھلنے پھولنے اور جادۂ ارتقاء پر گامزن رہنے کی!)

پس اب اس نظامِ زندگی اور ضابطۂ عمل کی دریافت مکمل ہوگئی۔ جو دنیا و آخرت (حال اور مستقبل) دونوں کی خوشحالی اور دونوں میں عزت و سرفرازی کا ضامن ہو۔ وہ نظام یہ ہے:۔

"متاعِ ارضی (دنیاوی اسبابِ زیست) کے حصول کے لیے ہر فرد کی اپنی بساط کے مطابق پوری جدوجہد اور کامل سعی و کاوش اور اس مجموعی ماحصل متاعِ ارضی کی تقسیم اس انداز سے کہ ہر فرد کو اس کی امکانی قوتوں ——— (POTENTIALITIES) کے نشوونما پانے FULLY DEVELOPED ہونے کے لیے پورے پورے اور یکساں مواقع میسر ہوں۔"

اور "اس انداز سے" تقسیم کا مطلب ہے

"تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہونچانا اور ان کی مضمر صلاحیتوں کے نشوونما کے سامان فراہم کرنا۔" (ص ۵۳)

اور اس دریافت کے بعد یہ بات آپ سے آپ متعین ہوگئی کہ "دین" اسی "تحصیل و تقسیم کے نظام" کا نام ہے!

لیکن اگر آپ کی "نافہمی" اور "مذہب پرستی" اس "کھلی ہوئی" بات کے سامنے بھی سرِ تسلیم خم نہیں کرنے دیتی۔ تو پھر مزید تشفی کے لیے سُن لیجئے کہ ——— اسلام کی سب سے پہلی داعی جماعت (کم سے کم صحابہ کرامؓ) بھی دین کا یہی تصور رکھتی تھی۔

"اس جماعت نے تسخیرِ فطرت سے کائنات کی بکھری ہوئی قوتیں اپنے قبضہ میں کی ہوئی تھیں اور ماحصلِ فطرت (متاعِ ارضی) کو آسمانی قوانین[1] (مستقل اقدار) کے مطابق تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس تحصیل و تقسیم کے نظام کا نام دین تھا۔" (ص ۵۳)

---

[1] "آسمانی قوانین کے مطابق تقسیم" کے الفاظ سے کہیں دھوکا نہ کھایئے گا۔ اس سے مراد تقسیم کا وہی "انداز" ہے جو اوپر کے اقتباس میں بیان ہوا ہے۔ اوپر کے اقتباس کی عبارت اس دوسرے اقتباس کے آخری (خط کشیدہ) فقرہ ہی کی شرح ہو جس سے پہلے (کتاب میں) یعنی کا لفظ موجود ہے۔

اگر آپ اس پر بھی نہ سمجھیں تو پھر آپ کو خدا سمجھے! ——— اور سمجھ ہی رہا ہے کہ مسلمان ہونے کے باوجود ذلت و خواری میں گرفتار ہیں۔ اور پرویز صاحب بھی بیچارے مفت میں آپکے شریک حال ہیں۔!

مگر کیا بتایا جائے کہ اتنے مقامات معرفت اور نکات بصیرت کی سیر و سلوک کے بعد بھی ہم نہیں سمجھے اور نہ شاید آپ سمجھے ہوں ——— ہم کیوں نہیں سمجھے؟ اور کیا اشکالات ہیں پرویز صاحب کے دعوی کو قبول کرنے سے مانع ہو رہے ہیں؟ اگر پرویز صاحب سمجھنا چاہیں تو، اس کی بابت ہماری گزارشات حسب ذیل ہیں۔

مقصد کیا ہے؟ سب سے پہلی گزارش تو پرویز صاحب کی خدمت میں یہ ہے کہ آپ کا مقصد اس تحریر میں امت کے دنیوی زوال کے اسباب اور ان کے مقابلہ میں (ضمناً) عزت و کامرانی کے ذرائع کو بتانا تھا۔ تو آخر وہ "مذہب پرستوں" کے کون سے ایسے مستند اور قابل لحاظ نمائندگان ہیں جو سامان زیست اور قوت و ثروت کے حصول کے اس طبیعی قانون کا انکار کرتے اور اس سے استفادہ کو دین اور قرآنی تعلیمات کے خلاف ٹھہراتے ہیں جن کی ضد میں آکر آپنے اس قانون کے اتباع کو عین دین اور مقصد دعوت قرآنی ٹھہرانے کے لیے دینی اصطلاحات کے متواتر و متوارث مفہومات کو اس بری طرح ذبح کر ڈالا کہ

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے ✕ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

"مذہب پرستوں" کے ایسے نمائندوں کا واقعی ہمیں پتہ نہیں ہے۔ بڑی مہربانی ہوگی اگر پرویز صاحب ہمیں آگاہ کریں کہ وہ کون حضرات ہیں؟ اور زمین کے کس خطہ پر گورے یا پائے جاتے ہیں؟ ———

قرآن کہتا ہے "وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللّٰهِ" (اللہ کا فضل، رزق، اسباب معیشت اور سامان زیست تلاش کرو۔) کیا "مذہب پرستوں" کے مستند نمائندوں نے اس آیت کا مفہوم اور منشاء اس کے سوا اور کچھ بتایا ہے جو قوسین میں ظاہر کیا گیا؟ ——— وہ کہتا ہے وَاَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَّمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ۔ (اپنے اور اللہ کے دشمنوں کو ہیبت زدہ رکھنے کے لیے جس قدر بھی قوت و طاقت کے اسباب تم سے بن پڑیں جمع کرو۔) کیا کسی نے اس حکم قرآنی کے اس مفہوم سے انکار کیا ہے؟ ——— قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دین حق کے ساتھ مبعوث کرنے کا مقصد یہ بتاتا ہے کہ اس دین کو تمام ادیان پر غالب کیا جائے ———

(لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ) "مذہب پرستوں" کا کونسا قابل ذکر نمائندہ ہے جو اظہار دین کے لیے اعدادِ قوت کو منجملۂ ضروریات نہ تسلیم کرتا ہو؟ اور پھر اس حقیقت کے پیش نظر اس کا نہ قائل ہو کہ مسلمانوں کے لیے حصولِ قوت کی جد و جہد واجبات دینیہ میں سے ہے؟

پس جب سامان زیست کے حصول کی جد و جہد (ابتغاء فضل اللہ) کو حیات طبیعی کی ایک ناگزیر ضرورت سمجھ کر قرآن خود اس کی اجازت دیتا اور دشمنان دین و ملت کے مقابلہ میں عزت و غلبہ کی زندگی بسر کرنے کے لیے (اس عالم طبیعی کی ضروریات کے پیش نظر) اسباب قوت و ثروت کے حصول پر ابھارتا ہے۔ اور جب اس کے منشاء اظہار دین کو پورا کرنے کے لیے اسباب قوت کے حصول کی جد و جہد خود بخود واجبات دینیہ میں سے ہو جاتی ہے، تو پھر آخر اسکی کیا ضرورت پیش آرہی ہے کہ سامان زیست اور قوت و ثروت کے حصول کی جد و جہد کو عین دین ٹھہرایا جائے؟ اور ستم بالائے ستم یہ کہ جن آیات کو سامان زیست، اور قوت و ثروت کے حصول کی جد و جہد کے مضمون سے دور کا واسطہ نہیں، لغت و عرف، اور تواتر و توارث کی ساری چیخ پکار کے علی الرغم، انھیں کو اس مضمون کا حامل ٹھہرایا جائے؟۔

پھر یہ کہ قرآن کی ان تصریحات اور ان تصریحات کے اقتضاءات سے کسی کو انکار بھی نہیں۔ اور نہ کوئی ان کے علی الرغم تسخیر فطرت کی جد و جہد کو قرآنی تعلیمات کے منافی ٹھہرانے کی جرأت کرتا ہے کہ آپ اس کی ضد میں آکر اس جد و جہد کو عین دین ثابت کرنے کے لیے (معاذ اللہ) آیات قرآنی کا حلیہ بگاڑنے پر تُل جائیں! ——— اور بالفرض اگر کوئی ایسی جرأت کرتا ہے اور اس پر قرآن ہی سے حجت قائم کرنا تھی! تو مذکورہ بالا آیات اس مقصد کے لیے بالکل کافی تھیں! - ہم حیران ہیں کہ ان مفید مقصد آیات کے ہوتے ہوئے پرویز صاحب نے غیر متعلق آیات سے یہ دھینگا مشتی آخر کیوں روا رکھی ہے؟

الغرض اگر پرویز صاحب کا منشاء صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ خوشحال اور باعزت زندگی بسر کرنے کے لیے سامان زیست اور قوت و ثروت کے حصول کی جد و جہد (عالم طبیعی کے معروف قانون کے مطابق) ضروری ہے اور یہ جد و جہد نہ صرف قرآنی تعلیمات کے منافی نہیں بلکہ متعدد آیات میں اس کی اجازت و تاکید صراحتہً یا اقتضاءً موجود ہے۔ تو اس میں کسی کو کلام نہیں (اور اگر کوئی کلام کرنے والا موجود ہے تو یہ اس کی انفرادی رائے ہے۔ جو جمہور امت کی نمائندہ نہیں!) پرویز صاحب نے اگر یہ سمجھا ہے کہ گردن زدنی "مذہب پرستوں" کو اس سے انکار ہے تو یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ اور بہتر ہے کہ ان کی خواہ مخواہ کی

ضد میں آکر قرآن کی جس افسوسناک تحریف پر وہ تُل کھڑے ہوئے ہیں، اس سے باز آئیں۔ اور اپنی ذہنی اُپج کی صلاحیتوں کو قرآن کی صحیح خدمت میں صرف کریں۔

لیکن اگر انھوں نے صرف کسی کی ضد میں آکر اپنی ذہنی اُپج کا یہ تماشا نہیں دکھایا ہے، بلکہ جیسا کہ ان کا بیان ہے یہ ان کی "قرآنی بصیرت" کا نتیجہ ہے۔ تو پھر اوپر کی مختصر گزارش ان کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔ ضرورت ہوگی کہ ان کے استدلال کا جائزہ لیا جائے اور پھر قرآن کی روشنی میں ان کی اس "بصیرت قرآنی" کا مقام متعین کیا جائے۔　　(باقی آیندہ)

عبرت انگیز ذہنی غلامی

"اس دنیا کی بھوک اور دکھ سے نجات یا فراغت کاملہ دونوں کے متعلق رسول عربی نے اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر اور تاریخ کے گہرے مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ نکالا تھا کہ شاہی اور پردھی ختم کی جائے اور عقل کی شاہنشاہی قائم ہو، یہ تصور خدا کے فضل وکرم سے ان کے دل و دماغ پر بچپن سے چھا گیا تھا اور آخرکار، ۴۰ سال کی عمر میں یہ پگھر وہ پاکیزہ افکار ابل پڑے جو قرآن کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔"

یہ تحریر کس کی ہے؟ یقیناً کسی ہمدرد اسلام فرنگی مستشرق کی ہوگی۔ جی نہیں۔ آپ کے ہندستان کے ایک خاص الخاص اور ٹھیٹھ مسلمان کی ہے! ---- کیسی وحی الٰہی اور کہاں کے فرشتے جبرئیل! کیسی دوزخ اور کہاں کی جنت! کیسی معاد اور کہاں کی روحانیت! دنیا و ما فیہا کے مسئلے تو کل یہی دو ہیں، ایک پیٹ کی بھوک، دوسرے جسم کا دکھ۔ "رسول عربی" نامی کسی شخص نے ان کا خوب غور سے مطالعہ کیا (جیسا کہ آج ہر سوشلسٹ اور کمیونسٹ لیڈر کرتا ہے) اور ایک خاص عمر پر پہونچ کر اپنے نتائج فکر قرآن نامی ایک کتاب میں درج کر دیئے! چلئے چھٹی ہوئی ---- اور یہ صاحب "دین کی تجدید" پر کمربستہ ہو کر "سیرت قرآنیہ" تالیف فرما رہے ہیں جن کے مضامین ہمارے اسلامی پریس کے رسول نمبروں میں فخر کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں!

رہا قرآن جس کی غیر محفوظیت کا دعوٰی کرنے کی ہمت کسی فرنگی کو بھی آج تک نہیں ہوئی اسکی حقیقت اس "مسلمان" کے قلم حقیقت رقم سے ملاحظہ ہو:۔

"اسلامی تعلیم کے ساتھ سب سے بڑی مشکل کی بنیاد سنہ ۳۰ھ سے پڑی، جبکہ سرکاری حکم سے

قرآن کی ترتیب ایک خاص انداز پر متعین کر دی گئی "۔

اناللہ وانا الیہ راجعون اسی جہل محض کا نام تحقیق و تجدید ہے !۔

پاکستان والے چلّا رہے تھے کہ ہمارے ہاں کیسے کیسے دینی فتنے ہر روز رونما ہو رہے ہیں، ہندوستان آخر کیوں پیچھے رہتا، اس نے بھی نظیر پیش ہی کر دی۔

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہمان

معاصر قومی آواز کی خبروں کے کالم سے :۔

لکھنؤ۔ ۲۲ر نومبر۔ لکھنؤ یونیورسٹی کی اردو فارسی سوسائٹی کا افتتاح کل بیگم اعزاز رسول کے ہاتھوں یونیورسٹی کے شعبۂ آرٹ میں ہوا۔ ابتدائی پروگرام کے مطابق معلوم ہوا ہو کہ گورنر یوپی شری چنّا ریڈی کرنے والے تھے جس کا انھوں نے وعدہ بھی کر لیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کے بعض اعلیٰ ذمہ داروں کی مداخلت پر گورنر یو، پی کے پروگرام کو منسوخ کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یونیورسٹی کے اعلیٰ ذمہ داروں کے خیال میں شعبہ جاتی تنظیموں کی اتنی اہمیت نہیں کہ اس کی کسی تقریب میں چانسلر کو مدعو کیا جائے "۔

جی ہاں ! خصوصاً جبکہ وہ شعبہ جاتی تنظیم شعبۂ اردو و فارسی کی ہو ! یہ اردو اور فارسی کا کوئی شعبہ آخر یو، پی کی کسی یونیورسٹی میں اب تک زندہ و قائم ہی کیوں ہے ؟ کیا یہی اس کی خوش قسمتی کے لیے کافی نہیں جو وہ اپنی بساط سے بڑھ کر حوصلہ و ہمت اسٹیٹ کے گورنر شری کے، ام منشی کو دعوت دینے کی کر بیٹھا تھا ۔

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت !

وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

کاٹھمنڈو۔ ۲۳ر نومبر۔ ورلڈ بدھسٹ کانگریس میں شرکت کے لیے جو بدھ مت والے باہر سے آئے ہوئے تھے ان میں سے تقریباً ... بدھسٹوں نے نیپال کے مشہور مندر پشوپتی ناتھ میں داخل ہونا چاہا، لیکن مندر کے پروہتوں نے انکی اجازت نہ دی، اور عذر یہ پیش کیا کہ اس میں اچھوت یا ہریجن داخل نہیں ہو سکتے، بدھسٹ زائروں نے کہا کہ ہم پر ہریجن یا اچھوت کا اطلاق نہیں ہوتا، لیکن پروہتوں نے مندر کے دروازے بند کر لیے "۔ (خبر)

خبر چھپی۔ بعض اخبارات کے گوشہ میں محض ایک معمولی خبر کی طرح، نہ سرخیوں پر سرخیاں، نہ اور کوئی لازمۂ "سنسنی خیزی" ــــ ذرا چشم تصور کے سامنے لائیے وہ صورت حال، کہ بجائے ایک ہندو مندر کے کوئی مسجد ہوتی اور اس کے کسی کٹھ ملا قسم کے متولی یا امام نے اس کا دروازہ معزز و نامور غیر مسلموں کے آنے پر ان کے اصرار و الحاح کے باوجود بند کر دیا ہوتا تو کیا اخبارات اور اخباری ایجنسیاں اتنے پر بس کرتیں؟ کتنا شور و واویلا برپا ہو گیا ہوتا! اور متعصب، تنگ نظر، فرقہ پرست، جنونی اور غدار" مسلمانوں کو سنانے کے لیے کیا کچھ اٹھا رکھا گیا ہوتا!۔

(صدق جدید)

بھانڈوں کا عروج

لاہور میں میاں مشتاق احمد گورمانی کے زیر اہتمام رقص، موسیقی، ڈرامے وغیرہ کے ایک ورائٹی شو کا افتتاح ہوا جس پر معاصر "چٹان" نے سوال کیا ہے کہ

ــــ "ملک و قوم نے کتنے تعمیری شعبوں میں ترقی کی ہے کہ اس قسم کی تقریبات کا اہتمام ضروری سمجھا جاتا ہے، ہمیں افسوس ہے کہ ورائٹی شو کے کارپردازوں نے موجودہ وزارت کی کوئی خدمت نہیں کی کیونکہ اس کے تحت ثقافتی و تہذیبی عنوانوں سے بعض ایسے عناصر جمع ہو گئے ہیں جو واجد علی شاہ کے دربار میں ہوتے تو اعتماد الملک اور وقار الملک کا خطاب پاتے۔ بہر حال یہی غنیمت ہے کہ گناہ نے ترقی کر کے اپنا نام آرٹ رکھا، مجرے کا نام ورائٹی پروگرام اور کنچنے کا فن کار! ہم اس کے سوا اس پر کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اسلامی ملکوں کے فرمانرواؤں کو شرم کرنی چاہیے"۔

کسی کو شرم آئے یا نہ آئے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ آج آرٹ اور کلچر کے نام سے بھانڈوں، کنچنیوں اور گویوں کی وہ عزت افزائی ہوئی ہے کہ واجد علی شاہ کی روح بھی پھڑک اٹھی ہے، علماء اور فضلا مارے مارے پھریں اور بھانڈوں اور گویوں کا یہ مرتبہ کہ وزراء تک ان کے پاس بیٹھنے اور ان کے ساتھ فوٹو اتروانے پر فخر کریں۔

چنے کھانے کو ترسیں صاحبان گوہر عالی

بھانڈوں اور کنچنیوں کے معیار زندگی کا کیا کہنا کہ وزراء کرام کے پہلو میں جگہ ملتی ہے، اور

ان کے مجروں کا افتتاح منسٹر صاحبان فرماتے ہیں۔

اُلٹی نقالی

اصل میں مغربی ممالک نے ہر برائی کو مختلف ناموں سے اپنایا، مگر ان میں قدرتی ترتیب کو بھی ملحوظ رکھا۔ پہلے انھوں نے علم کی اشاعت کی، سائنس پیدا کیے۔ مشینیں ایجاد کیں، ساری دنیا کو ترقی کا راستہ دکھایا، ہر شخص نے محنت اور جفاکشی کا سبق سیکھا، باہمی امداد کے جذبہ کو فروغ دیا، سماجی زندگی کو ستھرا بنایا اور عوام کو خوش حالی کی زندگی پر ڈالا۔ اس کے بعد انھیں ڈانس، ریس، سینما، کرکٹ، آرٹ، ورائٹی شو کے میدانوں میں قدم رکھنے کا موقع ملا۔ اور انھوں نے اپنی بنیادوں کو مضبوط کر کے عیاشی کے خوب سامان پیدا کیے۔ مگر پاکستان اور ہندوستان اتنے بھولے نکلے کہ جلدی میں قدرتی ترتیب کو بھول گئے۔ لوگ بھوکے ہیں۔ بیروزگار ہیں، جاہل ہیں، سماجی زندگی میں پست ہیں، امداد باہمی کے جذبہ سے محروم ہیں۔ مگر ان کے لیے رقص و سرود، ناچ گانے مہیا کیے جا رہے ہیں، ان کے لیے کلچرل پروگرام بنائے جا رہے ہیں، انھیں ورائٹی شو کا چسکہ لگایا جا رہا ہے، ان کے لیے ایرکنڈیشنڈ گاڑیاں چلائی جا رہی ہیں! گویا ترتیب اُلٹی ہو گئی۔ شاگردوں نے نقالی میں تو کسر نہیں رکھی، مگر برائی اور بھلائی کی ترتیب کا احساس نہ کر سکے۔ ایک شخص کہتا ہے روٹی دو، جواب ملتا ہے کہ ورائٹی شو کا انتظام کر دیا گیا ہے! پاکستان غلہ تک میں غیروں کا محتاج ہے، مگر شوقین اتنا ہے کہ رقص، موسیقی اور ڈرامے کے بغیر اسے سانس لینا مشکل ہو رہا ہے! (الجمعیۃ)

تعارف و تبصرہ

کیا جماعتِ اسلامی حق پر ہے | مرتبہ جناب مولانا عبدالرحیم اشرف صاحب ضخامت ۲۴۴ صفحات، قیمت ۲/۱۲/- ملنے کا پتہ: مکتبہ تہذیب ملت لائلپور (مغربی پاکستان)

جماعت اسلامی کے حق یا ناحق پر ہونے کا سوال بہت دنوں سے اٹھا ہوا ہے، جماعت اسلامی پاکستان کے ایک اہم رکن مولانا عبدالرحیم اشرف صاحب نے اسی سوال کے تصفیہ کے لیے یہ کتاب مرتب کی ہے۔ بحث کا مرکز حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی دامت برکاتہم کا ایک فتویٰ ہے۔ اس فتوے کی روشنی میں ایک استفسار مرتب کر کے پہلے خود مرتب نے اس پر ایک تفصیلی فتویٰ دیا ہے جس میں مولانا مدنی کے فتوے کا ذکر لا کر عنانِ توجہ اسی کی طرف موڑ دی گئی ہے۔ یہ تفصیلی فتویٰ جس میں مقدم الذکر فتویٰ پر تفصیلی تبصرہ کیا گیا ہے صفحہ ۱۳۴ تک چلا گیا ہے۔ اس کے بعد متعدد علماء عرب اور علماء ہند و پاکستان کے فتوے اس استفسار کے جواب میں نقل کیے گئے ہیں۔ اور آخری باب میں "اتمام حجت" کے عنوان سے جماعتِ اسلامی پر عائد کیے جانے والے الزامات کے متعلق ذمہ دارانِ جماعتِ اسلامی (پاکستان) کی تصریحات (کہ وہ ان الزامات کو قبول کرتے ہیں یا نہیں) جمع کر دی گئی ہیں، جن میں بالکلیہ برأت کی گئی ہے ـــــ اور ان سب چیزوں سے مرتب نے یہ ثابت کیا ہو کہ جماعت اسلامی حق پر ہے اور اس کی مخالفت ناحق۔

مودودی دستور و عقائد کی حقیقت | از حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی۔ ناشر۔ ادارہ نشر و اشاعت، دار العلوم دیوبند۔

صفحات ۶۸، مجلد، قیمت درج نہیں۔

یہ ایک فاضل دیوبند کے نام حضرت مولانا کا مکتوب ہو جس میں (ان کی جماعت اسلامی سے وابستگی معلوم کر کے) مولانا نے اپنی رائے عالی کے مطابق اس جماعت کے .... عقائد کی حقیقت واضح فرمائی ہو۔ بحث کا مرکزی نقطہ دستور جماعت اسلامی کی مشہور دفعہ ۶ ہے ـــــ مولانا کے مکتوب سے پہلے مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی کے قلم سے ایک ۴۰ صفحے کا مقدمہ ہے جو ان کے خاص متکلمانہ انداز کلام کا نمونہ ہے۔

جماعت اسلامی کے حق یا ناحق پر ہونے کی بحث سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے فریقین کی ان دونوں کتابوں کا مطالعہ مفید ہوگا مذکورۃ الصدر کتاب میں بھی (جماعت اسلامی کی طرف سے دفعہ ۶ پر کافی بحث کی گئی ہے۔)

سد باب ذریعہ ازافادات علامہ ابن قیمؒ۔ مترجمہ مولانا عبداللہ العمادی۔ ناشر مکتبہ نشاۃ ثانیہ۔ معظم جاہی مارکیٹ۔ حیدرآباد۔ دکن۔ قیمت ۱۰؍ آنے۔

شریعت اسلامی کا ایک اہم تشریعی اصول یہ ہے کہ جو کام کسی امر مذموم (شرعاً حرام و ناجائز وغیرہ) کے ارتکاب کا ذریعہ بنے اس کو بھی ممنوع قرار دے دیا جائے۔ ایسا کوئی کام چار قسم کا ہوسکتا ہے۔

(۱) امر مذموم کے وسیلہ ہی کے طور پر وضع کیا گیا ہے۔

(۲) وضع تو امر مباح کے لیے کیا گیا تھا مگر بلا قصد و ارادہ کسی گناہ کا وسیلہ بن جائے۔

(۳) یہ کہ بالارادہ کسی مفسدہ کا ذریعہ بنایا جائے۔ اور اس کا مفسدہ مصلحت پر غالب ہو۔

(۴) اس میں مصلحت کا پہلو مفسدہ پر غالب ہو۔

درمیان کی دو صورتوں کے متعلق اس رسالہ میں سنت نبویہ سے ۹۹ مثالیں پیش کر کے ابن قیمؒ نے ثابت کیا ہے کہ ان دونوں قسموں کے ذریعے بھی از روئے شریعت مذموم اور ممنوع ہیں۔

بقیہ نگاہ اولیں

اختیار کر کے نیت کے سادہ جلسوں کو اسی طرح لاحاصل اور کثیر الصرف بنا دیں۔ اور پھر لکھنؤ ہی کی طرح ان کثیر الصرف محفلوں کی تعداد دن دونی رات چوگنی ہونے لگے۔

ہم نے یہ ناگوار ذکر اور ایک تلخ حقیقت کا بیان اس لیے چھیڑا ہے کہ جن سادہ دل، نیک نیت اور ذات رسالت سے سچی وابستگی رکھنے والے عوام وخواص کے روپیہ سے یہ محفلیں آراستہ کی جارہی ہیں (یا آئندہ آراستہ کی جائیں گی)۔ وہ سوچیں کہ ان کا روپیہ کس لاحاصل مصرف میں جارہا ہے (یا جائیگا) جبکہ ان کے روپے کے بہترین قومی و دینی مصارف موجود ہیں۔ اور کئی سال سے صدائے "ھل من مجیب" اور "ھل من مزید"!! بلند کر رہے ہیں ——

نئے ہندستان میں ان کے دین کے لیے سب سے بڑا خطرہ ملک کے موجودہ تعلیمی ادارے ہیں۔ اگر اسلام کو اس ملک میں باقی رکھنا ہو تو اس کی اصل صورت یہ ہو کہ مسلمانوں کے خود اپنے تعلیمی ادارے (پرائمری اور سکنڈری اسکول) ہوں جن کا کلی انتظام انکے ہاتھ میں ہو جن میں گورنمنٹ کا منظور شدہ نصاب، وہ اپنے بچوں کیلئے دوسری ضروری چیزوں کے ساتھ، پڑھائیں —— اصل صورت تو یہی ہے باقی تجویزیں مجبوری کے درجہ کی ہیں —— اور وہ بھی بہرحال خاصے سرمایہ کے بغیر عملی جامہ نہیں پہن سکتیں! —— اسی طرح مسلمانوں کی بیروزگاری اور اقتصادی بدحالی ان کے قومی وجود کیلئے ایک زبردست خطرہ ہو جس سے بچاؤ کی اگر کوئی شکل —— اس تعصب جنبہ داری اور امتیازی پالیسی کے دور میں —— ہوسکتی ہے تو وہ یہ ہو کہ چھوٹی اور بڑی حیثیت کے تمام مسلمان، قومی مفاد کو سامنے رکھ کر بڑے سے بڑے پیمانہ پر لمیٹیڈ کمپنیاں قائم کریں، اور جگہ جگہ صنعتی اداروں کی بنیاد رکھیں۔ جو امتیازی پالیسی کے مارے ہوئے بیروزگار نوجوانوں کی پناہ گاہیں ثابت ہوسکیں۔ علیٰ ہذا باہمی امداد کی سوسائیٹیاں قائم کر کے غریب خاندانوں کی اقتصادی بدحالی کو روکا جاسکتا ہو۔

کاش! —— ہمارے اصحاب خیر وارباب خلوص اپنی دولت کی قدر پہچانیں! ور لاحاصل مصارف کے بجائے اس کام دل کھولکر روپیہ لگائیں۔ اور جن حضرات کو اللہ نے وقت اور اجتماعی کاموں کی صلاحیت دی ہو وہ ان اصحاب خیر وارباب خلوص کو اس ضرورت کی طرف متوجہ کرنے اور قومی و دینی تحفظ کی ان ناگزیر شکلوں کو وجود میں لانے کی سعی و تدبیر کریں۔

ہمیں بڑی مسرت ہو کہ اپنے حلقہ میں خواتین کے ایک ماہنامہ کی جو کمی ہم بڑی شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ وہ مولانا سید ابوالحسن علی صاحب کے بھانجے مولانا محمد ثانی صاحب نے اپنی ذی علم خالہ صاحبہ محترمہ امۃ اللہ تسنیم کے تعاون سے ابھی خواتین کا ایک ماہنامہ "رضوان" نکالکر پوری کردی ہو۔ پہلا شمارہ جو ہمارے سامنے ہو۔ بڑی اچھی توقعات پیدا کرتا ہو۔ سالانہ چندہ صرف دو روپیہ ہو۔ دفتر کا پتہ۔ ۳۵ گوئن روڈ لکھنؤ —— امید ہو کہ مسلمان گھرانوں میں اس کی پوری قدر کی جائے گی۔

منتخب و قابل مطالعہ کتابیں

تالیفات ڈاکٹر حمید اللہ صاحب

- عہد نبوی میں نظام حکمرانی -/۸/۲
- عہد نبوی کے میدان جنگ -/۸/۱
- رسول اکرم کی سیاسی زندگی -/-/۵
- صحیفہ ہمام بن منبہ -/۸/۲
- امام ابو حنیفہ کی تدوین فقہ -/-/۱

مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی

- تفسیر ماجدی جلد اول مجلد (تاج کمپنی) -/-/۱۳
- 〃 〃 〃 دوم 〃 -/-/۱۳
- حکیم الامت -/۸/۲ سفرنامہ حجاز -/-/۵
- جغرافیہ قرآنی -/۸/۱ حیوانات قرآنی -/-/۲
- مناجات مقبول مع شرح ماجدی مجلد -/-/۲
- اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں -/-/۳

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ

- خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی -/-/۵
- حکایات صحابہ -/-/۲
- فضائل حج -/-/۳ برکات ذکر -/۱۰/۲
- فضائل صدقات اول -/۸/۳ دوم -/۱۲/۲
- فضائل نماز -/۱۵/- فضائل رمضان -/۱۲/-
- فضائل قرآن -/۱۲/- فضائل تبلیغ -/۶/-

- بہشتی زیور اختری -/-/۱۲
- تعلیم الدین (از حضرت تھانوی) -/۱۲/۱
- حیات المسلمین -/۱۲/۱ اصلاح الرسوم -/۱۲/-
- احکام التجلی (دیدار الٰہی کا محققانہ اور شوق انگیز بیان - از حضرت تھانوی) -/۸/-
- الانتباہات المفیدہ (عقل و فلسفہ کی روشنی میں مکمل اسلام کا ثبوت اور نئے شبہات کا جواب - از حضرت تھانوی) -/۸/-

---

- ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک (از مولانا مسعود عالم صاحب ندوی) -/۸/۲
- ایک مظلوم اور بدنام مصلح محمد بن عبد الوہاب نجدی کی سوانح حیات -/۸/۲
- اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں -/-/۳
- علم الحدیث (اپنے موضوع پر بہترین کتاب ہے) -/۸/۲
- سد باب ذریعہ (علامہ ابن قیم کی ایک اہم کتاب کا ترجمہ ہے) -/۱۰/-

بچوں کے دل میں دین و ایمان کی جڑیں مضبوط کرنے کیلئے یہ کتابیں ضرور پڑھائیے

- اللہ کے رسول -/۶/- حضرت ابوبکرؓ -/۶/-
- حضرت عمرؓ -/۶/- حضرت عثمانؓ -/۶/-
- حضرت علیؓ -/۶/-
- اچھا قاعدہ -/۳/- اچھی باتیں حصہ اول -/۸/-
- دوم -/۸/- سوم -/۸/- چہارم -/۸/-
- پنجم -/۸/- اچھے قصے -/۶/- آسان فقہ -/۶/-

اپنے گھر والوں کو ان کتابوں کا مطالعہ ضرور کرائیے

- سراپائے رسولؐ -/۱۲/-
- رسول پاک کی صاحبزادیاں -/۱۲/-
- ہمارے نبی کے صحابہ -/۱۰/-
- رسول اللہ کے دو محبوب -/۸/-
- عہد نبوی کے دو بچے (حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ) -/۶/۱
- درسگاہ رسول کے دو طالب علم (ابوہریرہؓ اور ابن مسعودؓ) -/-/۱
- سیرت حضرت امام حسنؓ -/۱۳/-

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

- قصص القرآن کامل سٹ -/۸/۲۱
- لغات القرآن چہار جلد -/-/۱۸
- ترجمان السنۃ جلد اول و دوم -/-/۱۹
- قرآن اور تعمیر سیرت -/-/۵
- قرآن اور تصوف -/-/۲
- رہنمائے قرآن -/-/۱
- تدوین قرآن (یعنی قرآن مجید کے تحفظ پر ایک تاریخی نظر) -/۴/۱
- الفوز الکبیر فی اصول التفسیر -/-/۱
- کتابت حدیث (حدیثوں کی تدوین کی تاریخ پر ایک جامع مقالہ) -/۴/۱
- تاریخ علم فقہ -/-/۲
- سلسلہ تاریخ ملت دس جلد مکمل -/-/۳۱
- تاریخ اسلام پر ایک نظر -/-/۶
- قرون وسطی کے مسلمانوں کی علمی خدمات دو جلدوں میں قیمت کامل -/۴/۹
- اسلام کا نظام حکومت -/-/۶
- مسلمانوں کا نظم مملکت -/-/۴
- اسلام کا اقتصادی نظام -/-/۵
- اسلام کا زرعی نظام -/-/۴
- اسلام کا نظام عصمت و عفت -/-/۲
- اسلام کا نظام مساجد -/۸/۳
- تاریخ مشائخ چشت -/-/۱۲
- حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی -/-/۶
- تذکرہ علامہ محمد طاہر محدث پٹنی -/۸/۱
- مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ (از مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم) -/۸/۱
- مصباح اللغات مجلد -/-/۱۶

ملنے کا پتہ: کتب خانہ الفرقان۔ کچہری روڈ لکھنؤ

شرح چندہ

ہندوستان میں سالانہ ۵؍

پاکستان میں سالانہ ۶؍

ششماہی (ہر دو ملک) ۳؍

الفرقان

لکھنؤ

ماہنامہ

اعزازی خریداروں سے

سالانہ ۱۰؍

غیر ممالک سے

سالانہ دس شلنگ

قیمت فی کاپی آٹھ آنے

جلد ۲۴ | بابت ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۶ھ مطابق جنوری ۱۹۵۷ء | نمبر ۵

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان لگا ہو تو اس کا مطلب یہ ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہو۔ براہ کرم آئندہ کے لیے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی۔ پی ارسال کیا جائے گا ــــــ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۱۴ تاریخ تک پہونچ جانا چاہیے۔

پاکستان کے خریدار: - اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیج دیں۔

تاریخ اشاعت: - رسالہ ہر انگریزی مہینہ کی ۵ تاریخ کو روانہ کیا جاتا ہو اگر ۱۵ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں اگلے رسالہ کے ساتھ مکرر بھیجدیا جائے گا اس سے پہلے مطلوب ہو تو ۳ کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں۔

مقام اشاعت: - دفتر ماہنامہ الفرقان ــــــ کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اولیں

سائنس کی خطرناک ترقیوں کو دیکھ دیکھ کر یوں تو مفکرین عالم عرصہ سے انسانی دنیا کے مستقبل کے بارے میں متفکر تھے۔ مگر سال گذشتہ (سنہ ۵۶ء) کی آخری سہ ماہی کے بین الاقوامی حالات نے یکایک دنیا کو ایک فیصلہ کن مرحلہ پر پہونچا دیا ہے۔ اب مہلت کا وقت گویا ختم ہو چکا ہے۔ اور بین الاقوامی طاقتیں اگر موجودہ جادۂ عمل پر گامزن رہیں تو دنیا کی تباہی یقینی اور بالکل قریب ہے۔ اور سائنس جس کا مقصد انسان کے لیے راحت و آسائش کے اسباب مہیا کرنا تھا۔ نسل انسانی اسی کے ہاتھوں زہر کا پیالہ پی کر ہمیشہ کے لیے موت کی آغوش میں چلی جائے گی —— اس انجام کے لیے ظاہر ہے کہ کوئی تیار نہیں ہے —— اور یہی روشنی کی وہ ایک کرن ہے جس سے مستقبل کے افق پر چھائے ہوئے اندھیرے میں کچھ اُجالا نظر آجاتا ہے۔

اس انجام سے بچنے کی صورت کیا ہے؟ یہ سوال اس وقت مختلف زاویوں سے محلِ بحث بنا ہوا ہے۔ اور اس سلسلہ میں بڑے بڑے فضلائے وقت کی طرف سے برملا یہ آواز اُٹھنے لگی ہے کہ اس عالمگیر تباہی سے بچنے کی واحد صورت اخلاقی قدروں کا احترام اور مذہب کی بنیادی تعلیمات کو رہنمائے حیات بنانا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امن وسلامتی کے پجاری کی یہی وہ واحد صورت ہے جسے اقوام عالم کو چار و ناچار اپنانا پڑے گا۔ ورنہ خواہی نخواہی اپنے ہاتھوں اپنی بربادی پر راضی ہونا پڑے گا۔

اس خوفناک تباہی کے قریب تک پہونچانے کا ذمہ دار سائنس کے انکشافات اور پوشیدہ حقائق کی دریافت نہیں ہے، بلکہ بین الاقوامی معاملات میں اقوام عالم کی اخلاقی قدروں اور انسانیت کے تقاضوں کے احترام سے وہ آزادی ہے جس نے قوموں کو ایک دوسرے سے مستقل

طور پر بد اعتماد اور خائف کر دیا ہے۔ اور اس بے اعتمادی اور خوف کی فضا نے ہر وقتی اور ہنت نئی جنگی تیاریوں کا وہ رجحان پیدا کیا جس کے تحت ترقی یافتہ قوموں نے سائنس کا رُخ جنگی خدمت کی طرف موڑ کر اس کے انکشافات سے وہ تباہ کن اسلحہ تیار کر ڈالے جن کے نام سے انسانیت لرزہ بر اندام ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ امن وسلامتی کی مستقل ضمانت اخلاقی قدروں اور انسانیت کے اُن تقاضوں کے احترام ہی سے مل سکتی ہے جن کا دوسرا نام "مذہب کی بنیادی تعلیمات" ہے۔

گویا اصل مسئلہ خوف و بے اعتمادی کی موجودہ فضا کو ختم کرنے کا ہے۔ اور اس کا خاتمہ اُن اسباب کے خاتمہ ہی سے ہو سکتا ہے جو اس فضا کو پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ یعنی بین الاقوامی معاملات میں خود غرضی، اخلاق کشی اور اپنے قومی مفادات کے لیے منافقت، بد دیانتی، اور دوسری قوموں کے حقوق پر ڈاکہ زنی۔ اور ان اسباب کے خاتمہ کی شکل بجز اس کے کوئی نہیں کہ سیاست کا دامن اصولِ اخلاق اور مذہبی تعلیمات سے باندھا جائے۔ یورپ نے سیاست کے مفاد پرستانہ نظریہ کے ماتحت سیاست کا دامن دین واخلاق کی پابندیوں سے آزاد کر دیا اور اس کا نتیجہ وہی ہوا جو حکیم مشرق کی زبان پر ان الفاظ میں آیا تھا۔

"جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی"

آج دنیا کا امن وامان چنگیزیت کے نرغے میں ہے، سیاست کی بے مہاری نے ہر طاقتور قوم کو چنگیز خاں بنا دیا ہے۔ جب تک یہ خوفناک نتیجہ کھل کر سامنے نہیں آیا تھا یورپ کو سمجھانا مشکل تھا کہ اس نے خود کو اور پوری دنیا کو مکمل تباہی کے راستہ پر ڈال دیا ہے۔ مگر تجربہ سب سے اچھا استاد ہے اس نے اب یہ منوانا شروع کر دیا ہے کہ تباہی وبربادی کا یہ عالمگیر خطرہ سیاست کے موجودہ نظریہ کا نتیجہ ہے۔ اور امید رکھنی چاہیے کہ، نوعِ انسانی کی تباہی اگر ابھی مقدر نہیں ہے تو، اس نظریہ سیاست کے خلاف عام بغاوت ہوگی اور ہر قوم میں ایسے لوگ اُبھر کر اوپر آئیں گے جو مصلحتِ وقت کے طور پر نہیں بلکہ تقاضائے فطرت (انسانی) کے طور پر سیاست کا دامن اخلاقی اقدار اور مذاہب کی بنیادی تعلیمات سے باندھیں گے۔ وہی وقت ہوگا جبکہ دُنیا حقیقی اور پائدار امن واطمینان کی فضا میں سانس لے گی۔

اس خطرہ کی روک تھام کے لیے بین الاقوامی سیاست میں ایک نیا نظریہ "پر امن باہمی وجود"

کا ابھرنا شروع ہوا ہے۔ اس نظریہ کی تحریک کا شرف ہمارے ہی ملک کو حاصل ہو، بلکہ فطرت انسانی کی گہرائیوں پر جن لوگوں کی نظر ہو وہ اس نظریہ سے کچھ زیادہ لمبی امیدیں وابستہ نہیں کر سکتے۔ اسکی نوعیت اصل مرض کے علاج کی نہیں بلکہ مرض کی شدت اور اس کے خوفناک نتائج کے تصور سے گھبرا کر اپنے اوپر کچھ اوپری پابندیاں عاید کر لینے کی ہو۔ اس سے مرض کے خوفناک نتائج کچھ دیر کے لیے مؤخر ہو سکتے ہیں مگر اُن کے رونما ہونے کا خطرہ مستقل طور پر ٹل نہیں سکتا۔ جب تک مفاد پرستی اور ہوس اقتدار طبیعتوں کے اندر باقی ہو، طبیعتیں اس سے کوئی نفرت اور اس کے اندر کوئی قباحت نہیں محسوس کرتیں۔ اس وقت تک مصلحت وقت اور خود اپنی خیریت منانے کے طور پر پر امن باہمی وجود کے معاہدے کیے تو جا سکتے ہیں، مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کس وقت یہ اندر کی مفاد و اقتدار پرستی سارے معاہدوں کو بالائے طاق رکھ کر پھر کھل کھیلنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ بہر حال اس نئے نظریہ کا بھی تجربہ دنیا کو کر لینے دیجئے مگر چار و ناچار آنا اسی طرف پڑے گا کہ مذہب کے آگے سر جھکائے بغیر ابن آدم کی سلامتی ناممکن ہے۔

ولا ملجأ من اللہ الا الیہ

معارف الحدیث

(مسلسل)

ایفاء وعدہ اور وعدہ خلافی

وعدہ کر کے پورا کرنا درحقیقت سچائی ہی کی ایک عملی قسم ہے، اور وعدہ خلافی ایک طرح کا عملی جھوٹ ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اخلاقی تعلیم میں وعدہ خلافی سے بچنے اور ہمیشہ وعدہ پورا کرنے کی بھی سخت تاکید فرمائی ہے۔

اس سے پہلی ہی قسط میں وہ حدیث گزر چکی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند اچھے اخلاق کا ذکر کر کے فرمایا کہ جو شخص ان باتوں کی پابندی کی ذمہ داری لے میں اس کے لیے جنت کا ذمہ لیتا ہوں، اور ان میں آپ نے ایفاء وعدہ کو بھی گنایا۔

اور "کتاب الایمان" میں "شعب الایمان" کے حوالے سے حضرت انس کی وہ حدیث گزر چکی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص اپنے کیے عہد کا پابند نہیں اس کا دین میں کوئی حصہ نہیں ۔۔۔ اب چند حدیثیں اس سلسلہ کی یہاں اور بھی درج کی جاتی ہیں۔

(۲۰۵) عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلٰثٌ اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ

(رواہ البخاری ومسلم)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا منافق کی تین نشانی ہیں. جب بات کرے تو جھوٹ بولے. وعدہ کرے تو

اس کو پورا نہ کرے، اور جب اس کو کسی چیز کا امین بنا دیا جائے تو خیانت کرے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) قریب قریب اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے کتاب الایمان میں بھی گزر چکی ہے اور وہاں پوری تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ ان باتوں کے منافق کی نشانی ہونے کا کیا مطلب ہے ـــــ وہاں کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ جھوٹ، خیانت اور وعدہ خلافی دراصل یہ منافقوں کے اخلاق ہیں اور جس شخص میں یہ بری عادتیں موجود ہوں وہ خواہ عقیدہ کا منافق نہ ہو لیکن عمل اور سیرت میں منافق ہی ہے،

اسی حدیث کی صحیح مسلم کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں "وان صلّٰی وصام وزعم انّہ مسلم" یعنی وہ آدمی اگرچہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو اور اپنے کو مسلمان بھی کہتا اور سمجھتا ہو پھر بھی ان بد اخلاقیوں کی وجہ سے وہ ایک قسم کا منافق ہی ہے۔

بہرحال اس حدیث میں وعدہ خلافی کو نفاق کی نشانی اور ایک منافقانہ خصلت بتلایا گیا ہے۔

(۲۰۶) عن علیٍّ وعبدِ اللّٰہِ بن مسعودٍ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اَلعِدَۃُ دَینٌ ـــــ (رواہ الطبرانی فی الاوسط)

(ترجمہ) حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وعدہ بھی ایک طرح کا قرض ہے۔ (لہٰذا اس کو ادا کرنا چاہیے۔) (معجم اوسط للطبرانی)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کو کچھ دینے کا یا اس کے ساتھ کوئی سلوک کرنے کا یا اسی طرح کا کوئی اور وعدہ کیا گیا ہے تو وعدہ کرنے والے کو چاہیے کہ وہ اس کو اپنے پر قرض سمجھے اور اس کو پورا کرنے کی فکر کرے ـــــ لیکن اگر بالفرض کسی برے کام میں ساتھ دینے کا یا کسی اور ایسے کام کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے جو شرعاً صحیح نہیں ہے یا اس سے کسی دوسرے کی حق تلفی ہوتی ہے تو اس وعدہ کا پورا کرنا ضروری نہ ہوگا بلکہ اس کے خلاف ہی کرنا ضروری ہوگا، اور اس وعدہ خلافی میں کوئی گناہ نہ ہوگا بلکہ اتباعِ شریعت کا ثواب ہوگا۔

(۲۰۷) عَنْ عبدِ اللّٰہِ بن ابی الحمساءِ قَالَ بَایَعْتُ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَبْلَ اَنْ یُّبْعَثَ وَبَقِیَتْ لَہٗ بَقِیَّۃٌ فَوَعَدْتُّہٗ اَنْ اٰتِیَہٗ بِھَا فِیْ مَکَانِہٖ، فَنَسِیْتُ فَذَکَرْتُ بَعْدَ ثَلٰثٍ فَاِذَا ھُوَ فِیْ مَکَانِہٖ، فَقَالَ لَقَدْ شَقَقْتَ عَلَیَّ اَنَا ھٰھُنَا مُنْذُ ثَلٰثٍ اَنْتَظِرُکَ۔

(رواہ ابوداؤد)

(ترجمہ) عبداللہ بن ابی الحمسار سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے (یعنی آپ کے نبی ہونے سے پہلے) آپ سے خرید و فروخت کا ایک معاملہ کیا (پھر جو کچھ مجھے دینا تھا اس کا کچھ حصہ تو میں نے وہیں دے دیا) اور کچھ ادا کرنا باقی رہ گیا تو میں نے آپ سے وعدہ کیا کہ میں اسی جگہ لے کر آتا ہوں، پھر میں بھول گیا اور تین دن کے بعد مجھے یاد آیا، (میں اسی وقت لے کر پہونچا) تو دیکھا کہ آپ اسی جگہ موجود ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے مجھے بڑی مشکل میں ڈالا اور بڑی زحمت دی، میں تمھارے انتظار میں تین دن سے یہیں ہوں۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) گویا نبی ہونے سے پہلے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وعدہ کی ایسی پابندی فرماتے تھے کہ تین دن تک ایک جگہ رہ کر ایک شخص کا انتظار فرماتے رہے ــــــ واضح رہے کہ وعدہ کی اس حد تک پابندی کرنا شرعاً ضروری نہیں ہے۔ (جیسا کہ اس کے بعد والی حدیث سے معلوم بھی ہو جائے گا) لیکن اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت میں جو "خلقِ عظیم" ودیعت فرمایا تھا اس کا تقاضا یہی تھا۔

(۲۰۸) عَنْ زَیْدِ بْنِ اَرْقَمَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلم قَالَ مَنْ وَعَدَ رَجُلًا فَلَمْ یَاْتِ اَحَدُھُمَا اِلٰی وَقْتِ الصَّلٰوۃِ وَذَھَبَ الَّذِیْ جَاءَ لِیُصَلِّیَ فَلَا اِثْمَ عَلَیْہِ ــــــ

(رواہ رزین)

(ترجمہ) حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے کسی دوسرے شخص سے (کسی جگہ آکر ملنے کا) وعدہ کیا، پھر نماز کے وقت تک ان میں سے ایک نہیں آیا (اور دوسرا وقتِ معین پر مقررہ جگہ پر پہونچ گیا اور

نہ آنے والے کا انتظار کرتا رہا یہاں تک کہ نماز کا وقت آگیا اور یہ پہونچ جانے والا نماز پڑھنے کے لیے مقررہ جگہ سے چلا گیا تو اس کو کوئی گناہ نہ ہوگا۔ (رزین)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ جب وعدہ کے مطابق یہ شخص مقررہ جگہ پر پہونچ گیا اور کچھ دیر تک دوسرے آدمی کا انتظار بھی کرتا رہا تو اس نے اپنا حق ادا کر دیا۔ اب اگر نماز کا وقت آجانے پر یہ شخص نماز پڑھنے کے لیے چلا جائے یا اپنی کسی دوسری ضرورت سے چلا جائے تو اس پر وعدہ خلافی کا الزام نہیں آئے گا اور یہ گناہگار نہیں ہوگا۔

(۲۰۹) عَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ إِذَا وَعَدَ الرَّجُلُ أَخَاهُ وَمِنْ نِيَّتِهِ أَنْ يَفِيَ وَلَمْ يَجِئْ لِلْمِيعَادِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

(ترجمہ) حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جب کسی آدمی نے اپنے کسی بھائی سے آنے کا وعدہ کیا اور اس کی نیت یہی تھی کہ وہ وعدہ پورا کرے گا، لیکن (کسی وجہ سے) وہ مقررہ وقت پر آیا نہیں تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

(سنن ابی داود، جامع ترمذی)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص نے کوئی وعدہ کیا اور نیت اس کو پورا کرنے کی ہی تھی لیکن کسی وجہ سے وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا تو عند اللہ گناہگار نہ ہوگا۔ لیکن اگر نیت ہی وعدہ پورا کرنے کی نہ تھی۔ اور اس کا یہ وعدہ ایک طرح کا فریب تھا، تو اس کے گناہ ہونے میں شبہ نہیں۔

دو رخے پن کی ممانعت

بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب دو آدمیوں یا دو گروہوں میں اختلاف اور نزاع ہو تو وہ ہر فریق سے مل کر دوسرے کے خلاف باتیں کرتے ہیں اسی طرح بعض لوگوں کا حال یہ ہوتا ہو کہ جب کسی سے ملتے ہیں تو اس کے ساتھ اپنے حسنِ تعلق کا اظہار کرتے ہیں اور پیچھے اسکی برائی اور

"بدخواہی کی باتیں کرتے ہیں، ایسے آدمی کو اردو زبان میں "دورخا" کہتے ہیں۔ اور عربی میں "ذوالوجہین" کہا جاتا ہے ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ طرز عمل ایک طرح کی منافقت اور ایک قسم کی دھوکہ بازی ہے جس سے بچنے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل ایمان کو سخت تاکید فرمائی ہے۔ اور بتلایا ہے کہ یہ سخت گناہ کی بات ہے اور ایسے لوگ سخت ترین عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے۔

(۲۱۰) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیه وسلم تَجِدُوْنَ شَرَّ النَّاسِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ذَاالْوَجْهَیْنِ الَّذِیْ یَاْتِیْ هٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ وَهٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ۔　(رواہ البخاری ومسلم)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم قیامت کے دن سب سے برے حال میں اس آدمی کو پاؤ گے جو کچھ لوگوں کے پاس جاتا ہے تو اس کا رخ اور ہوتا ہے اور دوسروں کے پاس جاتا ہے تو اور۔　(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) قیامت میں ایسا آدمی جس بدترین حالت میں دیکھا جائے گا اس کی کچھ تفصیل اگلی حدیث سے معلوم ہو سکتی ہے۔

(۲۱۱) عَنْ عَمَّارٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیه وسلم مَنْ کَانَ ذَاوَجْهَیْنِ فِی الدُّنْیَا کَانَ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ لِسَانَانِ مِنْ نَّارٍ۔

(رواہ ابوداؤد)

(ترجمہ) حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا میں جو شخص دورخا ہوگا (اور منافقوں کی طرح مختلف لوگوں سے مختلف قسم کی باتیں کرے گا) قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی دو زبانیں ہوں گی۔　(سنن ابی داؤد)

(تشریح) اچھے اعمال اور اچھے اخلاق جن پر آخرت میں ثواب کے وعدے ہیں مختلف قسم کے ہیں اور ان کے درجے بھی مختلف ہیں۔ اسی طرح برے اعمال اور برے اخلاق جن پر عذاب کی وعیدیں ہیں وہ بھی مختلف قسم اور مختلف درجے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم وحکمت سے ہر نیکی اور بدی کا ثواب و

عذاب اس کے مناسب مقرر فرمایا ہے۔ پس دو رخا پن (جو ایک طرح کی منافقت ہے) اس کی سزا یہ مقرر فرمائی گئی ہے کہ ایسے آدمی کے منہ میں وہاں آگ کی دو زبانیں ہوں گی۔ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا! واضح رہے کہ جانوروں میں سے بعضے سانپوں کی دو زبانیں ہوتی ہیں۔

یہاں یہ بات ہم سب کیلئے سوچنے سمجھنے کی ہے کہ بعض اعمال یا اور بد اخلاقیاں حقیقت میں نہایت خطرناک اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت سنگین ہیں، لیکن ہم لوگ ان کو معمولی بات سمجھتے ہیں اور ان سے بچنے کی جتنی فکر کرنی چاہیے اتنی فکر نہیں کرتے۔ ایسی ہی برائیوں کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے "وَتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ" (تم اس کو معمولی اور ہلکی بات سمجھتے ہو حالانکہ اللہ کے نزدیک وہ بہت سنگین اور بہت بڑی بات ہے) — یہ بُری عادت (دو رخا پن) بھی اسی قبیل سے ہے۔ ہم میں سے بہت سے اس کو معمولی بات سمجھتے ہیں اور اس سے بچنے کی فکر نہیں کرتے حالانکہ ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتنا سنگین اور خطرناک گناہ ہے اور آخرت میں اس پر کتنا سخت عذاب ہونے والا ہے۔

ارشاداتِ خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ

مکتوبات کے پیرایے میں

— ۱۲ —

مترجم ———— مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوب (۱۴۷) میر محمد خانی کے نام (فضائلِ حسنِ اخلاق میں)

ثبتنا اللہ سبحانہ وایاکم علیٰ متابعۃِ سید المرسلین حبیبِ رب العٰلمین علیہ الصلوٰۃ والسلام ———

شفقت آثار! حیاتِ دُنیوی بہت تھوڑی ہے اور معاملاتِ ابدی و سرمدی اسی (مختصر) حیات سے وابستہ ہیں۔ سعادت مند وہ ہے جو اس تھوڑی سی فرصت کو غنیمت جان کر کارِ آخرت کی طیاری کرے اور ایک لمبے سفر کے لیے توشہ تیار کر لے ——— تم کو اللہ تعالےٰ نے اپنی مخلوق میں سے ایک بڑی جماعت کا مرجع بنایا ہے۔ اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے حاجاتِ خلق اللہ کو پورا کرنے کے لیے کمرِ ہمت کو خوب اچھی طرح باندھ لو اور اپنے خالق کے بندوں کی خدمت گاری کو درجاتِ دُنیوی و اُخروی پر فائز ہونے کا وسیلہ تصور کرو ——— نیک سلوکی، احسان، باخلاقِ خندہ روئی، حُسنِ خُلق اور مخلوق کے معاملات میں نرمی و سہولت کو رضا مندیٔ حق تعالےٰ کا ذریعہ، سببِ نجات اور واسطۂ ترقیٔ مدارج سمجھو ——— حدیث شریف میں آیا ہے ——— الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ (مخلوق، اللہ تعالےٰ کی عیال ہے لہٰذا اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ وہ شخص ہے جو اس کی مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک کرے)

اب چند احادیث مسلمانوں کی حاجات پورا کرنے اور ان کو خوش کرنے کی فضیلت نیز حسنِ اخلاق اور نرمی و تحمل کی فضیلت کے سلسلے میں لکھی جاتی ہیں ان پر اچھی طرح غور کرنا اور اگر کسی حدیث کے معنی سمجھ میں

نہ آئیں تو اس کو کسی متدین اہل علم سے سمجھ لینا ـــــ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ـــــ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ وہ اپنے بھائی پر نہ خود ظلم کرتا ہو نہ کسی کو اس پر ظلم کرنے دیتا ہے، جو شخص بھی اپنے بھائی کی حاجت روائی میں رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس شخص کی حاجت پوری کرتا ہے اور جو شخص کسی مسلم بھائی کا کوئی غم دور کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے عوض میں قیامت کے دن اس کے غم کو دور کردے گا ـــــ اور جو شخص مسلمان کو خوش کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو خوش کرے گا۔

(بخاری و مسلم)

مسلم کی روایت یوں ہے ـــــ اللہ بندے کی مدد پر رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد پر رہتا ہے ـــــ یہ بھی حدیث میں آیا ہے کہ ـــــ اللہ کی مخلوق میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کو اس نے پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ لوگوں کی حاجتیں پوری کریں۔ لوگ گھبرائے ہوئے اپنی حاجتیں لے کر ان کے پاس آتے ہیں (ملخصاً۔ طبرانی)

حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ ـــــ اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کو دولت کے ساتھ مخصوص کیا ہو تاکہ وہ بندوں کو فائدہ پہونچائیں۔ جب تک وہ اس دولت کو اللہ کے بندوں پر خرچ کرتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو دولت پر برقرار رکھتا ہے اور جب وہ اپنی داد و دہش بند کر دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے وہ دولت چھین لیتا ہے اور دوسروں کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ (رواہ ابن ابی الدنیا والطبرانی)

یہ بھی حدیث ہے کہ ـــــ جو شخص اپنے بھائی کی حاجت روائی میں کوشش کرے گا اس کا یہ عمل دس سال کے اعتکاف سے بہتر ہوگا۔ (ملخصاً ـــ رواہ الطبرانی والحاکم وقال صحیح الاسناد) ....

یہ بھی حدیث ہے کہ ـــــ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی حاجت روائی کے لیے دوڑ دھوپ کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے ہر قدم پر ستر نیکیاں لکھیگا اور ستر خطائیں مٹادے گا، یہاں تک کہ وہ اپنے مقام پر لوٹ کر آئے۔ پس اگر اس بھائی کی حاجت پوری ہوگئی تو وہ کوشش کرنے والا گناہوں سے ایسا صاف ہو جائے گا گویا کہ آج ہی اس کی پیدائش ہوئی ہے اور اگر وہ اثنائے کوشش میں مر گیا تو جنت میں بلا حساب داخل ہوگا (رواہ ابن ابی الدنیا) ـــــ حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ ـــــ جو شخص اپنے مسلم بھائی کے لیے ذریعہ بن جائے کسی ذی مقدرت تک پہونچنے کا اور عسرت دور کرنے کا تو اللہ تعالیٰ پل صراط پر گذرنے کے وقت اس کی اعانت فرمائے گا جبکہ لوگوں کے قدم پل صراط پر

عرش میں ہوں گے (رواہ الطبرانی) ــــــ ایک حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ ــــــ کسی مومن کو مسرور کرنا اس طرح کہ اس کے لیے کپڑا مہیا کر دیا یا اس کی بھوک دور کر دی یا اسکی کوئی ضرورت پوری کر دی ــــــ یہ بہت ہی اعلیٰ و افضل عمل ہے (رواہ الطبرانی و ابو شیخ) ــــــ ایک حدیث میں یہ آیا ہے کہ ــــــ اللہ کے نزدیک فرائض کی ادائیگی کے بعد سب سے زیادہ محبوب عمل مسلمان بھائی کو خوش کرنا ہے (رواہ الطبرانی) .... ایک حدیث میں یہ آیا ہے کہ ــــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس چیز کے متعلق سوال کیا گیا جس کے ذریعہ لوگ زیادہ تر جنت میں داخل ہوں گے آپ نے فرمایا وہ چیز تقویٰ اللہ اور حسن اخلاق ہے ــــــ اور آپ سے سوال کیا گیا اس چیز کے متعلق جس کی وجہ سے اکثر لوگ دوزخ میں داخل ہوں گے آپ نے ارشاد فرمایا دہن اور شرمگاہ ہے ــــــ (رواہ الترمذی و ابن حبان و البیہقی) ــــــ یہ بھی حدیث میں آیا ہے کہ ــــــ ایمان میں زیادہ کامل مومن وہ ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ مہربانی کا سلوک کرنے والا ہو (رواہ الترمذی) .... یہ بھی حدیث میں ہے کہ ــــــ میں اس شخص کے لیے جنت کے احاطے کے پاس گھر دلانے کا ضامن ہوں جو جھگڑا کرنا ترک کر دے اگرچہ حق پر ہی کیوں نہ ہو ــــــ اور وسط جنت میں گھر دلانے کا اس شخص کے لیے ضامن ہوں جو جھوٹ چھوڑ دے اگرچہ مذاق ہی میں کیوں نہ بولتا ہو ــــــ اور جنت کے بالائی حصے میں گھر دلانے کا اس شخص کے لیے ضامن ہوں جو اپنے اخلاق کو اچھا کرے (رواہ ابو داؤد و ابن ماجہ والترمذی) .... یہ بھی حدیث میں ہے کہ ــــــ بیشک اللہ نرمی کرنے والا ہے اور تمام کاموں میں نرمی کو پسند کرتا ہے (رواہ البخاری و مسلم) ــــــ یہ بھی حدیث میں آیا ہے کہ ... اللہ تعالیٰ نرمی کو پسند کرتا ہے اور اس سے خوش ہوتا ہے اور نرمی پر جو مدد کرتا ہے وہ سختی پر نہیں کرتا ــــــ (رواہ الطبرانی) ــــــ یہ بھی حدیث میں آیا ہے کہ ــــــ فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا میں تمہیں ایسے شخص کو نہ بتلاؤں جو دوزخ کی آگ پر حرام ہے یا (فرمایا کہ) اس پر دوزخ کی آگ حرام ہے (سنو) ہر وہ شخص جو آسانی کرنے والا اور نرم خو ہو اس پر دوزخ کی آگ حرام ہے (رواہ الترمذی) .... یہ بھی حدیث ہے کہ ــــــ بندہ تحمل و بردباری سے وہ درجہ پاتا ہے جو ایک صائم النہار اور قائم اللیل کا ہوتا ہے (رواہ ابن حبان) .... یہ بھی

حدیث میں آیا ہے کہ ـــــــ آپ نے فرمایا کہ کیا میں تمھیں وہ بات نہ بتلا دوں جس سے اللہ تعالیٰ بلندی عطا کرے اور درجات کو اونچا کر دے، صحابہؓ نے عرض کیا ضرور ارشاد فرمائیے ـــــ فرمایا۔ جو شخص تم سے جہالت کا معاملہ کرے تم اس سے بُردباری کا معاملہ کرو اور جو ظلم کرے اس کو معاف کر دو اور جس نے تم کو محروم کیا ہو اُس کو عطا کرو اور جو تم سے رشتہ توڑے تم اس سے جوڑو اور صلہ رحمی کرو ـــــ (رواہُ الطبرانی والبزار) ـــــ یہ بھی حدیث میں آیا ہے کہ ـــــ طاقتور وہ نہیں ہے جو کسی کو پچھاڑ دے۔ درحقیقت طاقتور وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے اوپر قابو رکھے، (تحمل کرے) ـــ (رواہُ البخاری ومسلم) ـــــ حدیث میں یہ بھی آیا ہو کہ ـــــ یہ بھی ایک قسم کا صدقہ ہے کہ تو کشادہ پیشانی کے ساتھ لوگوں کو سلام کرے ـــــ (رواہُ ابن ابی الدنیا) یہ بھی حدیث میں آیا ہے کہ ـــــ تیرا تبسم کرنا اپنے مسلم بھائی کو دیکھ کر صدقہ ہے ـــــ تیرا امر بالمعروف اور نہی المنکر کرنا صدقہ ہے ـــــ کسی بھٹکے ہوئے کو سیدھا راستہ بتا دینا صدقہ ہے ـــــ راستے سے پتھر کانٹا ہڈی کا ہٹا دینا، صدقہ ہے ـــــ اپنے ڈول میں پانی بھر کر اپنے بھائی کے ڈول میں ڈال دینا صدقہ ہے ـــ (رواہُ الترمذی) ـــــ یہ بھی حدیث میں آیا ہے کہ ـــــ جنت میں ایک ایسا بالاخانہ ہو گا جس کے باہر کا حصہ اندر سے اور اندر کا باہر سے (شفاف ہونے کی وجہ سے) نظر آئے گا حضرت اشعریؓ نے دریافت کیا یہ کس کے لیے ہو گا؟ یا رسول اللہ! ـــ فرمایا اس شخص کے لیے جو اچھا کلام کرے، لوگوں کو کھانا کھلائے، اور جب کہ رات کو لوگ سو رہے ہوں یہ نماز تہجد میں کھڑا ہو۔ (رواہُ الطبرانی والحاکم) ـــــ

یہ چند احادیث کتاب ترغیب وترہیب سے جو "کتب معتبرۂ علم حدیث" میں سے ہے ـــ لکھی گئی ہیں ـــ اللہ تعالیٰ ان کے موافق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے ـــ اپنے حال کا ان احادیث کے مضامین سے موازنہ کرو ان احادیث کی موافقت ہو رہی ہو تو اللہ کا شکر ادا کرو اور اگر موافقت نہیں ہے تو عجز وزاری کے ساتھ اپنا حال ان احادیث کے موافق ہونے کی اللہ تعالیٰ سے دعا و درخواست کرو ـــ اگر بالفعل ان پر عمل کی توفیق کوئی نہ پائے تو کم از کم اعترافِ کوتاہی تو ہونا چاہیے ـــــ یہ اعتراف بھی ایک نعمت ہے ـــ پناہ بخدا اگر کوئی توفیقِ عمل بھی نہ رکھتا ہو اور خود کو کوتاہ عمل بھی نہ جانے ایسا شخص کم نصیب ہے۔

۵ ہر کس کہ بیافت دولتے یافت عظیم آنکس کہ نیافت درد نایافت عظیم

مکتوب (۱۴۸) ارشاد پناہ میر محمد نعمان[1] کے نام ـــــــ

اللہ تعالیٰ آپ کی ذات با برکات کو الطاف سے بھر پور کر کے مسند ارشاد پر جلوہ آرا رکھے ـــــــ

ـــــــ ظہر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس (بر و بحر میں لوگوں کے کرتوتوں کی وجہ سے فساد ظاہر ہو گیا) ہمارے شامتِ اعمال کے باعث دوسرا سال ہے کہ مخلوق قحط کی مصیبت میں گرفتار ہے۔ لوگ نماز استسقاء کے لیے جنگل کی طرف نکلے تھے اور یہ "دور از کار" (میں) بھی سب کے ساتھ تھا، میں اپنے بار گناہ کو لیے ہوئے یقینی طور پر سمجھ رہا تھا کہ اس بلائے قحط کا ورود میرے ہی اعمالِ سوء کے نتائج میں سے ہے۔ لوگ خواہ مخواہ میرے وجود سے برکت ڈھونڈتے تھے اور مجھے دفع بلا کا ذریعہ بنا رہے تھے ـــــــ میری حقیقت حال سے واقف نہ تھے ـــــــ لوگ حکام کے ظلم کا شکوہ بھی کر رہے تھے، مگر جب میں اپنے اعمال کو دیکھتا تھا تو مقابلۃً ان حکام کے اعمال کچھ بھی نہیں تھے ـــــــ

ـــــــ مخدوما! ان تقصیرات کے باوجود احباب سے امید رکھتا ہوں کہ وہ میرے حال پر رحم فرمائیں گے ـــــــ میرے لیے عفوِ زلات کی اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں گے اور میرے "کثرت معاصی" کی بنا پر مجھے چھوڑیں گے نہیں ـــــــ ہر چند کہ عاصی ہوں لیکن امیدوار رحمت الٰہی ہوں۔ ارحم الراحمین عاصیان راجی" کے حال پر رحم فرماتے ہیں ـــــــ کل بروز قیامت شفاعت بھی نصیبِ عاصیاں ہوگی ......

مکتوب (۱۵۰) ملا نعمت اللہ کے نام ـــــــ

(اس مضمون میں کہ جس قدر نسبت باطن قوت پذیر ہوتی ہے اتنی ہی احکام شرعیہ کی تجلی بھی زیادہ ہوتی ہے)

...... عجب معاملہ ہے کہ جس قدر نسبتِ باطن، عارف پر غالب آتی ہے احکام شرعیہ کے ازدیادِ تجلی کا سبب بنتی ہے ـــــــ اس لیے کہ ـــــــ نفس امارہ جو بالذات احکام شرعیہ کا منکر ہے اس وقت مطیع ہو جاتا ہے اور کمالِ تجلی، کمالِ "اطمینان نفس" کے ساتھ وابستہ ہے ـــــــ شریعت کے معاملات میں مداہنت

---

[1] آپ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خلفاء میں سے تھے۔ آپ کی وفات ۱۹ صفر سنہ ۱۰۶۰ھ میں ہوئی تذکرہ اولیا جلد سوم مولفہ مرزا محمد اختر دہلوی۔

برتنے والا حقیقت نسبت سے بے بہرہ ہے وہ "مغز" سے ہٹ کر پوست میں الجھ گیا ہے ___ "ثبت" کا کمال "اطمینان" سے ہی حاصل ہوتا ہے اور علامت "اطمینان" یہ ہے کہ "احکام منزلہ" کا پورا پورا اتباع ہو ___ اتباع نہیں تو اطمینان بھی نہیں ___ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں کمالِ متابعت صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم پر ثابت قدم رکھے ___

مکتوب (۱۵۷) مولانا عبد الغفور سمرقندی[1] کے نام ___

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ___ کیا عجب نعمت ہے کہ کوئی شخص عالم پیری میں زیور طاعت سے آراستہ ہو اور ہنگام ضعف میں بھی "اعدائے توبہ" پر غالب ہو، اہل اللہ کی قبولیت کے آثار اسکے اطوار سے ظاہر ہوں اور اسکی پیشانی کے انوار حقیقت حال کے گواہ ___ آنعزیز کے "اخبار توفیق" باعث فرحت و شکر خداوندی ہیں ___ اور اس نعمت کی زیادتی کے لیے دعا کا سبب ___ یہ تمام انوار "نظر دوستان خدا" کی برکات کے انوار ہیں اور یہ جمعیت صوری جو ظاہر نے "ادائے وظائف بندگی" کے لیے پائی ہے اسی نسبت معنوی کا اثر ہے جو باطن اکابر سے آپکے باطن پر پڑ گئی ہے جو جماعت حضرت مجدد الف ثانی رحمہ کے حلقہ خدام میں رہ کر سعادت پابوسی سے مشرف ہوئی ہے وہ میری نظروں میں بغایت عزیز و محبوب اور شریف و مرغوب ہے ___ اس لیے کہ ___ یہ لوگ کمالاتِ محبوب کا آئینہ ہیں اور اس جمال دل آرا کی یادگار ___ جس وقت اس جماعت کو دیکھتا ہوں میری عجیب حالت ہو جاتی ہے گویا کہ حضرت گرامی قدر رحمۃ اللہ علیہ کا جمال مبارک مشاہدہ کر رہا ہوں ___ وہ اجتماع للہ فی اللہ کہ جس کی نظیر آج نہیں ملتی جب میرے دل میں گھومنے لگتا ہے تو (اس کی یاد سے) "دیدہ پر آب" اور "جگر کباب" ہو جاتا ہے۔ آرزو یہی ہے کہ اس جماعت کے ساتھ رہوں اور "حرف و حکایت" انھیں سے کروں ___ لیکن افسوس ___ یہ جماعت روز بروز قلت میں آرہی ہے اور باوجود قلت اس کے افراد ایک دوسرے سے دور ہیں ___

۵۰ نہ ہجر دوستاں خوں شد درونِ سینہ جانِ من
فراقِ ہمنشیناں سوخت، مغزِ استخوانِ من

---

[1] آپ حضرت مجدد الف ثانی کے خلفا میں سے تھے۔ بظاہر اہل سپاہ اور بمعنی از احباب اصحاب خانقاہ (زبدۃ المقامات ص ۳۸۹)

اللہ جو کچھ کرے اسی میں خیر ہے۔۔ جہاں کہیں بھی یہ حضرات ہیں بہرحال غنیمت ہیں

ع بیادگار ربانی کہ بوئے او داری۔۔۔۔۔۔۔

مکتوب (۱۵۸) مولانا محمد حنیف کے نام (اظہار درد و سوز میں)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔۔۔ الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ۔۔۔۔۔۔۔ مکتوب مرغوب لاہور سے ایک عزیز کی معرفت بھیجا ہوا۔۔ آیا۔۔ اس کے مطالعہ سے خوش وقت ہوا۔۔۔ مضمون خط سے جاذبۂ شوق ظاہر اور طلب حرارت آشکارا تھی۔۔۔۔۔

الحمد للہ سبحانہ علی ذالک۔۔۔ جس قدر "جذب وحرارت" حاصل ہو نعمت ہے۔۔۔۔۔

خط میں اس دیار (سرہند) کے آنے کا اشتیاق اور میرے بلاوے بھیجنے کا انتظار ظاہر کیا ہے۔۔ مخدوما! اس دیار کے ساکنین اپنے سر میں دوسرے دیار (آخرت) کا خیال رکھتے ہیں اس کی دوری سے ہمیشہ سوگوار رہتے ہیں اور دوستوں کو بھی اسی دیار کی دلالت کرتے ہیں۔ اگرچہ کوئی نشان اس دیار کا (اب تک) ظاہر نہیں ہوا اور سوائے ہجر و دوری اور سوز و گدازکے کچھ بھی پلے میں نہیں۔۔۔۔۔۔۔ تم بھی اس دیار کو عبور کرنا چاہو نیز ہم "ماتم زدگان ہجران" کے درد شریک اور "تلخ نوشان بزم سوزش فقدان" کے ساتھ جرعہ کش بننا چاہو تو کیا مضائقہ ہے یہاں آجاؤ۔۔۔ مگر ہماری یہ بات بھی ہے کہ اس درد و دوری اور سوز ہجراں کے باوجود "ادھر" سے عنایات بیش از بیش ہیں اور الطاف پہلے سے زائد۔۔۔ بھائی یہ بھی مستقل عنایت ہی ہے کہ اس درد سے مانوس کر رکھا ہو اور اس سوز سے موافقت و سازگاری کی ہمت دیدی ہے۔

ع درین دیار باکہ زندہ ام کہ گاہے نسیم عاطفتے زاں دیار می آید

مکتوب (۱۵۹) شیخ حسن کے نام۔۔۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔۔۔ الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ۔۔۔ اخوی اعزی شیخ حسن کو اس "درویش دلریش" کا سلام عافیت انجام۔۔ "اخبار توفیق" "گرمی ہنگامہ طالباں"۔ "استقامت اوضاع" اور "استمرار حلقۂ ذکر و فکر" کو سن سن کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔۔ یہ چیز مزید حمد و شکر کا باعث ہے۔۔ اس قرب قیامت کے زمانے میں اس قسم کا دینی اجتماع اور للہ فی اللہ ہمنشینی اللہ کی بڑی نعمتوں میں سے ہو۔

ع آسماں سجدہ کند بہر زمینے کہ درو یک دو کس یک دو نفس بہر خدا بنشینند

اپنے کام میں سرگرم رہو اور اللہ کا شکر ادا کرتے رہو (وہ فرماتا ہے) لئن شکرتم لازیدنکم ——— (اگر تم نعمت کا شکر ادا کروگے تو میں تمھارے لیے نعمت میں ضرور اضافہ کردوں گا)

ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالےٰ کی آزمائشی ڈھیل سے لرزاں اور کید شیطانی سے ترساں بھی رہنا نیز نفسانی وسواس اور شرکِ خفی کے دقائق سے بھی خبردار رہنا ....

الغرض بزرگوں کے ساتھ رابطۂ معنوی کو مُحکم رکھنا، سُنّتِ نبویہؐ کے عروۂ وثقیٰ کو اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑنا اور درگاہِ الٰہی میں دوام التجا نیز تضرع وزاری کو لازم کرلینا ——— دوستوں سے توقع یہ ہے کہ اس دور افتادہ کو دعائے خیر میں یاد رکھیں گے .... اللہ تعالیٰ معینکم وجناب رکم ...

مکتوب (۱۶۰) شیخ عبد اللطیف لشکر خانی کے نام ...

...... اس مسکین کی تمنا اپنے بارے میں اور دوستوں کے بارے میں یہ ہے کہ اپنی ہمت کو کلیتہً مطلوبِ حقیقی کی طرف مصروف رکھیں اور جو بات اس "دولت عظمیٰ" کے منافی ہو اس سے بالکل اعراض کریں ——— مگر ایسا بھی نہ ہو کہ معموریٔ باطن پر اکتفا کر کے ظاہر کی طرف سے غفلت برتیں ....

اگرچہ ایک درویش کا یہ مقولہ ہے کہ "کوئی سعادت مند اگر اللہ کی طرف تمام عمر متوجہ رہا پھر ایک لحظے کے لیے غافل ہوگیا تو اس نے جو کچھ پایا تھا اُس سے زیادہ فوت ہوگیا" ——— لیکن کیا کیا جائے تمام آرزوئیں میسر نہیں ——— مقتضیات بدنی اور اختلاط خلق کے بغیر بھی چارہ نہیں ——— ہاں یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس "غفلتِ ظاہری" کو جو کہ لابدی اور ضروری ہے اگر نیتِ صالحہ کے ساتھ ملالیا جائے تو یہ غفلت نہ رہے گی "غفلتِ ظاہری" "ذکر" کے ساتھ ملحق ہوجائے گی مثلاً نیند جو کہ سراسر غفلت ہے اگر اس نیت سے ہو کہ سونے کے بعد عبادت کرنے میں سستی نمودار نہیں ہوگی۔ تو یہی نیند "ذکر" بن جائے گی۔ "علماء کی نیند عبادت ہے" یہ تو تم نے سنا ہی ہوگا (یہ نیت ہی کی بنا پر ہے) ——— لوگوں کے ساتھ اس نیت سے ملنا جلنا کہ اُن کے حقوق ادا کردیئے جائیں یہی عبادت ہے ...... علیٰ ہذا القیاس ... ذکر زبان ہی پر منحصر نہیں ہے جس عمل سے بھی رضائے مولیٰ ملحوظ و مطلوب ہوگی وہ ذکر ہوجائے گا۔ اِنَّ ھٰذِہٖ تَذْکِرَۃٌ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیْلًا (باقی صفحہ پر)

پیغمبرِ اسلام اور انسانی اخلاق

(از ڈاکٹر محمد آصف صاحب قدوائی ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی)

(۲)

ذیل کے واقعات سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ اوصاف کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ایک شخص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کرنے آیا، آپ کو اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ "اگرچہ وہ اپنے قبیلہ کا اچھا آدمی نہیں ہے مگر آنے دو" وہ آیا تو آپ نے نرمی سے گفتگو کی، اس پر حضرت عائشہ کو تعجب ہوا اور اس کے واپس جانے کے بعد انھوں نے آپ سے دریافت کیا کہ "آپ تو اسے اچھا آدمی نہیں سمجھتے تھے پھر اتنی شگفتہ مزاجی سے کیوں باتیں کیں"۔ آپ نے جواب دیا۔ "خدا کے نزدیک وہ آدمی سب سے بُرا ہے جس کی بدزبانی کے باعث لوگ اس سے ملنا چھوڑ دیں"۔

اپنی غیر معمولی فیاضی اور دریا دلی کی وجہ سے آپ اکثر مقروض رہا کرتے تھے۔ مدینہ میں آپ وقتاً فوقتاً یہودیوں سے قرض لیا کرتے تھے، اگر کبھی ادائیگی میں دیر ہو جاتی تو وہ سختی سے تقاضہ کرتے تھے آپ ان کی بدمزاجی خندہ پیشانی سے برداشت کر لیا کرتے تھے۔

ایک دن ایک بدو گوشت بیچ رہا تھا۔ آپ نے اس بھروسہ پر کہ گھر میں کھجوریں رکھی ہیں، کچھ کھجوروں کے عوض میں گوشت چکالیا، لیکن گھر پہنچکر معلوم ہوا کہ کھجوریں ختم ہو چکی تھیں، چنانچہ آپ نے باہر آکر بدو سے فرمایا کہ "اتفاق سے میرے یہاں اس وقت کھجوریں نہیں ہیں، تم اپنا گوشت واپس لےلو" اس نے شور کرنا شروع کر دیا کہ "ہائے بددیانتی"۔ صحابہؓ نے بہتیرا سمجھایا کہ "بھلا اللہ کے رسول بددیانتی کریں گے"۔ مگر وہ نہ مانا اور اپنی بات کہے گیا۔ صحابہؓ کو یہ بُرا لگا اور انھوں نے ڈانٹ کر اُسے خاموش کرنا چاہا مگر آپ نے انھیں روک دیا کہ "اسے کہنے دو۔ اس کا حق ہے"۔ آخر آپ نے ایک انصاریہ کے

یہاں سے کھجوریں منگوا کر گوشت کی قیمت ادا کی۔

آپ کی خدمت میں ایک بار ایک سائل حاضر ہوا، آپ نے اُسے بٹھالیا۔ پھر دوسرا اور اس کے بعد تیسرا آیا، آپ نے ان سے بھی کہا کہ "بیٹھو۔ میرے پاس تو اس وقت کچھ نہیں ہے لیکن خدا دے گا تو تمہاری حاجت پوری کروں گا۔" اتنے میں کسی نے چار اوقیہ چاندی ہدیہ کی، آپ نے ایک ایک اوقیہ تینوں سائلوں میں تقسیم کردی اور چوتھی کی بابت اعلان کردیا کہ جسے ضرورت ہو لے لے۔ مگر رات ہوگئی، اور کوئی اس کا خواہشمند نہ ہوا، مجبوراً جب سونے کے لئے لیٹے تو اسے سرہانے رکھ لیا مگر نیند نہ آئی، بار بار اُٹھتے اور نماز پڑھنے لگتے۔ حضرت عائشہؓ نے یہ دیکھا تو انھیں تشویش ہوئی۔ انھوں نے پوچھا۔ "کیا یہ کچھ طبیعت ناساز ہے؟" آپ نے فرمایا "نہیں"۔ انھوں نے کہا۔ "پھر آپ اس قدر بے چین کیوں ہیں؟" تو آپ نے سرہانے سے چاندی نکال کر دکھائی اور فرمایا۔ "اس نے مجھے بے چین کر رکھا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں مجھے اس حال میں موت نہ آجائے کہ یہ چاندی میرے پاس ہو۔

حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول پاکؐ نے ان سے فرمایا کہ "ابوذر! اگر اُحد کا پہاڑ بھی میرے لئے سونا ہوجائے تب بھی میں یہ نہ پسند کروں گا کہ تین راتیں گزر جائیں اور میرے پاس ایک دینار بھر بھی رہ جائے۔ علاوہ اُس کے کہ جو میں ادائیگی قرض کے لئے چھوڑ دوں"۔

بعض اوقات ایسا بھی کرتے کہ کسی سے کوئی چیز مول لیتے تو قیمت ادا کرنے کے بعد وہی چیز اُسے بطور ہدیہ عنایت فرمادیتے۔

کھانے پینے کی معمولی سے معمولی چیز کو بھی تنہا نوش نہ فرماتے تھے، جو لوگ بر وقت موجود ہوتے ان کو ضرور شریک کرلیتے تھے۔

ایک بار آپ کہیں جارہے تھے کہ ایک حاجتمند نے سوال کیا۔ آپ اس وقت بالکل خالی ہاتھ تھے لیکن اُسے رخصت نہیں کیا بلکہ ساتھ چلنے کو کہا کہ شاید راستہ میں کوئی صورت نکل آئے۔ حضرت عمر فاروقؓ بھی ہمراہ تھے، انھوں نے عرض کیا کہ "آپ خود خالی ہاتھ ہیں تو آپ پر کیا ذمہ داری ہوسکتی ہے"۔ ایک اور صحابی وہیں موجود تھے، انھوں نے کہا۔ "یارسول اللہ آپ دئے جائیے۔ خدا آپ کو محتاج نہیں کرے گا"۔ یہ بات آپ کو بہت پسند آئی۔

آپ اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہراؓ سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ وہ تشریف لاتیں تو

آپ فرطِ محبت سے کھڑے ہوجاتے اور ان کی پیشانی کو بوسہ دیتے۔ تاہم ان کی تنگدستی کا یہ عالم تھا کہ ان کے گھر میں کوئی خادمہ نہ تھیں، اپنے ہاتھ سے چکی پیستیں اور خود ہی مشک میں پانی بھر لاتیں، چکی پیستے پیستے ان کے ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے تھے اور مشکیزہ اٹھاتے اٹھاتے شانہ پر نیل اُبھر آئے تھے ایک غزوہ میں کچھ کنیزیں مسلمانوں کے ہاتھ آئیں تو انھیں خیال ہوا کہ اگر ایک کنیز ان کی خدمت میں دیدی جائے تو ان کو اتنی محنت نہ کرنا پڑے، خود باپ سے کہنے کی تو ہمت نہ ہوئی۔ حضرت علیؓ کے ذریعہ سفارش کرائی، لیکن آنحضرت صلعم نے فرمایا "ابھی اصحاب صفہ کا انتظام نہیں ہوسکا ہو۔ جب تک یہ نہ ہولے میں کسی اور کے لئے کچھ نہیں کرسکتا"۔

مسلمان، مشرک، کافر بھی آپ کے مہمان ہوا کرتے تھے، آپ ان کی یکساں تواضع اور مدارات فرماتے تھے، اکثر گھر میں جو کچھ ہوتا وہ مہمانوں کی نذر ہوجاتا اور اہل وعیال فاقہ سے رہتے مہمانوں کے آرام کا اتنا خیال تھا کہ رات کو اٹھ اٹھ کر ان کی خبر گیری فرمایا کرتے تھے۔

سائلوں کی حتی الامکان مدد فرمانے کے باوجود گداگری سے آپ کو بڑی نفرت تھی، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص پیٹھ پر لکڑی لاد کر بیچے اور اس طرح اپنی آبرو بچائے تو یہ سوال کرنے سے بہتر ہے۔

ایک دفعہ ایک انصاری نے آپ سے سوال کیا۔ آپ نے ان سے پوچھا "تمھارے پاس کوئی چیز ہے؟" ان کے پاس ایک بچھونا اور ایک پیالہ تھا، وہ منگوا کر آپ نے دو درہم کو فروخت کردیا اور انصاری سے فرمایا کہ "ایک درہم کا کھانے کا سامان لیکر گھر دے آؤ اور دوسرے کی رسی خرید کر جنگل سے اس میں لکڑیاں باندھ کر لاؤ اور شہر میں بیچو"۔ پندرہ روز بعد وہ پھر خدمت نبوی میں حاضر ہوئے تو ان کے پاس دس درہم جمع ہو گئے تھے، حضور سرورِ کائنات یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا "یہ اس سے بہتر ہے کہ کوئی شخص قیامت میں گداگری کا داغ چہرہ پر لیکر اُٹھے"۔

اپنے خاندان کے لئے آپ نے صدقہ وزکوٰۃ لینا حرام کردیا تھا، فرمایا کرتے تھے کہ "میں کبھی کبھی اپنے بستر پر کھجوریں پڑی ہوئی دیکھتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ اُٹھا کر کھاؤں مگر یہ سوچ کر رُک جاتا ہوں کہ کہیں صدقہ کی نہ ہوں"۔

حضرت امام حسنؓ نے ایک بار صدقہ کی کھجوروں میں سے ایک کھجور منھ میں ڈال لی تو آپ نے انھیں ٹوکا۔ "کیا تم کو معلوم نہیں ہے کہ ہمارا خاندان صدقہ نہیں کھاتا" حضرت امام حسنؓ نے فوراً کھجور اُگل دی۔

آپ کو کسی کا احسان لینا پسند نہ تھا اور بغیر قیمت دئے کوئی چیز نہیں لیتے تھے۔ ایک سفر میں حضرت عمرؓ اور عبداللہ بن عمرؓ دونوں آپ کے شریک تھے۔ عبداللہ بن عمرؓ کی سواری کا اونٹ سرکش تھا اور بار بار رسول اللہ صلعم کے ناقہ کے آگے نکل جاتا تھا حضرت عمرؓ ہر دفعہ اُن کو ڈانٹتے تھے۔ وہ لاکھ کوشش کرتے مگر اونٹ قابو میں نہ آتا، آپ نے عبداللہ بن عمرؓ کی مجبوری محسوس کی تو حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ "تم یہ اونٹ میرے ہاتھ بیچ ڈالو، انھوں نے نذر کرنا چاہا لیکن بلا قیمت لینے سے آپ نے انکار کر دیا، آخر کار حضرت عمرؓ دام لینے پر راضی ہو گئے اور آپ نے اونٹ خرید کر عبداللہ بن عمرؓ کو دیدیا کہ "اب یہ تمھارا ہے"۔

آپ کے عدل وانصاف کی یہ شہرت تھی کہ یہودی تک اپنے مقدمات آپ کے سامنے پیش کرتے تھے اور آپ ان کی شرع کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔ آپ کا قول تھا کہ "قیامت کے دن جب کہ خدا کے سایہ کے علاوہ اور کوئی سایہ نہ ہوگا تو سات اشخاص کو خدا اپنے سایہ میں لے گا جن میں ایک عادل فرمانروا ہوگا"۔

شرعی حدود کے بارہ میں آپ کسی کی سفارش نہیں سنتے تھے، اسامہ بن زیدؓ آپ کو بہت محبوب تھے ایک بار انھوں نے ایک ملزمہ کی معافی کی درخواست کی تو آپ نے نہایت برہم ہو کر فرمایا کہ "تم حدود شرعی میں مداخلت کرتے ہو؟ خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی ایسا کرتی تو میں اُسے وہی سزا دیتا جو اس کو دوں گا۔"

ایک دن آپ مال غنیمت تقسیم کر رہے تھے، لوگوں کا بہت ہجوم تھا۔ ایک بے ادب شخص منھ کے بل آپ پر آپڑا، آپ کے ہاتھ میں ایک پتلی سی چھڑی تھی اس سے آپ نے اس کو ٹھوکا دیا، اتفاق سے چھڑی اس کے سر پر لگی اور خراش آگئی، آپ نے فوراً اسکی طرف چھڑی بڑھا دی اور فرمایا "بدلہ لیلو" اس نے کہا "یا رسول اللہ! میں نے معاف کیا"۔

رحم کی صفت اتنی غالب تھی کہ سزا دینے میں آپ انتہائی احتیاط برتتے تھے اور جہاں تک

گنجائش ہوتی در گزر کرنا چاہتے تھے۔

ایک صاحب نے آکر اقرار کیا کہ وہ زنا کے مرتکب ہوئے تھے، آپ نے منھ پھیر لیا، وہ گھوم کر دوسری طرف حاضر ہوئے۔ آپ نے پھر رُخ موڑ لیا۔ جب کئی بار ایسا ہی ہوا تو آپ نے پوچھا "تمھیں جنون تو نہیں ہوگیا ہے؟" انھوں نے کہا "جی نہیں"۔ پھر آپ نے پوچھا "تمھاری شادی ہو چکی ہے؟" انھوں نے عرض کیا "جی ہاں"۔ آپ نے فرمایا "تم نے شاید صرف ہاتھ لگایا ہوگا" انھوں نے کہا "جی نہیں، مجامعت کی ہے"۔ ان ساری وضاحتوں کے بعد ناچار آپ نے حکم دیا کہ سنگسار کیے جائیں"۔

مہرِ والطاف سے دشمن اسی طرح فیضیاب ہوتے تھے جیسے کہ دوست۔ مکہ والوں کی دشمنی کے باعث ایک بار ثمامہ بن اثال نے نجد سے مکہ غلہ جانا روک دیا تھا، آپ کو اطلاع ہوئی تو فوراً حکم دیا کہ غلہ نہ روکا جائے۔

ایک روز ایک درخت کی شاخ سے تلوار لٹکا کر اس کے سایہ میں آپ سو رہے تھے کہ غورث بن الحراث اُدھر سے گزرا، اس نے چپکے سے تلوار اُتار لی اور اُسے کھینچ کر آپ کو جگایا اور بولا "اب تم کو کون بچا سکتا ہے؟" آپ نے آسمان کی طرف اُنگلی اُٹھا کر فرمایا "خدا"۔ غورث پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ آپ نے اس کے ہاتھ سے تلوار چھین لی اور ارشاد فرمایا "اب تم کو کون بچا سکتا ہے؟" غورث سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔ آپ نے اُسے معاف کر دیا۔

حضرت زینبؓ آپ کی صاحبزادی، حمل سے تھیں۔ ان کے ہبار نے نیزہ مار دیا اور حمل ساقط ہوگیا، بالآخر یہی صدمہ ان کی موت کا باعث ہوا، ہبار نے خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر معافی چاہی اور رحمتِ عالم نے معاف کر دیا۔

بچوں سے نبی اکرمؐ بڑی محبت فرماتے تھے۔ ان کے قریب سے گزرتے تو خود سلام کرتے اور ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتے۔ بوڑھوں کا بھی بہت احترام کرتے تھے، مکہ فتح ہونے کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے بوڑھے اور نابینا باپ کو بیعت کرانے آپ کے پاس لے کر آئے تو آپ نے بڑی نرمی سے فرمایا "تم نے ان کو کیوں زحمت دی؟ میں خود ان کے پاس چلا جاتا"۔

آپ نے جنگ میں بھی کسی کو اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کیا۔ ابی بن خلف آپ کا شدید دشمن تھا، اس نے ایک نفیس گھوڑا تیار کیا تھا اور جا بجا کہتا پھرتا تھا کہ میں نے یہ اس لیے تیار کیا ہے کہ اس پر

سوار ہو کر محمدؐ کو قتل کروں گا، اُحد کی لڑائی میں وہ صفوں کو چیر پھاڑ کر آپ کے قریب پہنچ گیا صحابہؓ کرامؓ نے اُسے روکنا چاہا مگر آپ نے فرمایا کہ آنے دو اور جب وہ بالکل پاس آگیا تو ایک مجاہد سے نیزہ لے کر اس کی گردن میں آہستہ سے اس کی نوک چبھو دی۔ وہ چیخ کر بھاگا، لوگوں نے یہ دیکھ کر اس سے کہا "یہ کوئی ایسا کاری زخم تو نہیں ہے کہ تم اتنا بدحواس ہو گئے" تو اس نے جواب دیا۔ "کاری تو نہیں ہے مگر ہے تو محمدؐ کے ہاتھ کا۔"

شجاعت کے ساتھ بقول ابو سعید خدری "آپ میں کنواری لڑکیوں سے زیادہ حیا تھی" آپ حیا کو "جزو ایمان" فرماتے تھے۔

خدمت گزاری کے لئے صحابہ کرامؓ جسم و جان سے حاضر رہتے تھے لیکن آپ اپنا کام خود کرنا پسند کرتے تھے، ادنیٰ سے ادنیٰ کام میں آپ کو عار نہ تھی۔ ایک شخص نے حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر میں کیا مشغلہ رہتا تھا تو انھوں نے بتایا کہ "آپ گھر کے کام کاج میں مشغول رہتے تھے، کپڑوں میں اپنے ہاتھ سے پیوند لگاتے تھے، جھاڑو بھی دے لیتے تھے، دودھ دوہ لیتے تھے، جوتا پھٹ جاتا تو خود درست کر لیتے تھے۔ اونٹ کو چارہ ڈال دیتے تھے اور بازار سے سودا خرید لاتے تھے"

حضرت انس بن مالکؓ ایک دن آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ آپ اپنے ہاتھ سے اونٹ کے بدن پر تیل مل رہے تھے۔

اجتماعی محنت و مشقت کے کاموں میں آپ برابر کی شرکت فرماتے تھے۔ قبا اور مدینہ کی مسجدوں کی تعمیر ہو یا جنگ میں خندق کھودنا ہو آپ ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے، ایک سفر میں صحابہؓ نے بکری ذبح کی اور اس کو پکانے کا کام آپس میں بانٹ لیا۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا "جنگل سے لکڑی میں لاؤں گا" صحابہؓ نے لاکھ عرض کیا کہ آپ آرام سے بیٹھیں، ہم سارا انتظام کر لیں گے لیکن آپ نے فرمایا "میں امتیاز پسند نہیں کرتا"

دوسروں کے کام کر دینا بھی آپ کی عادت میں داخل تھا ایک دفعہ نماز کیلئے جماعت کھڑی ہو چکی تھی کہ ایک بدو آیا اور اس نے بڑی بے باکی سے آپ کا دامن پکڑ کر کہا "میرا تھوڑا سا کام رہ گیا ہے ایسا نہ ہو کہ میں اُسے بھول جاؤں، اس لئے پہلے اُسے کر دو" آپ چپ چاپ اس کے

ساتھ ہو گئے، اور پہلے اس کی خدمت انجام دیدی پھر نماز ادا کی۔

خباب، ایک صحابی، کسی لشکر میں گئے ہوئے تھے، ان کے گھر میں کوئی دوسرا مرد نہ تھا، اور عورتوں کو دودھ دوہنا نہیں آتا تھا۔ آپ روزانہ ان کے گھر جاکر دودھ دوہ آتے تھے۔

حضرت انس ایک عرصہ تک آپ کے خادم رہے تھے، ان کا بیان ہے کہ آپ نے انہیں کبھی یہ نہیں پوچھا کہ تم نے فلاں کام کیوں کیا یا کیوں نہ کیا۔ انھی سے روایت ہے کہ ان کے لڑکپن کے زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کسی کام پر بھیجنا چاہا تو انھوں نے صاف انکار کردیا کہ میں نہ جاؤں گا اور باہر نکل کر لڑکوں کے ساتھ کھیلنے لگے، کچھ دیر بعد آنحضرت صلعم نے پیچھے سے آکر پیار کے ساتھ ان کی گردن پکڑلی اور فرمایا "انس اب وہ کام کردو"۔

زہد و قناعت کی یہ صورت تھی کہ حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ ہجرت کے بعد آنحضرت صلعم کو کبھی مسلسل تین روز تک گیہوں کی روٹی میسر نہیں ہوئی، اکثر دو دو مہینہ گھر میں چولھا نہیں جلتا تھا اور اہل بیت کھجور اور پانی پر بسر اوقات کرتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ فاقہ کی وجہ سے آپ کو بات کرنا مشکل ہو جاتا۔ صحابہؓ یہ کیفیت دیکھ کر سمجھ جاتے اور آپ کو مہمان بناکر اپنے گھر لے جاتے۔

دنیا سے بے رغبتی کا اندازہ آپ کی ان دو دعاؤں سے ہو سکتا ہے (۱) "اے اللہ ایسا کر کہ ایک دن مجھے بھوکا رکھ اور ایک دن کھانے کو دے تاکہ بھوک میں تجھ سے گڑگڑا کر مانگا کروں اور کھا کر تیرا شکر کیا کروں" (۲) "اے اللہ! اولادِ محمدؐ کو بس اتنا دے کہ بھوکی نہ رہے"۔

عہد کے اتنے پابند، بات کے اتنے سچے، قول کے اتنے پکے اور معاملت کے اتنے صاف تھے کہ دشمن بھی "صدیق" اور "امین" کہہ کر پکارتے تھے۔ آپ کا اصول تھا کہ "جسیں پاس عہد نہیں اس میں دین نہیں"۔

ایک بار مکہ کے ایک غلام ابو رافع قریش کے سفیر بن کر مدینہ آئے، وہ آپ کی سحر آگیں شخصیت سے ایسا متاثر ہوئے کہ انھوں نے فوراً اعلان کردیا کہ اب کبھی لوٹ کر کافروں میں نہ جائینگے لیکن آپ نے فرمایا کہ "میں ایک قاصد کو اپنے پاس روک کر عہد شکنی نہیں کرسکتا، تم اسوقت

لوٹ جاؤ اور اگر مکہ پہنچ کر تمہارے دل کی یہی کیفیت رہے تو پھر چلے آنا"۔

آپ کا بدترین دشمن ابوجہل بھی آپ کی صداقت کا معترف تھا۔ اس نے ایک بار آپکے سامنے اس کا یوں اقرار کیا کہ "محمدؐ! میں تم کو جھوٹا نہیں کہتا، لیکن اپنے دین کی جو باتیں تم ہم کو بتاتے ہو ان کو میں صحیح نہیں مانتا"۔

حق گوئی دراصل شجاعت ہی کی ایک شاخ ہے۔ ایک خطبہ میں آپ نے یہ نصیحت کی کہ "کسی شخص کو جب کوئی حق بات معلوم ہو تو چاہیے کہ اس کے کہنے سے کسی انسان کا خوف مانع نہ ہو" ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا کہ "کوئی شخص خود کو حقیر نہ سمجھے"۔ اس پر صحابہؓ نے دریافت کیا کہ "ہم میں کوئی شخص اپنے کو کیونکر حقیر سمجھ سکتا ہے؟" ارشاد ہوا "اس طرح کہ اسکو خدا کے بارہ میں ایک بات کہنے کی ضرورت ہو اور وہ نہ کہے۔ قیامت کے روز خدا اس سے پوچھے گا کہ تم کو میرے متعلق فلاں بات کہنے سے کس چیز نے روکا، وہ کہے گا کہ انسانوں کے خوف نے"، خدا کی طرف سے اُسے یہ جواب ملے گا کہ تم کو سب سے زیادہ میرا خوف ہونا چاہیے تھا"۔

آپ کی ایک حدیث ہے کہ "سب سے بڑا جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا ہے"۔

خوش معاملگی اور دیانت داری کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ مکہ کے کفار بھی آپ کے پاس اپنی امانتیں رکھواتے تھے۔

سائبؓ ایک تاجر تھے، وہ مسلمان ہو کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے تو لوگوں نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا تعارف کرانا چاہا۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ "میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں"۔ سائبؓ نے بتایا کہ "آپ تجارت میں میرے شریک تھے۔ میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ نے ہمیشہ معاملہ صاف رکھا"۔

ایک شخص سے آپ نے کچھ کھجوریں قرض لی تھیں۔ ادائیگی کے وقت کچھ کھجوریں اُن کو دینے کے لئے آپ کے پاس تھیں وہ اتنی اچھی نہ تھیں جتنی کہ اس کی تھیں اس لئے اُس نے لینے سے انکار کیا۔ صحابہؓ نے کہا کہ "تم رسول اللہؐ کی عطا کی ہوئی چیز سے انکار کرتے ہو؟" اس نے کہا کہ اگر رسول اللہؐ ہی معاملہ میں صفائی نہ برتیں گے تو پھر کس سے توقع کی جائے"۔ یہ سن کر آپ کے آنسو آ گئے اور فرمایا کہ "یہ سچ ہے"۔

امانت کا تعلق آپ کے نزدیک صرف مادی اشیاء سے نہیں تھا، قانونی اور اخلاقی امور بھی اس میں شامل تھے۔ آپ کی احادیث میں ہے کہ کسی کا کوئی بھید معلوم ہو تو اس کا چھپانا بھی امانت ہے یا کسی کی بابت کوئی شخص کوئی نامناسب بات کہے یا بری رائے ظاہر کرے تو اس کو اس تک پہونچا کر فتنہ و فساد کا باعث نہ بننا بھی امانت ہے، یا کوئی کسی نجی معاملہ میں مشورہ کرے تو اُسے اپنے ہی تک محدود رکھنا اور حتی المقدور بہترین مشورہ دینا بھی امانت داری میں شامل ہے۔ اسی طرح ملازم کا خیر خواہی اور مستعدی سے خدمت انجام دینا، بیوی، بچوں، اعزا، احباب اور ہمسایہ وغیرہ کے حقوق ادا کرنا یہ سب امانتیں ہیں اور ان میں کوتاہی کرنا امانت داری کے خلاف ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ حدیث بھی کس قدر جامع ہے کہ "اس ہستی کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے کسی بندہ کا اس وقت تک دین درست نہ ہوگا جب تک اس کی زبان درست نہ ہو.. ... اور جو کوئی ناجائز راستہ سے مال پائے گا اور اس میں خرچ کرے گا تو اس کو اس میں برکت نہ دی جائے گی اور اگر اس میں سے خیرات دے گا تو قبول نہ ہوگی اور جو اس میں سے بچ رہے گا وہ اس کے سفر دوزخ کا توشہ ہوگا۔ بری چیز بری چیز کا کفارہ نہیں بن سکتی ہے، البتہ اچھی چیز بری چیز کا کفارہ ہوتی ہے"۔

آپ نے یہ نصیحت بھی فرمائی کہ "میری اُمت اس وقت تک فطری صلاحیت پر قائم رہے گی جب تک وہ امانت کو غنیمت کا مال اور زکوٰۃ کو جرمانہ نہ سمجھے گی"۔ (باقی آئندہ)

(صـ۱۵ کا بقیہ)

...... وہ بزرگ جو حقیقت اخلاص کو پہونچ گیے ہیں اور تصنع و تکلف سے چھٹکارا پا چکے ہیں جو کچھ کرتے ہیں اللہ کے لیے کرتے ہیں اور جو کچھ اُن سے ظہور میں آتا ہے وہ اللہ کے لیے ہی ہوتا ہے وہ نیت کریں یا نہ کریں ــــ "نیت "امر محتمل" میں ہوا کرتی ہے "امر متعین" میں تصحیح نیت کی احتیاج نہیں ہے" ــــ چونکہ ان کا نفس فدائے مولیٰ ہو چکا ہے....... اس لیے وہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ کی طرف ہی عائد ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس مقام کے حاصل ہونے سے پہلے وہ جو کچھ کرتے تھے برائے نفس کیا کرتے تھے اور اس وقت بھی کسی نیت کی ضرورت نہ ہوتی تھی ــــ یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ اس قسم کے عارفوں کی شان میں جو گستاخی اور ایذا دہی ہوتی ہے وہ (براہ راست) اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی ہو جاتی ہے......

اسباب زوال اُمّت — اور مذہب

(از، عتیق الرحمٰن، سنبھلی)

۲

[پرویز صاحب کا دعویٰ اور دلیل (دین کی حقیقت کے بارے میں) آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اب آئیے ان کے دلائل کا جائزہ لیا جائے تاکہ دعوے کی حقیقت معلوم ہو سکے ——— ع]

جائزہ دلیل کے پہلے مقدمہ کے متعلق ہمیں کچھ کہنا نہیں ہے۔ دوسرے مقدمہ کے جزو ثانی کے متعلق البتہ اتنا کہنا ہو کہ "آخرت" کو "دنیا" سے الگ ایک دنیا، بعد از مرگ والی زندگی، ماننے والوں اور یہ سمجھنے والوں کے متعلق کہ اس زندگی میں کامیابی کا ایک الگ قانون ہے، پرویز صاحب کا یہ فرمانا کہ ان کے لیے دنیا میں بھی ذلت و رسوائی ہے اور آخرت میں بھی۔ اور اس پر دلیل یہ لانا کہ یہ "شرک" ہے، "کفر بعد الاسلام" ہے، اور "ایمان ببعض الکتاب' اور کفر ببعض" ہے۔ جس کا نتیجہ قرآن نے دونوں جہاں کی ذلت و نامرادی بتایا ہے ——— آنکھوں میں دھول جھونکنے کی ایک حد درجہ بھونڈی کوشش ہے، اور ہم نہیں سمجھتے کہ کوئی صاحب ضمیر آدمی اس کے لیے کیسے تیار ہو سکتا ہو؟

بے شک یہ تسلیم کہ قرآن نے شرک، کفر بعد الاسلام اور "ایمان ببعض الکتاب و کفر ببعض" کا نتیجہ یہی بتایا ہے مگر وہ کون سا مقام ہو جہاں قرآن نے آخرت کو دنیا سے بالکل الگ ایک دنیا، بعد از مرگ والی زندگی سمجھنے اور، اس زندگی میں کامیابی کے لیے (دنیوی زندگی کی کامیابی کے قانون سے) الگ قانون کا اعتقاد رکھنے کو شرک، کفر بعد الاسلام اور ایمان ببعض الکتاب و کفر ببعض کا مصداق ٹھہرایا ہو؟

کیا خوب مذاق ہے ——— کہ دعوٰے کیا کہ

"جو قوم دنیا کے لیے کوئی الگ خدا تجویز کرے۔ (یعنی قریبی مفاد کے لیے

اور قوانین وضع کرے) اور آخرت کے لیے اور قوانین سامنے رکھے تو یہ وہ شرک ہو جس کا نتیجہ بدحالی اور درماندگی کے سوا کچھ نہیں " (ص ۴۲)

اور ثبوت میں پیش کر دیا

"لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُومًا مَّخْذُولًا" (ص ایضاً)

دعویٰ کیا کہ

"قرآن کہتا ہو کہ جو شخص (یا قوم) حیات کائنات سے متعلقہ قانونی وحدت (UNITY OF LAW) کو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے۔ اسے کہہ دیجئے کہ اس کا حال بھی بدحال ہوگا اور مستقبل بھی تاریک " (ص ۴۴)

اور آیت پیش کر دی

"أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ. فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلٰى أَشَدِّ الْعَذَابِ "

جیسے آیت یہی کہنا چاہتی ہے! ــــ یا جیسے دنیا میں سب جاہل اور بصیرت پرویزی کے اندھے معتقد بستے ہوں کہ ادھر خود ساختہ نظریات کے ثبوت میں آیت پیش ہوئی اور ادھر آنکھیں بند کرکے "بصیرت" کی داد ملی!

پرویز صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں نہ سب جاہل بستے ہیں اور نہ آپ کی بصیرت کے فریب خوردگانِ بے بصر، یہاں ایک بڑی تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنی آنکھوں کو کھلا رکھ کر یہ دیکھیں گے کہ قرآن کی یہ آیتیں کیا کہنا چاہتی ہیں؟ اور آپ جو نظریہ قرآن کی طرف منسوب فرما رہے ہیں وہ واقعی قرآنی ہے، یا آپ من مانے طریقہ پر آیاتِ قرآنی کو ثبوت میں گھسیٹ کر ایک خود ساختہ نظریہ قرآن کے سر تھوپ رہے ہیں؟

براہ کرم یہ بتائیے کہ پہلی آیت کو جس دعوے کے ثبوت میں آپنے پیش فرمایا ہو، وہ کس طور پر مثبتِ مدعا ہے؟ ــــ اس آیت کا خود آپ ہی نے یہ ترجمہ فرمایا ہے۔

"اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود (سرچشمۂ قانون) نہ ٹھہراؤ۔ ورنہ ایسے

ہور ہو گئے کہ ہر طرف سے نفرین کے مستحق اور ہر طرف سے درماندگی میں پڑے ہوئے"۔

(صہ ۴۲)

اور غالباً اس سے بھی انکار نہ ہوگا کہ ترجمہ اور مطلب میں بہرحال کچھ تعلق ہونا چاہیئے (یہ نہیں کہ مطلب ترجمہ کی گنجائشوں سے بالکل بے نیاز ہو)۔ پھر ذرا یہ فرمایئے کہ "اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود (سرچشمہ قانون) ٹھہرانے" کا مطلب دنیا اور آخرت کے لیے الگ الگ قانون ٹھہرانا، کہاں سے نکل آیا؟ کہ اسکی ممانعت سے اس کی ممانعت نکل آئی؟ — اور یہی مصداق شرک قرار پاگیا!

مزید وضاحت مطلوب ہو تو ہمارے سوال اور اشکال کی بنیاد یوں سمجھیے — کہ اس ممانعت سے قرآن کا منشا یہی تو ہو کہ تنہا اللہ کو معبود اور سرچشمہ قانون مانو! تو کیا ایک سرچشمہ قانون سے ایک ہی قانون کا صدور ہوتا ہے؟ ایک حاکم زندگی کے سارے شعبوں میں ایک ہی قانون کی لاٹھی گھماتا ہو؟ کوئی حکومت اس طرح کی ہے؟ یا اس کے ہونے کا تصور بھی کیا جاسکتا ہو جو ایک ایسا قانون بنادے جو زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہو؟ سیاسیات کے شعبہ کو بھی وہی ایک قانون درست رکھے اور اقتصاد و معاشرت کے دائروں میں بھی وہی کارآمد ہو، ملک کا نظم و نسق بھی اسی قانون سے درست رہے۔ کھیتوں اور کارخانوں کا کام بھی اُسی قانون کے ماتحت چلے اور شہریوں کے معاشرتی معاملات پر بھی وہی قانون لاگو ہو؟ ہے کوئی ایسا خرد ماغ جو اس پر ہاں کہدے؟ —

پس اگر یہ بات نہیں ہے؟ — اور یقیناً نہیں ہے! — بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایک ہی حاکم بیک وقت مختلف قوانین نافذ کرتا ہے۔ ایک ہی سرچشمۂ قانون سے مختلف ضرورتوں کے لیے مختلف قوانین کا صدور ہوتا ہے — اور ہونا چاہیئے۔ اگر دنیا کے ہر معاملہ کے لیے ایک ہی قانون ہو تو وہ کسی سرچشمۂ قانون کا قانون نہیں بلکہ اندھے کی لاٹھی ہے! — تو پھر اللہ کے واحد سرچشمۂ قانون ہونے کا بھی یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ اس سے ایک ہی قانون کا صدور ہو، ایک سے زیادہ کا نہیں! لہٰذا یہ ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیئے کہ اللہ ہی نے متاع دنیوی کے حصول کے لیے الگ اور فلاح اخروی کے لیے الگ قانون مقرر کیا ہو! — پھر کیا وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص حصول دنیا کے لیے الگ قانون، اور فلاح آخرت کے لیے ایک الگ قانون کا قائل ہو تو اس کا مطلب یہ سمجھا جائے کہ اس نے اللہ کے سوا کسی اور کو بھی سرچشمۂ قانون ٹھہرالیا ہے — اور اس طرح اُسے مشرک

ٹھہرادیا جائے؟

علیٰ ہٰذا دوسری آیت سے جس طرح استدلال کیا گیا ہے وہ تو اس سے بھی زیادہ زبردستی کا نمونہ ہے۔ پہلی آیت کا ترجمہ تو کم از کم ٹھیک کیا تھا، زبردستی جو کچھ تھی وہ اس کا مطلب تراشنے میں تھی اس آیت میں تو سرے سے ترجمہ ہی ایجاد بندہ کا تختہ مشق بن گیا ہے۔ اس آیت کو مفید مطلب بنانے کے لیے پرویز صاحب "الکتاب" کا ترجمہ فرماتے ہیں "قانون کائنات" ـــــ کیا پرویز صاحب مہربانی کرکے بتائیں گے کہ الکتاب کا یہ ترجمہ انھوں نے عربی کے کس لغت سے لیا ہے؟ اور اگر قرآن میں یہ لفظ لغوی معنیٰ میں نہیں بلکہ کسی اصطلاحی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے تو انھیں اس معنیٰ اصطلاحی کا علم کس طرح ہوا؟ صاحب کلام کی جانب سے ان پر القاء تو ہونے سے رہا، پھر ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ آیت کے سیاق وسباق میں کوئی قرینہ اس لفظ کے یہ معنیٰ تبلا رہا ہو۔ لیکن سیاق آیت دیکھیے یا سباق کہیں دور دور تک بھی تو کسی ایسے قرینہ کا نشان نہیں ملتا۔ یہ آیت سورۂ بقرہ کے دسویں رکوع کی ہے۔ آپ وہ پورا سلسلۂ کلام پڑھ جائیے جس کا ایک ٹکڑا زیر بحث آیت ہے الکتاب کے معنیٰ میں آپ کو "قانون کائنات" کا وہم تک نہیں گزرے گا۔ اور صرف اسی مقام پر نہیں بلکہ قرآن میں کہیں بھی کتاب یا (ال کے ساتھ) الکتاب کے معنیٰ "قانون کائنات" لینے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور کوئی مدعی بصیرت قرآنی کسی بھی مقام پر اگر اس لفظ کے یہ معنیٰ ٹھہراتا ہے، تو وہ ایک ایسی مضحکہ خیز اپج کا مظاہرہ کرتا ہے جس پر ہنسی ضبط کر جانا کمال متانت ہے۔

لفظ کتاب (یا الکتاب) کے استعمال کے دیگر مقامات سے تو خیر یہاں بحث نہیں کہ تفصیل میں جایا جائے۔ البتہ زیر بحث مقام پر ذرا ایک تفصیلی نظر ڈال کر دیکھیے کہ پرویز صاحب کا ترجمہ اسی درجہ مضحکہ خیز ہے یا نہیں؟

یہ آیت جس سلسلۂ کلام میں واقع ہے وہ نویں رکوع کے اِن الفاظ سے شروع ہوتا ہے، وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَعْدُوْدَةً الخ (اور ان کا کہنا ہے کہ ہمیں نار جہنم گنتی کے چند روز سے زیادہ ہرگز نہیں چھو سکے گی) یہ بنی اسرائیل کا قول ہے۔ قرآن ان کے اس زعم باطل پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تمھارے اس دعوے کی بنیاد کیا ہے؟۔

"کیا تم نے بارگاہ خداوندی سے اس قسم کے تحفظ کا کوئی عہد و قرار لے لیا ہے کہ جس

کی خلاف ورزی کا کوئی کھٹکا نہیں؟ یا یونہی بغیر کسی علم و آگہی کے ایک بے سروپا بات اپنی طرف سے گڑھ کر اللہ کے سر تھوپ رہے ہو؟"

پھر خود ہی اس کا جواب دیتا ہے:۔

"اللہ نے ہرگز کسی نسل اور کسی قوم کو اس قسم کے خصوصی تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں دی ہے۔ بلکہ اس کے یہاں سب کے لیے ایک قانون ہے۔ اس قانون کی رو سے جو خلود فی النار کا مستحق ہوگا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم کا کندہ بنے گا اور جو خلود فی الجنۃ کا مستحق ہوگا وہ کوئی بھی ہو ہمیشہ کے لیے جنت میں جگہ پائے گا۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ جو بد اعمالی اور خطاکاری کی راہ پر چلے گا اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ (مَن كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ) اور جو ایمان و عمل صالح کی صراط مستقیم پر گامزن ہوگا اس کی منزل ابدی جنت۔ (وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ)"۔

یہاں نواں رکوع ختم ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد اُن کے (بنی اسرائیل کے) اعمال نامہ کے چند ورق سامنے لائے جاتے ہیں جو ان کی خوئے بد اعمالی و خطاکاری، اور اطاعت رب کے بجائے اطاعتِ نفس کی روشِ باطل کے شاہد ہیں۔ یہ دسواں رکوع شروع ہوا۔ اسی سلسلہ میں ان کی ایک یہ فردِ جرم سنائی جاتی ہے کہ

"ہم نے تم کو حکم دیا تھا کہ نہ آپس میں خونریزی کرو اور نہ لڑائی بھڑائی کر کے اپنے ہی میں کے آدمیوں کو گھر سے بے گھر کرو۔۔۔۔ اور تم نے اقرار کیا تھا کہ اس حکم پر کاربند ہوگے۔۔۔۔ مگر تمہارا حال یہ ہے کہ اپنی ہی قوم کے افراد کو قتل کرتے ہو اور ایک گروہ دوسرے گروہ کے خلاف اس کے دشمنوں کو ظلم و زیادتی سے مدد دیتا ہے"۔

بنی اسرائیل کے اعمال نامہ کی اس ورق گردانی سے قرآن کا مقصد یہ ہے کہ ایک طرف استحقاقِ نار اور استحقاقِ جنت کا وہ اٹل قانون دیکھو اور دوسری طرف اپنے اعمال پر نظر کرو۔ اور پھر خود فیصلہ کر لو

کہ تم مستحق جہنم ہو یا مستحق جنت؟ اور تمہارا دعوائے لَن تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً حق بجانب ہے یا پندارِ باطل؟

اس کے بعد قرآن اُن کے اعمالنامہ کا ایک ورق اور اُلٹتا ہے، جس سے ان کے طرزِ عمل کی نہایت مضحکہ خیز دورنگی سامنے آتی ہے، اور کہتا ہے:۔

وَاِنْ یَّاْتُوْکُمْ اُسٰرٰی تُفٰدُوْهُمْ. وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْکُمْ اِخْرَاجُهُمْ.	اور اگر اس گروہ کے آدمی (جس کے خلاف جنگ میں، تم نے اس کے دشمنوں کی مدد کی تھی) قیدی بنکر تمہارے پاس آتے ہیں

تو تم اُن کا فدیہ ادا کرکے انھیں رہائی دلا دیتے ہو، حالانکہ یہی وہ ہیں جن کا دشمنوں کے ہاتھ میں ڈلوا کر، بالواسطہ) اخراج بھی تم پر حرام تھا۔ (یعنی جس طرح تمھیں اپنی قوم کے افراد کے بارے میں یہ حکم تھا کہ وہ اگر کہیں قیدی بنے نظر آئیں تو فدیہ وغیرہ دے کر یا جس طرح بھی ممکن ہو انھیں چھڑا کر اپنے میں واپس لاؤ۔ اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ یہ حکم تھا کہ اپنے آدمیوں کے خلاف کوئی کارروائی ایسی مت کرو جس کے نتیجہ میں وہ بےگھر ہونے پر مجبور ہو جائیں۔ پھر یہ کیا مذاق ہے کہ اس دوسرے حکم کی دھڑلے سے خلاف ورزی کرتے ہو اور جب اس کے نتیجہ میں وہ غیروں کے ہاتھ پڑ کر گھر سے بے گھر ہوتے ہیں تو فدیہ ادا کرکے انھیں رہا کرانے لگتے ہو؟)۔

قرآن کہتا ہے کہ آخر اس دورنگی کا سبب کیا ہے؟

"اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ.	کیا دیہ ہے کہ) تم ہماری کتاب کے کچھ حصّہ کو مانتے ہو اور کچھ کو نہیں مانتے؟
فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ.	پس دبتاؤ کہ) اگر تم میں سے کوئی ایسی حرکت کرتا ہے تو ایسے لوگوں کی جزا اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ دنیوی زندگی میں ذلت و رسوائی ہو اور قیامت کے دن انھیں سخت ترین عذاب میں ڈالا جائے؟"

یہ ہے اس آیت کا سیاق و سباق! بتائیے کہ یہاں الکتاب سے مراد اُس کتاب الٰہی (توریت) کے سوا کچھ اور ہو سکتا ہے جس میں بنی اسرائیل کے لیے احکام شرعیہ مذکور تھے؟ اور اگر کوئی شخص اس موقع پر کتاب سے مراد "قانون کائنات" بتانے لگے تو اسے بجز "دیوانے کی بڑ" کے کچھ اور قرار دیا جا سکتا ہے ــــــ مگر اللہ رے "بصیرت قرآنی" کی کرشمہ سازی کہ پرویز صاحب بصد ادعائے فرزانگی، بلا ادنیٰ تکلف کتاب کا یہی ترجمہ فرماتے ہیں. فرمانے کو وہ جو جی میں آئے فرمائیں. ان کے منھ میں زبان ہے اور ہاتھ میں قلم. مگر اُسے ایک معقول بات منوانے کے لیے انھیں بتانا ہوگا کہ اس ترجمے کے بعد یہ آیت اس سلسلۂ کلام میں کس طرح فٹ ہوتی ہے جس کا یہ ایک جزو ہے؟ اور جب تک وہ اس بات میں کوئی اطمینان بخش توجیہ نہیں پیش کرتے دوسرے لوگ معذور ہیں کہ ان کے فرمودات کو "دیوانے کی بڑ" سے زیادہ وقعت نہ دیں۔

اس واضح اشکال کے بعد اگرچہ اس کا کوئی سوال نہیں باقی رہتا کہ آیت زیر بحث میں "الکتاب" سے مراد "قانون کائنات" ہو۔ لیکن اگر پرویز صاحب اپنی "بصیرت خداداد" کی فسوں کاری سے اس کے لیے کوئی جواز فراہم کر دیں۔ اور ان کے ذہن رسا پر کوئی ایسی توجیہ منکشف ہو جائے جس سے یہ آیت ("الکتاب" کے اس معنی کے ساتھ) اس سلسلۂ کلام میں فٹ ہو سکے جس کا یہ ایک جزو ہے، تب بھی یہ واضح رہے کہ اس آیت سے پرویز صاحب کا استدلال اتنا ہی مضحکہ خیز رہے گا جتنا اس سے پہلے تھا۔

اس لیے کہ ایسی صورت میں بھی "افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض" کا ترجمہ (جیسا کہ خود پرویز صاحب بھی کر رہے ہیں) یہی ہوگا کہ

> "کیا تم قانون کائنات کے ایک حصہ پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو؟" (صفحہ ۴۲)

اور پرویز صاحب ان الفاظ سے جس دعوے پر استشہاد کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ:۔

> جو شخص حیات کائنات سے متعلقہ قانونی وحدت کو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے (کہ دنیاوی زندگی کی کامیابی و ناکامی کے لیے کوئی اور قانون کارفرما سمجھتا ہو اور اخروی زندگی کے لیے کوئی اور قانون) تو اس کا حال بھی خراب اور مستقبل بھی تاریک۔
>
> (صفحہ ۴۳ صفحہ ۴۴ ملخصاً)

لیکن کوئی بتائے کہ کیا "قانونِ کائنات کے ایک حصہ پر ایمان لانا اور دوسرے سے انکار کرنا" اور "دنیا اور آخرت کے لیے کامیابی وناکامی کا الگ الگ قانون ماننا" ایک بات ہے؟ —— پرویز صاحب کو تو چھوڑیئے! کہ ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرنا ان کی تو طبیعت ثانیہ بن گئی ہے۔ اور "بصیرت خاص" کے غلبہ سے عقل عام کے سارے تقاضے انھیں فراموش ہو گیے ہیں۔ مگر جو شخص اس قسم کی بصیرت کے بجائے صرف عقل عام (common sense) سے بہرہ ور ہو، ہم نہیں سمجھتے کہ وہ کیسے ان دونوں کو ایک قرار دے سکتا ہے! کہاں ایک قانون کے بجائے دو قانون ماننا؟ اور کہاں ایک قانون کے ایک حصہ کو ماننا اور دوسرے کو نہ ماننا؟ کہاں آدھا ایمان اور آدھا کفر؟ اور کہاں ایمان ہی ایمان، بلا شرکتِ کفر؟ —— ایک ایران کی اور ایک توران کی! —— اس بُعد المشرقین کے باوجود کسی "صاحب بصیرت" کو ان دونوں باتوں کی حقیقت میں وحدت نظر آجائے تو آجائے، ہم عامی تو اس وحدت کا جلوہ پانے اور اسکو ماننے سے قاصر ہیں! قرآن خود پرویز صاحب ہی کے ترجمہ کے مطابق یہ کہہ رہا ہو کہ جو قانون کائنات کے ایک حصہ پر ایمان لائے اور دوسرے حصہ سے انکار کرے اس کی دنیا اور آخرت دونوں برباد۔ اور پرویز صاحب کو ان الفاظ میں یہ حقیقت "واشگاف" نظر آرہی ہو کہ جو دنیا اور آخرت کے لیے الگ الگ قانون مانے وہ دونوں زندگیوں میں نامراد! —— سبحان اللہ! کیا فہم قرآنی ہے اور کیا بصیرت قرآنی! اور کیا طبع روشن کی جولانی! ع —— "جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی"

شاید پرویز صاحب فرمائیں کہ یہ دونوں باتیں ایک اس طور پر ہیں کہ آخرت کے لیے دنیا سے الگ قانون ماننا جبھی ہو سکتا ہو جب کہ قانونِ کائنات کو آخرت میں کارفرما نہ مانا جائے! تو عرض یہ ہے کہ قبلہ! یہ تو قانون کے دائرہ عمل کی بات ہوئی کہ وہ دنیا ہی تک محدود ہے یا آخرت بھی اس کے حلقۂ اثر میں داخل ہے۔ اب اگر ایک شخص اس کو دنیاوی زندگی تک محدود مانتا ہے (اور مانا کہ اس کا خیال غلط ہو) تو اس سے قانون کو اس کے "واقعی" دائرہ عمل سے کم تر دائرہ میں محدود سمجھ لینا ہی تو لازم آیا، قانون کے کسی حصہ سے انکار کہاں سے لازم آگیا؟

یہ ہیں ہماری گذارشات پرویز صاحب کے استدلال کے زیر بحث مقدمہ کے بارے میں۔ بات طویل ضرور ہو گئی۔ مگر امید ہے کہ اس سے پرویز صاحب کے اس دعوے کی مضحکہ خیزی اچھی طرح ظاہر ہو گئی ہوگی کہ آخرت کی کامیابی وناکامی کے لیے دنیا سے الگ قانون ماننا، شرک اور ایمان ببعض الکتاب اور کفر ببعض ہو۔

اور اس دعوے کے باطل ہونے کے بعد ان کا وہ دعویٰ بے دلیل ہو کر رہ جاتا ہے کہ آخرت کے لیے دنیا سے الگ قانون ماننے والوں کا انجام قرآن کی رو سے دنیا اور آخرت دونوں میں رسوائی اور بربادی ہے!

اس دعوے کی دلیل کے طور پر انھوں نے ایسا ہی ایک مضحکہ خیز دعویٰ یہ اور کیا تھا کہ "کفر بعد الاسلام" ہے۔ مگر ہمیں یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ وہ "کفر بعد الاسلام" کا کیا ترجمہ کرتے اور کس طرح ان الفاظ سے دنیا اور آخرت کے لیے الگ الگ قانون ماننے کا مفہوم نکالتے ہیں۔ اس لیے ہم اسے بحث سے خارج کرتے ہیں۔ کفر بعد الاسلام کے جو معنیٰ ہم جانتے ہیں اس کے لحاظ سے تو یہ دعویٰ بجز ہذیانی کیفیت کے اور کسی حالت میں قابل تصور نہیں البتہ اگر پرویز صاحب ان الفاظ کے کوئی اور خاص معنیٰ بیان فرما دیتے تو اُن سے اعتنا رکیا جاسکتا تھا۔

بہر حال یہ بحث ختم ہوئی۔ اور معلوم ہوگیا کہ قرآن نے ذلت وعذاب کی وعید جن باتوں پر سنائی ہے ان کا کوئی تعلق "دنیا اور آخرت کے لیے کامیابی وخوشحالی کا الگ الگ قانون ماننے" سے نہیں ہے۔ حتیٰ کہ الفاظ قرآنی کے ترجمہ میں من مانی تحریف کرنے سے بھی ان باتوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں پیدا ہوتا۔

اب آگے چلیے۔

پرویز صاحب کے جس دعوے کا یہ حشر آپ کے سامنے آیا اسی کو انھوں نے پہلے دعوے (مقدمہ ۱) سے ملاکر یہ نتیجہ نکالا تھا کہ دین سے مراد کوئی ایسا ہی نظام عمل ہوسکتا ہے جو صرف آخرت کی نہیں بلکہ دنیا کی بھی کامیابی وخوشحالی کا ضامن ہو۔ اور پھر اس کے ساتھ ایک دوسرا مقدمہ یہ ملاکر کہ دنیاوی[1] زندگی کی کامیابی وخوشحالی کا قانون قطعی طور پر تسخیر فطرت ہے، یہ نتیجہ نکالا تھا کہ دین سے مراد وہ نظام ہے جو تسخیر فطرت کی جد وجہد پر مشتمل ہو۔ مگر جب یہ دعویٰ ہی سرے سے باطل ٹھہرا کہ آخرت اور دنیا کی کامیابی وخوشحالی کا قانون من وعن ایک ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں رہتی کہ دنیا کی خوشحالی کے قانون کو دین تسلیم کرلیا جائے۔

لیکن اگر پرویز صاحب کی خاطر اُن کی بے انتہا کد وکاوش کا یہ نتیجہ دلیل کی مضحکہ خیزیوں کے باوجود تسلیم بھی کرلیا جائے۔ تو مشکل یہ ہے کہ اس کے نتیجہ میں آگے ہر قدم پر جن مسلسل حماقتوں کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے ان میں ہم پرویز صاحب کا ساتھ دینے سے معذور ہیں۔

---

[1] دنیاوی کامیابی وخوشحالی کا وہی مفہوم ملحوظ رکھیے جو پرویز صاحب کی مراد ہے۔

پہلی حماقت جس کا اس راہ کے پہلے ہی قدم پر ارتکاب کرنا پڑتا ہے یہ ہے کہ آخرت کا ایک نیا مفہوم گڑھ کر پیش کیا جائے۔ چنانچہ جب دنیاوی خوشحالی و سرفرازی کے طبیعی قانون و تسخیر فطرت کی جدوجہد کو دین قرار دینے پر یہ سوال پیدا ہوا کہ آخرت کی زندگی تو طبیعیات کے دائرہ میں نہیں آتی۔ پھر طبیعیات کے کسی قانون پر عمل پیرا ہونے سے آخرت میں خوشحالی کا حصول کیونکر ممکن ہے۔ تو پرویز صاحب کو اس اشکال کے دور کرنے کے لیے یوں دادِ بصیرت دینا پڑی کہ آخرت قرآن کی ایک اصطلاح ہے۔ اور اصطلاحی طور پر قرآن اسے "بعد از مرگ والی زندگی" کے معنی میں نہیں بلکہ اسی قبل از مرگ والی (طبیعی) زندگی کے حصۂ مستقبل کے معنی میں استعمال کرتا ہے! ——— لیکن کوئی پرویز صاحب سے پوچھے کہ حضرت یہ اصطلاحی مفہوم کا علم آپ کو کیسے ہوا؟ قرآن آپ کا کلام تو ہے نہیں کہ جس لفظ کے متعلق آپ فرما دیں کہ اصطلاحی طور پر فلاں مفہوم کے لیے استعمال کیا گیا ہے بے چون وچرا مان لیا جائے۔ اور نہ صاحب کلام سے ہمکلامی کا شرف آپ کو حاصل ہے کہ اس نے آپ کو اپنی اصطلاحی مراد سے براہ راست آگاہ کر دیا ہوگا (اگرچہ خود آپ کے مسلک کی رو سے اس طرح کا علم بھی ہم لوگوں پر حجت نہیں ہو سکتا) اب اس دعوے کے قابل تسلیم ہونے کی بس ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ صاحبِ کلام کی طرف سے کوئی صراحت یا کوئی اشارہ اس اصطلاحی مفہوم کے بارے میں پیش فرمائیں! اس کے بغیر یہ ارشادِ عالی قطعاً قابل اعتناء نہیں! ——— یہ کوئی محفل شعر و سخن نہیں ہے کہ خیال آرائی میں عالم حقائق سے جتنے بھی اوپر اڑ جائیے، واہ واہ ہی واہ واہ پائیے۔ یہ بزم "معارف قرآنی" ہے۔ یہاں تو ہر ارشاد اور ہر مطلب آرائی کی سند چاہیے! یہ نقلیات کا میدان ہے۔ یہاں اپنی اٹکل کے تیر چلانے سے کام نہیں چلتا۔ آپ کی ذہانت تسلیم، مگر نقل کے میدان میں تیز سے تیز ذہن کی پیداوار کا بھی وہی وزن ہے جو ایک بلید الذہن کی بات کا! ——— تو کہنے کو تو پرویز صاحب جو چاہیں کہہ دیں مگر اس سوال کا بھی کچھ جواب انھوں نے سوچا ہے؟ جس کے بعد آخرت کا یہ مفہوم ٹھہرانا ایک کھلی ہوئی حماقت کا ارتکاب نظر آنے لگتا ہے؟

دوسری حماقت یہ کرنا پڑتی ہے کہ (آخرت بمعنی مستقبل لینے کے بعد) مستقبل کا مفہوم کہیں کچھ لیا جائے اور کہیں کچھ۔ چنانچہ جن آیات قرآنی میں دنیا اور آخرت کی کامیابی و ناکامی اور خوشحالی و بدحالی کا مضمون ہے وہاں تو پرویز صاحب آخرت سے ہر شخص یا ہر قوم کا اپنا مستقبل مراد

لیتے ہیں، مثلاً " فمن الناس من یقول ربنا اٰتنا فی الدنیا وما لہ فی الاٰخرۃ من خلاق " میں آخرۃ سے یہی مراد لے کر، خط کشیدہ الفاظ کا ترجمہ کرتے ہیں۔

" لیکن اُن کا مستقبل کی خوشحالیوں میں کوئی حصہ نہیں ہوتا " (ص ۳۶)

یا " ومنھم من یقول ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاٰخرۃ حسنۃ " کا ترجمہ کرتے ہیں۔

" اور جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ خدا کا نشو ونما دینے والا قانون ایسا کر دے کہ ان کا حال بھی مستحسن ہو جائے اور مستقبل بھی " (ص ۳۷)

علیٰ ہذا " الذین اٰمنوا وکانوا یتقون لھم البشریٰ فی الحیوۃ الدنیا وفی الاٰخرۃ " میں بھی خط کشیدہ الفاظ کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ

" ان کے لیے حال کی زندگی اور مستقبل دونوں میں خوشگواریاں ہیں " (ص ۳۹)

لیکن جن آیات میں دنیا طلبی اور آخرت طلبی کا مضمون ہے وہاں آخرت سے (ہر شخص یا ہر قوم کے اپنے مستقبل کے بجائے) پوری نوع انسانی کا مستقبل مراد لینا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ صرف اپنی خوشحالی اور اپنا عیش وآرام چاہنا، پرویز صاحب کے نزدیک دنیا طلبی کا مفہوم ہے۔ (اور ظاہر ہے کہ اس میں " اپنے مستقبل " کی خوشحالی بھی شامل ہے، بلکہ طلب درحقیقت ہوتی ہی مستقبل کے لیے ہی) پس اس کے مقابلہ میں آخرت طلبی کا مفہوم یقیناً یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص یا قوم اپنے مستقبل کی فکر کرے بلکہ اس کا مطلب ہوگا " اپنے آپ " سے بلند ہو کر پوری نسل انسانی کے مستقبل کی فکر! چنانچہ پرویز صاحب اس مضمون کی آیات کے ترجمہ میں " مستقبل " کا لفظ اسی معنیٰ میں بولتے ہیں۔ مثلاً

" ومن اراد الاٰخرۃ الخ

لیکن جو انسان (یا قوم) مستقبل کا طالب ہو " (ص ۴۰)

کوئی پوچھے کہ آخر یہ کیا " شترگربگی " ہے؟ اصطلاح نہ ہوگئی مذاق ہو گیا کہ اس کا کوئی مفہوم ہی متعین نہیں!

" مستقبل " کے ان دو مفہوموں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ ایک لحاظ سے یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک کو مطمح نظر بنانے کے لیے دوسرے کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ ایسے دو مفہوم بھی کہیں کسی ایک لفظ کا اصطلاحی مدلول بن سکتے ہیں؟ جب کہ مطلق دو مفہوم بھی کسی اصطلاح کے نہیں ہوا کرتے۔ اور کوئی ایک شخص کسی لفظ کو

اصطلاحی طور پر کسی ایک متعین مفہوم ہی میں استعمال کیا کرتا ہے۔ الا یہ کہ وہ خبط الحواس ہو ـــــ مگر پرویز صاحب کو کلام خداوندی میں (معاذ اللہ) خبط الحواسی کا رنگ پیدا کرنا گوارا ہے۔ اگر نہیں گوارا ہے تو آخرت کو بعد از مرگ والی زندگی ماننا! ـــــ بتائیے اس جسارت یا اس حماقت میں کون ان کا ساتھ دے سکتا ہے؟

آخرت کے اس خود تراشیدہ "اصطلاحی مفہوم" کو تسلیم کر لینے کے مضحکہ خیز نتائج کا قصہ یہیں پر ختم نہ سمجھئے۔ یہاں تک کی گھاٹیوں کو اگر کسی طرح عبور بھی کر لیجئے اور مان لیجئے کہ آخرت طلبی کا مطلب نوع انسانی کے مستقبل کی فکر ہے۔ تو آگے بڑھ کر اس اشکال کو دور کیجئے کہ جو انسان بھی طالب آخرت ہو گا اور اس کے لیے کما حقہ کوشش کرے گا، قرآن کہتا ہے کہ اُسے آخرت کی کامیابی نصیب ہو گی اور اس کوشش کے نتیجہ میں وہ آخرت میں خوب پھلے پھولے گا۔ آپ کہتے ہیں کہ یہاں آخرت سے مراد انسان کی اسی طبیعی زندگی کا حصہ مستقبل ہے (یعنی یہ بشارت اس کی اسی زندگی کے حصہ مستقبل کے لیے ہے) تو کیا واقعات کی دنیا میں قرآن کا یہ وعدہ ہر شخص کے ساتھ پورا ہو سکتا ہے؟ ـــــ ایک شخص تسخیر فطرت کی جد و جہد کرتا ہے۔ اسباب زیست کی تحصیل میں سرگرم عمل ہوتا ہے۔ اور اپنی سعی و کاوش کا مقصد نوع انسانی کی خوشحالی کو بناتا ہے۔ اپنا سب کچھ اس جد و جہد پر لگا دیتا ہے۔ نہایت عسرت و شقت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ اس کی کوششیں بار آور ہوں پیام اجل آجاتا ہے۔ اس کی اس جد و جہد سے دوسرے بنی نوع انسان کو تو ضرور فائدہ پہونچ جائے گا اور بعد والے اس کی کوششوں کے پھل کھائیں گے۔ مگر اس غریب کے حصہ میں کیا آیا؟ اس کی تو عمر نے وفا ہی نہ کی کہ اس کے سامنے اس کی کوششوں کا پھل آتا اور "خوشحالی کا ایک دیا دائرہ" قائم ہو جاتا جس میں "حال و مستقبل کے کنارے ملتے ہوئے آگے بڑھتے" اب آپ فرمائیں کہ قرآن کی بشارت اگر اسی طبیعی زندگی سے متعلق تھی۔ اور آخرت اسی زندگی کا ایک حصہ ہے، تو ایسے لوگوں کے حق میں یہ بشارت اور وعدہ کیا ہوا؟ کیا قرآن کا وعدہ (معاذ اللہ) جھوٹا تھا؟ اور جو لوگ اس پر اعتماد کر کے "طالب آخرت" بنے اور راہ طلب میں خود کو مٹا کر کچھ پائے بغیر راہی عدم ہو گئے، وہ کیا "خسر الدنیا والآخرۃ" کا مصداق بنے؟

ظاہر ہو کہ بشارت اخروی کو اسی قبل از مرگ والی زندگی سے متعلق ماننے کے بعد آپ کو عجیب باتیں ماننا پڑیں گی!

اب ذرا ایک نظر پیچھے پلٹ کر دیکھئے کہ کتنے چند در چند سوالات اور اشکالات ہیں جو پرویز صاحب کے

ارشاد فرمائے ہوئے "آخرت کے اصطلاحی مفہوم کے گرداگرد حلقہ بنائے ہوئے ہر چہار سوے اس کا مضحکہ اڑا رہے ہیں۔ اور اگر غور و فکر کا سلسلہ دراز کیا جائے تو ان کی تعداد میں ابھی کچھ اور اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔[ف]

ف مثلاً یہ کہ پرویز صاحب نے جہاں آخرت کا یہ " اصطلاحی " مفہوم بیان کیا ہے وہاں تمہید ہی میں یہ بھی اقرار کیا ہو کہ

"قرآن انسان کی پیدائش سے لے کر اسکی طبیعی موت تک کے عرصہ کو دنیا کی زندگی قرار دیتا ہو اور موت کے بعد پھر زندہ ہونے کو حیات اخروی سے تعبیر کرتا ہے"

لیکن آگے ایک خاص تحقیق کے انداز میں یہ "حقیقت" واضح فرما کر کہ

"قرآن بہت سے الفاظ کو بطور اصطلاحات استعمال کرتا ہے"

دنیا اور آخرت کے الفاظ کا اصطلاحی مفہوم وہ بیان فرمایا گیا ہے جس سے آپ واقف ہو چکے ہیں۔

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ قرآن بہت سے الفاظ کو بطور اصطلاحات استعمال کرتا ہے (بلکہ یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر کتاب اللہ کی تشریح و تفہیم کے لیے رسول اللہ کی احتیاج اور ارشادات رسول کی حجیت بلا کسی مزید دلیل کے ثابت ہوتی ہے) اور یہ بھی تسلیم ہے کہ دنیا اور آخرت بھی قرآن کے اصطلاحی الفاظ ہیں۔ مگر سوال یہ ہو کہ ان الفاظ کے جس مفہوم کا آپ کو بھی اقرار ہے کیا وہ ان الفاظ کا غیر اصطلاحی مفہوم ہے؟ دنیا اور آخرت کے لفظی (یا لغوی) معنیٰ خود آپ کو بھی تسلیم ہے کہ (علی الترتیب) "قریبی" اور "بعد میں آنے والے" کے ہیں۔ لغوی طور پر "قریبی" کے مفہوم میں کہیں "قبل الممات" کا مفہوم شامل نہیں ہے علیٰ ہٰذا "بعد والے" کے مفہوم میں "بعد الممات" کا مفہوم شامل ہے۔ پس اگر آپ کو یہ تسلیم ہے کہ قرآن انسان کی حیات قبل الممات کو دنیا اور حیات بعد الممات کو آخرت سے تعبیر کرتا ہو تو اسکی صورت بجز اس کے کیا ہو سکتی ہو کہ یہ تعبیر اصطلاحی ہو۔

اس کے برعکس جو مفہوم آپ اصطلاحی بتا رہے ہیں اس کو اصطلاحی قرار دینا "اصطلاح" کے مفہوم سے سراسر ناواقفی کی دلیل ہے۔ کسی لفظ کو کسی مفہوم کے لیے بطور اصطلاح استعمال کرنے کی ضرورت تو جب ہوتی ہے جب کہ وہ مفہوم لفظ کے لغوی معنیٰ سے نہ نکلتا ہو اور کسی مناسبت سے بھی مراد نہ لیا جا سکتا ہو۔ برخلاف اس کے دنیا اور آخرت سے حال اور مستقبل مراد لینے کے لیے ان الفاظ کے لغوی معنیٰ میں پوری گنجائش موجود ہو (لیکن ہم لیتے ایسے نہیں کہ ان الفاظ کو قرآن لغوی نہیں بلکہ ایک اصطلاحی مفہوم کیلئے استعمال کر رہا ہو۔ جیسا کہ آپ کو بھی تسلیم ہے۔)

پس یہ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ جو مفہوم صرف اصطلاحی طور پر ہی لیا جا سکتا ہو اُسے تو آپ گویا لغوی ٹھہرا دیں اور جس کے لیے وضع اصطلاح کی ضرورت نہیں اُسے اصطلاحی مفہوم بتائیں!

ـــــ اور آخرت کا یہ مضحکہ خیز مفہوم تراشنے کے لیے پرویز صاحب کو جس چیز نے مجبور کیا تھا یعنی یہ نظریہ کہ "آخرت کی کامیابی اور خوشحالی کا بھی وہی قانون ہے جو دنیا کی کامیابی وخوشحالی کا!" ـــــ خود اس کا بھی بودا پن آپ دیکھ چکے۔ کہ ہر دلیل ایک طرفہ تماشہ تھی، اور آیات قرآنی کی تحریف میں سارے بصیرت افروز کرتب آزمانے کے باوجود، قرآن سے اس نظریہ کو کوئی تائید نہ مل سکی تھی۔

پس جب کہ نہ اصل نظریہ کے حق میں کوئی دلیل ہے اور نہ اسکو صحیح قرار دینے سے لازم آنے والے اشکالات کا کوئی حل۔ تو دین کی وہ تعریف جو پرویز صاحب کی بصیرت فرقانی کا شاہکار تھی۔ اور جس کے اظہار کے لیے (بقول خود) ان کی بیتابئ تمنا کوندے کی طرح لپکتی تھی، خود انھیں کے دماغ کی پیداوار تو ہوسکتی ہے۔ قرآن کی پیش کردہ نہیں! ـــــ یہ ہے یہاں تک کی بحث کا کھلا ہوا فیصلہ! اور اس لیے دین کی یہ حقیقت انھیں کو مبارک۔

دلائل کے اعتبار سے نظریہ کے اس بودے پن، اور دلائل سے قطع نظر، خود اسکی (مضحکہ خیز حد تک) اندرونی کمزوریوں کا یہ فیصلہ اگرچہ کسی خارجی شہادت سے متاثر نہیں ہوسکتا۔ اور اس لیے کوئی ضرورت نہیں کہ پرویز صاحب اگر اپنی مزعومہ حقیقت دین کے حق میں کوئی خارجی شہادت پیش فرمارہے ہوں تو اس سے بھی تعرض کیا جائے۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ پرویز صاحب کو یہ حسرت بھی نہ رہ جائے۔ اور ان کے تائیدی مواد کی حقیقت بھی، لگے ہاتھوں عیاں ہوجائے۔

دین کی جو حقیقت پرویز صاحب نے منکشف فرمائی ہے، ناظرین کو یاد ہوگا کہ اسکی تائید کے طور پر یہ بھی انکشاف فرمایا گیا تھا کہ اسلام کی سب سے پہلی داعی جماعت کے یہاں بھی دین کی حقیقت یہی تھی (کہ تسخیر فطرت سے کائنات کی بکھری ہوئی قوتوں (متاع ارضی) کو اپنے قبضہ میں کیا جائے اور پھر مجموعی ماحصل متاع ارضی کو ہر شخص کی ضروریات کے لحاظ سے مساوی طور پر تقسیم کردیا جائے) ـــــ ہم پچھلی ساری بحث اور اس کے فیصلہ کن نتائج سے دستبردار ہونے اور اپنے تمام اشکالات کے باوجود دین کی اس "عظیم حقیقت" کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں! بشرطیکہ پرویز صاحب (اسلام کی سب سے پہلی داعی جماعت کے بارے میں) اپنے اس انکشاف کو تاریخی حیثیت سے مدلل کردیں۔ زیادہ نہیں، وہ اس جماعت کے ابتدائی دور کی تاریخ میں، تسخیر فطرت کی جدوجہد کی ایک ہی مثال ہمیں دکھادیں ـــــ بس ہم پکار اٹھیں گے کہ

ربنا امنا فاغفر لنا ذنوبنا وکفر عنا سیئاتنا وتوفنا مع الابرار

"ابتدائی دور" کی قید ہم اس لیے لگا رہے ہیں کہ تسخیر فطرت کی جدوجہد کو ہم کوئی گناہ نہیں سمجھتے بلکہ طاغوتی طاقتوں پر غلبہ پانے اور غلبہ برقرار رکھنے کے لیے ہر زمانہ کی ضروریات کے لحاظ سے یہ جدوجہد ضروری ہے۔ اس لیے صحابۂ کرام نے اگر اُس دور میں جب کہ وہ دنیا کی عظیم طاقتوں سے ٹکرلے رہے تھے اور انھیں مغلوب کر کے خود نظم جہاں کے ذمہ دار بن رہے تھے اُس زمانہ کی ضروریات کے پیش نظر کسی پیمانہ پر تسخیر فطرت کی جدوجہد کی ہو تو اسکی بنا پر یہ جدوجہد عین دین نہیں کہی جا سکتی۔ دین کی یہ حقیقت تو جبھی قرار پا سکتی ہے جب کہ اسلام کے داعی اول خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال یہ نظر آئے کہ ادھر اہل مکہ سے فرما رہے ہیں

"اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ۔ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ" (سورۂ یوسف)

اور اُدھر جماعت مومنین کو لیے حجاز کے پہاڑوں اور ریگزاروں کا سروے کر رہے ہیں کہ کہاں فطرت کے خزانے چھپے ہوئے ہیں؟ کہاں سیم و زر اور فولاد کی کانیں نہاں ہیں؟ اور کہاں تیل کے چشمے تہ خاک رواں ہیں؟ اور سوچ رہے ہیں کہ اس متاع ارضی کو کس طرح قبضہ میں کیا جائے! کس طرح پہاڑوں کا جگر چیرا جائے اور کس تدبیر سے زمین کا سینہ شق ہو؟

اگر آنحضرت کا حال یہ نظر آئے تو بے شک سمجھا جائے گا کہ یہی ہے وہ "دین قیم" جسے کفار مکہ نہیں جانتے تھے۔ اور زبان حال سے آپ اسی کی عملی حقیقت واضح فرما رہے تھے۔ مگر تاریخ نہیں بتاتی کہ (شب و روز تو کجا) ایک روز بھی آپ اس حال میں نظر آئے ہوں۔ آپ بنفس نفیس نہ سہی، جماعت مومنین ہی کبھی اس فکر میں سرگرداں نظر آئی ہو! اس کے باوجود اگر کسی کو اصرار ہے۔ کہ تسخیر فطرت عین دین اور حقیقت دین ہے۔ تو وہ پہلے ہمت کر کے یہ کہے کہ جماعت مومنین (اپنے ابتدائی دور میں) بشمول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (خاکم بدہن!) کم از کم عملاً بے دین رہی!

بس اب دو ہی راستے ہیں۔ کہ یا تو پرویز صاحب "جماعت مومنین" کے سالہا سال کے ابتدائی دور میں تسخیر فطرت کی جدوجہد کی کوئی مثال دکھا دیں۔ یا پھر اپنے نظریہ کی محبت میں اس پورے دور کو (جو "خیر القرون" اور "اسوۂ حسنہ" ہے) عملاً بے دینی کا دور قرار دیدیں۔

اچھا ہوا کہ پرویز صاحب نے اس بحث میں خود ہی قرن اول کی بات چھیڑ دی۔ اور اس طرح یہ سوال بھی ہمارے سامنے آگیا کہ انکے نظریہ دین کو قبول کر لینے کے نتیجہ میں اس خیر القرون کے متعلق کیا اَن کہنی کہنی پڑتی ہے؟ ——— (باقی)

علامہ مناظر احسن گیلانیؒ

اپنے مکتوبات کی روشنی میں

(از جناب مولوی اشفاق احمد صاحب قاسمی گیاوی، متعلم صف عربی)

(دارالعلوم دیوبند)

رسالہ دارالعلوم اور مجلہ برہان میں حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی کی اس اپیل سے بہت مسرت ہوئی کہ علامہ گیلانیؒ کے خطوط کتابی شکل میں شائع کیے جائیں، خدا بہت جلد وہ وقت لائے کہ یہ اپیل ایک حقیقت بن کر جلوہ گر ہو۔ خطوط اگرچہ کاتب و مکتوب الیہ تک محدود اور عموماً ذاتی امور سے متعلق ہوتے ہیں مگر اہل علم کے خطوط کی دنیا اتنی محدود نہیں ہوتی۔ ان کے خطوط میں اجمال ہی کے ساتھ بھی بہت سی عام فائدہ کی باتیں آجاتی ہیں۔ ان کے علمی ذوق اور تجربہ کا عکس بھی نمایاں ہو جاتا ہو۔ ذاتی امور میں بھی علمی نکات آجاتے ہیں۔ خاص طور سے اگر کسی طالب علم کو یہ خط لکھے گئے ہیں تو اس جیسے بہت سے تشنہ کامان علم کو ان کے مضامین سے رہنمائی مل سکتی ہے۔

خطوط کی اشاعت کی غرض حقیقت میں یہی ہوتی ہے کہ وہ تمام باتیں جواب تک کاتب و مکتوب الیہ تک محدود تھیں اُن سے دوسرے حضرات کو بھی مستفید ہونے کا موقع ملے۔

راقم الحروف کو بھی علامہ گیلانیؒ سے طالبعلمانہ مکاتبت کا شرف حاصل ہے، کچھ خطوط ایسے بھی ہیں جن میں کسی خاص علمی افادہ کا پہلو تو نہیں مگر مولانا کی زندگی کے بعض حالات و واقعات اور ان کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر ان سے روشنی پڑتی ہے اس لیے جی چاہتا ہے کہ یہ امانت عام استفادہ کے لیے پیش کر دی جائے ــــــ ذیل میں بقدر ضرورت تمہید و تعلیق کے ساتھ مولانا کے چند

خطوط ہدیۂ ناظرین ہیں۔

ایک مرتبہ میں نے علامہ مرحوم سے ان کی زندگی کے حالات دریافت کیے اور لکھا کہ کہاں آپ زیر تعلیم رہے اور حیدرآباد کس طرح پہونچے اس کی کچھ روداد ہمیں بھی سنائیے۔ اس کے جواب میں جو گرامی نامہ آیا وہ اگرچہ دوسرے خطوط سے بہت بعد کا ہے، لیکن مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسے پہلے ہی ذکر کروں کیونکہ علامہ مرحوم نے اس میں اپنی زندگی پر مختصر سی روشنی خود اپنے قلم سے ڈالی ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔

"میں آپ سے شرمندہ ہوں کہ دو دو گرامی نامے آپ کے وصول ہوئے کسی کا جواب نہ دے سکا۔ اپنی صحت کی خرابی، مشاغل کی کثرت نے توجہ کرنے کا موقع نہ دیا۔ کوئی خاص بات آپ نے پوچھی بھی نہ تھی جس کے جواب کے بغیر آپ کا نقصان ہوتا، بہرحال، آپ نے اس فقیر کے حالات دریافت کیے ہیں۔ ساٹھ سال کی عمر گذر چکی ہو۔ بہار کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا، ابتدائی تعلیم اپنے گھر میں اپنے چچا سے پائی پھر ۱۳، ۱۴ سال کی عمر میں راجپوتانہ کی ریاست اسلامی ٹونک نامی میں مولانا سید حکیم برکات احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں چھ سات سال گزرے۔ دینی علوم کے ساتھ وہاں پرانی منطق و فلسفہ کی کتابیں بھی مولانا ہی سے پڑھیں، پھر دیوبند پہونچ کر دورۂ حدیث میں شریک ہوا، شیخ الہندؒ سے ترمذی، بخاری اور مولانا کشمیری سے صحیح مسلم پڑھی۔ اس کے بعد مولانا حمید الدین فراہی سے حیدرآباد میں قرآن کے مطالعہ میں مدد حاصل کرنے کا موقع میسر آیا۔ وہیں عثمانیہ یونیورسٹی میں دینی علوم کی تعلیم کے لیے ملازم ہوگیا تقریباً ۳۰ سال کی ملازمت کے بعد وظیفہ (پنشن) پر سبکدوش ہوکر آخری منزل کے انتظار میں پھر اپنے پرانے گاؤں میں بیٹھا ہوا ہوں۔ بس یہی ہے اپنی زندگی کا خلاصہ۔ دیوبند سے دارالعلوم نامی ایک رسالہ نکلتا ہے۔ اس میں قسط وار دارالعلوم کی زندگی کے ارتسامات شائع ہو رہے ہیں۔ تیرہ قسطیں شائع ہو چکی ہیں چودھویں آئندہ ماہ میں شائع ہوگی۔ کہیں مل جائے تو پڑھ لیجیے۔"

۱۳۶۹ھ میں میں نے پہلا خط قلمی استفادہ کے سلسلہ میں لکھا۔ مضمون یہ تھا کہ اردو ادب و انشاء سے خاص دلچسپی ہے لیکن اپنی اس دلچسپی میں کسی اہل قلم کی راہ نمائی چاہتا ہوں تاکہ کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کر سکوں اور ادبی مشق بھی پوری ہو جائے۔ مولانا نے نہ صرف پیش نظر مقصد میں رہنمائی فرمائی، بلکہ ازراہ عنایت ہم جیسوں کے لیے خود ادب و انشا کا مقصد سب سے پہلے واضح فرمایا۔

ارشاد فرماتے ہیں :۔

"گرامی نامہ ملا۔ آپ کی فرمائش دلچسپ ہے کم ازکم وقت میں کافی معلومات حاصل ہوں اور ادبی مشق کی آرزو بھی پوری ہو "مشق" کا لفظ آپ نے خود استعمال فرمایا ہے۔ مشقی چیز صرف کلیات و اصول کے معلوم کرنے سے قابو میں نہیں آتی اس کے لیے تو بہر حال مشق کی ضرورت ہے۔ باقی مطالبہ اول کہ "کم ازکم وقت میں زیادہ معلومات" بظاہر اس کی بھی امکانی صورت مشکل ہے۔ اگر واقعی آپ کو ادیب بننے کا شوق ہے تو چند باتیں سن لیجیے۔ (۱) ادب خود مقصود نہیں بلکہ ذریعہ اور واسطہ ہے۔ پہلے آپ اپنی خدمت کا نصب العین متعین فرمالیں اس کے بعد ادب کو اس نصب العین کی اشاعت و توسیع کا ذریعہ بنائیے۔ آپ نے دیوبند میں تعلیم حاصل کی ہو اس لیے آپ کو تعلیم دلائی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو مردہ مسلمانوں میں زندہ کیجیے اور جو مسلمان نہیں ان کو اس پیغام کی دعوت دیجیے ان کو اپنے رسولؐ سے مانوس بنائیے۔"

اس خط میں مطالعہ کے لیے کتابوں کی ایک لمبی فہرست تحریر فرمائی ہے۔ اسی کے ساتھ شدت سے علوم جدیدہ کی تحصیل کی طرف توجہ دلائی۔

ایک دوسرے گرامی نامہ میں نہایت واضح الفاظ میں انگریزی سیکھنے کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس خطرہ پر متنبہ فرماتے ہیں جو انگریزی تعلیم کا ایک عمومی لازمہ بن گیا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔

"انگریزی، فارسی، اردو میں ترقی کیجیے۔ انگریزی سیکھ کر دین کی خدمت کے امکانات اس زمانے میں جتنے پیدا ہوتے ہیں نرے خشک مولویوں سے یہ خدمت نہیں ہوسکتی۔ لیکن عموماً دیکھا جارہا ہے۔

شد غلامے کہ آب جو آرد

آب جو آمد و غلام ببرد

انگریزی سیکھ کر واپس آنے والے کم ہی نظر آتے ہیں، مولانا عبدالماجد، مولانا عبدالباری ندوی استثنائی مثالیں ہیں۔"

ایک مرتبہ مشورۃً دریافت کیا کہ خاکسار کا ارادہ ادیب ماہر ادیب کامل وغیرہ کے امتحانات دینے کا ہو رہا ہے۔ ان امتحانات سے ہو سکتا ہے کہ کچھ ادبی شعور اور مضمون نگاری کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

اس کے جواب میں جو گرامی نامہ موصول ہوا اس میں آپ کو محسوس ہوگا کہ ذہنی رجحانات کو صحیح رُخ پر لگانے کا کیا مؤثر انداز اختیار کیا گیا ہے اور ہمت افزائی کا ایک خاص اسلوب ہو جس سے ناکارہ و ہیچمداں انسان بھی اپنی کمر ہمت چست کر کے جد و جہد کرنے لگے گا چہ جائیکہ وہ حضرات جنھیں خدا نے صلاحیتیں ودیعت کی ہیں۔

"امتحان اگر ادیب ماہر وغیرہ کا دینا چاہتے ہیں تو دیجئے۔ ایک مولوی کے لیے ان کتابوں پر قابو پانا زیادہ دشوار نہیں، لیکن صرف امتحانوں سے میرا خیال ہے چنداں فائدہ نہیں ہوتا۔ اصل چیز مطالعہ اور ممارست ہے ابھی جلدی سے کام نہ لیجیے۔ آہستہ آہستہ آپ میں ملکہ مضمون نگاری پیدا ہو جائے گا، آپ میں تو کافی صلاحیت پائی جاتی ہے، محنت تو ان لوگوں کو بھی محروم نہیں کرتی جو قدرتی صلاحیتوں سے گویا محروم ہیں۔"

میرے اس سوال کے جواب میں کہ ادبی مشق و ممارست کے طور پر اگر کچھ افسانہ نگاری کی جائے تو کیا حرج ہے؟ علامہ مرحوم نے اسی خط میں اس پر بھی بڑے مؤثر انداز میں تنبیہ فرمائی ہے اور خدا انھیں جزائے خیر دے کہ اسی کی بدولت ان خرافاتی قصے کہانیوں سے کنارہ کش رہا۔ فرماتے ہیں:۔

"افسانہ نگاری کے قصہ میں عالم ہو کر الجھنا آپ کی شان سے مستبعد ہے۔ بھلا کوئی کہے کہ مولانا تھانوی بڑے اچھے افسانہ نگار تھے، ان کی مذمت ہوگی یا تعریف؟ اس کو بھی سوچیے برساتی کیڑوں کی طرح ارزاں شہرت حاصل کرنے والے قصص خوانوں یا افسانہ نگاروں کا ایک اشرف علی تھانویؒ کے مقابلہ میں کچھ وزن بھی ہے۔ آپ وزن والی راہ پر جب چل سکتے ہیں تو بازاری شہرت والی راہ کیوں اختیار کریں، دین کی خدمت پیش نظر رکھ کر آپ جیسیوں راہ سے کام کر سکتے ہیں۔ نیت محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اور دین کی خدمت ہو۔"

ایک مرتبہ اپنی ذہنی خلش کو دور کرنے کے لیے یہ سوال لکھ بھیجا کہ جب جنت میں بہشتی حوریں ملیں گی تو ان دنیوی رفیقہ ہائے حیات کا کیا ہوگا؟ کیا یہ بھی آخروی رفیقۂ حیات بن سکتی ہیں یا نہیں؟ جواباً ارشاد فرماتے ہیں:۔

"یہ دوسری بات ہو کہ بہشتی زندگی میں خاکی زندگی کی رفیقۂ حیات بھی کسی کے لیے فراہم کر دی جائے اس میں کچھ استبعاد نہیں ہے۔ رہا الفت و محبت کا مسئلہ عموماً جسمانی حسن و جمال ہی سے

اس کا تعلق ہو۔ اس خاکی زندگی میں شباب کے ساتھ سب کچھ رخصت ہو جاتا ہے۔ بقول امیر مینائی۔

پھیرتے کیوں ہو جوانی میں حسینوں کو امیر
رات ہی بھر کا یہ جوبن ہے سحر ہونے دو

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے لکھا ہے کہ ہر ایک شخص کی فطرت میں حسن و جمال کا ایک خاص معیار ہوتا ہے۔ آدمی درحقیقت اپنی فطرت کے اس معیاری حسن کو ڈھونڈھتا رہتا ہے درحقیقت باہر کی کسی چیز پر نہیں بلکہ خود اپنی فطرت کے اسی مطلوب پر آدمی عاشق ہوتا ہے ...... بہشت میں بھی اندر والا محبوب متشکل ہو کر ہمارے سامنے آئے گا، دنیاوی محبوبات کا وہی ناسخ ہو سکتا ہو۔ خدا جانے میری بات سمجھ میں آئی یا نہیں؟"

اس آخری عمر میں علامہ مرحومؒ پر غیر معمولی طور پر فکر آخرت غالب تھی اور ہونا بھی چاہیے تھی۔ کوئی گرامی نامہ ایسا نہ ہوتا جس میں اخروی زندگی کے سنوار دسدھار، اور وہاں کام آنے والی چیزوں کو مضبوطی سے تھامے رہنے کی ہدایت نہ ہوتی، ایسے درد و اضطراب سے ہدایت فرماتے کہ دل اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ فرماتے ہیں۔

"آپ کے خط کا جواب فقیر نے اسی زمانہ میں دے دیا تھا، تعجب ہو کہ کیوں نہیں ملا اس وقت کیا جواب دیا تھا اب یاد نہیں رہا، ادھر مختلف مشغولیتوں میں الجھا رہا اس لیے جواب وقت پر نہ دے سکا، معافی کا طلبگار ہوں۔ بھائی اصل چیز صرف ایک ہے۔ یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت پر غیر متزلزل اعتماد اور بھروسہ۔ ایسا بھروسہ کہ اس بھروسہ کے برابر کسی دوسرے بھروسہ کا دل میں وزن باقی نہ رہے۔"

دوسرے گرامی ناموں میں بھی فکر آخرت اور عشق رسالت کا یہی رنگ ہے اور یہی روح اپنے تمام متعلقین میں پھونک دینا چاہتے ہیں۔ ایک دفعہ تحریر فرمایا۔ "انشا پردازی میں بھی مہارت اسی نیت سے حاصل کیجئے، الغرض نصب العین کو درست کر کے جو کچھ کیجئے گا زندگی کا ہر لمحہ قیمتی بنتا جائے گا۔ خواہ جس مشغلہ میں بھی رہیے اپنے رسول کے دین کی خدمت کا موقع ہر حال میں ہر وقت میسر آ سکتا ہے۔ یوسف علیہ السلام جیل خانے میں بھی وعظ کہا کرتے تھے اور قیدیوں میں تبلیغ کیا کرتے تھے کہ یا صاحبی السجن أأرباب متفرقون خیر أم اللہ الواحد القہار

کسی حال میں ہوں لیکن زندان مصر میں تو ہم آپ نہیں ہیں، محمدؐ کا غلام رہنا ہے۔ اپنے آقا کی بہی خواہی یہی ہے اسی کی زندگی ہوتی ہے، ورنہ زندگی سے موت بہتر ہے۔"

آج بڑائی، خود بینی، خود نمائی کا جذبہ انسان میں اسقدر بڑھ گیا ہے کہ اس کے حصول کے لیے اچھے برے ذرائع کی بھی پروا نہیں کرتا۔ اس تباہ کن خبط کے گرفتاروں کے لیے گرامی نامہ کا اگلا حصہ اپنے اندر بصیرت و عبرت کا خزانہ رکھتا ہے۔ نیز خود کاتب کا اپنا حال بھی اس کے اندر جھلکتا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔

"بھائی اس زندگی کا ہر وہ پہلو جس سے نتیجہ کی زندگی میں کچھ فائدہ پہونچے اچھا ہے ورنہ "ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا" جن کی زندگیوں کی خصوصیت قرآن میں بیان کی گئی ان کا حال تو وہی ہو جو شاعر نے کہا ہے ؎

زمیں شدیم چہ شد، آسماں شدیم چہ شد

اس چھوٹی سی عمر میں آپ ہی کی آنکھوں نے دیکھ لیا کہ "نہ ہٹلر بجا ماند نہ ہٹلری" مسولینی کی لاش تھوکی جا رہی ہے۔ اسٹالن ایڑیاں رگڑتے ہوئے ختم ہو گیا، روزولٹ دانت پیستے ہوئے خاک کا تودہ بن کر رہ گیا۔ ان اونچائیوں کے بعد بھی بلندیوں کا کوئی تصور کر سکتا ہے۔ بس دیکھنے کی بات اسقدر ہو کہ انجام میں کام آنے والی سانسوں کے حاصل کرنے میں آپ کہاں کامیاب ہو سکتے ہیں۔"

۱

انتخاب

رجعت پسند مدراس

مدراس کی دو خبریں :-

(۱) یونیورسٹی نے ہدایتیں جاری کی ہیں کہ کالجوں کی لڑکیاں لباس اس طرح کا نہ پہنیں جس سے پنڈلیاں کھلی رہیں۔

(۲) میڈیکل کالج کے پرنسپل نے حکم جاری کیا ہے کہ کالج کی لڑکیاں اپنے بالوں میں پھول نہ لگائیں کہ کالج کے سنجیدہ ماحول میں پھولوں کی خوشبو رومانی فضا پیدا کر دیتی ہے۔

خدا معلوم یہ علاقۂ مدراس کے خداوندان تعلیم پر رجعت پسندی کا حملہ کہاں سے ہو گیا ہے! اس بیسویں صدی کے وسط میں اور نعروں والی مساوات و آزادی کے دعووں کو پوری طرح تسلیم کر لینے کے بعد لڑکیوں اور پھر تعلیم یافتہ کالجی لڑکیوں پر یہ قید و بند! یقین ہے کہ لڑکیاں ہرگز ایسے "جبر و استبداد" کے آگے سر نہ جھکائیں گی بلکہ جوابی بیانات اور مجلسوں میں تقریر کر کر کے اور احتجاجی جلوس نکال نکال کے بلکہ ہڑتالیں کر کر کے اور مرن برت رکھ رکھ کر دنیا پر ثابت کر دیں گی کہ

(۱) جدید عورت کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ سر کے بال ہوں یا جسم کا کوئی سا بھی حصہ وہ اسے پھول یا تیل یا عطر کی جس خوشبو سے بھی چاہے گی بساتی رہے گی۔

(۲) جدید عورت کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی پنڈلی ہی کے نہیں بلکہ جسم کے جس حصہ کو بھی چاہے گی اس کے حُسن و زیبائش کی نمائش پوری طرح کرتی رہے گی

یہ بھی کیا کوئی اس پُرانے دُھرانے اسلام کی حکومت ہے جس نے حکم دیا تھا کہ عورت خوشبو لگا کر باہر نہ نکلے اور اپنے جسم کی تمام زینتوں کو چھپائے رکھے!

اپنا بھیس "صاحب" کا دیس

دسمبر کے آخری ہفتہ کے انگریزی روزنامے پیش نظر ہیں وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال کی ایک دو نہیں، کثرت سے تصویریں سفر امریکہ کی درج ہیں، کسی میں صدر جمہوریہ امریکہ سے ہاتھ ملا رہے ہیں، کسی میں وہاں کے کسی

اور بڑے شخص سے مصروف گفتگو ہیں، کسی میں یو۔ ان، جنرل اسمبلی کے سامنے تقریر کر رہے ہیں،
ان سارے موقعوں پر، ہر تصویر میں پنڈت جی کا لباس کیا ہے؟ امریکی لباس جو درحقیقت یورپی ہی
لباس ہے؟ جی نہیں کسی ایک موقع پر بھی نہیں، بلکہ ہر جگہ وہی اپنا ملکی اور ہندستانی لباس وہی
سفید گاندھی ٹوپی، وہی سیاہ شیروانی اور وہی سفید چوڑی دار پاجامہ! گویا بھیس اپنا ہی رہا، گو دیس
صاحب کا ملتا رہا ...... کتنی خوشی ہوتی اگر اپنی خودداری کا ویسا ہی ثبوت ہمارے مسلمان حکمران
افغانستان اور پاکستان، ایران اور ٹرکی، عراق و یرون، مصر و انڈونیشیا کے فرمانروا بھی دیتے!
بڑے مسلمان حکمرانوں میں اس وقت تک مستثنیٰ ذات ایک سلطان سعود والی حجاز سلمہ اللہ کی ہے۔
اسلام محض لباس کی بنا پر یقیناً کفر وایمان کا قائل نہیں، پھر بھی ملی خودداری ایک شے ہے۔ اور
دوسروں کا لباس اختیار کر لینا ذہنی مرعوبیت کا تو بہر حال غماز ہے۔

مرن برت کے بعد

۱۸۔ دسمبر کی خبر ہے احمد آباد (گجرات) سے :۔
"آج جب صوبہ کے وزیر اعلیٰ، شری وائی، بی چاون یہاں پہنچے
تو لال دروازہ کے میدان میں مہا گجرات والوں نے ان کا استقبال پُر شور احتجاجی نعروں کے
ساتھ پتھروں کی بوچھار سے کیا۔ سیاہ جھنڈیوں کے درمیان چاون واپس جاؤ کے نعرے لگ
رہے تھے، جب وزیر اعلیٰ ہوم گارڈز کے دفتر سے مہارا شٹر ساج کے دفتر کو پیدل جا رہے تھے،
ان کی واپسی کے وقت مجمع نے پولیس کی صف بندی توڑ دی اور سرکاری موٹر پر پتھراؤ شروع کر دیا۔
ایک خاتون وزیر مس اندومتی کو ان کے موٹر سے باہر گھسیٹ لانا چاہا۔ اور قومی جھنڈے کو وزیر اعلیٰ
کی موٹر سے نوچ کر پھینک دیا۔ پولیس کو آنسو گیس ۱۵ بار چھوڑنا پڑی"
اور یہ سب کہاں ہوا؟ یہی نہیں کہ ہندستان کے کسی حصہ میں بلکہ سردار پٹیل اور امن و آشتی
کے اوتار گاندھی جی کے خاص الخاص وطن کی سرزمین پر اور وہ بھی کب؟ مرارجی ڈیسائی سابق
وزیر اعلیٰ بمبئی کے مرن برت کے بعد! ـــــ کسی مسلمان مجمع سے اس کی آدھی بدتمیزیاں بھی اگر
سرزد ہو گئی ہوتیں، چاہے وہ "ریجبس لیڈرز" یا کسی اور ایسے ہی دینی اشتعال کے موقع پر سہی، تو
ان بدبختوں کو کہیں بھاگتے راہ بھی مل جاتی!

رشتہ تسبیح از زنار ساخت!

"کانپور ۱۲۔ دسمبر۔ مشہور اور معمر کانگریسی کارکن شری م

منظر علی سوختہ الہ آبادی جن کا کل انتقال ہوا تھا، آج سوختہ آشرم میں دفن کئے گئے۔ تدفین میں شریک ہونے والے شری لال بہادر شاستری (مستعفی وزیر ریلوے) حافظ محمد ابراہیم فنانس منسٹر یو۔پی اور شری مظفر حسین ڈپٹی منسٹر جیل خانہ یو۔پی وغیرہم تھے۔ جنازہ پر قرآنی سورتوں کی تلاوت کے علاوہ رام دھن بھی گائی جاتی رہی"۔ (یو۔پی۔آئی)

اہل بدعت نے اپنے فن میں خوب ترقیاں کیں، بدعتیں ہر دور میں انھیں نت نئی سوجھا کیں لیکن یہ آج تک اس چودہ سو برس کے عرصہ میں کسی کو کیوں سوجھی ہوگی کہ میت کو "رگھوپتی راجہ رام" کے نغمے اور ترانے بھی سنائے جائیں! —— "ترقی" کی اس منزل پر پہنچ جانے کے بعد حیرت اس پر ہے کہ پابندی تدفین کی پرانی دھرانی اسلامی رسم کیوں کی گئی اور سوختہ صاحب کے جسم خاکی کے لئے آتش سوزاں کی چتا کیوں نہ تیار ہوئی! آہ کہ

شیخ در عشق بتاں اسلام باخت
رشتۂ تسبیح در زنار ساخت

کی شاعری حقیقت بن کر رہی!

(صدق جدید)

تعارف وتبصرہ

الحرم شہید کربلا نمبر

مرتبہ قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، صفحات ۱۱۲ قیمت ایک روپیہ
ناشر: مکتبۂ علمیہ، قاضی منزل، میرٹھ

الحرم ایک ہلکا پھلکا مذہبی و ادبی ماہنامہ ہے جس کی تیسری جلد کا پہلا شمارہ "شہید کربلا نمبر" کی صورت میں سامنے ہے۔ شروع میں دو تین نظمیں شہادت سے متعلق ہیں اور اس کے بعد پورا رسالہ فاضل مرتب کے قلم سے ہے، جس میں واقعۂ شہادت کو پوری تفصیل اور اس کے تاریخی پس منظر کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، آخر میں ایک مضمون مولانا آزاد کا شامل ہے۔ واقعات کے بیان میں مصنف کا اعتماد قدیم تاریخی مآخذ پر رہا ہے۔ اور اس لحاظ سے ان کی بیان کردہ صورت واقعہ تاریخی طور پر صحیح کہی جائے گی۔ مگر اس معاملہ میں کتب تاریخ کا بیان آنکھیں بند کر کے مان لینے کے قابل نہیں ہے۔ اس کی بہت سی وجوہ ہیں (جن کے بیان کا یہ موقع نہیں) اس لیے واقعہ کی صحیح نوعیت معلوم کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ خود ان تاریخی بیانات پر ناقدانہ نظر ڈالی جائے۔

طبری کے حوالہ سے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی پیش کردہ شرائط ثلاثہ میں دوسری شرط (یا دوسری صورت مصالحت) ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

"یا مجھے یزید سے خود اپنا معاملہ طے کر لینے دو، جو کچھ بھی اس کی رائے ہو وہ بتا دے۔" ص ۶۶

ہمارے علم میں طبری کی روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

"وإما أن أضع يدي في يد يزيد بن معاوية فيرى فيما بيني وبينه رأيه۔"

ہم نہیں سمجھتے کہ ان الفاظ کا وہ ترجمہ کیسے ہو سکتا ہے "وضع الید فی الید" کا مطلب اگر بیعت نہ بھی لیا جائے تو کم از کم ان الفاظ کا مطلب "سپردگی" تو ضرور ہی ہوتا ہو۔ علیٰ ہذا "فیریٰ فیما بینی و بینہ رایہٗ" کا مطلب "اپنی رائے بتادینا" بھی ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ ان کا بامحاورہ ترجمہ اگر کیا جائے تو یہ ہوگا کہ

"پھر جیسی اس کی رائے ہو"

یعنی ایک صورت یہ ہو سکتی ہو کہ "میں خود کو یزید کے سپرد کر دوں اور پھر جو اس کا فیصلہ ہو وہ مجھے منظور۔

البدایہ والنہایہ کے الفاظ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اسکے الفاظ "فیریٰ فیما بینی و بینہ رایہٗ" کے بجائے یہ ہیں۔

"فیحکم فِیَّ ما رأی" (ج ۸ ص ۱۷۰)

اس ایک مقام کے علاوہ اصل اور ترجمہ میں اس قسم کا فرق غالباً کہیں اور نہیں ہو۔ اور اس بنا پر موجودہ تواریخ کی رو سے یہ رسالہ قابلِ اعتماد سمجھا جا سکتا ہے۔

انتخاب صحاح ستہ باترجمہ

صحاح ستہ (یعنی بخاری۔ مسلم۔ ابوداؤد۔ ترمذی نسائی، ابن ماجہ) کے بیش بہا ذخیرہ احادیث میں سے ہر ہر باب کی چند حدیثیں مع ترجمہ جمع کر کے یہ مجموعہ مدون کیا گیا ہو۔ ابواب کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے ہو۔ ترجمہ سلیس اور عام فہم ہو۔ توضیحی نوٹ بھی جگہ جگہ ہیں۔ اکثر مناسب اور ضروری، البتہ بعض نوٹ عوام میں غلط فہمی کا باعث بن سکتے ہیں۔ مثلاً کتاب الغنا میں گانے بجانے کے متعلق۔ اور کتاب اللباس میں پردہ کے متعلق۔ بعض مقامات پر توضیحی نوٹ باوجود ضرورت کے نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہو مترجم نے ضرورت نہ سمجھی ہو۔ قیمت پانچ روپیہ، صفحات ۲۵۶۔ مجلد۔ ملنے کا پتہ:۔ محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب و مالکان مطبع سعیدی، قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ۔ کراچی۔ پاکستان۔

صدق مقال

مؤلف و ناشر۔ جناب عبد المجید صاحب صدیقی۔ یونائیٹڈ موٹر انڈیا کمپنی بندر روڈ ـــــــ کراچی

عبد المجید صدیقی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دینی ذوق اور خدمت دین کے شوق سے بھی بہرہ ور

فرمایا ہے، چند سال ہوئے انھوں نے اپنے نیک جذبات کے ماتحت منکرین حدیث کے رد میں "نصرۃ القرآن" نامی کتاب لکھوا کر طبع کرائی۔ اب وہ زیارت حرمین سے مشرف ہوئے تو روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر اپنے وفور شوق سے کہی ہوئی جو نعتیں انھوں نے پڑھی تھیں وہ ۹۶ صفحات کے اس کتابچہ کی صورت میں ازدیاد شوق کے لیے بلاقیمت نذر شائقین کر دی ہیں۔ ڈاک سے منگانے والے حضرات صرف ۲ر آنہ کے ٹکٹ بھیجکر ایک نسخہ منگا سکتے ہیں۔

(۱) خیر البشر حصہ اول	قیمت ۱۲ر آنے	ضخامت ۱۰۰	صفحات
(۲) " " دوم	" ۱؍ روپیہ	" ۱۹۲	"
(۳) صراط مستقیم حصہ اول	" نامعلوم	" ۶۲	"

یہ تینوں کتابیں جناب مولوی خیر الدین صاحب وکیل (معتمد جمعیۃ العلماء حیدرآباد دکن) دبیر پورہ، حیدرآباد کی تالیف کردہ ہیں۔ خاص طور پر اُن طلبہ کے لیے لکھی گئی ہیں جو حیدرآباد دکن کے مقامی مذہبی تعلیمی ادارہ "دار العرفان" کے مقرر کردہ امتحانات میں شرکت کریں۔ لیکن فائدہ دیگر طلبا اور عوام بھی اٹھا سکتے ہیں۔

(۱) میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مختصر طور پر سوال و جواب کے انداز میں لکھی گئی ہے۔

(۲) میں واقعات سیرت آنحضرت کی تعلیمات اور مختلف شعبوں میں قائم شدہ اسلام کا نظام عمل کچھ تفصیلات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

(۳) میں مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم کی "تعلیم الاسلام" کے طرز پر ابتدائی عقائد اور ضروری احکام وغیرہ سوال و جواب کے پیرایہ میں سمجھائے گئے ہیں۔

تینوں کتابیں غالباً مؤلف ہی کے پتہ سے ملیں گی۔

اسلام کی تعلیم — از محمد عبد الحی صاحب مدیر الحسنات۔ ناشر مکتبۂ الحسنات رام پور یو۔پی۔ صفحات ۱۴۰۔ قیمت عہ؍ کتابت طباعت صاف ستھری۔

اس کتاب میں عوام کی ضرورت کے پیش نظر اسلام کے بنیادی عقائد، ارکان اسلام (عبادات) اور عبادات کے شرائط و ضروری مسائل عام فہم زبان اور دلنشین طریقہ سے بیان کیے گئے ہیں۔ مدیر

الحسنات سہل نگاری کا خاص سلیقہ اور کامیاب تجربہ رکھتے ہیں۔ یہ کتاب بھی ان کے تجربات میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

یہی کتاب مکتبۂ الحسنات نے "اسلام کی شکشا" کے نام سے ہندی میں بھی شائع کی ہے۔ صفحات ۱۲۸ ہیں اور قیمت ایک روپیہ۔

عجز و نیاز

از مولانا محمد عبد الحکیم صاحب محمدی۔ ناشر:- حاجی محمد یوسف صاحب تکیہ احمد گنج، الہ آباد۔

اس رسالہ میں نماز کی اہمیت و عظمت، اس کی مسنون ظاہری صورت اور اس میں خشوع و خضوع پیدا ہونے کا ایک خاص طریقہ بتایا گیا ہو جس کا حاصل نماز کے ارکان اور فرائض و اجبات میں تدبر اور ان کی رمز شناسی کی کوشش ہے جس سے توجہ الی اللہ اور حضور قلب پیدا ہوتا ہے۔ زبان ذرا پُر رمز اور تصوف آمیز ہے۔

کتاب کی ایک خاص تعداد نادار اصحاب کو مفت دینے کے لیے مقرر کر لی گئی ہے۔ باقی حضرات روپیہ یا آٹھ آنہ حسب حیثیت ادا کر کے لے سکتے ہیں۔

کنیز (ناول)

مصنف۔ نظر زیدی صاحب، صفحات ۳۰۸، قیمت تین روپے آٹھ آنے۔
ناشر:- ادارۂ خواتین اچھرہ۔ لاہور

یہ تقریباً ہم سبھی کو معلوم ہے کہ اسلام کے دور دورہ سے پہلے عام دنیا کی طرح عرب میں بھی عورت ذات کی زندگی حد درجہ بے قیمت تھی۔ وہ کیسی ہی شریف کیوں نہ ہو جس طریقے سے بھی کسی کے ہاتھ لگ جاتی ایک آزاد عورت سے کنیز میں تبدیل ہو جاتی۔ اور کبھی اس کی زندگی معصومیت ہی کے دور میں اپنے باپ کی جھوٹی غیرت کی بھینٹ چڑھ جاتی۔ اسلام نے انسانیت کی اس توہین کو ختم کیا اور اسلامی معاشرہ نے مظلوم عورت کو وہ مقام عطا کیا کہ صنف نازک کو اپنے تیرہ و تار مستقبل کے روشن ہونے کی وہ واحد امیدگاہ نظر آئی۔ اور جانی دشمن بھی مسلمانوں کے اس انسانیت پرور طرز فکر و عمل سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، مگر یہ تاریخی حقیقت اگر کسی کہانی کے ذریعہ ہمارے سامنے لائی جاوے تو عام انسانوں کی نفسیات کے مطابق یہ انداز زیادہ مؤثر ہوتا ہے، اس لیے کہ اس میں حقیقت "مانند دیدہ" ہو جاتی ہے۔

جناب نظر زیدی نے "اسلام اور عورت" کے موضوع پر موجودہ گمراہ کن پروپگنڈہ کا پول کھولنے کے لیے غالباً اسی نفسیاتی اصول کے پیش نظر مذکورۂ بالا حقیقت کو ایک کہانی کے ذریعہ روشناس کرانے کی کوشش کی ہے، کہانی کے کردار اگرچہ اپنے ناموں کے اعتبار سے تاریخی نہیں ہیں۔ مگر اس دور کی جو تاریخ ہمارے سامنے ہو اس کے لحاظ سے یہ خیالی داستان اپنے ماحول کی بڑی حد تک صحیح عکاسی کرتی ہے۔ اور کہیں کہیں کی غیر شعوری مصنوعیت اور غیر عادی اتفاقیت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس پر حقیقت کا گمان ہو جانا کچھ بے جا نہیں۔ کہانی میں محبت کا ضروری عنصر بھی شامل ہے مگر نہایت پاکیزگی کے ساتھ بلکہ مقصدیت کے زیر اثر، بہت دبا ہوا۔ لیکن پلاٹ خشک نہیں دلچسپ ہے۔ یہ دلچسپی کہانی کے دوسرے عناصر نے پیدا کی ہے، بہر حال ناول مجموعی حیثیت سے مفید بھی ہے اور دلچسپ بھی ——— کہیں کہیں البتہ مصنف پر مقصدیت غالب آ جاتی ہے تو دلچسپی کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ مثلاً زید اور ابو شحمہ کے لمبے لمبے سنجیدہ مکالمے جن کی سنجیدگی اور طوالت ناول کے ماحول پر بار ہوتی ہے ——— کتاب کی جلد بندی کے متعلق ناشر سے یہ عرض کرنے کی ضرورت ہو کہ وہ بے حد ناقص ہے۔ ایک بار کے مطالعہ میں ہی اوراق بکھر جاتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ
اور ان کی دینی دعوت

(تالیف مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی)

یہ کتاب دراصل مولانا مرحوم کی سوانح حیات ہے جس میں انکے ذاتی حالات اور سوانح کے علاوہ انکی مشہور دینی و اصلاحی دعوت کو بھی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے جو بلاشبہ اس دور کی نہایت وسیع اور گہری دینی و اصلاحی تحریک ہے۔ شروع میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رح کا مبسوط مقدمہ ہے جس میں کتاب و سنت کی روشنی میں انبیاء علیہم السلام کے اصول دعوت کی تشریح کر کے دکھلایا گیا ہے کہ اس دینی تحریک کو اسوۂ انبیاء سے کس درجہ مطابقت ہے۔ کتابت و طباعت اعلیٰ کاغذ نفیس قیمت (عہ)

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس رح
(مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی)

آج مولانا مرحوم اس دنیا میں نہیں ہیں، لیکن اگر کوئی انھیں جاننا اور انکی باتیں اور ہدایتیں سننا چاہے تو حضرت مرحوم کے اس مجموعۂ ملفوظات کا مطالعہ کرے جو دینی حقائق و معارف کا عجیب و غریب گنجینہ ہے۔

اس سے مولانا مرحوم کی دینی دعوت کی روح و حقیقت اسکے اصول و مقاصد اسکی گہرائیاں بھی معلوم ہوں گی اور یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ تفقہ فی الدین اور معرفت و یقین میں مولانا کا مقام کتنا بلند تھا اور امت مسلمہ کے امراض کی مولانا نے کتنی صحیح تشخیص کی تھی۔

کاغذ، کتابت طباعت اعلیٰ

قیمت

ڈیڑھ روپیہ
عہ

تصوف کیا ہے؟

اردو میں تصوف پر اچھی اچھی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن یہ کتاب اپنے اختصار کے ساتھ انصاف و تحقیق اور مباحث کے سلجھاؤ کے لحاظ سے یقیناً ممتاز ہے۔ اور ہمارا ذاتی تجربہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے اللہ کے سیکڑوں بندوں کے خیالات تصوف کے بارے میں صحیح ہوئے ہیں۔

یہ دراصل تصوف سے متعلق ۸ مقالات کا ایک مجموعہ ہے جن کے لکھنے والے مولانا محمد منظور صاحب نعمانی، مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی، مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی ہیں۔

کاغذ، طباعت، بہترین

قیمت ایک روپیہ چار آنے عہ

مولانا محمد منظور نعمانی
اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

کی ۱۳ تبلیغی تقریریں

جو ہندستان و پاکستان کے مختلف شہروں کے اہم تبلیغی اجتماعات میں کی گئی تھیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اس تبلیغی جد و جہد کا کیا مقصد و نصب العین اور اس کے کیا اصول ہیں اور مسلمانوں کے لیے اسکا پیام کیا ہے اور دنیا اور آخرت میں اس سے کن نتائج کی توقع ہے۔ اس دینی دعوت و تحریک کے بارے میں ناواقفی کی وجہ سے بعض حلقوں میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں ان سب کا جواب بھی ان تقریروں میں مل جاتا ہے ان میں سے بعض تقریروں کے خاص غیر مسلم حضرات بھی ہیں۔ ان تقریروں سے یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ... میں دین کی دعوت و تبلیغ کا انداز کیا ہونا چاہیے ... صفحات کاغذ ... [illegible]

امام ولی اللہ دہلوی
اور ان کا فلسفہ

(از حضرت مولانا عبید اللہ سندھی)

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے علوم و معارف اور ان کے فلسفہ پر نہایت گہرا علمی مقالہ ہے اور ان کی علمی خصوصیات اور ان کے فلسفہ کی بنیادوں کو سمجھنے کے لیے یہ کلیدی حیثیت رکھتا ہے اس میں پانچ باب ہیں پہلے باب میں شاہ صاحب کی تعلیم و تربیت اور حرمین کے اساتذہ و مشائخ سے استفادہ و تحصیل کا بیان ہے دوسرے اور تیسرے باب میں علوم قرآن و حدیث میں انکی مجتہدانہ اور خاص نظریات کی تشریح کی گئی ہے اور چوتھے اور پانچویں باب میں علی الترتیب فقہ اور تصوف کے بارے میں ان کے خاص مجتہدانہ نظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

لیکن صرف اہل علم اور عربی داں حضرات کے مطالعہ کے لائق ہے۔

کاغذ سفید چکنا، قیمت:۔ ایک روپیہ (عہ)

کتب خانہ الفرقان: کچہری روڈ لکھنؤ

Regd. No. (A-353)

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

یہ اسی انسانیت کی نجات کا گر ہو

امر فیصلہ ہو اور ...

محمد منظور نعمانی

لیکن یہ صرف ایک بول رہا ...

اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں

اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی

زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں، ہم اس کا

عہد کرتے ہیں اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ

تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ

"ادارہ الفرقان"

مدیر مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

الفرقان لکھنؤ

شرح چندہ

ہندستان میں سالانہ ... [illegible]

پاکستان میں سالانہ ... [illegible]

ششماہی (ہر دو سے) ... [illegible]

اعزازی خریداروں سے

سالانہ ... ۱۵ [illegible]

(غیر ممالک سے)

سالانہ ... دس شلنگ

قیمت فی کاپی آٹھ آنے اس شمارہ کی قیمت بارہ آنے

جلد ۲۴ | بابتہ ماہ رجب و شعبان ۱۳۷۶ھ مطابق مارچ ۱۹۵۷ء | نمبر ۷

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان لگا ہے! تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا پرچہ بصیغہ وی پی ارسال کیا جائے گا ــــ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۲۴ تاریخ تک پہنچ جانا چاہیے۔

پاکستان کے خریدار: اپنا چندہ سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

تاریخ اشاعت رسالہ ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۵ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔ اگلے رسالہ کے ساتھ مکرر بھیجدیا جائے گا۔ اس سے پہلے مطلوب ہو تو ۲ آنے کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں۔

مقام اشاعت: دفتر ماہنامہ "الفرقان" کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

کسی ملک کی فلاح و بہبود اور اس کی ترقی و خوش حالی کی اولین شرط یہ ہے کہ اس کا انتظام و انصرام اور اس کے اقتدار کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جن کا نصب العین سچے دل سے ملک کی خدمت ہو اور جو ملک کی خدمت کے نام سے ملے ہوئے اختیارات اور اپنے منصبی اثرات کو اپنے ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرنے سے بلند ہوں —— یہ وہ چیز ہے جس کی بدولت ایک ملک کم تر وسائل رکھتے ہوئے بھی فلاح و ترقی کے اعلیٰ درجات پر پہونچ سکتا ہے، لیکن اگر یہ نہیں ہے تو وسائل کی کثرت کے باوجود نہ وہاں فلاحی ریاست کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے اور نہ عمومی خوش حالی ایسے ملک کو نصیب ہو سکتی ہے۔

ہمارے ملک میں وسائل کی کمی نہیں، قدرتی دولت کے اعتبار سے اس کا شمار اچھے دولتمند ملکوں میں ہوتا ہے، مگر افسوس کہ وہ شرط مفقود ہے جس کی بغیر وسائل کی کیسی بھی کثرت ملک کو عمومی خوش حالی اور اجتماعی بہبود سے ہم کنار نہیں کر سکتی —— اور اس سے بھی زیادہ افسوس اس کا ہے کہ ملک کے مخلص اور معتمد لیڈر اس شرط کو پورا کرنے کی کوئی مؤثر تدبیر کرتے نظر نہیں آ رہے۔ جمہوری طرزِ حکومت کو اپنانے کی بنا پر، ہندوستان کی مرکزی پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیاں ملک کے انتظام و انصرام میں ایک اہم پارٹ ادا کرتی ہیں: ان اسمبلیوں اور پارلیمنٹ کی تشکیل عام الکشن کے ذریعہ ہوتی ہے، جو ایک مقررہ مدت کے بعد عمل میں آتا ہے۔ اس طریقہ سے درحقیقت الکشن ہی وہ آئینہ ہے جس پر ایک نظر ڈال کر یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں پہونچنے والوں کا مطمح نظر عام طور پر کیا ہے، اتفاق سے ان دنوں ملک میں جنرل الکشن کا ہنگامہ بپا ہے۔ بہت سی سیٹوں پر انتخابی لڑائی لڑی جا چکی ہے اور باقی پر لڑی جا رہی ہے، ذرا اس ہنگامہ پر ایک نظر ڈال کر دیکھئے کہ ممبری کے امیدواروں سے عام طور پر کیا توقع

کی جا سکتی ہے؟ ملک کی خدمت، اور ذاتی مفادات سے بلند رہنے کی؟ یا ملک کے اچھے برے سے بے نیاز رہ کر ذاتی مفادات حاصل کرنے کی؟

ہم نے عام طور پر الکشن میں کیا دیکھا اور کیا دیکھ رہے ہیں؟ —— یہ کہ ہر امیدوار اپنے تن، من، دھن سے اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ کامیاب ہو جائے، بے دریغ پیسہ صرف کرتا ہے اور ضرورت ہوتی ہے تو قرض لے کر کرتا ہے، گھر گھر گھوم کر ووٹ کی درخواست کرتا ہے، تمام ذاتی اور خاندانی تعلقات و اثرات استعمال کرتا ہے۔ مخالفوں کے مضبوط حلقوں پر کمندیں ڈالتا ہے۔ وعدے کرتا ہے، لالچ دیتا ہے، اہل اثر کے اثرات استعمال کراتا ہے۔ اپنے مخالف امیدوار کے خلاف کھلا اور چھپا جھوٹا پروپگنڈا کرتا ہے۔ رائے عامہ کو مغالطہ دے کر اپنے حق میں کرنے کے حسب ضرورت حربے استعمال کرتا ہے — اسکے علاوہ کہیں مخالف طاقت کو تقسیم کرنے کے لیے ایک دو تین چار فرضی مخالف امیدوار کھڑے کر دیے جاتے ہیں۔ اور کہیں اگر واقعی طور پر دو تین مخالف امیدوار کھڑے ہیں اور ان میں سے دو ایک کا بیٹھ جانا مفید ہو سکتا ہے تو سودے بازی کر کے ان میں سے بعض کو اپنے حق میں دستبردار کرا دیا جاتا ہے۔

یہ ہے جو الکشن میں عام طور پر ہوتا ہے، بڑی بڑی پارٹیاں جو محض اصول اور پروگرام کی بنیاد پر ووٹ مانگنے کا دعویٰ کرتی ہیں، اُن کے امیدوار بھی ووٹروں کو محض اپنی پارٹی کے اصول اور پروگرام سنانے اور سمجھانے پر اکتفا نہیں کرتے، اصول اور پروگرام کی باتیں صرف دو چار عام جلسوں میں کی جاتی ہیں، باقی الکشن کے اصل کام وہ ہوتے ہیں جو اوپر ذکر میں آئے۔ بے شک بعض امیدوار ذاتی طور پر ان باتوں سے بلند رہتے ہیں۔ اور مذکورۂ بالا باتوں میں سے اگر بعض ان کے حلقہ میں ہوتی ہیں تو وہ ان کے حامیوں کی ذاتی دلچسپی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ مگر ایسے لوگ گنتی کے چند نظر آتے ہیں، باقی عام طور پر الکشن کے امیدواروں کا حال یہی ہے۔

اب ذرا سوچئے کہ اگر امیدوار کا مقصد ممبرشپ کا اعزاز اور دوسرے مفادات حاصل کرنا نہیں بلکہ ملک کی خدمت کرنا ہے تو وہ یہ سب کچھ کیوں کرتا ہے؟ الکشن کے قواعد کی رو سے جتنا روپیہ الکشن کے مصارف کے لیے مقرر ہے اُس سے تجاوز کر کے وہ ایک غیر قانونی حرکت کا ارتکاب کیوں کرتا ہے؟ پھر اس جرم کو چھپانے کے لیے وہ الکشن کمشنر کو غلط حسابات دکھانے کا دوسرا اخلاقی جرم کیوں کرتا ہے؟ الکشن کے قواعد کی رو سے ووٹروں کے لیے سواری کا انتظام کرنا جرم ہے۔

مگر کون ایسا امیدوار ہے جو اس کا ارتکاب نہ کرتا ہو، آخر وہ کیوں کرتا ہے ؟ وہ لوگوں پر ذاتی تعلقات کا دباؤ کیوں ڈالتا ہے ؟ اہلِ تعلق میں سے جو لوگ اس کا ساتھ نہ دیں، اُن سے ناراضگی اس کے دل میں کیوں پیدا ہوتی ہے ؟ وہ اپنے مخالف کے خلاف جھوٹا اور غیر اخلاقی پروپگنڈا کیوں کرتا ہے ؟

کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ جس شخص کے پیش نظر کوئی اعزاز اور کوئی مفاد نہیں صرف خدمت ہو، وہ ان غیر قانونی، غیر اخلاقی اور نفسانی حرکتوں سے ملوث ہو سکتا ہے ؟ محض خدمت کے لیے ممبری کی امیدواری کا تقاضہ تو یہ ہے کہ آدمی اپنی کامیابی کے لیے اس قسم کی کسی کوشش کے پاس نہ جائے صرف اپنی امیدواری سے لوگوں کو آگاہ کر دے اور انھیں آزادی سے فیصلہ کرنے کے لیے چھوڑ دے کہ وہ اگر اہل سمجھیں تو اپنی نمائندگی کا سارٹیفکٹ اسے دیدیں، ورنہ جس کو اہل سمجھیں منتخب کر لیں! بلکہ سچ پوچھیے تو سرے سے "امیدواری" ہی مقصد "خدمت" کے منافی ہے، اگر ایک شخص اپنی خواہش سے نہیں بلکہ پارٹی کی خواہش پر الکشن میں امیدوار بنتا ہے تو یہ حقیقت میں "امیدواری" نہیں، مگر سب جانتے ہیں کہ امیدواروں میں اس قسم کے "امیدوار" صرف گنے چنے ہوتے ہیں۔ ننانوے فیصدی وہ لوگ ہوتے ہیں جو پارٹیوں سے خود ٹکٹ کی درخواست کرتے ہیں، خصوصاً برسرِ اقتدار پارٹی کے امیدواروں میں۔ اور پھر جن لوگوں کو پارٹی ٹکٹ نہیں دیتی ان کے لیے اگر بطور خود (آزاد) کھڑے ہونے کے امکانات ہوتے ہیں تو وہ عمر بھر کے مسلک کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں، کل تک جس پارٹی کے اقتدار پر ملک کی فلاح منحصر بتاتے تھے یہ یکدم اس کا اقتدار ملک کے لیے سم قاتل بتانے لگتے ہیں، کل تک جن لیڈروں کی شان میں قصیدے پڑھا کرتے تھے، دوسرے دن انھیں صلواتیں سنانے لگتے ہیں اور ان کے کھڑے کیے ہوئے امیدواروں کے مقابلے میں خم ٹھونک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے اس طرزِ عمل سے ننانوے فیصدی کی اس پوری قسم کے کیرکٹر کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے، اور جن کا یہ کیرکٹر ہو اُن کی نسبت کوئی فاترالعقل ہی یہ خیال کر سکتا ہے کہ یہ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں پہونچ کر ملک کی خدمت کریں گے۔ خدمت کی توقع تو بلند کردار اور با اصول لوگوں سے کی جا سکتی ہے۔ نہ کہ ایسے بے اُصول اور بے کردار لوگوں سے!

الغرض یہ ہیں وہ لوگ جن سے پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیاں وجود میں آتی ہیں۔ اور پھر انھیں میں سے کچھ لوگ وزارت کی کرسیاں سنبھالتے ہیں۔ کیا ایسے لوگوں سے ملک کی مخلصانہ خدمت کی توقع کرنا صحیح ہو

اور ملک کے انتظام و انصرام اور اقتدار کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں رہتے ہوئے ملک کے وسائل اور اور اس کی دولت کا صحیح استعمال ہو سکتا ہے؟

یہ سوال اُن تمام لوگوں کے غور کرنے کا ہے جو ملک کی بھلائی چاہتے ہیں۔

ماہ مُبارک

الفرقان کا یہ شمارہ انشاء اللہ شعبان کے آخری ہفتہ میں آپکے ہاتھ میں پہونچے گا اور اس کے چند ہی دن بعد سال کا سب سے زیادہ بابرکت مہینہ رمضان شروع ہو جائے گا۔ رمضان کو اسلام میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے غیر معمولی فضائل ہیں، یہ اپنے جلو میں بڑی برکتیں لاتا ہے۔ جن کے حصول کے کچھ خاص طریقے ہیں۔ یہ اپنی ابتدا سے انتہا تک ایک اہم فریضہ کی ادائیگی کا مطالبہ کرتا ہے جسکے ضروری احکام کے علاوہ کچھ آداب ہیں جو اس میں حسن پیدا کر کے اس کی قدر و قیمت بڑھاتے ہیں۔ اسی سبب سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد کے مسلمانوں کو رمضان کی آمد کے قریب ہر سال اسکے فضائل و برکات یاد دلاتے۔ ان سے بہرہ مند ہونے کی ترغیب دیتے اور اُن احکام و آداب کی تعلیم کا اعادہ فرماتے جن سے اس ماہ کے فریضہ کے کما حقہٗ ادائیگی ہو سکتی۔ اور اسی بنا پر رمضان کی آمد کے قریب اہلِ دین کی طبیعتوں کا قدرتی تقاضہ ہوتا ہے کہ وہ اس سبق کو دوہرائیں۔ اکثر ناظرین الفرقان بجا طور پر اسکے منتظر ہوتے ہیں کہ شعبان کا الفرقان ان کی طبیعتوں کے اس تقاضہ کو پورا کرنے کا ذریعہ بنے گا، اور ہم بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ مگر ایک ہی بات اور ایک ہی مواد کو ایک ہی مقصد کے لیے ہر سال ایک نئے انداز میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس سال ہم اس شمارہ میں مدیر الفرقان کی ایک تقریر شائع کر رہے ہیں جو اب سے پانچ سال پیشتر اسی موقع پر شائع ہوئی تھی۔ امید ہے کہ ناظرین الفرقان اس سے تذکر کا لطف اٹھائیں گے۔ اور انشاء اللہ اسکی دوبارہ اشاعت بہت سے بندگانِ خدا کے لیے خاص فائدے کا ذریعہ بنے گی۔

یہ شمارہ

الفرقان کا یہ شمارہ رجب اور شعبان کے دو شماروں پر مشتمل ہے، مگر صفحات دو شماروں کے

پورے نہیں ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ الفرقان کا اصل سال تو قمری سال ہے، چنانچہ اس کی جلد اسی سال کے مہینوں سے مرتب ہوتی ہے، مگر ہمارا محکمۂ ڈاک ملک کے دوسرے تمام محکموں کی طرح صرف شمسی سال (سنہ عیسوی) کو جانتا ہے اور ماہناموں کی اشاعت کے لیے شمسی مہینوں ہی کی کوئی تاریخ مقرر کرتا ہے جسکی پابندی ضروری ہے۔ اسکی پابندی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر تین سال بعد رسالہ قمری مہینوں کے اعتبار سے ایک ماہ لیٹ ہوجاتا ہے (اس لیے کہ شمسی سال کے اندر قمری سال کے مقابلہ میں ۱۱ دن زیادہ ہوتے ہیں، اور اس طرح ہر تین سال پر قمری سال شمسی سال سے ایک مہینہ آگے بڑھ جاتا ہے) چنانچہ اس سال برابر ایسا ہی ہورہا ہے۔ جس سے بعض خریداروں کو بھی الجھن ہوتی ہے۔ اب اس مسئلہ کا ایک حل تو یہ تھا کہ ایک قمری مہینے کی اشاعت سرے سے اڑا دی جائے، یعنی ہر چوتھے سال الفرقان کی جلد ۱۲ کے بجائے ۱۱ شماروں پر مشتمل ہو۔ یہ صورت بعض خریداروں کے لیے ناقابل قبول ہوتی۔ دوسرا حل یہ تھا کہ ایک ہی ماہ کی مدت میں دو ماہ کا رسالہ شائع کیا جائے۔ ہم نے اسی صورت کو اختیار کیا ہے۔ مگر دو ماہ کی پوری ضخامت (یعنی ۱۲۸ صفحات) کے رسالہ کی تیاری صرف ایک ماہ کی مدت میں ہمارے لیے ممکن نہ تھی اس لیے اس میں مجبوراً کمی کی گئی۔ امید ہے کہ خریداران الفرقان صفحات کی اس تھوڑی سی کمی کو گوارا فرمائیں گے جس کے بغیر رسالہ کی اشاعت وقت پر نہیں لائی جاسکتی تھی۔

گزارش

اس شمارہ کی اشاعت میں غالباً چند دن کی تاخیر ہوجائے گی۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ دور دراز کے بعض خریداروں کو ۵ مارچ تک نہ مل سکے اور وہ حسب قاعدہ اطلاعی خط روانہ کردیں۔ ایسے حضرات سے گزارش ہے کہ رسالہ موصول ہوجانے پر براہ کرم وصولیابی کی اطلاع دوسرے خط کے ذریعہ دفتر کو فوراً ہی دے دیں۔ ان کی اس زحمت کے ہم ممنون ہوں گے۔

آئندہ شمارہ

اس شمارہ کے بعد الفرقان کا دوسرا شمارہ اپریل میں نہیں بلکہ مئی میں شائع ہوگا، اسکی بابت ضروری اعلان صفحہ ۶۳ پر ملاحظہ فرمائیں۔

معارف الحدیث

کم بولنا اور بُری اور فضول باتوں سے زبان کی حفاظت کرنا:-

دنیا میں جھگڑے اور فسادات زیادہ تر زبان کی بے احتیاطیوں اور بیباکیوں ہی سے پیدا ہوتے ہیں اور جو بڑے بڑے گناہ آدمیوں سے بکثرت سرزد ہوتے ہیں اُن کا تعلق بھی بیشتر زبان ہی سے ہوتا ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسکی بڑی تاکید فرماتے تھے کہ زبان کو قابو میں رکھا جائے اور اس قسم کی بُری باتوں سے، بلکہ بے ضرورت اور بے فائدہ باتیں کرنے سے بھی زبان کو روکا جائے اور جب بات کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہ ہو اور بات سے کسی خیر اور نفع کی امید نہ ہو تو خاموش ہی رہا جائے

یہ تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُن اہم تعلیمات میں سے ہے جن پر آپ نے نجات کا دارومدار بتلایا ہے، اور بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز روزہ اور حج و جہاد جیسی عبادات کی نورانیت اور اُن کا حسن و قبول بھی زبان کی اس احتیاط ہی پر موقوف ہے۔ اس بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض ارشادات "کتاب الرقاق" میں بھی گزر چکے ہیں ۔۔۔ چند حدیثیں یہاں اور درج کی جاتی ہیں۔

عَنْ مُعَاذٍ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَخْبِرْنِیْ بِعَمَلٍ يُدْخِلُنِیْ الْجَنَّةَ وَ يُبَاعِدُنِیْ مِنَ النَّارِ قَالَ لَقَدْ سَأَلْتَ عَنْ اَمْرٍ عَظِيْمٍ وَاِنَّهٗ لَيَسِيْرٌ عَلٰى مَنْ يَسَّرَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ تَعْبُدُ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا وَتُقِيْمُ الصَّلٰوةَ وَتُؤْتِی الزَّكٰوةَ وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ وَ تَحُجُّ الْبَيْتَ۔ ثُمَّ قَالَ اَلَا اَدُلُّكَ عَلٰى اَبْوَابِ الْخَيْرِ؟ اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ وَالصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيْئَةَ كَمَا

يُطْفِئُ الْمَاءُ النَّارَ وَصَلٰوةُ الرَّجُلِ فِي جَوْفِ اللَّيْلِ، ثُمَّ تَلَا تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ ...... حَتّٰى بَلَغَ يَعْمَلُوْنَ، ثُمَّ قَالَ أَلَا أَدُلُّكَ بِرَأْسِ الْأَمْرِ وَعَمُوْدِهٖ وَذُرْوَةِ سَنَامِهٖ قُلْتُ بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ رَأْسُ الْأَمْرِ الْإِسْلَامُ وَعَمُوْدُهُ الصَّلٰوةُ وَذُرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ ثُمَّ قَالَ أَلَا أُخْبِرُكَ بِمِلَاكِ ذٰلِكَ كُلِّهٖ قُلْتُ بَلٰى يَا نَبِيَّ اللّٰهِ فَأَخَذَ بِلِسَانِهٖ فَقَالَ كُفَّ عَلَيْكَ هٰذَا فَقُلْتُ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ وَإِنَّا لَمُؤَاخَذُوْنَ بِمَا نَتَكَلَّمُ بِهٖ قَالَ ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ يَا مُعَاذُ وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ أَوْ عَلٰى مَنَاخِرِهِمْ إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ ——— (رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ)

(ترجمہ) حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حضرت مجھے ایسا عمل بتا دیجئے جس کی وجہ سے میں جنت میں پہونچ جاؤں اور دوزخ سے دور کر دیا جاؤں، آپ نے فرمایا تم نے بہت بڑی (اور بہت بھاری) بات پوچھی ہو لیکن بڑی اور بھاری ہونے کے باوجود وہ اس بندے کے لیے آسان ہے جس کے لیے اللہ اس کو آسان کر دے (اور توفیق دے دے) ——— لو سنو! (سب سے مقدم بات تو یہ ہے کہ دین کے ان بنیادی مطالبوں کو فکر و اہتمام سے ادا کرو) اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور اچھے طریقے سے (اور دل کی توجہ کے ساتھ) نماز ادا کیا کرو، اور زکوٰۃ دیا کرو، اور رمضان کے روزے رکھا کرو، اور بیت اللہ کا حج کرو، پھر فرمایا کیا میں تمھیں خیر کے دروازے بھی بتا دوں؟ (گویا جو کچھ آپ نے اب تک بتلایا یہ تو اسلام کے ارکان اور فرائض تھے، اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ تم چاہو تو میں تمھیں خیر کے اور دروازے بتلاؤں! غالباً اس سے آپ کی مراد نفل عبادات تھیں، چنانچہ حضرت معاذ کی طلب دیکھ کر آپ نے ان سے فرمایا) روزہ (گناہوں سے اور دوزخ کی آگ سے بچانے والی) سپر اور ڈھال ہے اور صدقہ گناہ کو (گناہ سے پیدا ہونے والی آگ کو) اس طرح بجھا دیتا ہو ہے جس طرح پانی آگ کو بجھا دیتا ہے، اور رات کے درمیانی حصہ کی نماز (یعنی نماز تہجد کا بھی یہی حال ہے اور ابواب خیر میں اُس کا خاص الخاص مقام ہے)، اس کے بعد آپ نے

(تہجد اور صدقہ کی فضیلت کے سلسلہ میں) سورۂ سجدہ کی یہ آیت پڑھی۔ "تَتَجَافٰی جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ○ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○"

——— پھر آپ نے فرمایا کیا میں تمہیں معاملہ کا (یعنی دین کا) سر اور اس کا عمود یعنی ستون اور اس کی بلند چوٹی بتا دوں؟ (معاذ کہتے ہیں) میں نے عرض کیا حضرت ضرور بتا دیں! آپ نے فرمایا دین کا سرا یا سرا اسلام ہے اور اس کا ستون نماز ہے، اور اس کی بلند چوٹی جہاد ہے ——— پھر آپ نے فرمایا کیا میں تمہیں وہ چیز بھی بتا دوں جس پر گویا ان سب کا مدار ہے (اور جس کے بغیر یہ سب چیزیں ہیچ اور بے وزن ہیں، معاذ کہتے ہیں) میں نے عرض کیا حضرت وہ چیز بھی ضرور بتلا دیجئے! پس آپ نے اپنی زبان پکڑی اور فرمایا اس کو روکو (یعنی اپنی زبان قابو میں رکھو یہ چلنے میں بے باک اور بے احتیاط نہ ہو، معاذ کہتے ہیں) میں نے عرض کیا حضرت! ہم جو باتیں کرتے ہیں کیا ان پر بھی ہم سے مواخذہ ہوگا؟ آپ نے فرمایا اے معاذ! تجھے تیری ماں روئے (عربی محاورہ کے مطابق یہاں یہ پیار کا کلمہ ہے) آدمیوں کو دوزخ میں اُن کے منھ کے بل یا فرمایا کہ اُن کی ناکوں کے بل (زیادہ تر) اُن کی زبانوں کی بیباکانہ باتیں ہی ڈلوائیں گی۔

(مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) اس حدیث میں ارکان اسلام کے بیان کے بعد آپ نے ابواب خیر کے عنوان سے روزہ، اور صدقہ کا جو ذکر فرمایا ہے، اس عاجز کے نزدیک اُس سے مراد نفلی روزہ اور نفلی صدقہ ہے اور

لہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ایمان والے بندوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ راتوں کو وہ اپنے بستروں کو چھوڑ کر خوف اور امید کی کیفیت کے ساتھ ہماری عبادت اور ہم سے دعا کرنے میں مشغول رہتے ہیں اور ہم نے جو تھوڑا بہت دنیا میں ان کو دیا ہے وہ اس میں سے ہماری راہ میں بھی خرچ کرتے ہیں (یعنی صدقہ و خیرات کرتے ہیں)، اُن کے اعمال خیر کے صلہ میں دیئے جانے کے لیے جو نعمتیں، اور آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے والا جو سامان پردۂ غیب میں رکھا گیا ہے اُس کو کوئی بھی نہیں جانتا۔ بس اللہ ہی کو اس کا علم ہے۔

اسی لیے آپ نے اس کے ساتھ نماز تہجد کا ذکر فرمایا ہے جو نفل نمازوں میں سب سے افضل ہے ـــــ پھر آپ نے اسلام کو "راس الامر" یعنی دین کا سر بتلایا ہے، بظاہر یہاں اسلام سے مراد اسلام قبول کرنا اور اس کو اپنا دین بنانا ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص سارے اچھے عمل کرے اور اس کے اخلاق و معاملات بھی اچھے ہوں لیکن وہ اسلام کو اپنا دین نہ بنائے تو اسکی مثال ایک ایسے جسم کی سی ہو جس کے ہاتھ پاؤں وغیرہ سب درست ہوں لیکن سر کٹ گیا ہو۔ پھر نماز کو آپ نے دین کا ستون بتلایا، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کوئی مکان بغیر ستون کے قائم نہیں رہ سکتا اسی طرح بغیر نماز کے دین کا قیام نہیں، پھر آپ نے جہاد کو دین کی بلند ترین چوٹی فرمایا، ظاہر ہے کہ دین کی بلندی اور رفعت جہاد ہی پر موقوف ہے

ـــــ حدیث کا سب سے آخری جز جس کی وجہ سے یہاں اس حدیث کو درج کیا گیا ہے، یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ان سب چیزوں کا دارومدار اس پر ہے کہ آدمی اپنی زبان کی حفاظت کرے، یعنی زبان کی بیباکیاں ان سب اعمال حسنہ کو بے وزن اور بے نور کر دیتی ہیں ـــــ پھر جب حضرت معاذ کو یہ سن کر تعجب ہوا اور انھوں نے دریافت کیا کہ کیا باتوں پر بھی ہماری پکڑ ہوگی؟ تو آپ نے فرمایا آدمی جہنم میں اوندھے منھ زیادہ تر زبان ہی کی بے احتیاطیوں اور بے باکیوں کی وجہ سے ڈالے جائیں گے! ـــــ آج بھی ہر دیکھنے والا بچشم خود دیکھ سکتا ہے کہ جو بڑے بڑے گناہ وبا کی طرح عام ہیں اور جن سے بچنے والے بہت ہی کم ہیں ان کا تعلق زیادہ تر زبان و دہن ہی سے ہے ؎

ہر چہ بر آدمی برسد ز زیاں ہمہ از آفت زباں برسد

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ رَفَعَہٗ قَالَ اِذَا اَصْبَحَ ابْنُ اٰدَمَ فَاِنَّ الْاَعْضَاءَ کُلَّھَا تُکَفِّرُ اللِّسَانَ فَتَقُوْلُ اِتَّقِ اللّٰہَ فِیْنَا فَاِنَّا نَحْنُ بِکَ فَاِنِ اسْتَقَمْتَ اِسْتَقَمْنَا وَاِنِ اعْوَجَجْتَ اِعْوَجَجْنَا۔ (رواہ الترمذی)

(ترجمہ) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جب آدمی صبح کرتا ہے تو اس کے سارے اعضا عاجزی اور لجاجت کے ساتھ زبان سے کہتے ہیں کہ (خدا کی بندی ہم پر رحم کر) اور ہمارے بارہ میں خدا سے ڈر، کیونکہ ہم تیرے ہی ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ تو ٹھیک رہی تو ہم بھی ٹھیک رہیں گے، اور اگر تو نے غلط روی اختیار کی تو ہم

بھی غلط روی کریں گے۔ (اور پھر اس کا خمیازہ بھگتیں گے۔)

(جامع ترمذی)

(تشریح) اوپر والی حدیث سے معلوم ہوا تھا کہ انسان کے ظاہری اعضا میں سے زیادہ تر زبان ہی کی غلط روی لوگوں کے جہنم میں ڈالے جانے کا باعث ہوگی ——— اس حدیث میں بتلایا گیا ہے کہ زبان کی اسی خاص نوعیت کی وجہ سے ہر روز انسان کے سارے اعضا زبانِ حال یا زبانِ قال پوری عاجزی اور لجاجت کے ساتھ زبان سے درخواست کرتے ہیں کہ خدا کی بندی ہماری صلاح و فلاح اور ہمارے انجام کی اچھائی برائی تجھ سے ہی وابستہ ہے اس لیے ہم پر رحم کر اور خدا سے بے خوف ہو کر بیباکانہ نہ چل ورنہ تیرے ساتھ ہم بھی اللہ کے عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

ایک دوسری مشہور حدیث میں اعضاء انسانی میں سے قلب کی یہ خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ "اِذَا صَلَحَ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ" (جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے تمام جسم اور اس کے سارے اعضاء کا صلاح و فساد اس کے قلب کے صلاح و فساد سے وابستہ ہے۔ لیکن ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد اور منافات نہیں ہے۔ اصل تو قلب ہی ہے لیکن ظاہری اعضاء میں چونکہ زبان ہی اس کی خاص ترجمان ہے اس لیے .... دونوں کی نوعیت یہی ہے کہ اگر یہ ٹھیک ہیں تو خیریت ہے اور اگر ان میں فساد اور کجی ہے تو پھر انسان کی خیریت نہیں۔

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يَّضْمَنْ لِيْ مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ اَضْمَنْ لَهُ الْجَنَّةَ۔

(رواہ البخاری)

(ترجمہ) حضرت سہل بن سعد سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ذمہ لے اپنی زبان اور اپنی شرمگاہ کا (کہ یہ دونوں غلط استعمال نہ ہوں گی) میں اس کے لیے ذمہ داری لیتا ہوں جنت کی۔

(صحیح بخاری)

(تشریح) انسانی اعضاء میں زبان کے علاوہ غلط استعمال سے جس عضو کی حفاظت کو خاص اہمیت

حاصل ہے وہ انسان کی شرمگاہ ہے اس لیے اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے بارہ میں فرمایا ہے کہ جو بندہ اس کا ذمہ لے لے کہ وہ غلط استعمال سے اپنی زبان کی بھی حفاظت کرے گا اور شہوتِ نفس کو بھی خدا کے احکام کا پابند رکھے گا میں اس کے لیے اللہ کی طرف سے جنت کا ذمہ لے سکتا ہوں۔

یہاں پھر یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قسم کے ارشادات کے مخاطب وہ اہلِ ایمان ہوتے تھے جو آپ ہی کی تعلیم و تلقین سے اس بنیادی حقیقت کو جان چکے تھے کہ اس قسم کے وعدوں کا تعلق صرف ان لوگوں سے ہے جو صاحبِ ایمان ہوں اور ایمان کے بنیادی مطالبات کو بھی ادا کرتے ہوں۔

عَنْ سُفْيَانَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ الثَّقَفِيِّ قَالَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَا اَخْوَفُ مَا تَخَافُ عَلَيَّ قَالَ فَاَخَذَ بِلِسَانِ نَفْسِهٖ وَقَالَ هٰذَا۔

(رواہ الترمذی)

(ترجمہ) حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا حضرت! میرے بارہ میں جن باتوں کا حضور کو خطرہ ہو سکتا ہے ان میں زیادہ خطرناک اور خوفناک کیا ہے؟ سفیان کہتے ہیں کہ آپ نے اپنی زبانِ مبارک پکڑ کے فرمایا کہ سب سے زیادہ خطرہ اس سے ہے۔

(جامع ترمذی)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ تم سے کسی اور برائی کا تو زیادہ خطرہ نہیں ہے، البتہ یہ خطرہ ہے کہ تمھاری زبان بے جا چلے۔ لہٰذا اس کے بارے میں ہوشیار اور محتاط رہو ـــــ ہو سکتا ہے کہ سوال کرنے والے سفیان بن عبداللہ ثقفی کی زبان میں کچھ تیزی ہو اس لیے حضور نے ان سے یہ فرمایا ہو۔ واللہ اعلم۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَمَتَ نَجَا۔

(رواہ احمد والترمذی والدارمی والبیہقی فی شعب الایمان)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو چپ رہا وہ نجات پا گیا۔

(مسند احمد، جامع ترمذی، مسند دارمی، شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے بری باتوں اور فضول باتوں سے زبان کو روکا وہ ہلاکت کے غار میں گرنے سے بچ گیا۔ ابھی حضرت معاذ کی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گزر چکا ہے کہ آدمی جہنم میں زیادہ تر زبان ہی کی بے باکیوں کی وجہ سے اوندھے منہ گرائے جائیں گے۔

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ لَقِيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ مَا النَّجَاةُ؟ فَقَالَ اَمْلِكْ عَلَيْكَ لِسَانَكَ، وَلْيَسَعْكَ بَيْتُكَ وَابْكِ عَلٰى خَطِيْئَتِكَ

(رواہ احمد والترمذی)

(ترجمہ) حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا کہ حضرت (مجھے بتا دیجئے کہ) نجات حاصل کرنے کا گُر کیا ہے (اور نجات حاصل کرنے کے لیے مجھے کیا کیا کام کرنے چاہئیں؟) آپ نے ارشاد فرمایا اپنی زبان پر قابو رکھو (وہ بیجا نہ چلے) اور چاہیے کہ تمھارے گھر میں تمھارے لیے گنجائش ہو، اور اپنے گناہوں پر اللہ کے حضور میں رویا کرو۔

(جامع ترمذی)

(تشریح) زبان پر قابو رکھنے اور اپنے گناہوں پر رونے کا مطلب تو ظاہر ہے۔ لیکن ان دو کے علاوہ تیسری نصیحت جو آپ نے یہ فرمائی کہ "تمھارے گھر میں تمھارے لیے گنجائش ہونی چاہیے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب باہر کا کوئی کام نہ ہو تو آوارہ گردوں اور بے فکروں کی طرح باہر نہ گھوما کرو، بلکہ اپنے گھر میں اور بال بچوں میں رہ کر گھر کے کام کاج دیکھا کرو اور اللہ کی عبادت کیا کرو — تجربہ شاہد ہے کہ بے ضرورت باہر گھومنا سینکڑوں برائیوں اور فتنوں کا سبب بن جاتا ہے۔

عَنْ اَنَسٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَا اَبَا ذَرٍّ اَلَا اَدُلُّكَ عَلٰى خَصْلَتَيْنِ هُمَا اَخَفُّ عَلَى الظَّهْرِ وَاَثْقَلُ فِي الْمِيْزَانِ؟ قَالَ قُلْتُ بَلٰى قَالَ طُوْلُ الصَّمْتِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ

بِيَدِهٖ مَا عَلَى الْخَلَائِقُ بِمِثْلِهِمَا۔

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

(ترجمہ) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ میں تمھیں ایسی دو خصلتیں بتادوں جو پیٹھ پر بہت ہلکی ہیں (ان کے اختیار کرنے میں آدمی پر کچھ زیادہ بوجھ نہیں پڑتا) اور اللہ کی میزان میں وہ بہت بھاری ہوں گی؟ ابوذر کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ دونوں خصلتیں ضرور تبلا دیجئے! آپ نے فرمایا، زیادہ خاموش رہنے کی عادت، اور حسنِ اخلاق۔ قسم اُس پاک ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے مخلوقات کے اعمال میں یہ دونوں چیزیں بے مثل ہیں۔

(شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے زیادہ خاموش رہنے کا مطلب یہی ہے کہ بے ضرورت اور نامناسب و ناپسندیدہ باتوں سے آدمی اپنی زبان روکے رہے، جس شخص کا یہ طرزِ عمل ہوگا، قدرتی طور پر وہ کم بولنے والا اور زیادہ خاموش رہنے والا ہوگا ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا میں سب سے زیادہ بولنے کی ضرورت تھی کہ قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کے لیے آپ کو ہدایات دینی تھیں، اور آپ اس ضرورت سے بولنے میں کوئی کمی نہ کرتے تھے، بتانے کی ہر چھوٹی بڑی بات تبلاتے تھے، لیکن اس کے باوجود آپ کے دیکھنے والے صحابہ کرام نے آپ کا حال یہ بیان فرمایا ہے کہ "كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَوِيْلَ الصَّمْتِ"[1] (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت زیادہ خاموش رہتے تھے) ایک دوسری حدیث میں ہے کہ "وَلَا يَتَكَلَّمُ إِلَّا فِيْمَا يَرْجُوْ ثَوَابَهٗ"[2] (آپ صرف وہی بات کرتے تھے جس پر آپ کو ثواب کی امید

---

[1] رواہ البغوی فی شرح السنہ عن جابر بن سمرۃ۔ مشکوٰۃ باب فی اخلاقہ و شمائلہ [2] رواہ الطبرانی فی الکبیر فی حدیث طویل عن الحسن بن علی فی صفاتہ و شمائلہ صلی اللہ علیہ وسلم (جمع الفوائد)

ہوتی تھی)

عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حِطَّانَ قَالَ اَتَيْتُ اَبَا ذَرٍّ فَوَجَدْتُهٗ فِي الْمَسْجِدِ مُحْتَبِيًا بِكِسَاءٍ اَسْوَدَ وَحْدَهٗ فَقُلْتُ يَا اَبَا ذَرٍّ مَا هٰذِهِ الْوَحْدَةُ؟ فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْوَحْدَةُ خَيْرٌ مِنْ جَلِيْسِ السُّوْءِ وَالْجَلِيْسُ الصَّالِحُ خَيْرٌ مِنَ الْوَحْدَةِ وَاِمْلَاءُ الْخَيْرِ خَيْرٌ مِنَ السُّكُوْتِ وَالسُّكُوْتُ خَيْرٌ مِنْ اِمْلَاءِ الشَّرِّ۔

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

(ترجمہ) عمران بن حطان تابعی سے روایت ہے کہ میں ایک دن حضرت ابوذر غفاری کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے ان کو مسجد میں اس حالت میں دیکھا کہ ایک کالی کملی لپیٹے ہوئے بالکل اکیلے بیٹھے ہیں۔ میں نے عرض کیا اے ابوذر یہ تنہائی اور یکسوئی کیسی ہے؟ (یعنی آپ نے اس طرح بالکل اکیلے اور سب سے الگ تھلگ رہنا کیوں اختیار فرمایا ہے!) انھوں نے جواب دیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ برے ساتھیوں کی ہم نشینی سے اکیلے رہنا اچھا ہے اور اچھے ساتھی کے ساتھ بیٹھنا تنہائی سے بہتر ہے، اور کسی کو اچھی باتیں بتانا خاموش رہنے سے بہتر ہے۔ اور بری باتیں بتانے سے بہتر خاموش رہنا ہے۔

(شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) اس حدیث میں یہ بات زیادہ صراحت و وضاحت کے ساتھ آگئی ہے کہ خاموشی کی جو افضلیت ہے وہ بری باتیں کرنے کے مقابلہ میں ہے ورنہ اچھی باتیں کرنا خاموش رہنے سے افضل ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی صراحت سے آگئی ہے کہ برے لوگوں کے ساتھ اختلاط و ہم نشینی سے بہتر تنہائی ہے، لیکن صلحا کی صحبت تنہائی سے بہتر ہے۔

(ف) یہاں ایک نکتہ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ کے بندوں کی طبیعتیں اور ان کی استعدادیں اور اُن کے رجحانات بہت مختلف ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں اتنی حکیمانہ وسعت اور ایسی جامعیت ہے کہ مختلف طبائع اور مختلف رجحانات رکھنے والے بندگان خدا اپنی اپنی طبیعت

اور اپنے اپنے ذوق و رجحان کے مطابق آپ کی اتباع کرکے اللہ کے قرب و رضا کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقامات حاصل کر سکتے ہیں۔ مثلاً بعض لوگوں کا مزاج اور ذوق ایسا ہوتا ہے کہ جس قسم کے لوگوں کو وہ پسند نہ کریں اُن سے ملنا جلنا ان کے لیے شاق اور گراں ہوتا ہے، اور وہ ایسے لوگوں سے اختلاط رکھنے میں اپنا نقصان محسوس کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تعلیم اور رہنمائی موجود ہے جس کا ذکر حضرت ابوذر غفاری نے اس حدیث میں فرمایا اور جس پر خود ان کا عمل تھا۔ ـــــ اور بعض لوگ اپنی فطرت اور طبیعت کے لحاظ سے ایسے ہوتے ہیں کہ جن لوگوں کے احوال اور چال چلن کو وہ پسند نہ کریں ان کی بھی اصلاح اور درستی کے لیے اُن سے ملنا جلنا اور اُن کے بُرے اثرات سے اپنی حفاظت کرتے ہوئے اُن کے ساتھ اختلاط رکھنا اور مختلف صورتوں سے ان کی خدمتیں کرنا ان کے لیے شاق نہیں ہوتا، بلکہ ان کو اس سے مناسبت ہوتی ہے، اُن کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری حدیثوں میں (جو اپنے موقع پر آئیں گی) اسی طرز عمل کی رہنمائی فرمائی ہے۔ اور اکثر صحابۂ کرام جو حضرت ابوذر کی طرح تنہائی پسند نہیں تھے اُن کا طرز عمل وہی تھا ـــــ پس صحابۂ کرام کی سیرت کے بعض پہلوؤں میں، اور اسی طرح زمانۂ مابعد کے اہلِ ایمان اور اہلِ صلاح کے مختلف طبقوں کے طرز عمل میں جو اس طرح کی رنگا رنگی کہیں کہیں نظر آتی ہے اس کی حقیقت بس اتنی ہی ہے کہ اللہ کی بنائی ہوئی طبیعتوں اور مزاجی مناسبتوں کے قدرتی فرق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کی جامعیت اور کاملیت کا وہ قدرتی نتیجہ ہے۔

جو لوگ اپنی تنگ نظری سے سب کو ایک ہی حال اور بالکل ایک ہی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں درحقیقت انھوں نے دین کی وسعت، تعلیم نبوی کی جامعیت و کاملیت اور اللہ تعالیٰ کی تکوینی و تشریعی حکمت پر غور نہیں کیا ہے۔

ارشادات خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ

مکتوبات کے پیرایے میں

(۱۵)

(مترجمہ ——— مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

مکتوب (۱۹۲) محمد حبیب اللہ جامع مکاتیب کے نام (آخری حصہ)

.... بعض افراد امت کو بطریق تبعیت جو "حصول کمالات نبوت" ہو جاتا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ نبی ہو جائے یا نبی سے مساوات پیدا کرلے۔ اس لیے کہ کمالات نبوت کا حصول امر دیگر ہے، اور منصب نبوت کا حاصل ہونا دوسری چیز ہے، اس مضمون کی تحقیق حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ والسلام علی من اتبع الھدیٰ۔

مکتوب (۱۹۳) مولانا محمد افضل کے نام (ابتدائی حصہ)

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ۔ ہمارے حضرت مجدد الف ثانیؒ کو مرض وفات سے بیشتر بخار اور کھانسی کی شکایت ہو گئی تھی۔ چند روز کے بعد اس مرض سے صحت ہو گئی تھی۔ چنانچہ اصلی حالت پر آگئے تھے۔ اور بے تکلف مسجد میں حاضر ہوتے تھے۔ کم و بیش ایک ماہ کے بعد ایک ایسا بخار عارض ہوا کہ آپ ؒ اس دنیا سے "دارالسرور" کی طرف رحلت فرما گئے ....

مکتوب (۱۹۷) ملا سجاول کے نام (آخری حصہ)

.... تم نے لکھا تھا کہ اس جگہ کے لوگ بعد نماز پنجگانہ ہاتھ اٹھا کر "فاتحہ" پڑھتے ہیں اور اس عمل کو اپنے اوپر لازم کرلیا ہے، اس کے ترک کرنے والے پر اعتراض کرتے ہیں۔ مخدوما! اس

قسم کا فاتحہ پڑھنا ہمارے بزرگوں کا عمل نہیں ہے اور اعمال پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی یہ چیز نظر سے نہیں گزری۔ خزانۃ الروایات میں خلاصہ سے نقل کیا ہے کہ ـــــ قرأۃ الفاتحۃ لاجل المهمات بعد الفرائض بدعۃٌ (مہمات کے لیے بعد فرائض فاتحہ پڑھنا بدعت ہے)، ـــــ اور تم نے بعد نماز جمعہ مصافحہ کرنے کے متعلق بھی دریافت کیا ہے، جو وہاں مروج ہے ـــــ مخدوما! ـــــ مصافحہ فی نفسہا تو مسنون اور "عمل بزرگ" ہے اور یہ وقت کا تعین بدعت ہے۔ یہ مصافحہ وجہ حسن بھی رکھتا ہو اور وجہ قبح بھی ـــــ زیادہ سے زیادہ اباحت تک ہی معاملہ پہونچ جائے جیسا کہ بعض نے کہا ہے تو بھی غنیمت ہے.........

مکتوب (۲۰۰) صوفی نور بیگ کے نام ـــــ

.... ذکر کرنے میں کوئی غرض "قبول خلق" "یا" حصول احوال ومواجید" میں سے نہ ہونی چاہیے۔ بے غرضانہ ذکر کریں۔ اور "وقت نشاط" میں چند لوگوں کو "تلقین ذکر" کریں۔ بطریق سفارت نہ کہ بطریق اصالت وخلافت ـــــ اور جن شرائط کو تم نے لکھا ہے وہ تو اس صورت میں ہیں جب کہ بطور خود تلقین کرو لیکن اگر بطور سفارت ذکر کرائیں تو یہ شرائط درکار نہیں ہیں، تم تو محض ایک ترجمان کی حیثیت رکھتے ہو ـــــ اور یہ تلقین ذکر تم پر جبر نہیں ہے تم کو اختیار ہے اگر بے تکلف انشراح صدر ہو تو یہ کام انجام دو ورنہ کوئی ضرورت نہیں ـــــ تمھارے لیے جو ضروری ہے وہ "دوام ذکر و مراقبہ" ہے۔ دوسرے کی تکمیل تو اپنے کمال کی فرع ہے ـــــ یہ جو چند اشخاص کو ذکر کرانے کی تم کو اجازت دے دی تھی اس لیے تھی کہ اچھا ہے چند آدمی جمع ہو کر مشغول ہوں تاکہ ایک کا فیض دوسرے پر منعکس ہو۔ ـــــ تم نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کسی سالک کو خواب میں پیر و مرشد اجازت تلقین دیدے اور "بزرگان گذشتہ" کی ارواح سے بھی اجازت ظاہر ہو تو یہ اجازت تلقین ہے یا نہیں؟ ـــــ مخدوما! اجازت تعلیم طریقت اہم معاملہ ہے، خواب سے کام نہیں چلتا ہے تاوقتیکہ بیداری میں اجازت نہ ملے۔ اجازت صورت پذیر نہیں ـــــ اسی طرح احوال، مواجید، قطبیت، فردیت اور غوثیت کا معاملہ ہے کہ اگر یہ چیزیں خواب میں ظاہر ہوں تو اکابر کے نزدیک معتبر نہیں، البتہ بیداری میں جو احوال و مواجید رونما ہوں وہ معتبر ہیں۔ قطب و غوث وہ ہے جو خارج و بیداری میں ان دونوں منصبوں سے سرفراز ہو۔ اگر کوئی خواب میں اپنے آپ کو بادشاہ دیکھے تو بادشاہ نہیں بن جائے گا تاوقتیکہ خارج میں بادشاہ نہ ہو۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

ہاں یہ ضرور ہے کہ "وقائع و منامات صالحہ"، مبشرات اور مخبر استعداد ہیں۔۔۔ کبھی حقیقت استعداد" ظہور میں آجاتی ہے اور کبھی ظہور میں نہیں بھی آتی۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مکتوب (۲۰۲) حافظ محمد شریف کے نام۔۔۔

حافظ جی کو اس دور افتادہ کا سلام عافیت انجام۔۔۔

دعائے خیر سے مجھ کو بھول نہ جائیں۔۔۔ اس عمر چند روزہ کو اہم امور میں صرف کریں "احیائے لیالی" اور "گریہ سحری" کو مغتنمات میں سے سمجھیں۔ شبہائے تار کو "انوار اذکار" سے روشن کر دیں۔ تجارت میں "صدق و امانت" کو ملحوظ رکھیں ان اللہ یحب التاجر الصدوق (سچے تاجر کو اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے) یہ حدیث تم نے سنی ہوگی۔۔۔ "عقود فاسدہ و ربویہ" سے بچتے رہیں۔ اس بارے میں خاص اہتمام رکھیں یہ مقام، محل لغزش علماء ہے چہ جائیکہ غیر علماء۔۔۔۔۔۔۔ علماء متدین سے ایسے عقود و معاملات کی جانچ پڑتال کرتے اور اس مبحث کی تحقیق کرتے رہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ سے "ورطۂ مہلکہ" سے نجات کے طالب رہیں۔۔۔ والسلام علی من اتبع الھدیٰ۔۔۔

مکتوب (۲۰۴) اسد اللہ بیگ کے نام۔۔۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔۔۔ اللہ تعالیٰ "نیستی و بندگی" کا حسن و جمال تمہارے آئینہ باطن پر جلوہ گر کر دے اور دعوئے تکبر سے نجات دے۔ بحرمت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔۔۔ بندہ جتنا احکام بندگی میں ثابت قدم ہوگا، "نیستی ذاتی" اور "فقر جبلی" کا تصور اس پر جتنا غالب ہوگا "ہستی" و کمالات اور خوبی کا ظہور اس کے حق میں اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ ع

وبضدہا تتبین الاشیاء (چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں)

حسن و جمال، غنا، اور تمام کمالات بوجہ کمال، اللہ کے لیے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ اس نے مخلوق کو "ذل و نیستی" اور احتیاج کی صفت پر پیدا کیا ہے۔ اور اپنے کمالات وجودی کا ایک پرتو بھی اس پر ڈال دیا ہے۔ جس کسی نے اپنے آپ کو باوجود اس کمال عاریتی" کے کامل و خیر خیال کیا اور قید نفس امارہ میں پھنس گیا وہ سعادت قرب سے محروم ہو گیا اور "بُعد و حرمان" کے داغ میں مبتلا ہوا۔ فالویل

لہٗ کل ویل ـــــ اور جس کسی نے "کمالاتِ عاریتی" کو اس کے مالک کے سپرد کیا اور اپنے ذاتی فقر و نیستی کو دیکھا وہ "دولتِ قرب و وصال" سے بہرہ یاب ہوا، اس نے "دامِ نیستی" سے صیدِ ہستی کو حاصل کر لیا۔ اور "راہ ذلت" سے مقامِ عزت پر پہونچ گیا۔ فطوبیٰ لہٗ و بشریٰ ـــــ اسکی پیدائش کا جو مقصد تھا اس کو پورا کیا، نعمت اس کے حق میں تمام ہوئی۔ اَوَ مَن کان میتاً فاحییناہٗ وجعلنا لہٗ نوراً یمشی بہ فی الناس الآیہ (آیا جو شخص مردہ تھا پس اس کو ہم نے زندہ کیا اور اس کے لیے نور پیدا کیا کہ وہ اس نور کے ساتھ لوگوں میں چلتا ہے، اس شخص کے مانند ہو سکتا ہے جس کا عالم یہ ہے کہ ظلمات میں مبتلا ہے اور اس سے نکلنے والا نہیں ـــ) یہ آیہ کریمہ اس شخص کا بیانِ حال ہے .... یہ کمال، کمالِ اتباعِ سید کونین صلی اللہ علیہ وسلم پر موقوف ہے۔

اللھم ارزقنا کمال متابعتہ والثبات علیٰ محبتہ ویرحم اللہ عبداً قال آمینا۔

مکتوب (۲۰۷) شیخ عبداللطیف لشکر خانی کے نام (وعظ و تذکیر میں)

(یہ مکتوب عربی میں ہے)

بعد الحمد والصلوٰۃ .... دوستوں سے امید ہے کہ وہ اتباعِ ہوا و شیطان کے باعث "لقاءِ رحمٰن" کو فراموش نہ کریں گے، زمانۂ صحت و فراغ کو غنیمت جانیں گے تلاوتِ قرآن کرینگے، نفس برائیوں حکم کرنے والا ہے، اور دنیا (درحقیقت) ایک بڑی زبردست جادوگرنی ہے، جس کا ظاہر پسندیدہ اور جس کی لذتیں مرغوب ہیں ـــ آخرت فراموش کی ہوئی چیز ہے اور اسکی نعمتیں پوشیدہ ہیں ـــ شیطان، نقد کو رواج دے رہا ہے اور فقر و فقدان سے ڈرا رہا ہے۔ کیا عاقل کو خبر نہیں کہ دنیا "عاجلہ" ہے اس کی متاع، فانی ہے، اور آخرت کا فائدہ باقی اور پائدار ہے، فوت ہونے والا نہیں ـــ .... (اے انسان) تو نے تین چیزوں کو تین چیزوں پر ترجیح دے رکھی ہے یعنی تعبِ نفس، شغلِ قلب اور ثقلِ حساب کو راحتِ نفس، فراغِ قلب اور خفتِ حساب پر ترجیح دیدی ہے، تو بدن فانی کی تعمیر میں مشغول ہے، نفس ظالم کا پیٹ بھر رہا ہے، اور جناب سبحانی کی جانب توجہ کرنے کو فراموش کر بیٹھا ہے۔ تو نے اپنے قلب کو لذات

فانیہ سے لبریز کر دیا ہے اور ابھی تک تجھ کو تیری آرزوئیں حاصل نہیں ہوئی ہیں۔ ایک عقلمند سے یہ بات تعجب خیز ہے کہ وہ امورِ دنیا میں تو تدبیر کا اہتمام کرے لیکن امورِ آخرت کو تقدیر کے حوالے کر دے۔ کیا اس کو اس کا یقین نہیں کہ امورِ دنیا کی تدبیر ہی یہ ہے کہ تدبیر کو ساقط کر دیا جائے، اور امورِ آخرت میں جد و جہد کرنا اور کوتاہی کو ترک کرنا ضروری ہے۔ — کیا اس نے یہ نہیں سنا کہ دنیا کی حاجت کا ترک کر دینا ہی حاجت کا پورا ہونا ہے، کمبخت ہے اس شخص کی جو دار الغرور (دنیا) میں مطمئن ہے۔ اور یہاں کی خوشی پر فریفتہ ہے، وحشتِ قبر اور شدتِ یوم قیامت کو بھول گیا، باطل میں ڈوبا ہوا ہے اور کتاب مسطور فی رقٍّ منشور (قرآن مجید) سے اعراض کر رہا ہے۔ لہو و لعب کی طرف چلتا ہے اور بیتِ معمور کی طرف نہیں چلتا۔ افلا یعلم اذا بعثر ما فی القبور وحصل ما فی الصدور ان ربہم بہم یومئذٍ لخبیر۔ (کیا انسان نہیں جانتا اس وقت کو جبکہ قبروں سے مردوں کو اٹھایا جائے گا اور ان بھیدوں کو جو سینوں میں چھپے ہوئے ہیں ظاہر کیا جائے گا۔ بیشک رب الناس اس دن انسانوں کے احوال سے باخبر ہے) والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ۔

مکتوب (۲۱۰) میر کی عباد اللہ ولد قاضی محمد زاہد کابلی کے نام۔

الحمد للہ رب العالمین والسلام علیٰ سید المرسلین وآلہ اجمعین ——— علم جس سے مراد انکشاف ہو، دو قسم پر ہے۔ ایک یہ کہ انکشاف کے ساتھ ساتھ احاطہ بھی ہو، دوسری قسم یہ ہے کہ محض انکشاف ہو احاطہ نہ ہو۔ — وہ علم جو "ممکن" سے تعلق رکھتا ہے قسم اول میں داخل ہے۔ اور جو علم "واجب" سے متعلق ہے وہ از قسم ثانی ہے — اس دوسرے علم کو "ادراک بسیط" کہتے ہیں۔ — "عدم احاطہ" کی علامت شناخت یہ ہے کہ کیفیت "درک" میں نہ آئے۔ "رویت اخروی" علم کی قسم ثانی ہے کیونکہ وہاں محض انکشاف ہے، بغیر کیفیت معلوم ہوئے — اور کیفیت معلوم بھی کیسے ہو، حق تعالیٰ تو کیفیت سے منزہ ہے ——— تعالیٰ شانہ وعز برہانہ۔ والسلام۔

مکتوب (۲۲۵) حاجی محمد عارف کے نام۔

بسم اللہ حامداً لہ ومصلیاً علیٰ رسولہ الکریم .... "تم نے لکھا تھا کہ حقیقت نماز کو کیا عرض کروں، نماز کی ادائیگی میں وہ لذت حاصل ہوتی ہے کہ اس کی تشریح نہیں کی جا سکتی تکبیر اولیٰ کے وقت ہی محویت طاری ہو جاتی ہے اور سوائے مشاہدۂ حق کے کوئی شعور باقی نہیں رہتا نیز

بعض اوقات ایک ایسا نور قلب سے ظاہر ہوتا ہے کہ گویا اس نے تمام عالم کو منور کر دیا ہے" ــــــ

مخدوما! ــــــ نماز سے لذت یاب ہونا بڑی نعمت ہے۔ ہمارے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکتوبات میں لکھا ہے کہ غیر منتہی کو نماز میں لذت میسر نہیں، علی الخصوص فرائض میں۔ اس لیے کہ ابتدا میں زیادہ سے زیادہ نفلی نمازوں میں لذت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن "نہایت النہایۃ" (آخر) میں یہ نسبت فرائض سے مربوط و متعلق ہو جاتی ہے ع این کار دولت کنون تا کرا دہند۔ حضرت مجددؒ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہو کہ جو لذت ادائے نماز کے وقت حاصل ہوتی ہے، نفس کو اس میں بالکل دخل نہیں ہوتا...... ع هنیئاً لارباب النعیم نعیمها۔ اور یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ "نماز کا رتبہ دنیا میں ایسا ہے جیسا کہ آخرت میں رویت باری تعالیٰ کا"۔ اور یہ بھی فرمایا کہ "تمام عبادات، وسائل نماز ہیں اور نماز مقاصد میں سے ہو"...

مکتوب (۲۲۷) میرزا امان اللہ کے نام ــــــ

.... بنی آدم کو جو امتیاز و فضیلت تمام "اجناسِ موجودات" میں حاصل ہے وہ ازراہِ عشق ہے۔ ع دردا جز آدمی در خود نیست (لائق)

انسان، جتنا زیادہ "مورد درد و محبت" ہوگا معیت و قرب میں بھی کامل تر ہوگا۔ (از روے) المرءُ مع من احبّ ــــــ معیت، محبّ صادق کو ہر وقت نصیب ہوتی ہے ــــــ

سرور کائنات فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم باوجود محبوبیت ذاتیہ، "دوام حزن" اور "تواصل فکر" کے ساتھ موصوف تھے جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے ــــــ اور جو شخص بھی اس درد سے بے نصیب ہو وہ چوپائے کے حکم میں ہے بلکہ اس سے بھی کم درجہ اور گمراہ تر ہے.........

مکتوب (۲۲۸) مولانا محمد صدیق کے نام (احیائے سنت و اماتت بدعت کی ترغیب و تحریص میں)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ حامداً اللہ العظیم و مصلیاً علیٰ رسولہ الکریم۔

اس وقت عہد نبوت سے دوری اور قرب قیامت کی وجہ سے بدعت شائع ہوتی جا رہی ہے۔ اور بدعت کی ظلمتیں عالم پر محیط ہیں۔ سنت غریب و نادر ہو گئی ہے۔ اور اس کے انوار مستور ہو رہے ہیں۔ "سنن متروکہ" کے زندہ کرنے اور علوم شرعیہ کے پھیلانے کے لیے کمر ہمت خوب مضبوط باندھو اور اس امر کو وسیلۂ کمالِ رضامندی حق تعالیٰ بنالو نیز "قرب بارگاہِ محمدیؐ" کو بھی اسی عمل سے ڈھونڈھو۔ یہ مضمون حدیث سے بکو

جو شخص میری ایسی سنت کو جو متروک العمل" ہوگئی ہے ۔ زندہ کرے گا ۔ اس کو سو شہیدوں کا ثواب ہے ۔ احیاء سنت کا پہلا درجہ تو یہ ہو کہ اس سنت پر خود عمل کرے اور اعلیٰ درجہ اس سنت کی نشر و اشاعت اور دوسروں کو اس پر عمل کرانے کی کوشش کرنا ہے ......

مکتوب (۲۳۰) بنام پیرزادہ حضرت خواجہ محمد عبید اللہ[1] ابن حضرت خواجہ باقی باللہ دہلوی معروف بہ خواجہ خرد۔

(درمیان سے)

...... مشفقا! آپ معارف توحید وجودی سے جو کچھ جانتے ہیں شوق سے لکھیں۔ یہ حال شریف ہے کس کو مجال سخن ہو سکتی ہے کیونکہ اکابر اہل اللہ نے اس توحید وجودی کو بیان کیا ہے۔ اگرچہ از راہ سکر و غلبۂ محبت ہی سہی ۔ حضرت جد امجد (حضرت شیخ عبدالاحد قدوسیؒ) توحید وجودی میں قدم راسخ رکھتے تھے اور (اس مضمون میں) تصانیف عالیہ بھی تالیف فرمائی ہیں لیکن آداب شریعت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا جیسا کہ محققین کا طریقہ ہے ۔ بہر حال دوسروں کی نفی کرنا اور حق کو اپنے علم میں ہی محصور و محدود رکھنا اور اس کے علاوہ کو محال سمجھنا آپ جیسے حضرات سے بہت زیادہ محل تعجب ہے ......

مکتوب (۲۳۳) شیخ عبدالہادی فاروقی بدایونیؒ خلیفہ مجدد الف ثانیؒ کے نام ۔

(فضیلت و خدمت درویشان میں)

---

[1] خواجہ خرد رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ باقی باللہ دہلویؒ کے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ ہنوز آپ کم سن تھے کہ آپ کے والد ماجد کا وصال ہوگیا۔ عمر کے ابتدائی مراحل طے کر کے سن رشد میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی خدمت میں پہونچے اور ان سے اجازت حاصل کی۔ بعد ازاں خواجہ حسام الدین اور شیخ الہداد سے (جو حضرت خواجہ باقی باللہ کے خلفاء تھے) اجازت اور اخذ طریقہ کی سند حاصل کی اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم فاروقی دہلویؒ اور ان کے چچا شیخ ابوالرضا دہلویؒ، سید مبارک محدث بلگرامیؒ اور سید کمال سنبھلیؒ وغیرہم نے آپ سے علمی و روحانی فیوض حاصل کیے ۔ ۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۰۷۳ھ کو وصال فرمایا۔ اپنے والد کی درگاہ کے احاطے میں دفن ہوئے ۔ ان کا توحید وجودی کی طرف رجحان تھا۔ اس سلسلے میں حضرت خواجہ محمد معصومؒ سے مکاتبت فرمائی۔ سوال جتنا اہم تھا جواب بھی اتنا ہی اہم ہے۔ حضرت سرہندیؒ نے اس مکتوب میں بہت دقیق اور اعلیٰ درجہ کی بحث فرمائی ہے انتخاب میں بقدر ضرورت پر اکتفا کیا گیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ بعد الحمد والصلوٰۃ وتبلیغ الدعوات ..... " احوال فقرائے اینجا ودموجب حمد ہیں ۔ اللہ تعالیٰ سے آپ کی سلامتی واستقامت کی درخواست ہے ۔ مدت ہوگئی کہ آپ نے اپنے احوال سے کوئی اطلاع نہیں دی خدا کرے کہ خیریت ہو کیا عجیب نعمت ہے یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو بڑھاپے اور زمانۂ ضعف میں آثار قبولیت کے ساتھ مزین فرمادے اور اس کے نور جبین کو اس کا شاہد عادل بنادے ۔ منقول ہو کہ ایک شخص نے ایک فاسق کو خواب میں اسکے مرنے کے بعد دیکھا اور اسکے حالات دریافت کیے اس نے کہا کہ مجھے بخشدیا گیا ۔ سائل نے ازراہ تعجب پوچھا کس عمل کی وجہ سے ؟ اس نے کہا کہ ایک روز حضرت بایزید بسطامیؒ نے بعد نماز عصر ، دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تھے میں بھی اس دعا میں شریک تھا اور ہاتھ اٹھا کر آمین کہتا جاتا تھا ۔ اس دعا کے طفیل میں مجھے بخشدیا " پس آپ جیسے درویشوں پر رشک وغبطہ کرنا چاہیے کہ دوستانِ خدا کی دوستی میں اپنے " موئے سیاہ " کو سفید کرلیا اور ان کے دل میں اپنی جگہ بنائی ۔ اس " امر عظیم القدر " کو تھوڑا خیال نہ کرنا ....

مکتوب (۲۳۴) خواجہ محمد کاظم کے نام (انکے والد خواجہ محمد ہاشمؒ کی تعزیت کرتے ہوئے)

.... اللہ تعالیٰ کے فعل پر راضی وشاداں اور جادۂ شریعت پر ثابت قدم رہیں ، سنت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل پیرا ہوں ۔ اپنے والد کے " اوضاع پسندیدہ " کو ہاتھ سے نہ دیں ، پانچوں نمازوں میں اول وقت حاضر ہوں ۔ اپنی والدہ نیز تمام اہل حقوق کی رضاجوئی میں کوشش کریں " موسم جوانی " کو غنیمت جانیں اور اپنی پوری کوشش مرضی حق تعالیٰ کے حاصل کرنے میں صرف کردیں ۔ قوت جوانی کو اپنے آقائے حقیقی کی خدمات میں صرف کریں ۔ ایام ضعف و پیری میں کیا کام ہو سکتا ہے ۔ ایسا نہ ہو کہ ان ایام کو یوں ہی گذاردیں ، لہو ولعب اور عیش وعشرت میں پڑجائیں ۔ وقت عیش تو آگے آرہا ہو ۔ اللّٰھم لاعیش الاعیش الآخرۃ ۔ یہ وقت ، وقت کار ہے ۔ نیک کاموں کے کرنے میں کوشش کریں ۔ اور سوائے مولیٰ تعالیٰ اور اسکی رضا کے اور کوئی مقصود نہ رکھیں ، فقر ومسکینی کو جان ودل سے دوست رکھیں ۔ نامرادوں اور دردمندوں کی ہم نشینی اختیار کریں " صلحاء و درویشان " کو بدل وجان عزیز اور دنیا سے مجالست رکھیں ۔ واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی یریدون وجھہ الآیۃ (روک اپنے آپ کو ایسے لوگوں کے ساتھ جو یاد کرتے ہیں اپنے رب کو صبح وشام چاہتے ہیں اللہ کی مرضی کو) اہل دنیا اور دنیا کے ٹھاٹ پر ہرگز گوشۂ چشم نہ ڈالیں اور دنیا کے ٹھاٹ کو حقیر وناچیز اور کم قابل تصور کریں طلبا کی خدمت حتی الامکان خود کریں اور جہاں تک ہو سکے دوسروں پر انکو نہ چھوڑیں ..... والسلام علیکم وعلیٰ من لدیکم

ل شیخ عبدالہادی بدایونی پہلے حضرت خواجہ باقی باللہ کے مرید ہوئے ۔ حضرت خواجہؒ نے اپنے اور مریدوں کے ساتھ ان کی تربیت بھی حضرت مجدد الف ثانیؒ سے کرائی تھی ۔ حضرت مجددؒ کے یہ خلیفہ مجاز ہیں ۔

ہمارا مستقبل

(از ڈاکٹر محمد آصف صاحب قدوائی، ایم اے، پی ایچ، ڈی)

[ذیل کے مضمون میں ماضی اور حال کے بارے میں مضمون نگار کے بعض احساسات اور مستقبل کی بہتری کے لیے ان کی بعض تجاویز و آراء سے اختلاف ہو سکتا ہے، مگر نفس مسئلہ کی اہمیت کا تقاضہ یہ ہے کہ اظہار اختلاف کے بجائے قابل قبول باتوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے ——— ادارہ]

افراد کی طرح قوموں کی زندگیوں میں بھی نہ جانے کتنے سورج ڈوبتے اور طلوع ہوتے رہتے ہیں! اندھیرے اور اجالے کی اسی الٹ پھیر کا نام وقت ہے جس کا کارواں عروج و زوال کی مختلف وادیوں سے گذرتا آگے بڑھتا رہتا ہے۔

تقسیم کے بعد ہندستان کے مسلمان جن حالات میں گرفتار ہو گئے ہیں وہ لاکھ ناساز گار اور حوصلہ شکن کیوں نہ ہوں ایسے نہیں ہیں کہ دوسری قوموں کو ان کی تاریخ کے مختلف دوروں میں ان کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو، خود ہندوستانی مسلمانوں کو بھی اس سے پہلے ایک بار اور آگ اور خون کے سیلاب سے ہو کر گذرنا پڑا تھا۔ جب انگریزوں نے ملک کی حکومت ان سے چھین کر اور جس تہذیب کی بنیاد انھوں نے یہاں ڈالی تھی اسے روند کر اپنی سامراجیت کا علم بلند کیا تھا، ہندستان میں مسلمانوں کے لیے اس طرح کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ وقت کی طلاطم خیزی سے واقف نہ تھے، ان کے برخلاف ہندو اپنے ملک میں اسی قسم کے کئی دور دیکھ چکے تھے وہ زمانہ کا ساتھ دینا جانتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے کشمکش کے ابتدائی دور ہی میں زمانہ کے تیور پہچان لیے اور ان کے اشاروں کے مطابق اپنی تنظیم میں لگ گئے۔ مسلمانوں نے اس کی پرواہ نہ کی اور ان کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ انھوں نے ماضی کے سہارے جینا چاہا اور اپنے کھنڈروں اور ویرانوں کے گوشوں میں پڑے آنسو بہاتے رہے۔ ہندوؤں نے نئے سیاسی اور اقتصادی حالات کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا اور اپنے کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کی عملی تحریکیں جاری کیں۔ بالآخر سرسید کے چونکانے پر جب مسلمان اس راستہ کو اپنانے کے لئے اٹھے تو ہندو ان سے بہت آگے نکل چکے تھے۔ اور یہ فاصلہ پھر کبھی مٹ نہ سکا۔

ہندوستانی مسلمان اب پھر اپنے کو اندھیرے میں پا رہے ہیں۔ خیال تھا کہ ۱۸۵۷ء کے تجربہ کے بعد ان کے قومی مزاج میں پختگی آگئی ہوگی اور وقت کے مطالبوں کو سمجھنے اور اپنے مسائل پر غور کرنے کا ان میں شعور پیدا ہو گیا ہوگا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس سے کوئی ایسا سبق نہیں لیا تھا جو ان کے شعور کی گہرائیوں میں اتر کر کوئی مفید اور دائمی تبدیلی پیدا کر سکتا۔

ان پر ایسی افسردگی اور شکست خوردگی طاری ہے کہ سوچنے اور سمجھنے اور اپنے لیے کوئی لائحہ عمل متعین کرنے کی ان کی ساری صلاحیتیں مفلوج ہو گئی ہیں۔ ان کے اندر ایک جامد، منفی اور منفعل ذہنیت پیدا ہو گئی ہے جو رفتہ رفتہ انھیں ایسی تاریکی میں ڈھکیل رہی ہے جہاں نہ راستہ کا پتہ چل سکتا ہے نہ منزل کا۔ اس بیمار اور مجہول بلکہ سراسر ہلاکت آفریں ذہنیت کی اصلاح وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

غدر کے بعد مسلمانوں میں چار بڑی تحریکیں چلائی گئیں۔ سب سے پہلے سرسید نے ان کا دامن وقت کے دامن سے باندھنے کی کوشش کی۔ پھر شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی علیہ الرحمہ نے شمالی ہند کے مسلمانوں کی تنظیم کو اپنایا۔ تیسری تحریک علی برادران کی تحریک خلافت تھی۔ اور آخر میں مسلم لیگ نے مسلمانوں کی قیادت اپنے ذمہ لی۔ ان تحریکوں میں بعض تعمیری اور اصلاحی طرز کی تھیں اور بعض جذباتی اور ہنگامی بعض تاریخی حقائق کی بے رحمی، آج کے سامنے کل کی بے بسی اور اقدار کی تغیر پذیری سے واقف تھیں اور بعض ان سے لاعلم۔

ان تحریکوں نے وہ مکرمی کے جالے تو دفع کر دیے جو مسلمانوں کے ذہنوں میں لٹکے ہوئے تھے اور ان کو ایک قوم کی طرح ایک مشترکہ مقصد کے لیے لڑنے اور قربانیاں جھیلنے کی لذت سے آشنا کیا۔ مگر ان کے نظریاتی اور اسلوبی تفاوت و تخالف کا اثر مسلمانوں کے اجتماعی تحت الشعور پر بھی پڑا۔ کبھی ان کو یہ تلقین کی جاتی کہ ہوش کے ناخن لو، سیاست و معاشرت میں رومانی انداز فکر چھوڑو، ٹھنڈے دل سے غور کرنا اور وقت کی نبض پہچاننا سیکھو اور کبھی یہ اذن ہوتا کہ عقل و خرد کے فیصلوں کو ہنگامی تقاضوں میں غرق کر کے بے خطر "آتش عشق" میں کود پڑو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک صدی کے تجربہ اور جد و جہد کے بعد بھی ان کے مزاج میں اعتدال و توازن نہ پیدا ہو سکا۔

مسلم لیگ کا نصب العین پاکستان تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اس کے ہندوستان میں جاری رہنے کا کوئی امکان نہیں رہ گیا۔ اس کے ممتاز لیڈر سب کے سب پاکستان منتقل ہو گئے اور اپنی قومی زندگی کے

اس نازک ترین موقع پر ہندوستان کے مسلمان بغیر کسی قائد اور بغیر کسی پروگرام کے رہ گئے۔

قیادت کا یہ فقدان اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے۔ سارے ملک میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں نظر آتا جس کی طرف مسلمان امید و اعتماد سے دیکھ سکیں اور جو اس مشکل دور میں ان کی قیادت کا فرض ادا کر سکے۔ ملکی سطح کے علاوہ مقامی سطحوں پر بھی یہی کیفیت ہے۔ جو چند مخلص ہستیاں ہیں بھی وہ مایوسی اور تلخی کی اس درجہ اسیر ہیں کہ ان کے قویٰ شل ہو گئے ہیں، نہ وہ کسی کو راستہ دکھا سکتے ہیں، نہ کسی کے بتائے ہوئے راستہ پر چل سکتے ہیں۔ بس چند ہنگامہ پسند و مطلب پرست ساحر رہ گئے ہیں جو موقع موقع سے قوم کے اسٹیج پر نمودار ہو کر آگ اگلا کرتے ہیں اور قوم ان کے ابھارے ہوئے جوش اور ہیجان سے متاثر ہو کر پاگلوں کی طرح اپنی قبر کھودتی رہتی ہے۔

نہ جانے کتنے بار ہم شیروں کے مانند دہاڑنے والے سورماؤں کے پہلوؤں میں بھیڑ کا دل دیکھ چکے ہیں۔ نہ جانے کتنے سستے بازیگروں کی آتش بیانی ہمارے خرمنوں کو پھونک چکی ہے۔ ہم کو پھر بھی عبرت نہیں ہوتی، ہم کھرے اور کھوٹے میں فرق نہیں کر پاتے۔ مذہب کے نام پہ ہر نعرہ ہم کو دیوانگی میں مبتلا کر دینے کے لیے کافی ہے۔ خواہ اس دیوانگی کی کتنی ہی قیمت کیوں نہ ادا کرنا پڑے۔ یہ سطحی جوشیلا پن ہماری قوم کا موروثی روگ بن گیا ہے۔ اس نے ہماری سنجیدہ اور تعمیری دعوت قبول کرنے کی صلاحیتوں کو کمزور کر دیا ہے۔ اب اسے مزید غذا پہونچانے سے احتیاط کرنا چاہیے۔

جذباتیت سے نکل کر خطِ اعتدال کو پھر سے پالینا مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا معاملہ ہے، مگر اسے جھوٹی امیدیں اور فضول حوصلے بلند کر کے نہیں حاصل کیا جا سکتا ہے جو ہمارے پیشہ ور لیڈروں کا مرغوب طریقہ ہے۔ انھوں نے تو قومی درد اور ملی جذبہ کی دوکانیں کھول رکھی ہیں۔ یہ دوکانداری اب ختم ہونا چاہیے۔ خطِ اعتدال پر پہونچنے کے لیے جس قسم کی قیادت کی ضرورت ہے وہ ایک متوازن شخصیت ہی مہیا کر سکتی ہو جو وقت کے تقاضوں کو پہچانتی ہو اور ہمت اور حماقت، ارادہ اور آرزو، حقیقت اور خواب اور ماضی اور مستقبل وغیرہ میں فرق کرنا جانتی ہو، جو ہمت اور ارادہ کے ساتھ تجربہ، تدبیر، احتیاط اور استقلال کو ملانا جانتی ہو، جس کے دماغ میں وسعت اور دل میں گرمی ہو اور جو ذہنوں میں مایوسی کی جگہ بے چینی پیدا کر سکے اور پھر اس کی صحت مندانہ طور پر پرورش کر کے اسے قوم کا سرمایہ بنا دینے کا گر جانتی ہو۔

• علامہ اقبال نے ایک موقع پر کہا تھا کہ اچھے قائد قوموں کے حق میں اللہ تعالیٰ کا انعام ہیں در حقیقت

وہ کون سی نعمت ہے جو خدا کا انعام نہیں ہے۔ پھر ان نعمتوں کے نازل ہونے کے انتظار میں ہم ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے تو نہیں رہتے۔ خدا کی رحمت کے مستحق بننے کے لیے اپنے امکان والی کوشش ضروری ہے، ملکی سطح پر نہیں تو مقامی سطحوں پر ہی قیادت کے خلا کو پر کرنے کی عملی فکر میں اب دیر نہ کرنا چاہیے۔ جن کے دلوں میں ملک و ملت کا درد ہے اور جو اس درد کی ضرورتوں پر سنجیدگی سے غور کر سکتے ہیں۔ ان کو چاہیے کہ مسلمانوں میں صحیح شعور اور تعمیری ذہنیت اور اعلیٰ مقاصد کے لیے جد و جہد کرنے اور قربانی دینے کا جذبہ پیدا کرانے کی طرف اپنے وقت اور اپنی صلاحیتوں کو لگائیں۔ اگر مسلمانوں میں اس سمت کی طرف حرکت پیدا ہوگئی تو وہ قائد خود پیدا کر لیں گے۔ کیونکہ بہر حال قوم ہی قائد پیدا کرتی ہے قائد قوم نہیں پیدا کرتے۔

مسلمانوں کو یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ دنیا کا کوئی ملک ان کی چار کروڑ آبادی کے لیے اپنے یہاں جگہ نہیں نکال سکتا ہے، ان کو جینا اور مرنا ہندوستان ہی میں ہے، یہی ان کا وطن ہے اور رہے گا۔ اور اسی کے ساتھ ان کو وطن دوستی کے سارے حقوق ادا کرنا ہیں۔ وہ گنتی میں ہندوؤں سے بہت کم ہیں، یہ صحیح ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں نکلتے کہ ملک میں ان کی عددی طاقت قابل اعتنا نہیں ہے، تعداد کے اعتبار سے وہ اب بھی ہندوستان کی دوسری سب سے بڑی جماعت ہیں مگر اخلاقی طور پر تہی دست اور بے مایہ بھی نہیں ہیں، ہندوستان کی تاریخ میں وہ بڑی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، وہ جب یہاں آئے تھے تو اپنے ساتھ ایک ایسی تہذیب لائے تھے جس نے ملک کی کایا پلٹ دی تھی۔ اگر وہ اپنی حیثیت اور وقار کو قائم رکھنا چاہیں تو اس کی پوری گنجائش ہے، چار کروڑ کی جماعت دنیا کے کسی ملک میں بھی ہو اعزاز و اعتماد کی زندگی بسر کر سکتی ہے، یہاں کچھ عناصر ایسے ضرور ہیں جو مسلمانوں کے متعلق تاریک ارادے رکھتے ہیں۔ لیکن اگر مسلمان یہ فیصلہ کر لیں کہ وہ اپنی طرف سے ان کو کھل کھیلنے کا موقع نہ دیں گے تو وہ ان ارادوں میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ہندو فرقہ پرستی کی کامیابی کے لیے مسلم فرقہ پرستی یا مسلم ناعاقبت اندیشی کا اشتراک عمل بڑی حد تک ضروری ہے۔

ہندوستان نے اپنے لیے جو سیکولر جمہوریت کا نصب العین متعین کیا ہے وہ مسلمانوں کے مفاد کے عین مطابق ہے۔ ہر دوسری اقلیت کی طرح ان کا نفع بھی اسی میں ہے کہ ریاست و حکومت پر کسی مخصوص قوم یا مذہبی گروپ کے عقیدوں اور رجحانوں کا سایہ نہ پڑنے پائے اور ریاستی امور کو مذہبی اور تہذیبی امور سے الگ رکھا جائے۔ ورنہ مشترک آبادی والے ممالک میں عموماً یہی ہوتا ہے کہ اکثریت کے قومی عزائم

ملک کے سیاسی عزائم بن جاتے ہیں۔ حکومت کے قوی اکثریت کے دینی اور ثقافتی سرمایہ کی حفاظت اور اشاعت کے لیے استعمال ہونے لگتے ہیں اور اقلیتوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے جو آخر میں ملک کی بربادی کا بھی موجب ہوتا ہے۔

سیکولرزم کی حفاظت اور نگرانی میں مسلمانوں کو حصہ لینا چاہیے۔ فی الحال ملک کی ذہنی آب و ہوا سیکولرزم کے زیادہ موافق نہیں ہے اس کا سبب زیادہ تر تاریخی نوعیت کا ہے، جب کوئی قوم ایک عرصہ تک محکومی کی زندگی بسر کرنے کے بعد آزاد ہوتی ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماضی قدیم کی طرف تیزی سے پلٹ جانا چاہتی ہے، ہمارے یہاں کی اکثریت بھی آج کل اسی مرض کی شکار ہے وہ اپنی پرانی تہذیب کی بازدید کی شدت سے آرزومند ہے، مگر یہ دور عموماً عارضی ہوتا ہے اور جیسے جیسے وقت گذرتا جاتا ہے ماضی پرستی کا جوش اور ولولہ کم ہوتا جاتا ہے۔ مسلمانوں اور سیکولرزم دونوں کو اس قسم کے جھٹکے برداشت کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

ملک کی تعلیمی پالیسی اسی تہذیبی جارحیت کی زد میں آگئی ہے۔ اس میں ہندی کے روپ میں ہندو مائتھالوجی اور کلچر ٹھونسا جارہا ہے۔ یہ مسلمانوں کے لیے ایک بڑا خطرہ ہے۔ ان کے بچوں کی دینی تعلیم خاص توجہ کی مستحق ہے، سیکولر نظام میں یوں بھی دینی تعلیم کا انتظام دینی جماعتیں خود کرتی ہیں، حکومت نہ ان کی مدد کرتی ہے نہ مخالفت۔ اس کی طرف سے مسلمانوں نے اگر کچھ دنوں اور غفلت برتی تو یہ ان کی اپنی آنے والی نسلوں کے ساتھ ناقابل معافی غداری ہوگی۔ ان کی اولاد اسلام کی دولت سے عملاً محروم ہو جائے گی۔

تعلیم سے ملتا جلتا مسئلہ زبان کا ہے۔ ہمارا کل دینی اور ثقافتی سرمایہ اردو میں ہے۔ اگر مسلمان بچے اردو سے نابلد رہ گئے تو ان کے تہذیبی وجود کی جڑیں کٹ جائیں گی اور یہ سارا سرمایہ غارت ہو جائے گا۔ زبان بہرحال کوئی سرکاری چیز نہیں ہے، وہ سرکاری دفتروں میں نہیں گھروں اور گلی کوچوں میں پرورش پاتی ہے۔ اسے نہ سرکاری احکام مار سکتے ہیں نہ جلا سکتے ہیں۔ اس کے راستہ میں رکاوٹیں بیشک پیدا کی جاسکتی ہیں مگر ان رکاوٹوں کا مقابلہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اردو کی بقا اور اشاعت کی سنجیدہ تحریکوں کو سیاسی جتھہ بندیوں سے الگ رکھتے ہوئے جاری رکھنا پڑے گا۔ اسکول جانے والے بچوں کو گھر پر اردو پڑھانے کی ضرورت پر بھی ذمہ داری سے غور کرنا چاہیے۔ کیونکہ تمام سرکاری وعدوں کے باوجود اسکولوں

میں اس کا کوئی انتظام نہیں کیا جا رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان بچے ہندی تو خوب سیکھ رہے ہیں لیکن اردو کے دو لفظ بھی نہیں پڑھ سکتے۔ اسلامی لٹریچر کو جلد از جلد ہندی میں منتقل کرنے کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے۔ انکو ہندوستان میں باقی رکھنے کی اس سے موثر کوئی دوسری تدبیر نہیں ہو سکتی۔

مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کی مالی حالت اتنی خراب ہو گئی ہے کہ ان میں سے اکثر تو نزع کی ہچکیاں لینے لگے ہیں۔ ان کو زیادہ تر امداد (ہمارے صوبہ میں) زمیندار طبقہ سے ملتی تھی۔ خاتمہ زمینداری کے بعد یہ ذریعہ بند ہو گیا ہے۔ بہت سے تجارت پیشہ مسلمان جو تعلیمی کاموں میں دلچسپی لیتے تھے اور مالی اعانت فرماتے تھے۔ ان کے پاکستان چلے جانے سے آمدنی کے دوسرے ذرائع بھی خاصے محدود ہو گئے ہیں۔ اسکے باوجود مسلمان اگر اپنی ذمہ داری محسوس کریں اور اپنے وقت، محنت اور دولت کے سرمایہ کا کچھ حصہ اس اہم خدمت میں لگائیں تو اپنے اسکولوں اور کالجوں کو بہ آسانی برقرار رکھ سکتے ہیں۔ ان کی زبوں حالی کا اصلی سبب مسلمانوں میں دولت کی کمی نہیں، صحیح شعور کی کمی ہے۔ ہمارے وہ بھائی جن کو اللہ تعالیٰ نے فراغت اور وسعت عطا فرمائی ہے معاشرہ کے ساتھ اپنی ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتے وہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ آرام و اطمینان سے ہیں اور انھوں نے اپنی اولاد کے لیے معاش کا معقول انتظام کر لیا ہے تو اب ان کو کچھ سوچنے یا فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کبھی انھوں نے ملی خدمت کی بہت ضرورت محسوس کی تو قوم کے حال زار پر آنسو بہا لئے یا تنقید کر دی۔ اس سے ان کے ملی جذبہ کی تشفی ہو جاتی ہے۔ تفریح اور نام و نمود کے کاموں پر تو وہ بے دریغ صرف کر ڈالتے ہیں لیکن قوم کی ضرورت کے وقت یا حق العباد ادا کرنے کے موقعوں پر ان کی جبینیں اتنی سکڑ جاتی ہیں کہ خدا کی پناہ، وہ یہ نہیں سوچتے کہ اگر ان کی غفلت کے باعث معاشرہ کی کشتی ڈوبی تو وہ اپنے ساتھ انھیں بھی لے ڈوبے گی۔ وہ اپنے کو الگ الگ جزیرے سمجھتے ہیں۔ حالانکہ کوئی انسان بھی ایک علیحدہ جزیرہ نہیں ہے اس کا سارا وجود معاشرتی رشتوں میں جکڑا ہوا ہے، معاشرہ سے فرد کے تعلق کے مختلف درجے اور نوعیتیں ہو سکتی ہیں مگر ان سے رہائی ناممکن ہے۔

تقسیم سے پہلے شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمدنی کے عام طور سے دو ذریعے تھے، ایک زمینداری اور دوسرا سرکاری ملازمت۔ زمینداریاں ختم ہو گئیں اور سرکاری ملازمتوں میں ان کا خیال ہے کہ ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاتا ہے۔ ان کا اقتصادی نظام درہم برہم ہو گیا ہے، تجارت سے وہ ہمیشہ الگ تھلگ رہے۔ اس کا انھیں تجربہ نہیں ہے اور اب اگر وہ اس میں داخل ہونا بھی چاہتے ہیں تو اولاً ان کے پاس

سرمایہ کی کمی ہے اور ثانیاً یہ میدان پہلے ہی سے ایسا اٹھا ہوا ہو کہ انکو پاؤں دھرنے کی جگہ نہیں ملتی ایسی صورت میں حکومت
کو بھی انکی اقتصادی بحالی کی طرف خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہو۔ اتنی بڑی تعداد کی معاشی بے اطمینانی ملک کی ترقی
میں بڑا رخنہ ڈال سکتی ہے، جیسا کہ ڈاکٹر عابد حسین نے لکھا ہے اس کا تو کوئی امکان نہیں ہے کہ مسلمان
رزق تنگی سے عاجز آ کر پاکستان یا کسی دوسرے ملک سے سازش کرنے لگیں گے، لیکن یہ ضرور ہو سکتا ہے
کہ وہ ایک بھاری پتھر بن کر ہندوستان کی گردن میں لٹک جائیں۔ جو اس کا آگے بڑھنا دشوار ہو جائے۔

کچھ عرصہ ہوا اینگلو انڈین ایسوسی ایشن نے اقتصادی خود کفالت کے دس سالہ منصوبہ کا اعلان کیا
تھا تاکہ رزق و معاش کے معاملہ میں اینگلو انڈین لوگ حکومت کے دست نگر نہ رہیں، مسلمانوں کو اس سے
سبق لینا چاہیے۔ اگر چند لاکھ کی اینگلو انڈین جماعت ایسا جرأت مندانہ قدم اٹھا سکتی ہے تو وہ بھی ایسا کیوں نہیں
کر سکتے۔ ملک میں جو ترقیاتی اسکیمیں کھولی جا رہی ہیں۔ ان میں ان کو آگے بڑھ کر شریک ہونا چاہیے۔ ہم جانتے ہیں
کہ اس میں ان کے لیے متعدد دشواریاں ہیں لیکن اکثر مقامات پر مستقل مزاجی، عزم سلیم اور موقع شناسی سے کام
لے کر مسلمان ان موانع اور مشکلات کو عبور کر رہے ہیں اور فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

امداد باہمی کی سوسائٹیاں قائم کر کے قلیل سرمایہ سے نئے نئے روزگار شروع کیے جا سکتے ہیں مسلمانوں
میں اب بھی بڑے اچھے دستکار ہوتے ہیں۔ مگر ان کے ہنر اور محنت کی کمائی ہندو سرمایہ داروں کے ہاتھوں
میں چلی جاتی ہے جو انھیں معمولی اجرت پر ملازم رکھ کر ان سے سامان تیار کراتے ہیں اور پھر اس کی تجارت
کرتے ہیں۔ ان کو آزاد کاروبار میں لگانے کے لیے کسی بڑے سرمایہ کی ضرورت نہیں ہو۔ چند ہزار روپوں سے
اس طرح کی صنعتی انجمنیں قائم کی جا سکتی ہیں جہاں ہمارے دستکار کوآپریٹو کے اصولوں پر کام کر کے خود بھی
دونا اور چوگنا نفع کما سکتے ہیں اور معاشرہ کی معاشی تنظیم میں بھی معاون ہو سکتے ہیں۔

اسراف کی عادت اور اس کے نتیجہ میں زیر باری ہماری روزمرہ کی زندگی کا لازمی جزو بن گئی ہے۔
گویا کہ ہم کو کبھی نہ کشادگی اور نہ تنگی دونوں میں میانہ روی کی تعلیم دی ہی نہیں گئی تھی۔ بخل کے بغیر کفایت
اور فضول خرچی کے بغیر فراخ دستی ——— یہ ہے اسلام کا معیار، جس سے ہم نے پہلے تغافل برتا تو برتا۔
اب اس پر عمل پیرا ہوئے بغیر چارہ نہیں، روپیہ کے علاوہ وقت اور مواقع ضائع کرنے میں بھی ہم کو بڑا ملکہ حاصل
ہے۔ جب تک ہم اپنی عادتیں نہ بدلیں گے اور محنت، کفایت شعاری اور باہمی ہمدردی اور تعاون کو اپنا شعار نہ
بنائیں گے ہماری صلاح و فلاح کی تدبیریں بس تدبیریں ہی رہیں گی ——— (باقی صفحہ پر)

اسلام اور تحریم شراب

(از مولانا سید محمد انظر شاہ صاحب کاشمیری)

(۲)

"شراب اور دماغی امراض"

شراب سینکڑوں قسم کے دماغی امراض پیدا کرتی ہے اس کا انکار علمی حقائق و واقعات کے انکار کے مرادف ہوگا۔ مے نوش جن دماغی عارضوں میں ہمیشہ مبتلا رہتے ہیں۔ اس کا اظہار اطبّا اور حاذق معالج آئے دن کیا کرتے ہیں، اور اس ہلاکت عظیم کو شراب کی دوسری مضرتوں میں زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ:۔

"خداوند عالم نے شراب میں کوئی شفا نہیں رکھی وہ دماغ کو جو مرکز عقل ہے شدید نقصان پہونچاتی ہے۔ فقہا اور اطبا سب اسے تسلیم کرتے ہیں۔"

ما جعل اللّٰہ لنا فیہا شفاء قط فانہا شدید المضرۃ بالدماغ الذی ہو مرکز العقل عند الاطباء والفقہاء۔　(زاد المعاد جلد ۳)

طب یونانی کا سب سے بڑا ماہر اور حاذق طبیب جس کے تجربات و حذاقت پر یونانی طب کے علاوہ ڈاکٹری میں بھی بڑا اعتماد ہے اور یورپ کی مخصوص طب، صدیوں کے روشن تجربات کے باوجود بقراط کی فنی مہارت کا انکار نہ کر سکی یعنی دنیا کا مایۂ ناز طبیب "بقراط" کہتا ہے کہ

"ضرر الخمر بالراس شدید"　　شراب کا سب سے زیادہ ضرر دماغ کو پہونچتا ہے

....　　............

....　　............

وھوکذالک بالذھن" (ایضاً) اور ایسا ہی ضرر اس سے ذہن کو پہونچتا ہے۔

صاحب "الکامل" نے بھی لکھا ہے کہ

"اِنَّ خاصۃ الشراب الاضرار بالدماغ والعصب" (ایضاً)

یعنی شراب کی خاصیت ہے کہ وہ دماغ اور پٹھوں کو شدید نقصان پہونچاتی ہے۔ بقراط کی طبی حذاقت پر اعتماد کے بعد شراب کی مضرت کے سلسلہ میں کوئی وجہ نہیں کہ اس کی رائے پر اعتماد نہ کیا جائے لیکن دور حاضر کا ذہن جس طرح یورپ کی تحقیقات پر اعتماد کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ اسی کی ساخت کا تقاضہ ہو کہ اس سلسلہ میں یورپ کے پیش کردہ ان اعداد و شمار کو بھی دیکھ لیا جائے جو انسداد مے نوشی کی سوسائٹیوں کی جانب سے شراب کی دماغ پر مرتب ہونے والی مضرتوں کے سلسلہ میں سامنے آتے رہتے ہیں۔ "بلجیم" میں کثرت شراب نوشی کے نتیجہ میں جو ہولناک تباہ کاریاں رونما ہو رہی ہیں ان کو دیکھتے لکھا ہے کہ:۔

"مجرموں میں فی صدی اسی خودکشی کرتے ہیں۔ ۷۰، قید خانے میں رہتے ہیں ۹، فقر و فاقے میں بسر کرتے ہیں اور ۵، فی صدی مجنون اور پاگل ہیں۔"

(احکام العقلیہ ص۴۸۵)

اور دنیا کے سب سے زیادہ مے نوش ملک اور عشرت کدہ یورپ یعنی فرانس میں اسی زہر سیال کی ہلاکت خیزیاں اس طرح سامنے آئیں۔

"کثرت مے نوشی سے جو دو خاص مرض، ایک مرض دماغی سرسام کا اور دوسرا جگر کی خرابی کا، پیدا ہوتے ہیں، اس سے مرنے والوں کی تعداد "فرانس" میں ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۲ء تک ۱۸۰۰۰ کو پہونچی، اور اسی مدت میں فرانس جو انڈوچائنا میں جنگ کر رہا اس جنگ میں اس کے مرنے والوں کی تعداد ۹۱۰۰۰ کی رہی اور یہ شمار تو ان امراض سے براہ راست مرنے والوں کا رہا، باقی جو لوگ کثرت مے نوشی سے بالواسطہ مرے ہیں یعنی اس کے اثرات سے بالواسطہ ان کی میزان اگر لگائی جائے تو تعداد اس کی بھی دس گنی پڑے گی۔"

(بمبئی کرانیکل ۱۹۵۳ء)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ مے نوشی کی کثرت اور جام زہر کے پر کیف نائو نوش کے نتیجہ میں مرنے والوں

کی تعداد جنگ ایسی ہلاکت انگیز و تباہ کن چیز سے بھی آگے بڑھ گئی اور جنگ بھی چار سو پانچ سو سال قبل کی نہیں جبکہ تیر و تفنگ، اور شمشیر و سنان سے کام لیا جاتا تھا، بلکہ ایٹم اور ہائیڈروجن بم کے زمانہ میں جس سے "ہیروشیما" ایسے آباد و پر رونق آبادی اور حسین شہر کو چند منٹ میں تودۂ خاک بنا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ اور ہزار ہا بلکہ لاکھوں انسانوں کو دیکھتے ہی دیکھتے خاک و خون میں تڑپنے کے لیے اور خونخوار انسان نما بھیڑیوں کی داستان ظلم و عدوان سنانے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ فرانس کے اسی عشرت خانے میں جہاں شراب نوشی کے لیے آبادی کا ذرہ ذرہ سمٹ کر شراب خانوں میں پہونچ جاتا ہے، دماغی امراض اور جگر کی خرابیوں میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد

"۱۹۵۲ء میں ۳۹۰۵ اور ۱۹۵۴ء میں ۱۰۶۰۴ تھی۔"

(صدق جدید ۲۱ اکتوبر ۵۵ء)

انسدادِ مے نوشی کے ان اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہوگا کہ شراب سے دماغی امراض اور عارضے کس طرح اور کن مہلک صورتوں میں پیدا ہوتے ہیں اور یہ دماغی بیماریاں اکثر

"جنون"

کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔ دماغ کے ضعیف اور ماؤف ہو جانے کے بعد جنون کا عارضہ قطعاً متوقع ہے۔ ہندوستان کا مشہور افسانہ نگار اور فحش نویس "منٹو" بارہا جنون میں مبتلا ہو کر پاگل خانوں تک پہنچا اس برگشتہ قسمت افسانہ نویس کی موت پچھلے دنوں جن عبرتناک حالات میں ہوئی وہ خود ایک المناک افسانہ ہے، شراب سے پیدا ہونے والے جنون کے سلسلہ میں یورپ کا ڈاکٹر "بنثیم" لکھتا ہے کہ

"افریقہ کے جن لوگوں نے شراب کا استعمال کیا وہ پاگل ہو گئے اور یورپ کے جو باشندے اسکی کثرت رکھتے ہیں وہ بھی جنون کی بیمار ہیں اس لیے شراب کو جلد از جلد افریقیوں کے لیے ممنوع مشروب قرار دیا جائے۔" (طنطاوی صد ۱۹۴)

جگر کی بیماری

دماغ کو شدید نقصان پہونچانے کے ساتھ جگر کو بھی اس کی مضرتیں تباہ کرتی ہیں، حالانکہ جگر

بھی اعضائے رئیسہ میں، ایک ایسا عضو ہے جس پر جسمانی صحت کا دارومدار بڑی حد تک ہے، خون صالح تیار کرنے کے بعد تمام اعضاء کو ان کی مناسب خواہش کے تحت سپلائی کرنے کا کام قدرتی طور پر یہی عضو رئیس انجام دیتا ہے۔ جن مریضوں کے جگر خون بنانے کا کام چھوڑ دیتے ہیں اُن کی صحت جسمانی بالکل مضمحل ہو کر رہ جاتی ہے، اور اطباء و معالجین اسکے علاج و معالجہ میں خاص احتیاط اور غور و پرداخت کی ہدایت کرتے ہیں، لیکن آتش سیال اسی کارآمد اور جسم کے فعال عضو کو ماؤف کر دیتی ہے اور صرف ایک ملک میں اسکی ہلاکت خیزیوں کی سالانہ رپورٹ یہ ہے:۔

"کثرت مے نوشی سے ۱۹۵۳ء میں جگر کی بیماری میں ۱۱۸۷۰ نفوس ہلاک ہوئے اور ۱۹۵۴ء میں اسی جگر کی بیماری میں مرنے والوں کی تعداد ۱۲۷۰۱ ہوئی"۔

بندش شراب کے ان باخبر اداروں کے ان اعداد و شمار کی روشنی میں فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ مہلک مشروب جگر کو کس طرح نقصان پہونچا کر نہ صرف لب گور بلکہ ہلاک ہی کر کے چھوڑتا ہے۔ ریاست ٹونک کا مشہور "سلمیٰ پرست" شاعر، اختر شیرانی جیسے اس کے دوستوں نے شراب کی عادت ڈال کر عالم شباب ہی میں تباہ و برباد کیا۔ سوانح نگار نے لکھا ہے کہ:۔

"شراب نے ان کے جگر کو بھون دیا تھا اور جسمانی صحت کے پرخچے اڑا دیئے"۔

(نقوش۔ شخصیات نمبر ۲ صفحہ ۹۰)

یہاں تک کہ مے نوشی کی کثرت کی وجہ سے یہ نوجوان شاعر لاہور میں ہلاک ہو گیا۔ شراب نوشی سے پیدا ہونے والے امراض خصوصاً عارضہ جگر کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"لیل و نہار اسی طرح گذر رہے تھے ایک دن آپ پر ردعمل کی کیفیت طاری ہوئی جس کے نتیجہ میں غثیان و تہوع کی حالت بڑھ گئی، تنفس شدید ہو گیا، جگر نے جواب دے دیا اور آنکھوں پر زردیاں چھا گئیں، مجبوراً میں نے انھیں "میو ہسپتال" میں داخل کرایا۔ وہاں پہلے تو کچھ روز ٹھیک رہے، اچانک ایک روز زیادہ طبیعت بگڑ گئی اور بالآخر ۴۳ سال کی عمر میں ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کی دوپہر کو اپنے وقت سے پہلے زندگی کی دشوار گذار راہوں کا سفر ختم کر لیا"۔ (ایضاً)

• پچھلے دنوں بادہ پرستی کا ہولناک انجام "مجاز" کی موت کی صورت میں سامنے آیا اور "منٹو" کی

عبرت انگیز موت کی تفصیلات اخبار بین طبقہ کو معلوم ہیں۔"

"سکتہ کی بیماری"

بادہ نوشی کے نتیجہ میں ایک اور مہلک بیماری "سکتہ" بھی جان لیوا روگ ثابت ہوتا ہے۔ سستیٔ اعصاب، تشنج اور رعشہ کے بعد سکتہ کا خطرناک عارضہ لاحق ہو کر ہلاک کر دیتا ہے، طب یونانی کی ایک مشہور کتاب میں ہے کہ :-

"شراب ذہن کو بلید کر دیتی ہے، اعصاب کو سست، رعشہ اور تشنج پیدا کرتی ہے اور اکثر شراب پینے والے سکتہ کی بیماری میں ہلاک ہوتے ہیں۔"	تبلد الذهن ويرخي الاعصاب ويحدث الرعشة و يحدث التشنج وكثيراً ما يموت السكران بالسكتة۔
	(نفیسی صفحہ ۲۴۷)

"ضعف قلب"

صحت انسانی کے قیام و بقا میں جہاں اور اعضائے رئیسہ کو دخل ہے ان میں سب سے زیادہ قلب کی طبعی حرکت کو انسانی زندگی کے بقا کا دار و مدار بتایا گیا ہے۔ اس عضو رئیس کی حرکت سے انسانی زندگی تعبیر ہے۔ اندرونی نظام کی یہ متحرک گھڑی جہاں بند ہوئی تو انسان کی موت واقع ہوتی ہے، اسکی حرکت میں اختلال خطرناک آغاز ہے۔ مصنف نے جسمانی زندگی کے نظام میں قلب کو جو اہمیت ہے اسی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

"صحت جسمانی کا مدار، قلب کی حالت و کیفیت پر ہے اگر قلب اور دموی رگیں صحیح حالت پر نہ ہوں گی تو ان سے متعلق قدرتی عمل پورا نہ ہو سکے گا اور جسمانی صحت کا پورا نظام شکست و ریخت ہو جائے گا۔" (الحیوٰۃ والخمر صفحہ ۵)

مصنف نے قلب سے مربوط شریان و عروق کی تفصیل اس کی طبعی رفتار پر مے نوشی کے مہلک اثرات کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

اطبا نے اسی وجہ سے کہا ہے کہ جب شراب	ومن هنا اثبت للعلماء ان الكحول

جسم میں داخل ہوگی تو قلب کو ضعیف کرے	اذا دخل الجسم ادّی الی اضعاف
گی. قلب اور اس سے متعلق اعصاب میں	القلب واثرفیه وفیما یتصل به من
شدید مضرتیں رونما ہوں گی.	الاعصاب تاثیراً تاماً (صـ۲۵ ایضاً)

اور یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوگا کہ جب ۲۴ گھنٹے کے عرصہ میں شراب پینے والا ۱۶ وقیہ (تقریباً ۸۰ تولہ) شراب استعمال کرے گا تو قلب کی حرکت جو ایک گھنٹے میں ۴۲۰۰ مرتبہ ہونی چاہیے تھی طبعی حرکت سے بڑھ جائے گی۔ اور ایک سکنڈ میں "۱۲" مرتبہ حرکت ہوگی. یہ حرکت قلب کی معمولاً رفتار سے زیادہ ہے اور مے نوشی کا خطرناک نتیجہ ہے. اور پھر کچھ مدت میں غیر طبعی مسلسل حرکت، قلب کو ضعیف کردے گی. جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے کہ:۔

مسکرات کے پینے سے قلب سست پڑ جائے	"وقد ثبت انّ ادمان المشروبات
گا اور عضلات ڈھیلے پڑ جائیں گے.	الکحولیه یودی شیأ فشیأ الی
(الخمر والحیوٰة صـ۵۰)	استرخاء القلب وتمدد عضلته"

چنانچہ اسی ضعف قلب کے نتیجہ میں جو عموماً شراب نوشوں کو عارض ہوتا ہے نوے فی صدی اموات واقع ہو رہی ہیں اسی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"علاوہ ازیں آجکل حرکت قلب بند ہونے سے اسقدر زیادہ موتیں واقع ہو رہی ہیں کہ کسی اور مرض سے اتنی نہیں. ایک اندازے کے مطابق ایسی موتیں "۹۰" فیصدی شراب نوشی کا نتیجہ ہوتی ہیں." (انسانیت حیوانیت کے راستہ پر صـ۲۲۶)

"گلے کی خرابی"

حاذق اطباء اور تجربہ کار ڈاکٹروں کا فیصلہ ہو کہ شراب گلے کو بھی سخت نقصان دیتی ہو جس کی وجہ سے نہ صرف آواز بیٹھ جاتی ہے بلکہ گلے میں دائمی خراش، مسلسل کھانسی قائم ہو کر "سل" ایسے موذی مرض کا پیش خیمہ بن جاتی ہے. لکھا ہے کہ

"شراب پینے والے کے گلے میں التہاب و تشنج پیدا ہو جاتا ہے جس سے ہوا کی نالیاں بگڑ جاتی ہیں. یہی وجہ ہے کہ شرابی عموماً کھانسی کے مریض رہتے ہیں اور

ان کی آواز میں خشونت پیدا ہو جاتی ہے، جب بولتے ہیں تو سخت آواز کے ساتھ اور بسا اوقات پھیپھڑہ کی بیماری اور سانس کا مرض "سل" ایسے خوفناک مرض کا باعث ہوتا ہے۔" (الخمر والحیوٰۃ صفحہ ۵۲)

ہندوستان کے ایک مشہور شاعر گلے کی جن شدید بیماریوں میں مبتلا تھے۔ کیا عجب کہ ان امراض کے پیدا کرنے میں اسی زہر کی سمیات کو دخل ہو۔

"فتورِ ہضم"

شراب کے فوائد بیان کرنے والے کہتے ہیں کہ غذا شراب سے خوشگوار ہو کر زود ہضم بن جاتی ہے، اس لیے شراب کا استعمال مفید ہوگا۔ حالانکہ اس شعبہ میں بھی رائے یہی ہے کہ شراب فتورِ ہضم کا باعث بنتی ہے اور قوت ہضم کو سست کرکے اس کے صالح نظام کو درہم برہم کرنے میں اس کو کافی دخل ہے، چنانچہ لکھا ہے کہ:-

"شراب ہضم طعام کے سلسلہ میں بے حد مضر اور مہلک ہے اس لیے کہ یہ معدہ میں پہونچ کر غیر معمولی گرمی اور ہیجان پیدا کرتی ہے یہ تہیج بہت سے امراض پیدا کرتا ہے اور اشتہا کو ساقط کر دیتا ہے، غذا کے کم ہونے پر جسم کو غذا کی اتنی مقدار نہیں پہونچ سکتی جتنی کہ وہ اپنے نظام کو چلانے کے لیے چاہتا تھا، اور غذا کا جو قلیل حصہ پہونچتا بھی ہے تو ہضم کے فتور کی وجہ سے بجائے مفید ہونے کے وہ بھی مضر ہوتا ہے۔" (الخمر والحیوٰۃ صفحہ ۴۱)

شراب میں منافع ثابت کرتے والے برابر کہہ رہے ہیں کہ اس آتش سیال میں غذائی اجزاء بھی ہیں جو تحلیل ہو کر جسم کے لیے بہترین غذا بن سکتے ہیں، شراب میں غذائیت کی تردید کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ:-

"شراب میں ایسے اجزا نہیں ہیں جو غذا کا کام دے سکیں، بلکہ یہ تو جسم کی طاقت کو سلب کرنے والی شے ہو، غذا کا کام اس سے نہیں لیا جا سکتا۔" (ایضاً صفحہ ۴۲)

حالانکہ ہضم کا فتور بلکہ ہاضمہ کا معمولی اختلال و فساد بھی جسمانی صحت کے لیے زبردست مفسد

ہے، جسمانی صحت کی عمارت ہضم کے صالح نظام پر موقوف ہے، غذا اگر ٹھیک طور پر ہضم نہ ہوگی تو جسم کے تمام اعضاء ضروری اور صالح خون کے حاصل کرنے سے محروم رہیں گے جس کے نتیجہ میں پوری صحت و تندرستی کا ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ جائے گا اور طاقت و قوت کے نہ ہونے سے آدمی نکما ہو کر نہ صرف اہل و عیال، قبیلہ و خاندان کے لیے بلکہ معاشرہ اور سوسائٹی کے لیے بار ثابت ہوگا۔ ہضم کے پورے نظام کا اختلال درکنار معمولی سا سوءِ ہضم بھی انسان سے سرور و نشاطِ عمل کو چھین لیتا ہے، معطل زندگی اپنے لیے بھی مصیبت اور معاشرہ کے لیے بھی بلائے بے درماں۔ بہرحال معلوم ہوا کہ شراب سے قوت ہضم بے حد کمزور اور سست پڑ جاتی ہے چہ جائیکہ اس سے استمراءِ طعام وغیرہ کا کام لیا جائے، بعض شراب نوش "بیئر" میں خاص طور سے غذائیت کے قائل ہیں، اگر "بیئر" میں غذائیت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو معمولی غذائیت ان عظیم نقصانات کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتی ہے، جو نقصانات شراب نوشی سے پیدا ہونے والے ہیں۔ اور پھر یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ صالح، غیر مضر اور ارزاں غذاؤں کو چھوڑ کر مضر اور گراں قیمت "بیئر" کو خرید کر پیا جائے، مصنف نے بھی لکھا ہے کہ:-

"کس قدر کھلی ہوئی حماقت اور فضول خرچی ہے کہ آدمی بطور غذا کے "بیئر" کی کثیر مقدار استعمال کرے۔" (ایضاً ص۴۲)

یعنی "بیئر" کو خرید کر پینے والے سوائے حماقت و سفاہت کے اور کس بات کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔

"جسم کی حرارت ختم ہو جاتی ہے"

ایک فائدہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ شراب نوشی سے جسم میں حرارت پیدا ہوتی ہے جس سے جد و جہد کی تحریک اور کام کرنے کی اُمنگ پیدا ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر بادہ پرستوں کا یہ اشہیٰ و اعلیٰ مشروب "فعال" بنانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ لیکن اس دعوے میں کہاں تک سچائی اور واقعیت ہے اسی کا انکشاف کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ:-

"اکثر پینے والے کہتے ہیں کہ شراب جسم کی حرارت بڑھا کر، برودت کو زائل کر دیتی ہے۔

یہ دعویٰ بلا دلیل ہے اور کہنے والے حقیقت سے قطعاً ناآشنا ہیں۔"

(الخمر و الحیوٰۃ ص۹)

طب جدید میں یہ بات طے شدہ ہے کہ جسم کے لیے حصول حرارت کا یہ طریقہ صحیح نہیں کہ جسم سے برودت کو زائل کر دیا جائے، بلکہ غیر مضر اور مفید شکل یہ ہے کہ جسم میں موجودہ حرارت کو باقی رکھنے کی کوشش کیجائے مزید حرارت پیدا کرنا اور پھر شراب ایسے زہر ہلاہل سے قطعاً غلط ہے، اور پھر اس فریب کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ شراب پینے کے ساتھ ہی جو کچھ عارضی آثار چہرہ وغیرہ پر ظاہر ہوتے ہیں حماقت سے اس کو حرارت سمجھ لیا گیا ہے، جو شخص شراب استعمال کرے گا فوری طور پر اس کا چہرہ سرخ ہو جائے گا اور اس کے رنگ پر سرخی دوڑ جائے گی، کیونکہ شراب کی طبیعت یہ ہے کہ وہ جلد کے اندر عروق شعریہ میں اپنا عمل شروع کرتی ہے، کبھی وہ سکڑ جاتے ہیں اور پھر پھیلتے ہیں نتیجہ ان کا یہ ہوتا ہے کہ یہ رگیں خون کا وہ حصہ جو کھینچتی تھیں اس تیزی کے ساتھ سکڑنے اور پھیلنے کی وجہ سے خون کو زیادہ کھینچنے لگتی ہیں اس لیے پینے والا خون کے تیز دباؤ کے ظاہری آثار کو دیکھ کر سمجھتا ہے کہ یہ حرارت شراب کی پیدا کی ہوئی ہے، حالانکہ یہ شعور غلط ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ یہ کیفیت بہت عارضی ہوتی ہے، نشہ کے دور ہوتے ہی رنگ اپنی حالت پر آجاتا ہے اور پھر شراب کے استعمال کا ردعمل شروع ہوتا ہے، اور اگر یہ صحیح ہوتا کہ شراب جسم میں حرارت پیدا کرتی ہے تو ان علاقوں میں جو بیحد بارد اور ٹھنڈے ہیں شراب کی خاص یہ منفعت ظاہر ہونا چاہیے تھی، حالانکہ مشاہدہ اسکے خلاف ہو، مثلاً منطقہ منجمد شمالی اور جنوبی میں شراب کے استعمال کی وجہ سے جسم کی حرارت اور گھٹ جاتی ہے اور اس حرارت کے زائل اور فنا ہونے کی وجہ سے اکثر اموات واقع ہوتی ہیں، یہی وجہ ہو کہ ان دونوں منطقوں میں مزدور پیشہ انسان شراب قانوناً نہیں پی سکتے۔ اس لیے معلوم ہوا کہ شراب جسم میں حرارت پیدا نہیں کر سکتی، بلکہ جو کچھ حرارت ہوتی بھی ہے اسے بھی زائل کر دیتی ہے۔

یہاں پر ایک بات اور بھی سمجھ لینا چاہیے، اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ شرابی کا چہرہ سرخ اور آنکھیں بھی سرخ ہوتی ہیں۔ ہماری اس تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ وہ بھی شراب ہی کا اثر ہوتا ہے اور کیونکہ مسلسل استعمال کیا جاتا ہے تو اسکی وجہ سے یہ آثار بھی دیرپا ہو جاتے ہیں۔ ان کو یہ سمجھنا کہ شراب کی پیدا کردہ حرارت ہے قطعاً غلط ہوگا، اسی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔

"واذا تعاطی الانسان الکحول زمانا طویلاً فان الاوعیۃ الدمویۃ الصغیرۃ المنتشرۃ علی سطح الجلد بعد ان یتوالی

علیھا التمدد باستمرار بتبقی فی ھذہ الحالۃ من التمدد والانبساط ولھذا احمر الوجہ والانف وعینیہ ملتھبتین "۔

(الخمر والحیوٰۃ صفحہ ۶۲)

اور جس طرح یہ غلط ہے کہ شراب جسم کو حرارت پہونچاتی ہے، بلاشبہ یہ بھی بداہتہً خلاف واقعہ ہو کہ شراب سے رنگ صاف ہوتا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ :۔

"شراب سے رنگ بھی صاف نہیں ہوتا، بلکہ خون کے دوران کو تیز کرنے کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لیے چہرہ پر سرخی آجاتی ہے اور پھر نشہ کے زائل ہونے پر وہ سرخی سیاہی سے بدلنے لگتی ہے"۔ (ایضاً)

مقالہ نگار کی اس تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ شراب نہ ہضم طعام کے لیے مفید اور نہ جسم میں حرارت پیدا کرنے کے لیے کارآمد بلکہ اس کے استعمال سے ہزار ہا خطرناک اور جانگسل بیماریاں پیدا ہوتی ہیں جنکی ہلاکت کی تفصیل، اعداد و شمار کی روشنی میں پیش کی گئی ہے، ان اعداد و شمار اور ہماری تفصیلات کے بعد یہ کہنا کہ شراب میں طبی اعتبار سے کچھ منافع ہیں، حقیقت سے کس قدر گریز و انحراف ہوگا۔ اور یہ تو وہ مضرتیں تھیں جن کا تعلق جسمانی صحت سے تھا، شراب اخلاق پر بھی ایک بہت ناگوار اثر چھوڑتی ہے۔ چنانچہ عموماً شرابی ایسے گندے اور مذموم اخلاق کے حامل ہوتے ہیں جو عام طور پر سوسائٹی میں بری نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور جن سے تمام ماحول ہمیشہ پریشان اور مکدر رہتا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ ان اخلاقی بیماریوں کی بھی ایک مختصر سی تفصیل پیش کریں جو مے نوشی کے نتیجہ میں رونما ہوتی ہیں۔

"چوری"

شراب کو حاصل کرنے کے لیے مال و دولت کے تمام ذخیروں کو اس بہتے ہوئے پانی میں صرف کرنے کے بعد شرابی ایسے ذرائع سے بھی چند پیسے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے جو اخلاقی نقطہ نظر سے بہت ناپسندیدہ ہیں، چنانچہ عموماً شرابی چور ہو جاتے ہیں، اور بعض اوقات یہ چوری بہت سے جرائم کی پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ پچھلے دنوں کراچی میں "دنیا کے بادشاہ" گرفتار ہوئے، اخبار نے اس خبر کی تفصیل دیتے ہوئے لکھا تھا کہ :۔

"پولیس نے کل رات صدر سے ایک نوجوان کو جو اپنے آپ کو دنیا کا بادشاہ بتاتا ہے دکان کا شیشہ توڑ کر دوائیاں چراتے ہوئے گرفتار کر لیا، بتایا جاتا ہے کہ جب پولیس نے اس نوجوان کو پکڑ کر اس کا نام پوچھا تو اس نے بادشاہوں کی طرح اکڑ کر مونچھیں اینٹھتے ہوئے ایک زوردار قہقہہ لگا کر کہا کہ میرا نام "دنیا کا بادشاہ ہے" پولیس کے سپاہی نے کئی مرتبہ اس سے نام دریافت کیا لیکن ہر بار اس نے یہی کہا، آخر اسے پولیس تھانے لیجایا گیا لیکن وہاں بھی پولیس افسر اس کا نام معلوم نہ کر سکے، جوان کی حرکات و سکنات کچھ اس قسم کی تھیں کہ پولیس افسر گھبرا گئے اور اس کا معائنہ کرانے کے لیے ہسپتال بھیجدیا گیا، ڈاکٹروں نے معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ یہ نوجوان بہت زیادہ شراب پیے ہوئے ہے۔"

"آزاد" ۳ دسمبر ۱۹۵۶ء لاہور

شاید بعض لوگوں کو شبہ ہو کہ نشہ کی حالت میں ایسی حرکات غیر متوقع نہیں اس لیے ایسے چند واقعات سے شرابیوں پر "چوری" کا الزام کس حد تک صحیح ہوگا، لیکن ہم نے کہا ہے کہ شراب کو حاصل کرنے کے لیے ہر مناسب اور غیر مناسب اقدام کیے جا سکتے ہیں اور چوری سب سے زیادہ قریبی ذریعہ ہو ناجائز طور پر مال و دولت حاصل کرنے کا۔ "الخمر والحیوۃ" کے مصنف نے بھی لکھا ہے کہ:-

"وقد دلت الشواھد فی کثیر من الاحیان علی ان خیانۃ العھود بدأت عند بعض السارقین حین اعوزھم المال لشراء الخمر التی الفوا تعاطیھا ولم یطیقوا اصبرا علی تجنبھا فتاصلت فیھم بذلک عادۃ السرقۃ حتی صار التلصص بعض طباعھم وسجیۃ فیھم (صلا ۹۴)

مطلب یہی ہے کہ شراب کے عادی ہو جانے کے بعد ایسے جرائم کا ارتکاب غیر یقینی نہیں، بعض اوقات شرابی ایسی کم قیمت چیزوں کی بھی چوری کرنے سے گریز نہیں کرتے جو فی نفسہ کچھ حیثیت نہیں رکھتیں لیکن اپنے نشہ اور طلب میں یہ سب کچھ کر گذرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ شرابیوں کی ایک بڑی تعداد جن سے جیلخانے ہمیشہ بھرے رہتے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر چوریوں کے الزام میں ماخوذ ہوتے ہیں، یا پھر بڑے ذلیل طریقے سے دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کریں گے اور چند کوڑیوں کے لیے اپنی عزت و وقار کا پاس تک باقی نہ رکھا جائے گا۔ اس لیے شراب کے استعمال کے نتیجے میں

"گدائی"

اور بھیک کا اختیار کرنا بھی غیر متوقع نہیں، ذیل کا واقعہ ہمارے اس دعوے کی تصدیق کرتا ہو ہندستان کے مشہور شاعر اختر شیرانی جن کا اس سے پہلے بھی ذکر گذرا انھیں کے متعلق سوانح نگار نے لکھا ہے کہ:-

"شراب کے بارے میں وہ اپنے خاص دوستوں کی جیب کو اپنی جیب سمجھتے تھے اور حسنِ طلب ایسا لطیف اور شاعرانہ ہوتا تھا کہ بغیر فرمائش پوری کیے رہا نہیں جاتا تھا، ایک مرتبہ سرما کا مہینہ تھا اور میں باہر دھوپ میں بیٹھا مطب کر رہا تھا کہ دو بلانوش شاعر دوستوں کو ہمراہ لے کر آگئے

ایک صاحب نے فرمایا ع دھوپ میں اپنے مریضوں کو دوا دیتے ہیں

دوسرے صاحب بولے ع اور شاعر کوئی آئے تو بلا دیتے ہیں

اور اختر صاحب نے فرمایا ع اہلِ دل ایسے مسیحا کو دعا دیتے ہیں

اس کے بعد ان شاعروں کے سامنے فرمائش شروع کی اور بوتل کے پیسے لے کر چلتے ہوئے۔" (نقوش شخصیات نمبر ۲ ص ۸۹۳)

اپنے نشہ کو پورا کرنے کے لیے یہ ذلیل گدائی اور بھکاری بننا اسی ام الخبائث کا نتیجہ ہے۔ آہ کہ ایک علمی خانوادہ کا فرد حرام مشروبہ کے لیے سوال کا ہاتھ پھیلا رہا تھا، حالانکہ کہا گیا ہے کہ:-

"السوال ذل"

یعنی سوال ذلت ہے، سڑکوں پر بیٹھنے والے تنومند شہروں میں ہٹے کٹے اصرار والحاح کے ساتھ مانگنے والے بھکاریوں میں ایک بڑی تعداد ان مصنوعی فقیروں کی ہوتی ہے جو مانگ کر سیدھے شراب کی بھٹیوں پر جاتے ہیں اور ٹھرے کی بوتلیں پی کر انسانیت کو بھی ذلیل کرتے ہیں۔ اور اس طرح گداگری کا وہ دروازہ غیر ضروری طور پر کھولتے ہیں جس کو مذموم و معیوب قرار دینے میں مذاہب عالم میں سب سے زیادہ اسلام ہی پیش پیش ہے، یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے؟ اور سوسائٹی کے مہذب افراد اس ذلیل پیشہ کو اختیار کرنے پر کیوں مجبور ہوتے ہیں۔ صرف اسی ام الخبائث کی ناجائز طلب کو پورا کرنے کے لیے جس کو حرام قرار دیا گیا ہے، گویا کہ ایک حرام فعل کے ارتکاب پر ایک دوسرے معیوب و مذموم حربہ سے مدد لی جاتی ہے۔ سوچئے

والے اگر سوچ سکیں تو شراب کی اسلام میں حرمت کی وجہ خاص اس عنوان سے بھی بہت جلد سمجھ میں آسکتی ہے۔ لیکن سکر و نشہ میں کھوئی ہوئی بصیرتیں، اور عقل و دانش اب کہاں اس قابل کہ ان نقاط پر سوچنے کی زحمت گوارا کرے۔ اسی طرح شرابی کذب بیانی و خیانت۔ دروغ بافی اور وعدہ خلافی کے ان امراض میں مبتلا پائے جاتے ہیں جو عالم انسانی اور اخلاقی زندگی میں سخت معیوب کردار ہے۔

"کذب بیانی"

شراب نوشی کے نتیجہ میں بعض اوقات اپنے جرائم کو چھپانے کے لیے اس ہتھیار سے بھی کام لیا جاتا ہے جو اسلامی زندگی سے گذر کر عام اخلاقی زندگی میں بھی بہت معیوب ہے، چنانچہ شراب کے متوالوں کی یہ قبیح ترین عادت اس حد تک پہونچ جاتی ہے کہ وہ ضرورتاً اور بلا ضرورت ہر وقت کذب بیانی، فحش گوئی، خیانت عہد کے مرتکب ہوتے ہیں۔ سید عبد الحمید عدم صاحب کے سوانح میں ہے کہ:۔

"انھیں دنوں عدم صاحب دو تین روز کے لیے اچانک غائب ہو گئے۔ مجھے تشویش ہوئی آخر چوتھے روز آئے اور کہنے لگے کہ حضور ایک چھوٹا سا مقدمہ بن گیا ہے میں حیران ہوا کہ آخر معاملہ کیا ہے، کہنے لگے کہ میں اسی لیے تین چار روز نہ آیا نہیں، حضور بات یہ ہے کو میرے پاس اس دن ایک بوتل رم کی اور کچھ بوتلیں "بیر" کی تھیں "میانمیر" سے کوئی ٹانگہ والا، لاہور آنے کے لیے تیار نہ تھا، سب کہتے تھے کہ کرفیو کا وقت ہونے والا ہے، آخر ایک ٹانگہ والے کو میں نے تیار کر لیا، بوتلیں ساتھ تھیں، راستے ہی میں کرفیو کا وقت ہو گیا، پولیس نے تانگہ والے کا چالان کر دیا، بوتلوں پر قبضہ کر لیا، اور مجھ کو تھانے لے گئے سپرنٹنڈنٹ پولیس کے استفسار پر میں نے بتایا کہ یہ شراب میں اپنے اور اپنے ایک دوست شاد امرتسری کے لیے لے جا رہا تھا۔ حضور آج تاریخ ہے اور آج آپ کو میرے ساتھ کوتوالی جانا ہوگا تاکہ معاملہ ختم ہو اور شراب واپس ملے ورنہ حضور شراب مفت میں حرام ہو جائے گی"۔ (نقوش صفحہ ۱۱۳۹)

ایک معزز اردو شاعر کو کوتوالی میں مجرم کی حیثیت سے پیش ہونا پڑا اور کذب بیانی و دروغ گوئی سے گلو خلاصی کے لیے کام لیا گیا۔ یہ صرف ام الخبائث کی کرشمہ کاریاں ہیں۔

"زنا کاری"

اکثر و بیشتر شرابی، حرام کاری کی لذت کو غیر معمولی طور پر طویل کرنے کے لیے اور بدکاری اور فحاشی میں رنگ رلیاں منانے کے لیے شراب استعمال کرتے ہیں۔ رندی و مستی میں زنا ایسے مذموم فعل کا ارتکاب یقینی ہے، عقل جو حرام و حلال کی تمیز کرتی تھی جب اس کا گلا گھونٹ دیا گیا اور انسانی زندگی کے اس سب سے زیادہ مفید جوہر کمے کشی کے راستہ ضائع کر دیا گیا تو پھر حیاسوز افعال میں مبتلا ہونا غیر متوقع نہیں ہے، حرام کاری لازمہ شراب ہو اور حرام کاری سوسائٹی کے لیے سب سے زیادہ موذی مرض اور بیماری ہے شہوانی جرائم میں شراب کو کس درجہ دخل ہے؟ اسی سوال کا جواب دیتے ہوئے بین الاقوامی ادارہ کے صدر ڈاکٹر رابرٹ پپرسن کہتے ہیں کہ:-

"قتل اور ڈاکہ کے جرائم اور اجتماعی و انفرادی آلام و مصائب کا سب سے بڑا محرک شراب ہے، شہوانی جرائم ۵۰ سے ۵۵، فیصدی تک شراب نوشی کا نتیجہ ہوتے ہیں اور دوسرے جرائم کی تہ میں بھی اکثر شراب نوشی ہی کے اثرات شامل رہتے ہیں۔"

(انسانیت حیوانیت کی راہ پر ص۲۲۴)

زنا کار ممالک میں جہاں شراب لازمہ تہذیب قرار دے کر پوری آبادی کو پلائی جا رہی ہے، ان زنا کار آبادیوں میں ناجائز ولادتیں بکثرت ہو رہی ہیں۔ وسط ۱۹۵۵ء میں برطانیہ کی معاشیاتی ریسرچ کونسل نے جو رپورٹ شائع کی اس میں لکھا ہے کہ:-

"ان ناجائز ولادتوں کا تعلق ضرور اس کثرت مے نوشی سے ہو جو ۱۸ سال سے کم عمر والوں اور والیوں میں جاری ہے۔" (ایضاً)

اسی رپورٹ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ شراب نوشی کے نتیجہ میں جو بدمستی پیدا ہو رہی ہے اس میں بڑی اور چھوٹی عمر والے سب برابر شریک ہیں، لکھا ہے کہ:-

"شراب سے بدمستی جتنی بڑے سن والوں میں ہے اس سے دگنی ۲۱ سال سے کم عمر والوں میں ہے، شراب سے بدمستی جتنی بڑی سن والیوں میں ہو اتنی ہی ۲۱ سال سے کم عمر والیوں میں ہے۔" (ایضاً)

اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ حرام کاری جو نتیجہ ہے شراب نوشی کا اس سے ناجائز توالد و تناسل میں چھوٹی عمر والی لڑکیاں سب سے بڑھ گئیں۔ لکھا ہے کہ :۔

"ناجائز ولادتوں کی ۱۲ سال کی عمر والیوں میں ۹ فی صدی کی زیادتی رہی اور ناجائز ولادتوں میں ۱۱ سال سے کم عمر والیوں میں ۲۳ فی صدی کی زیادتی رہی۔"

بتایا جائے کہ زنا و حرامکاری جو سوسائٹی کے لیے ایک مہلک روگ اور رستا ہوا ناسور ہے اس کے نتیجہ میں جو ناجائز نسل کشی ہوتی ہے جن میں پیدا ہونے والے بچوں کی مائیں ۲۹ فی صدی وہ ہیں جو غیر شادی شدہ ہیں جن کو شرابیوں نے رندی و مستی کی بھینٹ چڑھا دیا یا زناکار ممالک میں یہ لڑکیاں سکر و نشہ میں خود ہی شراب نوشوں کی گرمی آغوش کے لیے تیار ہو گئیں وہ بچے جو پیدا ہو رہے ہیں، اپنی حرامکاری کو چھپانے کے لیے یہ مہذب بیوائیں کیا کریں گی؟

سوائے اس کے کہ اسقاط حمل کی تیز اور مضر ادویہ استعمال کریں، یا معصوم جان کو گلا گھونٹ کر مار ڈالیں یا پھر چلتی گاڑیوں اور راستوں، نالیوں، کھیت اور باغات میں ڈال کر بھاگ جائیں اور کیا کر سکتی ہیں اور پھر یہ بچے یا مر جائیں، زندہ رہ جائیں تو ان کی پرورش کا بار براہ راست حکومتوں پر آ جائے جس کی وجہ سے ملک کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ اسی مد میں صرف ہو، پھر بھی مشفق ماں و باپ کے نہ ہونے سے تربیت و پرورش، جسمانی صحت، اور نشو و نما میں اسقدر نقص رہ جائے کہ تمام عمر قوم کے یہ نونہال اپنے لیے اور پورے معاشرہ کے لیے بلائے جان ثابت ہوں، گویا کہ ایک شراب نوشی کا نتیجہ زنا، معصوم بچوں پر ظلم، ان کی معصوم جانوں کا تلف، بچوں کی ناقص تربیت، ملک اور سوسائٹی کے لیے اتنی تباہ کن شکل میں ظاہر ہوا۔ اور اسی رندی و مستی کے عالم میں غیر محرم عورتوں اور حسین لڑکیوں پر جنسی بھوک کی بے تابی میں بے اختیار نظریں اُٹھتی ہیں جس کو مہذب الفاظ میں

"حُسن پرستی"

سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اختر شیرانی کے حالات میں ہے کہ :۔

"سینما سے انھیں (اختر شیرانی کو) کوئی خاص لگاؤ نہ تھا، پہلے پہل جب متکلم فلمیں لاہور میں آئیں تو میں انھیں تین چار بار لے گیا، لیکن میں نے دیکھا کہ وہ تصویروں کی جگہ حسین

باقی صفحہ پر

اسباب زوال امت — اور مذہب

(عتیق الرحمٰن سنبھلی)

(تیسری اور آخری قسط)

سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو الفرقان بابتہ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۶ھ

آگے بڑھنے سے پیشتر اب ذرا ایک نظر پیچھے کی سمت ڈال کر یہ دیکھ لیجئے کہ نقاطِ بحث کیا کیا تھے، کتنے حصہ پر گفتگو ہو چکی۔ اس کا کیا نتیجہ نکلا۔ اور اب کس کس چیز پر گفتگو ہونا باقی ہے؟

پرویز صاحب کا دعویٰ تھا کہ زوال امت اور مسلمانوں کی موجودہ ذلت و نکبت کا بنیادی سبب یہ ہے کہ انھوں نے قرآن کے لائے ہوئے دین کی پیروی چھوڑ کر مذہب پرستی اختیار کر لی۔ اس دعوے کے پہلے جزو تک بظاہر کوئی بات قابل اختلاف نہ تھی۔ ہم خود یہی سمجھتے ہیں کہ مسلمان جیسے جیسے دین سے دور ہوتے گئے، عزت و اقبال کا سایہ بھی ویسے ویسے اُن کے سر سے ہٹتا گیا۔ مگر دین اور مذہب چوں کہ ہمارے عرف میں دو مترادف الفاظ کے طور پر بولے جاتے ہیں، اور پرویز صاحب نے اپنے دعوے کے دوسرے جزو میں اس زوال کا مثبت سبب مذہب کو ٹھہرایا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ وہ دین اور مذہب میں فرق کرتے ہیں۔ اس لیے یہ دیکھنا پڑا کہ قرآن کا لایا ہوا دین ان کے نزدیک کیا ہے؟ اور اس مذہب پرستی سے ان کی کیا مراد ہے جسے مسلمانوں نے قرآن کی منشاء کے خلاف اختیار کر رکھا ہے؟

اس سلسلہ میں ہمارے سامنے یہ عجیب و غریب انکشاف آیا کہ قرآن نے دین کے عنوان سے جس نظامِ حیات کی دعوت دی تھی اور اسلام کی سب سے پہلی داعی جماعت نے جس چیز کا نام دین سمجھا تھا وہ ہے۔

تسخیر فطرت کی جد و جہد سے متاع ارضی کی تحصیل اور مجموعی ماحصل کی اس انداز سے تقسیم کہ تمام افراد کی بنیادی ضروریات زندگی کے پورا ہونے اور ان کی مضمر صلاحیتوں کے نشو و نما پانے کا سامان فراہم ہو۔

اور مذہب پرستی کے بارے میں معلوم ہوا کہ

آخرت کو دنیا سے الگ، بعد از مرگ والی زندگی سمجھتے ہوئے اسکی کامیابی وخوشحالی کو مقصود بنانا۔ اور اس کی کامیابی کے لیے دنیا وی خوشحالی کے قانون سے الگ قانون ماننا۔ یہ ہے مذہب پرستی۔

دین کی جو حقیقت پرویز صاحب نے واضح فرمائی، یہ الگ بات ہے کہ وہ دنیاوی زندگی میں قوموں کی مادّی طاقت اور خوشحالی کے لیے ایک ضروری چیز ہے اور اس سے غفلت ہی نے مسلمانوں کو موجودہ مادّی ضعف اور بدحالی میں مبتلا کیا ہو مگر، یہ کہنا کہ قرآن نے جس دین کی دعوت دی تھی اسکی حقیقت یہی ہے، ہم نہایت تفصیل اور مختلف پہلوؤں سے غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچ چکے ہیں کہ یہ سراسر بے بنیاد اور انتہائی مہمل و مضحکہ خیز بات ہے۔

اب ہمیں مذہب اور مذہب پرستی کے بارے میں دو باتوں پر غور کرنا ہے۔

(۱) یہ کہ پرویز صاحب جس چیز کو مذہب پرستی سے تعبیر کر رہے ہیں، وہ منشاء قرآنی کیخلاف ہے؟ یا عین مطابق۔

(۲) یہ کہ مسلمانوں کی موجودہ ذلت و نکبت کو اس کا نتیجہ قرار دینا صحیح ہے یا نہیں؟

آخرت کی حقیقت جہاں تک آخرت کے مقصود ہونے کا تعلق ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ پرویز صاحب کو بھی تسلیم ہے کہ قرآن کی رو سے آخرت مقصود حیات ہے۔ البتہ وہ آخرت کے معنی ایک ایسے بیان کرتے ہیں جس کی رو سے آخرت اسی دنیاوی زندگی میں آجاتی ہے۔ اور پھر اس میں کامیابی وخوشحالی کا قانون بھی بعینہ وہی ماننا درست ہوجاتا ہو جو اس دنیا کا عام قانون ہے۔ لہٰذا سوال نمبر ۱ کا صحیح جواب اس پر موقوف ہے کہ آخرت کی حقیقت اور اسکے واقعی معنی کا فیصلہ کیا جائے۔

پرویز صاحب کے تراشیدہ معنی! آخرت کا جو مفہوم پرویز صاحب بیان فرماتے ہیں وہ گذشتہ

بحث میں آپ کے سامنے آچکا ہے۔ اور اس مقام پر یہ بات بھی واضح کی جا چکی ہے کہ پرویز صاحب اسکی کوئی سند نہیں پیش کرتے۔ حالاں کہ دعویٰ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایسا ہو کہ وہ بلا سند کے قابل غور بھی نہیں۔ مزید براں یہ کہ وہ مختلف پہلوؤں سے اتنے اشکالات کو مستلزم ہے کہ اگر بلا سند بھی مان لیجیے تو تھوڑی ہی دیر میں وہ ایک کھلی ہوئی حماقت کا ارتکاب نظر آنے لگتا ہے۔

حیات بعد الممات والے معنیٰ اس کے برعکس لفظ آخرت سے موت کے بعد والی زندگی مراد ہونا خود قرآن سے اس طرح ظاہر ہے کہ پرویز صاحب بھی اس کے اعتراف پر مجبور ہیں (جس کا حوالہ پہلے گزر چکا ہے)۔ پس جب کہ ایک طرف پرویز صاحب کو فی الجملہ یہ تسلیم ہے کہ "آخرت" کا لفظ قرآن میں حیات بعد الممات کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ اور دوسری طرف وہ جن بعض مقامات پر ایک دوسرا مفہوم بیان فرماتے ہیں اسکی ان کے پاس کوئی سند نہیں۔ اور نہ صرف یہ کہ سند نہیں بلکہ اس مفہوم پر لاینحل اشکالات وارد ہوتے ہیں۔ تو عام قاعدہ کے مطابق ان مقامات پر بھی وہی مفہوم برقرار رہے گا جو کسی بھی دوسرے مقام پر مسلّم ہو۔

اس عام قاعدہ کے علاوہ یہ بات کہ آخرت سے موت کے بعد والی زندگی مراد لینے کی صورت میں وہ تمام اشکالات ختم ہو جاتے ہیں جو دوسری صورت میں پیش آتے تھے، خود اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آخرت کا صحیح اور واقعی مطلب یہی ہو

ان سب پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اس میں کیا شبہ رہ جاتا ہو کہ آخرت اور حیات اخروی سے مراد قرآن میں قطعی طور پر موت کے بعد والی زندگی ہی ہے؟

مذہب پرستی اور قرآن آخرت کی حقیقت کے بارے میں فیصلہ کا یہ مرحلہ طے کر لینے کے بعد آئیے اس سوال کی جانب توجہ کیجیے جس کے بارے میں صحیح نتیجہ تک پہونچنے کے لیے آخرت کی حقیقت معلوم کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔

سوال یہ تھا کہ پرویز صاحب جس چیز کو مذہب پرستی کہتے ہیں (یعنی آخرت کو دنیا سے الگ بعد از مرگ والی زندگی سمجھتے ہوئے اسکی کامیابی کو مقصود بنانا اور اسکی کامیابی و خوشحالی کے لیے دنیاوی خوشحالی کے قانون سے الگ قانون ماننا) وہ منشاء قرآنی کے خلاف ہے یا

عین مطابق ہو؟ ——— آخرت کی مقصودیت تو پرویز صاحب کو بھی تسلیم تھی! کہ وہ روح دین اور اساس دین ہے۔ سوال آخرت کی حقیقت کا تھا کہ پرویز صاحب اسے حیات بعد الممات نہیں مانتے تھے، سو معلوم ہو چکا کہ قرآن کی جن آیات میں آخرت پسندی کی ترغیب و تحسین ملتی ہے ان میں بھی آخرت سے مراد حیات بعد الممات ہی ہے۔ پس اب ظاہر ہے کہ آخرت (یعنی حیات بعد الممات) کی کامیابی کو مقصود بنانا منشاء قرآنی کے عین مطابق ہوگا۔ بلکہ یہ کہنا حق ہوگا کہ یہی روح دین اور اساس دینی ہے۔

رہا آخرت کی کامیابی کے لیے دنیا کی کامیابی کے قانون سے الگ قانون ماننا، تو یہ تو آخرت کو دنیا سے الگ (بعد از مرگ والی زندگی) ماننے کا لازمی نتیجہ ہے۔ اگر وہ حق ہے تو یہ بھی حق!۔

الغرض پرویز صاحب جس چیز کو "مذہب پرستی" اور قرآن کی منشاء کے خلاف قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں عین منشاء قرآنی اور قرآن کے پیش کردہ دین کی روح و اساس ہے۔

مذہب اور زوال اُمّت

اب آئیے یہ دیکھیں کہ کیا یہی چیز مسلمانوں کے زوال اور ان کی موجودہ ذلت و نکبت کا اصل سبب ہے۔

یہ سوال واقعاتی ہے، محض ذہنی اور منطقی نہیں۔ اس لیے ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ اس "مذہب" اور کسی امت کے زوال میں علت و معلول کا منطقی علاقہ پایا جاتا ہے یا نہیں۔ بلکہ دیکھنا صرف یہ ہے کہ کیا واقعاتی طور پر مسلمانوں کے زوال کا سبب یہی چیز بنی ہے؟ ———

اس طور پر جب ہم صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم حیران رہ جاتے ہیں، اگر کوئی شخص مسلمانوں کے زوال کا سبب ان کی مذہب پرستی (یعنی حیات بعد الممات کے معنیٰ میں "آخرت پسندی") کو بتاتا ہو اور سوچنا پڑتا ہے کہ کہنے والا آخر کس دنیا کی بات کر رہا ہے؟ جہاں تک ہماری اس دنیا کا تعلق ہے، ہم نہیں دیکھتے کہ خال خال افراد کے سوا، امت میں من حیث الامت کہاں آخرت پسندی پائی جاتی ہو۔ عقیدہ یہ ضرور ہے کہ آخرت ہی کی زندگی اصل زندگی ہے۔ اور اسی کی کامیابی انسان کی حقیقی کامیابی! مگر حال یہ ہے کہ امت سر سے پاؤں تک دنیا طلبی میں ڈوبی ہوئی ہے۔

ہر فرد دنیا کو چند روزہ مانتے ہوئے بھی دن رات اسی کو بنانے کی فکر میں ہے۔ اور عقیدہ آخرت کے تقاضے پس پشت پڑے ہوئے ہیں، مسلمانوں کے جس ملک میں بھی جا کر دیکھ لیجئے اُن کے تمام طبقے ہمہ تن دنیا میں غرق اور آخرت کو یکسر بھولے ہوئے ہیں۔ بس خال خال افراد ہیں جن کے دم سے ایمان بالآخرت کی لاج ہے —— یہ ایک ایسی عریاں حقیقت ہے جس سے اس دنیا کا کوئی رہنے والا انکار نہیں کر سکتا۔

حال سے ماضی میں جائیے اور تاریخ کی ورق گردانی کیجئے تو ماضی کے دور میں جہاں تک آپ کو زوال اور ذلت و نکبت کے آثار ملیں گے وہاں تک آپ یہی دیکھتے چلے جائیں گے کہ آخرت طلبی (حیات بعد الممات کی فکر) غائب ہے اور دنیا طلبی غالب۔ پھر بھی اگر کسی کو مسلمانوں کے زوال کا سبب آخرت پسندی نظر آتی ہے تو کیا ٹھکانا ہو اس بے بصری کا، کہ جو چیز تقریباً مفقود رہی وہ ایک سبب کی حیثیت سے کارفرما بتائی جا رہی ہے!

زوال کا واقعی سبب

امت کا مادی زوال، جس کے اسباب گفتگو ہے، اس کا ظاہری اور قریبی سبب تو ظاہر ہے اُن ذرائع اور اُن کوششوں سے غفلت ہے جو قوموں کو زمانہ کی ضرورت کے مطابق قوت اور ثروت بخشتی ہیں۔ پھر اس غفلت کا سبب تلاش کیجئے۔ کہ یہ کیوں کر پیدا ہوئی؟ تو واقعات کی روشنی میں یہ کہیں نہیں نظر آئے گا کہ جن لوگوں پر اُن ذرائع اور اُن مساعی کو عمل میں لانے کی ذمہ داری تھی (یعنی ارباب اقتدار) وہ آخرت پسندی کے اثر سے، اِن امور کو لایعنی قرار دے کر چھوڑ بیٹھے۔ بلکہ صورت واقعہ صاف صاف یہ نظر آئے گی کہ وہ تن آسانی، عیش کوشی اور لذائذ سے لطف اندوزی میں ایسے غرق ہوئے کہ اس کا بھی خیال نہ رہا کہ موجودہ قوت و ثروت کو مستقبل میں برقرار رکھنے کے لیے کیا کرنا ضروری ہے۔

یہ ہیں سلسلہ اسباب زوال کی دو کڑیاں —— اوپر سے نیچے کی جانب چلتے ہوئے —— اب اگر آپ مزید گہرائی میں جانے کی کوشش کریں تو تیسرے درجہ میں ایک کڑی اور سامنے آجائے گی۔ سوال یہ پیدا ہوگا کہ ارباب اقتدار کے لیے یہ عیش کوشی کی راہ کہاں سے کھلی اور انھیں یہ موقع کیوں کر مل گیا کہ وہ اپنی عشرت پرستیوں میں بے روک ٹوک مست رہیں خواہ قوم کا بیڑا ہی کیوں نہ غرق ہو جائے؟ اس سوال کے جواب میں نظر، اسلامی حکومت کے طرز

میں اس عظیم تاریخی تغیر پر جاتی ہے جو ملوکیت کی شکل میں رونما ہوا جس میں حکومت ایک شخص اور ایک خاندان کی جاگیر ہوجاتی تھی کہ وہ چاہے تو حکومت کے وسائل کو قوم کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرے اور چاہے تو ان وسائل کو اپنی عیش کوشی میں لگا کر قوم کا مستقبل تاریک کردے۔

گویا یہ سلسلہ اسباب زوال کی تیسری کڑی ہے۔ اور اسی پر زوال امت کے ظاہری (یا خارجی) اسباب کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے۔ اس طور پر کہنا چاہیئے کہ زوال امت کا بنیادی سبب امت کے نظام حکومت کی وہ تبدیلی ہے جو ملوکیت کی شکل میں رونما ہوئی جس کے نتیجہ میں نہ صرف مادی زوال آیا بلکہ امت کی زندگی میں رفتہ رفتہ ہر پہلو فساد رونما ہوگیا۔

پرویز صاحب کی تلبیس

اس نکتہ کو پرویز صاحب بھی سمجھ رہے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اسلامی حکومت میں ملوکیت کا رجحان حیات اخروی (حیات بعد الممات) کو مقصود بنانے سے نہیں پیدا ہوا۔ کوئی نہیں جو اتنی نامعقول بات کہہ سکے کہ ملوکیت جو حبِ دنیا کا انتہائی مظہر ہے وہ نتیجہ ہو حب آخرت کا۔ بلکہ لاریب اس رجحان کا سبب دنیا کی محبت بنی جو بعض افراد میں غالب ہوگئی تھی۔ علیٰ ہذا یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ قومی عزت و خوشحالی کے لیے جو اسبابی جد و جہد ضروری تھی اس کو آخرت طلبی کے خلاف سمجھ کر ترک کردینے کے نتیجہ میں ملوکیت کا رجحان پیدا ہوا ہے کیوں کہ نہ تو واقعۃً ایسا ہوا کہ ملوکیت کے وجود میں آنے سے قبل امت اسبابی جد وجہد سے دست کش ہوگئی ہو۔ اور نہ ان دونوں باتوں میں کوئی جوڑ ہے کہ ایسا ہو تو اسکے نتیجہ میں ایسا ہوجائے ــــــ اسی لیے پرویز صاحب کو مذہب کو باعث زوال امت قرار دینے میں انتہائی تلبیس سے کام لینا پڑا جس کی تفصیل یہ ہے۔

زوال کے اسباب پر گفتگو کرنے سے پیشتر انھوں نے امت کے گزشتہ عروج اور اس کی ابتدائی دور کی عظمت و شوکت کا راز بیان کیا تھا۔ وہ راز یہ بتایا گیا تھا کہ اس دور کے مسلمان دین کی حقیقت یہ سمجھتے تھے کہ "متاع ارضی کے حصول کی بھرپور جد وجہد کی جائے اور پھر ما حصل کو تمام افراد کے درمیان ان کی بنیادی ضروریات کے لحاظ سے تقسیم کردیا جائے"۔ اور اسی کے مطابق عمل کرتے تھے۔ جب عروج کا راز یہ تھا تو کھلی ہوئی بات ہے کہ زوال کا سبب یہ ہوا ہوگا کہ متاع ارضی کے حصول کی جد وجہد چھوڑ دی گئی۔ اب اگر پرویز صاحب کی تحقیق میں

اس تحریک جدوجہد کی وجہ (یعنی زوال کا بنیادی سبب) یہ تھی کہ مسلمان موت کے بعد والی زندگی کو اصل مقصود سمجھنے لگے اور دین صرف ان اعمال کو سمجھنے لگے جو آخرت میں کام آویں (یعنی مذہب) تو قاعدہ سے ان کو عروج کا راز بیان کرنے کے بعد بات اس طرح شروع کرنا چاہیے تھی کہ اسکے بعد بدقسمتی سے مسلمانوں میں "مذہبیت" کے جراثیم پیدا ہو گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ الخ مگر چونکہ واقعہ یہ نہیں تھا کہ مسلمان تارک الدنیا ہو گئے ہوں۔ بلکہ وہ تبدیلی جس کی بدولت اُن کا آفتاب عروج مائل بزوال ہوا یہ تھی کہ ان میں دنیا کی محبت غالب ہو گئی اور اس کے نتیجہ میں اُن کے نظام حکومت میں ملوکیت نے راہ پالی۔ اس لیے پرویز صاحب نے امت کے عروج کا راز بیان فرمانے کے بعد، اس بات سے "گریز" کے لیے جو سیاق کلام کی مناسبت سے، اسباب زوال کے سلسلہ میں اُن کو کہنا پڑتی، یہ غیر متعلق ٹکڑا لگا یا کہ

"یہ تھا دین جس میں نہ ملوکیت کی سیادت تھی، نہ مذہبی پیشوائی کی قیادت نہ طبقات کی تقسیم تھی، نہ بساط زندگی کی ناہمواریاں، نہ دنیا آخرت سے الگ تھی نہ حال مستقبل سے جدا۔" ص ۵۳

اور (اس "حسن تخلص" کے بعد) اسباب زوال کا بیان اس طرح شروع کر دیا کہ —— اس کے بعد

"وہی قوم تھی اور اُن کے ہاتھوں میں وہی قرآن۔ لیکن اب ایک طرف ملوکیت اپنے پورے جبروت و اقتدار کے ساتھ مسلط تھی اور دوسری طرف مذہبی پیشوائیت اپنے کامل تقدس اور طمطراق کے ساتھ مستولی" الخ ص ۵۴

اور پھر "مذہب" کو 'مذہبی پیشوائیت (PRIESTHOOD) کے ایک انسٹی ٹیوشن (INSTITUTION) کے معنیٰ میں بول کر یاں طور زوال امت کا سبب قرار دیا کہ اس نے ملوکیت سے ساز باز کر کے اس کے استحکام و بقا کے لیے طرح طرح کے حربے اختیار کیے اور لوگوں کو مذہب کے نام پر مختلف اصول و احکام کے فریبوں میں مبتلا کر کے ملوکیت کو اپنی مفاد پرستیوں میں بے زمام ہونے کا موقع فراہم کیا۔

یہ ہے وہ ایچ پیچ اور لفظی مغالطہ انگیزی جس کے ذریعہ پرویز صاحب یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ زوال امت کا سبب مذہب ہے۔

حالانکہ مذہب اس معنیٰ میں زیر بحث نہیں تھا۔ بلکہ مذہب پر گفتگو آخرت پسندی اور آخرت کی کامیابی کے لیے دنیاوی کامیابی کے طبعی قانون سے الگ قانون ماننے اور اس کا اتباع کرنے کے معنیٰ میں تھی۔ اور اس لحاظ سے پرویز صاحب کو تاریخی طور پر دکھانا یہ تھا کہ مسلمانوں میں مادّی ترقی کی جد وجہد سے دستکشی آخرت کی کامیابی کو مقصود بنانے اور اس کے لیے دنیاوی کامیابی کے طبعی قانون سے الگ قانون ماننے کے نتیجہ میں پیدا ہوئی۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ یہ نہیں دکھا سکتے تھے چنانچہ انھوں نے گفتگو کے ابتدائی موقف سے ہٹ کر یہ نیا موقف اختیار کر لیا۔

پرویز صاحب کا نظریہ عقل کی کسوٹی پر

حقیقت یہ ہے کہ اسباب زوال امت کے بارے میں پرویز صاحب کا اصولی نظریہ واقعاتی نقطۂ نظر سے جس قدر بے اصل ہے، خالص منطقی نقطۂ نظر سے بھی اسی قدر غلط اور بے وزن ہے۔ اصولی طور پر وہ دنیا اور آخرت کو دو الگ الگ دنیائیں ماننے اور ان میں کامیابی کے لیے الگ الگ کچھ خاص قوانین اور طریقوں کا قائل ہونے کو افراد اور اقوام کی ذلت و پسماندگی کا بنیادی سبب قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ مادّی ذلت و پسماندگی قوانین طبعیہ کی رو سے موقوف ہے اس بات پر کہ قوت و خوشحالی کے طبعی اسباب سے دستکشی اختیار کی جائے۔ اور دنیا و آخرت کو الگ الگ دنیائیں ماننے اور دونوں میں کامیابی کے لیے کچھ خاص الگ الگ قوانین اور تدابیر کا قائل ہونے سے یہ قطعاً نہیں لازم آتا کہ کوئی فرد یا قوم قوت و خوشحالی کے طبعی اسباب سے دستکش ہو جائے ــــ

آخر اس میں کیا استبعاد ہے کہ ایک شخص دنیاوی کامیابی (مادّی قوت و خوشحالی) کے طبعی قوانین کے مطابق جد وجہد بھی کرے، اور اُخروی کامیابی کے قانون کے مطابق اُن اعمال پر بھی کاربند ہو جن کے مجموعہ کا نام مذہب رکھا جاتا ہے؟ دنیاوی کامیابی کے طبعی قوانین کا اتباع کوئی اس پر موقوف تو ہے نہیں کہ آدمی اُخروی کامیابی کا ذریعہ بھی انھیں قوانین کے اتباع کو سمجھے!

ہاں ان دونوں قسم کی کوششوں کا اجتماع، اس صورت میں بے شک، عملاً نہیں ہو سکے گا جب کہ آدمی مذہب کو اپنانے کا فیصلہ کرے اور مذہب مادّی قوت و خوشحالی کی جد وجہد سے دستکشی کا حکم دے۔ کوئی مذہب اگر ایسا حکم دیتا ہے اور اس جد وجہد کو آخرت کی کامیابی کی راہ کا روڑا قرار دیتا ہے تو بے شک آپ کہیے کہ اس مذہب میں انسانوں کی دنیاوی ذلت و تباہی مضمر ہے۔

مگر یہاں بحث ہے مسلمانوں کے مذہب (یعنی اسلام) کی۔ اور وہ بے شک تسخیر فطرت کی جد وجہد کا نام نہیں۔ بلکہ اس کے اجزاء اصلیہ ہیں، عبادت، اخلاق، اور عدل۔ مگر وہ تسخیر فطرت کی جد وجہد اور مادی قوت وخوشحالی کے طبعی قوانین کے اتباع سے اپنے پیرووں کو ہرگز نہیں روکتا۔ بلکہ وہ اپنی سربلندی اور کفر کی سرکوبی کے لیے صریح حکم دیتا ہے کہ قوت وہیبت اور غلبہ وعزت کے تمام ممکنہ اسباب جمع کرو کہ کفر کو کبھی پرچم اسلام کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی مجال نہ ہو۔ اب اگر اس کے نام لیوا تسخیر فطرت اور حصول اسباب قوت وشوکت کی جد وجہد سے غافل ہو گئے تو اس کا الزام ان کے مذہب کو کیونکر دیا جا سکتا ہے؟ جبکہ یہ بھی معلوم ہے کہ غفلت کے اس دور میں اُن میں فکر آخرت اور مذہبی اعمال سے رغبت کچھ بڑھتی نہیں بلکہ برابر گھٹتی رہی ہے۔ اور تاریخ کا مطالعہ اس بات پر شاہد ہے کہ ان کی یہ غفلت اُخروی کامیابی کی دُھن بڑھ جانے کا نہیں بلکہ قریبی مفادات اور ذوق عیش وعشرت میں ڈوب کر "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کے نظریہ پر عمل پیرا ہو جانے کا نتیجہ ہے۔

اصل مقصد اس کھلی ہوئی حقیقت کے باوجود پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ امت مسلمہ کی دنیاوی ذلت وبدحالی کا اصلی سبب مذہب ہے اور وہ قرآن کا پیش کردہ نہیں، بلکہ ملوکیت کے دوش بدوش قائم ہو جانے والی مذہبی پیشوائیت اور پاپائیت کا گڑھا ہوا ہے۔ اس کا مقصد بجز اس کے کیا سمجھا جائے کہ ان کے پیش نظر اصل سوال امت کے عروج وزوال کے اسباب کا نہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کسی طرح مذہبی اعمال کے دائمی "کھڑاگ" اور مذہب کی عائدکردہ پابندیوں سے نجات مل جائے۔ اور یہ یونہی قیاس آرائی نہیں بلکہ ان کی اسی کتاب کے متعدد صفحات اس کے گواہ ہیں کہ ان پر اسلام کی اخلاقی ومعاشرتی پابندیاں بے حد گراں بار ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی "خداداد بصیرت" کا پورا زور لگا کر اسلام کی تمام تعلیمات وہدایات کو انسان کی معاشی زندگی سے متعلق کر دیا ہے۔ حد یہ ہو کہ "تقویٰ" اور "اتقا" جو اسلام اور قرآن کی تعلیمات میں ان تمام پابندیوں کا اجمالی عنوان ہے، پرویز صاحب کی بصیرت کرشمہ ساز کی دست درازی سے وہ بھی نہ بچ سکا۔ اور اس کا مطلب ہو گیا

"معاشی زندگی کو آسمانی[1] قوانین سے ہم آہنگ کرنا"

[1] "آسمانی قوانین" کے لفظ سے دھوکا نہ ہو مراد طبعی قوانین ہیں

مثال کے طور پر کتاب کے صفحہ ۲۰۰ پر نظر ڈالیے اور دیکھ لیجئے کہ دل و نظر کی آوارگی اور راگ و رنگ پر عائد کردہ اسلام کی پابندیوں سے ان کی طبع حسن پرست کس قدر نالاں ہے۔ "مذہب پرست" لوگوں کی "کور ذوقی" پر ماتم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"انھیں ہر حسین شے سے کراہت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر تبسم فشاں چہرہ انھیں موت کا آئینہ دار اور ہر گلفشاں پیشانی انھیں جہنم کا کندہ دکھائی دیتی ہے، جب بہار خوشی کے جھولے جھولتی ہے تو وہ ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں، جب چاندنی مسکراتی ہے تو وہ منھ بسور لیتے ہیں ....

ادب، موسیقی، آرٹ، سائنس، زیبائش و آرائش کے شگفتہ اسباب و ذرائع ان کے مذہب میں حرام ہوتے ہیں۔"

وہ چاہتے ہیں کہ جب بہار خوشی کے جھولے جھول رہی ہو اور چاندنی مسکرا رہی ہو تو انھیں حسین چہروں کے ساتھ بہار کی راتوں میں، چاندنی کے مزے لوٹنے کی اجازت دی جائے۔ اور تہذیب حاضر کے مطابق زیبائش و آرائش اور موسیقی اور آرٹ (جس میں ساری بے حیائیاں داخل ہیں) سے لطف اندوز ہونے پر کوئی پابندی نہ عائد کی جائے۔ انھوں نے دیکھا کہ اسلام ان امور میں پابندیاں عائد کرتا ہے تو کہہ دیا کہ یہ پابندیاں اللہ کے دین میں نہیں مُلّا کے گڑھے ہوئے دین میں ہیں رہا اللہ کا دین تو وہ

"کائنات کے حسن سے بہرہ یاب ہونے اور اس حسن میں نت نئے اضافے کرنے کی تعلیم دینے آتا ہے"

تو گویا اب بات اس حد پر بھی نہیں رہی کہ دین کو ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں، وہ تو بس معاشی جد وجہد کا ایک نظام ہے، بلکہ وہ حسن پرستی کا معلم اور آرٹ اور موسیقی کا داعی بن گیا ـــــ یہ ہے اصلی اصلی بات اعروج و زوال کا فلسفہ تو بس برائے بیت ہے۔

یہ آرٹ اور موسیقی کا دین جس کی طرف پرویز صاحب اپنی قوم کو بلا رہے ہیں۔ اس کے زوال کو عروج سے بدلے گا یا مزید باعث زوال ہو گا؟ اس کا جواب ہمیں دینے کی ضرورت نہیں جس مظلوم اقبال کے پرویز صاحب واحد اجارہ دار بنے ہوئے ہیں، اُسی کا شعر ہے

آ تجھ کو بتا دوں میں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

ماہِ مبارک کا استقبال

مدیر الفرقان کی ایک تقریر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ لقد جاءت رسل ربنا بالحق۔ صلوات اللہ تعالیٰ علیہم وعلی کل من اتبعھم باحسان الی یوم الدین

حضرات! اللہ کی رحمتوں اور برکتوں والا مہینہ رمضان قریب ہے، بلکہ گویا آچکا ہے۔ اگرچہ ہم جیسے عوام کی آنکھیں اس مبارک مہینہ میں اور دوسرے گیارہ مہینوں میں کوئی خاص فرق نہیں دیکھتیں بلکہ ظاہری نظر میں رمضان کے دن اور رات بھی اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت رمضان اور دوسرے مہینوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ اتنا بڑا فرق کہ اگر وہ ہم پر کھل جائے تو رمضان کی آمد پر ہم کو کچھ اس قسم کی خوشی اور مسرت ہوا کرے جیسی کہ پانی کے جانوروں کو سخت قحط اور خشکی کے بعد بارش کا موسم شروع ہونے سے ہوتی ہوگی۔ یا شاعروں کی زبان میں جیسی خوشی بلبل کو فصلِ بہار آنے پر ہوتی ہے ــــــ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رمضان مبارک کا بڑے اشتیاق کے ساتھ انتظار رہتا تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ جب آپ رجب کا چاند دیکھتے تو اللہ تعالیٰ سے دعا فرماتے کہ اللھم بارک لنا فی رجب و شعبان و بلغنا رمضان (اے اللہ ہمارے رجب اور شعبان کو ہمارے واسطے مبارک کر اور رمضان تک ہمیں پہنچا دے) اور رجب شعبان شروع ہوتا تو آپ کثرت سے روزے رکھنے شروع کر دیتے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رمضان کے علاوہ سب مہینوں سے زیادہ روزے آپ شعبان میں رکھتے تھے، بلکہ کبھی کبھی تو پورا مہینہ گویا روزوں ہی میں گزر جاتا تھا۔ دراصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ روزے رمضان ہی کے اشتیاق میں اور اسی کی تیاری کیلئے اور اُس کی رحمتوں اور برکتوں کے استقبال کے واسطے ہوتے تھے۔

پھر جب رمضان بالکل قریب آتا تو آپ اس کی فضیلتوں اور برکتوں پر مستقل خطبے دیتے اور صحابۂ کرام کو اس کی قدردانی اور اس کی رحمتوں کے استقبال کے لئے تیار کرتے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سلسلہ کے بعض خطبے حدیث کی کتابوں میں بھی محفوظ ہو گئے ہیں، اگر ہم میں طلب اور عزم ہو تو ان خطبات نبوی کی رہنمائی میں رمضان مبارک کی وہ رحمتیں اور برکتیں کسی درجہ میں ہم بھی ضرور حاصل کر سکتے ہیں جو ان خطبوں کے براہِ راست سننے والے صحابہ کرام حاصل کرتے تھے۔

اس سلسلہ کا سب سے بڑا اور مفصل خطبہ تو وہ ہے جس کو حضرت سلمان فارسیؓ کی روایت سے بیہقی وغیرہ محدثین نے روایت کیا ہے اور وہ مشکوٰۃ شریف میں بھی ہے — حضرت سلمانؓ راوی ہیں کہ ایک دفعہ شعبان کی آخری تاریخ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور اس میں ارشاد فرمایا۔

ایھا الناس قد اظلکم شھر عظیم شھر مبارک شھر فیہ لیلۃ خیر من الف شھر۔

اے لوگو! ایک بڑی عظمتوں اور برکتوں والا مہینہ تم پر سایہ افگن ہو رہا ہے، اس مبارک مہینہ کی ایک رات (شب قدر) ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

حضورؐ کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ شب قدر عموماً رمضان ہی میں ہوتی ہے، اور شب قدر کی یہ فضیلت کہ "وہ ہزار مہینوں سے بہتر ہے" (خیر من الف شھر) ان ہی لفظوں میں قرآن پاک میں بھی بیان فرمائی گئی ہے، اس کے بعد آپ نے فرمایا۔

جعل اللہ صیامہ فریضۃ وقیام لیلہ تطوعاً، من تقرب فیہ بخصلۃ من خصال الخیر کان کمن ادی فریضۃ فیما سواہ ومن ادی فیہ فریضۃ کان کمن ادی سبعین فریضۃ فیما سواہ۔

اللہ تعالیٰ نے اس پورے مہینہ کے روزے فرض کئے ہیں اور اسکی راتوں کی نماز (تراویح) کو کار ثواب قرار دیا ہے (یعنی اسکو فرض تو نہیں کیا ہے لیکن اس میں بڑا ثواب رکھا ہے) جو شخص اس مہینہ میں اللہ کی کوئی غیر فرضی عبادت کرے (یعنی سنت یا نفل ادا کرے) اسکو دوسرے زمانہ کی فرض عبادت کی برابر اس کا ثواب ملیگا اور جو شخص اس مہینہ میں فرض عبادت ادا کرے گا اسکا ثواب دوسرے مہینوں کے اسی جنس کے ستر فرضوں کے برابر ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ یوں ہی سُن کر گزر جانے کے نہیں ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم ان پر دھیان کریں اور ان میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اپنے دل و دماغ میں اس کا یقین بٹھائیں آپکے اس ارشاد کا

مطلب اصح ہے، اس میں خاص طور سے ہم جیسے دین کے مفلسوں کیلئے بڑی بشارت ہے، فرمایا گیا ہے کہ رمضان میں تمام عبادات اور اعمال صالحہ کا اجر و ثواب بہت بڑھا دیا جاتا ہے، نوافل کا ثواب فرضوں کے برابر کر دیا جاتا ہے اور فرائض کا ثواب ستر گنا بڑھا دیا جاتا ہے، مثلاً رمضان میں فجر کی جو دو رکعتیں پڑھی جائیں گی ان کا ثواب غیر رمضان کی دو رکعتوں سے ستر گنا زیادہ ہوگا، گویا ایک سو چالیس رکعت کے برابر ہوگا۔ علیٰ ہذا زکوٰۃ کے جو دس روپے مثلاً رمضان میں نکالے جائیں گے اُن کا ثواب دوسرے زمانے کے سات سو روپے کے برابر ہوگا۔ اور اسی طرح نفلی عبادات جن کا ثواب فرض عبادات کے مقابلہ میں بہت کم ہوتا ہے، رمضان مبارک میں ان کا ثواب بڑھا کر فرضوں کے برابر کر دیا جاتا ہے۔ بس ہم جیسے کم ہمت لوگ جو اللہ کے خاص عبادت گذار بندوں کی طرح ہمیشہ زیادہ عبادتیں نہیں کر سکتے۔ ان کے لئے یہ ماہ مبارک خاص رحمت کا موسم ہے، اگر اس ایک مہینہ کے لئے وہ ہمت کی کمر کس لیں تو بھی بہت کچھ کمائی کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد حضور نے ارشاد فرمایا۔

هو شهر الصبر والصبر ثوابه الجنة وشهر المواساة وشهر يزاد فيه رزق المومن۔

یہ رمضان صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ بس جنت ہے اور یہ ہمدردی اور غمخواری کا مہینہ ہے اور یہ وہ مہینہ ہے جس میں ایمان والوں کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے۔

ان جملوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کو صبر کا، ہمدردی و غمخواری کا اور رزق میں زیادتی کا مہینہ بتلایا ہے۔

صبر اس کا نام ہے کہ آدمی کسی اعلیٰ مقصد کی خاطر اس چیز کو برداشت کرے جس میں اس کو تکلیف ہو اور جو اس کی طبیعت کو ناگوار ہو۔ یہ انسان کی بہت اونچی صفتوں میں سے ہے اور بڑی زبردست طاقت ہے اور دین میں اور اللہ کی نگاہ میں اس کی بڑی فضیلت ہے۔ کہیں فرمایا گیا ہے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ۔ "اللہ تعالیٰ صبر والوں کے ساتھ ہے" کہیں فرمایا گیا ہے۔ "وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصَّابِرِيْنَ"

لہ زکوٰۃ نکالنے والوں کیلئے بہتر ہے کہ وہ حساب لگا کر اپنے پورے مال کی زکوٰۃ رمضان میں نکال لیا کریں پھر اسکے صرف کیلئے جو مناسب موقع رمضان میں سامنے آئیں ان میں صرف کریں اور جو باقی بچ جائے اس کو محفوظ رکھیں اور حسب موقع دوسرے مہینوں میں صرف کریں۔ انشاء اللہ اس کی پوری زکوٰۃ رمضان ہی کے حساب میں شمار ہوگی۔ ۱۲

(اللہ تعالیٰ صبر والوں سے محبت کرتا ہے) اور اسی خطبہ میں فرمایا گیا ہے کہ صبر کا بدلہ جنت ہی، بہرحال صبر انسان کے اونچے کمالات میں سے ہے اور رمضان میں اسی صبر کی مشق ہے۔ بندہ اللہ کے حکم کی تعمیل میں اور اس کی رضا کے لئے کھانے پینے سے اور نفسانی خواہش سے پورے ایک مہینہ کے دنوں میں اپنے کو روک کر صبر کا عمل کرتا ہے۔ اور صبر کی صفت اپنے اندر پیدا کرتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسکے واسطے جنت کی بشارت ہے ــــــ اور ماہ رمضان کے "ہمدردی اور غمخواری کا مہینہ" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینہ میں ہر روزہ دار کو بھوک پیاس وغیرہ کی تکلیف کا تجربہ ہوتا ہے تو ان کو اسکا احساس ہوتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے جن بندوں کو ناداری کی وجہ سے فاقہ ہوتے ہیں اور جو بیچارے افلاس اور غربت کی وجہ سے دو دو چار چار وقت بھوک کے ساتھ گزارتے ہیں ان پر کیسی گزرتی ہوگی اور یہ احساس ان میں ہمدردی و غمخواری کے جذبے کو پیدا کرتا ہے۔ اور ایک دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رمضان میں اہل ایمان کو ہمدردی اور غمخواری کی خصوصیت کے ساتھ تاکید ہے۔ گویا رمضان مبارک کے خاص اعمال خیر میں سے یہ بھی ہے۔

اور رحمت کے اس مہینہ میں ایمان والوں کے رزق میں زیادتی اور برکت کا جو ذکر فرمایا گیا ہے ہر صاحب ایمان اس کی شہادت دے سکتا ہے کہ یہ اس کا ہمیشہ کا تجربہ ہے، اللہ کے مومن بندوں کو رمضان مبارک میں جتنا اچھا اور جتنی فراغت سے رزق ملتا ہے، یقیناً بقیہ گیارہ مہینوں میں وہ بات نصیب نہیں ہوتی، اس کے بعد حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔

من فطر فیہ صائماً کان لہ مغفرۃ لذنوبہ وعتق رقبتہ من النار وکان لہ مثل اجرہ من غیر ان ینتقص من اجرہ شیئ۔

اس مہینہ میں جو شخص کسی روزہ دار کو افطار کرائے تو یہ اس کیلئے گناہوں کی مغفرت کا اور آتش دوزخ سے اسکی آزادی کا ذریعہ ہوگا اور اسکو اس روزہ دار کے برابر ثواب ہوگا بغیر اس کے کہ اس کے ثواب میں کوئی کمی کی جائے۔

یعنی اللہ تعالیٰ روزہ افطار کرانے والے کو روزہ دار کے برابر ثواب اپنے خاص خزانہ فضل سے دیگا، روزہ دار کے ثواب میں سے نہیں دیا جائے گا کہ اس میں کوئی کمی آئے۔

اس خطبے کے راوی حضرت سلمان فارسیؓ فرماتے ہیں کہ جب حضورؐ نے روزہ افطار کرانے والے کا

یہ ثواب عظیم بیان فرما دیا تو بعض حاضرین نے عرض کیا۔

یا رسول اللہ لیس کلنا یجد ما نفطر بہ الصائم

حضور! ہم میں سب تو ایسے نہیں ہیں جنھیں روزہ افطار کرانے کی کوئی خاص چیز میسر ہو۔

آپ نے ارشاد فرمایا۔

یعطی اللہ ھذا الثواب من فطر صائما علی مذقۃ لبن او تمرۃ او شربۃ من ماء

اللہ تعالیٰ یہی ثواب (یعنی روزہ دار کے برابر ثواب) اس شخص کو بھی دیگا جو کسی روزہ دار کو دودھ کی تھوڑی سی لسی سے یا کھجور کے ایک دانہ سے یا پانی کے ایک گھونٹ ہی سے افطار کرا دے۔

اس کے بعد حضور نے فرمایا۔

ومن اشبع صائما سقاہ اللہ من حوضی شربۃ لا یظمأ حتی یدخل الجنۃ

اور جو کوئی کسی روزہ دار کو پورا کھانا کھلاے تو اللہ تعالیٰ اس کو میرے حوض کوثر سے ایسا سیراب فرمائیں گے کہ پھر جنت میں جانے تک اس کو پیاس نہ لگے گی۔

ہمارے زمانہ کے بعض لوگ جب کسی حدیث میں کسی ایسے عمل پر جس کو وہ معمولی اور آسان سمجھتے ہیں کسی بڑے ثواب کا وعدہ دیکھتے ہیں تو انھیں اس کے بارے میں شکوک اور شبہات ہوتے ہیں۔ یہ شکوک دراصل اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل و کرم کی وسعتوں کو نہ جاننے کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ۔ اصل بات یہ ہے کہ اعمال کے اُخروی نتائج یعنی ثواب اور عذاب کی مقدار اور اس کی تفصیلات کے بارے میں انسانی ذہن بالکل عاجز ہے۔ بَلِ ادّٰرَکَ عِلْمُهُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ (آخرت کے بارے میں سب کا علم عاجز ہے) بلکہ اللہ و رسول جو کچھ فرمائیں ہمارا کام بس اس پر ایمان لانا ہے۔ ہاں ثبوت مستند طریقے سے ہونا چاہیے ـــــ ورنہ اگر ہم ان چیزوں میں بھی اپنی بیمار عقلوں اور اپنے ماؤف ذہنوں کو معیار بنائیں گے تو دین کی بہت سی بنیادی اور مسلم حقیقتیں ہمارے نزدیک مشکوک اور مشتبہ ہو جائیں گی مثلاً ایمان کے نتیجہ میں ہمیشہ اور ابد الآباد تک جنت میں عیش کرنا اور کفر و شرک کے نتیجہ میں ہمیشہ دوزخ میں جلنا وہ حقیقت ہے جس کو قرآن مجید نے سیکڑوں جگہ

بیان فرمایا ہے لیکن کتنے احمق اور بیوقوف وہ لوگ ہیں جن کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ایمان اور کفر کے انجام میں اتنا بڑا فرق کیوں ہے ــــــ بہرحال جس عمل کا جو ثواب یا جو عذاب صحیح اور مستند طریقے سے معلوم ہو جائے ہمیں اس پر یقین کر کے اس ثواب کے حاصل کرنے یا اس عذاب سے بچنے کی فکر کرنا چاہیئے۔ ایمانی طریقہ کار یہی ہے۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے روزہ دار کو افطار کرانے اور کھانا کھلانے کا یہ ثواب بیان فرما کر آگے ارشاد فرمایا۔

وھو شھر اولہ رحمۃ واوسطہ مغفرۃ وآخرہ عتق من النار ۔ اس مہینہ کا (یعنی رمضان کا) پہلا حصہ رحمت کا ہے، درمیانی حصہ مغفرت کا ہے اور آخری حصہ جہنم سے آزادی کا ہے۔

اس حدیث کی شرح کرنے والے علماء نے خطبہ کے اس جزء کے کئی مطلب بیان کئے ہیں ان میں جو سب سے زیادہ میرے دل کو لگتا ہے وہ یہ ہے کہ رمضان کی برکتوں میں حصہ لینے والے آدمی تین طرح کے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ ابرار اور علماء اور اولیاء جو تقوی اور پرہیزگاری کی وجہ سے اور مسلسل توبہ واستغفار کی وجہ سے گناہوں کی ناپاکی سے صاف رہتے ہیں تو ان حضرات پر تو شروع مہینہ ہی سے بلکہ رمضان کی پہلی رات ہی سے رحمت اور انعام کی بارشیں ہونے لگتی ہیں۔ دوسرا طبقہ ان بندوں کا ہے جو معمولی اور ہلکے درجہ کے گنا ہگار ہوتے ہیں۔ تو یہ لوگ جب رمضان کے ابتدائی حصہ میں روزوں کے اور دوسرے اعمال حسنہ کے ذریعہ اپنے گناہوں کی کچھ تلافی کر دیتے ہیں اور اپنی حالت کو درست کر لیتے ہیں تو درمیانی حصہ میں ان کو معافی دے دی جاتی ہے اور ان کی مغفرت کر دی جاتی ہے، اور تیسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جن کے گناہ اس دوسرے طبقہ والوں سے بھی زیادہ ہوتے ہیں اور جن کا دینی حال ان سے زیادہ خراب ہوتا ہے اور وہ گویا اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے جہنم کے مستحق بن چکے ہوتے ہیں تو اس طبقہ والے بھی جب رمضان کے ابتدائی اور درمیانی حصہ میں روزے

رکھ کے اور دوسرے اچھے اعمال کر کے اپنی سیاہ کاریوں کی کچھ تلافی کر لیتے ہیں، اور اللہ کے سامنے روتے دھوتے ہیں تو ان کو بھی جہنم سے آزادی دے دی جاتی ہے ..... تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا حاصل یہ ہوا کہ پہلی قسم کے مستحقین رحمت کیلئے تو رحمت کا دور دورہ شروع مہینہ ہی سے شروع ہو جاتا ہے اور درمیانی حصہ میں دوم درجہ والوں کی بھی مغفرت کر دی جاتی ہے اور آخر میں ان لوگوں پر بھی کرم کیا جاتا ہے جو اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے جہنم کی فہرست پر چڑھ چکے ہوتے ہیں تو رمضان کے آخری حصہ میں ان کو بھی جہنم سے چھٹی دے دی جاتی ہے۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا۔

من خفف فیہ عن مملوکہ غفر اللہ لہ واعتقہ من النار

جو کوئی اس مہینہ میں اپنے مملوک یا (ماتحت) کے کام میں تخفیف کر دے گا اللہ تعالیٰ اس کو بخشدیگا اور اس کو جہنم سے آزادی دیگا۔

یہ خطبہ مشکوٰۃ شریف میں امام بیہقی کی شُعَبُ الْاِیْمَان کے حوالے سے بس اتنا ہی ہے۔ مگر منذری کی ترغیب و ترہیب میں اس پر ایک جز کا اور اضافہ ہے۔ اسمیں ہے کہ اس خطبہ میں آپ نے صحابۂ کرام سے یہ بھی فرمایا کہ رمضان کے اس مہینہ میں تم چار چیزوں کی خصوصیت کے ساتھ کثرت کرو، ایک لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی کثرت رکھو، دوسرے استغفار کی کثرت کرو، اور تیسرے جنت کے سوال کی اور چوتھے دوزخ سے پناہ مانگنے کی کثرت کرو یعنی اس مہینہ کے دن رات میں ان چار شغلوں کی کثرت رکھو۔

امام منذری کی "ترغیب و ترہیب" میں رمضان ہی کے سلسلہ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور خطبہ بھی حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت سے طبرانی کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے، اس میں ہے کہ ایک دفعہ جب رمضان مبارک آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں سے ارشاد فرمایا۔

اتاکم رمضان شھر برکۃ یغشاکم اللہ فیہ فینزل الرحمۃ ویحط الخطایا ویستجیب فیہ الدعاء ینظر اللہ تعالیٰ الی تنافسکم فیہ ویباھی بکم ملئکتہ

لوگو ماہ رمضان آگیا، یہ بڑی برکت والا مہینہ ہے، اللہ تعالیٰ اسمیں اپنے خاص فضل وکرم سے تمہاری طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اپنی خاص رحمتیں نازل فرماتے ہیں، خطائیں معاف کرتے ہیں اور دعائیں قبول فرماتے ہیں اور اس مہینہ میں طاعات وحسنات اور عبادات کی طرف تمہاری رغبت اور مسابقت کو دیکھتے ہیں اور مسرت ومفاخرت کے ساتھ اپنے فرشتوں کو بھی دکھاتے ہیں۔

اللہ اللہ! کیسے خوش نصیب ہیں وہ بندے جن کو روزہ کی اور بھوک پیاس کی حالت میں نماز پڑھتے یا تلاوت کرتے یا ذکر کرتے یا رات کو تراویح میں رکوع وسجود اور قیام وقعود کرتے یا پچھلے پہر تہجد پڑھتے ان کا آقا ومولا خود دیکھتا ہے اور ان کی طرف اشارہ کرکے اپنے درباری فرشتوں سے کہتا ہے کہ دیکھتے ہو یہ ہماری رضا کیلئے کیا کیا کر رہے ہیں۔ ع

کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا۔

فاروا اللہ من انفسکم خیراً فان الشقی من حرم فیہ رحمۃ اللہ عزوجل۔

پس اے لوگو ان مبارک دنوں میں اللہ پاک کو اپنی نیکیاں ہی دکھاؤ (یعنی عبادات وحسنات کثرت سے کرو) بلاشبہ وہ شخص بڑا بے نصیب ہے جو رحمتوں کے اس مہینہ میں بھی اللہ کی رحمت سے محروم رہے۔

حضرات! اگرچہ ہم نے اور آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک زمانہ نہیں

پایا اور اس لئے حضور کے یہ خطبے آپ کی زبان مبارک سے ہم نے نہیں سنے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم اور آپ بلکہ قیامت تک آنیوالے سارے مسلمان ان خطبوں کے اسی طرح مخاطب ہیں جس طرح کہ صحابۂ کرام تھے اور آپ کے خطبات کے متعلق ہمیں یہی تصور کرنا چاہیئے کہ گویا آپ ارشاد فرما رہے ہیں اور ہم سُن رہے ہیں۔ انشاءاللہ اس تصور سے عمل کے شوق و ذوق میں ترقی ہوگی۔

مشکوٰۃ شریف ہی میں ایک اور حدیث ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان مبارک کی فضیلتیں اور اس کی برکتیں بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ رمضان کی ہر رات میں اللہ کا منادی پکارتا ہے۔

یا باغی الخیر اقبل ویا　　　اے نیکی اور ثواب کے طالب قدم بڑھا کے
باغی الشر اقصر!　　　آ۔ اور اے بدی کے شائق رک اور باز رہ۔

میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ ہمیں رمضان کی ہر رات میں یہ دھیان کرنا چاہیئے کہ اللہ کا منادی خیر کے طالبوں کو بلا رہا ہے اور بدی کے طالبوں کو ڈانٹ رہا ہے اور پھر ہمیں لبیک کہہ کے دل کے شوق و ذوق کے ساتھ خیر کی طرف اور اللہ کی رحمت اور رضا کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کرنا چاہیئے اور اس راہ میں برابر ترقی اور تیز قدمی رکھنی چاہیئے۔ دراصل رمضان کا ایک ایک منٹ بڑی قدر کے قابل ہے ــــ اللہ کے جن بندوں کو رمضان کی عظمتوں اور برکتوں کا یقین نصیب ہو جاتا ہے ان کا حال اس مبارک مہینہ میں بالکل مختلف ہوتا ہے وہ اس کے ایک ایک لمحہ کی بڑی قدر اور بڑی حفاظت فرماتے ہیں ــــ ہمارے ایک مخدوم بزرگ کا دستور اور معمول تو یہ ہے کہ پورے رمضان کے مہینہ صرف اتنا آرام کرتے ہیں جو زندگی اور صحت کے لئے بالکل ناگزیر ہے اور لوگوں سے ملنے اور بات چیت کرنے کے اوقات بھی بہت محدود کر دیتے ہیں، یعنی دن رات کے ۲۴ گھنٹوں میں سے روزانہ بہ مشکل بس آدھ گھنٹہ پون گھنٹہ اس کے لئے دیتے ہیں۔ باقی تمام اوقات تلاوت قرآن اور نوافل و اذکار میں مشغول رہتے ہیں ــــ پھر ان کا پروگرام بھی بڑا عجیب اور بڑا دلچسپ ہے، پورے رمضان ان کا

یہ معمول رہتا ہے کہ نماز مغرب کے بعد اوابین کی چھ رکعتوں میں تین پارے پڑھتے ہیں۔ پھر وہی تین پارے عشا کے بعد تراویح میں پڑھتے ہیں، تراویح کے بعد چائے پیتے ہیں اور چائے کی یہ مجلس قریباً آدھ گھنٹہ پون گھنٹہ تک رہتی ہے (ان بزرگ کے یہاں رمضان بھر گفت گو اور ملاقات کا بس یہی وقت رہتا ہے) اس چائے سے فارغ ہو کر پھر قرآن مجید لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور ان ہی تین پاروں کی پورے غور و تدبر کے ساتھ تلاوت فرماتے ہیں اور اسوقت بعض تفاسیر بھی سامنے رہتی ہیں اور غور طلب چیزوں کے لئے ان کی طرف رجوع بھی فرماتے ہیں اس تلاوت اور مطالعہ سے فارغ ہو کر تہجد کے لئے کھڑے ہوتے ہیں اور اس میں بھی وہی تین پارے پڑھتے ہیں بس پوری رات یوں ہی گزر جاتی ہے اس کے بعد نماز فجر سے اول وقت فارغ ہو کر کچھ دیر کیلئے آرام فرماتے ہیں۔ پھر اُٹھکر چاشت کے نوافل پڑھتے ہیں۔ اور ان میں بھی وہی تین پارے پڑھتے ہیں اس کے بعد پھر ان ہی تین پاروں کی تلاوت فرماتے ہیں، پھر ظہر کی سنتوں اور نفلوں میں وہی تین پارے پھر پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد عصر تک ان ہی تین پاروں کی دو دفعہ اور تلاوت فرماتے ہیں پھر عصر کے بعد کسی دوسرے حافظ کو وہی تین پارے سناتے ہیں اس طرح دن رات میں دس دفعہ تین پاروں کا دور ہوتا ہے اور ایک عشرہ میں قرآن مجید کے دس ختم ان بزرگ کے پورے ہو جاتے ہیں۔ پھر آخری عشرہ میں اس خیال سے کہ شاید ۲۹ رمضان کو رویت ہو جائے بجائے تین تین پاروں کے سوا تین تین پارے ہر دفعہ پڑھتے ہیں اور اس طرح آخری عشرہ کے ۹ ہی دن میں دس قرآن مجید ختم ہو کر انتیسویں رمضان کو ان بزرگ کے تیس قرآن اس طرح پورے ہو جاتے ہیں۔ پھر اگر ۲۹ رمضان کو رویت نہ ہوئی اور مہینہ پورے ۳۰ دن کا ہوا تو ۳۰ رمضان کو ایک قرآن مجید اور ختم ہو جاتا ہے ان بزرگ کا برسہا برس سے یہی معمول ہے اور دوسرے اذکار و تسبیحات اور دعوات و صلوات اس کے علاوہ ـــــ بلکہ ان کے تو گھر کی مستورات کا بھی یہی حال ہو کہ گھر کا سارا کام کاج، جھاڑو برتن، کھانا پکانا بھی خود کرتی ہیں اور اس کے ساتھ ۲۰-۲۰ اور ۲۵-۲۵ پارے روزانہ تلاوت بھی کرتی ہیں بلکہ کبھی کبھی پورا قرآن ختم کرتی ہیں۔

. اور یہ تو میں نے اس زمانے کے صرف ایک بزرگ کا ذکر کیا اور وہ بھی صرف اسلئے کیا کہ اُن کا عجیب وغریب اور دلچسپ پروگرام جو مجھے معلوم ہو گیا تھا وہ آپکو بھی معلوم ہو جائے شاید آپ میں سے کسی کے دل میں کسی درجہ میں اس کی نقل اور تقلید کا شوق پیدا ہو جائے ـــــ ان کے علاوہ بھی اللہ کے نیک بندوں کا یہ عام معمول ہے کہ رمضان مبارک میں وہ اپنے کو زیادہ سے زیادہ اللہ کی عبادت کے لئے اور اس کی راہ میں مجاہدہ کیلئے تیار کر لیتے ہیں۔ پھر جن کو تلاوت قرآن کا زیادہ ذوق ہوتا ہے وہ اس مہینہ میں تلاوت زیادہ کرتے ہیں۔ جن کو ذکر سے زیادہ مناسبت ہوتی ہے وہ ذکر زیادہ کرتے ہیں جن کو نوافل میں زیادہ روحانی لذت ملتی ہے وہ نوافل زیادہ پڑھتے ہیں، جن کے دلوں میں اللہ نے دین کی خدمت اور دین کے لئے جدوجہد کا احساس زیادہ پیدا کر دیا ہے اور جو اس عمل کو سب سے اونچا اور زیادہ کمائی والا عمل سمجھتے ہیں۔ وہ رمضان میں اس کو زیادہ کرنا چاہتے ہیں ـ بہرحال رمضان کا یہ خاص حق ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنت ہے اور اللہ کے تمام صالح اور مقبول بندوں کا یہ طریقہ ہے کہ رمضان میں اپنے کو عبادات اور طاعات کے لئے زیادہ سے زیادہ فارغ کر لیا جائے اور اس مبارک مہینہ میں اللہ کی رضا اور رحمت حاصل کرنے کیلئے اور اپنی دینی ترقی کے لئے جو جدوجہد کی جا سکے، اس میں کسر نہ رکھی جائے۔ بعض اہل ادراک بزرگوں کا ارشاد ہے کہ جس شخص کا رمضان میں جو دینی حال رہتا ہے اسی نسبت سے باقی پورے سال میں اس کا حال رہتا ہے۔

تو مجھے آپ سے یہی کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رمضان کے مہینہ کی شکل میں ہمیں جو ایک نعمت عظمیٰ نصیب فرمائی ہے (کہ اس ایک مہینہ میں ہم برسوں کی کمائی انشاء اللہ کر سکتے ہیں)، ہم اس کی قدر کریں، دوسرے کاموں سے ہم اپنے کو زیادہ سے زیادہ ہلکا کریں اور اس پورے مہینہ کا ایسا پروگرام بنائیں جس میں اللہ کا ذکر و فکر، اللہ کی طاعت وعبادت اور اللہ کے لئے مجاہدہ زیادہ سے زیادہ ہو ـــــ اگر سال میں یہ ایک مہینہ خاص اہتمام سے اس طرح گزار دیا جایا کرے جس طرح اس کے گزارنے کی رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم ہدایت فرماتے تھے تو اپنی اصلاح کے لئے اور اللہ سے تعلق بڑھنے کے لئے اور تقویٰ کی صفت پیدا ہونے کے لئے اس ایک مہینہ کا محنت و مجاہدہ انشا اللہ اچھی خاصی حد تک کافی ہو گا ــــــ جو لوگ اپنے کو اس ایک مہینہ کیلئے دوسرے کاموں سے فارغ کر سکیں ان کے لئے تو سب سے بہتر یہ ہو کہ وہ یہ پورا مہینہ اللہ کے کسی خاص بندہ کی صحبت میں اور کسی ایسے ماحول میں جاکر گزاریں جو اللہ کے ذکر و فکر کا ماحول ہو، طاعت و عبادت کا ماحول ہو، صلاح و تقوے کا ماحول ہو، تربیت و تزکیہ کا اور مجاہدہ کا ماحول ہو، اور جو بھائی پورے مہینے کیلئے ایسا نہ کر سکیں۔ وہ کم سے کم ایک عشرہ کے لئے اور خاص طور سے آخری عشرہ کے لئے اگر کر سکیں تو ضرور کریں۔ انشا اللہ اُن کی دینی ترقیات کیلئے یہ چیز بہت مفید ہوگی۔ باقی وہ حضرات جو ایسے کاموں میں اور ایسے حالات میں ہیں کہ دوسرے مشغلوں سے وہ اپنے کو فارغ نہیں کر سکتے وہ کم سے کم اس کا فیصلہ ضرور کریں کہ اس مہینہ کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کاموں کے کرنے کی خصوصیت کے ساتھ ہدایت فرمائی ہے انشا اللہ ان کو پورے اہتمام سے کرنے کی کوشش کریں گے، اور جن باتوں سے اس مبارک مہینہ میں پرہیز کرنے کی آپ نے خصوصیت کے ساتھ ہدایت فرمائی ہے ان سے پوری طرح انشاء اللہ پرہیز کریں گے اور اپنے کو زیادہ سے زیادہ ذکر و تلاوت اور طاعت و عبادت میں مشغول رکھیں گے۔

اس مہینہ کی خاص عبادتوں میں سب سے اہم تو روزہ ہے جو اسلام کا ایک رکن ہے اسلام میں رمضان کے علاوہ کسی دن کا روزہ فرض نہیں، اور رمضان کے پورے مہینے کے روزے فرض ہیں اور ان کی اتنی اہمیت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ جو شخص کسی شرعی عذر کے بغیر رمضان کے ایک دن کا بھی روزہ چھوڑ دے گا وہ اگر ساری عمر نفل روزے رکھ کر اسکی تلافی کرنا چاہے گا تو نہ کر سکے گا۔

اور واقعہ یہ ہے کہ حدیثوں میں رمضان کے روزوں کا جو اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے

اور اللہ تعالیٰ نے اس پر جیسے انعامات کا وعدہ کیا ہے ان کے معلوم ہو جانے کے بعد شرعی مجبوریوں اور شرعی عذر کے بغیر وہی محروم شخص روزہ چھوڑ سکتا ہے جسے اللہ و رسول کی باتوں کی اور اللہ کی رحمت کی کوئی پرواہ نہ ہو ـــــــ جن حدیثوں میں روزہ کے اجر و ثواب کا اور روزہ پر ملنے والے انعام کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے پہلے ایک حدیث قدسی کا ذکر کرتا ہوں حدیث قدسی ایک خاص اصطلاح ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی حدیث میں صراحتاً یہ فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے تو اس کو "حدیث قدسی" کہتے ہیں تو جو حدیث میں روزہ کے متعلق ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ اسی قسم کی حدیث ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ حدیث کی تمام کتابوں میں یہ حدیث روایت کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایمان والوں کو اپنے تمام اچھے اعمال کا ثواب دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک ملنے والا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ نے اس امت مرحومہ کے لئے عام قانون اپنے کرم سے یہ مقرر فرمایا ہے کہ اس کی ہر نیکی کا ثواب بہ نسبت پہلی امتوں کے کم از کم دس گنا زیادہ دیا جائیگا۔ اور جن لوگوں کی نیکیاں زیادہ جاندار، زیادہ روح والی اور احسان کی صفت کے ساتھ اور خوف و محبت کی خاص کیفیات کے ساتھ ہوں گی تو ان کا ثواب اور بھی زیادہ ہوگا، یہاں تک کہ بعضوں کو سو گنا اور بعضوں کو دو سو گنا اور بعضوں کو ان کی کیفیات اور خصوصیات کے موافق اس سے بھی زیادہ حتیٰ کہ بعض خوش نصیب بندوں کو سات سو گنا تک دیا جائے گا) حضورؐ فرماتے ہیں کہ اس اُمت کے اعمال خیر کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ عام قانون ہے لیکن حق تعالیٰ نے روزے کو اس سے مستثنیٰ رکھا ہے، روزہ کے متعلق اس کا ارشاد ہے کہ روزے میں بندہ میرے لئے اپنا کھانا پینا اور اپنی نفسانی خواہش چھوڑتا ہے۔ اس کی اس قربانی کی میں پوری پوری قدر کر کے دکھاؤں گا اور ثواب کے اس عام حساب سے نہیں، بلکہ اپنے خاص کرم سے اور بلا واسطہ میں ہی روزہ کا اجر اسکو دوں گا، گویا بندہ بس اسی وقت دیکھے گا کہ میں اسے اپنے ہاتھ سے کیا دوں گا۔ حدیث

• کے اصل الفاظ اس موقع پر یہ ہیں کہ "الا الصوم فانہ لی وانا اجزی بہ یدع لی شھوتہ وطعامہ وشرابہ"

دوستو! اللہ تعالیٰ آخرت میں روزہ داروں پر جو انعام و اکرام فرمائیں گے جس کا وعدہ اس حدیث میں کیا گیا ہے وہ تو انشاء اللہ اسی وقت سامنے آئے گا اور اس کی عظمت اور قیمت اسی وقت معلوم ہو سکے گی لیکن اس قدسی حدیث میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ میرا بندہ میری وجہ سے اپنا کھانا پینا چھوڑتا ہے، اہل ذوق کے لئے یہ کچھ کم نعمت نہیں ہے، اگر بالفرض آخرت میں کچھ بھی نہ ملے تو اللہ تعالیٰ کا بس یہ فرما دینا کہ بندہ نے اپنا کھانا پینا میری وجہ سے چھوڑا۔ ہمارے روزہ کی وہ قیمت ہو گئی کہ ہم ہرگز مستحق نہیں ؎

ہزار عمر فدائے دمے کہ من از شوق بخاک خوں تپم و گوئی برائے من است

پھر اسی حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

ولخلوف فم الصائم عند اللہ اطیب من ریح المسک

(یعنی روزہ دار کے منہ میں خلو معدہ کی وجہ سے جو بدبو بعض اوقات پیدا ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ میرے نزدیک مشک کی خوشبو سے اچھی ہے۔

گویا روزہ دار اللہ کا ایسا محبوب بنجاتا ہے کہ اسکے منہ کی بدبو بھی اللہ کو محبوب ہوتی ہے سبحان اللہ وبحمدہ۔

ایک اور صحیح حدیث میں خاص رمضان ہی کے روزوں کے متعلق فرمایا گیا ہے۔

من صام رمضان ایمانا واحتسابا غفر لہ ما تقدم من ذنبہ۔

جو شخص ایمان اور احتساب کی صفت کے ساتھ رمضان کے روزے رکھے گا۔ اس کے سب پہلے گناہ معاف کر دیئے جائینگے۔

ایمان اور احتساب یہ دو خاص دینی اصطلاحیں ہیں اور حدیثوں میں بہت سے اعمال خیر کے ثواب کے ذکر کے ساتھ شرط کے طور پر ان دونوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یعنی کہا جاتا ہے کہ اس عمل کا یہ ثواب ہے بشرطیکہ یہ عمل ایمان اور احتساب کے ساتھ کیا جائے اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کرنے والا اس عمل کو اس یقین کے ساتھ کرے کہ یہ اللہ کا حکم ہے اور قرآن وحدیث میں اس کا جو اجر و ثواب بتلایا گیا ہے وہ بالکل حق ہے، اور اللہ تعالیٰ مجھے اور میرے اس عمل کو دیکھنے والا ہے، اور پھر اسی یقین کی تحریک سے اور حکم الٰہی کی تعمیل ہی کی نیت سے اور اللہ و رسول کے بیان کئے ہوئے اس ثواب ہی کی امید پر اس عمل کو کیا جائے۔ بس یہ مطلب ہوتا ہے ایمان و

احتساب کے ساتھ کسی عمل کے کرنے کا، تو اس حدیث کا حاصل یہ ہوا کہ جو کوئی رمضان کے روزے اس یقین کیساتھ رکھے کہ یہ اللہ کا حکم ہے اور مجھے اس کے حکم کی تعمیل کرنا ہی ہے اور اللہ مجھے اور میرے عمل کو دیکھنے والا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ قبول فرمائے تو مجھے اس عمل پر انشاء اللہ تعالیٰ بہت بڑا ثواب ملنے والا ہے تو اس شخص کے پہلے سب گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

روزے کے علاوہ رمضان کی دوسری خاص عبادت "قیام لیل" یعنی رات کی خاص نماز ہے جس میں تراویح اور تہجد دونوں داخل ہیں اسکے بارے میں بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہی ارشاد ہے کہ :-

من قام رمضان ایماناً واحتساباً غفر له ما تقدم من ذنبه	جو شخص ایمان و احتساب کے ساتھ رمضان کی راتوں میں اللہ کے حضور میں کھڑا ہو (یعنی تراویح و تہجد پڑھے) تو اس کے پہلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔

تو حدیث میں رمضان کی ان دونوں عبادتوں کی، یعنی دن کے روزوں کی اور رات کی نماز تراویح و تہجد کی یہ فضیلت اور تاثیر بیان کی گئی ہے کہ ان کی برکت سے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ یہ عبادتیں ایمان اور احتساب کے ساتھ کی جائیں۔ دراصل ایمان و احتساب اعمال کی روح اور اعمال کا باطن ہیں جو اعمال ایمان و احتساب کے بغیر کئے جاتے ہیں وہ بے روح اور بے اثر ہیں آجکل اول تو اعمال کرنیوالے کم ہیں اور پھر جو کرنے والے ہیں ان میں ایمان و احتساب والے بہت ہی کم ہیں اسی لئے ہمارے اعمال بے اثر ہیں۔

اعمال میں ایمان و احتساب پیدا کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ ہر عمل نیت سے کیا جائے اور اس یقین کو بار بار دل میں دہرایا جائے کہ اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر ہیں اور یہ اُن کا حکم ہے اور وہ اس کی تعمیل سے راضی ہوتے ہیں اور میں ان کو راضی کرنے کے لئے اور آخرت میں ان کا رحم و کرم حاصل کرنے کے لئے ہی یہ عمل کرتا ہوں ـــــ مثلاً ہم روزہ رکھیں تو اس نیت سے رکھیں اور اس نیت کو برابر تازہ کرتے رہا کریں۔ یہاں تک کہ دن میں جب جب کچھ کھانے یا پینے کو دل چاہے تو دل کو یہی یاد دلایا جائے کہ میں اللہ کے حکم سے اور اس کی رضا کے لئے روزہ سے ہوں اور وہ مجھے دیکھ رہا ہے اور میری اس

بھوک پیاس پر وہ مجھے بڑا ثواب دینے والا ہے ـــــ اسی طرح تراویح اور تہجد پڑھنا جب نفس پر بھاری ہو اور جی اسوقت آرام کرنے کو چاہے تو اس یقین کو تازہ کیا جائے کہ میرے اللہ مجھے اور میرے حال کو دیکھ رہے ہیں اور اسوقت اللہ کے حضور میں کھڑے ہو کر میرا نماز پڑھنا آخرت میں اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کو آسان کریگا اور اسوقت تھوڑی سی تکلیف اٹھالینا انشاء اللہ دوزخ کی سخت تکلیفوں سے نجات کا ذریعہ ہو جائے گا ـــ انشاء اللہ چند روز ایسا کرنے سے یہ ایمان و احتساب دل کا مستقل حال بن جائے گا اور پھر خدا نے چاہا تو ہمارا ہر عمل ایمان و احتساب کی صفت سے ہوا کرے گا۔

رمضان کی ان دونوں عبادتوں (یعنی دن کے روزوں اور رات کی نمازوں) کے متعلق ایک حدیث اور بیان کرتا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

الصیام والقرآن یشفعان للعبد یقول الصیام ای رب انی منعتہ الطعام والشھوات بالنھار فشفعنی فیہ ویقول القرآن منعتہ المنام باللیل فشفعنی فیہ فیشفعان۔

روزہ، اور قرآن (یعنی تراویح یا تہجد میں جو قرآن پڑھا یا سنا جائے) یہ دونوں مومن بندہ کے حق میں اللہ تعالیٰ سے سفارش کریں گے۔ روزہ عرض کریگا اے میرے رب میں نے تیرے اس بندے کو کھانے پینے سے اور خواہش نفس پورا کرنے سے دن کے اوقات میں روکا تھا لہذا میری شفاعت اس کے حق میں قبول فرما، اور قرآن کہے گا کہ میں نے اس کو رات میں سونے نہیں دیا تھا۔ اس لئے میری شفاعت اسکے حق میں قبول فرما۔ رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں کہ پھر ان دونوں کی شفاعت اس بندہ کے حق میں قبول کیجائیگی۔

دوستو! ہمیں اور آپکو بلاشبہ روزہ سے بھوک پیاس کی کچھ تکلیف ہوتی رہی، اور دن کو روزہ رکھکر رات کو تراویح اور تہجد پڑھنا اکثر لوگوں کیلئے ضرور کچھ شاق ہوتا رہا۔ لیکن جب قیامت میں ہمارے یہ روزے اور رمضان کی راتوں کی ہماری یہ نمازیں اور ان میں پڑھے جانیوالا قرآن ہمارے شفیع بن کر کھڑے ہوں گے اور ہمارے لئے بارگاہ خداوندی میں سفارش کریں گے اور جب ان کی وجہ سے ہمارے گناہ معاف کئے جائیں گے اور جب اللہ تعالیٰ براہ راست اور بلاواسطہ ہمیں انکے انعام دینگے تو اسوقت ان سے زیادہ محبوب و لذیذ ہمارے لئے کوئی چیز نہ ہوگی اور اس دن ہمیں انکی اصل قدر و قیمت معلوم ہوگی۔

ہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ رمضان کے صیام اور قیام کی یہ ساری فضیلتیں اور انعام و اکرام کے یہ تمام وعدے ان ہی خوش نصیبوں کیلئے ہیں جن کے روزے اور جن کی راتوں کی نمازیں صرف رسمی نہ ہوں، بلکہ اخلاص کے ساتھ اور ایمان و احتساب کی کیفیت کے ساتھ ہوں اور جنھوں نے ان کے بارے میں اللہ و رسول کے احکام کی پوری پابندی کی ہو۔ ورنہ اگر یہ بات نہ ہوئی تو حدیث میں صاف طور پر فرمایا گیا ہے۔

رب صائم لیس له من صیامه الا الجوع و الظمأ و رب قائم لیس له من قیامه الا السهر۔

کتنے ہی روزہ دار ہیں کہ انکے روزہ (رکھنے) کا حاصل بھوک پیاس کے سوا کچھ نہیں، اور کتنے ہی شب زندہ دار ہیں کہ راتوں کی ان کی نمازوں کا حاصل رات کے جاگنے کے سوا کچھ نہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

من لم یدع قول الزور و العمل به فلیس لله حاجة فی ان یدع طعامه و شرابه

جس روزہ دار نے (روزہ رکھتے ہوئے) جھوٹ اور بیہودہ باتیں اور غلط اور بیہودہ اعمال نہ چھوڑے تو اللہ کو اسکے بھوکے اور پیاسے رہنے کی کچھ پرواہ نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص روزے میں کھانے پینے سے تو اپنے منھ کو بند کرے لیکن جھوٹ سے اور بری باتوں سے اپنی زبان کی حفاظت نہ کرے اور برے اعمال اور بری عادتیں نہ چھوڑے تو اللہ کے یہاں اس کا روزہ قبول نہ ہوگا۔

ایک اور حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ روزہ صرف کھانا پینا چھوڑ دینے کا نام نہیں ہے بلکہ برے

کاموں اور بُری باتوں سے بھی رُکا جائے تو حقیقی روزہ ہے۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ داروں کو ہدایت فرمائی ہے کہ

اذا کان یوم صوم احدکم فلا یرفث ولا یصخب فان سابہ احدٌ او قاتلہ فلیقل انی صائم

جب تم میں سے کسی کے روزہ کا دن ہو تو چاہیے کہ وہ کوئی بیہودہ حرکت اور کوئی بیہودہ بات نہ کرے اور تیزی میں زور سے بھی نہ بولے اور اگر بالفرض کوئی دوسرا اس سے گالی گلوج کرے اور لڑنا چاہے تو کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں۔

یعنی روزہ دار کو چاہیے کہ کسی بدتمیز کے جواب میں بھی کوئی بدتمیزی نہ کرے اور دل کے جذبات پر اور زبان پر پورا قابو رکھے حتی کہ چیخ کر اور زور سے بھی نہ بولے۔

دوستو! یہ ہے حقیقی روزہ اور یہ ہیں وہ روزہ دار جن کے روزہ سے پیدا ہونیوالی منھ کی بدبو بھی اللہ کو مشک کی خوشبو سے زیادہ پیاری ہے — اور یہ بات جب ہی حاصل ہو سکتی ہے جب روزہ دار یہ دھیان برابر تازہ کرتا رہے کہ میرا مالک اور میرا رب میرے ساتھ ہے، حاضر ناظر ہے اور اسکا حکم ہے کہ میں روزہ میں کوئی بُرا کام نہ کروں، کوئی بری بات زبان سے نہ نکالوں حتی کہ زور سے بھی نہ بولوں، پس اللہ کے حاضر اور شاہد ہونے کا یہ یقین روزہ دار پر جتنا طاری ہوگا اور ہر دم اپنے اللہ کے سامنے ہونے کا دھیان جتنا پختہ اور گہرا ہوگا اتنی ہی ان چیزوں سے احتیاط نصیب ہوگی جو روزہ کو خراب کرنیوالی ہیں بس سارا کھیل اس یقین اور دھیان کا ہے۔ اللہ تعالے ہمیں نصیب فرمائے۔

حضرات! رمضان کے خاص اعمال میں سے ایک اعتکاف بھی ہے، اعتکاف کیا ہے؟ ہر طرف سے منقطع ہو کر اللہ کے در پر پڑ جانا اور اس سے لو لگا کے بیٹھ جانا۔ اسکا اصل وقت رمضان کا آخری عشرہ ہے۔

یوں تو رمضان کا پورا مہینہ خاص رحمتوں اور برکتوں کا مہینہ ہے لیکن اس حیثیت سے اسکا آخری عشرہ پہلے دونوں عشروں سے بڑھا ہوا ہے کہ قرآن پاک کا نزول بھی آخری عشرہ ہی میں ہوا تھا اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شب قدر بھی عام طور سے اس آخری عشرہ ہی میں ہوتی ہے اسلئے اعتکاف کیلئے اسی عشرہ کو مخصوص کیا گیا ہے — گویا پورے رمضان کے روزوں کا مجاہدہ تو تمام اُمت پر فرض کیا گیا ہے جس سے

بیماروں اور معذوروں کے سوا کوئی بھی مستثنیٰ نہیں ہے اور پورے مہینہ کی راتوں میں عشا کی روزمرہ کی نماز کے علاوہ زائد نماز پڑھنا اور اللہ کے حضور میں زیادہ سے زیادہ کھڑا رہنا جسکو حدیثوں میں "قیام لیل" کہا گیا ہے وہ اگرچہ روزہ کی طرح فرض تو نہیں کیا گیا ہے لیکن فرض قرار دیئے بغیر اسکا حکم بھی سب کو دیا گیا ہے، گویا رمضان کے دنوں میں صیام اور راتوں میں قیام تو ایمان والوں کیلئے رمضان کے مجاہدہ اور رمضان کی عبادت کا عام نصاب ہے۔ پھر اللہ کے جو بندے رحمت والے اس مہینہ کی رحمتوں اور برکتوں میں خاص الخاص حصہ لینا چاہیں ان کیلئے خاص نصاب اعتکاف ہے۔ یعنی اللہ کا طالب بندہ رمضان کے آخری دس دنوں اور دس راتوں میں سب طرف سے کٹ کے اور گویا سب سے ہٹ کے اللہ ہی کے آستانہ پر جا پڑے اور گویا اسی کے قدموں میں جا گرے، یعنی اللہ کی کسی مسجد میں اپنے جسم کو مقید کر دے، حاجت بشری کے سوا وہاں سے نہ نکلے، اسی طرح اپنے باطن کو صرف اللہ کی طرف متوجہ کر دے اسی کی یاد ہو اسی کا دھیان ہو اسی کی عبادت ہو اسی کی تسبیح و تقدیس ہو، اسی سے ڈرنا اسی کے حضور میں رونا اور تڑپنا ہو، اسی سے مانگنا ہو اسی کے سامنے گڑگڑانا ہو، غرض وہاں بس وہ بندہ ہو اور اس کا رب کریم۔

حضرات! اعتکاف کا جو اجر و ثواب آخرت میں ملیگا وہ تو وہیں پہونچکر سامنے آئیگا لیکن جب بندہ کو اپنے مولا کی محبت کا کوئی ذرہ نصیب ہو اسکے لئے تو خلوص کے ایسے چند دنوں اور چند راتوں کا نصیب ہو جانا بجائے خود وہ نعمت عظمیٰ ہے جس کے سامنے دنیا کی ساری نعمتیں اور لذتیں ہیچ ہیں، اہل محبت تو ایسے وقت کی تمنا میں تڑپتے ہیں ؎

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑا رہوں	سر زیر بارِ منتِ درباں کئے ہوئے
دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن	بیٹھا رہوں تصورِ جاناں کئے ہوئے

میں آپ حضرات سے عرض کر رہا تھا کہ اعتکاف بجائے خود ایک نعمت اور لذت ہے ایسی نعمت اور لذت جو اگر ہم سب پر منکشف ہو جائے تو ہماری مسجدیں رمضان میں معتکفین سے بھری رہا کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی معمول تھا کہ آپ رمضان کے آخری عشرہ میں برابر اعتکاف فرماتے تھے، ایک سال کسی وجہ سے آپ اعتکاف نہیں کر سکے تو اگلے سال آپنے ۲۰ دن کا اعتکاف فرمایا اور ایک سال ایسا بھی ہوا کہ رمضان کے پورے مہینہ میں آپ معتکف رہے۔

تو اللہ تعالیٰ آپ میں سے جنکو توفیق دے وہ آخری عشرہ میں اعتکاف کریں اور جن کیلئے کسی وجہ سے

اسکا موقع نہ ہو وہ بھی اتنا ضرور کریں کہ آخری عشرہ میں اپنے دوسرے مشغلوں کو کم سے کم کر دیں اور دن رات کا زیادہ سے زیادہ وقت اللہ کے ذکر میں، قرآن مجید کی تلاوت میں، اللہ کی عبادت میں، اللہ کے دھیان میں اور اس سے دعا و استغفار میں گزاریں خصوصاً ان راتوں میں زیادہ سے زیادہ اللہ کی طرف متوجہ اور اس کے ذکر میں مصروف اور دعا و استغفار میں مشغول رہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلعم رمضان کی آخری دس راتوں میں خود بھی جاگتے تھے اور اپنے گھر والوں کو بھی بیداری کا حکم فرماتے تھے اور ترغیب دیتے تھے (احیی لیلہ وایقظ اھلہ)

اور بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے اور اہل تجربہ بھی بیان کرتے ہیں کہ عموماً رمضان کے اسی آخری عشرہ کی راتوں میں شب قدر ہوتی ہے جسکی عظمت اور فضیلت اور جسکی قدر و منزلت قرآن مجید کی ایک مستقل سورت میں بیان کی گئی ہے اور اسی وجہ سے اس سورت کا نام ہی سورۃ القدر ہے تو جو شخص رمضان کے آخری عشرہ کی راتوں میں ذکر و عبادت کا اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہنے کا اور دعا و استغفار میں مشغول رہنے کا اہتمام کریگا انشاء اللہ وہ شب قدر میں نازل ہونیوالی اللہ کی خاص رحمتوں اور برکتوں سے ضرور اپنا دامن بھر لیگا اور جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے وہ اس ایک رات کی عبادت پر ہزار مہینہ کی عبادت سے زیادہ ثواب کا مستحق ہوگا۔

دوستو اور دینی بھائیو! اللہ تعالیٰ نے رمضان کی شکل میں رحمت کا جو موسم ہمارے لئے بھیجا ہے اسکی قدر کر لو، تھوڑی سی ہمت اور محنت کر کے اپنے گناہوں کو بخشوانے اور اپنے اللہ کو راضی کرنے کا سامان کر لو، اور رمضان کے دنوں اور راتوں میں کچھ کر کے اپنے نامۂ اعمال میں نیکیوں کی میزان کو بڑھوالو، معلوم نہیں اس سال کے بعد ہم میں سے کس کس کو رمضان نصیب ہوگا اور کس کس کیلئے یہی آخری رمضان ہے۔ رسول اللہ صلعم نے کسی صحابی کو ان کی خاص استدعا پر چند نصیحتیں فرمائی تھیں ان میں سے ایک نصیحت یہ بھی تھی کہ "صل صلوٰۃ مودع" یعنی اس شخص کی سی نماز پڑھو جو اپنے متعلقین کو خیرباد کہہ کے دنیا سے رخصت ہونیوالا ہو اور اپنی نماز کو آخری نماز سمجھ کر خضوع و خشوع سے پڑھ رہا ہو۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اسی طرح اس رمضان میں ہم سب یہ خیال کر کے کچھ کر لیں کہ کیا خبر ہو شاید یہی ہمارے لئے آخری رمضان ہو اور اللہ کی رحمت و مغفرت حاصل کرنے کا یہی ہمارے لئے آخری موقع ہو۔

آخر میں مجھے ایک بات آپ حضرات سے اور عرض کرنی ہے، اسوقت میں نے آپ حضرات کے سامنے رمضان اور اسکے خاص اعمال کے متعلق یعنی روزہ۔ تراویح اور اعتکاف وغیرہ کے متعلق جو کچھ عرض کیا ہے دراصل وہ سب ثواب آخرت کی وہ ترغیبات ہیں جو رسول اللہ صلعم صحابہ کرام کے سامنے بیان فرمایا کرتے تھے اور جو حدیثوں میں

ابتک محفوظ ہیں، ان اعمال میں اسکے علاوہ جو اور مصلحتیں اور فائدے ہو سکتے ہیں جن کا تعلق ہماری اسی دنیوی زندگی سے ہے، اسوقت میں نے انکو قصداً نظرانداز کیا ہے۔ یہ میں نے اسلئے کیا ہے کہ میرے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا طریقہ یہی ہے کہ وہ جو عمل کرانا چاہتے ہیں آخرت کے ثواب کو سامنے رکھکر کرانا چاہتے ہیں اور جس کام سے لوگوں کو بچانا چاہتے ہیں اُسکے آخرتی عذاب سے ڈراکر بچانا چاہتے ہیں ان کا امتیازی اور اصلی کام یہی تبشیر اور انذار ہے (یعنی ثواب کی بشارتیں سنا کر اچھے اعمال پر لوگوں کو آمادہ کرنا اور عذاب سے ڈراکر لوگوں کو بُرے اعمال سے بچانا) قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے "رُسُلاً مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ"

ہمارے اس زمانہ میں دین میں اور دین کی دعوت میں جو غلطیاں داخل ہوگئی ہیں ان میں کی بہت اہم ایک غلطی یہ ہے کہ بہت سے حضرات تبشیر اور انذار کے اس نبوی طریقے سے اس قدر ہٹ کر دین کی اور دین کے اعمال و ارکان کی دعوت دیتے ہیں کہ اُن کی گفتگوؤں اور ان کی کتابوں میں جنت کے ثواب اور دوزخ کے عذاب کا تذکرہ کسی تلاش کرنے والے کو مشکل ہی سے مل سکتا ہے حالانکہ قرآن و حدیث اسی تذکرے سے بھرے ہوئے ہیں۔ قرآن پاک سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دین کی پوری دعوت کی بنیاد آخرت کے ثواب عذاب کو بنایا ہے اور جنت کی نعمتوں اور دوزخ کے عذابوں کا ذکر قرآن مجید میں اسقدر تفصیل سے اور اتنی تکرار کے ساتھ کیا گیا ہے کہ اگر اسکو نکال لیا جائے تو قرآن شاید آدھا بھی مشکل سے رہیگا بہرحال انبیاء علیہم السلام کا یہی طریقہ ہے اور ہمیں مادہ پرستی اور دنیا پرستی کے اس دور میں اپنے قول و عمل سے اُسکو اجاگر اور زندہ کرنا ہے کہ دین کی اور دین کے اعمال و ارکان کی دعوت آخرت کے ثواب عذاب کی بنیاد پر دیجائے اور جنت و دوزخ کو قرآن مجید کے طریقہ پر ایک سچی اور یقینی حقیقت کی طرح لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے ۔۔۔ اس کے علاوہ آج میں نے خاص طور پر یہ التزام اسلئے بھی کیا کہ رمضان کے مخصوص اعمال روزہ۔ قیام لیل۔ احیار لیلۃ القدر ان سب کے متعلق حدیث میں یہ صراحۃً ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ان پر یہ انعام اور یہ اجر و ثواب اُسی وقت ملیگا جبکہ اُن کو ایمان اور احتساب کی صفت کیساتھ کیا جائے اور ایمان و احتساب کا مطلب جیسا کہ میں نے ابھی بتلایا تھا یہی ہے کہ اللہ کے وعدوں اور وعیدوں پر یقین کرکے اور ان کے بتلائے ہوئے ثواب عذاب کو بالکل برحق جان کے اس ثواب کی اُمید ہی میں ان اعمال کو کیا جائے ۔۔۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ اعمال بھی نصیب فرمائے اور ایمان و احتساب کی صفت بھی نصیب فرمائے، میں عرض کرچکا ہوں کہ وہی دین کی روح اور جان ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین وسلام علی المرسلین ٥

(بقیہ صفحہ ۴۶)

عورتوں کی جانب زیادہ متوجہ رہے جو سینما ہال میں اِدھر اُدھر رونق افروز تھیں۔"

(نقوش ص۸۸)

حسن پرستی اور دیدہ بازی کا یہ وہی معیوب مشغلہ ہے جس کی قباحت و شناعت کو ظاہر کرنے کے لیے اسلام نے زنا العین کا عنوان اختیار کیا ہے، زنا کا یہ پہلا زینہ ہے جس پر سے شیطانی وساوس غیر شعوری طور پر گزارتے ہیں، اور پھر اسکی انتہا زنا پر ہوتی ہے، شراب نوش عموماً اس "خطرناک مرض" میں مبتلا پائے جاتے ہیں۔

"قوی شہوانیہ کی تحریک"

یہ تمام اخلاقی بیماریاں ایک شرابی میں صرف اسی لیے پیدا ہوتی ہیں کہ شراب کا استعمال غیر معمولی طور پر قوی شہوانیہ میں ہیجان و حرکت پیدا کرتا ہے جس کے نتیجہ میں ضروری ہوتا ہے کہ ہر قوت نفسانی کی محبوب مرغوب غذا فوراً بہم پہونچائی جائے ورنہ وہ قوت اپنی مطلوبہ غذا کو حاصل نہ کرنے کی صورت میں ایک سخت دھکا کھا کر ماؤف و معطل ہو جاتی ہے، شیخ الرئیس بو علی سینا نے شرابیوں کو شراب نوشی کے سلسلہ میں ہدایت دیتے ہوئے لکھا ہے کہ مجلس شراب میں جاذب نظر گل و ریحان، حسین و دلفریب نوعمر لڑکے، لطیف اور مہیج شہوت بخورات، خوش گلو مطرب، ہونے چاہئیں اس لیے کہ

شراب قوت شہوانیہ کو تحریک دیتی ہے	"وذلک لأن الشراب تحرك
لہذا ہر قوت جب اپنی مطلوبہ غذا نہ پائے	قوی النفس ویثیر کل الشهوات
گی تو منقبض ہو جائے گی۔	فاذا لم تجد کل قوة مطلوبها
(باقی)	تاذت وانقبضت" (نفیسی ص۲۴۳)

(بقیہ مضمون صفحہ ۳۱)

ہر دور کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ اس تقاضہ کو سمجھنا اور سمجھ کر اپنے حالات اور ماحول کی روسے اپنی تنظیم کرنا دنیا میں سنبھلے رہنے اور کامیاب ہونے کے لیے ضروری ہے، ہمارا مستقبل شاندار ہوگا یا تاریک اس کا انحصار اسی پر ہے کہ ہم اس نکتہ کو کس حد تک سمجھ سکتے اور اس پر عمل کر سکتے ہیں۔

تعارف و تبصرہ

اسلام اور انسانی قانون از عبدالقادر عودہ شہید۔ ناشر۔ اسلامک بک سنٹر۔ طرمسجد چوک۔ حیدرآباد دکن۔ صفحات ۹۶ قیمت ۱۵؍ ار

عبدالقادر عودہ، مصر کی جماعت "الاخوان المسلمون" کے ایک مقتدر رہنما تھے۔ پچھلے دنوں "الاخوان" اور مصری حکومت کی افسوسناک کشمکش میں ان کی زندگی آزمائش دار و رسن کی نذر ہو گئی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، ان کی بڑی خوبیاں سننے میں آئی ہیں۔ وہ مصر کے ایک نامور اور فاضل قانون داں تھے اور جماعت اخوان میں آنے سے پہلے ایک عدالت میں جج کے عہدہ پر فائز تھے۔ ایک قانون داں اور جج کی حیثیت سے وہ اپنے ملک کے قانون سے جسقدر واقف ہو سکتے تھے، ظاہر ہے۔ ذہن و فکر نے دین کی روشنی پائی اور اسلام کی حقیقت اور اس کے احکام و مطالبات سے آگاہی ہوئی تو انھوں نے دیکھا کہ ملک کا رائج قانون اسلامی ضابطۂ حیات کے خلاف ہے، اپنے اصول و مبادی میں بھی اور فروع و جزئیات میں بھی۔ اس صورت حال سے متاثر ہو کر انھوں نے موجودہ قوانین اور اسلامی شریعت کو اپنا خاص موضوع بنا لیا اور مقالات و ضخیم تصنیفات کے ذریعہ اس کی کوشش کی کہ اہل مصر پر رائج قانون اور اسلامی شریعت کا تضاد، رائج قانون کی کمزوریاں اور اپنے مقاصد میں اس کی ناکامی، اسلامی شریعت کی برتری اور ہر زمانہ میں قابل نفاذ ہونے کی اس کی اہلیت ظاہر ہو جائے۔ زیر تبصرہ رسالہ ان کے اسی موضوع سے متعلق ایک رسالہ کا ترجمہ ہے۔ مترجم عمر بن عبداللہ صاحب ایم اے عثمانیہ ہیں۔ عبدالقادر عودہ شہید کے بعض مقالات اور بعض تصانیف کے کچھ حصوں کے تراجم ہند و پاک کے بعض رسائل و جرائد میں اس سے پہلے نظر سے گزرے ہیں۔ وہ کافی قدر و قیمت کے حامل نظر

آتے تھے مگر زیر نظر رسالہ پتہ نہیں کہ ترجمہ کا نقص ہے اور بات مترجم کی گرفت میں نہیں آئی یا اصل مضمون ہی کچھ اس قسم کا ہے کہ اس میں کوئی خاص افادیت ہمیں نظر نہیں آتی لیکن فائدہ سے بالکلیہ خالی بھی نہیں ہے۔

پلاننگ پر ایک تنقیدی نظر | از عظمت اللہ خاں صاحب ایم اے عثمانیہ۔ ناشر مکتبہ سیل نو۔ جدید آغا پورہ۔ حیدر آباد دکن۔ صفحات ۱۳۶ قیمت ایک روپیہ۔

یہ پندرہ روزہ سیل نو کی ایک خصوصی اشاعت ہے۔ ہمارے ملک میں حکومت پلاننگ اور منصوبہ بندی کے طریقے کو اپنا چکی ہے مصنف نے اس پلاننگ کے اصول پر ایک تحقیقی اور تنقیدی نظر ڈالی ہے کہ اسکی حقیقت کیا ہے۔ اسکے بارے میں دنیا میں ...... کیا کیا مختلف نظریات پائے جاتے ہیں (مثلاً جمہوری پلاننگ اور سوشلسٹ پلاننگ) ان میں باہم کیا فرق ہے اور مآل کار کوئی فرق رہ سکتا ہے یا نہیں؟ پلاننگ سسٹم کا اثر سماج پر کیا پڑیگا۔ اور اسمیں کیا کیا نقصانات پوشیدہ ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ کتاب کافی محنت وکاوش سے لکھی گئی ہے۔ موضوع سے مصنف کی کافی مناسبت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اس مبحث سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے اس کا مطالعہ یقیناً مفید ہوگا۔

(۱) رسول اللہ کے دو محبوب | از جناب عبدالحق قدوسی صفحات ۶۴ قیمت ۸ر آنے
(۲) رسول اللہ کی دو صاحبزادیاں | از جناب عبدالحق قدوسی صفحات ۸۰ قیمت ۱۲ر آنے
ناشر اسلامک پبلشرز چنچل گوڑہ حیدر آباد دکن۔

یہ دونوں کتابچے علی الترتیب بچوں اور بچیوں کیلئے لکھے گئے ہیں۔ ۱ میں حضرت زیدؓ اور اُن کے صاحبزادے حضرت اُسامہؓ کے اخلاق وسوانح کا مختصر تذکرہ ہے۔ ۲ میں حضورؐ کی بنات طاہرات سیدہ زینبؓ سیدہ رقیہ سیدہ ام کلثوم اور سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہن کے حالات زندگی اور اخلاق وشمائل بیان کیے گئے ہیں۔ زبان بچوں کے مناسب اور انداز دلنشیں ہے پہلے رسالہ میں پہلے ہی صفحہ پر کتابت کی دو قابل تصحیح غلطیاں نظر پڑیں۔ "حُبّ رسول اللہ ح کے پیش کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ صحیح حِب رسول اللہ ح کے زیر کے ساتھ ہے۔ (بمعنی محبوب رسول اللہ)

(سطر ۳) حضرت زیدؓ کی والدہ کا نام "سَعدِی" لکھا ہوا ہے، ہونا چاہیئے "سُعدیٰ"۔

سلاطین ہند کی علم پروری | از جناب محمد حفیظ اللہ صاحب۔ ناشر۔ مسلم اکاڈمی پھلواری شریف (پٹنہ) صفحات ۱۶۸ کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

کتاب کے موضوع اور اس کے مندرجات کے اجمالی تعارف کیلئے کتاب کا نام ہی کافی ہے۔ "سلاطین" پر "مسلم" کا اضافہ اور کر لیجئے۔ اپنے موضوع پر اچھی مختصر کتاب ہے۔

علم الحدیث | از مولانا عبداللہ العمادی صفحات ۹۴ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ ناشر مکتبہ نشاۃ ثانیہ حیدر آباد دکن

مولانا عبداللہ العمادی مرحوم کا یہ مقالہ فتنۂ انکار حدیث کا ایک اچھا جواب ہے، یہ مقالہ اس فتنہ کے ابتدائی دور میں لکھا گیا تھا مکتبہ نشاۃ ثانیہ نے اب اسکو دوبارہ طبع کرایا ہے اسمیں اول حدیث سے متعلقہ علوم و فنون کی تفصیل پیش کی گئی ہے جس کے بعد موضوع احادیث کے وجود کی بنا پر سارے ذخیرہ حدیث کو مشکوک قرار دینے کی حیثیت ایک ہٹ دھرمی سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ ثانیاً حدیث کی تدوین کے بارے میں تاریخی طور پر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یہ کام دوسری صدی میں نہیں پہلی ہی صدی میں شروع ہو چکا تھا اس کے بعد حدیث کے رد و قبول کے باب میں روایت و درایت کے وہ بیش قیمت اصول اور کڑے شرائط بیان کئے گئے ہیں جو مؤلفین حدیث کے پیش نظر ہے اور کھرے اور کھوٹے کو پرکھنے کیلئے جن سے زیادہ اطمینان بخش کسوٹی آج یورپ کے بازار علم و فن میں بھی دستیاب نہیں ہو سکتی۔ احادیث کا ذخیرہ جن بیشمار اجتماعی و عمرانی فوائد سے لبریز ہے جو حدیث کی اہمیت کا ایک اہم پہلو ہے، ایک مثال کے ذریعہ فاضل مصنف نے اس کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی ہے۔ حدیث کے متعلق جو چند شبہات عام طور پر پھیلائے گئے ہیں۔ مثلاً اخبار احاد سے یقین کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ یا بہت سی حدیثیں خلاف عقل ہیں، بتلایا گیا ہے کہ یہ شبہات کسقدر بے وزن ہیں۔ بعض احادیث جن پر خلاف عقل ہونے کا الزام ہے، اُن پر سیر حاصل بحث کر کے دکھلایا گیا ہے کہ اعتراض کی بنا معترضین کی کم علمی اور عربی ادب سے ناواقفی ہے ــــــ بہرحال یہ مختصر سا رسالہ "مَا قَلَّ وَ دَلَّ" کا مصداق اور ہر تعلیمیافتہ مسلمان کے مطالعہ کے لائق ہے۔ صفحہ ۳ پر احادیث کے بارے میں مصنف کا

یہ کہنا کہ "ہم کو بہت صاف لفظوں میں اعتراف ہے کہ اسلام کی تکمیل پر ان اقوال و افعال کے وجود و عدم کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا" محل نظر ہے۔ مصنف مرحوم اگر حیات ہوتے تو ہم ان سے نظر ثانی کی درخواست کرتے! اسلئے کہ انکا مطلب غالباً اس سے وہ نہو گا جو فتنہ پرداز لے سکتے ہیں۔

حج کیا ہے | از مولانا سید حامد علی صاحب۔ صفحات ۹۶ قیمت ۸ رآنے۔

ناشر۔ مکتبہ جماعت اسلامی (ہند) رام پور یو۔ پی۔

حج کی حقیقت اور اس کے مقاصد اس رسالہ کا خاص موضوع ہے۔ آخر میں حج کا طریقہ اور کچھ مسنون اذکار بھی شامل ہیں۔ یہ اس رسالہ کا دوسرا ایڈیشن ہے جس میں پہلے ایڈیشن کے مقابلہ میں کافی اضافات ہیں۔ حج کی روح اور اس کے مقصد سے عام حجاج کی بے خبری ہی نے اس انقلاب انگیز عبادت کو بے اثر بنا رکھا ہے۔ یہ اس بے خبری کو آشنائی سے بدلنے کی ایک کوشش ہے اور مجموعی اعتبار سے مفید!

صحیح لغات القرآن | مؤلفہ مولانا شہید الدین صاحب مرحوم۔ ناشر۔ نور محمد کارخانہ تجارت کتب۔ آرام باغ۔ کراچی۔ صفحات ۶۱۲ قیمت چار روپے (سائز خورد)

قرآن کے تمام الفاظ بہ ترتیب حروف تہجی اردو معانی کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں۔ لغات کے متعلق کوئی رائے بلا تجربہ نہیں دی جا سکتی۔ سرسری نظر میں بظاہر کتاب کارآمد ہے۔ تعجب ہے کہ کتابت طباعت ناشر کے عام معیار سے کیوں گری ہوئی ہے۔ ہندوستان میں اشتیاق بکڈپو۔ دیوبند سے طلب کی جا سکتی ہے۔

دلائل احترام مسلم | از مولانا عبدالرؤف صاحب رحمانی جھنڈانگری۔ صفحات ۲۸۔ قیمت ۴ر

ملنے کا پتہ:۔ مولانا عبدالرؤف صاحب معرفت قاضی تبارک اللہ صاحب۔ پوسٹ رامدت گنج۔ ضلع بستی۔ یو پی۔ مسلمان کی غیبت تحقیر اور لعن وطعن وغیرہ کے متعلق آیات و احادیث اور آثار صحابہ پیش کر کے بتلایا گیا ہے کہ یہ کیسی مبغوض عادتیں ہیں اور اس کے برعکس ایک مسلمان کا معاملہ دوسرے مسلمان کے ساتھ کیسا ہونا چاہیئے۔

الفرقان کی آئندہ اشاعت کے متعلق

ضروری اعلان

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی نور اللہ مرقدہ کے وصال کے بعد سے ہمیں برابر خیال ہے کہ الفرقان کا ایک خاص نمبر مولانا مرحوم سے متعلق نکالا جائے۔ مگر اس خیال کو عمل میں لانے کی فرصت ابتک نہیں مل سکی تھی۔ اب بنام خدا ارادہ کیا گیا ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے الفرقان کی اگلی اشاعت میں اس خیال کو عمل کا جامہ پہنا دیا جائے۔

کسی شخصیت سے متعلق خاص نمبروں کا مروج طریقہ یہ ہے کہ اس شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر مختلف اہل قلم کے مضامین جمع کئے جائیں۔ الفرقان کا یہ نمبر اس طور پر مرتب نہیں کیا جائیگا۔ بلکہ ہمارے پیش نظر یہ ہے کہ مولانا کے جو مضامین و مقالات گزشتہ ۱۸-۱۹ سال میں الفرقان میں شائع ہوئے اور اُن کی اشاعت الگ کتابی شکل میں نہیں ہوئی ہے، اُن پر ایک انتخابی نظر ڈالی جائے اور اس ہزار دو صفحات کے ذخیرہ میں سے مولانا کے اہم علمی اور اصلاحی افادات بقدر ضرورت تسہیل کی خدمت کے ساتھ اس نمبر میں یکجا کر دیے جائیں۔ اس طور پر الفرقان کا یہ نمبر "گیلانی نمبر" نہیں بلکہ

"افادات گیلانی نمبر"

ہوگا

ہمیں اُمید ہے کہ یہ مولانا کی ایک اچھی یادگار ہوگی اور اُن کی مسلّمہ ژرف نگاہی اور نکتہ سنجی کی وہ قابل دید یادگاریں جو الفرقان کے فائلوں میں دب کر رہ گئی ہیں ایکمرتبہ پھر تابندہ ہو کر سامنے آجائیں گی۔

یہ نمبر انشاء اللہ مئی کی ۵ تاریخ کو شائع ہوگا اس سے پہلے اب کوئی شمارہ شائع نہ ہو سکے گا۔

ناظرین اپریل میں الفرقان کا انتظار نہ فرمائیں۔

"ادارہ الفرقان"
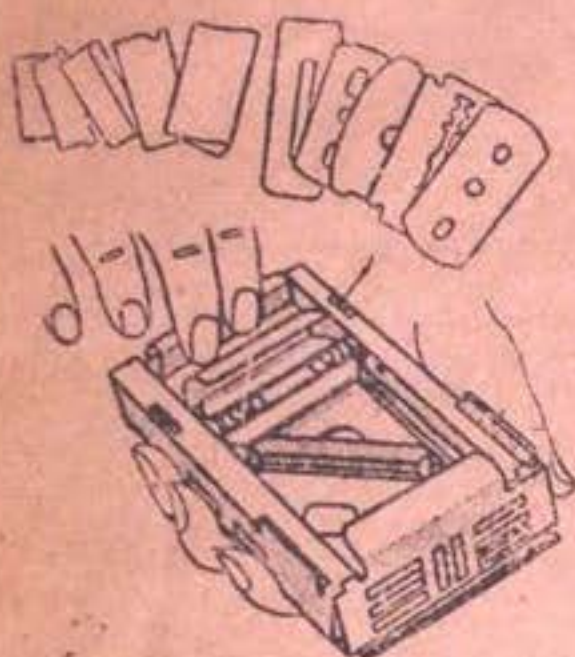
ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ملکیت و دیگر تفصیلات کے متعلق بیان

اخبارات کے رجسٹریشن (مرکزی) قواعد ۱۹۵۶ء

کے قاعدہ ۸ کے تحت حکومت ہند کی وزارت

اطلاعات و نشریات کا مطلوبہ بیان متعلق ملکیت و دیگر

تفصیلات۔

(۱) مقام اشاعت .. .. لکھنؤ

(۲) وقفہ اشاعت .. .. ماہانہ

(۳) اڈیٹر، پرنٹر، پبلشر اور مالک کا نام ... محمد منظور نعمانی

قومیت .. .. ہندوستانی

پتہ .. .. کچہری روڈ۔ لکھنؤ

میں (محمد منظور نعمانی) بذریعہ ہذا اعلان کرتا ہوں

کہ مندرجہ بالا تفصیلات جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے صحیح ہیں۔

دستخط پبلشر (محمد منظور نعمانی)

مختصر فہرست کتب خانۂ الفرقان۔ لکھنؤ

پہلے یہ چند باتیں ضرور ملاحظہ فرمایئے!

(۱) اپنا پتہ ہمیشہ صاف اُردو میں ضرور لکھئے، اور اگر ہو سکے تو انگریزی میں بھی لکھ دیجئے!۔

(۲) اگر آپ صرف ایک دو روپئے کی کتابیں منگوائیں گے تو محصولڈاک کا بار بہت زیادہ پڑ جائے گا اور اگر زیادہ منگوائیں گے یا اگر چند ساتھی مل کر اور زیادہ منگوائیں گے تو محصول کا بوجھ اسی حساب سے بہت کم ہو جائے گا اور آپ نفع میں رہیں گے۔

پاکستانی احباب کی خدمت میں!

(۳) آپ حضرات کو جو کتابیں منگوانی ہوں اُن کی قیمت اس فہرست میں دیکھ لیجئے، پھر اس قیمت پر فی روپیہ دو آنے کے حساب سے محصول بک پوسٹ اور دس آنے رجسٹری فیس وصرفہ پیکنگ کا اضافہ کر کے کل رقم ذریعۂ منی آرڈر" ناظم ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگس لاہور" کے نام روانہ کر دیجئے، اور ڈاک خانہ کی ابتدائی رسید تفصیلی فرمائش کے ساتھ ہم کو بھیجدیجئے، یہاں سے کتابیں رجسٹرڈ آپ کو روانہ کر دی جائیں گی۔

(۴) یاد رکھئے کہ ایک بنڈل میں مختلف کتابوں کے چند نسخے ہندوستان سے پاکستان جا سکتے ہیں، لیکن ایک کتاب کے دو نسخے بھی نہیں جا سکتے۔

ہماری مطبوعات ایک نظر میں

جلد اوّل
معارف الحدیث
مجلد للعہ
غیر مجلد ۱۲/ے

اسلام کیا ہے؟
نیا اڈیشن
قسم اعلیٰ مجلد ۱۲/ے
قسم دوم غیر مجلد ۱۲/

کلمۂ طیبہ کی حقیقت
قیمت:۔ ۶/ آنے

نماز کی حقیقت
قیمت:۔ ۱۲/ آنے

آپ حج کیسے کریں
قسم اوّل مجلد ۱۲/عہ
دوم غیر مجلد عہ/

آسان حج
حج کیسے کریں کا خلاصہ
جیبی سائز
قیمت:۔ ۶/ آنے

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور اُن کی دینی دعوت
قیمت:۔ ۸/ ے

ملفوظات
حضرت مولانا محمد الیاسؒ
قیمت:۔ ۸/عہ

امام ولی اللہ دہلویؒ
از
مولانا سندھی مرحوم
قیمت:۔ عہ/

اسلام اور نظام سرمایہ داری
قیمت:۔ ۸/

بوارق الغیب
حصۂ دوم
قیمت:۔ عہ/

دیوبند اور بریلی کے اختلاف پر
فیصلہ کن مناظرہ
اکابر جماعت دیوبند پر سنگین الزامات مولانا احمد رضا خاں صاحب کے قلم سے اُن کے تحقیقی اور تشفی بخش جوابات مولانا نعمانی کے قلم سے قیمت عہ

قادیانیت پر غور کرنے کا
سیدھا راستہ
قادیانی مذہب اور اسکے بانی کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے مولانا نعمانی کا یہ مختصر رسالہ کافی ہے۔ قیمت صرف:۔ ۶/

کلمۂ طیبہ کی حقیقت

از افادات مولانا محمد منظور نعمانی

اس رسالہ میں اسلام کے کلمۂ دعوت لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ ایسے دلنشیں اور مؤثر انداز میں کی گئی ہے کہ سطر سطر کے مطالعہ سے نور یقین میں اضافہ ہوتا ہے، اور ایمان تازہ ہوتا ہے، اردو زبان میں کم از کم ہمارے علم میں توحید و رسالت کے متعلق کوئی اور ایسا محققانہ اور عارفانہ رسالہ موجود نہیں ہے جس سے عقل اور جذبات اور دل و دماغ یکساں طور پر متاثر ہوں۔

تازہ اڈیشن ——— قیمت :- ۶/ر

نماز کی حقیقت

از افادات مولانا محمد منظور نعمانی

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے مقام اور اس کی روح و حقیقت سے واقف ہونے کے لئے اور اپنی نماز میں روحانیت اور نورانیت پیدا کرنے کیلئے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔ نماز کے متعلق کتاب و سنت کے لطیف اشارات، اور ائمۂ دین و معرفت خصوصاً امام غزالیؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے عارفانہ افادات کا عطر کھینچ کر اس رسالہ کی صورت میں پیش کر دیا گیا ہے۔ کاغذ و طباعت اعلیٰ قیمت ۱۲/ر

آپ حج کیسے کریں؟

مرتبۂ

مولانا محمد منظور نعمانی، و مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

حج و زیارت کے موضوع پر اب اردو میں بیشمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن یہ کتاب اپنی اس خصوصیت میں اب بھی ممتاز اور منفرد ہے کہ حج کے احکام اور اس کا پورا طریقہ بھی یہ بہت آسان اور دلنشین طریقے پر بتاتی ہے، اور ذوق و شوق اور عشق کا وہ جذبہ بھی پیدا کرتی ہے جو حج کی روح اور جان ہے۔ قیمت :- مجلد قسم اول (۱۲/ر) - غیر مجلد، قسم دوم (عه/ر)

آسان حج

یہ آسان زبان میں "حج کیسے کریں" کا مکمل خلاصہ ہے، کم تعلیم یافتہ حضرات کیلئے اپنے موضوع پر یہ بہترین کتاب ہے۔ قیمت :- ۶/ر

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ
اور ان کی دینی دعوت

"تالیف مولانا سید ابو الحسن علی ندوی"

اس کتاب میں مولانا مرحوم کے ذاتی حالات اور سوانح کے علاوہ ان کی مشہور دینی و اصلاحی دعوت کو بھی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے، جو بلا شبہ اس دور کی نہایت وسیع اور گہری دینی و اصلاحی تحریک ہے۔

شروع میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا مبسوط مقدمہ ہے، جس میں کتاب و سنت کی روشنی میں انبیاء علیہم السلام کے اصول دعوت کی تشریح کر کے دکھلایا گیا ہے کہ اس دینی تحریک کو اسوۂ انبیاء سے کس درجہ مطابقت ہے۔ کتابت و طباعت اعلیٰ، کاغذ نفیس۔

قیمت :- ۱۲/ر

ملفوظات

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ

مرتبۂ

"مولانا محمد منظور نعمانی"

آج مولانا مرحوم اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن اگر کوئی انھیں جاننا اور ان کی باتیں اور ہدایتیں سننا چاہے تو حضرت مرحوم کے اس مجموعۂ ملفوظات کا مطالعہ کرلے جو دین کے حقائق اور معارف کا عجیب و غریب گنجینہ ہے ——— اس سے مولانا مرحوم کی دینی دعوت کی روح و حقیقت، اسکے اصول و مقاصد اس کی گہرائیاں بھی معلوم ہوں گی اور یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ تفقہ فی الدین اور معرفت و یقین میں مولانا کا مقام کتنا بلند تھا، اور امت مسلمہ کے امراض کی مولانا نے کتنی صحیح تشخیص کی تھی۔ کاغذ، کتابت، طباعت اعلیٰ۔

قیمت :- ۸/ر

قرآن مجید سے متعلق کتابیں

تفسیر ابن کثیر (اُردو)

حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ کی تفسیر جو عربی تفسیروں میں بھی بے نظیر اور مستند ترین تفسیر سمجھی جاتی ہے، اور جو سلف صالحین کی تفسیری محنتوں کا قابل اعتماد ذخیرہ ہے، اور جس میں یہ التزام ہے کہ آیات کی تفسیر وہ پہلے دوسری آیتوں سے کرتے ہیں، اسکے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے، پھر صحابہؓ کرام اور تابعین اور بعد کے ائمہ تفسیر کے ارشادات سے، یہ اس کا مکمل اُردو ترجمہ ہے پانچ ضخیم جلدیں ہیں۔ قیمت مجلد مکمل سیٹ (ھلعہ روپئے)

تفسیر بیان القرآن

(از حکیم الامت حضرت مولٰنا تھانویؒ)

مکمل بارہ جلد۔ طبع ہندوستان۔ ۶۰/- روپیہ

بیان القرآن مطبوعہ تاج کمپنی پاکستان

لاہور کی تاج کمپنی اپنے خاص طرز پر نہایت اہتمام کے ساتھ بیان القرآن کو چھاپ رہی ہے اب تک چھ جلدیں شائع ہوئی ہیں ہر جلد میں ڈھائی پارہ کی تفسیر ہے۔ قیمت فی جلد ۶/ (واضح رہے کہ اس میں بیان القرآن کا عربی حصّہ نہیں لیا گیا ہے)۔

تفسیر ماجدی

مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کی اُردو تفسیر قرآن کی دو جلدیں تاج کمپنی لاہور کی طرف سے چھپ چکی ہیں جس کی طباعت کیلئے تاج کمپنی کا نام ہی کافی ہے۔ قیمت جلد اول مجلد ۱۳/ جلد دوم مجلد ۱۳/ جلد سوم ۱۲/

قصص القرآن

(از مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی)

قرآن پاک میں انبیاء علیہم السلام کے سوانح حیات، ان کی امتوں اور مختلف قوموں و شخصیتوں کے جو قصص و واقعات مذکور ہیں اس کتاب میں انھیں بڑی تفصیل اور تحقیق کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، بلا شبہ یہ کتاب ایک مذہبی و تاریخی شاہکار ہے ——

جلد اوّل:۔ حضرت آدمؑ سے حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کے حالات تک۔ قیمت:۔ ۶/

جلد دوم:۔ حضرت یوشعؑ سے حضرت یحییٰؑ تک کے واقعات۔ قیمت:۔ للعہ/

جلد سوم:۔ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ باقی تمام قصص قرآن کا بیان۔ صہ/

جلد چہارم:۔ حضرت عیسیٰؑ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور متعلقہ واقعات۔ قیمت:۔ ۶/

الحیوانات فی القرآن

(از مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی)

قرآن مجید میں جتنے حیوانات کا کہیں ذکر آیا ہے، ان کے متعلق لغوی تحقیقات اور تاریخی و تفسیری مباحث کا ایک علمی مرقع۔ قیمت:۔ عہ/

قرآنی جغرافیہ:۔ از مولانا موصوف۔ قیمت عہ/

رہنمائے قرآن

اسلام اور پیغمبر اسلام کی صداقت کو سمجھنے کیلئے اپنے انداز کی بالکل ہی نئی کتاب۔ اصل کتاب انگریزی میں تھی، اُردو ترجمہ ڈاکٹر میر ولی الدین (پی، ایچ، ڈی) نے کیا ہے۔ قیمت عہ/

لغات القرآن

(تالیف مولانا عبد الرشید صاحب نعمانی)

اُردو زبان میں قرآن شریف کے تمام الفاظ لغات کی نہایت مفصل اور مبسوط تشریح کی گئی ہے اپنے موضوع میں بے نظیر اور محققانہ کتاب ہے —— چار جلدیں تیار ہیں، آخری پانچویں جلد عنقریب تیار ہونیوالی ہے۔ قیمت جلد اوّل (للعہ/) جلد دوم (للعہ/) جلد سوم (للعہ/) جلد چہارم (صہ/)۔

قاموس القرآن

(از مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی)

اس میں تمام الفاظ قرآنی کا صحیح اُردو ترجمہ اور ان کی مکمل صرفی و نحوی تشریح درج کی گئی ہے، نیز قرآن کریم کے تمام وضاحت طلب الفاظ پر سلیس و شیریں زبان میں مختصر مگر جامع اور مستند نوٹ لکھے گئے ہیں۔ قیمت:۔ معہ/

ترجمۂ قرآن کا مکمل نصاب

(از جناب مولانا محفوظ الرحمٰن نامی)

مفتاح القرآن حصّہ اوّل ۵/، دوم ۶/، سوم عہ/، چہارم عہ/، پنجم عہ/۔

معلّم القرآن . . . . . . عہ/

مصباح اللغات اُردو میں عربی زبان کا سب سے زیادہ جامع اور مبسوط لغت۔ مجلد ۱۶/

اُردو عربی ڈکشنری ۶/

قرآن اور تعمیر سیرت از ڈاکٹر میر ولی الدین قیمت ۵/- مجلد ۶/-

قرآن اور تصوف از ڈاکٹر میر ولی الدین قیمت ۲/- مجلد ۳/-

۱ حدیث شریف سے متعلق کتابیں

صحیح بخاری شریف (مکمل اُردو)

سات ہزار سے زائد صحیح حدیثوں کا مجموعہ یہ بخاری شریف کا مکمل اُردو ترجمہ ہے، جو بہت اہتمام سے چھاپا گیا ہے۔ تین ضخیم جلدیں ہیں۔ قیمت کامل مجلد / ۲۷ روپیہ

جامع ترمذی شریف (اُردو)

ترمذی شریف کو صحاح ستہ میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ امام ترمذی نے اس کا التزام کیا ہے کہ ہر باب میں حدیثیں درج کرنے کے ساتھ وہ ائمۂ امت کا مذہب بھی لکھتے ہیں ——— یہ اس کا مکمل اُردو ترجمہ ہے۔ دو ضخیم جلدیں۔ قیمت مجلد / ۱۸ روپیہ

مشکوٰۃ شریف (اُردو)

چھ ہزار سے زائد حدیثوں کا مجموعہ مشکوٰۃ شریف کو بجا طور پر حدیث کے کتبخانہ کا جامع انتخاب کہا جا سکتا ہے۔ اس میں حدیث کی گیارہ کتابوں، بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی، موطا امام مالک، مسند شافعی، مسند احمد، بیہقی و دارمی کی منتخب حدیثیں آگئی ہیں۔ یہ اس کا مکمل ترجمہ ہے جو پورے اہتمام سے چھاپا گیا ہے۔ دو ضخیم جلدیں۔ قیمت مجلد / ۱۸ روپیہ

الابواب والتراجم

صحیح بخاری شریف کے تراجم ابواب پر حضرت شیخ الہندؒ کا قابل دید رسالہ، اُردو زبان میں۔ قیمت:- عمر

افادات محمود (از شیخ الہندؒ) قیمت ۸ر

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ کی
حجۃ اللہ البالغہ

مع ترجمہ اُردو

اسلامی اسرار و حقائق کے بیان اور احادیث نبویہ کی عارفانہ اور حکیمانہ تشریح میں یہ کتاب بلاشبہ پورے اسلامی کتبخانہ میں بے نظیر ہے۔ علامہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اسکے بارہ میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ

"ایں کتاب اگرچہ در علم حدیث نیست اما شرح احادیث بسیار کردہ و حکم و اسرار آں بیان نمودہ تا آنکہ در فن خود غیر مسبوق واقع شدہ"

اس کتاب کے دو اُردو ترجمے پہلے بھی شائع ہوئے تھے، لیکن اب اصح المطابع کراچی نے اس کو تفسیر حقانی کے مصنف مولانا عبدالحق حقانی مرحوم کے بہترین ترجمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اصل عربی متن بھی ساتھ چھاپا گیا ہے۔ علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے بہترین علمی تحفہ ہے۔ اعلیٰ کاغذ اعلیٰ کتابت و طباعت۔ دو ضخیم جلدیں قیمت مجلد:- ۲۰ر

نصرۃ الحدیث

از حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی

حدیث پر منکرین حدیث کے حملوں کے جواب میں اب بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، لیکن اپنی علمی اور تحقیقی خصوصیات کے لحاظ سے یہ کتاب اس موضوع پر اب بھی ممتاز ہے۔ بہترین کتابت و طباعت۔ قیمت:- چہر

ترجمان السنّۃ

از حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مقیم مکۂ مکرمہ

حدیث کی ایک نہایت مبسوط اور جامع کتاب اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ۔ ہر جلد بجائے خود بھی علوم و معارف کا ایک مستقل خزانہ ہے۔ قیمت جلد اول عنہ ر جلد دوم لعہ ر۔ جلد سوم بھی تیار ہو کر آگئی ہے۔ قیمت:- عنہ ر۔

حدیث کا ایک اہم تاریخی مجموعہ

صحیفۂ ہمام بن منبّہ

ہمام بن منبّہ، مشہور صحابی حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد ہیں، انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے سنی ہوئی حدیثوں کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کر لیا تھا، اور یہ اسی سے روایت کیا کرتے تھے، حدیث کی کتابوں میں اس کا صرف تذکرہ ملتا تھا، ہمارے زمانہ کے مشہور محقق ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے بڑی تلاش اور جستجو سے اس کا نسخہ کسی طرح حاصل کیا اور اپنے فاضلانہ مقدمہ اور ترجمہ و تشریحی نوٹوں کے ساتھ شائع کیا ہے۔ قدر دانوں کیلئے بڑا قابل قدر تحفہ ہے۔ قیمت:- ۲ روپے

زاد سفر

امام نوویؒ کی بہترین کتاب ریاض الصالحین کا ترجمہ محترمہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کے قلم سے (دو جلدوں میں)، شروع میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ قیمت جلد اول مجلد کاغذ بہتر ے ر۔ غیر مجلد کاغذ معمولی (عـہ ر)، جلد دوم مجلد کاغذ بہتر للعہ ر

علم الحدیث:- اپنے موضوع پر بہترین کتاب جو حدیث کے بارہ میں پیدا کئے جانے والے شبہات کا جواب ہے۔ قیمت:- عہر

مختلف موضوعات پر منتخب کتابیں

تاریخ اسلام
(از حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی)
مجلد خوبصورت چھوٹی تقطیع۔ قیمت عہ

سلسلۂ تاریخ ملت
(شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی)

حصہ اول (نبی عربی) عہ
" دوم (خلافت راشدہ) ہے
" سوم (خلافت بنو امیہ) ہے
" چہارم (خلافت ہسپانیہ) عگر
" پنجم (خلافت عباسیہ اول) ۱۲ ہے
" ششم (" " دوم) للعہ ۱۲
" ہفتم (تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ) ہے
" ہشتم (خلافت عثمانیہ) ہے
" نہم (تاریخ صقلیہ) یعنی صقلیہ کے عہد اسلامی کی جامع تاریخ۔ عہ ۱۲
حصہ دہم (سلاطین ہند) اس میں سندھ کی پہلی مہم اور سلطان محمود غزنوی سے لے کر سلطان سکندر لودھی کے زمانہ تک کے حالات جامعیت کیساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ ہے
پورا سٹ (دس جلد و نجیں) مجلد للعہ

قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات
جب سارے یورپ پر جہالت و ظلمت کی حکومت تھی تو مسلمان علم کی شمع کو کس طرح روشن کر رہے تھے۔ قیمت حصۂ اول مجلد عگر ۱۲ حصۂ دوم مجلد ہے

تاریخ اسلام پر ایک نظر
اسلام کے مختلف دوروں اور خلافت و حکومت کے مختلف سلسلوں کی جامع و مختصر تاریخ ہے مجلد ہے

سیف اللہ الجبار
حضرت خالد بن ولید کی سوانح حیات قیمت ۱۲ ار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات و معاہدات
یعنی شاہان عالم، عرب کے حکمرانوں اور قبائلی سرداروں سے آپ کی سیاسی خط و کتابت اور معاہدات، انکے پس منظر اور نتائج، گویا حضورؐ کی ۲۳ سالہ دعوت و تبلیغ کی تاریخ، مکتوبات و معاہدات کی روشنی میں۔ از سید محبوب صاحب رضوی دیوبندی۔ مجلد عگر

تاریخ مشائخ چشت
(از پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی)
سلسلۂ چشتیہ کی نظامی شاخ کی چند اہم شخصیتوں کا مفصل اور محققانہ تذکرہ اور تصوف، اور خاصکر چشتی سلسلہ کے متعلق نہایت اہم اصولی بحثیں۔ فاضل مصنف نے اس کی تصنیف میں عربی، فارسی، اردو، انگریزی کی ۸۰۲ کتابوں سے مدد لی ہے قیمت عہ ۱۲

حیات شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ
(از پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی)
حضرت شیخ موصوف ہندوستان کی نہایت اہم شخصیتوں میں سے ہیں۔ آپکی سوانح کی کمی کو اس تحقیقی کتاب نے پورا کر دیا ہے۔ قیمت مجلد عہ

سوانح قاسمی
مولانا گیلانی مرحوم کے قلم سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کی مفصل سوانح حیات قیمت جلد اول ہے، جلد دوم ہے

حیات انور
خاتم المحدثین حضرت مولانا محمد انور شاہ کاشمیریؒ کی سوانح حیات۔ قیمت مجلد للعہ

اسلام کا نظام حکومت
اس میں اسلام کی ریاست عامہ کا مکمل دستور اساسی اور مستند ضابطۂ حکومت پیش کیا گیا ہے، طرز تحریر زمانہ حال کی قانونی زبان سے پوری مطابقت رکھتا ہے، اسکے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اسلام کا نظام حکومت دوسرے رائج الوقت نظاموں سے کس قدر بلند ہے قیمت ہے، مجلد عہ

مسلمانوں کا نظم مملکت
یہ در اصل ایک مصری فاضل کی کتاب "النظم الاسلامیہ" کا اردو ترجمہ ہے اسکے مطالعہ سے مسلمانوں کے نظام حکومت و مملکت کی ایک صاف محققانہ تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ قیمت للعہ، مجلد صہ

اسلام کا اقتصادی نظام
مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی کی مشہور تالیف ہے، جدید اڈیشن فاضل مؤلف کے اہم اضافات کے ساتھ شائع ہوا ہے قیمت شہ مجلد تے

اسلام کا زرعی نظام
اپنے موضوع پر جامع اور اپنی نوعیت کی پہلی کتاب۔ قیمت للعہ، مجلد شہ

اسلام کا نظام عصمت و عفت
اسلام نے پاکدامنی اور عصمت کی حفاظت کے جو اصول مقرر کئے ہیں، انکی تفصیل اور انکی حکمت اس کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے۔ قیمت للعہ

اسلام کا نظام مساجد
اسلام کے نظام میں مساجد کا کیا مقام ہے، اور اس سے کتنے اہم مقاصد وابستہ ہیں، اور اسکے بارہ میں اسلام کے احکام

تاریخ دیوبند یہ در اصل قصبۂ دیوبند اور دار العلوم دیوبند کی تاریخ ہے، شروع میں مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم کا [illegible]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تالیفات

تاریخ دعوت و عزیمت (جلد اوّل)

اس کتاب کو بجا طور پر اس دور کی عظیم ترین کتاب کہا جاسکتا ہے مجددین امت کے کارناموں پر یہ پہلی مبسوط اور محققانہ کتاب ہے ابھی صرف جلد اول چھپی ہے جس میں ساتویں صدی تک کے مجددین اور خاص مصلحین کا تفصیلی تذکرہ ہے، گویا مسلمانوں کی سات صدیوں کی دینی تاریخ ہے، علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ دونوں کیلئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

قیمت :- ے ر

انسانی دنیا پر

مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر

یہ کتاب اس قسم کی تصنیفوں میں ہے جو مردہ قوموں کو زندہ کر دیتی ہیں، اسکے کئی عربی اڈیشن مصر میں نکل چکے ہیں۔ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ مشرق [illegible] کی اور اسلامی حلقوں کو اس کتاب سے زیادہ دور حاضر کی کسی تصنیف نے متاثر نہیں کیا۔ قیمت مجلد (للعہ)

اصلاحیات

مولانا کے چند منتخب اصلاحی مضامین اور دعوتی تقریروں کا مجموعہ۔

قیمت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عہ

مولانا ندوی کے سفر ترکی کا روزنامچہ

دو ہفتے ترکی میں

آپکے تاثرات اور معلومات و مشاہدات کا آئینہ۔ ہر صاحب ذوق مسلمان سے اسکے مطالعہ کی سفارش کی جاسکتی ہے۔ قیمت مجلد ۔ ۔ ۔ ۔ عہ

پیام انسانیت

مولانا موصوف کی ۵ ایسی اہم تبلیغی و اصلاحی تقریروں کا مجموعہ جو مخلوط اجتماعات میں کی گئیں۔ اور جن میں آپ نے مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کو بھی مخاطب کیا۔ قیمت ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۰ر

سلسلۂ تجدید دین کی چار کتابیں!

یعنی حکیم الامت حضرت تھانوی کی دینی اصلاحات و تجدیدات نئے قالب اور نئی زبان میں۔ از مولانا عبد الباری صاحب ندوی

ان کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اصل دین کیا ہے، اور ہم نے اس سے بے تعلقی اختیار کرکے اپنے کو اس کی برکتوں اور خدائی رحمتوں سے کس قدر محروم کر لیا ہے۔

(۱) جامع المجددین

اس میں خصوصاً اعمال ظاہر کی صلاح و اصلاح پر بحث ہے، جو شریعت کا خاص موضوع ہے۔

قیمت :- مجلد صہ

(۲) تجدید تصوف و سلوک

اس کا موضوع انسانوں کی قلبی باطنی یا اخلاقی اصلاح ہے اس میں تصوف کے متعلق موافقین و مخالفین کی تمام نئی پرانی غلطیوں اور غلط فہمیوں کو دور کرکے بتلایا گیا ہے کہ تصوف در اصل نام ہے عین اسلام بلکہ کمال اسلام کا۔ قیمت مجلد صہ

(۳) تجدید تعلیم و تبلیغ

اس میں دین کی تعلیم و تبلیغ کا مکمل نظام بتلایا گیا ہے۔

قیمت ۔ مجلد ے

(۴) تجدید معاشیات

معاشیات کے موضوع پر خالص ایمانی نقطۂ نظر سے اس دور کی یہ واحد تصنیف ہے، جس میں معاشیات کے نو پید انظریوں اور نعروں سے مرعوب ہوئے بغیر، بلکہ ان کو محض فریب ثابت کرتے ہوئے رزق و معاش سے متعلق خالص اسلامی تعلیم کو پیش کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد ۔ ۔ ۔ ۔ صہ

تالیفات

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ

خصائل نبوی یعنی شرح شمائل ترمذی

جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات اور روزمرہ کے معمولات کا تفصیل کے ساتھ بیان ہے، اپنے موضوع پر ایک ہی کتاب ہے۔

قیمت :- صہ

حکایات صحابہ عہ ۔ فضائل نماز ۸ر ۔ فضائل تبلیغ ۶ر فضائل ذکر عہ ۔ فضائل قرآن ۱۲ر ۔ فضائل رمضان ۱۲ر فضائل حج ے ر ۔ فضائل صدقات (حصہ اول) عہ فضائل صدقات (حصہ دوم) ۱۴ر ۔

تالیفات

مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی

حقیقت ذکر مجلد ۔	عہ	تجلیات کعبہ۔ مجلد ۔	ے ۔
تجلیات مدینہ	عہ	ارکان اسلام	عہ
دین خالص	۸ر	اسلامی زندگی	۱۴ر
شاہراہ ترقی	۱۲ر	پستی کا واحد علاج	۱۴ر
حیات فخر	۱۰ر	اصلاح معاشرت	۱۴ر

اپنی حالت اور ضرورت کے مطابق کتابوں کا انتخاب کیجئے!

فقہ و فتاویٰ

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند
مرتبہ مفتی مولانا محمد شفیع صاحب
دارالعلوم دیوبند کا یہ مستند فتاویٰ آٹھ جلدوں میں ہے۔
قیمت۔ کامل ... ... عـہ
اختری بہشتی زیور مکمل، ـــہ ر

"الجواب المتین"
اسمیں ڈیڑھ سو فقہی سوالات کا جواب صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے دیا گیا ہے۔
قیمت ۸ر

"احکام العیدین" ... ۸ر

چند قابل مطالعہ کتابیں
"دین و دانش" از پروفیسر محمود علی سائنس کی روشنی میں اسلام کی حقانیت ثابت کی گئی ہے، اپنے موضوع پر بے نظیر کتاب ہے۔ جواب نایاب ہے۔ قیمت:۔ عـہ

"معارف القرآن" اسلامی تعلیمات کا فلسفہ۔ قیمت عـہ

"عہد نبوی میں نظام حکمرانی" از ڈاکٹر حمید اللہ صاحب۔ مجلد للعہ

"سد باب ذریعہ" (اردو) علامہ ابن القیم کی ایک اہم کتاب کا ترجمہ۔ قیمت ۱۰ر

"ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" (از مولانا مسعود عالم مرحوم) عـہ

"ایک مظلوم اور بدنام مصلح" (محمد بن عبدالوہاب نجدی کا حال) قیمت ... ... عـہ

بہت مفید چند کتابیں

ارشاد السالکین:۔
ہر دیندار اور طالب خدا کے پاس رہنے کے لائق یہ نہایت مفید اور موثر کتاب ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب کو بجا طور سے تصوف کے کتب خانہ کا عطر کہا جا سکتا ہے۔
قیمت مجلد ... ... عـہ

ہر مسلمان کے گھر میں
یہ کتابیں رہنی چاہئیں
زبان آسان معلومات مستند

سراپائے رسول ... ۱۴ر
رسول پاک کی صاحبزادیاں ۔۱۲ر
ہمارے نبی کے صحابہؓ ... عـہ
رسول اللہ کے دو محبوب ۸ر
عہد نبوی کے دو بچے (حضرت عبداللہ بن عمرؓ و حضرت ابن عباسؓ) عـہ
درسگاہ رسول کے دو طالب علم (حضرت ابو ہریرہؓ و حضرت ابن مسعودؓ) ... ... عـہ
سیرت حضرت امام حسنؓ ۱۴ر

ہمارے بچوں کا نصاب
جس کا پڑھانا دل میں ایمان کی جڑ مضبوط ہونے کی ضمانت ہے
اللہ کے رسولؐ ۶ر
حضرت ابوبکرؓ ۶ حضرت عمرؓ ۶ر
عثمانؓ ۶ر علیؓ ۶ر
اچھا قاعدہ ۲ر اچھے قصے ۶ر
اچھی باتیں ع۱ ۴ر ع۲ ۸ر
ع۳ ۶ر ع۴ ۸ر
حصہ پنجشم ۸ر

اکابر علماء اور مشاہیر امت کی تالیفات

عقد الجید (مع ترجمہ اردو) اجتہاد اور تقلید کے موضوع پر حضرت شاہ ولی اللہؒ کی محققانہ تالیف ہے۔ قیمت ... ... عـہ

"قطرات" شاہ صاحب موصوف کی اہم عارفانہ تصنیف ہمعات کا اردو ترجمہ۔ قیمت ۱۴ر

"مسئلہ تفضیل شیخین" حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا فارسی رسالہ (مع اردو ترجمہ) ۴ر

تالیفات مولانا محمد قاسمؒ
تقریر دلپذیر ـــہ
حجۃ الاسلام ۱۰ر
مباحثہ شاہجہانپور عـہ
میلہ خدا شناسی ۴ر
انتصار الاسلام ۸ر
تصفیۃ العقائد ۴ر
الدلیل المحکم ۴ر
"اوثق العریٰ" از حضرت گنگوہیؒ ... ۲ر
سبیل الرشاد ۳ر
فتاویٰ میلاد شریف ۳ر
"التصدیقات" از حضرت سہارنپوریؒ ... عـہ
الابواب والتراجم:۔ از شیخ الہندؒ ... عـہ
افادات محمود ۸ر
اسیر مالٹا ... عـہ
ہدیۂ سنیہ (مولانا عثمانیؒ) ۴ر
فلسفہ بعثت انبیاء ۴ر

ضیاء القلوب (فارسی) از حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ ۸ر
ضیاء القلوب مع ترجمہ اردو عـہ
ارشاد مرشد مع فیصلہ ہفت مسئلہ ۲ر
حضرت تھانویؒ
بہشتی زیور (اختری) ـــہ ر
تعلیم الدین (کاغذ معمولی) مجلد ۱۴ر
حیات المسلمین ۱۴ر
اصلاح الرسوم عـہ
اعمال قرآنی (مکمل) ۱۰ر
احکام التجلی ۸ر
الانتباہات المفیدہ ۸ر
شوق وطن ۶ر
قصد السبیل ۴ر
مناجات مقبول (مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے ترجمہ اور شرح کے ساتھ، مطبوعہ کلکتہ) مجلد عـہ
حکیم الامت (از مولانا دریابادی) ـــہ
الحیوانات فی القرآن عـہ
قرآنی جغرافیہ عـہ
سفرنامہ حجاز صـہ
شرق اوسط میں کیا دیکھا؟ مجلد عـہ
حسن معاشرت ۱۲ر
مثالی حکمران (مجلد) عـہ
مضامین مولانا احمد سعید صاحب عـہ
فضائل الشہور والایام ۸ر
مفید الواعظین ۶ر
"رحمۃ رضوان"
(تذکرۂ امام ابو حنیفہؒ)
قیمت ... ۲ر

اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں (نئے) مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ (مولانا گیلانی مرحوم کا قابل دید مقالہ) قیمت عـہ

ماہنامہ

الفرقان

لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے

لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، وہ اس

بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی

اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی

زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں، ہم اس کا

عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ

تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ

"ادارہ الفرقان"

مدیر مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

الفرقان لکھنؤ

قیمت فی کاپی آٹھ آنے

شرح چندہ
ہندوستان میں سالانہ ... [illegible]
پاکستان میں سالانہ ... [illegible]
ششماہی (ہر دو سے) [illegible]

اعزازی خریداروں سے
سالانہ ... [illegible]
غیر ممالک سے
سالانہ ... دس شلنگ

جلد ۲۴ — بابت ماہ رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ - اپریل ... ۱۹۵۷ء — نمبر ۹

نہایت ضروری گذارش

اگلے صفحات میں ناظرین کرام کی خدمت میں کچھ ضروری اور قابل توجہ باتیں عرض کی گئی ہیں۔ براہِ کرم انھیں اچھی طرح ملاحظہ فرمائیے۔

اگر اس دائرہ میں سُرخ نشان لگا ہے! تو اسکا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کیلئے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی پی ارسال کیا جائیگا — چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۲۴ تاریخ تک پہنچ جانا چاہیے

پاکستان کے خریدار اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں۔ منی آرڈر کی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

تاریخ اشاعت رسالہ ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۲۵ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔ اگلے رسالے کے ساتھ بھیجا جائیگا اس سے پہلے مطلوب ہو تو ۲ آنے کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں۔

مقامِ اشاعت دفتر ماہنامہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

نگاہِ اولیں

افادات گیلانی نمبر | مارچ میں رجب و شعبان کا مشترک شمارہ شائع ہوا تھا جسمیں اعلان کیا گیا تھا کہ اسکے بعد کا شمارہ ۱۵ مئی کو شائع ہوگا اور وہ "افادات گیلانی نمبر" ہوگا مگر افسوس کہ بجائے اُس خاص نمبر کے ایک عام شمارہ آپ کے ہاتھ میں پاہے ہیں اور وہ بھی ۱۲ یوم کی تاخیر سے! —

اپنے اعلان کردہ پروگرام کے مطابق عمل نہ کر سکنے پر ہم ناظرین سے معذرت خواہ ہیں۔ مگر یہ صورت حال ہماری کسی کوتاہی یا سستی سے نہیں بلکہ مجبوری سے پیدا ہوئی ہے جسکی تفصیل یہ ہے کہ الفرقان کے مضامین کی کتابت عام طور پر جو کاتب صاحبان کرتے ہیں وہ اپنی بعض مجبوریوں کی وجہ سے عید (یکم مئی) تک ایک صفحہ کی بھی کتابت نہ کر سکے حالانکہ مضامین اُن کو ۱۰ رمضان ہی سے دینا شروع کر دیئے گئے تھے۔ پھر بھی ہم اُن کے وعدوں کی بنا پر اپنی خواہش کے ماتحت یہ خیال کئے رہے کہ ۱۵ کو نہیں تو مہینہ کی آخری تاریخوں میں، بہرحال مئی میں نمبر نکل جائیگا۔ مگر مئی کا پہلا عشرہ گزرنے پر کتابت کی سُست رفتاری کو دیکھتے ہوئے بادلِ ناخواستہ اس نتیجہ پر پہونچنا پڑا کہ اب ۱۵ جون سے قبل نمبر کی اشاعت ناممکن ہے۔ اب اس کا بھی وقت نہیں رہا تھا کہ ۱۵ مئی کو ایک ماہ کا عام شمارہ ہی شائع کر دیا جائے لیکن ناظرین کو انتظار کی زحمت سے نکالنے کیلئے ضروری معلوم ہوا کہ کچھ تاخیر ہی سے سہی مگر ایک شمارہ مئی میں نکل ضرور جانا چاہیے چنانچہ بدقت تمام یہ شمارہ پیش خدمت ہے اور اس صورت حال میں کہ ۱ مئی تک نہ اس شمارہ کی اشاعت کا خیال تھا نہ کوئی تیاری، اس شمارے کے پیش کرنے میں اس سے زیادہ عجلت کسی طرح ممکن نہ تھی جتنی کہ کی گئی جیسا کہ ناظرین خود اندازہ فرما سکتے ہیں۔ بہرحال اب افادات گیلانی نمبر انشاء اللہ ۱۵ جون کو شائع ہوگا۔ اسکی تیاری برابر جاری ہے اور کتابت کی رفتار بھی اطمینان بخش ہے۔

یہ ہو سکتا تھا کہ ہم کچھ نئے کاتب تلاش کر کے نمبر کی کتابت اپنے پروگرام کے مطابق مکمل کرا لیتے مگر اس صورت میں اس خاص نمبر کی کتابت کا معیار عام نمبروں کے معیار سے گر جاتا اور یہ ہمیں کسی طرح گوارا نہیں، نہ ہی ناظرین اس بات کو پسند کرتے — بس یہی چیز تھی جسکی بنا پر ہمیں نمبر کی تاخیر کو گوارا کرنا پڑا اور نہ اس تاخیر کی اطلاع سے

ہمارے پرانے کاتب چونکہ نمبر کی کتابت میں مصروف ہیں اسلئے اس شمارہ کی کتابت ایک نئے کاتب صاحب سے کرائی گئی ہے۔ کوشش حتی الامکان کی گئی ہے کہ کتابت میں کچھ زیادہ فرق نہ رہے۔ تاہم اگر کچھ نیا پن محسوس ہو تو نمبر کی خاطر اسے بھی گوارا فرمائیے۔

ایک ضروری گزارش اور آگاہی

رسالہ نہ پہونچنے کی ہر ماہ تھوڑی بہت شکایات ایک ایسی عام اور لازمی چیز بن گئی ہے جس سے کوئی رسالہ بھی محفوظ نہیں ہے۔ یہ شکایات خاص نمبروں کے سلسلہ میں بڑے پیمانہ پر پیش آتی ہیں۔ ضخامت کی زیادتی کو دیکھ اور رسالہ کو اہم سمجھکر بد دیانتی کرنے والے دس بن جاتے ہیں اور اس طرح شکایات کی تلافی کا بار ادارہ پر کئی گنا بڑھ جاتا ہے جسکا تحمل کسی طرح ممکن نہیں اسلئے الفرقان کے جملہ خریدار حضرات سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ فوراً ہی رجسٹری فیس کے آٹھ آنے بذریعہ منی آرڈر یا بصورت ٹکٹ ارسال فرما دیں۔ ہندوستانی حضرات ہمیں براہ راست بھیجیں اور پاکستانی حضرات ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کے پتہ پر بھیجکر ہمیں مطلع فرمائیں۔ ہندوستانی خریداروں کے ۸ر اور پاکستانی خریداروں کی اطلاعات ہمیں لازمی طور پر ۲۵ جون سے قبل وصول ہو جانی چاہئیں ورنہ انکا رسالہ بغیر رجسٹری انڈر سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائیگا اور پھر عدم وصولیابی کی کسی شکایت کی تلافی کا دفتر ذمہ دار نہ ہوگا۔ اس درخواست اور پیشگی آگاہی کو اچھی طرح نوٹ فرما لیجئے تاکہ بعد میں آپکو دفتر سے کوئی شکایت نہ ہو۔

اس سلسلہ میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک مقام کے متعدد حضرات (خواہ انکی تعداد کتنی بھی ہو) اپنے رسالے ایک رجسٹرڈ پیکٹ میں ایک ہی پتہ پر منگا لیں۔ یہ صورت بہت کفایت اور بچت کی ہے (اسلئے کہ خواہ رسالے تعداد میں جتنے بھی ہوں رجسٹری کا خرچہ وہی ۸ر آنے رہیگا) لہذا ہمارا مشورہ ہے کہ جہانتک ہو سکے اسپر عمل کیا جائے مگر اس صورت میں یہ ضروری ہے کہ تمام حضرات کے مکمل پتے مع صحیح خریداری نمبر کے ہمارے پاس بھیجے جائیں۔ جن حضرات کا نمبر خریداری نہیں لکھا جائیگا انکے متعلق ذمہ داری نہیں ہے کہ رجسٹرڈ پیکٹ میں ان کا رسالہ بھی ضرور شامل ہو۔

مقامی (لکھنؤ کے) حضرات کیلئے ہم نے یہ طے کیا ہے کہ وہ اپنا رسالہ دفتر سے دستی لے لیں انکے لئے رجسٹری کا صرفہ غیر ضروری ہے ——— اسی ذیل میں ایجنٹ صاحبان کو بھی مطلع کیا جاتا ہے کہ خاص نمبر انھیں رجسٹری سے بھیجا جائیگا اور حسب شرائط ایجنسی رجسٹری فیس انکے بل میں شامل ہوگی۔

جماعت اسلامی اور علمائے دیوبند نگاہ اولین کے یہ صفحات اس مرتبہ خلاف معمول دفتری جھمیلوں کی نذر ہوگئے مگر باتیں کچھ اتنی ضروری تھیں کہ اسکے سوا چارہ نہ تھا۔ تاہم معمول بالکل چھوٹ بھی جائے اسلئے اس ماہ کی ایک اہم بات کا تذکرہ نہ صرف مناسب معلوم ہوتا ہے بلکہ ضروری ہے کہ مختصراً ہی سہی، اس پر اظہار خیال کردیا جائے ——— اس ماہ کا وہ اہم واقعہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی اور علمائے دیوبند کے مابین جو ایک شدید نزاعی حالت عرصہ سے پیدا ہوگئی تھی، جماعت دیوبند کے ایک عالی مقام رکن دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا محمد طیب صاحب نے اپنی ایک تحریر کے ذریعہ اسکی شدت میں تخفیف کرنیکی طرف ایک اہم قدم اٹھایا ہے مولانا موصوف نے اپنے اس مضمون میں اُن دو اہم مسائل کے بارے میں اختلاف کے خاتمہ کا اعلان فرمایا ہے جو جماعت اسلامی کے دستور کی دفعہ ۶ سے پیدا ہوگئے تھے۔ ہم نے اس تحریر کو پڑھکر انتہائی مسرت محسوس کی اسلئے کہ ہمارا نقطہ نظر شروع سے یہی تھا کہ جب جماعت اسلامی کے عمائدین اس دفعہ کی عبارت کے اُس مفہوم سے برأت کرتے ہیں اور اُسکے مراد ہونے سے انھیں انکار ہے جسکی بنیاد پر یہ سخت نزاعی صورت پیدا ہوگئی ہے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ الفاظ میں اُن حضرات کی بیان کردہ مراد کی گنجائش نہو، تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ اُن کی برأت نہ قبول کی جائے اور الزامات کو علی حالہا باقی رکھا جائے اختلاف و جدال انھیں امور میں مناسب بھی ہے جن کے التزام سے دوسرے فریق کو انکار نہو اور نتیجہ خیز بھی ایسی صورت میں ہے الا یہ کہ کسی شخص کے الفاظ کسی مفہوم میں اتنے صریح اور قطعی ہوں کہ کسی دوسرے مفہوم کی ان میں گنجائش نہو اور اسکے باوجود وہ ان الفاظ سے رجوع کرنے کیلئے بھی تیار نہو ——— الحمد للہ کہ مولانا موصوف نے مسئلہ پر اسی نقطۂ نظر سے غور فرمایا جس کا نتیجہ اس مصالحانہ تحریر کی شکل میں ظاہر ہوا جو رسالہ "دارالعلوم" اور جماعت اسلامی کے اخبار "دعوت" میں تقریباً ساتھ ہی ساتھ شائع ہوئی ہے اور جو ہر اُس شخص کی آنکھ کی ٹھنڈک ہے جو حضرت مہتمم صاحب موصوف کے الفاظ میں یہ خواہش رکھتا ہے کہ۔

"مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی میں جو رخنے پڑگئے ہیں وہ مٹ جائیں"

مگر جہاں یہ تحریر انتہائی مسرت بخش اور امید افزا ہے وہاں یہ بات بڑی مایوس کن ہے کہ ادارۂ دعوت نے اس تحریر پر جو نوٹ لکھے ہیں ان کی اسپرٹ بالکل دوسری ہے اور اُن کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ جماعت اسلامی اس دست مصالحت کی طرف اپنا دست مصالحت بڑھانے کیلئے فی الحال تیار نہیں ہے ہم اس روش پر فی الحال کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔ بس اپنا تأثر ظاہر کرکے ذمہ داران جماعت کو اس رویہ پر نظر ثانی کے لیئے متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ یہ تناتنی کی فضا ختم ہوجائے۔

حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ

از مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہی

ذیقعدہ ؁۳ھ کے الفرقان میں مدیر الفرقان کا ایک مضمون "بریلی کا تکفیری فتنہ" کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ بریلوی مکفرین کی طرف سے حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ پر جو گندے الزامات عائد کئے گئے ہیں اُن کی تردید میں مدیر الفرقان نے بیس سال پیشتر جو متعدد مقالات الفرقان میں لکھے تھے جواب نایاب ہیں۔ اسوقت ان کی دوبارہ اشاعت کی ضرورت محسوس کر کے ان پر نظر ثانی کی گئی ہے اور جلد ہی وہ کتابی شکل میں یک جا ہو کر آجائیں گے نظر ثانی کے علاوہ کچھ اہم مباحثہ کا اضافہ بھی ضروری تھا وہ بھی بحمد اللہ ہو گیا تھا۔ مگر اسکے ساتھ یہ بھی چاہا گیا کہ کتاب کے شروع میں بطور مقدمہ کے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مختصر تذکرہ بھی شامل کر دیا جائے۔ اس کام کیلئے جناب مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہی کو تکلیف دی گئی۔ کتاب ابتک اسی کے انتظار میں رکی ہوئی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب وہ تذکرہ بھی مولانا موصوف نے مرتب کر کے بھیجدیا ہے۔ کتاب سے قبل افادۂ عام کی غرض سے یہی تذکرہ ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ کتاب بھی انشاء اللہ اسی ماہ میں تیار ہو جائیگی۔ (ع۔ س)

حجۃ اللہ فی الارض حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ کی ذات اقدس سرچشمۂ علوم دینیہ اور منبع برکات اُخرویہ تھی۔ شاہ صاحب کا خاندان پہلے ہی سے علم وعمل سے آراستہ اور کمالات ظاہری و باطنی کا آئینہ دار تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اُنکے اور اُن کے باکمال آبا و اجداد

کے اجر میں اضافے کا سامان اس طرح مہیا کیا کہ آپ کے چار صاحبزادے جسم ملت بیضا کیلئے چار عناصر ثابت ہوئے۔ تین صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث رح، حضرت شاہ رفیع الدین رح اور حضرت شاہ عبدالقادر رح تو اپنی تصنیفات اور خدمت قرآن و حدیث کے سلسلہ میں مشہور و معروف ہیں۔ چوتھے صاحبزادے، حضرت شاہ عبدالغنی رح سوانح کی حد تک غیر معروف رہے۔ تذکرہ نگاروں کو اُن کے حالات پورے طریقے سے بہم نہیں پہونچ سکے۔ حیات ولی کا مؤلف بھی یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے "مجھے افسوس ہے کہ شاہ عبدالغنی رحمہ کے حالات زندگی کسی ایسے وسیلے سے دستیاب نہیں ہوئے جنھیں بے کم وکاست یقین کر سکتا اور یہی وجہ ہے کہ میں اُن واقعات کو بالکل قلم انداز کرتا ہوں جو لوگوں کی زبانی سُنے گئے ہیں اور کسی تذکرے یا تاریخ میں نہیں دیکھے گئے" البتہ ایک جملہ حیات ولی میں اُن کے بارے میں ایسا لکھ دیا گیا ہے جس سے اُن کی عالی مقامی اور باکرامت زندگی کا اچھا خاصا اندازہ ہو جاتا ہے۔

"وضع و لباس میں اپنے والد بزرگوار (حضرت شاہ ولی اللہ) کے اس درجہ مشابہ تھے کہ جس نے اُنھیں نہ دیکھا تھا وہ آپ کو دیکھکر شاہ صاحب مرحوم کو یاد کرتا تھا"

اِن شاہ عبدالغنی رح کی شہرت اُن کے صاحب فضیلت فرزند شاہ محمد اسمٰعیل شہید دہلوی رحمہ کے ذریعے مقدر ہو چکی تھی۔ بڑی سے بڑی کوئی کتاب بھی شاہ عبدالغنی رح تصنیف کرتے تو اُن کو وہ لازوال شہرت اور ابدی معروفیت حاصل نہ ہوتی جو اس عالم دین متین، محافظ ملت، مجاہد و شہید فی سبیل اللہ فرزند کے دینی کارناموں سے حاصل ہوئی۔ بہر حال اُن کے لئے یہی بات کافی ذریعہ افتخار ہے کہ اُن کی تربیت سے اُن کا نور چشم اتنی صفات کا مالک ہوا کہ اُن کا احاطہ مشکل ہے۔ کیا ٹھکانہ ہے اس فرزند توحید کی جد وجہد کا، اس نے شریعت غرا کی تابانی برقرار رکھنے اور ملت بیضا کی سرسبزی و شادابی بڑھانے کے لئے مسلسل و پیہم کوششیں کیں اور اپنی زندگی کا آخری لمحہ اور خون کا آخری قطرہ اسی متاع عزیز پر قربان کر دیا۔ عالم بھی، درویش بھی، مقرر بھی، مناظر بھی، حافظ و قاری بھی، غازی و شہید بھی، منتظم و باوقار و شوکت بھی، کتنی خوبیاں تھیں جو ایک فرد واحد میں

جمع ہوگئی تھیں، اُن کے زمانے ہی میں اُن کے بعض حاسد اُن کی خوبیوں کو دیکھکر جلنے لگے تھے، اُن کی بُرائیاں کرتے تھے۔ اُن کی مذمت کے درپے رہتے تھے مگر ان "شپرہ چشموں" کی اُنھوں نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ دین کا کام اُسی لگن اور دُھن کے ساتھ کرتے رہے اور اُن کی زبان خاموشی اس شعر کو دُہراتی رہی۔

واذا اتتک مذمتی من ناقصٍ فھی الشہادۃ لی بانی کامل

(جب کوئی ناقص آدمی میری مذمت تم سے بیان کرے تو یہ میرے کامل ہونے کی عکس دلیل ہے)

اہل زمانہ نے اُن کے کارناموں کو بے قصد اور بالقصد بہت کچھ بھلانا چاہا، تساہل پسند اپنوں نے کچھ غفلت برتی۔ ناخدا ترس بیگانوں نے تہمتیں دھریں۔ شہید کے زریں کارناموں اور شہ کاروں کو قرطاس عالم سے مٹانا چاہا لیکن خدا کا روشن کیا ہوا چراغ کہیں بجھائے سے بجھ سکتا ہے؟ —— شہیدؒ کے کارنامے اُبھرے۔ اُبھر رہے ہیں اور جتنا زمانہ اور آگے آئے گا شہیدؒ کی خدمات ملّیہ اُجاگر ہوتی چلی جائیں گی۔

نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانے کی
کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہوکر

مرزا حیرت مرحوم نے سوانح اسمٰعیلی میں حیات طیبہ لکھی لیکن اس میں اپنے "ذوق خاص" کی تسکین شامل فرماکر بہت سی باتیں بلا تنقید و تحقیق درج کردیں ہیں اور بے موقع مباحث چھیڑ کر کتاب کو طویل بنایا ہے۔ سچ پوچھو تو اس میں عبارت آرائی زیادہ اور سوانح کا عنصر کم ہے۔ اُن کے قلم کی جولانی نے بہت سے مواقع پر اُن کو خلاف حقیقت نتائج نکالنے پر آمادہ کیا ہے۔ پھر بھی غنیمت ہے کہ ایک سوانحعمری لکھ تو دی، ایک زیرک دمبصر، ناظر اُس میں سے کار آمد حصہ محنت کرکے جدا کرسکتا ہے۔ سوانح احمدیہ میں بھی حضرت شہیدؒ کے کچھ حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں لیکن اُن سے اجمالی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے اور مولانا غلام رسول مہر نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے نقوش سیرت کو اجاگر کرتے ہوئے ضمنی طور پر حضرت شہیدؒ دہلوی کا ذکر خیر کردیا ہے

بنظر غائر دیکھا جائے تو حضرت سید شہیدؒ کے سوانح کا ہر ہر صفحہ حضرت مولانا شہیدؒ کی زندگی کا بھی پتہ دیتا ہے۔ جب سے حضرت مولانا شہیدؒ نے حضرت سید السادات سے اپنی نسبت معنوی درست کی ہے اس وقت سے لیکر آخر لمحہ حیات تک یہ سایہ کی طرح پیر و مرشد کے ساتھ ساتھ اور میدان جد وجہد میں قدم قدم پہ ہمرکاب رہے۔ حضرت سیدؒ کے تمام ہی رفقا آسمان خلوص و صداقت کے روشن ستارے تھے لیکن حضرت شہیدؒ دہلوی اور حضرت مولانا عبدالحی بڈھانوی یہ دو وہ شخصیتیں ایسی ہیں کہ اگر کوئی مؤرخ و سیرت نگار ان کے کارنامے نظر انداز کرکے سید صاحبؒ کی سیرت مرتب کرنا چاہے تو ناکامیاب ہو جائیگا۔

حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ کے ایما سے میں چند اوراق حضرت مولانا شہیدؒ کی کتاب زندگی سے پیش کر رہا ہوں۔ میں حضرت شہید دہلوی کے سوانح کے سلسلے میں کوئی سیر حاصل مقالہ لکھنے کی استعداد و صلاحیت اپنے اندر نہیں پاتا البتہ اتنا ہوگا کہ ایک خاص ترتیب کے ساتھ حضرت شہیدؒ کا تعارف کرا دوں گا ——— اور بس۔ ؏

آنکھ نرگس کی دہن غنچے کا حیرت میری

یہ مصرع میری اس تحریر پہ پورا پورا صادق ہے —— اللہ تعالیٰ حق بات لکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس تحریر کو میرے لئے اور تمام ناظرین کیلئے نافع و مفید بنائے۔ آمین۔

ولادت حضرت مولانا شہیدؒ ۱۲۔ ربیع الثانی ۱۱۹۳ھ کو اپنی نہیال پھلت ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔ آپکے والد ماجد کا اسم مبارک شاہ عبد الغنی اور والدہ مکرمہ کا نام فاطمہ رح ہے جو مولوی علاؤ الدین پھلتی کی رحؒ کی صاحبزادی تھیں۔ انھیں مولوی علاؤ الدینؒ کے پوتے شیخ کمال الدین پھلتیؒ سے شاہ صاحب کی ہمشیرہ رقیہ منسوب ہوئی تھیں۔

تعلیم و تربیت آپنے جب ہوش سنبھالا تو قرآن شریف حفظ کرنے کیلئے ایک معلم کے پاس بٹھا دیا گیا آٹھ سال کی عمر میں آپنے قرآن شریف حفظ کر لیا آپکے بعض سوانح نگاروں کے بے ترتیب بیانات پر غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حفظ قرآن کے ساتھ ساتھ آپ کو ترجمہ و معانی قرآن سے بھی آگاہ کیا گیا اور ریاضی بھی پڑھائی گئی۔ آپ کی عمر چھ سات سال کی ہوگی جب آپ کو اقلیدس کے اصول موضوعہ و متعارفہ

پڑھائے اور سمجھائے گئے جبر، مقابلہ، علم مثلث، مساحت وغیرہ وغیرہ، ریاضی کی اہم معلومات آپنے زمانہ حفظ کتاب اللہ ہی میں حاصل کر لیں۔

اس کے بعد دو تین برس میں صرف و نحو کی کتب متداولہ اپنے والد بزرگوار سے نکال لیں اور صرف و نحو میں مہارت تامہ حاصل کی۔ اس کے بعد کچھ معقول کی کتابیں بھی اپنے والد سے پڑھیں۔ جب آپکی عمر دس سال کی تھی تو ۱۶۔ رجب المرجب ۱۲۰۳ھ (مطابق ۱۲۔ اپریل ۱۷۸۹ء) کو آپکے والد ماجد کا انتقال ہو گیا۔ اسی وقت سے شاہ عبد القادر رح نے اُن کو اپنے دامن تربیت میں لے لیا اور بالکل اپنی اولاد کی طرح آپ کا خیال رکھا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد زیادہ تر کتابیں شاہ عبد القادر رح سے پڑھیں۔ شاہ رفیع الدین رح سے بھی آپنے پڑھا جب آپکی عمر بارہ سال کی تھی آپ اسوقت صدرا پڑھتے تھے۔ تمام موقوف علیہ کتابیں ختم کر لینے کے بعد، حدیث شریف، حضرت شاہ عبد العزیز رح کے حلقہ درس میں پڑھی۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں آپ فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔ شاہ صاحب رح کے خاندان میں علوم نقلیہ کے ساتھ ساتھ علوم عقلیہ کا بھی رواج تھا۔ اسلئے آپنے علوم نقلیہ و عقلیہ دونوں میں دستگاہ کامل حاصل کر لی تھی۔ اس خاندان میں تاریخ و جغرافیہ پڑھنے پڑھانے کا بھی دستور تھا اُس زمانے میں جغرافیہ کی جو کتابیں مسلمان مصنفوں کی، شامل درس تھیں وہ مولانا شہید رح نے پڑھیں۔ مولانا شہید رح تاریخ سے بھی بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ بہترین ذکاوت اعلیٰ درجہ کی ذہانت اور ایک عمدہ حافظہ، قدرت کی جانب سے آپ کو ودیعت کیا گیا تھا۔ قلبی قوت دینی جرأت اور مذہبی حمیت کے ساتھ ساتھ یہ علمی پختگی بھی جو زمانہ طالب علمی سے آپ کو منجانب اللہ حاصل ہو چکی تھی اس پایہ کی تھی کہ آپکے معاصرین میں سے بڑے بڑے دعویداران علم کو آپ کی قابلیت کا لوہا ماننا پڑا اور آپ کی علمی ہیبت اُن کے قلوب پر ہمیشہ طاری رہی۔

سپاہیانہ فنون اور ورزشیں آپنے گھوڑے کی سواری میاں رحیم بخش چابک سوار سے سیکھی۔ اُس میں اتنی مشق بڑھالی تھی کہ چاہے کیسا ہی منہ زور گھوڑا ہو بے زین اُس پر سوار ہو کر اس کو دوڑا سکتے تھے۔ گو آپ دُبلے پتلے اور متوسط قد کے تھے لیکن بلند سے بلند گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہی بے رکاب چڑھ جانا اور پھر آسانی سے اُتر آنا

ایک معمولی بات تھی۔ بنوٹ وغیرہ مرزا رحمۃ اللہ بیگ سے سیکھی جو شہزادوں کے اُستاد تھے اور اپنے فن میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ آپ نے کشتی کا فن بھی سیکھا تھا، گولی کا نشانہ بھی آپ کا بہت اچھا تھا اور اُس کی بھی مشق کرتے رہتے تھے۔ غرضیکہ اکیس سال کی عمر میں تمام جنگی فنون میں آپنے مہارت کاملہ حاصل کر لی تھی۔

آپنے تیرنا بھی سیکھا تھا۔ علاوہ ازیں جاڑوں کے زمانے میں بے سرمائی کپڑوں اور بغیر لحاف کے رہنے کی بھی مشق کی، موسم سرما میں اکہرے کپڑوں سے مکان کی چھت پر ٹہلتے رہتے تھے۔ سخت دھوپ میں تپتی ہوئی زمین پر آہستہ آہستہ برہنہ پا چلنے کی بھی مشق کی، کم کھانے اور کم سونے کی بھی مشق کی تھی اور نیند پر اتنا قابو پا لیا تھا کہ جب چاہیں سو رہیں اور جب چاہیں جاگ اُٹھیں۔ یہ قوتیں کم و بیش قبضے میں آگئیں تو تقریر کی قوت بڑھائی۔ ایک دن میں چار چار وعظ دو دو تین تین گھنٹے تک کہنے کا اتفاق ہو جاتا تھا لیکن کبھی نہیں دیکھا گیا کہ آپ کی آواز بیٹھی ہو یا وعظ کے درمیان میں پانی پینے کی ضرورت ہوئی ہو۔

نکاح شاہ عبدالقادر صاحب رح کی اولاد میں صرف ایک صاحبزادی تھیں جن کا نام مسماۃ زینب تھا اُن کا عقد نکاح شاہ رفیع الدین صاحب رح کے فرزند عبدالرحمٰن رح عرف مصطفےٰ سے ہوا تھا اُن کے بھی صرف ایک بیٹی ہوئیں جن کا نام اُم کلثوم" تھا شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی نواسی اُم کلثوم کا نکاح مولانا شہید رح سے کر دیا تھا۔

اصلاحی کارنامے تحریک اصلاح و تذکیر کے آغاز میں شاہجہانی مسجد جامع میں آپنے باطل شکن تقریریں فرمائیں جن میں اصلاح عقائد اور حُسن اعمال کی ترغیب تھی۔ اُن تقریروں میں واضح طور پر آپنے شرک و بدعت اور رسوم مروجہ کی تردید فرمائی۔ ایک تقریر دہلی کی جامع مسجد ہی میں فقیری کے موضوع پر کی جس میں اصل تصوف و درویشی کی نشاندہی فرمائی اور اُس کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا۔ ان تقریروں سے بہت کچھ فائدہ ہوا اور بگڑے ہوئے ماحول میں اصلاح کی صورتیں پیدا ہو گئیں۔ حاسدوں اور دراندازوں نے آپ کو پریشان کرنا چاہا۔ آپ کے خلاف غلط اور مکروہ پروپیگنڈے

کرنے شروع کر دئیے لیکن آپ اپنے اصلاحی کام کو برابر کرتے رہے اور آپ کی حق آمیز پختہ
طبیعت پر معاندین کی شورشوں کا کوئی اثر نہیں پڑا سہ

پختہ طبعوں پر حوادث کا نہیں ہوتا اثر
کوہساروں پر نشانِ نقشِ پا ملتا نہیں
(اکبر الہ آبادی مرحوم)

شاہ وقت (اکبر شاہ ثانی) سے آپ کی شکایت کی گئی۔ اُس نے آپ کو طلب کیا۔ آپ
اُس کے دربار میں پہونچے اور اُس کے استفسار کا تسکین بخش جواب دیکر اُسے مطمئن کیا۔
ساتھ ہی ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہم فریضہ بھی اُس کے دربار میں ادا
کیا جس کے نتیجے میں آپ کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔

اسوقت ایسٹ انڈیا کمپنی کا دور دورہ تھا۔ حاسدوں نے ریذیڈنٹ کے کان
بھرے اور وعظ بند کرانے کی یہ تدبیر کی کہ کئی سو دستخطوں سے ایک عرضی اُسکے سامنے
حکم امتناعی حاصل کرنے کے لئے پیش کر دی۔ ریذیڈنٹ نے کوتوال کے نام حکم بھیجدیا کہ
آئندہ مولانا اسمٰعیل صاحبؒ وعظ نہ کہنے پائیں اور ایک حکمنامہ آپکے پاس بھی بھیجدیا کہ
وہ آپکے وعظ سے چونکہ امن میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے اس لئے روک دیا گیا تا حکم ثانی
آپ عام طور سے وعظ نہیں کہہ سکتے۔ چالیس دن تک آپ کا وعظ بند رہا۔ اس
عرصے میں تعلیم و تعلم کا سلسلہ برابر جاری رکھا اور اُسے کوئی روک بھی نہیں سکتا تھا۔
حضرت شہیدؒ کو اپنے وعظ کے بند ہونے کا اسلئے اور بھی قلق تھا کہ مسلمان پھر اُسی
شرک و بدعت میں پھنس جائیں گے جس سے انھیں نفرت دلائی ہے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا
کہ ریذیڈنٹ نے بالآخر دوسرا حکم کوتوال کے نام بھیجا جس کی رو سے حضرت شہیدؒ کو
وعظ کی اجازت حاصل ہو گئی۔

وعظ کی تاثیر آپکے وعظ بڑے مؤثر اور دلنشیں ہوتے تھے علاوہ عوام الناس کے
بڑے بڑے علماء آپ کے وعظ میں شرکت کرتے تھے، آپ زیادہ تر اُن برائیوں کے
دفع کرنے کے لئے وعظ فرماتے تھے جن میں اُسوقت مسلمان مبتلا تھے۔ سیتلا (چیچک) کی

پرستش، تعزیہ داری، قبروں پر کلاوے باندھنا، عورتوں کا عورتوں کو بیعت کرنا ہیہ شرک و بدعات دہلی میں رائج تھیں آپ ان کا پُرزور طریقے پر رد فرمایا کرتے تھے۔ جامع مسجد دہلی کے حوض پر خوانچہ والے خوانچے لگاتے تھے آپ نے ایک مرتبہ اسی پر وعظ فرمایا۔ آپ کی کوشش ہی سے مسجد کے اندر دکانیں لگنی موقوف ہوئیں۔ مُورت والے کھلونے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر فروخت ہوتے تھے آپ کی سعی سے اُن کی خرید و فروخت بھی ختم ہو گئی۔ ردّ بدعات پر خاص زور دیتے تھے۔ سہ شنبہ اور جمعہ کو وعظ ہوتا تھا۔ ان تقریروں کے سننے کے لئے نمازیں اتنی کثیر تعداد ہونے لگی جتنی عیدگاہ میں عیدین کے لئے ہوا کرتی ہے۔ تقریریں جامع ہوتی تھیں ہر شخص کو اُس کے شبہے کا جواب مل جاتا تھا اور ہر عالم و عامی یکساں مستفید ہوتا تھا۔ دہلی کے پنجابی تاجر اس امر کا اعتراف کرتے تھے کہ خرید و فروخت کی کثرت اور نفع کی زیادتی کے باوجود وعظ سے اُٹھنے اور دوکان کھولنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

آپکے وعظوں سے متاثر ہو کر ہزاروں آدمی معاصی سے تائب ہو گئے، ہزاروں کو حُسن عمل کی توفیق نصیب ہوئی۔

ایک مرتبہ خانم کے بازار میں ایک طوائف کے یہاں جا کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حق ادا کیا۔ اُس کے یہاں کوئی تقریب تھی جس میں بڑی کثرت سے طوائفیں جمع ہوئی تھیں۔ وہاں پہونچکر اُن کو قہر خدا اور عذاب قبر و آخرت سے ڈرایا۔ اور زنا سے باز رہنے کی تلقین کی۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریر کا یہ اثر ہوا کہ وہ سب کی سب آہ و بکا اور گریہ و زاری سے بیتاب ہو گئیں۔ پھر آپنے توبہ کے فضائل بیان فرمائے اور توبہ کی ترغیب دی۔ بہت سیوں نے اُسی وقت توبہ کی اور آپ نے اُن توبہ کرنے والیوں کے نکاح کروا دیئے۔

سفر امرتسر | مرزا حیرت کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مولانا شہیدؒ سپاہیانہ بھیس بدلکر عازم پنجاب ہوئے پہلے آپ انبالہ پہونچے اس کے بعد آپ امرتسر روانہ ہوئے۔ یہاں مسلمانوں کے عقائد بھی خراب ہو رہے تھے اور اُن کے ساتھ حکمراں سکھوں کا سلوک بھی

اچھا نہ تھا۔ بہت سی مسجدیں سکھوں کے قبضے میں تھیں اور اُن مسجدوں میں گھوڑے بندھتے تھے یا دفتر قائم کئے گئے تھے۔ مسلمان بہو بیٹیوں کی عزت و آبرو بھی محفوظ نہ تھی۔ امرتسر کی ایک سرائے میں ایک مسلمان بوڑھے کی داستانِ غم انگیز سُن کر بھی حضرت شہیدؒ بہت متاثر ہوئے تھے۔ مرزا حیرت ہی کا بیان ہے کہ دو برس تک آپ نے پنجاب کی سیر کی اس عرصے میں آپ نے سکھوں کی بولی بھی سیکھ لی تھی، ڈوگری پنجابی بخوبی بولنے اور سمجھنے لگے تھے

سید صاحب سے بیعت

سید صاحبؒ ۱۲۳۴ھ (۱۸۱۸ء) میں نواب امیر خاں سے علیحدگی اختیار کر کے تیسری مرتبہ دہلی تشریف لائے اور اکبر آبادی مسجد میں قیام فرمایا تو لوگوں کا رجوع شروع ہوا۔ مولانا عبدالحیٔ صاحبؒ نے بیعت کی اور شاہ شہیدؒ سے اپنی بیعت کا واقعہ بیان کیا اور آپ کو بھی شوق دلایا۔ شاہ صاحبؒ حاضر ہوئے نماز پڑھی اور ایک خاص حالتِ جذب و کیف کے نمودار ہونے کے بعد بیعت کر لی۔ ہنٹر لکھتا ہے۔

"سید احمد صاحبؒ کے پہلے دو مرید وہ شخص تھے جو اپنے لاثانی ضمیری جوہروں اور علمی قابلیتوں میں اپنے وقت کے فردِ اکمل تھے۔ یہ دونوں فردِ اکمل دہلی کے سب سے بڑے حکیم یا فاضل اجل (حضرت شاہ عبدالعزیزؒ) کے کنبے سے تعلق رکھتے تھے۔" (حیات طیبہ بحوالہ ہنٹر)

غلام رسول مہر رقم فرماتے ہیں۔

سید صاحب سے بیعت کے بعد زیادہ وقت (آپ کا) اُنھیں کی معیت میں گزرا جہاد کے لئے تبلیغ و تنظیمات کا کام سب سے بڑھ کر اُنھوں نے انجام دیا۔ سید صاحبؒ کے ساتھ حج کیا اس وقت تک اُن کی والدہ ماجدہ زندہ تھیں حج کے لئے ساتھ گئیں اُنھوں نے سید صاحبؒ سے بیعت کی وہیں وفات پائی اور جنت المعلیٰ میں دفن ہوئیں۔ ؎ ۷۔ جمادی الآخری ۱۲۴۱ھ ....

(دوشنبہ۔ ۱۷۔ جنوری ۱۸۲۶ء کو رائے بریلی سے سید صاحب کے ساتھ داد جی •

ہجرت میں قدم رکھا اور وطن عزیز سے سیکڑوں میل کے فاصلے پر ایک غیر معروف گوشے میں شہادت پائی جسے اُن کی اور سید صاحب کی شہادت کے باعث ہمیشہ کے لئے ناموری حاصل ہوئی وہ تمام انتظامات میں سید صاحب کے مشیر خاص تھے۔"

(جماعت مجاہدین ص۱۲۲ و ۱۲۳)

تبحر علمی | نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اتحاف النبلاء میں لکھا ہے "در علم معقول و منقول یاد پیشینیاں از خاطر می برد" آپ کا تبحر علمی معاصرین کے نزدیک مسلم تھا۔ کثرت سے احادیث یاد تھیں۔ فقہ کا ہر مسئلہ آیات و احادیث سے مستند فرماتے تھے۔ معقول کی بیشتر کتابوں پر آپنے حاشیے تحریر کیے۔

تقریر | آپ کی تقریر بہت ہی شستہ، مدلل جامع اور اثر انگیز ہوتی تھی۔ اپنا مافی الضمیر بڑی خوبی سلاست و فصاحت کے ساتھ ادا فرماتے تھے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ فرمایا کرتے تھے کہ "میری تقریر اسمٰعیلؒ نے لے لی اور تحریر رشید الدینؒ نے۔"

سادگی | مہر صاحب لکھتے ہیں۔

"کسی قسم کے تکلف کی پرچھائیں بھی اُن کے (شاہ صاحبؒ) کے قلب صافی پر نہ پڑی تھی۔ کھانے پینے، رہنے سہنے اور پہننے اوڑھنے میں صد درجہ سادہ تھے بسفر حج میں کلکتہ پہونچے تو لباس ایسا پہن رکھا تھا کہ منشی امین الدین کو پہلی نظر میں اُن کے شاہ اسمٰعیلؒ ہونے کا یقین نہ آیا جب معلوم ہوا کہ یہی وہ شخصیت ہے جسکی ناموری سے ملک کے در و دیوار گونج رہے ہیں تو منشی صاحب یہ سنتے ہی آبدیدہ ہو گئے۔"

(جماعت مجاہدین ص۱۲۷)

مشہور ہے کہ دوران جہاد میں کبھی کبھی گھوڑے کا کھریرا کرتے اس حالت میں بھی کوئی شخص دینی یا علمی مسئلہ پوچھنے کے لئے آجاتا تو ساتھ ساتھ جواب دیتے جاتے۔

مسلک | حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہیؒ نے ایک بار ارشاد فرمایا تھا کہ۔

"مولانا اسمٰعیل صاحب شہید اور حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہما کا یہ مشرب تھا کہ حدیث صحیح غیر منسوخ کے مقابلہ میں کسی کے قول پر عمل نہ کرتے اور جہاں حدیث

غیر منسوخ نہ ملے تو مذہب حنفی سے بڑھ کر کوئی مذہب محقق نہیں۔"

(تذکرۃ الرشید جلد دوم صد ۲۷۴)

تصانیف منجانب اللہ آپ کے قلب حساس کو ایک خاص جذبہ اصلاح و تبلیغ ودیعت کیا گیا تھا جسکی وجہ سے آپ کو یکسوئی اور گوشہ گیری حاصل نہ ہوئی۔ چل پھر کر وعظ و تقریر سے مردہ دلوں کو زندہ کیا۔ عملی میدان میں اپنی کامیاب جدوجہد کا مظاہرہ کیا۔ سید صاحبؒ سے بیعت ہونے کے بعد روحانیت میں ترقی کے ساتھ ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا احساس بھی ترقی کر گیا۔ دوآبہ کا طویل سفر کیا۔ پھر حج کا سفر کیا اس کے بعد ایک لمبا سفر ہجرت درپیش ہوا۔ بعدہٗ وہ زریں کارنامے سید صاحب اور جماعت مجاہدین کی معیت میں اُن سے ظہور پذیر ہوئے۔ جن کے بیان کرنے کے لئے مؤرخین کے قلم بے طاقت ثابت ہو رہے ہیں۔ بہت کچھ لکھنے کے بعد بھی بہت سے گوشے ایسے رہ گئے ہیں جن کو آئندہ تذکرہ نویسوں کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ اتنے ہجوم کار اور غلبۂ مشاغل میں آپ تصنیف و تالیف کے لئے اپنے بلند پایہ تبحر علمی کے مطابق مستقل طور پر کس طرح وقت نکال سکتے تھے؟ لیکن پھر بھی جو کچھ لکھا اصلاحی نقطۂ نظر سے لکھا ہے اور وقت کے اہم مسائل پر قلم اُٹھایا ہے۔ کج فہمی کی کارفرمائیاں نہ ہوں تو آپ کی تالیفات و تصنیفات سے بہت کچھ فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ تصنیفات کے تقدم و تاخر سے واقفیت ہو تو مختلف تصنیفات میں بظاہر جو چند تضاد ہیں اُن کو ایک ذہین صاحب علم خود ہی بخوبی حل کر سکتا ہے اُن میں کے بعض مسائل سے اختلاف، علمی حیثیت سے ہو تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ حضرت مولانا شہیدؒ کے تمام معارف و حقائق کو اُن چند مسائل کی وجہ سے نظر انداز کر دیا جائے۔ آپ کی تصنیفات زیادہ تر وہ ہیں جو سید صاحبؒ سے بیعت کے بعد زیر قلم آئی ہیں۔

اب میں ذیل میں آپ کی تصنیفات اجمالی تعارف کیساتھ درج کرتا ہوں۔ ان میں سے دو ایک کتابوں پر تھوڑی سی تفصیل بھی ہوگی۔

(۱) ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت والضریح۔ اس میں نہایت مبصرانہ انداز

میں حقیقتِ بدعت کو واضح فرمایا ہے۔ فارسی زبان میں مختصر سا رسالہ ہے لیکن کوزے میں دریا کو بند کر دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ مستقل طور پر اس پر ایک مقالہ لکھا جائے تاکہ اس رسالے کی افادیت ذہن نشین ہو۔

(۲) منصب امامت۔ یہ بھی سات آٹھ جزو کا رسالہ ہے نہایت لاجواب ہے اس میں حقیقتِ نبوت، حقیقتِ امامت اور حقیقتِ ولایت کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔

(۳) عبقات۔ عربی زبان میں اسرار و معارف سے متعلق ہے۔

(۴) تقویت الایمان۔ اس کے متعلق کچھ ضروری بحث آگے ملاحظہ فرمایئے۔

(۵) تنویر العینین فی اثبات رفع الیدین۔ یہ کتاب دراصل اُس اختلاف کو مٹانے کے لئے لکھی گئی ہے جو اسوقت کے علما میں رفع یدین کے بارے میں برپا تھا۔ اس فروعی اختلافی مسئلے میں اُسوقت ایک گروہ دوسرے کو بُرا بھلا کہتا تھا۔ جو شخص رفع یدین کرتا وہ اپنے اُس بھائی کو جو رفع نہ کرتا مسلمانی سے خارج جانتا تھا اسی طرح رفع نہ کرنیوالا شخص رفع یدین کرنیوالے کو اچھی نظر سے نہ دیکھتا تھا۔ مولانا شہیدؒ نے اس رسالے کے ذریعہ اپنی خداداد بصیرت کی رہنمائی سے اُمت مسلمہ کے اس خلفشار کو دور کرنے اور اس غلط شورش اور خطرناک کشمکش کو ختم کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ اس کتاب میں نہ تو احناف پر بے باکانہ اعتراض ہے اور نہ غیر احناف و اہل حدیث کی بیجا حمایت اس لئے نہ اُن کو وحشت کرنے کی ضرورت ہے نہ ان کو خوش ہونے کی۔ اس میں جہاں رفع یدین کو ترجیح دی ہے وہاں وضع ید تحت الصدر و تحت السُّرہ کو مساوی اور ترک الجہر بالتسمیہ کو اولیٰ قرار دیا ہے۔

(۶) اُصول فقہ۔

(۷) منطق میں ایک رسالہ۔

(۸) صراط مستقیم (فارسی) درحقیقت یہ کتاب سید صاحبؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جو مولانا شہیدؒ اور مولانا عبدالحئی صاحبؒ کے مرتب کئے ہوئے ہیں۔ اسمیں

پہلا حصہ مولانا شہیدؒ کا مرتب کیا ہوا ہے۔ حجاز میں بحکم حضرت سید صاحبؒ مولانا عبد الحئیؒ نے اس کتاب کا عربی ترجمہ کیا تھا۔ یہ کتاب عرب میں بہت مقبول ہوئی۔

(۹) یکروزی۔ یہ مختصر رسالہ فارسی زبان میں ہے جو ایک روز میں ایک ہی نشست میں مولانا فضل حق خیر آبادی مرحوم کے رسالہ کے جواب میں ارقام فرمایا ہے۔ مولانا خیر آبادی نے تقویت الایمان کی بعض عبارتوں پر کچھ اعتراض کئے تھے شاہ صاحبؒ نے اُن اعتراضات کا مسکت اور مدلل جواب دیا ہے۔ یہ رسالہ قابل دید ہے[1]

مرزا حیرت لکھتے ہیں کہ۔

"ان رسائل کے علاوہ آپ کی تصوف میں اور بھی کتابیں ہیں جن میں سے بعض کی میں زیارت کر چکا ہوں اور بعض کو میں نے دیکھا بھی نہیں۔" (حیات طیبہ)

مرزا حیرت نے کچھ خطوط شاہ صاحبؒ کے اپنی کتاب میں درج کئے ہیں اور لکھا ہے کہ

"میرے پاس (اُن کے) خطوط کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا۔" (حیات طیبہ صـ۲۳۱)

ایک مثنوی سلک نور نام کی آپ کی تصنیف بتائی جاتی ہے جس کا شروع اس طرح ہے۔

الٰہی ترا نام کیا خوب ہے　　کہ ہر جان کو وہ ہی مطلوب ہے

اسی سے ہے ہر دل کو آرام و چین　　وہی سب زبانوں کا ہے زیب و زین

اس کے علاوہ چند کتب پر آپ کے حاشیے بھی تھے۔ مولانا رشید الدین خاں دہلویؒ کے

---

[1] مرزا حیرت نے لکھا ہے کہ ہنٹر نے اپنی کتاب میں شاہ صاحب کی ایک کتاب تذکرۃ الاخوۃ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ یہ لکھنے کے بعد تحریر کرتے ہیں۔

"میں نے ہر چند اس کتاب کو تلاش کیا مجھے نہیں ملی، خبر نہیں ڈاکٹر ہنٹر کے ہاتھ یہ کتاب کہاں سے لگ گئی تھی۔"

مرزا حیرت کو خواہ مخواہ حیرت ہوئی۔ ہنٹر نے تذکیر الاخوان دیکھ لی ہو گی جس میں متن شاہ صاحبؒ ہی کا ہے اور فوائد محمد سلطان صاحب کے اور وہ اکثر تقویت الایمان ہی کے ساتھ شائع ہوتی ہے۔ ہنٹر نے اس کتاب کا نام بجائے ذکر شاہ صاحبؒ ہی کی طرف منسوب کر دیا بھلا اُسے زحمت تحقیق برداشت کرنے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ ؟

صاحبزادے مولوی سدید الدین خاں امین مدرسہ کلکتہ (جن کا ہزار ہا روپے کا کتب خانہ سنہ ۱۸۵۷ء میں لوٹا گیا) فرمایا کرتے تھے کہ۔

"وہ ہم کو اپنے کتب خانے کے لوٹے جانے کا اس قدر افسوس نہیں ہے جس قدر اُن حاشیوں کے ضائع ہو جانے کا افسوس ہے جو علمی کتابوں پر مولانا شہیدؒ نے چڑھائے تھے۔ کیونکہ وہ کتابیں تو پھر مل سکتی ہیں لیکن ان حاشیوں کا ملنا سراسر محال ہے" پھر صاحب لکھتے ہیں۔

"سید صاحب کے مکاتیب کا بڑا حصہ بھی اُنہی کا لکھوایا ہوا ہے۔ کچھ منظومات بھی اُن سے منسوب ہیں مثلاً ایک نعتیہ قصیدہ فارسی میں ایک قصیدہ سید صاحبؒ کی مدح میں۔ توحید پر ایک مثنوی فارسی میں۔ موسوم بہ سلک نور۔ اور اسی نام کی ایک مثنوی اُردو میں" (جماعت مجاہدین صـ۱۲۹)

کیا تقویت الایمان حضرت شاہ صاحبؒ ہی کی کتاب ہے؟

تقویۃ الایمان پر اہل بدعت کے بیشمار حملوں سے متاثر ہو کر یا نہ معلوم کس بنا پر کچھ عرصے سے بعض حضرات کی طرف سے یہ تحقیق پیش کی گئی ہے کہ یہ کتاب شاہ صاحبؒ کی نہیں ہے یا یہ کہ اس کی نسبت مشکوک ہے۔ اس سلسلے میں "التحقیق الجدید علی تصنیف الشہیدؒ" مصنفہ مولوی حافظ عبدالشکور صاحب مرزاپوری مرحوم میری نظر سے گزری جو اس موضوع پر غالباً پہلی کتاب ہے۔ مولوی نجم الدین صاحب اصلاحی نے بھی اپنے مرتب کئے ہوئے "مکتوبات شیخ الاسلام" جلد دوم کے ایک فٹ نوٹ میں اس تحقیق کی تائید کی ہے۔

اس قسم کی تحریروں سے یقیناً بہت سے دلوں میں اس بارہ میں شک اور خلجان پیدا ہوا ہوگا اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر تقویت الایمان پر کچھ لکھوں تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ یہ واقعی حضرت شاہ صاحبؒ ہی کی تصنیف ہے۔

سب سے پہلے تقویت الایمان کے اصل و متن کے بارے میں کچھ وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

اس کتاب کا متن ردّ الاشراک ہے جس میں آیات قرآنی اور احادیث

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کی گئی ہیں اور اُس کے آخری حصے میں عربی زبان ہی میں کچھ فوائد بھی ہیں۔ مجھے میرٹھ کے ایک قدیم مدرسہ اسلامیہ کے کتب خانے میں اس کا ایک قلمی نسخہ دیکھنے کے اتفاق ہوا۔ جس کے سرورق پر یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔

"ردالاشراک فی علم الحدیث تالیف مولوی محمد اسمٰعیل برادرزادہ حضرت شاہ عبدالعزیز مرحوم دہلوی المحدث از کتب خانہ حکیم غلام محی الدین طبیب ساکن میرٹھ"

اس پر حکیم صاحب مذکور کی مہر بھی ہے جس میں غالباً سنہ ۱۲۴۳ھ کندہ ہے۔

قیاس غالب یہ ہے کہ حضرت مولانا شہیدؒ کے زمانۂ حیات ظاہری ہی میں یہ نسخہ نقل ہوا ہے۔ اس کتاب میں دو باب ہیں۔ ایک باب توحید۔ دوسرا باب سنت پوری کتاب کی ترتیب سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے ذریعے کلمہ طیبہ کے ہر دو جزء کی تشریح و تفصیل کرنا مقصود ہے۔ کتاب کے آخر میں یہ اشعار درج ہیں جو حضرت شاہ صاحب کے فکر کا نتیجہ ہیں۔

گوید ایں بندۂ ضعیف و ذلیل	نام او ہست عاجز اسمٰعیل
ایں احادیث چند جمع شدہ	کہ ازاں اصل شرک قمع شدہ
طرفہ تر آنکہ ایں حدیث نبی	شد مؤید بقول رب قوی
آنچہ تقدیم اولاً کردم	ردِ اشراک، مجملاً کردم

یہ کتاب متوسط سائز کے آٹھ جزو پر مشتمل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے بعد میں ضرورت محسوس کرکے اس کتاب کے پہلے باب میں ترجمہ و فوائد اردو شامل کرکے اس کا نام تقویت الایمان رکھا۔ دوسرے باب اعتصام بالسنۃ کے مندرجات پر عربی زبان میں فوائد ہیں۔ اردو زبان میں اس کو منتقل کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ اُس کے بعد معرکۂ جہاد پیش آگیا۔ محمد سلطان نامی ایک صاحب نے اُس کا ترجمہ کرکے تذکیر الاخوان بقیہ تقویۃ الایمان نام رکھا۔ چنانچہ وہ تذکیر الاخوان کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"وہ بعد اس کے معلوم کیا چاہیئے کہ ایک فاضل جلیل متشرع دیندار نے (شاہ صاحبؒ نے) شرک اور بدعت کی برائی کے بیان میں ایک رسالہ تقویت الایمان لکھا اور اُس میں

صرف آیتیں اور حدیثیں جمع کیں اور اس کے دو باب ٹھہرائے۔ ایک باب میں توحید کی خوبیاں اور شرک کی برائیاں ہندی (اُردو) زبان میں بیان کیں اور دوسرے باب میں اتباع سنت کی خوبیاں اور بدعت کی برائیاں اور تفصیل بعض بدعات کی آیت اور حدیث سے ذکر کی اور ارادہ ہندی ترجمے کا کیا مگر فرصت نہ پائی اور راہ خدا میں جان دی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

اب سن بارہ سو پچاس (۱۲۵۰ھ) میں اللہ تعالیٰ نے اس خاکسار گنہگار محمد سلطان کے دل میں ارادہ اس کے ترجمہ کا ڈالا سو دوسرے باب کا ترجمہ ہندی بولی میں شروع کیا اور تذکیر الاخوان بقیہ تقویت الایمان اس کا نام رکھا۔"

تقویت الایمان نام کی کتاب یقیناً حضرت شاہ صاحبؒ کی ہے یہ ممکن ہے کہ ناسخین و کاتبین کے قلم سے اس میں کوئی جزوی ردو بدل ہو گیا ہو۔ ایسا ہونا ممکن ہے۔ بزرگوں کی کتابوں میں جو کتاب جتنی زیادہ رائج ہوتی ہے اور اس کی جتنی زیادہ نقلیں کی گئی ہیں اس کی بعض عبارتوں میں اتنا ہی جزوی تغیر و تبدل ہو جانا کچھ بعید نہیں بلکہ موجود ہے۔ لیکن صرف اس معمولی تغیر کو مصنوعیت کی دلیل ٹھہرانا سراسر دور از تحقیق بات ہے۔ غور کیجیے موافقین ومخالفین نے اس کتاب کی تائید و تردید کی اس پر تحریری و تقریری مناظرے ہوئے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کو اس کتاب کے بعض مضامین پر اعتراض تھا حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کا جواب دیا ہے بعد کو بھی شہادت شہیدؒ سے لے کر اس وقت تک اہل باطل کی طرف سے اس کتاب پر تصنیف شہیدؒ کی حیثیت سے لے دے ہو رہی ہے اور اہل حق برابر جواب دے رہے ہیں جو کتاب اس تواتر کے ساتھ حضرت شاہ صاحبؒ کی کتاب ہو اس کے متعلق یہ کہہ دینا کہ مصنوعی ہے ان کی نہیں ہے کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

حضرت شاہ صاحب کی ایک تصنیف یک روزی ہے۔ یہ مولانا فضل حق خیرآبادی مرحوم کے اعتراضات کے جواب میں لکھی گئی تھی اس کا قلمی نسخہ (محررہ ۱۲۸۰ھ) جو کتب خانہ فیض العلوم پھلت ضلع مظفر نگر میں ہے۔ میری نظر سے گزرا جس کے آغاز میں یہ عبارت مرقوم ہے۔

"رسالہ ہٰذا از تصنیفات عالم نبیل مقبول رب جلیل مولانا و بالفضل والاحسان اولٰنا مولوی محمد اسمٰعیل شہید مرحوم و مغفور است کہ در دفع اعتراضات مولوی فضل حق صاحب در یک روز نویسانید و دادہ بودند"

اس رسالے کو شروع کرتے ہوئے خود حضرت شاہ صاحبؒ نے تقویت الایمان کا ذکر یوں فرمایا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ از عبارت مرقومہ چناں مستفاد می شود کہ مقصود معترض ایراد اعتراض است بر عبارت رسالہ تقویۃ الایمان بسبب چہ الخ

اسی طرح دو ایک جگہ اور بھی تقویت الایمان کا نام لیا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے سنہ ۱۲۴۰ھ میں یہ رسالہ لکھا ہے۔ اس سے بڑھکر اور کیا دلیل اس امر کی ہو سکتی ہے کہ تقویت الایمان حضرت شہیدؒ دہلوی کی ہے۔ میرے نزدیک صرف یہی ایک دلیل کافی ہے پھر بھی مزید اطمینان کے لئے دو تین قلمی اور مطبوعہ (قدیم) نسخوں کو پیش کرتا ہوں۔

(۱) کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے شعبۂ مخطوطات میں سنہ ۱۲۴۶ھ کی لکھی ہوئی یہی تقویت الایمان مصنفہ شہیدؒ کی حیثیت سے موجود ہے۔

(۲) فہرست کتب قلمی محررہ سنہ ۱۲۴۳ھ میں جو کہ مولانا محمد صابر عثمانی مرحوم کے قلم کی ہے تقویت الایمان مصنفہ مولانا محمد اسمٰعیل شہید کا اندراج ہے۔ دفتری نور الحق صاحب عثمانی دیوبندی نواسۂ شاہ رفیع الدین عثمانی دیوبندیؒ کے پاس یہ فہرست موجود ہے۔

(۳) سنہ ۱۲۶۵ھ کی مکتوبہ تقویت الایمان میرے پیش نظر ہے جس کے آخر میں یہ عبارت لکھی ہے۔

"قد تمت ہٰذہ الرسالۃ المسمی بہ تقویت الایمان من تصنیف مولانا اسمٰعیل صاحب دہلویؒ"

(۴) ۱۲ محرم سنہ ۱۲۶۷ھ کو جمعۃ موگران شاہجہاں آباد (دہلی) مطبع محمدی میں حافظ محمد پیر خاں کے اہتمام سے جو تقویت الایمان چھپی ہے اُس کی قلمی نقل بھی میرے پیش نظر ہے اس پر مولانا محبوب علی دہلوی کا بھی حاشیہ ہے۔ آخر کتاب کی ایک عبارت پر حاشیہ لکھتے ہوئے محشی نے لکھا ہے۔

"افسوس ایسے موحد، محب رسول کی کہ آخر اس راہ میں شہید ہوئے۔ گور پرست لا مذہب ہونگے

نے توحید کے پھولوں سے دامنِ مراد کو بھر دیا۔ آج کی ترقی یافتہ اُردو کو معیار بنا کر اس کتاب کو جانچنا ایک بر دست علمی و تحقیقی غلطی ہو گی۔ ویسے تقویت الایمان اپنی عبارت کی شستگی اور روانی کے لحاظ سے آج بھی اہل نظر کی نگاہوں میں بہترین مانی گئی ہے۔

شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے۔

"اُن کی (حضرت شہیدؒ کی) اہم ترین کتاب تقویۃ الایمان ہے جو اُنھوں نے اُردو زبان میں اُسوقت لکھی جب اس زبان کو ابھی گھٹنوں چلنا نہ آتا تھا" الخ

موج کوثر ص ۳۵

ایک جگہ اسی موج کوثر میں ہے۔

"یہ کتاب نہ صرف مذہبی بلکہ ادبی نقطۂ نظر سے بھی بڑی اہم ہے اس کا طرز تحریر ایسا با اثر اور پُر زور ہے کہ بقول صاحب سیر المصنفین معلوم ہوتا ہے کہ "ایک دریائے زخار اُمنڈا چلا آتا ہے۔"

تعجب تو یہ ہے کہ اس کتاب کو غور سے دیکھے بغیر بہت سے لوگوں نے محض سنی سنائی باتوں پر اعتماد کرتے ہوئے اُن "کور باطنوں" کی ہم آہنگی کی جنھوں نے "اشارۂ چشم فرنگ"[۱] پر یہ تمام "ہنگامہ رستخیز" برپا کیا اور دیدہ و دانستہ خدا کا نہ خوف کر کے کفر کے فتوے لگائے۔ بہت سے عوام بیچارے اچھے اچھے لباسوں اور چہروں سے مرعوب ہو کر وہی کہنے لگے جو ان "مقدس" کفر سازوں نے کہا لیکن حقیقت بے نقاب ہوتی جا رہی ہے۔ اب جبکہ "دجل و فریب" کی کارگزاریاں واضح ہو رہی ہیں، اور جعل سازوں کی تمام جعلسازیاں کھُل کر سامنے آ رہی ہیں یہ بات بھی نمایاں ہو جائے گی کہ فرنگی کی حکومت مضبوط کرنے کے لئے اُس کے ایمار سے اور اُس کی خوشنودیٔ مزاج حاصل کرنے کیلئے حضرت شہیدؒ اور اُن کی جماعت کی بے پناہ محبوب و مؤثر شخصیتوں کے اثرات زائل کرنے میں کن کن "تقدس مآبوں" نے کام کیا ہے۔ اس مقالے میں گنجائش نہیں ورنہ ارادہ تھا کہ اس بحث کو بھی پایۂ تکمیل تک پہونچاتا۔ مرزا حیرت نے حیات طیبہ میں تقویت الایمان کے متعلق ایک واقعہ لکھا ہے اس کو یہاں نقل کرتا ہوں جس سے یہ بات واضح ہو گی کہ حقیقت سامنے

---

[۱] دیکھئے سیرت سید احمد شہید طباعت دوم ص ۲۴۳ تا ۲۴۷

کچھ قدر نہ کی کبھی وہابی کہا بلکہ بزرگوں کا منکر ٹھہرایا" الخ

اب آپ فرمائیے کہ رد الاشراک کو دیکھکر تقویت الایمان کے بارے میں خواہ مخواہ شبہ پیدا کر دینا کہاں کی تحقیق ہے؟ اسی کے ساتھ ساتھ میں تنویر العینین کے متعلق بھی کہتا ہوں کہ یہ بھی یقیناً حضرت شاہ صاحبؒ کی تصنیف ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے آخر میں اس کے بعض مضامین سے رجوع کر لیا ہو۔ مجھے اپنے ایک بزرگ استاذ سے یہ روایت پہونچی ہے کہ نواب قطب الدین دہلویؒ مؤلف مظاہر حق شاگرد حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ نے حضرت شیخ الہندؒ سے فرمایا کہ تنویر العینین حضرت شہیدؒ کی تصنیف نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ نواب قطب الدین دہلویؒ کو حضرت شہیدؒ کے آخری نعل سے یہ شبہ ہوا ہو اس سلسلے میں مولانا کرامت علی جونپوریؒ کی بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے جس کو انھوں نے ذخیرۂ کرامت صفحہ ۲۲۴ ج ۲ میں مولوی مخلص الرحمٰن کے سوال کے جواب میں فرمایا ہے۔

"تنویر العینین جو کتاب ہے سو اس میں مولانا محمد اسمٰعیل کے لکھے ہوئے چند ورق رفع یدین کی ترجیح میں ہیں اور بعد اس کے مولانا مرحوم نے اپنے مرشد حضرت سید احمد قدس سرہٗ کے سمجھانے سے اپنے قول سے رجوع کیا یعنی رفع یدین چھوڑ دیا۔"

تقویت الایمان پر کئے گئے اعتراضات زیادہ تر غلط فہمی کج فہمی اور فرنگی کی سازش پر مبنی ہیں۔

تقویت الایمان کے متعلق یہ تو ثابت ہو چکا کہ یہ کتاب حضرت شاہ صاحبؒ ہی کے افادات میں سے ہے۔ اس مخزن علم توحید کو شاہ صاحبؒ کی جانب منسوب کرنے میں نہ مجھے کوئی جھجک ہے اور نہ کوئی مصلحت مانع ہے جس وقت اور جس ماحول میں یہ کتاب لکھی گئی اس کو پیش نظر رکھا جائے اور پھر یہ بھی ملحوظ ہے کہ کس مضمون میں یہ کتاب ہے؟۔ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ جیسی حساس طبیعت اور فاروقی جذبات والی شخصیت کے قلم سے یہ کتاب اس وقت نکلی ہے جب شرک و بدعات کا زور تھا اور اردو نثر نے بھی کچھ ترقی نہیں کی تھی بلکہ مذہبی اردو نثر کی بالکل ابتدا تھی۔ اور یہ خاندان ولی اللّٰہی کا صدقہ ہے کہ اردو زبان کو قرآن کا ترجمہ ملا اور اسی خاندان کے ایک فرد جلیل

نہ آنے کی وجہ سے بھی غلط فہمیاں پھیلتی اور قائم رہتی ہیں۔ جوں ہی صحیح بات سامنے آجاتی ہے باطل راہ فرار اختیار کرلیتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"بمبئی میں عموماً مولانا اسمٰعیلؒ کے نام سے لوگ جلتے ہیں لیکن جلنے کی وجہ صرف سُنی سنائی باتیں ہیں جن کی کچھ بھی بنیاد نہیں اور وہ محض بے اصل ہیں۔ ایک دن جمعہ کو میں بمبئی کی جامع مسجد میں گیا تو نماز پڑھنے کے بعد مجھے میرے ایک دوست نے ٹھہرالیا۔ میں وہیں بیٹھ گیا کئی شخص اور بھی میرے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے اُن کی گفتگو سے یہ معلوم ہوتا تھا یہ لکھے پڑھے ہیں وہ باہم مولوی اسمٰعیل صاحب کا ذکر تحقیر آمیز الفاظ میں کر رہے تھے اور ایسی ایسی بے بنیاد باتیں قائم کر رہے تھے جو میرے کانوں میں جہاں تک مجھے یاد ہیں کبھی نہ پڑی تھیں ایک شخص تو یہ کہہ رہا تھا کہ تقویت الایمان سوائے کفر کے کچھ نہیں ہے۔ نبیؐ اور آپ کے صحابہؓ کو بُرا گالیاں (نعوذ باللہ) دی گئی ہیں۔ دوسرا شخص بولا کہ صوفیوں کو تو ایسا سخت لکھاہے کہ ہندو عیسائی بھی کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ یہ نازیبا باتیں سُن کے مجھ سے رہا نہ گیا ہر چند میں چاہتا تھا کہ اُن کے خیالات میں خلل اندازی نہ کروں لیکن جب قرآن کا یہ ارشاد ذہن میں آیا کہ حق بات چھپانی نہیں چاہیئے۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کے اُن کے پاس جابیٹھا۔ اور میں نے نہایت ادب سے اُن کی خدمت میں یہ عرض کیا "آپ نے تقویت الایمان دیکھی ہے؟" اُنھوں نے نہایت سادگی سے بے پرواہانہ لہجے میں یہ جواب دیا "نہیں — ہم نے نہیں دیکھی اور نہ ہم اسے دیکھنا چاہتے ہیں" میں نے نہایت عاجزی سے اُن کی خدمت میں عرض کیا۔ "بڑے ظلم کی بات ہے۔ آپ نے ایک چیز ملاحظہ نہیں کی اور اُس کی بابت اس مضبوطی سے رائے قائم کی جاتی ہے" میری اس بات سے وہ ناراض ہوئے اور اُنھوں نے میری طرف حقارت کی نظر سے دیکھا پھر میں نے یہی التماس کیا کہ "میرے خیال میں زیادہ بہتر یہی ہوگا کہ آپ اُسے ملاحظہ فرما کے اُس پر رائے قائم کریں" بڑی ردو کد کے بعد اُنھوں نے میری بات مان لی۔ میں نے اُنھیں تقویت الایمان بھجوادی۔ آٹھویں دن جب وہ مجھ سے ملے تو اُن کے خیالات ہی بدلے ہوئے تھے" (صـ ۱۹۶)

• اس خالص مضامین توحید پر مشتمل کتاب کی افادیت کا انکار کرنا (جس نے بیشمار انسانوں کی اصلاح کردی) سخت ناانصافی اور ہٹ دھرمی ہے۔

تقویت الایمان پر سب سے پہلا علمی اعتراض

تحقیق سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تقویت الایمان پر سب سے پہلا اعتراض مولانا فضل حق خیرآبادی نے کیا تھا وہ ایک علمی اعتراض تھا۔ مولانا خیرآبادی خود ایک جید منطقی عالم اور خاندان ولی اللّٰہی کے فیض یافتہ تھے۔ اُنھوں نے مولانا شہیدؒ کی ایک عبارت سے امکان نظیر کا مفہوم پیدا کیا۔ جس کی تعبیر بلفظ صحیح اثبات قدرت سے ہو سکتی تھی۔ قدرت کو منظور تھا کہ سرزمین دہلی پر علم کلام کا یہ زبردست مسئلہ حل ہو جائے۔ مولانا خیرآبادی نے ایک سالہ اس سلسلے میں لکھا اور ایک معقولی عالم کی حیثیت سے معقولی انداز میں تقویت الایمان کے بعض مضامین پر اعتراضات کئے۔ اس رسالے میں نہ تو "ذوق کفر سازی" کی تسکین تھی نہ سب و شتم، صرف اپنے تاثرات کو پیش کیا گیا تھا۔ اُن کے اعتراضات کا خلاصہ خود حضرت شہیدؒ کے لفظوں میں یہ ہے۔

(۱) دعوائے تعلق قدرت الٰہیہ بمثل محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فی نفسہا باطل ست

(۲) دعوائے مذکور اسارت ادب است بجناب سید المرسلینؐ۔

(۳) ذکر آں لغو است۔

حضرت شہیدؒ نے یک روزی میں ان اعتراضات کے جو جواب دیئے وہ تمام کے تمام پڑھنے کے قابل ہیں۔ حضرت شہیدؒ نے عقل و نقل کی مدد سے ایسے مدلل جوابات دیئے کہ مولانا خیرآبادی کیلئے جواب کا کوئی موقع نہیں چھوڑا۔ حضرت شہیدؒ کے جوابات کا خلاصہ، ترتیب اعتراضات کے لحاظ سے یہ ہے۔

(۱) وجودِ مثل پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم، تحت قدرت الٰہیہ داخل ہے، تحت تکوین نہیں۔ اگر تحت تکوین داخل ہو تب وقوع لازم آئے گا۔ قدرت علیحدہ صفت ہے اور تکوین علیحدہ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ دوسری جگہ فرماتا ہے۔ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ــــ برہان عقلی یہ ہے کہ وجودِ مثل، ممتنع بالغیر ہے اور ہر ممتنع بالغیر ممکن بالذات ہے اور ہر ممکن بالذات، داخل تحت قدرت الٰہیہ ہے پس وجودِ مثلِ مذکور ــــ داخل تحت قدرتِ الٰہیہ ہے۔

(۲) اسارت و بے ادبی کے متعلق جو کہا گیا ہے اُس کا جواب یہ ہے کہ ــــ وزیر کو

بادشاہ کا نوکر کہنا، باپ کو دادا کا لڑکا کہنا اور اُستاد کو اُس کے اُستاد کا شاگرد کہنا ہرگز اسارتِ ادب نہیں ہے "وجود مثل" کے "تحت قدرت الٰہیہ" داخل ہونے سے اسارتِ ادب اور بے ادبی ہرگز نہیں ہوتی اور نہ اس سے "اضلال عوام" لازم آتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی عبودیت کا اظہار ہے جو کہ اہم مقاصد دینی میں سے ہے۔ جس طرح کہ بعد وفات سید المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم۔ نفس کمالِ نبوت اور اُس کے لوازم۔ نزول وحی اور عصمت کا سلب و انقطاع، اولیاء کرام سے کرنا یہ انبیاء کی شان کی تنقیص نہیں ہے اسی طرح الوہیت کا سلب و انقطاع، اور الوہیت کے لوازم۔ وجوب و قدم، احاطۂ علم، عموم قدرت اور امتناع شریک کا سلب و انقطاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کرنا ہرگز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص نہیں ہے۔

(۳) میرا مقصود، شمول قدرت الٰہیہ ہے معدومات پر۔ اور چونکہ بحیثیت ظاہر ذات والاصفات جناب سید المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم، باعتبار ایجاد، اکمل کائنات اشرف مخلوقات اور اصعب مجعولات ہے۔ اس لئے اکمل مفروضات، نظیر مفروض آنجناب ہی ہے۔ پس میں نے تقویت الایمان میں "شمول قدرت الٰہیہ بر جمیع معدومات ممکنہ" کو اسلوب بلیغ سے بیان کیا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ کوئی کہے کہ فلاں معمار باب عمارت میں اتنی مہارت رکھتا ہے کہ جامع مسجد دہلی جیسی تعمیر کر سکتا ہے اس سے جہاں معمار کی مہارت تامہ معلوم ہوتی ہے ساتھ ہی ساتھ جامع شاہجہاں آباد کی حسن تعمیر میں دوسری (ہندوستانی) مسجدوں پر شرافت و خوبی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

پورے رسالہ میں جو لاجواب جوابی مضامین ہیں اُن کی تشریح و تفصیل کے لئے ایک مستقل مقالے کی ضرورت ہے اس وقت بقدر ضرورت پر اکتفاء کیا گیا ہے۔ مولانا شہیدؒ کے زمانے ہی میں اہل علم کے روبرو یہ مسئلہ تشفی بخش جوابات کے ساتھ واضح ہو گیا تھا اور غالباً اس سے پہلے یہ علمی مسئلہ اتنی وضاحت کے ساتھ صاف نہ ہوا ہوگا۔ مگر تعجب ہے اہل باطل بار بار مکروہ طریقے سے اس مسئلے کو دوہرا رہے ہیں اور اپنی جہالت کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔

تقویت الایمان کے خلاف تکفیر بازوں کا طوفان | بعد شہادت حضرت شہیدؒ

میدان خالی پاکر اس مفید ایمان کتاب کے خلاف وہ طوفان برپا کیا کہ الامان والحفیظ۔ مدراس میں ایک فتویٰ اس کتاب کی تقبیح اور معتقدوں کی تکفیر میں بعض عبارات لیکر مرتب کیا گیا۔ جب یہ فتویٰ کلکتہ پہونچا تو عوام مومنین جو تقویۃ الایمان کے فیض سے شرک و بدعت چھوڑ چکے تھے اس فتوے کے وحشت انگیز مضامین دیکھکر تذبذب میں مبتلا ہوئے۔ آخر کار بغرض تحقیق اس بارے میں اُنھوں نے استفتار کیا۔ علمار کی ایک بڑی جماعت نے تقویۃ الایمان کی موافقت میں دو فتوے دیئے ایک مجمل اور دوسرا مفصل اور اُن پر اپنی مہریں اور دستخط ثبت کئے ان دونوں فتووں کے اچھے اثرات پڑے اور وہ شبہات و وساوس جو عوام میں پیدا کیے گئے تھے دور ہوگئے۔ رجب علی حسینی لکھنوی نے دونوں فتووں کو شائع کرادیا ہے اس کی ایک قلمی نقل میرے سامنے ہے ان علمار کلکتہ میں سے جنھوں نے موافقت میں فتوے دیئے چند کے اسمار یہاں بھی درج کرتا ہوں۔

مولانا غلام سبحان، مولانا سید محمد مراد، مولانا وارث علی، مولانا عبدالباری قاضی شہر کلکتہ، مولانا اکبر شاہ کابلی، مولانا محمد سلیمان الهروی۔ مولانا رمضان علی (مدرسین مدرسہ کلکتہ)، مولانا منصور احمد، مولانا خادم حسین مدرسین مدرسہ کلکتہ، مولانا صاحب علی خان، مولانا ریاض الدین وغیرہم من العلمار والصلحا۔

ان فتووں پر مولانا کرامت علی جونپوری رح کے بھی دستخط موجود ہیں۔

بعد کو بدایوں اور الہ آباد کے بعض علمار نے تقویۃ الایمان کے رد میں رسالے لکھے اور ایک مشہور زمانہ "کفرساز بزرگ" نے تو "وہابیہ نجدیہ و اسمٰعیلیہ و دیوبندیہ و محمدیہ" کے رد میں اُن کے بعض ہمنواؤں کے بقول دو سو کتابیں لکھیں (تاریخ وہابیہ صہ۳۹)

مگر کیا ہوا؟ منہ کی کھائی اور تمام تحریریں حق کے سامنے بیکار گئیں بھلا چاند پر خاک ڈالنے سے فائدہ؟ ان تکفیر بازوں نے حضرت شہیدؒ کے حق میں آج تک جو ہرزہ سرائی "درکسی" کے اشارے یا کج فہمی سے کی ہے وہ موجود ہے اور حضرت شہیدؒ کے کارنامے اور اُن کی خدمات دینیہ بھی۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھے گا مستقبل کا مورخ شہیدؒ کے روشن کارناموں کو سراہتے ہوئے ان بدباطن دشمنان حق کی یاوہ گوئیوں پر اظہار نفرت کریگا۔

میں چاہتا ہوں کہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ کی ایک الہامی کیف آور اور حق آگیں تحریر پر اس بحث کو ختم کر دوں۔ فرماتے ہیں۔

"۲۴ ذی قعدہ سنہ ۱۲۴۶ھ سے لیکر اس دن تک جس کو سو برس سے زائد ہوئے شاید کوئی دن طلوع ہوا ہو جس کی صبح کو اس شہید اسلام (حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ دہلوی) کی جس کی اور فضیلتیں برطرف اس کی شہادت مسلم اور شہداء کی مغفرت مسلم۔ تکفیر و تضلیل میں کوئی فتویٰ نہ نکلا ہو، لعنت و سب و شتم کا کوئی صیغہ نہ استعمال کیا گیا ہو۔ فقہ و فتاویٰ کی کوئی دلیل ایسی نہیں جو اس کے کفر کے ثبوت میں نہ پیش کی گئی ہو وہ ابوجہل و ابولہب سے زیادہ دشمن اسلام، خوارج و مرتدین سے زیادہ مارق من الدین و خارج از اسلام فرعون و ہامان سے زیادہ مستحق نار، کفر و ضلالت کا بانی۔ بے ادبوں اور گستاخوں کا پیشوا شیخ نجدی کا مقلد و شاگرد بتایا گیا اور یہ اُن لوگوں نے کہا جن کے جسم نازک میں آجتک اللہ کے لئے ایک پھانس بھی نہیں چبھی۔ جن کے پیروں میں اللہ کے راستے میں کوئی کانٹا نہیں گڑا جن کو خون چھوڑ کر دکھ اس کا اُن کے یہاں کیا ذکر، اسلام کی صحیح خدمت میں پسینے کا ایک قطرہ بہانے کی سعادت بھی حاصل نہیں ہوئی اور یہ اُن لوگوں نے کہا جن کی ماؤں بہنوں، بیٹیوں کی عزت و عصمت بچانے کیلئے اُسنے اپنا سر کٹایا۔ تو کیا اُس کا یہی گناہ تھا؟ اور کیا دُنیا میں احسان فراموشی کی اس سے بڑھ کر نظیر مل سکتی ہے؟ جس وقت پنجاب میں مسلمانوں کا دین و ایمان جان و مال، عزت و آبرو محفوظ نہ تھی اُسوقت یہ غیرت ایمانی و حمیت اسلامی والے جو ایک "کلمہ کفر" برداشت نہیں کر سکتے کہاں تھے؟ اور کیا آج بھی شاہ ولی اللہؒ کے پوتے کے علاوہ کوئی کافر نہیں۔؟

دیکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

(سیرت سید احمد شہید بار دوم صفحہ ۳۵۷ و ۳۵۸)

شہادت | حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ تین ہزار میل کا راستہ طے کر کے پشاور کے علاقے میں پہونچے۔

یہاں اللہ کا پیغام سنانے اور اللہ کے کلمے کو اونچا کرنے کے لئے جتنی کوششیں وہ کر سکتے تھے اُنھوں نے کیں، سخت سے سخت مصیبتیں اُٹھائیں، انتہائی مشقتیں برداشت کیں۔ اور صبر آزما محنتیں جھیلیں، جتنی جنگیں مجاہدین نے لڑیں اُن سب میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ جو سیاسی خطوط حکمرانوں کے نام روانہ ہوتے تھے وہ زیادہ تر آپ ہی کے لکھوائے ہوئے ہوتے تھے۔ مرزا حیرت کے بیان کی رو سے گیارہ جنگیں ہوئیں ان سب میں حضرت مولانا شہید دہلوی شریک رہے۔ بالآخر بالاکوٹ کے میدان میں اپنے محبوب پیر و مرشد کے ہمراہ ۲۴ ذی قعدہ سنہ ۱۲۴۶ھ کو جمعہ کے دن اپنے خون کا آخری قطرہ اللہ کے راستے میں بہایا۔ وہیں آپ کی قبر ہے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

خبر شہادت دہلی میں حضرت شہید دہلوی کی خبر شہادت سے دہلی ہی میں نہیں تمام ہندوستان میں رنج و غم کی لہر دوڑ گئی ہوگی۔ لیکن یہ سنکر آپ کو تعجب ہوگا کہ اُس وقت دہلی میں دنیا بیگ جیسا سخت دل حاسد بھی موجود تھا جس نے شہادت کی خبر سنکر اس خوشی میں جامع مسجد دہلی میں مٹھائی تقسیم کی تھی۔ (حیات طیبہ بحوالہ مجموعۂ واقعات ص۱۰۹) مگر شریف النفس اور نیک دل مدمقابل ایسے ہوتے ہیں جیسے مولانا فضل حق خیرآبادی مرحوم۔ لکھا ہے کہ۔

”مولوی فضل حق خیرآبادی سے خاصی کشمکش رہی تھی مولوی صاحب نے شہادت کی خبر اُس وقت سنی جب طلبہ کو سبق پڑھا رہے تھے یہ سنتے ہی کتاب بند کر دی گھنٹوں بیٹھے روتے رہے اس کے بعد کہا کہ اسمٰعیل کو ہم مولوی نہ جانتے تھے وہ اُمت محمدیہ کا حکیم تھا کوئی شئے نہ تھی جس کی انیت اور لمیت اُس کے ذہن میں نہ ہو۔“

(جماعت مجاہدین ص۱۲۹ بحوالہ حیات بعد الممات)

اولاد حضرت مولانا شہیدؒ کی اولاد کے بارے میں سوانح احمدیہ میں لکھا ہے۔

”محمد عمر آپ کے صاحبزادے تھے سنہ ۱۲۶۰ھ میں وہ بھی لاولد رحلت کر گئے۔“

شاہ محمد عمرؒ مجذوب صفت بزرگ تھے۔ تذکرۃ الرشید اور ارواح ثلثہ میں ان کے متعلق کچھ حکایات ملتی ہیں۔

مولانا محمد حسین فقیر دہلویؒ کا قصیدہ آخر میں دہلی کے مشہور واعظ مولانا محمد حسین فقیرؒ کے

ایک قصیدے کا انتخاب درج کرتا ہوں۔ یہ قصیدہ مولانا فقیر دہلوی رحؒ نے حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ دہلوی کی شان میں لکھا ہے۔ اس میں حضرت مولانا شہیدؒ کی زندگی کے اہم واقعات آگئے ہیں۔

پوچھیے نام تو، ہم نام ذبیح اللہ تھے — جو عُمر تھے وہ اگر پوچھیے اُن کی کنیت

دیکھنے والے ابھی اُن کے بہت ہیں موجود — کیجئے تصدیق، جو اس غرض میں تنک ہو حضرت

عالم ایسے تھے کہ کیا علم کا اُنکے ہو بیاں — علما کو بھی رہی علم سے اُن کے حیرت

صرف میں نحو میں وہ رتبۂ عالی اُن کا — ابن حاجب کی نہ تھی عہد میں اُنکے حاجت

ایک جملہ بھی سنے اُن کے بیاں سے تو مدام — نحو نحوی پہ رہے صرفی کو ہو مصروفیت

اہل معقول بنے اُن کے بیاں سے معقول — اہل ہیئت پہ رہی اُن کی ہمیشہ ہیبت

ہر اشارہ تھا اشارات، شفا تھا ہر لفظ — بو علی سینا کو کلام اُن کا سکھا دے حکمت

جو ادب میں انھیں سکاکیٔ دوراں کہیے — کب بجا ہے، کہ یہ ہے بے ادبی کی نسبت

علم تفسیر کو کیا کہیے کہ گویا اُن کو — ابن عباسؓ کی تھی روح سے خاص قربت

کیا بیاں معنیٔ قرآں کئے سبحان اللہ — گویا ان آنکھوں کو دکھلا دیے نار و جنت

اس قدر علم احادیث رسول حق تھا — نائب ختم رسل اُنکی مناسب ہے صفت

تھے وہ بے واسطہ تلمیذ بخاریؒ گویا — ایسے شاگرد سے مسلم کو بھی ہوتی راحت

ترمذیؒ کے وہ اگر عہد میں ہوتے تو ضرور — نور چشم اپنا سمجھتے وہ انھیں بے منت

ہوتے مالکؒ کے زمانے میں اگر مولانا — ملک تدریس کی دیتے وہ انھیں ملکیت

پاتے قسمت سے اگر دور سلیمانؒ[1] کی حدیث — شاہ ایسے شاگردوں سے لیجاتے وہ گوئے سبقت

ابن ماجہ کا اگر وقت میسر ہوتا — کرتے وہ اُنکے لئے سب سے زیادہ عزت

گویا محفوظ تھیں سینے میں احادیث صحیح — تھے خبردار خبر سے وہ بہت باخبرت

---

[1] سلیمان ابن اشعث سجستانی صاحب سنن۔

بو حنیفہؒ کا زمانہ بھی اگر وہ پاتے — مجتہد اُن کو بنا دیتی اُنھوں کی صحبت
ہوتے شاگردوں میں تا بندِ ابو یوسفؒ وہ — کرتے جو خدمتِ نعمانؒ سے حاصل برکت
عالم و عاملِ قرآن و حدیث ایسے تھے — اُنکا دستورِ عمل تھا یہ کتاب و سنت

حاجی ایسے کہ طفیل اُنکے بہت سی مخلوق — حاجی کعبہ ہوئی زائرِ بیت حضرتؐ
یعنی وہ شوق دلایا کہ سفر ہائے حجاز — قطع کرنے میں سبھی ہو گئے عالی ہمت

واعظ ایسے تھے کہ کیا اُنکے بیاں کا ہو بیاں — سننے والوں کو عجب ہوتی تھی رغبت ہیبت
جب حدیث نبویؐ کا وہ بیاں کرتے تھے — ہوتا تھا خلق سے معدوم، حدوث بدعت
ذکر دوزخ کا جو آتا تو جلا دیتی تھی — آتشِ خوفِ خدا، پنبۂ خوابِ غفلت
اور جنت کا بھی کچھ ذکر جو آجاتا تھا — سُن کے کفار بھی اسلام کی کرتے رغبت
اور جو کرتے تھے کبھی ہول قیامت کا بیان — ق — مجلسِ وعظ کی ہو جاتی تھی ایسی صورت
ایک کو دوسرے کی کچھ نہ خبر رہتی تھی — اس قدر ہوتی تھی ہر ایک کے دل کو دہشت
سر کو سجدے میں جھکا دیتے ہی بن پڑتی تھی — بے نمازوں کی بدل جاتی تھی ایسی حالت
اکل و شرب اپنا فراموش وہ کر دیتے تھے — روزہ خوروں کو تھی اُس وعظ کی ایسی ہیبت
جو نہ دیتے تھے زکوٰۃ اُنکا یہ ہوتا تھا حال — صرف کل مال میں کرتے تھے وہ صرفِ ہمت
عیش میں گھر سے بھی تھا جنکو نکلنا مشکل — سفرِ حج کی پیادہ ہوئی اُن کو رغبت
ہوگئے سیکڑوں زانی بھی زنا سے تائب — اور میخوار بھی توبہ سے ہوئے پاک صفت
زانیہ عورتیں بھی اُن کی نصیحت سُنکر — باندھتی تھیں کسی دیندار سے عقدِ حلت
ہے یہ مشہور کہ دہلی میں وہ اک روز کہیں — آئے زنِ فاحشہ کے در پہ گئے با عزت
اُسکو کچھ ذکرِ قیامت جو سُنایا تو وہیں — وہ بھی تائب ہوئی اور اسکی جو تھیں ہم صحبت
اور اُن سب کے دیئے باندھ اُسی لحظہ نکاح — اللہ اللہ یہ تھی اُن کے بیاں کی ہیبت۔

اور دہلی ہی کی مسجد میں یہ مشہور ہے بات — حوض تک بہتا تھا بازار لگا بے وحشت
خیر کی جانے کو گر ڈالا تھا اک موقعِ شر — اسقدر شہر میں تھی اہل ہوا کی کثرت
بہ طفیل اُنکے وہاں سے یہ بلا دُور ہوئی — موضعِ خیر میں افزوں ہوئی بس خیریت

مسجدیں سیکڑوں آباد ہوئیں اُنکے سبب — مرد و زن لاکھوں نمازی ہوئے صافی طینت
ہر نمازی کو ہوا شوقِ تہجد ایسا — بستر خار بنا بسترِ خوابِ راحت

ہر جگہ دینِ محمدؐ کا رواج ایسا ہوا — ظلمتِ دہر میں روشن ہوا نورِ سنت
دیکھو دشوار تھا کیا کچھ زنِ بیوہ کا نکاح — وہ بھی آسان ہوا اُن سے علیہ الرحمت

اور مہاجر بھی وہ ویسے تھے کہ سبحان اللہ — مانہی اللہ سے تھی اُن کو ہمیشہ ہجرت

غازی ایسے تھے کہ کیا اُنکی غزا کا ہو بیان — آبِ شمشیر کو پیتے تھے وہ مثلِ شربت
مال سے، ملک سے اور جاہ سے کچھ کام نہ تھا — تھا تو یہ کام تھا عالی ہو یہ دینِ ملت
راہِ مولیٰ میں سارے ہی قربان ہوگئے واہ نصیب — اور حیاتِ ابدی پائی علیہ الرحمت

جو بُرا کہتے ہیں ایسوں کو بُرا کرتے ہیں — عیب اپنے ہی بیاں کرتے ہیں وہ بد طینت
ظاہرا بے ادبی ہے یہ کلامِ حق کی — ایسے حافظ کو بُرا کہتے ہیں جو بد خصلت
ایسے عالم کی مذمت جو کیا کرتے ہیں — مثلِ جاہل ہیں اگرچہ ہیں بظاہر علمیت

اسلام اور تحریم شراب

(از مولانا سید محمد انظر شاہ صاحب کشمیری)

(۳)

اخلاقی زندگی کے سلسلہ میں جن جرائم کا ذکر مختصراً آگیا ہے وہ یقیناً شراب نوشی ہی کا نتیجہ ہیں۔ اسلام نے چودہ سو سال قبل جن خطرات کا ادراک کیا تھا آج چودہ سو سال کے بعد دنیا اس کی تصدیق کر رہی ہے حال ہی میں راجستھان اسمبلی میں انسداد مے نوشی کا بل پیش کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ:-

"شراب کو جلد از جلد قانوناً بند کرنا چاہیئے مے کشی کے بڑھتے شغل کی وجہ سے اخلاقی جرائم میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے" (الجمعیۃ دہلی)

ہندوستان کی آبادی میں صرف اسی گوشہ سے ہی یہ آواز نہیں اٹھائی گئی، بلکہ آئے دن صوبوں کی اسمبلیوں میں اسی قسم کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں اور غالباً مرکزی حکومت کو بھی عنقریب شراب کے استعمال کو روکنے کیلئے کوئی اقدام کرنا پڑیگا، اگرچہ آبکاری کے ٹھیکوں اور کاروبار سے جو بڑے منافع حکومتوں کو حاصل ہوتے ہیں اس کے پیش نظر انسداد مے نوشی کی مؤثر جدوجہد تقریباً ناممکن ہے۔

بہرحال زنگ آتش سیال کے ان مضار کی ہلکی سی تفصیل کی گئی جن کا تعلق جسمانی صحت اور پھر اخلاقی زندگی سے تھا اب اس کو بھی دیکھئے کہ ام الخبائث کی تباہ کاریاں معاشرہ سوسائٹی اور عائلی زندگی میں بھی کس درجہ مہلک اور برباد کن ثابت ہو رہی ہیں سیکڑوں گھرانے، قبیلے، خانوادے، بیوی بچے، عزیز و اقارب اور اس سے بڑھ کر ماحول مے کشی

اور بادہ پرستی کی ہلاکتوں سے تباہ حال اور خستہ بال ہے۔ دولت کے انبار، جائداد کے طویل و عریض اور زرخیز حصے۔ ملازمت و نوکری سے حاصل ہونے والی رقم اسی جام زہر پر قربان کی جا رہی ہے۔ گھر میں اہل و عیال بھوک سے تڑپ رہے ہیں۔ معصوم بچے بھوک کی شدت سے بلبلا رہے ہیں۔ لیکن بادہ نوش بوالہوسوں کے بے رحم قلوب پر ان دل ہلا دینے والے مناظر کا کوئی اثر نہیں۔ شاید شراب کا مسلسل استعمال قلب میں قساوت و شقاوت بھی اس درجہ کی پیدا کر دیتا ہے۔ پھر اس جام زہر کا مشغلہ آدمی کو معطل کر کے نشاط کار اور جد و جہد کی اُمنگ چھین لیتا ہے اور یہ شخص خانگی زندگی کے علاوہ سوسائٹی کے حق میں بھی ایک بڑا بار ثابت ہوتا ہے۔ اسلئے عائلی زندگی اور سوسائٹی کے حق میں شراب کی تباہ کاریوں کے ذیل میں ہم سب سے پہلے

”فقدان عمل“

کو لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس زہر کا طویل استعمال سیکڑوں قسم کی بیماریاں اور عوارض جب پیدا کرتا ہے۔ جس کی تفصیل بیان کی گئی تو صحت جسمانی سے یاس ہو نیکے بعد یہ بلانوش تعطل و فقدان عمل کی ایک ایسی زندگی گذاریگا جس میں نشاط کار اور عملی جد و جہد کی اُمنگ تو درکنار اپنا وگیلا وجود سنبھالنا اس کے لئے بار ہوگا۔ خاندان اور سوسائٹی کی نظر میں اپنے وجود کو ایک بار کی حیثیت میں دیکھکر اور ایک رستے ہوئے ناسور کی شکل میں اپنے آپ کو پاکر عجب نہیں کہ پُر آلام و پُر مصائب زندگی کو جلد ختم کرنے کے لئے خودکشی تک پہنچنے کے لئے یہ بلانوش راہ ہموار کرے۔ اگرچہ مے نوشی خود ایک خودکشی ہے جس کی ہلاکت بدیر و سویر موت کی بھیانک شکل میں ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ بعض شراب کے پینے والے اس حماقت میں مبتلا ہیں کہ شراب کے پینے سے عملی جد و جہد میں مدد ملتی ہے اور ایک شرابی اس شخص کے مقابلہ میں زیادہ کام کر سکتا ہے جو شراب استعمال نہ کرتا ہو حالانکہ یہ بھی سراسر غلط ہے۔ شراب کے نتیجے میں عوارض و امراض اور ان کے بعد تعطل و فقدان عمل بدیہی نتیجہ ہے۔ جنوبی افریقہ میں ہونے والی جنگ کے دوران افسران فوج نے محاذ جنگ پر کام کرنیوالے فوجیوں کے متعلق اپنے مشاہدہ کے بعد رپورٹ دیتے ہوئے لکھا تھا کہ

”محاذ جنگ پر تھک کر چُور چُور ہو جانے والے اور جنگ کے عین موقع پر فرار

اختیار کرنے والے وہی فوجی تھے جو شراب کا استعمال کرتے ہیں۔"

(الخمر والحیوۃ ص۶۹)

اور اسی کے ساتھ یہ بھی اطلاع دی گئی تھی کہ۔

"اور جو فوجی شراب کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں۔ خطرات کا مقابلہ کرنے والے اور عملی جدوجہد میں ہرگز نہ تھکنے والے وہی ثابت ہوئے۔ (ایضاً)

فوجی افسران نے اپنے اس چشم دید تجربے میں یہ بھی بتایا کہ محاذ جنگ پر بے پناہ مصروفیت کے نتیجے میں اگر فوجی بیمار بھی ہوئے تو تیزی کے ساتھ صحت کی طرف لوٹنے والے وہی تھے جو شراب کے استعمال سے اجتناب کرتے ہیں۔ اور شراب پینے والے حصول صحت سے بھی محروم رہ جاتے ہیں اپنے اسی مشاہدے کے بعد ان فوجی افسروں نے لکھا تھا کہ۔

"انھیں سپاہیوں کی بھرتی کرنی چاہیے اور محاذ جنگ پر بھیجنا چاہیے جو شراب کے استعمال سے پرہیز کرتے ہوں اسلئے کہ کارآمد اور فعال سپاہی یہی ثابت ہوئے ہیں۔ (ایضاً)

بہترین اور کارآمد فوجیوں کے بارے میں یہ فیصلہ اسی یورپ کی جانب سے کیا جارہا ہے۔ جسنے ایک طویل عرصہ تک فوجیوں کیلئے شراب کو ضروری قرار دیا تھا۔ اور محاذ جنگ پر شراب کے ذخیروں کے ساتھ دنیا بھر سے حرامکار اور بدکار عورتوں کو بھی فوجیوں کی جنسی بھوک کیلئے مہیا کیا جاتا تھا شاید یورپ سمجھ رہا تھا کہ سکر و نشہ کی شدت اور جوش میں اپنی جان کو پیش کرنے میں یہ فوجی پس و پیش نہ کرے لیکن ماہرین یہ سمجھا رہے ہیں کہ مے نوشی کے بعد فقدان عمل اور تعطل کا اتنا زبردست مظاہرہ ہوتا کہ جس سے جنگ کے خونریز ہنگاموں کے دوران مقاصد جنگ میں عظیم نقصانات اور ناکامیاں اٹھانا پڑتی ہیں۔ پچھلی جنگ عظیم میں یورپ نے بڑی تعداد میں محاذ جنگ میں نابکار عورتوں کا ہجوم اور بڑی تعداد میں شراب کا انتظام کرکے ہر ہر محاذ پر مسلسل شکست اٹھانے کے بعد یہ تجربہ حاصل کیا جس کو چودہ سو سال پہلے اسلام محسوس کر چکا تھا

اور بنی نوع انسان کو بھی اس کے خطرات اور ہلاکتوں سے مطلع کر رہا تھا۔ بہرحال معلوم ہوا کہ شراب نشاطِ کار کو چھین کر عمل کی امنگ کے بجائے تعطل کا روگ پیدا کرتی ہے اور فقدانِ عمل کے بعد مے کشی کر نیوالے گھریلو زندگی اور سوسائٹی و ملک تک کو اتنے بڑے نقصانات پہنچاتے ہیں جن کی تلافی ممکن نہیں اسلئے شراب سے عملی جد وجہد میں اعانت و امداد یہ ایک فریب خیال ہے۔

عائلی زندگی کی بربادی

اس کے ساتھ یہ بھی مسلم اور مشاہد ہے کہ ایک شرابی عائلی اور خانگی زندگی کے تقاضوں کو ہرگز پورا نہیں کر سکتا اور مے نوشی کے عوض گھر کی تمام زندگی جہنم زار کا صحیح نمونہ بن جاتی ہے۔ بوتلوں میں بند پانی کے حصول کے لئے بڑی بڑی جائداد اور دولت لٹا کر وہ کفاف بھی اسی راستہ ضائع کر دیا جاتا ہے جو بیوی اور بچوں کیلئے معمولی سی معیشت اور گذران کا باعث بن سکتا تھا۔ یہاں تک کہ بیوی بچے، لباس خورد و نوش جو کہ انسانی زندگی کے بقاء و تحفظ کی بنیادی ضروریات ہیں۔ ان کے انتظام سے بھی عاجز ہو کر رہ جاتے ہیں۔ نتیجۃً یا تو بیوی اور بچوں کو فاقوں کی سخت گرفت میں تڑپ تڑپ کر جان دینا ہوگی یا پھر وہ قرضہ لینے پر مجبور ہوں گے جس کی ادائیگی بظاہر بالکل ہی ناممکن ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پیٹ کے جہنم کو پر کرنے کے لئے ہاتھ پھیلا کر ذلیل و خوار ہوں یا عورت اور لڑکیاں عصمت و عفت کی تجارت اختیار کریں اور لڑکے چوری اور ڈکیتی میں مبتلا ہو کر ملک و سوسائٹی کے لئے ایک مصیبت بن جائیں۔ شراب نوشی کے یہ ہولناک نتائج بالکل یقینی اور مشاہد ہیں۔ ورہی سید عبدالحمید عدم پنجاب کے مشہور شاعر جن کا پہلے بھی ذکر گذرا انھیں کے متعلق سوانح میں ہے کہ۔

"ایک دفعہ انھوں نے خود ایک واقعہ سنایا۔ مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔ کوئی پانچسو روپیہ تنخواہ لیکر شام کو اختر شیرانی سے ملے اور ایک ہی شام میں پانچسو روپیہ شراب اور عورت کی نذر ہو گئے۔ صبح گھر گئے تو بیوی نے تنخواہ مانگی۔ کہنے لگے کہ کسی

نوٹ:- پریس کی غلطی سے صفحہ ۳۷ صفحہ ۴۰ کی جگہ پر چھپ گیا ہے اور صفحہ ۴۰ کا مضمون ۳۷ پر آگیا ہے۔ ناظرین تصحیح فرمالیں۔

کی محبوب شراب ہے جس کی اس سال ایک کروڑ ۲۰ لاکھ بوتلیں کھل گئیں۔ "جنیس ڈرنک"

بیر سے عورتیں نفرت کرتی ہیں مگر مرد اسے بخوشی استعمال کرتے ہیں اور آج ۱۷

گیلن سالانہ فی کس اس کا استعمال ہے،،   انسانیت حیوانیت کی راہ پر ص ۲۲۲

یورپ کے مرکزی شہروں کی ان تفصیلات کے بعد ہند و پاکستان کے بھی اعداد و شمار دیکھئے ایک خبر ہے کہ۔

"دہلی میں ہر سال شراب نوشی، سینما بینی میں اضافہ ہوتا ہی چلا جارہا ہے۔

۵۵ء میں دہلی کے شہریوں کیلئے تین لاکھ ۵۶ ہزار ۱۴۰ گیلن، یعنی ۲۱ لاکھ

۳۶ ہزار ۸۴۰ بوتلیں شراب کی خرچ ہوئیں اس میں ۵۵۳۱۱ گیلن ٹھرا اور

باقی ولایتی شراب تھی،،   ایضاً ص ۲۲۸

پاکستان کے صرف ایک صوبۂ پنجاب کے متعلق اطلاع ہے کہ۔

صوبۂ پنجاب میں دس ہزار سے اوپر اشخاص کے پاس شراب کے پرمٹ موجود ہیں،،

ان اعداد و شمار پر جو معتبر اور ثقہ ذرائع سے ہم تک پہنچ رہے ہیں سوچئے کہ ملک کی دولت کا ایک بہت بڑا حصہ کس غلط راہ میں صرف ہو رہا ہے۔ دولت کا یہی گرانقدر حصہ اگر ملک کی دوسری فلاحی اسکیموں پر خرچ کیا جاتا تو خوشحالی اور ملکی بہبودی و فلاح، خود ملک کے لئے اور وہاں کے باشندوں کے لئے کس قدر مفید ہوتی۔ آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ فاقوں اور بھوک کے پیچ و تاب میں مبتلا ہے اور ان پر افلاس و فلاکت کا دیو اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہے۔ لیکن ایک طبقہ اور بڑا طبقہ عیاشی اور تعیش کے اس تباہ کن مشغلہ میں مبتلا ہے۔

شاید یہاں یہ کہا جاسکے کہ شراب سے محصول، ٹیکس وغیرہ کی صورت میں آمدنی کا ایک بڑا حصہ حکومت وقت تک پہنچ جاتا ہے جس سے وہ ملکی خوشحالی کا توازن باقی رکھ سکتی ہے اگرچہ یہ شبہ میرے مقصد سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتا اسلئے کہ کہا تو یہ جارہا تھا کہ انفرادی طور پر اگر حکومت سے قطع نظر کر کے اجتماعی زندگی اور معاشرہ کی اصلاح کیلئے ان پر دولت صرف کی جاتی تو بھوکے اور ننگے عوام حکومت سے

خدانخواستہ معصوم بچوں میں اگر سرایت کر جائیں جس کا امکان بہت زیادہ ہے تو ایک اتنی بڑی تباہی آئے گی جس کا ازالہ بھی ہمیشہ کے لئے ناممکن ہوگا۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ بچے بھی مے کشی کی ناہنجار عادت میں مبتلا ہو جائیں گے، اگرچہ یہ بھی بالکل متوقع ہے، بلکہ اس وقت عام انسانی عادات و خصوصیات کے بارے میں عرض کر رہا ہوں جن کے لحاظ ہی سے انسان حیوان سے ممتاز ہو سکتا ہے۔ شرابی عام انسانی امتیازات کے برعکس جن حیوانی عادات کا خوگر ہو جاتا ہے اس کا اندازہ اس اقتباس سے کیجئے۔

"اسی وارفتگی کے سبب وہ کئی کئی روز تک نہیں نہاتے۔ اور پھر لطف یہ کہ انھیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ سردیوں میں خاص طور پر وہ ایک ایک قمیص کئی کئی دن پہنے رہتے ہیں۔ ان کے کوٹ اور پتلون کی تہ اکثر خراب ہوتی ہے۔ کپڑے اکثر ان کے جسم پر لٹکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ بعض اوقات وہ کئی کئی دن تک منھ بھی نہیں دھوتے۔ صبح اٹھے اور کلی کی اور دفتر چلے گئے"

نقوش شخصیات نمبر صـ ۱۱۴۱

بھلا سوچنے کی بات ہے کہ تربیت کا وہ سب سے پہلا اسکول اور آنکھ کھولنے کے بعد وہ سب سے پہلا ماحول جس میں بچہ سے سب سے زیادہ قریب ماں اور باپ ہی ہوتے ہیں اور جن کے عادات و اخلاق، خصائل و کردار سے بچہ غیر شعوری طور پر متاثر ہوتا ہے اس ماحول میں جب اسے ماں اور باپ ہی سے یہ سبق ملے گا تو اس کی بدتمیزیاں کہاں تک پہنچیں گی انسانیت سے نکال کر حیوانیت اور چوپایوں کی زندگی میں داخل کرنے کا یہ سبق جو بچوں کو دیا جاتا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ملک و قوم کے ان مجرموں کے اس شدید نوعیت والے جرم کی تعبیر کس عنوان سے کی جائے۔

"معاشرہ کی تباہی"

مے کشی کے بڑھتے ہوئے شغل کا نتیجہ انسان کی انفرادی و عائلی زندگی پر یہ ناگوار اثرات چھوڑتے ہوئے پھر جس طرح اجتماعی زندگی کے لئے تباہ کن بنتا ہے اسکی تفصیل بھی

بڑی ہولناک ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے ذرا ان اعداد و شمار پر نظر ڈالئے جو آئے دن موقر اخبارات اور انسداد مے نوشی کی سوسائیٹیوں کی جانب سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اطلاع دی گئی تھی کہ۔

"بلجیم ایک چھوٹا سا ملک ہے جس کی آبادی ۳ ½ ملین سے زائد نہیں لیکن ایک لاکھ نو ہزار شراب خانے ملک میں موجود ہیں یعنی ہر ۱۳۵ اشخاص کیلئے جن میں عورتیں اور لڑکے بھی شامل ہیں ایک شراب خانہ ہے۔ گذشتہ نصف صدی میں بلجیم کی آبادی میں فی صدی پچاس کی ترقی ہوئی لیکن شراب خانے فی صد ۲۵۸ زیادہ ہوئے"

اور اس کے بعد لکھا ہے کہ۔

اہل بلجیم ایک سال میں ۵۵ گیلن شراب پیتے ہیں اور مجموعی مقدار دو کروڑ دس لاکھ چالیس ہزار پونڈ شراب میں صرف کرتے ہیں یعنی روزانہ ستاون ہزار چھ سو پونڈ کی شراب خرچ ہوتی ہے۔ فی کس ۳ ½ پونڈ اور فی خاندان پندرہ پونڈ کا سالانہ حساب بالاوسط ہے" احکام العقلیہ صـ ۲۵۵

بلجیم ایسے چھوٹے ملک میں جس کی آمدنی کے ذرائع و وسائل بھی یقیناً محدود ہی ہونگے دولت کی ایک اتنی بڑی مقدار اس پانی کے حاصل کرنے کیلئے صرف کردی جاتی ہے جو اپنے مزاج اور اثرات کے اعتبار سے آتش سیال ہے اور یہ اعداد و شمار تو ایک ایسی کتاب سے نقل کئے جارہے ہیں جو تقریباً آج سے دس سال پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ سنہ ۱۹۵۶ء کے ان اعداد و شمار پر غور کیجئے جو تہذیب کے ایک بڑے مرکز لندن سے شائع ہوئے ہیں کہ۔

"بیئر انگریز کا قومی مشروب ہے اور وہ اسے شراب نہیں بلکہ پانی سمجھکر پیتا ہے بیئر کے علاوہ وسکی، برانڈی، جن، رم، وائن اور شمپین کی بھی خوب کھپت ہے پچھلے سال انگریزوں نے اسی لاکھ وسکی کی بوتلیں چڑھائیں جن کی انھیں بلغ ایک ارب ۳۶ کروڑ ۸۰ لاکھ روپیہ قیمت ادا کرنا پڑی۔ اسی سال جن کی ۳ کروڑ ۲۰ لاکھ بوتلیں استعمال ہوئیں جو زیادہ تر عورتوں میں مقبول ہے۔ رم بھی یہاں کی عورتوں

جیب کترے نے کمال صفائی سے جیب کاٹ لی اور ایک پیسہ بھی نہیں چھوڑا۔ بیوی جان گئی کہ جھوٹ ہے۔ لڑائی ہوئی" نقوش ص ۱۱۴۱

پانچ سو روپیہ کی ایک خطیر رقم ایک ہی شام کے چند گھنٹوں میں شراب اور عورت کی نذر ہو جانے کے بعد بیوی اور بچوں کو پورا مہینہ جس طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر گذارنا پڑا ہو گا اس کا تصور اتنا دلدوز و دلگیر ہے کہ بیان بھی نہیں کیا جا سکتا۔

بیوی بچوں کے تقاضوں اور فقر و فاقہ کے دل دہلا دینے والے مناظر سے بچنے کے لئے سوسائٹی اور عائلی زندگی کے یہ بدترین مجرم پھر یہ کرتے ہیں کہ:

"گھر کا رخ نہیں کرتے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہفتہ ہفتہ میرے گھر پڑے رہے بڑا لڑکا خالد بار بار آیا اور انھوں نے کہا کہ بیٹا میں آج ضرور آؤں گا"

(ایضاً)

اور نہ صرف یہ بلکہ شرابیوں کو معیشت کے حصول اور اہل و عیال کی واجبی ضروریات کے تکفل کا خیال تک باقی نہیں رہتا چنانچہ ایک اور مشہور شاعر کے تذکرے میں ہے کہ:

"انھوں نے خود بیوی کی ضروریات معیشت کی جانب کبھی توجہ نہیں کی" نقوش ص ۸۸۷

اور پھر یہ بلانوش اپنے بچوں اور متعلقین کو سوسائٹی کے لئے ایک بوجھ بنا کر چھوڑ دیتے ہیں اور بچوں کی صحیح تربیت نہ ہونے کی وجہ سے ان کی بہترین صلاحیتیں ملک و ملت کیلئے مفید ہونے کے بجائے مضر اور مہلک ثابت ہوتی ہیں۔ گویا عائلی زندگی کی یہ تباہی براہ راست ملک کے حق میں بھی ضرر رساں بن جاتی ہے کیونکہ:

"وہ گھر ہی سب سے پہلی تربیت گاہ تھی جس میں بچے اور بچیاں صحیح تربیت کے سانچوں میں ڈھلکر ملک و ملت کے لئے باعث فخر اور امتیاز و افتخار کے لائق مفید کردار ادا کر سکتے تھے"

(الخمر والحیواۃ ص ۹۸)

لیکن عائلی زندگی کی تباہی سے ملک کی یہ متوقع گراں بہا دولت برباد ہو جاتی ہے اور خطرہ شدید اس کا بھی ہے کہ پینے والے باپ کے عادات و خصائل

بے نیاز ہو کر بھی اپنے بھائیوں کے جیب سے اپنی تباہ حالی کا علاج کر سکتے تھے تاہم اگر تھوڑی دیر کے لئے آبکاری کے محکموں سے وصول ہونے والی دولت جو حکومت کو پہنچتی ہے اس کا اعتبار کر لیا جائے تو جاننے والے جانتے ہیں کہ شراب نوشی کے نتیجہ میں جرائم کی تعداد میں جو غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے اس کی روک تھام کیلئے حکومتوں کو اس آمدنی سے زیادہ صرف کرنا پڑتا ہے جو آبکاری کے محکموں سے حاصل ہوتی ہیں۔
ڈاکٹر رابرٹ پرسن نے لکھا ہے کہ۔

"شراب سے محصول، ٹیکس وغیرہ کی صورت میں سرکاری آمدنی ایک باطل دپُر فریب تصور ہے بلکہ یہ آمدنی تو عوام کی جیب پر قانونی ڈاکہ زنی کے مترادف ہے۔ امریکہ میں اس سے معقول آمدنی ضرور خزانہ سرکار میں داخل ہوتی ہے لیکن اس سے بیس گنا خرچ بھی تو مجرموں کی گرفتاری اور جرائم کی روک تھام پر ہوتا ہے" (انسانیت حیوانیت کی راہ پر صد ۲۲۴)

ڈاکٹر رابرٹ پرسن کی اس رپورٹ پر ٹیکس کرنے والوں اور خود حکومتوں کو غور کرنا چاہیے کہ عوام اپنی دولت کو لٹا رہے ہیں اور حکومت بھی محصول و ٹیکس لیکر اس سے بیس گنا زائد انسداد جرائم کے لئے خرچ کر کے عقل و دانش کا ثبوت نہیں دے رہی ہے۔
قرآن کریم نے شراب نوشی کا ایک نقصان بغض و عداوت پیدا کرنا بتایا ہے۔

"بغض و عداوت"

ظاہر ہے کہ اس مضرت عظیم کا بھی تعلق اجتماعی زندگی سے ہے۔ یہ شقاق و نفاق آویزش و جھڑپ معاشرہ اور اجتماعی زندگی کے لئے وہ خطرناک طاعون ہے جس سے سوسائٹی کی اجتماعیت و یکجہتی ختم ہو کر رہ جاتی ہے اور اسلام باہمی طور پر جو اتحاد و ائتلاف پیدا کرنا چاہتا تھا اس کے خلاف نتائج سامنے آتے ہیں اور کم از کم اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بادہ پرستوں کو شراب سے اجتناب کرنے والوں کے ساتھ اور پرہیز کرنے والوں کو بلانوشوں کے ساتھ فطرت سلیمہ کے تقاضوں کے مطابق یا گندی ذہنیت کے محرکات کے تحت ایک بغض و عداوت یقینی اور حتمی ہے۔ شاید بغض و عداوت

کی یہی صورت قرآن کے پیش نظر ہے۔

"انسدادِ مے نوشی کی ضرورت"

جسمانی، اخلاقی، عائلی اور معاشرہ کی تباہی جو شراب نوشی کا بدیہی نتیجہ ہے اس کی مختصر تفصیلات پیش کی گئی ہیں اب کہا جاسکتا ہے کہ۔

شراب کے خطرناک عواقب و نتائج کے پیش نظر بہت ضروری ہے کہ مے کشی کے سلسلے کو جلد از جلد بند کیا جائے۔ بنی نوع انسان کیلئے یہ وہ زبردست خطرہ ہے جسکے مہلک خطرات کو امریکہ اور یورپ کے مصلح بھی آج تسلیم کر رہے ہیں جیسا کہ مصنف نے اسی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

"یورپ و امریکہ کے مصلحین شراب کے مضر نتائج کو اس دور میں بنی نوع انسان کے لئے سب سے بڑا خطرہ تصور کرتے ہیں۔" (الخمر والحیوٰۃ ص۱۱)

اور دنیا کے جن حصوں میں شراب نوشی کو قانوناً بند کر دیا گیا وہاں کی اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہلاکت سے قریب ہونے والی انسانیت جام زہر کے ان تلخ گھونٹوں سے بچکر ایک مرتبہ پھر زندگی اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل ہو گئی ہے۔ یوپی کے وزیر آبکاری نے اپنی تقریر ۲۲ مارچ ۱۹۵۲ء میں کہا تھا کہ۔

"جن ضلعوں میں نشہ بندی کا قانون نافذ ہو گیا ہے وہاں کے دیہی علاقوں کی معاشرتی حالت پہلے سے کہیں بہتر ہو گئی۔ ایک تحقیقاتی پروگرام کے ذریعہ سے جو اعداد جمع کئے گئے ہیں ان سے معلوم ہوا ہے کہ ممنوعہ علاقوں میں جرائم فوجداری کی تعداد میں ۵۰ فیصدی کمی ہو گئی ہے خانگی زندگیاں سدھر گئی ہیں اور ان علاقوں میں رہنے والوں کی قرضداری بھی کافی گھٹ گئی ہے۔" صدق جدید ۱۹ اپریل ۱۹۵۲ء

"اسلام کا دنیائے انسانیت پر احسان عظیم"

"منافع للناس" سے بات شروع ہوئی تھی۔ شراب ایسے زہر ہلاہل میں منافع ڈھونڈھنے والوں کے واہی خیالات کی تردید میں مقالہ نگار کو یہ صفحات سیاہ کرنے پڑے۔ شراب کے مضار و نقصانات کو اعداد و شمار کی روشنی میں تفصیلات سے پیش کرنے کے بعد

کیا مقالہ نگار دریافت کرسکتا ہے کہ وہی جام زہر جو جسمانی صحت، اجتماعی اور عائلی زندگی کے لئے تباہ کن ہے جس سے زندگی کے تمام ہی گوشے متاثر ہوتے ہیں اور جو اپنے تباہ کن اثرات کو انسانیت کے جسم پر زخموں کی صورت میں چھوڑ جاتا ہے کیا اُس کی ان خطرناک دھملک مضرتوں کے بالمقابل چند حقیر وغیر ضروری منفعتوں کو حاصل کرنے کیلئے انسان انسان رہتے ہوئے استعمال کرنے کے لئے خود کو آمادہ کرسکتا ہے۔ میں تو نہیں سمجھ سکتا کہ اس انسان اور حیوان لایعقل میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے جو اپنے نفع ونقصان کو محسوس نہ کرسکے اور دانستہ موت کے جانگسل دیو کو اپنے اوپر مسلط کرلے۔ پس بلاشبہ انسانیت پر اسلام کے ہزاروں احسانات کے ساتھ اپنے نتائج کے اعتبار سے یہ کتنا بڑا اور جامع احسان ہے کہ اُس نے آج سے چودہ سو سال قبل تحریم شراب کے مسئلے کو دو ٹوک طریقے پر سمجھا کر اس زہر ہلاہل کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھنے کی بلیغ کوشش کی تھی اور بلا تخصیص مذہب وملت اس کی ہولناک مضرتوں سے انسانیت کو مطلع کیا تھا لیکن آج اقتدار طلبی کا بھوکا یورپ سیاسی مقاصد کے حصول کی خاطر، معاش اور اقتصادی تفوق کے پیش نظر مسلمانوں کی قوت عمل کو چھین لینے کیلئے ضروری سمجھتا ہے کہ عالم اسلامی کو اس پرکیف مشروب میں زہر کے اجزاء تحلیل کرکے پلا دے۔ اور اس طرح دنیا کی امامت بلاشرکت غیرے اس کو حاصل ہو۔ چنانچہ ترکی اور قاہرہ میں شراب نوشی کی کثرت جسکی اطلاع دیتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ۔

"موجودہ سیاسی حالات کی غلط تشریح کے باعث اور نقل سے عیسائی حکمرانوں کی برابری حاصل کرنے کیلئے مسلمانوں میں بھی شراب خواری عام ہورہی ہے اور اس شان سے کہ پیرس لندن اور برلن سے کہیں زیادہ شراب کے اشتہار قاہرہ میں نظر آتے ہیں۔ شمالی الجیریا کے مہذب الجیریائی اور مشرق قریب کے

عہ مصر کے ایک خود اور دوست نے بتایا کہ قاہرہ میں ہر دس دکان کے بعد ایک شراب کی دکان ضرور ہے میکشی کی انتہا یہ ہے کہ ہوٹلوں میں ایک میز پر کھانے والے کے ساتھ متصلاً بیٹھا ہوا مسلمان شراب پیتا ہوا ملیگا۔ منہ

ترقی یافتہ مسلمان شراب خوار ہیں۔ جب میں انگورہ کا شہر دیکھ چکا تو میں نے ایک ترک سے پوچھا کہ کیا اور قابل دید جگہ انگورہ میں باقی رہ گئی ہے۔ تو اس نے مجھ سے پوچھا کیا تم نے ہمارا سب سے بڑا شراب خانہ دیکھا ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ حکومت ترکی نے سات شراب خانے ترکی میں کھول رکھے ہیں۔ اور ترکی ریڈیو پر گاہے گاہے شراب کی صفات ترکوں کو سمجھائی جاتی ہے کہ یہ رنگ لال کرتی ہے۔ گرمیوں میں سردی اور سردیوں میں گرمی پہنچاتی ہے۔ تمام مہذب اقوام شراب پیتی ہیں۔ ترک بھی اب یوروپین ہو گئے ہیں"

اسلامی روایات کا تحفظ صد ۱۴۶

بتاتی ہے کہ یورپ کا وہ زہر آلود خنجر جس سے مسلمانوں کو ذبح کرنے کا مشورہ چالاک اور گھاگ مدبروں نے دیا تھا ترکی اور قاہرہ کے مسلمانوں پر چل گیا ہے۔ مسلمانوں کی ان دو بڑی سلطنتوں کے مسلمان باشندوں کی یہ بلانوشی؟ اس موقع پر مجھکو بے اختیار حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے وہ الفاظ یاد آرہے ہیں جو آپ نے تحریم خمر کا حکم آجانے کے بعد فرمائے تھے کہ۔

"اگر شراب کا ایک قطرہ کسی کنوئیں میں گر جائے پھر اس سے منارہ بنا کر مجھ کو اذان کے لئے بلایا جائے تو ہرگز اذان نہ دوں گا۔ اور اگر قطرۂ شراب سمندر میں جا پڑے اور خشک ہو جانے کے بعد وہاں سبزہ اُگ آئے تو میں اپنے جانوروں کو چرانے کے لئے قطعاً آمادہ نہیں۔ روح المعانی صد ۱۱۲

لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں وہ بھی ہوں گے جو اسی حرام مشروب میں لذت سرور۔ نشاط و کیف کی تلاش کریں گے اس کی کیا خبر تھی۔ درد و کرب سے کراہتی ہوئی انسانیت کے مرہم و مداوا کا کام جن کے سپرد کیا گیا تھا زہر آلود نشتروں سے آج انھیں کا جسم گھائل ہے۔ یورپ بھی جانتا تھا کہ اسلام ہی اس وار کو کامیاب ہونے میں مزاحم بنا ہوا ہے لہٰذا اس نے بھی فراست و دانائی سے کام لیتے ہوئے اسلام ہی کی گرفت کو ڈھیلا کر دیا۔ اب راہ صاف ہو اور مسلمانوں کی رگِ حیات کو کاٹنے کا

موقع حاصل ہو۔ وہی ہنری فرانسیسی جس نے یورپ کو مشورہ دیا تھا کہ مسلمانوں کو ذبح کرنے کیلئے ضروری ہے کہ شراب کا رواج عام کیا جائے۔ اپنی کتاب خواطر و سوانح فی الاسلام میں لکھتا ہے کہ۔

"ہم نے یہ ہتھیار الجزائر کے مسلمانوں پر استعمال کیا۔ لیکن اُن کی شریعت اسلامیہ نے روک دیا کہ وہ اس کو استعمال کریں۔ لہذا ان کی نسل برابر بڑھ رہی ہے کاش یہ مسلمان اگر ہماری اس تلوار کو اسی طرح چلنے دیتے جس طرح کہ انھیں میں کے منافقین نے اپنی گردن کٹوانے کیلئے پیش کر دی تو یقیناً یہ سب ہمیشہ کیلئے سرنگوں کر دیے جاتے"۔ طنطاوی ص ۱۹۵

لیکن ٹرکی و قاہرہ میں اسی اسلام کی گرفت جب ڈھیلی پڑی تو مسلمانوں کا بہک جانا مستبعد نہ رہا۔ ہنری فرانسیسی کو کیا اس کا احساس نہیں کہ اس زہر آلود خنجر سے خود بھی وہ غیر شعوری طور پر ذبح ہو رہے ہیں اور یورپ کے گوشہ گوشہ سے کراہتی ہوئی انسانیت کی آہ و پکار ہر طرف سُنی جاسکتی ہے۔ یورپ اگر مسلمانوں کا قتل عام کرنے کی تجاویز و منصوبوں پر اپنی دماغی طاقت صرف کرنے کے بجائے دنیا کو اسلام کے حیات آفریں اور سکون بخش اصول پر کاربند ہونے کی دعوت دے تو انسانیت کو ہلاکتوں سے محفوظ رکھنے کا یہ عظیم الشان اقدام ہوگا جس کے ثمرات سے خود یورپ بھی جائز طور پر نفع اُٹھا سکے گا۔ لیکن یورپ آج تک نہ سمجھ سکا کہ اسلام کو ضعیف و مضمحل کرنے سے انسانیت کس طرح تباہی کے گڑھوں میں گرتی چلی جارہی ہے مسلمانوں کا تنزل انسانیت کے قلعے کیلئے ڈائنامیٹ کا حکم رکھتا ہے۔ اس حقیقت کو اگر آج نہیں تو کل پوری دنیا کو تسلیم کرنا پڑیگا۔

خریدارانِ کرام

خط و کتابت و ترسیل زر کے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ہمیشہ دیں۔ ورنہ فرمائشات کی تعمیل اور اندراجات میں تاخیر ہونے کی ذمہ داری دفتر پر نہیں۔

البلاغ کا حج نمبر

ماہنامہ البلاغ دینی تعلیمی اور حج سے متعلق معلوماتی رسالہ ہے تین سال سے یہ رسالہ محض خدمت کے جذبہ سے مسلسل جاری ہے ادارہ البلاغ پہلے سال "تعلیمی نمبر" اور دوسرے سال "ملک سعود نمبر" شائع کرکے ملک و قوم کیلئے خراج تحسین وصول کر چکا ہے اب ادارہ نے آیندہ شوال میں "حج نمبر" شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ شروع ہی سے دینی تعلیمی علمی اور معلوماتی مضامین کے ساتھ حج کی اہمیت اور حج کے مقاصد کو عام کرنا اس رسالہ کا مقصد رہا ہے۔ ماہنامہ البلاغ تین سال سے ہزاروں حاجیوں کی رہبری کرتا رہا ہے اس شائع ہونیوالے خصوصی نمبر کی افادیت کا صحیح اندازہ تو اسی وقت ہوگا جب رسالہ آپکے ہاتھ میں ہوگا۔ حج کے راستہ کے ماہرین اس خصوصی نمبر کو بہتر اور مفید تر بنانے کیلئے لگے ہوئے ہیں۔ خریدار حضرات کی خدمت میں یہ رسالہ بلا قیمت بھیجدیا جائیگا۔ سالانہ چندہ پانچ روپے ہیں مسلمان رسالہ کے خریدار بنکر اس دینی رسالہ کی سرپرستی فرمائیں۔

مدیر ماہنامہ البلاغ۔ صابو صدیق مسافر خانہ کرناک روڈ بمبئی ۱

مسلمان خواتین کیلئے اصلاحی اخلاقی دینی ماہنامہ

رضوان لکھنؤ

زیر ادارت سیدہ محمدی ثانی حسنی ——— امۃ اللہ تسنیم (ہمشیرہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی)

آج جبکہ فحش اور عریاں کتابیں اور رسالے گھر گھر پہونچ گئے ہیں اور شریف مسلمان گھرانوں تک کی پردہ نشین خواتین کے ہاتھوں میں ناقابل برداشت لٹریچر پہونچ رہا ہے جسکی وجہ سے خاندان کے خاندان بداخلاقی کے سیلاب میں بہے جا رہے ہیں اسکی سخت ضرورت تھی کہ ان شریف بہو بیٹیوں کو اس گندے اور گھناؤنے ماحول سے بچایا جائے اور اُن کے ہاتھوں میں صالح اور اخلاقی لٹریچر پہونچایا جائے اس ضرورت کے پیش نظر ماہنامہ رضوان کا اجرا عمل میں لایا گیا، امید ہے کہ یہ رسالہ مسلمان خواتین میں صحیح دینی ذوق، اسلامی جذبہ، قوت عمل اور اخلاقی شعور پیدا کریگا اور اُن کیلئے دلچسپ و دل آویز بھی ثابت ہوگا۔ چندہ سالانہ ہندوستان کیلئے ۴ پاکستان کیلئے ۵ روپے غیر ممالک کیلئے ۸ شلنگ (فی پرچہ ۶) پاکستان میں رقم جمع کرنے کا پتہ۔ ادارہ نشر و اشاعت اسلامیات ملتان۔

منیجر ماہنامہ رضوان ۳۷ گوئن روڈ لکھنؤ

تعارف وتبصرہ

حقیقت | از قلم علامہ عامر عثمانی۔ فاضل دیوبند۔ شائع کردہ۔ مکتبہ تعمیر ملت چوک بازار ملتان (پاکستان) صفحات ۱۴۲۔ قیمت ۱۰؍ آنے صرف۔

عامر عثمانی صاحب حضرت العلامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے بھتیجے ہیں۔ دیوبند کے فاضل ہیں اور دیر سے کئی سال سے تجلی کے نام سے ایک ماہنامہ نکال رہے ہیں۔ ادھر کچھ عرصے سے وہ بڑے زور شور سے جماعت اسلامی اور علمائے دیوبند کے اختلاف ونزاع پر خامہ فرسائی کر رہے ہیں۔ پیش نظر کتاب اُن کے اسی سلسلہ کے ایک مضمون کی کتابی شکل ہے جسمیں حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی ایک کتاب "مودودی دستور وعقائد کی حقیقت" پر تنقید کی گئی ہے۔ مگر عجیب اتفاق ہے کہ عامر صاحب کی یہ کتاب تبصرہ کیلئے نکالی ہی گئی تھی۔ ابھی نوبت تبصرہ کی نہیں آئی تھی کہ یکایک حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کی ایک تحریر اخبار دعوت (دہلی) اور رسالہ دار العلوم (دیوبند) کے صفحات میں سامنے آگئی جس میں اس مسئلہ پر جماعت اسلامی سے علمائے دیوبند کے اختلاف کے خاتمہ کا اعلان کیا گیا ہے جو حضرت مدنی کی مذکورہ بالا کتاب کا موضوع ہے اور جو تنہا حضرت مدنی کی تصنیف نہیں بلکہ مہتمم صاحب موصوف بھی اپنے بسیط مقدمہ کی بنا پر اس میں گویا برابر کے شریک ہیں۔ ایسی صورت میں لاحاصل ہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب سے متعلق کسی تنقیدی تحریر پر تبصرہ کیا جائے۔ اب تو نہ اس کتاب کی اشاعت ہونی چاہیئے نہ اس کتاب کی۔

البتہ کتاب کا ایک مقام جو تنقیدی رد وقدح کے قبیل سے نہیں بلکہ اسکی حیثیت صحابہ کرام رضی کی شرعی حیثیت جیسے اہم اصولی مسئلہ کے بارے میں ایک مثبت تصریح کی ہے، اُسے

مذکورہ عذر کی بنا پر نظر انداز کرنا صحیح نہ ہوگا۔

عامر صاحب نے اس مسئلے کے متعلق صفحہ ۲ پر متعدد فقروں میں جو کچھ کہا ہے، مختصر کر کے ایک فقرہ میں اُسے یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ ـــــ صحابۂ کرام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ زرِ خالص تھے نہ یہ کہ وہ خود کسوٹی (معیارِ حق) تھے۔

پسند کرنیوالوں نے اسے یہاں تک پسند کیا کہ دین و ادب کی دنیا میں ایک یادگار اور آب زر سے لکھنے کے قابل فقرہ قرار دیا۔ مگر ہماری نظر میں مسئلہ کی یہ صورت نہایت غلط اور نص حدیث کے قطعاً خلاف ہے۔ اُمت کے دینی افتراق کے وقت میں یہ معلوم کرنے کیلئے کہ کونسا فرقہ حق پر (فرقہ ناجیہ) ہے، نبوت کی زبان مبارک نے اُمت کو "ما انا علیہ واصحابی" کا معیار عنایت فرمایا ہے۔ حدیث کے ان صریح اور مشہور الفاظ کی موجودگی میں، سمجھ میں نہیں آتا کہ صحابہ کے معیارِ حق ہونے سے کیسے مطلقاً انکار کیا جا سکتا ہے۔ صحابۂ کرام کے اندر اگر خود معیاریت کی کوئی شان نہیں پائی جاتی تو پھر "ما انا علیہ" کے بعد "واصحابی" کا اضافہ آخر کیا معنی رکھتا ہے۔ اس اضافہ کا تو صاف مطلب یہ ہے کہ بعض مختلف فیہ مسائل میں ایسی صورت بھی پیش آسکتی ہے کہ وہاں تعیین حق کیلئے اُسوۂ نبوی کسی واضح اور فیصلہ کن شکل میں موجود نہ ہو، ایسی صورت میں اُسوۂ صحابہ کی طرف رجوع کیا جائے گا، اور جو رائے اُس پر منطبق ہو جائیگی وہی حق قرار پائے گی۔ ورنہ اگر صحابۂ کرام کو کسی موقعہ پر بھی "ناقل" اور "ترجمان" سے بڑھ کر خود مستقل معیار کی حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی تھی تو، ماننا پڑے گا کہ "ما انا علیہ" کے الفاظ ہی بالکل کافی تھے اور "واصحابی" کا اضافہ قطعاً زائد اور لاحاصل۔

یہ موقع تفصیلی گفتگو کا نہیں تفصیل کیلئے اس سلسلہ میں مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی کی ترجمان السنہ جلد اول کے مقدمہ کا مطالعہ مفید ہوگا۔ البتہ اس ذیل میں اتنی بات اور ضروری ہے کہ علامہ عامر صاحب معیاریت کے لئے نبوت و رسالت کو جو لازم سمجھے ہوئے ہیں اور اسی بنا پر لکھ گئے ہیں کہ۔

"کیا ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ (صحابہ) سونا نہیں خود کسوٹی تھے۔ پیرو رسول نہیں خود رسول اور صاحب شریعت تھے۔" صفحہ ۲

ہمارے نزدیک یہ علم و فہم کا عجیب و غریب مظاہرہ ہے کہ کسی کو کسی بھی معنی میں اور کسی بھی حیثیت سے

معیار حق قرار دینے کو اس کی نبوت و رسالت کے اعتقاد کا مترادف قرار دیا جائے۔ اور ان دونوں باتوں میں تلازم کا دعویٰ اس طور پر کیا جائے کہ جیسے یہ ایک بدیہی بات ہے، حالانکہ یہ ایک مغالطہ کے سوا کچھ نہیں اور اس مغالطہ کی بنیاد یہ ہے کہ معیاریت مطلقہ اور مطلق معیاریت کے علمی فرق کو نہیں سمجھا سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو چیز لازم تھی معیاریت مطلقہ کے اعتقاد کو اُس کو مطلق (کسی بھی نوعیت کی) معیاریت کا بھی لازم سمجھ لیا گیا وشتان ما بینہما۔

کتاب کا ایک اور ایسا ہی پہلو جس کا تنقیدی رد و قدح سے تعلق نہیں ہے یہ ہے کہ تحریر میں جا بجا ادبی روانی کے زیر اثر جو عربی ترکیبیں اور فقرے علامہ موصوف کے قلم پر آگئے ہیں جہاں تک ہماری نظر پڑی، وہ سب کسی کی شان علم اور فاضلیت دیوبند کے افتخار کو بٹہ لگانے والے ہیں۔ مثلاً ایک عنوان ہے "تصریح القول من جانب القائل" (ص۵۳) بنام "تہذیب" کا نمونہ ہی نہیں، بلکہ عربی کے کسی ادب شناس سے پوچھئے تو جس مفہوم کیلئے یہ عنوان اختیار کیا گیا ہے، عربی ادب کے لحاظ سے یہ الفاظ اُس مفہوم کو ادا ہی نہیں کرتے۔ ایک جگہ مرقوم ہے "صدق استاذ المحترم" (ص۹) نحو کے ابتدائی قواعد کی رو سے غور کیجئے تو "المحترم" عامر صاحب کے استاذ کی صفت نہیں رہتی بلکہ اُن کی خود اپنی صفت بن جاتی ہے۔ تنقید کا اختتام اس جملہ پر ہوا ہے "وما علینا الا البلاغ والالتماس للتنبیہ" التماس لفظاً اصلاً عربی ہی کا ہے مگر اس موقع پر وہ جن معنیٰ کو ادا کر رہا ہے اُن کے پیش نظر اس کی حیثیت کچھ ایسی نظر آتی ہے جیسے نخل عربی میں "تمر ہندی" کی قلم لگا دی گئی ہو۔

عامر صاحب دار العلوم دیوبند کے وقار کی محبت میں اپنے استاذ محترم تک کی برملا تردید و تغلیط بلا خوف لومۃ لائم کر رہے ہیں۔ ہمیں بھی دار العلوم سے نسبت ہے اسی نسبت کی بنا پر اُن کے ایک چھوٹے بھائی نے کتاب کے اس پہلو کی طرف توجہ دلانے کی جرأت کی ہے تاکہ اُن کی تحریریں جو ایک پہلو سے دار العلوم کے گرتے ہوئے وقار کو تھامنے کا ذریعہ بن رہی ہیں۔ دوسرے پہلو سے نہ اُس کی رسوائی اور جگ ہنسائی کا باعث نہ بنتی رہیں۔ اعاذنا اللّٰہ من شرور انفسنا۔

انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام از جناب عبدالحمید صدیقی ایم۔اے۔ کتابت طباعت بہتر صفحات ۳۱۲۔ مجلد قیمت ۳/۸۔ پتہ۔ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان اچھرہ لاہور

کتاب کے نام سے اُس کے وسیع موضوع اور مشتملات کا اندازہ نہیں ہو پاتا۔ اصل میں اس کتاب کا موضوع ہیں موجودہ دور کی اجتماعی تحریکات کہ وہ کس طرح یکے بعد دیگرے نمودار ہو ہو کر انسانیت کی فلاحی آرزوؤں کا مرجع بننے کے باوجود اسکی بربادیوں میں نت نئے اضافے کرتی چلی جارہی ہیں۔ ان سب بظاہر مختلف تحریکات کا ہیولیٰ چونکہ ایک ہی ہے جو مختلف تقاضوں اور کاوشوں کے ماتحت مختلف صورتوں میں ڈھلتا رہا ہے اور وہ ہے مغرب کا الحادی طرز فکر اور الحادی تہذیب اسلئے مصنف نے پہلے اس تہذیب الحاد کے عناصر کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے طبعی اقتضاآت اور اثرات کو بیان کیا ہے اور اس ذیل میں وہ برابر اہل مغرب اور بعض دوسرے مفکرین کے اقوال و اعترافات پیش کرتے چلے گئے ہیں۔ اس کے بعد علیحدہ علیحدہ ابواب میں مختلف تحریکات کا جائزہ لیتے ہوئے بتاتے چلے گئے ہیں کہ یہ تحریکیں اپنے مشترک بنیادی عناصر کے زیر اثر کس کس طور پر عالم انسانی کو تباہی کے موجودہ بھیانک انجام کی طرف لے آئی ہیں کہ نہ صرف اخلاق کا توازن خطرناک حد تک بگڑ جانے کی وجہ سے بے شمار معاشرتی و تمدنی مسائل انسان کیلئے وبال جان ہو گئے ہیں بلکہ نفس وجود انسانی کی موت و زیست کا سوال پیدا ہو گیا ہے۔ ان ابواب میں بیشتر مواد اہل یورپ کے اقوال و اعترافات سے لیا گیا ہے ـــــ اب سوال یہ ہے کہ اس وبال اور موت و زیست کے ہولناک سوال سے نجات کا راستہ کیا ہے مصنف نے دلائل کے ساتھ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اب نجات اور برباد شدہ انسانیت کی تعمیر نو کا راستہ صرف اسلام ہے۔ اس ذیل میں مصنف کی یہ آخری بات بڑی قیمتی ہے کہ

"اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ چونکہ دنیا نے اور سارے نظامات کی آزمائش کر لی ہے اور وہ اُن کے تلخ نتائج سے روشناس ہو چکی ہے۔ اس لئے اب اُسے مجبوراً اسلام کی طرف آنا پڑے گا تو وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ انسانی تاریخ میں جبر کا کوئی عنصر نہیں پایا جاتا۔ اسلام کے سربلند ہونے کیلئے یہ ضروری ہے کہ مسلمان ...... اللہ تعالےٰ کے

وفادار اور مطیع بندے بن جائیں اور پوری قوت کے ساتھ اُسے دنیا میں بالفعل قائم کرنے کی جد وجہد کریں۔"

(صفہ ۳۰)

انوار سبحانی

۳۸۴ صفحات۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کتابت طباعت متوسط قیمت پانچ روپیہ (مجلد) ناشر:۔ علمی کتب خانہ، مظفر گڑھ۔ مغربی پاکستان۔

"رأس الاولیا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساٹھ پُر تاثیر مواعظ حضرت کے خلیفہ خاص حضرت عفیف الدین ابن مبارک نے "الفتح الربانی" کے نام سے جمع کر دیئے تھے۔ مولانا عاشق الہی صاحب میرٹھی مرحوم نے ان میں سے چالیس مواعظ کو ترجمہ و تشریح کے ملے جلے انداز میں اردو میں منتقل کیا اور "الفتح الربانی" کا یہ ترجمہ مع تشریحی اضافات اب سے قریباً ۳۵ سال پیشتر پہلی مرتبہ طبع ہوا اسکے بعد اور بھی لوگوں نے اسکو شائع کیا۔ حال ہی میں (دو تین سال پیشتر) بمبئی سے بھی غالباً اسی کا نیا ایڈیشن نکل چکا ہے الغرض کتاب کچھ ایسی نایاب نہیں۔ پھر ناشر نے واللہ اعلم یہ کیونکر لکھا ہے کہ "ایک محترم بزرگ کے پاس اس کتاب کا ایک نسخہ اس حالت میں کسی طرح محفوظ رہا کر اس کے تمام حاشے دیمک نے چاٹ لئے تھے" بہر حال کتاب نہایت مفید اور تعمیر سیرت کیلئے یقیناً اکسیر ہے مواعظ کا سارا زور توحید و تفویض، رضا بالقضا خشیت و انابت اور حُبِّ آخرت پر ہے۔ کتاب کی قیمت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

کتاب الصلوٰۃ وما یلزم لہا

تالیف حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ۔ مترجمہ شیخ علی جواد صاحب۔ کتابت طباعت معیاری۔ کاغذ بہتر صفحات ۱۷۰ مجلد قیمت ۸/ ناشر:۔ نور محمد، کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی۔

حضرت امام احمد بن حنبل رح کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں یہ دوسری صدی ہجری کی وہ برگزیدہ ہستی ہے جس نے قرآن کے تقدس کو مجروح کرنے والے ایک ایسے عقیدے سے اپنے جسم مطہر کا پاک خون بہا کر امت مسلمہ کی حفاظت کی جس کی پشت پر

وقت کی عباسی خلافت نے اپنے جلال و جبروت کے تمام مظاہر جمع کر دیئے تھے۔ یہ کتاب انھی قابل صد احترام امام حدیث کی تالیف کا اُردو ترجمہ ہے جس میں نماز کی عظمت و اہمیت، اس کے وہ ضروری آداب و احکام جن سے لاپروائی برابر بڑھتی جا رہی ہے اور وہ اُمور جو نماز کو ناقص یا کامل بناتے ہیں، احادیث رسول اور آثار صحابہ کے ذریعے نہایت مؤثر، دلنشین اور جامع انداز میں بیان فرمائے گئے ہیں۔

اصل تالیف کے ترجمے سے پہلے قریباً ۵۰ صفحات میں حضرت الامام کی سیرت اور سوانح حیات ہیں۔ ضروری ہے کہ کتاب ہر عاقل و بالغ مسلمان کی نظر سے گذرے تاکہ نماز جو دین کا ستون ہے اسمیں جو کوتاہیاں ۹۹ فی صدی نمازی دانستہ یا نادانستہ کئے جا رہے ہیں ان کوتاہیوں پر انھیں پوری طرح تنبہ ہو سکے۔ ہندوستان میں اشتیاق بکڈپو دیوبند سے مل سکتی ہے۔

تفسیر ابن کثیر اُردو پارہ ۱۴ تفسیر ابن کثیر عربی کی اول درجہ کی مستند تفسیروں میں سے ہے اور بعد کی تمام تفسیروں میں اسپر اعتماد کیا گیا ہے۔ اس کا مخصوص طرز یہ ہے کہ جتنی آیات پر ایک بات پوری ہو جاتی ہے وہ سب ایک جگہ لکھدی جاتی ہیں پھر اُن آیات کی تفسیر پہلے دوسری آیات سے کی جاتی ہے اس کے بعد احادیث نبوی اور اقوال صحابہ و تابعین سے اور پھر مفسر رحمۃ اللہ علیہ حسب ضرورت الفاظ اور آیات کی تشریح اپنے الفاظ میں فرماتے ہیں۔ مولانا محمد جونا گڑھی مرحوم نے اس کا اُردو ترجمہ کیا تھا جو نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی نے ایک ایک پارہ کر کے شائع کیا ہے۔ ترجمہ مقبول اور معتمد ہے۔ ہمارے سامنے چودھواں پارہ ہے جس کا ہدیہ ایک روپیہ آٹھ آنے ہے۔ سائز $\frac{20 \times 30}{8}$ کا ہے (عرض میں الفرقان سے کچھ زائد) کتابت طباعت بھی مناسب ہے۔ ضخامت کوئی ستر صفحات۔ دیوبند کے مذکورہ بالا پتے سے یہ بھی مل سکتی ہے

غیر مستطیع شائقین الفرقان کیلئے مژدہ

جنوبی افریقہ کے ایک صاحب خیر نے یکصد روپیہ از مد زکوٰۃ دفتر کو ارسال فرمائے ہیں۔ الفرقان کے جو غیر مستطیع شائقین الفرقان کا صرف ششماہی چندہ (تین روپئے) ارسال فرمادیں گے ان کے حساب میں ۳/- اس رقم میں سے شامل کر کے ان کے نام الفرقان سال بھر کیلئے جاری کر دیا جائے گا اس طور پر پچاس اشخاص اس رقم سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ (منیجر الفرقان)

عربی نہ جاننے والوں کیلئے بڑی نعمت

ترجمہ تفسیر ابن کثیر۔ (اردو) پانچ ضخیم جلدیں۔ جلد خوشنما قیمت مکمل سٹ پچپن روپئے۔

ترجمہ صحیح بخاری شریف۔ مکمل ۳ جلدوں میں ۷۲۷۵ احادیث کا مجموعہ قیمت مجلد مکمل۔۔۔۔ چوبیس روپئے۔

ترجمہ مشارق الانوار۔ بخاری اور مسلم کی منتخب ۲۲۴۷ قولی احادیث کا گران قدر مجموعہ قیمت مجلد چھ روپئے

ترجمہ مشکوٰۃ شریف۔ مکمل اردو ترجمہ چھ ہزار سے زائد احادیث کا بیش بہا ذخیرہ دو جلدوں میں قیمت مجلد مکمل سولہ روپئے۔

ترجمہ موطا امام مالکؒ مع عربی متن، حدیث کی سب سے پہلی کتاب جسے امام مالکؒ نے مرتب فرمایا قیمت مجلد بارہ روپئے۔

ترجمہ ترمذی شریف۔ تقریباً چار ہزار احادیث کا مجموعہ۔ ساتھ ہی ہر باب میں ائمہ کے مذاہب کا بیان۔ دو جلدیں سولہ روپئے۔

ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ۔ (متن عربی) تصنیف حضرت شاہ ولی اللہ۔ دو جلدوں میں۔ قیمت بیس روپئے۔

ترجمہ کتاب الصلوٰۃ۔ امام احمد بن حنبل کی بے نظیر اور نہایت مؤثر کتاب ہے قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

حصن حصین مع اردو ترجمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری دعائیں اس کتاب میں جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قیمت مجلد ڈیڑھ روپیہ۔

تاجران کتب کو ان سب کتابوں پر ۱۵ فیصدی کمیشن دیا جائیگا۔ (ناظم کتب خانہ الفرقان)

کتب متعلقہ قرآن مجید

تفسیر ابن کثیر (ترجمہ اردو) ۵ جلد مکمل مجلد ۵۵/-
تفسیر بیان القرآن مکمل ۲ جلد ۹۶/-
تفسیر ماجدی جلد اول مجلد ۱۲/-
" " دوم " ۱۲/-
" " سوم " ۱۲/-
" " چہارم " ۱۲/-
الحیوانات فی القرآن ۲/-
قرآنی جغرافیہ ۱/۴/-
قصص القرآن مکمل ۴ جلد ۲۱/-
قرآن اور تصوف ۲/-
قرآن اور تعمیر سیرت ۵/-
رہنمائے قرآن ۱/-
لغات القرآن جلد اول ۴/-
" " دوم ۴/-
جلد سوم ۴/- جلد چہارم ۵/-
قاموس القرآن ۶/-
ترجمہ قرآن کا مکمل نصاب (از مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب) ۴/-

حدیث شریف کے متعلق کتابیں

ترجمہ صحیح بخاری شریف مکمل ۳ جلد، مجلد ۳۳/-
ترجمہ جامع ترمذی مکمل ۲ جلد، مجلد ۱۸/-
ترجمہ مشکوٰۃ شریف مکمل ۴ جلد، مجلد ۳۲/-
ترجمہ موطا امام مالک مع عربی متن۔ مجلد ۱۲/-
مشارق الانوار اردو ترجمہ تشریح کے ساتھ۔ مجلد ۱۲/-
حصن حصین مع ترجمہ اردو مجلد ۸/-
ترجمان السنۃ از مولانا بدر عالم صاحب جلد اول ۱۷/- جلد دوم ۹/-
جلد سوم ۱۰/-
صحیفۂ ہمام بن منبہ ۳/۸

تالیفات مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی

تاریخ دعوت و عزیمت جلد اول ۵/- ، ۹/-
انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ۴/۸
اصلاحیات ۲/۸ اردو مجھے ترکی میں ۱/۸
پیام انسانیت ۱/۶/-

ہر مسلمان کے گھر میں یہ کتابیں ضرور رہنی چاہئیں
زبان آسان شیریں معلومات مستند

سیرت رسول ۱۲/-
رسول پاک کی صاحبزادیاں ۱۲/-
ہمارے نبی کے صحابہ ۱/۴/-
رسول اللہ کے دو محبوب ۱/۴/-
عہد نبوی کے دو بچے ۱/۶/-
درسگاہ نبوی کے دو طالب علم ۱/-
امام حسن ۱۲/-

تالیفات مولانا عبد الباری صاحب ندوی

جامع المجددین مجلد ۵/-
تجدید تصوف و سلوک " ۵/-
تجدید تعلیم و تبلیغ ۳/-
تجدید معاشیات ۵/-

تالیفات حضرت شیخ الحدیث مدظلہ

حکایات صحابہ ۲/- فضائل نماز ۱/۴
فضائل تبلیغ ۱/۴ فضائل قرآن ۱/۴
فضائل رمضان ۱/۴ فضائل حج ۲/-
فضائل صدقات اول ۳/۸ دوم ۲/۱۲

تالیفات مولانا احتشام الحسن صاحب

حقیقت ذکر مجلد ۱/۴ دینی تعلیم ۱/-
تجلیات کعبہ ۲/- تجلیات مدینہ ۲/-
ارکان اسلام ۱/۸ اسلامی زندگی ۱/۴
شاہراہ ترقی ۲/- دو بیتی کا علاج ۱/-
اصلاح معاشرہ ۱/۸ حیات فخر ۱/۴

ایمان ورہمانی سیریز یعنی مولانا ... بچوں کا نصاب

اللہ کے رسول ۱/۶ حضرت ابوبکر ۱/۶ حضرت عمر ۱/۶ حضرت عثمان ۱/۶ حضرت علی ۱/۶ اچھا قاعدہ ۱/۲ اچھے قصے ۱/۶
اچھی باتیں ۱/۴ ... [illegible]

کتبخانۂ الفرقان کی مطبوعات ایک نظر میں

معارف الحدیث جلد اول مجلد ۲/۸ سوانح حضرت مولانا محمد الیاس ۲/۸
معارف الحدیث غیر مجلد ۲/۱۲ ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس ۱/۸
اسلام کیا ہے مجلد کاغذ قسم اعلیٰ ۲/۸ امام ولی اللہ دہلوی از مولانا سندھی مرحوم ۲/۴
اسلام کیا ہے غیر مجلد ۱/۱۲ اسلام اور نظام سرمایہ داری ۱/۸
کلمۂ طیبہ کی حقیقت ۱/۴ ازالۃ الغیب حصہ دوم ۱/-
نماز کی حقیقت ۱۲/- معرکۃ القلم (فیصلہ کن مناظرہ) ۱/۴
آسان حج ۱/۶ قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ ۲/-

ارشاد السالکین

ہر مبتدی اور طالب خدا کے پاس رہنے کے لائق یہ نہایت مفید اور موثر کتاب ہے اس مجموعی سی کتاب کو اصلاح و تزکیہ اور تصوف کے کتب خانہ کا عطر کہا جاسکتا ہے — قیمت مجلد ۱/۸/-

مختلف موضوعات پر منتخب کتابیں

تاریخ اسلام (از مولانا عاشق الٰہی صاحب) ۴/-
عہد نبوی میں نظام حکمرانی (از ڈاکٹر حمید اللہ) ۳/۸
عہد نبوی کے میدان جنگ مع نقشہ جات (") ۱/۱۲
سلسلہ تاریخ ملت مکمل سیٹ (دس حصے مجلد) ۳۱/-
تاریخ اسلام پر ایک نظر ۶/-
قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات حصہ اول مجلد ۲/۱۲
حصہ دوم مجلد ۲/۸
رسول اللہ کے مکتوبات و معاہدات، مجلد ۱/۴
حضرت خالد بن ولید ۱۲/-
تاریخ مشائخ چشت ۴/-
حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی مجلد ۴/-
مقامات امام ربانی ۱/۶
سوانح قاسمی (از مولانا گیلانی) جلد اول ۶/- جلد دوم ۴/-
حیات انور، مجلد ۲/-
تاریخ دیوبند (از سید محبوب رضوی) ۳/-
ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ۲/-
ایک مظلوم اور بدنام مصلح (محمد بن عبد الوہاب) ۲/۸
سد باب ذریعہ (شیخ ابن القیم کی ایک اہم کتاب کا اردو ترجمہ) ۱/۴
معارف القرآن، اسلامی تعلیم کا فلسفہ قیمت ۱/۸
دین و دانش (از پروفیسر محمود علی) بے نظیر کتاب ہے اور نایاب ہے ۵/-
الجواب المتین (ڈیڑھ سو نقلی سوالات کا جواب بصورت احادیث نبوی سے دیا گیا ہے) قیمت ۱/۸
فتاویٰ دار العلوم دیوبند ۸ جلد ۳۶/-

علامہ گیلانی (م۔ جون ۱۹۵۶ء)

- فکر و نظر کی وسعت، علمی جامعیت اور ذہانت میں اپنی مثال آپ تھے۔
- انکی ژرف نگاہی نے ہر بساط علم و فن پر نکات و تحقیقات کے وہ گل کھلائے جو سدا بہار ہیں۔
- انھوں نے تنہا تحقیق و تصنیف کا اتنا کام کیا جتنا یورپ میں ادارے اور انجمنیں کرتی ہیں۔

غرض ـــ "حقیقۃً وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے"

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ ـــ مرحوم کے قدر شناسوں کی خدمت میں انکی وفات کے ٹھیک ایک سال بعد

افاداتِ گیلانی نمبر

کی شکل میں ایک یادگاری تحفہ جون ۱۹۵۷ء میں پیش کر رہا ہے

جو الفرقان میں شائع شدہ علامہ مرحوم کے اُن اہم علمی و تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے جو مستقل کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے ہیں

انکے علاوہ اس نمبر میں:۔ علامہ مرحوم کا ایک تقریباً سوا سو صفحے کا طویل مقالہ ہے جو بجائے خود ایک قیمتی کتاب اور اُنکی جامعیت و ذہانت کی بہترین یادگار ہے ـــ ایک اُن کے اس مقالہ کی تلخیص ہے جو الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر کی زینت بنا اور اہل علم کی نظر میں مصنف کا عظیم تحقیقی کارنامہ قرار پایا ـــــــ

ایک عجیب و غریب مقالہ حج کی حقیقت پر ہے جو علم و تحقیق اور ایمانی جذبات کا قابل دید نمونہ ہے اسکے علاوہ بعض سلسلہ وار مضامین کی اہم اقساط ـــ اور شروع میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے قلم سے علامہ مرحوم کی شخصیت پر ایک دلآویز بصیرت افروز اور جامع مقالہ "نقوش و تاثرات" کے عنوان سے ہے۔

ضخامت: کم و بیش ... صفحات۔ قیمت۔ دو روپے علاوہ محصول ڈاک ۸ر آنے۔

سال بھر کیلئے الفرقان کی خریداری قبول کرنیوالے حضرات [illegible] سالانہ چندہ پانچ روپے کے علاوہ اس نمبر کی کوئی قیمت نہیں لی جائیگی البتہ رجسٹری فیس کے ۸ر آنے چندہ کے علاوہ لازمی طور پر آنے چاہئیں۔

پاکستانی حضرات سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کے پتہ پر منی آرڈر بھیجکر ہمیں اطلاع دیں۔

ناظم رسالہ الفرقان لکھنؤ

مدیر مسئول
محمد منظور نعمانی

مرتب
عتیق الرحمن سنبھلی

ماہنامہ

الفرقان

کا

افاداتِ گیلانیؒ نمبر

بیادگارِ

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی نوّر اللہ مرقدہٗ

مرتبہ

عتیق الرحمٰن سنبھلی

قیمت ——— دو روپیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سخنہائے گفتنی

۱۔ دلی افسوس ہے کہ یہ نمبر جس کو پہلے اعلان کے مطابق ۱۵ر مئی کو شائع ہو جانا چاہیے تھا، جولائی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہو رہا ہے، گویا دوسرا اعلان جو ۳۰ر جون کا کیا گیا تھا اُس سے بھی ایک ہفتہ کی تاخیر ہو گئی۔ یہ دوسرے اعلان کی خلاف ورزی شائقین پر بیحد شاق گزری ہو گی۔ مگر قضا و قدر پر کسی کا بس نہیں۔ راقم سطور جو ۲۲ر جون تک بالکل صحتمند تھا ۲۲ر جون سے یکایک انفلوئنزا کی وبا کی لپیٹ میں آ گیا۔ جس نے مکمل ایک ہفتہ معطل رکھا اور اس طرح سوچا سمجھا سارا پروگرام درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ اگر یہ مجبوری پیش نہ آجاتی تو پوری امید تھی کہ نمبر وقت پر نکل جاتا۔ صرف اسی مجبوری کے باعث ایک ہفتہ کی یہ مزید تاخیر ہوئی۔ امید ہے کہ ناظرین زحمت انتظار کی ناگواری اس اطلاع کے بعد معاف فرما دیں گے۔

۲۔ یہ نمبر اپنی ضخامت کے لحاظ سے چار اور مواد کے اعتبار سے پانچ ماہ سے بھی زائد کا ہے[1]، مگر اس کو صرف تین ماہ کے شماروں کے قائم مقام قرار دیا گیا ہے، یعنی شوال، ذیقعدہ اور ذی الحجہ۔ اس طور پر یہ اس سال کا آخری شمارہ بھی ہے۔ گویا الفرقان کی چوبیسویں جلد اس نمبر پر تمام ہو گئی۔ فالحمد للہ علی ذلک۔ اب اس کے بعد والا شمارہ پچیسویں جلد کا پہلا شمارہ (بابت ماہ محرم سنہ ۷۶ھ) ہو گا جو انشاء اللہ تعالیٰ ۱۵ر اگست کو شائع ہو گا۔

عتیق الرحمن سنبھلی

۳۰ر جون ۵۶ء

---

[1] ناظرین اگر غور فرمائیں گے تو محسوس ہوگا کہ نمبر کے ہر صفحہ میں عام شماروں کے تقریباً ڈیڑھ صفحے کا مضمون آیا ہے۔

جلد (۲۴) | بابت ماہ شوال، ذیقعدہ و ذی الحجہ ۱۳۷۶ھ مطابق جولائی ۱۹۵۷ء | شمارہ (۱۰-۱۱-۱۲)

اگر اس ◯ دائرہ میں سُرخ نشان لگا ہے

تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی۔ پی ارسال کیا جائے گا۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۱۴ر تاریخ تک پہونچ جانی چاہیے۔

پاکستان کے خریدار: اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

تاریخ اشاعت: رسالہ ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ر تاریخ کو روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۵ر تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں اگلے رسالہ کے ساتھ مکرر بھیجدیا جائے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ گیلانی (ضلع پٹنہ، صوبہ بہار) کے ایک متمول اور ذی علم خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ سنہ ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد کافی عرصہ ٹونک رہے، اور پھر اس سلسلہ کی تکمیل دار العلوم دیوبند پہونچ کر کی۔ دار العلوم میں ان کا جوہر استعداد کافی نمایاں ہو چکا تھا جس کی وہاں کے اہل نظر ارباب اختیار نے مختلف طریقوں سے قدر شناسی کی۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں مولانا کا تقرر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں دینیات کے استاذ کی حیثیت سے ہو گیا جس سے ترقی کر کے وہ شعبہ کی صدارت تک پہونچے۔ بالآخر سنہ ۴۹ء میں پنشن پاکر گیلانی تشریف لے آئے۔ پنشن کے بعد کے دور میں جو فرصت میسر آئی تو وہ ہمہ تن تحریر و تصنیف کی طرف متوجہ ہو گئے اور سنہ ۵۳ء تک (تقریباً پانچ سال) ان کا دریائے علم و تحقیق مجلاتی مقالات اور بعض ضخیم تصنیفات کی شکلوں میں خوب خوب روانی اور جولانی دکھاتا رہا۔ سنہ ۵۳ء کے اخیر میں مولانا پر قلبی شکایت کا حملہ ہوا — افاقہ ہو گیا۔ مگر سنہ ۵۴ء میں چند ماہ بعد پھر شکایات نے عود کیا اور ابکی کا حملہ بڑا سخت بھی تھا اور طویل بھی۔ مولانا کا قلم جو پہلے حملے سے صحت پاکر پھر چل کھڑا ہوا تھا اب بالکل رک گیا۔ کئی مہینے علاج معالجہ کے سخت اور اعلیٰ ترین اہتمامات کے بعد (جو ان کے محب و محبوب بھائی سید مکارم احسن صاحب کی بلند ہمتی کا نتیجہ تھے) شکایات کی شدت میں گو تخفیف ہو گئی مگر گزری ہوئی شدت نے اب انھیں کام کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ معالجین کی طرف سے بھی قطعی ممانعت تھی۔

تعطل کا یہ دور تقریباً دو سال کھنچا جس میں صحت اور مرض میں برابر کشمکش ہوتی رہی۔ اس دور کے لیے انھوں نے اُس زمانہ کے بعض خطوط میں "برزخی دور" کی تعبیر استعمال کی ہے۔ اور اس کے طول پر ایک مرتبہ

ایک گرامی نامہ میں اکبر الٰہ آبادی کا یہ شعر بھی ارقام فرمایا:۔

کمزور رہی میری صحت بھی کمزور رہی مری بیماری
اچھا جو رہا، کچھ کر نہ سکا، بیمار پڑا تو مر نہ سکا

آخر کار وہ جس گھڑی کے لیے بے چین تھے ۵ رجون ۱۹۵۶ء کو وہ آپہونچی اور انھوں نے اس جذب و مستی اور اس شوق لقا کے ساتھ دار البقاء کی طرف رحلت فرمائی جو خاصان خدا کی علامت اور عشاق ازلی کی پرانی رسم ہے۔
برد اللہ مضجعہ ونوّر ضریحہ وقدّس سرّہٗ ــــ ویرحم اللہ عبداً قال آمینا

مرحوم اپنے وقت کے فرد فرید اور اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے خاتم تھے۔ ان کا علم ہمہ جہت تھا اور قلم ہر دم رواں دواں۔ چنانچہ ان کے قلم سے اسلامی لٹریچر میں جو گرانقدر اضافہ ہوا ہے ممکن نہیں ہے کہ اسے نظر انداز کیا جا سکے۔ ابوذر غفاری۔ النبی الخاتم۔ الدین القیم۔ اسلامی معاشیات۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت۔ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی۔ اور تدوین حدیث۔ ان کی ایسی تصنیفات ہیں، جن سے مدتوں علم و تحقیق کے چراغ روشن ہوتے رہیں گے ــــ ان مستقل تصنیفات کے علاوہ ہندوستان کا کوئی مشہور علمی و دینی مجلہ ایسا نہیں ہے جس کے صفحات پر اُن کے نقوش قلم ثبت نہ ہوں۔ اور جس کا دامن مولانا کے نتائج فکر سے خالی رہا ہو۔ الفرقان بھی کوئی تیرہ سال تک اس ذات گرامی سے فیضیاب ہوتا رہا۔ اور اس درجہ خصوصیت رہی کہ درمیان میں ایک سال مولانا نے اپنی اعزازی ادارت کا فخر بھی الفرقان کو بخشا۔

ایسی عظیم المرتبت اور ناقابل فراموش ہستی کی یاد میں ایک خاص نمبر کی اشاعت دل کا ایک قدرتی تقاضہ تھا۔ خیال ہوا کہ اگر یادگاری نمبروں کے عام طریقہ سے ہٹ کر اس نمبر کی نوعیت یہ رکھی جائے کہ مولانا کے مضامین و مقالات میں سے جو چیزیں کتابی شکل میں نہیں آسکی ہیں ان میں سے اہم چیزوں کا انتخاب کر کے صرف انھیں سے یہ نمبر ترتیب دیدیا جائے تو اس بہانے ان منتخبات کو بھی کتابی شکل مل جائے گی، چنانچہ اس نمبر کی نوعیت یہی ہے کہ الفرقان میں شائع شدہ مولانا کے مضامین و مقالات میں سے چند کو منتخب کر کے یہ نمبر ترتیب دیا گیا ہے۔

قبل اس کے کہ ان منتخبات کا تعارف کرایا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ الفرقان میں شائع شدہ مولانا کے مضامین و مقالات کی پوری فہرست کا ایک اجمالی جائزہ لے لیا جائے تاکہ مولانا کے افادات کا جو خزانہ الفرقان میں محفوظ ہے اس کی ایک فہرست لوگوں کے ہاتھ میں آجائے اور کسی وقت کوئی فائدہ اٹھانا چاہے تو اٹھا سکے۔

۱۔ مولانا کا سب سے پہلا مقالہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ پر "الف ثانی (یا ہزارۂ دوم) کا تجدیدی کارنامہ" الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر ۱۳۵۷ھ میں شائع ہوا۔ اس کا تعارف آگے اس نمبر کے مشمولات کے ذیل میں آئے گا۔

۲۔ اس مقالہ کے بعد اسی سنہ کے آخری شمارہ (بابت ماہ ذی قعدہ و ذی الحجہ) سے مولانا کا دوسرا مضمون "دارالعلوم دیوبند" پر شروع ہوا جو صفر ۱۳۵۸ھ کے شمارہ میں تیسری قسط پر تمام ہوا۔ یہ مضمون دراصل دارالعلوم دیوبند کے متعلق ایک استفسار کا جواب ہے جو حکومت آصفیہ (حیدرآباد) کے ایک تعلیمی افسر کی جانب سے کیا گیا تھا۔ اس میں مولانا نے اپنے خاص تحریری اسلوب کے بجائے نہایت سادہ اور معروف انداز بیان اختیار کیا ہے۔ ——— یہ مضمون ۴۴ صفحات پر ہے، اور اسے ہم دارالعلوم، اس کے مقاصد اور منافع کا بہترین تعارف قرار دے سکتے ہیں ——— اور کیوں نہ ہو جبکہ یہ دارالعلوم کے مولانا گیلانی جیسے بالغ نظر، دقیقہ رس فرزند جلیل کی کاوش قلم کا نتیجہ ہے۔

۳۔ مجدد الف ثانی نمبر میں مولانا کا جو مقالہ شائع ہوا تھا وہ نامکمل رہ گیا تھا۔ ربیع الثانی ۱۳۵۸ھ کے شمارہ میں اس مقالہ کی دوسری قسط شائع ہوئی۔ مگر افسوس کہ اس پر بھی یہ مقالہ نامکمل ہی رہا۔

۴۔ ۱۳۵۸ھ ہی میں شوال و ذیقعدہ کے مشترک شمارہ سے مولانا کا نہایت اہم علمی مقالہ "امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی" شروع ہوا۔ ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ میں اس کی دوسری قسط شائع ہوئی اور صفر و ربیع الاول ۱۳۵۹ھ کے مشترک شمارہ میں تیسری قسط۔ یہ کل ۵۴ صفحات ہیں۔ الفرقان میں تو یہ سلسلہ نہ معلوم کیوں اتنے صفحات پر رک گیا لیکن بعد میں یہ چند قطرے بڑھ کر دریا بنے اور چار سو صفحے کی ایک ضخیم کتاب تیار ہو گئی جو اسی نام (امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی) سے کراچی سے شائع ہوئی۔ اور اُسے ان کی تصانیف میں ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔

۵۔ مجدد نمبر کے بعد ۱۳۵۹ھ میں الفرقان کا دوسرا عظیم الشان خاص نمبر "شاہ ولی اللہ نمبر" شائع ہوا۔ اس میں مولانا گیلانی کا مجدد صاحب کے بعد حضرت شاہ ولی اللہؒ پر دوسرا معرکۃ الآرا مقالہ آیا۔ یہ مقالہ ایک پورا رسالہ ہے جو باریک قلم کے ۱۲۶ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اور کتب خانہ الفرقان نے اسے نمبر کے بعد علٰحدہ بھی شائع کیا تھا۔ یہ بھی مولانا کی وسعتِ نظر اور دقتِ فکر کا شاہکار ہے، اور جیسا کہ اُن کے مقالات کا عموماً انداز ہوتا ہے، معلومات کا ایک بحرِ مواج ہے جو قلم کو قابو میں نہیں رہنے دیتا اور ہر ہر ضمنی بات پر بھی بہتا ہوا وہ بار بار اتنی دور نکل جاتا ہے کہ اصل موضوع کی طرف واپسی تک ضمنی معلومات کا ڈھیر لگ جاتا ہے۔ اس میں بھی مولانا نے مجدد صاحب والے مقالہ کی طرح پہلے بڑی تفصیل کے ساتھ اس تاریک ماحول اور طوفانی عہد کا نقشہ کھینچا ہے جس میں حضرت شاہ ولی اللہ کی ولادت ہوئی اور جس میں آپ کی ابتدائی زندگی گزری

کہ ـــــ اجمالاً خود مولانا ہی کے الفاظ میں ـــ

"اس وقت ہر چہار طرف سے اسلام نرغہ میں گھرا چلا جا تا تھا۔ شمالی مغربی علاقوں میں سکھوں کی آتشیں توت سر اٹھا رہی تھی۔ جنوبی ہند سے مرہٹوں کا سیلاب ٹھاٹھیں مارتا ہوا "اَعِزَّہ" کو "اَذِلَّہ" بنانے میں بیدردی سے سرگرم تھا۔ دونوں توتوں میں باہم جو کچھ بھی اختلاف ہو، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مآثر ونشانات، ان کے نام لیواؤں اور وابستوں کا بالکلیہ قلع قمع کرنے پر دونوں اُدھار کھائے بیٹھے تھے، تیسری طرف خلیج بنگال کے ساحلی علاقوں سے مغربی قوتیں بتدریج اپنا پنجہ ملک پر جماتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں ـــــ اور یہ تو بیرونی فتنے تھے، اندر ایرانیوں اور تورانیوں پھر ان کے ساتھ روہیلوں کے باہمی تصادم اور مختلف اغراض ومقاصد کی کش مکش سے "اسلامی حکومت ہند" کی قبا تار تار ہو رہی تھی۔ ان سیاسی مقاصد کے ساتھ ساتھ صوفیا کے غلط تصوف، اور فقہاء کے غلط تفقہ، حد سے گزری ہوئی عصبیت اور جاہلی حمیت نے امت کے شیرازوں میں الگ انتشار پیدا کر رکھا تھا ـــــ اسی کے ساتھ ساتھ ایرانی علماء اور شعراء کا جو دباؤ مختلف وجوہ سے ہندوستانی علماء ارباب فکر ونظر اور تعلیم وتدریس، وتصنیف وتالیف کے نظام پر پڑ رہا تھا۔ اسکی وجہ سے آہستہ آہستہ یہاں کے اہل علم کا تعلق، قرآن وحدیث، تحقیقی فقہ واصول فقہ اور عقائد وکلام سے ہٹ کر بے معنی لاطائل ذہنی اور لفظی مباحث کے گورکھ دھندوں میں الجھ الجھ کر "خسر الدنیا والآخرہ" کی صورت پیدا کر رہا تھا کہ ان لاحاصل مساعی کا کوئی نتیجہ نہ ان کو دنیا میں مل سکتا تھا نہ آخرت میں ...."

اسی اجمال کی تفصیل ہے جو اس مقالہ کے تقریباً ۵ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، جس میں مولانا کی باریک بینی اور دقیقہ رسی کا بصیرت افروز منظر دیکھ کر اسلامی ہند کی تاریخ کا طالب علم حیران رہ جاتا ہے کہ "ایک ایسے اہل قلم کی نگاہ جس کی تعلیم صرف عربی مدارس میں محدود رہی، کیسے ان باریک گوشوں تک پہونچی" اور خیال کرنے لگتا ہے کہ "اگر ان کی تعلیم خالص انگریزی طرز کی ہوتی اور وہ اپنا موضوع صرف تاریخ ہند کو بنا لیتے تو شاید اُن کے پایہ کا کوئی مورخ ہندوستان

میں نہ ہوتا۔"

اس تفصیل کے بعد ولی اللٰہی کارناموں کی تفصیل پیش کی گئی ہے کہ اللہ نے اسلام کی کشتی کو اس منجدھار سے نکالنے کے لیے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کیا کیا کام کس طریقے سے انجام دلائے۔

۶۔ شاہ ولی اللہ نمبر کے بعد سنہ ۷۰ھ کے فائل میں مولانا گیلانی کا کوئی مضمون نہیں ہے۔ سنہ ۷۱ھ کی جلد میں البتہ چار چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں۔ جن میں سے دو تو مولانا کی مشہور تصنیف "الدین القیم" کے دو حصے ہیں جو کتاب کی اشاعت سے قبل مولانا نے الفرقان کے لیے عنایت فرما دیے تھے۔ باقی دو میں سے ایک عید الاضحیٰ پر ہے، "بقرعید یا عملی اسلام کا پہلا دن" کے عنوان سے۔ دوسرا معراج پر ہے جس کا عنوان ہے "عالم غیب کا طویل سفر"۔ یہ درحقیقت ایک ریڈیائی تقریر ہے۔ دونوں مضمون مختصر ہونے کے باوجود نہایت جامع اور مولانا کی خاص علمی شان کے مظہر ہیں۔

۷۔ مولانا کی ایک اہم کتاب "اسلامی معاشیات" ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کا بار تو ادارۂ الفرقان اپنے وسائل کی قلت کی وجہ سے نہ اٹھا سکا مگر اسکے مضامین کی نقاب کشائی کا فخر ادارۂ الفرقان ہی کے حصہ میں آیا۔ الفرقان صفر و ربیع الاول سنہ ۶۲ھ میں اس کا ایک پورا باب ۴۴ صفحہ پر شائع ہوا اور کوئی سال بھر تک اس کے مختلف حصے الفرقان میں مسلسل نکلتے رہے، اس طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کا بڑا حصہ پہلے الفرقان میں شائع ہوا۔

۸۔ سنہ ۶۷ھ میں تقسیم ہند کا واقعہ پیش آیا اور جان و مال کی تباہی کا طوفانی عہد گزر جانے کے بعد مستقبل میں دین کی حفاظت اور باعزت زندگی کے دو اہم سوال مسلمانوں کے سامنے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہر حساس اور صاحب فکر مسلمان نے وقت کے ان اہم مسائل سے تعرض کیا، مولانا بھی کیسے بے تعلق رہ سکتے تھے چنانچہ شوال سنہ ۶۶ھ کے الفرقان میں "چند تجاویز" کے عنوان سے مولانا کا ایک مختصر مضمون شائع ہوا جس کا خاص تعلق پہلے مسئلہ سے ہے، اور اگلے ہی شمارہ میں دوسرا مضمون "ان دیکھی قوت کا ایک پوشیدہ خزانہ" آیا جس کا رُخ "باعزت زندگی" کے سوال کی طرف تھا۔ افسوس ہے کہ یہ مضمون ادھورا رہ گیا، ورنہ اگر پورا ہو جاتا تو بڑی مفید اور پُر از معلومات چیز ہوتی۔ اس میں مولانا نے تمہیدی باتوں کے بعد مسلمانوں کی تاریخ سے مثالیں پیش کر کے یہ بتانا چاہا تھا کہ اخلاق اور سیرت کی مضبوطی ایسی مؤثر قوت ہے کہ ظاہری قوت سے محرومی کے باوجود اس قوت کے حاملین ہر جگہ جگہ بنا لیتے ہیں۔ اس پہلی قسط میں صرف ہندوستان اور چین کی مثالیں آئی تھیں پتہ نہیں آگے مولانا ہی نہ لکھ سکے یا کیا ہوا۔ بہر حال الفرقان میں اس مضمون کو نامکمل پا کر افسوس ہوا۔

۹۔ سنہ ۶۷ھ میں ادارۂ الفرقان کو حج کے موقع پر الفرقان کا حج نمبر نکالنے کا خیال ہوا مضمون کے لیے مولانا سے بھی عرض کیا گیا چنانچہ مولانا کا ایک ۴۳ صفحے کا مقالہ حج کی حقیقت پر آیا۔ عنوان تھا "حج کیا ہے؟" یہ اس نمبر کا خاص مقالہ تھا۔ یہ چونکہ پیش نظر نمبر میں بھی شامل ہے اس لیے اس کا تعارف آگے ذرا تفصیل سے آئے گا۔

۱۰۔ سنہ ۶۸ھ مطابق سنہ ۴۹ء میں مولانا چونکہ حیدرآباد سے پنشن لے کر مستقل طور پر اپنی "کہنی قیام گاہ" گیلانی

میں قیام فرما ہو گئے تھے اور تصنیف و تالیف کے لیے کمل فرصت میسر آگئی تھی، لہٰذا ذی الحجہ سنہ ۱۳۶۹ھ کے شمارہ سے مولانا کا سب سے زیادہ طویل مضمون "دجالی فتنہ اور سورہ کہف" شروع ہوا جو ۱۴ قسطوں میں ۲۷۰ صفحات پر جمادی الاخریٰ سنہ ۱۳۷۱ھ کے الفرقان میں پورا ہوا۔ یہ مضمون بھی اس نمبر میں شامل ہے، بلکہ نمبر کا سہرا دراصل اسی مضمون کے سر ہے اس لیے اس کا تعارف بھی آگے مندرجات کے ذیل میں کرایا جائے گا۔

۱۱۔ سنہ ۱۳۶۸ھ کے بعد سنہ ۱۳۶۹ھ میں بھی الفرقان کا حج نمبر نکلا سنہ ۱۳۶۹ھ کے حج نمبر میں مولانا کا مضمون "دربار نبوت کی حاضری" شائع ہوا۔ جو مولانا کے سفر مدینہ کی سرگزشت تھی۔ سنہ ۱۳۷۰ھ کے حج نمبر میں مدینہ سے مکہ تک کا سفرنامہ آیا جس کا عنوان تھا "راہ کعبہ کے احساسات و واردات" سنہ ۱۳۷۰ھ کے بعد حج نمبر کے عنوان سے الفرقان کا خاص نمبر تو نہیں نکلا البتہ قیام مکہ اور حج کے جو حوال مولانا کی روداد سفر میں سے باقی رہ گئے تھے رمضان شوال سنہ ۱۳۷۱ھ کے شمارہ میں "اللہ کے گھر ہو چکر" کے عنوان سے مولانا نے وہ بھی سپرد قلم فرما دیئے۔ اور اس طرح تین قسطوں میں مولانا کا سفرنامہ حجاز شائع ہو گیا۔

۱۲۔ رمضان شوال سنہ ۱۳۷۱ھ کے شمارہ سے پہلے شعبان کے شمارہ میں رمضان کی مناسبت سے مولانا کا ایک مضمون "روزہ اور قرآن" بھی شائع ہوا تھا جس میں خالص قرآنی نقطۂ نظر سے روزہ کی حقیقت اور اسکے رموز و اسرار پر روشنی ڈالی گئی تھی، اور روزہ کی حکمتوں کے بارے میں متجددانہ نقطۂ نظر پر تنقید کی گئی تھی۔

۱۳۔ ذی الحجہ سنہ ۱۳۷۱ھ سے مولانا نے ایک نیا سلسلہ شروع کیا جس کا عنوان تھا "ھادم اللذات" (یعنی موت) اس عنوان کے تحت، مولانا کا ارادہ (خود مولانا ہی کے الفاظ میں) یہ تھا کہ

"ایسے واقعات جن کا موت سے تعلق ہے، ان ہی کا ذکر اس عنوان کے تحت ان شاء اللہ کیا جائے گا۔ ....

ابتداءً تو چند خاص استثنائی حوادث کا تذکرہ کیا جائے گا۔ بعد کو ارادہ یہی ہے کہ اللہ اسے پورا کرے کہ، مرتے ہوئے، مرنے والوں پر جو کچھ گزری اتفاقاً کتابوں میں اس کا تذکرہ کر دیا گیا ہے حتی الوسع اسی کو جمع کر دیا جائے۔ ممکن ہے کہ آئندہ وہ کوئی کتاب ہی بن جائے"!

(الفرقان ذی الحجہ سنہ ۱۳۷۱ھ)

چنانچہ اس سلسلہ کی پہلی اور دوسری قسط (صفر سنہ ۱۳۷۲ھ) میں تو مولانا نے چند ایسے استثنائی واقعات پیش فرمائے تھے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی مرنے والوں کی روح زندوں کے ساتھ تعلق قائم کر سکتی ہے۔ بعد کے مضامین میں اچھی اور بری زندگی گزار کر مرنے والوں کی موت کے وقت کی تصویر کشی کا سلسلہ شروع کیا اور

اس کے لیے انداز ایسا اختیار کیا جس سے ان واقعات کے بیان پر "ہادم اللذات" کا عنوان بالکل مناسب آ گیا۔
اچھی زندگی گزار کر مرنے والوں کی موت کے وقت کا تذکرہ تو مولانا نے کہیں کہیں صرف ضمناً آ گیا اصل مقصود صرف غفلت وطغیان اور لذت کوشی کی زندگی گزارنے والوں کی موت کا تذکرہ تھا کہ موت کے پنجہ نے کس طرح چشم زدن میں انہیں ساری شوخی اور لذت کوشی بھلا دی اور خود انہیں کی زبان سے اعتراف کرا دیا کہ وہ بڑے خسارے میں ہیں۔ اس سلسلہ میں پہلا تذکرہ عضد الدولہ دیلمی کا ہے کہ وہ کیا تھا، قدرت کی عنایت سے کیا بنا، افلاس کی گود میں پلا تھا بڑے ہو کر حکومت پر پہنچا، خوب گلچھرے اڑائے۔ پیر بام کبریائی پر کمندیں ڈالیں مگر کتنے دن، بمشکل چند سال یہ قصہ رہ سکا یکایک موت کے پنجے نے آ دبایا۔ اور اسکی زبان سے اعتراف کرایا کہ "آج مجھ سے زیادہ بدبخت اور کون ہوگا جس کی دنیا بھی برباد ہوئی اور اپنی ابلہی کا شکار ہو کر اپنے دین کو بھی وہ کھو بیٹھا"

اسی طرح مولانا نے بنوامیہ کے تین گورنروں۔ زیاد۔ حجاج، اور خالد تینوں کی زندگیوں کو اسی سلسلہ کے الگ الگ مضامین میں بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔ اور ان کے ظلم وطغیان اور اقتدار کی مستی کی مکمل تصویر دکھانے کے بعد دکھایا کہ انہیں کیسی موت سے واسطہ پڑا اور موت کے وقت ان پر کیا گزری اور کیا کہتے ہوئے وہ مرے ـــ یہ دنیا کی بے ثباتی کے بڑے عبرت انگیز مرقعے ہیں۔ ان میں سے ایک مضمون جسکا تعلق حجاج کی موت سے ہے سلسلہ "ہادم اللذات" کے نمونہ کے طور پر اس نمبر میں بھی شامل کیا گیا ہے جسکا عنوان ہے "وفاشعاری کے دو نادر نمونے"۔ اس میں مولانا نے حجاج کے بالمقابل ایک اور صالح شخصیت کی موت کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ جنہوں نے فقہ حنفی کے بانی حضرت امام ابراہیم نخعیؒ کی زندگی بچانے کے لیے اپنی جان حجاج کے ظلم کی نذر کر دی۔

۱۴۔ اس سلسلہ کے بعد مولانا کے دو مضمون اور شائع ہوئے۔ (جنہیں چاہا جائے تو اس سلسلہ میں بھی شمار کیا جا سکتا ہے) ایک شیر شاہ سوریؒ کے عہد حکومت سے متعلق تھا، دوسرا حضرت مولانا قاری عبد الرحمن پانی پتیؒ کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر۔ شیر شاہ سوری سے متعلق مضمون مولانا کی خاص تحقیقی شان اور ذہانت کا مظہر ہے۔ مولانا نے شیر شاہ کے پنج سالہ عہد حکومت کے کارناموں کو ایک "پنج سالہ اسکیم" کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اور دکھایا ہے کہ مرحوم بادشاہ نے اس تھوڑی سی مدت میں رفاہ عامہ اور امن وامان کے سلسلہ میں کیسے پائیدار اور وسیع وعریض کام کیے کہ ان سے آج "پنج سالہ اسکیموں" کے دور میں بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے ـــ ساتھ ہی شیر شاہ کے دینی مقام کو بھی آشکارا کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

یہ ہے الفرقان میں شائع ہونے والے مولانا کے مضامین کی مختصر فہرست۔ اور اس میں وہ مضامین درج نہیں کیے گئے ہیں جو دوسری جگہ اشاعت کے بعد مولانا کی فرمائش پر یا بغیر فرمائش کے الفرقان میں نقل کیے گئے۔

اب اپنے مولانا کے اُن افادات کے متعلق خصوصی طور پر کچھ عرض کر دیا جائے جو اس نمبر میں شامل کیے گئے ہیں۔
یہ چار مضامین ہیں (۱) الف ثانی (یا ہزارہ دوم) کا تجدیدی کارنامہ (۲) حج کیا ہے؟ (۳) دجالی فتنہ اور سورۂ کہف (۴) وفاشعاری کے دو نادر نمونے۔

الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ

مولانا کا یہ مقالہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ پر ہے۔ الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر [illegible] میں شائع ہوا تھا۔ یہ مقالہ مولانا کے یادگار مقالات میں سے ہے۔ اس کی اشاعت ہوئی تو علمی حلقوں میں ایک دھوم مچ گئی اور آج تک اس کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے۔ مولانا کے انتقال کے بعد جہاں کہیں ان پر کچھ تفصیل سے لکھا گیا اور ان کے علمی کارنامے گنائے گئے، اس مقالہ کو سرِ فہرست جگہ ملی۔ اس کے بارے میں ہمیں کچھ زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت اس لیے نہیں کہ چونکہ یہ مقالہ بالکل نامکمل حالت میں ہے اور پھر بھی پچاس صفحات سے زائد کا ہے اس لیے اسے من وعن درج نہیں کیا گیا ہے، بلکہ جناب مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہوی کو تکلیف دے کر اس کی تلخیص کرائی گئی تھی، یہی تلخیص اس نمبر میں شامل ہو۔ فریدی صاحب نے تمہید میں اس مقالہ کا اچھا تعارف بھی کرا دیا ہو اسی لیے اس کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ یہاں پر کچھ عرض کیا جائے۔

حج کیا ہے؟

یہ مقالہ الفرقان کے حج نمبر (۱۳۶۰ھ) میں شائع ہوا تھا، جو لوگ اس کو غور سے پڑھیں گے امید ہو کہ وہ اس کی قدر و قیمت کے ہماری طرح قائل ہوں گے۔ اور انھیں بڑے نوادر اس کے مطالعہ سے ہاتھ آئیں گے۔ اس میں مولانا نے پہلے یہ دکھایا ہے کہ کعبہ، جو اعمالِ حج کا محور ہو اس کا تعلق عالم ارضی سے کیا ہو۔ اس سلسلہ میں نباتی اور انسانی وحیوانی حقائق پر نظر ڈال کر انھوں نے یہ سوال اُٹھایا ہو کہ جس طرح نباتات کا قیام و بقا، اُن کا نشو و نما اور ان کا سلسلۂ برگ و بار، بیج اور گٹھلیوں کے اندر کے ایک انکھوے سے وابستہ نظر آتا ہے جسے نباتات اور ان کی تمام پیداواروں کا مرکزی نقطہ کہا جا سکتا ہے۔ یا انسان وحیوانی اجسام کے قیام و بقا اور ان کے نشو و نما کا دار و مدار دل پر ہو۔ کیا اسی طرح مٹی کا یہ تودہ جسے زمین یا دھرتی کہتے ہیں اور جس سے علاوہ عناصر اور معدنی مرکبات کے نباتی، حیوانی اور انسانی ہستیوں کی بے پناہ موجیں اُبل رہی ہیں۔ یہ (زمین) بھی اپنے اندر کیا کوئی ایسی چیز نہیں رکھتی جسے اس کی ان تمام پیداواروں کا مرکزی نقطہ ٹھہرایا جائے؟ کیا اس کا کوئی دل نہیں ہے، جس سے ان پیداواروں کی رگوں میں نشو و نما اور ارتقاء و بقاء کا خون دوڑ رہا ہو؟ یہ سوال اٹھا کر مولانا نے قرآن کی آیتوں سے اس کا جواب دیا ہو کہ بے شک زمین کا بھی دل اور ایک مرکزی نقطہ ہو اور وہ ہو "کعبہ"!۔

اس موقع پر آیات کے الفاظ سے مولانا کا استشہاد بس دیکھنے اور یاد رکھنے کے قابل ہے۔ انھیں آیات سے سینکڑوں بار ہم گزرتے ہیں، اور ان الفاظ کے وہی معنی ہم بھی جانتے ہیں جو مولانا نے بیان فرمائے ہیں، اگر مولانا انھیں مشہور معانی سے وہ بات پیدا کر دیتے ہیں جو کبھی حاشیۂ خیال میں بھی نہ آئی تھی، اور لطف یہ کہ بات بالکل دل لگتی۔ یہ مولانا کے انتقالِ ذہنی کا کمال ہو جو ان کا خاص امتیاز ہے۔

اسی ذیل میں مولانا نے کعبے کی قدامت اور اس کے وسط ارض میں واقع ہونے کو بھی تاریخی بیانات اور صحف قدیمہ اور جغرافیائی حقائق سے ثابت کیا ہو۔ جو اس کی مرکزیت کا اقتضاء ہے اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ خالق کائنات نے جب انسان کو خلیفہ بنا کر زمین پر آباد کرنے کا فیصلہ فرمایا تو اس کے قیام و بقا، نشو و نما اور امن و ارتقاء کے لیے

کعبہ کو مرکز قرار دیا۔ اور جیسے سارے عالم میں اپنی رحمتوں کو تقسیم کرنے کے لیے الرحمٰن عرش پر مستوی ہوا، اسی طرح کرۂ زمین کی رحمتوں کی تقسیم کے لیے کعبہ کو اس نے اپنی تجلی کی فرودگاہ خاص ٹھہرایا ـــــ پس ذاتِ حق کی تجلی گاہِ خاص ہونے کی وجہ سے وہ "بیت اللہ" ہو۔ اور یہی بنیاد ہو کعبہ کے ساتھ انسانوں کے ان روحانی تعلقات کی جو اسلام قائم کراتا ہو۔ جن میں سے ایک تعلق کی عملی شکل نماز ہو اور دوسرے کی حج۔

یہاں پہنچ کر مولانا یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ تعلقات کی ان دو شکلوں میں اس قدر اختلاف کیوں ہو، کہ ایک میں انتہائی صفائی، ستھرائی، وقار و سنجیدگی اور متانت و سکنت ہو کہ ہر بار منھ، ہاتھ، پاؤں دھوؤ، معقول لباس پہنو، دوڑ کر مت آؤ، اور خاموش رہو، اور دوسرے میں جتنا زیادہ میلے کچیلے، دیوانہ وش اور پراگندہ حال رہو۔ جتنا زیادہ دوڑ دھوپ کرو اور شور مچاؤ اتنی ہی سرخروئی حاصل کرو ـــــ؟

مولانا فرماتے ہیں۔ فطرتِ انسانی کے دو پہلو ہیں۔ ایک طرف انسان قدرت کے حاکمانہ اقتدار کے آثار کو اپنے اوپر طاری کرنا چاہتا ہو اور ساری کائنات کو قدرتی قوانین کی پابندی ہی کے ذریعہ ترقی اور کامیابی کے مراحل طے کرتا ہوا دیکھتا ہو تو وہ اپنی کامیابی کا راز بھی انھیں پابندیوں میں پوشیدہ سمجھتا ہے، انسانی فطرت کے اس اندرونی تقاضہ کی تکمیل نماز کے ذریعہ کی گئی ہو۔ مگر اسی کے ساتھ انسان کی فطرت میں جمال پرستی اور حسن پسندی بھی ہو اور اسی پر اس کے ذہنی امتیاز کی بنیاد قائم ہو۔ تلاشِ حسن اور جستجوئے جمال کے جذبہ کے ساتھ وہ پیدا بھی ہوتا ہو اور اسی جذبہ کو ساتھ لیے وہ مرتا ہے۔ بہتی ہوئی نہروں، لہلہاتے ہوئے مرغزاروں، سرسبز وادیوں کے نشیب و فراز، اور شگفتہ و نیم شگفتہ پھولوں، الغرض جمادی اور نباتی سانچوں میں حسن و جمال کی تجلیاں جب ڈھل کر سامنے آتی ہیں تو ان کو دیکھ کر گدھے گھوڑے اور بکرے نہیں، صرف آدم کے بچے اور حوّا کی بچیاں ہی کیف و سرور اور وجد و نشاط میں سرمست ہوتے ہیں۔

بہر حال یہ واقعہ ہے کہ انسان کی فطرت میں حسن پرستی اور تلاشِ جمال کا ایک غیر معمولی جذبہ موجود ہو اور اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ کائنات کے اندر حسن و جمال کی جو لہریں مختلف مظاہر میں پائی جاتی ہیں ان کا آخری سرچشمہ وہی ہے جو ہر خوبی و کمال کا مبداء و منتہیٰ ہے، یعنی اللہ۔ حج اسی جمالِ مطلق اور حسنِ ازل کی جستجو کی عملی شکل ہے، جو اس کے سارے عملی ڈھانچہ میں جھلکتی ہو، اور اسے نماز کے ڈھانچہ سے بالکل مختلف نوعیت بخشتی ہے۔

انھیں حقائق کو مولانا نے اپنے خاص انداز میں ۲۰۔۲۱ صفحے میں بیان فرمایا ہے۔ اصل مضمون میں تو آگے اور بھی کچھ چیزیں تھیں، مگر ہم نے آگے کے وہ صفحات اس انتخاب میں حذف کر دیے ہیں اور صرف اتنا ہی حصہ یہاں لیا ہے جس کا تعلق موضوع سے ہے۔ ہمیں اس کا احساس ہو کہ اختتام پر کچھ تشنگی سی محسوس ہوتی ہے، مگر آگے کے چند جملے جو آخری پیراگراف کی تکمیل کرتے ہیں ایسا معلوم ہوا کہ ان کی کتابت میں

کچھ غلطی ہوگئی ہے جس سے ناظرین کو الجھن پیش آتی اس لیے یہی مناسب سمجھا گیا کہ پیراگراف چند جملے پیشتر ہی ختم کردیا جائے، کیونکہ بات بہرحال پوری ہوجاتی ہے۔

دجّالی فتنہ اور سورۂ کہف

سچ پوچھئے تو یہی مضمون اس خیال کا محرک بنا کہ بجائے مولانا کے متعلق مضامین کا مجموعہ شائع کرنے کے خود ان کے مضامین کا مجموعہ (یعنی بجائے گیلانی نمبر کے افادات گیلانی نمبر) شائع کیا جائے۔ مولانا نے اس مضمون میں سورۂ کہف کی تفسیر ایک نئے انداز سے کی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت پر انھوں نے ایک خاص نقطۂ نظر سے مدتوں غور کیا تھا اور اسی غور و فکر کے سرمایہ کو اس مضمون میں پیش کیا۔ مگر غلطی یہ ہوئی کہ اتنی طویل چیز جو ایک کتاب کی شکل میں شائع کی جانی چاہیئے تھی ایک ماہنامہ کے صفحات میں شائع ہوئی۔ الفرقان کی ضخامت ہی کیا ہے' پھر بھی کافی لمبی لمبی قسطیں کرنے کے باوجود یہ مضمون اکیس قسطوں میں پورا ہوسکا۔ اور درمیانی ناغوں کی وجہ سے ڈھائی سال میں یہ قسطیں شائع ہوسکیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ناظرین کے سامنے تو یہ سلسلہ کہیں درمیان سے آیا۔ اور شروع کی کڑیاں سامنے نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس سے کوئی دلچسپی نہ لے سکے۔ اور جن کے سامنے یہ مضمون ابتداء سے آیا وہ بھی ماہناموں کے عام ناظرین کی عادت کے مطابق عام طور پر اس کی طوالت سے اکتانے سے لگے۔ الغرض بہت کم لوگ نکلے جو دلجمعی کے ساتھ اس مختلف قسم کے مواد سے بھرپور مضمون سے فائدہ اٹھا کر اس کی قدر شناسی کا ثبوت دیتے رہے۔ اس کا مولانا کو بھی قلق تھا اور ادارہ الفرقان کو بھی افسوس رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ مضمون تدبر قرآن کی ایک نئی راہ کھولتا ہے اور چاہے مولانا کے نتائج فکر سے پورا اتفاق نہ کیا جائے مگر زمانہ کے نت نئے حالات و مسائل میں قرآن سے ایک زندہ کتاب کی طرح استفادہ کرنے کا ایک ڈھنگ ضرور اس کے مطالعہ سے ہاتھ آتا ہے۔ اسی لیے خود مولانا کی جتنی خواہش ہوگی وہ تو ظاہر ہے، خود ہماری خواہش تھی کہ لوگوں کے لیے اس کے مطالعہ کی کوئی بہتر صورت نکالی جاتی۔ مولانا کے سانحہ ارتحال کے بعد جب ان کی یاد میں الفرقان کا ایک خاص نمبر نکالنے کا خیال پیدا ہوا۔ اسی وقت یہ ذہن میں آیا کہ یہی موقع اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے غالباً سب سے زیادہ مناسب ہے، اور مرحوم کی روح کو شاد کرنے کا شاید یہی سب سے اچھا ذریعہ ہوگا۔

اس مقصد کے لیے ضروری معلوم ہوا کہ اس مضمون کی کچھ خدمت کی جائے، اور اپنی جیسی پوری کوشش کرکے ایسی صورت کردی جائے کہ لوگ آسانی سے اس مضمون سے مستفید ہوسکیں کیوں کہ مولانا کے لکھنے کا انداز تو یہ تھا، جیسا کہ انھوں نے خود مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے کہ

"ایک بار جو نک میں لکھنے بیٹھتا ہوں تو لکھتا چلا جاتا ہوں، پھر اسکی نظر ثانی، حک و اصلاح میرے لیے مشکل ہوتی ہے۔ میں چھاپنے والے پر چھوڑ دیتا ہوں کہ خرافات کو حذف کر کے کارآمد اجزاء کا انتخاب کر لیں۔"

(معارف مارچ ۵۷ء ص ۱۸۲)

"خرافات" کا لفظ تو خیر مولانا کی کسر نفسی ہے۔ البتہ مولانا کے یہاں بات میں بات بہت نکلتی ہے۔ یہ ضمنی باتیں اگرچہ بذات خود سب نہایت کارآمد اور پُر از معلومات ہوتی ہیں مگر عام ناظرین کے لیے بعض وقت یہ بھول بھلیاں بن جاتی ہیں جس سے انھیں موضوع سے تعلق قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے، اور ذہن میں ایک انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ مولانا نے شاید اسی قسم کی چیزوں کو خرافات سے تعبیر کر دیا ہے۔

بہر حال عام ناظرین کی سہولت کے خیال سے ضروری معلوم ہوا کہ اولاً غیر متعلق باتوں سے پیدا ہونے والی مضمون کی طوالت اور اسکے پیچ و خم کو ممکن حد تک کم کر دیا جائے۔ دوسرے جتنے حصے سے مضمون کا مقصد پورا ہو جاتا ہے بس اتنے ہی حصہ پر اکتفا کیا جائے اور باقی حصہ میں سے بغیر کسی تسلسل کے صرف خاص خاص افادات لے لئے جائیں۔ چنانچہ اس نقطۂ نظر سے جب مضمون پر کام کیا گیا تو ۲۰۰ صفحات میں سے کوئی ۱۵۰ صفحے رہ گئے جو اس نمبر کے سطر کی تبدیلی (یعنی سطروں کی تعداد اور لمبائی میں اضافہ) اور کتابت کے گٹھاؤ کی وجہ سے صرف ۱۱۲ صفحے میں آگئے۔

حذف کے علاوہ کہیں لفظی ترمیم بھی کی گئی، عبارت کو سہل الفہم بنانے کے لیے ضرورت محسوس ہوئی تو کہیں کوئی لفظ یا جملہ بڑھا بھی دیا گیا۔ اور اسکے علاوہ بعض حواشی بھی لکھے گئے ہیں۔

مزید برآں دو کام اور کیے گئے ہیں (۱) ایک تو یہ کہ مضمون کو مختلف مناسبتوں سے چند حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ہر حصہ پر مناسب عنوان قائم کر دیا گیا ہے، کہ یہ چیز خود نفسیاتی طور پر ایک طویل مضمون کے مطالعہ کا بار ذہن سے ہلکا کرتی ہے۔ (۲) دوسرے یہ کہ مضمون بغلی سرخیوں سے بھی یکسر خالی تھا جو کہ فہم میں بڑی آسانی پیدا کرتی ہیں اور قاری کے ذہن میں مباحث کے انضباط کا ذریعہ بنتی ہیں۔ راقم مرتب نے جہاں جہاں ممکن ہوا یہ بغلی سرخیاں قائم کر دی ہیں جن کی تعداد غالباً کئی سو ہو گی۔

بہر حال یہ محنت صرف اس لیے کی گئی ہے کہ عام ناظرین سہولت کے ساتھ اس مضمون سے مستفید ہو سکیں اور مولانا مرحوم کی یہ محنت کم از کم ان کے بعد ہی ٹھکانے لگ جائے۔

اس مضمون میں کیا کچھ ہے؟ اب اس پہلو پر روشنی ڈالنے کی تو ان صفحات میں زیادہ گنجائش رہی نہیں — مختصراً اتنا ضرور عرض کر دینا چاہیئے کہ اس کے بعض مباحث مثلاً عیسائیوں کا عقیدۂ ولدیت اور اسکے آثار بڑے

نادر اور اچھوتے مباحث ہیں۔ مولانا کی وسعت معلومات اور ان کی ممتاز ذکاوت و ذہانت اور دقیقہ رسی کی غیر معمولی صلاحیت نے قطروں کو لے کر سمندر کر دیا ہے۔ جو لوگ توجہ سے اس کا مطالعہ کر لیں گے وہ کتنے ہی موضوعات پر اپنا دامن بیش بہا معلومات سے بھر لیں گے۔

وفاشعاری کے دو نادر نمونے

یہ اس مجموعہ کا آخری مضمون ہے اس کا تعلق چونکہ بعض تاریخی واقعات سے ہے اس لیے اس کے تعارف میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ ایک سادہ سا تذکیری مضمون ہے جو واقعات سے ترتیب دیا گیا ہے۔ مولانا کے آخری سلسلۂ مضمون کی ایک کڑی ہونے کی بنا پر مناسب معلوم ہوا کہ اسی کو افادات مندرجہ کی آخری کڑی بنا دیا جائے۔

مولانا کے افادات کے علاوہ اس نمبر میں دو مضمون اور ہیں۔ ایک سب سے پہلا مضمون مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ہے۔ جو مولانا مرحوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ایک جامع تعارف اور ان کی خصوصیات اور فضائل و کمالات پر ایک بصیرت افروز تبصرہ ہے ۔۔۔ دوسرا مختصر مضمون مدیر الفرقان مدظلہ، کا ہے جس سے مولانا گیلانیؒ اور الفرقان کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔

کچھ مولانا کے اسلوب نگارش کے متعلق

راقم مرتب نے چاہا تھا کہ اس نمبر میں ایک مضمون مولانا کی انشائی خصوصیات اور ان کے اسلوب پر ہو جائے۔ مگر افسوس ہے کہ خیال بے آیا چنانچہ جن حضرات سے اس کیلئے عرض کیا گیا ان کا جواب معذرت میں ملا۔ افسوس ہو کہ یہ بڑی کمی رہ گئی۔ ورنہ مولانا کے افادات سے استفادہ میں ناظرین کو اور زیادہ سہولت ہو جاتی۔ میں خود کو اس موضوع پر لکھنے کا اہل تو نہیں پاتا مگر ضرورت کے احساس کے تحت چند اشارات یہاں کیے جاتے ہیں شاید کچھ مفید ہو سکیں۔ واضح رہے کہ یہاں مولانا کے صرف انہیں مضامین کو سامنے رکھ کر کچھ لکھا جا رہا ہو جو اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ نیز مولانا کے طرز انشاء پر کوئی تبصرہ اور ان کی تمام خصوصیات کا احصاء مقصود نہیں ہو بلکہ صرف تسہیل کے نقطۂ نظر سے چند باتوں کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

۱۔ مولانا کے اسلوب کی سب سے پہلی خصوصیت کا آئینہ دار ان کی تحریر کا شروع ہوتا ہی بعض مرتبہ تو وہ مضمون اسی طرح شروع کرتے ہیں جس طرح لکھنے کا عام اور مانوس طرز ہے، مگر بعض مرتبہ وہ اس انوکھے ڈھنگ سے بات شروع کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو معلوم ہوتا ہو وہ شروع سے نہیں بلکہ بیچ سے کہیں مضمون پڑھنے لگا ہو۔ مثلاً "وفاشعاری کے دو نادر نمونے" میں انہیں مضمون اس بات سے شروع کرنا تھا کہ حجاج مروانی حکومت سے منسلک ہونے سے پہلے طائف کے ایک مکتب میں پڑھایا کرتا تھا۔ اس پیشہ کی آمدنی اس کی ضروریات کیلئے ناکافی ہوتی تھی۔ چنانچہ دمشق ہو گیا اور عبدالملک کے وزیر کے باڈی گارڈ میں بھرتی ہو گیا اور یہاں سے اس پر ترقیوں کا دروازہ کھلا۔ اس بات کو دیکھئے وہ کس ڈھنگ سے کہتے ہیں:۔

"طائف کے مکتب خانے میں بچوں کو پڑھاتا تھا۔ لیکن معلم الصبیانی کے اس پیشہ سے اتنی آمدنی جو ضروریات کو کافی ہوتی نہیں ہوتی تھی، پھر کیا کیا جائے، طائف سے اٹھا، دمشق پہونچا، وقت کے حکمراں کا جو وزیر با تدبیر تھا اسکے باڈی گارڈ کے سپاہیوں میں بھرتی ہو گیا۔ وزیر کا نام روح بن زنباع تھا مروانی حکومت کے پہلے حکمراں عبدالملک بن مروان نے روح کو اپنا وزیر بنا لیا تھا بھرتی جو ہوا ابو یوسف ثقفی باشندہ طائف کا لڑکا تھا، نام اس کا حجاج تھا"۔

۲۔ دوسری خصوصیت مولانا کی تحریر کی، بات میں بات کی ہے، وہ ایک بات سے دوسری بات کی طرف اس طرح نکل جاتے ہیں کہ جیسے پہلی بات ہو ہی نہیں رہی تھی، اسی مضمون میں دیکھئے اوپر جو اقتباس دیا گیا ہے اسکے بعد اگر مولانا دوسری بات کی طرف منتقل نہ ہو جاتے تو یہ بتلاتے کہ حجاج کس طرح آگے بڑھا کر اسے بدنام زمانہ چیرہ دستیوں کا موقع ملا۔ مگر حجاج کا نام آنے پر مولانا کے قلم کا رُخ اس طرف مڑ گیا کہ کون حجاج؟ وہی

"جس کی یاد کو مسلمان اپنے حافظہ سے مٹانا چاہتے ہیں، لیکن بجائے مٹنے کے وہ تازہ ہی ہوتی رہتی ہے......"

اور پھر اسی ذیل میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہ قول نقل کر کے کہ "دنیا کی ہر قوم اپنے اپنے فرعونوں کو لیکر کھڑی ہو تو مقابلہ میں مسلمانوں کا یہ فرعون سب پر بھاری ہو جائے گا۔" مولانا نے اسی سے یہ گفتگو شروع کر دی کہ حجاج ظلم و ستم آئینی طور پر کرتا تھا یا غیر آئینی طور پر، اور پورا ایک صفحہ اس پر صرف کرنے کے بعد پھر اُس اصل بات پر آئے کہ وزیر کے باڈی گارڈ سے بڑھ کر وہ گورنری تک کیسے پہنچا۔۔۔

جی چاہتا تھا کہ اسکی اور چند مثالیں پیش کر دی جائیں تاکہ ناظرین اس اسلوب سے اچھی طرح واقف ہو جاتے مگر جگہ کی تنگی اجازت نہیں دیتی۔

۳۔ مولانا کے اسلوب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ مختلف مباحث کو اس طرح باہم پیوست کر دیتے ہیں کہ عموماً کسی متعین نقطہ پر ان باہم مختلف قسم کی باتوں کے درمیان کوئی خط فاصل نہیں کھینچا جا سکتا۔ اسکی مثالیں انکے مضامین میں قدم قدم پر ملتی ہیں، جیسا کہ مثال کے طور پر حج پر جو انکا مضمون ہے اسمیں دیکھئے کہ وہ کعبہ کی مرکزیت و مامیت کی وسطیت پر گفتگو کر رہے تھے کہ یکایک اسکی قدامت کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس پر دلائل و شواہد پیش کرنے لگے اور اسطرح متوجہ ہوئے کہ کافی دور تک دوسری کو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ کوئی دوسری بات کہنے جا رہے ہیں، جعفر علیؓ کا ایک قول نقل کر کے یہ لکھنے کے بعد کہ یہ اشارہ کعبہ کی اسی برکاتی مرکزیت کیطرف ہے جسے قرآن میں "مبارکا" کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے، آگے عبارت یوں شروع ہو جاتی ہے۔

"بلکہ بجائے "مکہ" کے اسی آبادی کے دوسرے نام یا تلفظ یعنی "بکہ" کے لفظ کو قرآن نے یہاں جو اختیار کیا ہے"۔ الخ

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مرکزیت ہی کے سلسلہ میں مولانا کوئی نکتہ لا رہے ہیں مگر تھوڑی دور چلکر پتہ چلتا ہے کہ نہیں، یہاں سے ایک نئی بات شروع ہو گئی۔

۴۔ مولانا کے طرز انشاء کی ایک سب سے بڑی اور سب سے نمایاں خصوصیت ان کے جملوں کی بے ساختگی، وارفتگی اور ان کی البیلی ترکیب ہے۔ ان کے جملوں کی ترکیب کی خصوصیت ظاہر کرنے کیلئے "البیلے پن" سے زیادہ مناسب شاید کوئی اور لفظ نہ ہو۔ جملوں کے اجزاء کی ترتیب میں وہ کسی قاعدہ اور ضابطہ کے پابند نہیں ہیں، بس جو جزو بے ساختہ قلم سے پہلے نکل گیا، وہ پہلے ہو گیا جو بعد میں نکلا وہ بعد میں ہو گیا، پھر اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جملہ پورا نہیں ہونے پاتا کہ ایک جملہ معترضہ شروع ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی نا تمام جملہ کے بقیہ اجزاء بھی اسی میں گم ہو جاتے ہیں، جن لوگوں کو مولانا کے مضامین سے نیا نیا سابقہ پڑتا ہے وہ تو کچھ گھبرا سے جاتے ہیں، مگر جو لوگ مولانا کے اسلوب سے آشنا ہو چکے ہیں، انھیں اس انداز میں ایک مزہ آتا ہے اور خشک موضوع بھی دلچسپ بن جاتا ہے۔

مولانا کے طرز انشاء کی ان چند خصوصیات کو اگر پہلے سے ذہن میں رکھ لیا جائے گا تو امید ہے کہ عام ناظرین بھی خاطر خواہ استفادہ کر سکیں گے۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

نقوش و تاثرات

(از، مولانا سید ابو الحسن علی، ندوی)

اپنے زمانہ کی کسی مشہور و جلیل القدر ہستی کے متعلق یہ بتانا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے کہ اس کا نام سب سے پہلے کب کان میں پڑا تھا جب خیال کیجئے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام ہمیشہ سے مانوس اور یہ ہستی ہمیشہ سے معروف و محبوب ہے۔ میری طالب علمی کا زمانہ اور میرے لکھنے پڑھنے کی عمر کا بچپن تھا، اور مولانا کے علم و تصنیف کی عمر کا سن کہولت، میرے برادر معظم ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبد العلی صاحب ان کے دوست بھی تھے اور معالج بھی، مولانا اکثر حیدر آباد سے اپنے وطن گیلانی جاتے ہوئے اپنے رفیق کار اور مخلص دوست مولانا عبد الباری صاحب ندوی کی معیت میں لکھنؤ اتر جاتے اور ایک دو روز قیام کرکے بہار کے سفر پر روانہ ہوتے، اس عرصہ میں کبھی ہمارے گھر کو بھی رونق بخشتے اور کبھی ہم مولانا عبد الباری صاحب کے دولت کدہ (شبستان سعادت) پر حاضر ہو کر ان کی زیارت و صحبت کی سعادت حاصل کرتے، اس دو روزہ زمانہ قیام کے صرف دو تاثرات باقی رہ گئے ہیں، ایک ان کی شیریں گفتاری، شگفتہ بیانی، دوسرے ان کی نورانی صورت، خندہ پیشانی ان دونوں صفتوں نے مل کر ان کی شخصیت میں عجب دل آویزی اور دل کشی پیدا کر دی تھی، اور کسی طرح انکی موجودگی یا گفتگو طبیعت پر بار نہیں ہوتی تھی، قدیم مشرقی سوانح نگار اور ادیب اسی کو "سبک روحی" سے تعبیر کرتے ہیں اور اسکی مقابل صفت کو "گراں جانی" کہتے ہیں؛ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو اس لطافت سے خوب نوازا تھا، اور اسی وجہ سے وہ اپنے حلقۂ احباب میں بڑے محبوب اور

اور اپنے حلقہ تلامذہ و مستفیدین میں بڑے مقبول تھے اور جو ان کی صحبت میں ایک مرتبہ بیٹھ جاتا وہ یہ کہتا ہوا اٹھتا۔

بہت لگتا ہے جی صحبت میں اُن کی

اسی اثنا میں اگر نماز کا وقت آجاتا تو مولانا حاضرین یا صاحب خانہ کے اصرار سے مصلے پر تشریف لے جاتے، اُن کی قرأت میں بڑا سوز اور حلاوت تھی، قلب پر اس کا اثر پڑتا اور جی چاہتا کہ قرأت طویل ہو،

اس دوران قیام میں جو علمی فوائد ہوتے ان کی تو اس وقت کچھ زیادہ سمجھ نہ تھی اور نہ وہ محفوظ ہیں بس اتنا یاد ہو کہ ان کی باتوں سے یہ احساس نہیں ہونے پاتا تھا کہ کوئی شخص علم کے فلک چہارم سے اہل زمین کو خطاب کر رہا ہے یا کوئی عالم نشستگاہ کو درس گاہ تصور کرکے سامعین کو درس دے رہا ہو، ان سے مل کر ہم کو وہ دوری اور پستی نہ محسوس ہوتی جو مبتدی طالب علموں کو بڑے علماء و اساتذہ سے مل کر محسوس ہوا کرتی ہے، دیکھنے میں یہ بات معمولی ہے مگر بڑی غیر معمولی ہے، جس طرح بعض (نو دولت) حکام کو یہ مرض لاحق ہو جاتا ہے کہ وہ ہر جگہ یہاں تک کہ اپنے گھر میں اور اپنے بے تکلف احباب کے حلقہ میں بھی اپنے کو حاکم سمجھے رہتے ہیں، اسی طرح بعض علماء اور ادبا، اس کمزوری کا شکار ہو جاتے ہیں کہ وہ ہر وقت اپنے کو معلم و مصلح یا ادیب و نقاد سمجھنے لگے ہیں، اور درسگاہ اور مسند درس کا تصور اُن سے کبھی جدا نہیں ہوتا، مولانا کی مجلس میں بڑا انبساط تھا، اور علمی و درسی اصطلاح میں "تنزل" بھی تھا، لطائف بھی تھے، واقعات بھی تھے اور چیدہ و منتخب اشعار بھی، اور وہ بھی ترنم کے ساتھ، دل نوازی و شفقت بھی تھی، اور علمی و تحقیقی شان بھی اور یہ سب اُسی لطافت روح اور رباک جانی کا نتیجہ تھا جو اُن کو عطا ہوئی تھی' اور اس بات کا ثبوت کہ علم اُن کا ایسا جزو بدن ہو گیا تھا کہ اُن کو اس کا احساس باقی نہیں رہا تھا اس لیے اس کے موقع بے موقع اظہار کی ضرورت نہ تھی۔

اسی عرصہ میں مجھے تفسیر کے تفصیلی مطالعہ کا شوق ہوا، بھائی صاحب نے ارادہ فرمایا کہ مجھے کچھ عرصہ کے لیے مولانا کے پاس حیدر آباد بھیج دیں، مولانا نے بھی اس پر مسرت کا اظہار فرمایا، لیکن اب یاد نہیں کن اسباب و موانع کی بنا پر ایسا نہ ہو سکا، لیکن مولانا نے مشفقانہ و مربیانہ اور میں نے شاگردانہ و نیاز مندانہ تعلق آخر تک قائم رکھا، اس سلسلہ میں سب سے پہلے میری خط و کتابت ۱۳۷۱ھ میں ہوئی، جب مجھے اپنی کسی علمی یا تصنیفی ضرورت سے مولانا کے اس مقالہ سے استفادہ کی ضرورت پیش آئی جو انھوں نے جمع و ترتیب قرآن پر تحریر فرمایا تھا، اس کی تاریخ یہ ہے کہ اجمل خاں صاحب نے قرآن مجید کی جمع و ترتیب کے متعلق ایسے مشککانہ خیالات کا اظہار کیا تھا جن سے قرآن مجید کی موجودہ جمع و ترتیب بلکہ اس کی محفوظیت مشتبہ ہو جاتی ہے، یہ چند عامیانہ و سطحی خیالات کا مجموعہ تھا جن کی کوئی علمی و تحقیقی اہمیت نہ تھی لیکن ایک بڑے فتنہ کا آغاز تھا، مولانا کے

علم وحمیت میں اس سے حرکت وجنبش پیدا ہوئی اور انھوں نے نفس مسئلہ جمع وترتیب قرآن پر ایک محققانہ وعالمانہ مضمون تحریر فرمایا جو اسی زمانہ میں "مدینہ" بجنور میں شائع ہوا، مولانا کے علمی مقالات کی بڑی خوبی یہ ہوکہ اس میں یکجا اتنا منتشر مواد جمع فرما دیتے ہیں جو آسانی سے کسی ایک کتاب میں نہیں مل سکتا، دوسرے منقولات کے ساتھ وہ بہت سی ایسی نئی باتیں لکھ دیتے ہیں جن کی طرف عام طورپر ذہن نہیں جاتا، اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا نکتہ رس اور نکتہ آفرین ذہن عطا فرمایا تھا، قرآن مجید کی وہی آیات اور صحاح کی وہی احادیث اور تاریخ کے وہی بیانات جو ہم آپ بیسوں بار پڑھ چکے ہیں، مولانا ان سے ایسے حقائق ثابت کردیتے اور ان سے ایسے عجیب لیکن صحیح نتائج نکالتے کہ حیرت ہوتی[1]، اس مضمون میں بھی یہی شان ہو، قرآن مجید کے من جانب اللہ محفوظ و مرتب ہونے کو، اور عہد رسالت ہی میں اس کے مرتب وجمع ہوجانے کو انھوں نے قرآن مجید کے الفاظ نصوص اور واقعات سے اس طرح ثابت کیا تھا کہ اس خیال کی بالکل بنیاد ہی منہدم ہوجاتی تھی کہ قرآن مجید بہت تاخیر کے ساتھ جمع ومرتب ہوا اور اس کی ترتیب حضرت ابوبکر یا حضرت زید بن ثابت کے اجتہاد کا نتیجہ ہے، اس مضمون کا محرک اور اس کی شان کیا تھی، اپنے مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہیں:-

> "آپ کو شاید میرے جنون کا حال معلوم نہیں، اجل نامی پروفیسر کے نام "مدینہ" میں مضامین کا ایک سلسلہ شروع ہوا، غصہ آرہا تھا، دبانہ سکا، رات کو قلم لیا پراگندہ خیالات سمیٹے لکھ کر بھیج دیا، مسودہ تیار ہی کب تھا، وہی مسودہ وہی بیضہ تھا، طبع ہونے کے بعد ایک کاپی آئی تھی، یاروں نے اسے بھی ختم کردیا، سنہ تو یاد نہیں لیکن جس سنہ[2] میں شائع ہوا مارچ کا مہینہ غالباً، اگر مارچ تھا ہوسکے تو جناب مجید حسن سے مانگئے، شیر محمد صاحب کے پاس ہوگا، اس کا کیسے یقین کروں، کیا آج کل اس سلسلہ میں کوئی کام ہو رہا ہے، کاش! قرآن کے ساتھ دوسری آسمانی کتابوں کی تاریخی حالت بھی تحقیق کے ساتھ لکھ دی جاتی تو
>
> لاریب فیہ
>
> کی تفسیر ہوجاتی[3]"

مولانا کی تصنیفات میں سے غالباً سب سے پہلے النبی الخاتم پڑھی، کتاب عجب البیلے انداز میں لکھی گئی ہو، صحف سماوی کا انداز بیان، خطیبوں کا جوش وبرجستگی، عشاق کی مستی اور وارفتگی، عقل وجذب کی

---

[1] اس کا بہترین نمونہ انکی تصنیف "تدوین حدیث" ہو [2] مولانا ابواللیث ندوی امیر جماعت اسلامی ہند [3] خط پر تاریخ نہیں ہے ڈاکخانہ کی مہر سے مکتوب ۱۹۴۰ء کا ہے

لطیف آمیزش حسب معمول معمولی و مشہور واقعات سے لطیف نکتے اور عظیم نتیجے نکالتے چلے جاتے ہیں، اور وہ اس سرعت و کثرت کے ساتھ کہ پڑھنے والا مصنف سے شکایت کرنے لگتا ہو کہ

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

میں نے اپنی ساری عمر میں سیرت نبوی میں رحمۃ للعالمین اور النبی الخاتم سے زیادہ موثر کتاب نہیں پڑھی، کتاب پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف علم و انشاپردازی کی کرشمہ سازی نہیں ہے، اس کے اندر ان کا سوز دروں اور خون جگر بھی شامل ہے اور واقعہ یہی ہے کہ

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

ان سے جب زیادہ ملنا ہوا اور کچھ دن ساتھ رہنا ہوا تو اس حقیقت کی تصدیق ہوئی، اور حیدرآباد کے قیام میں خود انھوں نے اپنے بعض واقعات سنائے جن سے بارگاہ رسالت سے خصوصی تعلق و مناسبت اور اس کتاب کی مقبولیت و تاثر کا راز معلوم ہوا۔

ان کا دوسرا نقش قلم جو نظر سے گزرا، اور نقش ہو گیا، وہ ان کا مضمون "الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ" ہے جو الفرقان کے مجدد نمبر میں شائع ہوا تھا، اور وہ انکی بہترین و موثر ترین تحریروں میں ہے، حضرت مجدد الف ثانی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن اس مضمون سے بڑھ کر ان کی تجدیدی عظمت کو آشکارا کرنے والا کوئی مقالہ یا تصنیف اس وقت تک نظر سے نہیں گزری، اس مضمون میں بھی انھوں نے یہی کیا ہے کہ ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ سے لے کر ایسے اقتباسات جمع کر دیے ہیں کہ عہد اکبری کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے، اور پڑھنے والے کو اس خطرہ کا اندازہ ہو جاتا ہے جو اس ملک میں اسلام کو درپیش تھا، پھر ان تاریک و مایوس کن حالات میں الف ثانی کے مجدد کا تجدیدی کام شروع ہوتا ہے جو بالآخر اکبر کے تخت پر محی الدین اورنگ زیب بادشاہ غازی (نور اللہ مرقدہ و اعاد ایامہ) کو لے آتا ہے اگر یہ مضمون اسی پرواز کے ساتھ جس سے وہ شروع ہوا تھا، مکمل ہو جاتا تو نہ صرف حضرت مجدد علیہ الرحمہ کی بہترین سیرت تیار ہو جاتی بلکہ ہندوستان کے اسلامی انقلاب کی ولولہ انگیز تاریخ مرتب ہو جاتی۔

اس وقت تک میرے ان کے تعلقات کی نوعیت یہ تھی کہ میں ان کے علم و تحریر کے ہزاروں مداحوں میں سے ایک مداح تھا، ان کے مضامین و تصنیفات کو شوق سے پڑھتا، اور کبھی کبھی استفادۃً خط و کتابت بھی کر لیتا، ان کو بھی میرے حالات اور علمی مشاغل سے بزرگانہ دلچسپی تھی، لیکن ایک ایسی تقریب پیش آئی جس نے مجھے ان سے زیادہ قریب ہونے کا موقع دیا، اور وہ یہ کہ انھوں نے اپنی اہم تصنیف "مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" کے زمانۂ تصنیف میں والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحیؒ کی تصنیف "نزہۃ الخواطر" کا دوسرا حصہ جو درگاہ کے ذیل کے طور پر دائرۃ المعارف نے شائع کیا تھا پڑھا، وہ اس کو پڑھ کر بڑے متاثر ہوئے، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:-

"یہ واقعہ ہے کہ آپ کے والد مرحوم کی چیزوں سے یوں تو مجھے بچپن ہی سے خاص دلچسپی رہی ہے، لیکن نزہۃ الخواطر کی قدر و قیمت مجھ پر اپنی اس کتاب کے لکھنے وقت جتنی ظاہر ہوئی، اس سے پہلے نہیں ہوئی تھی، اللہ کے اس مخلص بندے نے کمال کر دیا ہو ہمنوں بلوں کو کھنگال گیے، لیکن پتہ بھی چلنے نہیں دیا، خدا کرے کہ ان کی محنت سے استفادہ کا موقع دنیا کو مل جائے، ایک انقلابی کام ہے جسے وہ کر کے چلے گیے ہیں، اب یہ ہم لوگوں کی توفیق کی بات ہو کہ اس سے خود مستفید ہوں اور دوسروں کے مستفید ہونے کے مواقع پیدا کریں گے۔"

(۱۷ نومبر ۱۹۴۵ء)

انھوں نے دائرۃ المعارف سے اس کتاب کے مکمل طبع ہونے کی تحریک کی، ایک محضر مرتب کیا جس پر ہندوستان کے اکثر اکابر علماء کے دستخط کرائے، یہ غالباً حیدری صاحب کا زمانۂ وزارت تھا اور وہ مولانا کی بڑی عزت کرتے تھے، بڑی کوششوں اور سلسلہ جنبانی سے اس کتاب کی طباعت کی منظوری ہوئی، اور میں نے پہلا حصہ صاف کرا کے بھیجدیا، ریاست کے دوسرے کاموں کی طرح اس کتاب کی طباعت میں تاخیر پر تاخیر ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ مصلحت یہ معلوم ہوئی کہ میں خود حیدرآباد جاؤں اور اس کے آخری مراحل طے کرانے کی کوشش کروں، چنانچہ ۱۹۴۶ء میں غالباً جولائی کا مہینہ تھا کہ میں حیدرآباد حاضر ہوا، مولانا کے سوا کہاں ٹھیرتا؟ یہ وہ زمانہ تھا کہ مولانا عبد الباری صاحب وظیفہ پر سبکدوش ہو کر لکھنؤ تشریف لے گئے تھے، جامعہ عثمانیہ کے قریب سیتا پھل منڈی میں مولانا کا قیام تھا، قریب ہی ایک مسجد تھی جس کی تاریخ مولانا نے المسجد الاقصیٰ نکالی تھی اور وہ مسجد کے دروازے پر کندہ ہے اور اس لحاظ سے مناسب حال ہے کہ مسجد بلدہ کے بالکل ایک سرے اقصی البلد پر واقع ہے، اس قیام میں مولانا کے شب و روز دیکھنے اور گھنٹوں پاس بیٹھنا ہوا، وہاں ٹھیر کر مولانا کا تصنیفی انہماک اور علمی استغراق دیکھا، پہلے کا حال تو یہ تھا کہ بعض دن رات رات بھر لکھتے رہتے، دوسرے کا حال یہ تھا کہ بعض اوقات سلسلہ گفتگو شروع فرماتے اور میں کسی ضرورت سے اٹھ جاتا مگر مولانا سلسلہ جاری رکھتے پھر اچانک سر اٹھا کر دیکھتے اور اس وقت معلوم ہوتا کہ میں موجود نہیں ہوں، طبیعت کی شگفتگی کا وہی عالم تھا "مسجد اقصیٰ" کے موذن ایک دلچسپ بزرگ تھے جن سے مولانا اکثر مطائبہ فرماتے اور ان کی سادگی سے لطف لیتے مولانا نے ان کا نام "امام مفرح القلوب" رکھا تھا، اکثر مولانا کے ساتھ ہی جامعہ عثمانیہ اور دائرۃ المعارف جانا ہوتا اور بعض مرتبہ ان کے درجہ میں بھی دجو اپنی دینی عظمت کی وجہ سے جامعہ کی سب سے بالائی منزل میں تھا، بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوتی۔

مولانا سے ملنے میں دو باتوں کا ضرور احساس ہوتا، ایک ان سے عزیزانہ قربت کا جو ایک خاندان کے افراد ہونے سے محسوس ہوتی ہے۔ اس کی وجہ خواہ نسبی اشتراک ہو (اشتراک بعید سہی) خواہ انکی طبیعت کی افتاد جس کے خمیر میں محبت و شفقت تھی، دوسرے ذوقی و علمی مناسبت، مولانا عالموں میں عالم تھے، ادیبوں میں ادیب،

مورخوں میں مورخ فقیہوں میں فقیہہ، محدثوں میں محدث، مفسروں میں مفسر، فارسی اردو کا ان کو یکساں مذاق تھا، شعر و شاعری کا ذوق اور سخن شناسی و سخن سنجی دونوں سے حصۂ وافر ملا تھا، غرض وہ ہندوستان کی اس گزشتہ تہذیب و ثقافت کی یادگار تھے جب فقیہہ و محدث کے لیے خشک ہونے، اور عالم کے لیے شعر کو غیر موزوں پڑھنے کی شرط نہ تھی، وہ علماء کی اس صف کے آدمی تھے جس کے اولین کرسی نشینوں میں مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا صدرالدین خاں آزردہ اور مولانا امام بخش صہبائی اور متوسطین میں مولانا حالی، مولانا شبلی اور حکیم سید عبدالحیٔ (صاحب گل رعنا) اور متاخرین میں مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوبکر جونپوری تھے، اپنی کم سوادی اور بے استعدادی کے باوجود میرا نشاروں کا اسی ماحول میں ہوا اس لیے مولانا سے ایسی مناسبت محسوس ہوئی جو ان کے بہت سے معاصروں سے محسوس نہیں ہوتی تھی، اور اس میں بہت کچھ دخل انکی اس جامعیت، ادبی ذوق اور لطف مجلس کو تھا جس کی بناپر کہنا پڑتا تھا کہ

وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں

سنہ ۴۸ء میں مولانا کا تعلق حیدرآباد سے ختم ہو گیا اور وہ وظیفہ لے کر گیلانی آ گیے جس کو وہ اپنی کہنی قیام گاہ کہتے تھے، حیدرآباد کے واقعات نے ان کے حساس و درد مند دل کو بڑا صدمہ پہونچایا تھا، وہ لکھ پڑھ کر اپنا دل بہلاتے تھے، اسی زمانہ میں انکی بعض اہم تصنیفات اور طویل سلسلۂ مضامین شایع ہوئے۔

سنہ ۵۰ء میں راقم الحروف اور رفیق مکرم مولانا عبدالسلام ندوی نے ادارۂ تعلیمات اسلام کی طرف سے ایک پندرہ روزہ اخبار "تعمیر" جاری کیا جس کا اصل مقصد مسلمانان ہند کی اس افسردگی اور احساس کہتری اور مایوسی کو دور کرنا تھا جو سنہ ۴۷ء کے انقلاب اور نئے حالات نے ان پر طاری کر دی تھی، مولانا نے اس اخبار سے پورا التعاون فرمایا اور اپنے بعض مضامین سے سرفراز کیا، مولانا کا ایک دیرینہ خیال یہ تھا کہ اسلامیہ کالجوں اور اسکولوں کے بجائے جن کا ایک زمانہ میں ہندوستان میں عام مذاق پیدا ہو گیا تھا اور مسلمانوں کی بہترین تنظیمی و عملی و مالی صلاحیتیں ان پر صرف ہوئیں اس وقت اسلامی اقامت خانوں کی ضرورت ہے جن میں وہ مسلمان طلبا قیام کریں جو مختلف سرکاری و غیر سرکاری مسلمان اور غیر مسلم درسگاہوں سے وابستہ ہوں اور ان کے اندر اسلامی و دینی فضا اور غذا مہیا کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ وہ اپنی درسگاہوں کے لادینی ماحول اور تعلیم کے اثرات سے امکانی حد تک محفوظ اور اسلامی افکار و اخلاق سے متاثر ہوں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تجویز "کم خرچ بالانشیں" کے مرادف اور اسلامیہ کالجوں و اسکولوں سے (جن کی افادیت اب بہت مشتبہ ہو گئی ہے اور جو اب انقلاب حکومت سے اپنی خصوصیات کھوتے چلے جا رہے ہیں) کہیں بہتر نتائج و ثمرات پیدا کر سکتی ہے اور جدید تعلیم کے غیر اسلامی اثرات سے بچانے اور نئی اسلامی نسل کو جس کا جدید

تعلیم حاصل کرنا ایک طے شدہ حقیقت اور ایک ناگزیر ضرورت ہو) مسلمان باقی رکھنے کی واحد شکل ہے، اس وقت عالم اسلام کا سب سے بڑا فتنہ اسی نوخیز نسل کا غیر اسلامی بلکہ معاند اسلام ذہن اور نفاق ہے جس نے تمام اسلامی ممالک کو (جن کی زمام اختیار قدرتی طور پر اسی طبقہ کے ہاتھ میں ہے) الحاد و زندقہ کے دوراہہ پر کھڑا کر دیا ہے اور ایک سخت ذہنی انتشار و کش مکش بلکہ اسلام کے خلاف بغاوت کا علمبردار بنا دیا ہے مولانا کی یہ بڑی دینی بصیرت تھی کہ انھوں نے اسلامی اقامت خانوں کی تجویز پیش کی جو کم سے کم ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس مسئلہ کا ایک عملی اور معقول حل ہے، مولانا نے تعبیر کو اس دعوت کا ترجمان بنانا چاہا اور اس سلسلہ میں ان کے متعدد مکاتیب و مضامین شایع ہوئے، افسوس ہے کہ انکی اس تحریک کو کسی بڑے ادارے یا انجمن نے نہیں اپنایا، اور اس کو تحریک و دعوت نہیں بنایا گیا، ورنہ وہ نہ صرف کالجوں اور اسکولوں کے مقابلہ میں بلکہ ان یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں بھی زیادہ مفید اور انقلاب انگیز ثابت ہوتی، جن پر مسلمانوں کی بہترین طاقتیں اور عظیم قومی سرمائے صرف ہوئے، مولانا کے انتقال کے بعد ان کے شریک کار اور یار غار مخدومی مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے "صدق" کے ذریعہ اقامت خانوں کے قیام کی دعوت پیش کی اور اس کے لیے عملی قدم بھی اٹھایا، خدا کرے مستقبل قریب میں یہ تخیل عالم وجود میں آجائے اور ہندوستان و پاکستان میں اس کا تجربہ شروع کیا جائے۔

وہ اگرچہ اپنے نزدیک ایک "کہف" میں گوشہ نشین و پناہ گزیں تھے، مگر باہر کی دنیا سے باخبر رہتے تھے اور باخبر رہنا چاہتے تھے، مطالعہ و تصنیف و تحریر کا سلسلہ قوت کے ساتھ جاری تھا، راقم سطور کا معمول تھا کہ اس کی کوئی چیز شائع ہوتی تو خصوصی مناسبت و تعلق کی بنا پر مولانا کی خدمت میں ضرور بھیجتا، اور مولانا اس پر اپنے تاثرات و جذبات کا اظہار فرماتے، ان تاثرات سے ان کے درد مند دل کا پورا اظہار ہوتا اور معلوم ہوتا کہ "امت" کے حالات سے ان کو کیا تعلق ہے، ۱۹۵۱ء میں یہ ناچیز جب حجاز و شرق وسطی کی سیاحت سے واپس آیا تو بعض دوستوں نے ان ریڈیائی تقریروں کا جو دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئی تھیں ترجمہ شایع کر دیا میں نے وہ کتابچہ مولانا کی خدمت میں بھی بھیجا، مولانا نے ان الفاظ میں اسکی رسید عنایت فرمائی۔

"کتنے ذوق و شوق کے ساتھ آپ کی کتاب شرق وسطی والی اپنے ہاتھ میں لی، لینے کے ساتھ پڑھ گیا، لیکن آپ نے پیاس بھڑکا دی، امیدوار بنا کر چھوڑ دیا، کاش! آپ کا روزنامچہ شائع ہو جاتا، تاہم جو کچھ بھی اس میں آ گیا غنیمت ہے، فلسطین کے اس پیر مرد کی بات دل کو بہت بھائی کہ سمندر کی مچھلیوں میں اگر جنگ ہو تو انگریز کی شرارت سمجھو، اپنا خیال بھی یہی ہے، اسی لیے اس دور کو "کہفی دور" سمجھے ہوئے ہوں، تا اینکہ ملا میذا لشیطان کا دور ختم ہو۔

آپ نے اس سفر میں زیادہ تر ندوی الطبع حضرات سے ملاقات کی، دیوبندی الفطرت بشکل دو ایک سے زیادہ نہ ملے، میری آرزو یہ تھی کہ حضرت شہید کے کچھ نمونوں کی تلاش کرنے میں بھی آپ کامیاب ہوئے ہوں گے، مگر شاید پیداوار کا سلسلہ اس راہ میں غالباً بند ہو چکا ہے۔" (۲۰ فروری ۱۹۵۳ء)

بالآخر وہ عربی روزنامچہ "مذکرات سائح فی الشرق العربی" بھی شائع ہو گیا، اور حسب معمول مولانا کی خدمت میں پیش کیا گیا، مولانا عربی ممالک کے دینی زوال اور جذبۂ اسلامی کے ضعف کے واقعات سے بڑے متاثر و غمگین ہوئے اور کتاب پڑھتے ہی یہ مکتوب گرامی ارسال فرمایا جو درد و اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔

آپ کا ہدیہ سنیہ یعنی عربی سفرنامہ کئی دن ہوئے موجب سرفرازی ہوا چونکہ "الفرقان" میں اس سفرنامہ کی متعدد قسطیں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی تھیں، خیال گزرا کہ وہی مضامین عربی زبان میں ہوں گے، تاہم پڑھنا شروع کیا، اب خدا جانے میرے حافظہ کی کمزوری کا نتیجہ تھا، یا کیا تھا کہ مجھے تو اب آپ کی اس کتاب کی ہر ہر سطر نئی معلوم ہوتی چلی جاتی تھی بڑھتا جاتا تھا اور استغراق و انہماک بڑھتا جاتا تھا، شاید دو دن میں ختم ہوا، ختم کیا ہوا، ایسا معلوم ہوا کہ میں خود ختم ہو گیا، پرانے ناسور جو دل میں پڑے ہوئے تھے تر و تازہ ہوتے چلے جاتے تھے، چند دن ایسے حال میں گزرے کہ گویا ایک قسم کا جنون مسلط ہو گیا ہے، عرب، مصر، سوریہ، سوڈان کے مسلمانوں کا حال جب اس حد تک خراب ہو چکا ہے تو پھر اب غریب اسلام کہاں پناہ لے گا؟ مرحوم ڈاکٹر اقبال کا شعر بار بار زبان پر جاری تھا۔

اس راز کو اب فاش کر اے روح محمدؐ
اس عہد میں اب تیرا مسلمان کدھر جائے

زیادہ سے زیادہ امید کی کچھ کرنوں کا سراغ آپ کے بیان کے مطابق الاخوان[1] میں ملتا تھا لیکن آپ ہی نے ان کے لیے جو ہدایتی رائے متعین فرما دیا تھا، اس راہ پر وہ کبھی تو نہ چلے، حال کے واقعات سے[2] اس کی تصدیق ہی ہو گئی، گویا مادہ برآمد کے مصداق درحقیقت وہ بھی تھے، بس تڑپ رہا ہوں، کراہ رہا ہوں، کیا ہوگا

---

[1] اشارہ ہے راقم سطور کے رسالہ ارید ان اتحدث الی الاخوان کی طرف [2] اخوان کی عملی سیاست میں شرکت

اور روطہ سے دین کا سفینہ کیسے نکلے گا، بھلا جب اپنے ہاتھوں سے مسجدوں میں مسلمان تصویریں لٹکانے لگے[1] اور دنیائے اسلام کے سب سے بڑے دینی مرکز[2] کے علماء نے اعفاء اللحی کا ترجمہ عفت الدیار محلہا و مقامہا[3] کی روشنی میں کرکے اسی پر اجماع منعقد فرمالیا ہو تو دین کو اب ہم کہاں ڈھونڈیں؟ کیا عرض کروں منہ لپیٹے آپ کی کتاب پڑھنے کے بعد پڑا ہوا ہوں امر جستجو ان اصحاب الکہف والرقیم کانوا من آیتنا عجبا معلوم ہوتا ہے کہ دل کے اندر کوئی پڑھ رہا ہو فلعلک باخع نفسک علی آثارهم ان لم یومنوا بھذا الحدیث اسفا، کا مطلب اب سمجھ میں آتا ہے، عقیدۂ ولدیت کے آثار[4] کھاں تک پھونک چکے ہیں؟ بھروسہ اسی پر ہو کہ قرآن کے بعد نہ کوئی کتاب ہی نازل ہونیوالی ہے اور نہ محمد رسول اللہ کے بعد کوئی رسول آنیوالا ہو، مسلمانوں کا حشر جو کچھ بھی ہو لیکن "الاسلام" کو خدا کی پیدا کی ہوئی دنیا سے کون نکال سکتا ہے؟

(۱۰ر نومبر ۱۹۵۴ء)

دسمبر ۵۳ء میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کا حادثۂ ارتحال پیش آیا، ہم لوگوں نے ارادہ کیا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طرف سے ایک ایسا سنجیدہ وعلمی اجتماع منعقد کیا جائے جس میں سید صاحب کے مختلف علمی کمالات اور دینی و تصنیفی خدمات پر علمی مقالات پڑھے جائیں، ہم لوگوں کو سید صاحب مرحوم اور مولانا مناظر صاحب کا باہمی تعلق و ارتباط معلوم تھا، عرصہ سے مولانا لکھنؤ بھی تشریف نہیں لائے تھے اور ان کے احباب وعلمی تلامذہ ان کی تشریف آوری اور لطف صحبت کے آرزومند تھے، میں نے آپ کی خدمت میں عریضہ لکھا اور یہ عرض کیا کہ خواہ مجھے خود حاضر ہونا پڑے لیکن یہ زحمت آپ کو نیازمندوں کی خاطر برداشت کرنی پڑے گی، مولانا کی صحت عرصہ سے کمزور تھی وہ پہلے سے سفر کے بارے میں بڑے کمزور اور ضعیف الارادہ واقع ہوئے تھے، قلبی شکایت نے ان کو اور بھی محتاط بنادیا تھا اور وہ سفروں کے سلسلہ کو بالکل بند کرچکے تھے، اندیشہ تھا اور ان کے دوستوں نے پیش گوئی کی تھی کہ وہ سفر پر آمادہ نہ ہوسکیں گے، مگر خلاف توقع انھوں نے یہ دعوت قبول فرمالی، اس کا سبب صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ اس جلسہ کی نسبت ان کے ایک محبوب دوست اور فاضل معاصر سے تھی جو اس وقت دنیا میں نہیں ہے زحمت اٹھاکر اور صحت کو خطرہ میں ڈال کر بھی اس میں شرکت کرنا ان کے نزدیک شرافت اور حق کے اعتراف کی دلیل تھی اور ان کی فطری سیادت ان کی متقاضی تھی، حقیقت میں شرافت علو نفس اور مکارم اخلاق کے ظہور کے یہی مواقع ہوتے ہیں، بہت سے اکابر و مشاہیر تو ایسے دیکھے گیے ہیں جو اپنے نامور معاصر اور دیرینہ رفیق کے انتقال

---

[1] سوڈان میں بعض مسجدوں میں وہاں کے مشہور شیخ طریقت السید علی میرغنی پاشا کی تصویریں آویزاں ہیں [2] جامعہ ازہر مصر [3] اعفاء کے معنی چھوڑنے اور بڑھانے کے ہیں، عفا یعفو کے معنی مٹنے کے ہیں، یہ مصرعہ لبید کے معلقہ کا ہے۔ [4] مولانا کا مستقل خیال تھا کہ موجودہ مغربی تمدن مسیحیوں کے عقیدہ ولدیت کا نتیجہ ہے ملاحظہ ہو سلسلۂ مضامین دجالی فتنہ "الفرقان"

کے بعد زبان پر ان کا ذکر لانا بھی اپنی عظمت و خودداری کے خلاف سمجھتے ہیں، مولانا کا یہ مکتوب (جس میں انھوں نے سفر کی آمادگی ظاہر کی ہے) لفظاً بلفظ پڑھنے کے قابل ہے اور ان کی شرافت نفس علو فطرت اور لطیف جذبات و احساسات کی ایک تاریخی دستاویز ہے جس کو ان کا سوانح نگار کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔

۰ر دسمبر ۱۹۵۳ء
گیلانی (بہار)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

سلیل الکرام البررہ برادر عزیز محترم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب وفقکم اللہ لما یحب ویرضی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ جی ہاں! نوازش نامہ کے جواب ہی کی فکر میں تھا کہ اچانک اس دینی و علمی حادثہ کی خبر نے دل و دماغ میں ہلچل ڈال دی۔ مرحوم نور اللہ ضریحہ کے ساتھ دل کے تعلق کی صحیح کیفیت کا علم اب ہوا ہو کافی مدت گزر چکی ہے، لیکن شاید ہی کوئی گھنٹہ بیداری تک کا ایسا گزرتا ہو جس میں ان کا خیال سامنے نہ آجاتا ہو، اور خیال کیا، کہنے کو کہہ سکتا ہوں کہ ان کا طیف نہیں بلکہ شاید وہی سامنے آجاتے ہیں، اس واقعہ کی توجیہ اب سمجھ میں آئی ہے، آخری حج سے واپس ہونے کے بعد۔ اپنے ایک مکتوب میں سید صاحب مرحوم نے ارقام فرمایا تھا کہ "میں مطاف کے سامنے بیٹھا ہوا تھا، اچانک میری نظر پڑی کہ "تو طواف کر رہا ہے" خیال آیا کہ وہ آتا تو مجھ سے ضرور ملتا، آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ میں خود ملنے کے لیے تیری طرف لپکا لیکن دیکھا کہ تم غائب ہوگیے، پوچھا تھا کہ آخر صوفیوں میں جو مشہور ہے کہ کعبہ میں نماز پڑھتے ہیں۔ کیا اسی کے ظہور کی یہ شکل تھی؟ ان کا شاید یہی آخری گرامی نامہ تھا۔ جواب میں عرض کیا گیا تھا کہ محبت کے یہ سارے کرشمے ہیں ورنہ کہاں یہ سیاہ رو، اور کہاں کعبہ کی نماز و طواف، پہلے تو ان کے اس رقیمہ وداد کو محفوظ کر دیا لیکن خیال گزرا کہ بعد کو کسی کی نظر اس پر نہ پڑ جائے۔ اور خواہ مخواہ کے وہم میں مبتلا ہو۔ دل کا فیصلہ یہی ہوا کہ اسکو ضائع کر دیا جائے۔ جب تک وہ زندہ رہے۔ اس راز کو دل ہی میں دبائے رہا۔ آج پہلی دفعہ آپکے سامنے صرف اس لیے اس واقعہ کا اظہار کر رہا ہوں کہ اپنے حال سے سید صاحب مرحوم کے حال کی توجیہ سمجھ میں آئی ہے، ان ہی کے قلب انور کا عکس ہے کہ غائب ہونے کے بعد حضوری کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ جو کچھ مجھ پر گزر رہی ہے، سمجھتا ہوں کہ کچھ اسی قسم کا حال ان پر بھی گزرا تھا۔ لیکن "الفضل للمتقدم" اور اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی محبت غالب تھی کہ میرے مرنے سے پیشتر اس حال کا تجربہ ان کو ہوا، میرے اندر جو کچھ پوشیدہ تھا اس کا بروز ان کی وفات کے بعد ہوا۔ غفر اللہ لہ ورحمہ۔

اب اس کے سوا دل کی تسلی کے لیے چارہ کار ہی کیا ہے کہنے والے نے کہا تھا

جمال ذی الارض کانوا فی حیاتہم
بعد الممات جمال الکتب والسیر

وفات کی خبر بھی عجب طرح سے ملی، گوشہ خمول سے نکلنے کا سلسلہ قطعی طور پر منقطع ہے لیکن جس رات کو ان کا وقت موعود ان کے سر پہ پہونچا، اسکی صبح کو استھانواں جو دسنہ کے قریب ایک گاؤں ہے میلاد کی مجلس تھی، وہاں کے لوگوں کے شدید اصرار سے اسی مجلس مبارک کی شرکت کے لیے حاضر ہوا۔ راستہ ہی میں تھا کہ ایک صاحب دسنہ کے ملے اور ہوش وحواس پر بجلی اس خبر کو سنا کر گرائی، بولے کہ رات ریڈیو سے دسنہ میں یہ خبر کراچی سے سنی گئی ہو، وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ واقعہ یہ ہو کہ اگر استھانواں جانا نہ ہوتا، تو علی الصباح غالباً ان کے دفن ہونے سے پیشتر اس سانحہ فاجعہ سے آگاہ ہونے کی کوئی شکل میرے لیے نہ تھی۔ اسی وقت جنون میں ایک مرثیہ بھی ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں خود بخود دل میں موزوں پذیر ہوا۔ کچھ اشعار تو اسکے اسی وقت کی مجلس میں سنائے گیے بعد کو اخباروں میں بھیج دیا۔

بہرحال آپ نے ایک ایسی مجلس میں شرکت کی دعوت دی ہے کہ انکار کی گنجائش نہیں پاتا۔ اور گنجائش آپ نے باقی ہی کب چھوڑی ہے۔ اس کے سوا اور کیا عرض کروں کہ صحت کے جس حال میں اس وقت ہوں۔ اگر یہی حال باقی رہا کوئی خاص غیر معمولی بے ترتیبی اس میں پیدا نہ ہوئی۔ تو حق سبحانہ وتعالےٰ کی توفیق کے بھروسہ پر یہ ارادہ کر چکا ہوں کہ جس طرح بھی ممکن ہو۔ اس بابرکت مجلس میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کروں آپ خود یا کسی صاحب کو بھیجنے کی ہرگز ہرگز تکلیف گوارا نہ فرمائیں۔ فقیر خود حاضر ہو جائے گا اور ایک آدمی کو اپنے ساتھ رکھ لے گا۔ ہاں! اگر ممکن ہو۔ تو اس سے مطلع فرمائیں کہ آخر یہ جلسہ عام پبلک کی طرف سے ہو رہا ہے۔ یا ذاتی طور پر آپنے اس بار کو اپنے سر پر اٹھایا ہے۔

آپ نے اپنے اس نوازش نامہ میں اس فقیر کے متعلق جن غیر استحقاقی الفاظ کا استعمال فرمایا ہے ان کو پڑھ کر بے ساختہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی زندگی میں بھی اس کا اعتراف کرتا رہا اور اب تو مجسم اعتراف ہوں کہ ان کے فضائل وکمالات سے دور کی بھی نسبت میرے ہفواتی مزورات کو نہ تھی۔ قلم کے دائرے میں ان کی قلم کاریاں صدیوں تک انشاء اللہ کام آئیں گی۔ دنیا ان کی قدر وقیمت کا اب اندازہ کرے گی۔ بہرحال اب چلئے سعید قلوب کے حسن ظن کو اپنی مغفرت کا ذریعہ سمجھتا ہوں بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ

اس فقیر کے متعلق جو عنوان مقرر کیا گیا ہے۔ مناسب ہے، کہہ نہیں سکتا کہ اب کچھ لکھا بھی جائے گا۔ یا نہیں۔ اپنے مرثیہ میں ایک شعر یہ بھی لکھا تھا کہ

اپنی تحریروں میں خود میری نظر تجھ پہ رہی
رائے کا تیری رہا دل کو ہمیشہ انتظار

یہ عجیب بات ہے کہ اس نفسیاتی کیفیت" کا انکشاف اب مجھ پر ہوا۔ قلم ہاتھ میں لیتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ سید صاحب مرحوم ہی کی نظر سے جب یہ بات نہ گزرے گی تو لکھنے کا فائدہ ہی کیا۔ وہ کہیں ہوں کسی حال میں ہوں، گوشہ خاطر عموماً ان ہی کی طرف رہتا تھا۔ ان کی پاک اور آزاد روح کو خطاب کرکے دعوت دی ہے کہ آپ آیئے اپنے دار المصنفین کی بہاروں کا تماشا کیجئے۔ اسی سلسلے میں ایک شعر یہ بھی تھا

راہ میں آئے گا لکھنؤ اور دریا آباد بھی
ہیں جہاں تھامے کلیجے تیرے کچھ یاران غار

آخری شعر یہ تھا۔

اور ہو دستہ جو آتا تو رہے اس کا خیال
ایک گیلانی میں بھی ہے آرزوں کا مزار

اپنے برادر اکبر محسنی ومحترمی ڈاکٹر صاحب مدظلہ العالی کی خدمت میں فقیر کا سلام عرض کر دیجئے۔ مولانا عبد الباری اور مولانا نعمانی صاحبان کی خدمت میں بھی سلام عرض ہے آخر اس "کھفی" کو کھف سے گھسٹنے کی ایک صورت نکل ہی آئی۔ فقط والسلام

مناظر احسن گیلانی

مولانا اپنے برادر عزیز مولوی مکارم احسن صاحب کی معیت میں تشریف لائے، اور نہایت ذوق و شوق اور محبت و خلوص کیساتھ دو روزہ اجتماع میں شرکت فرمائی، ایک روز کے اجتماع کی صدارت بھی فرمائی اپنا مقالہ (جو حسب معمول طویل، دلچسپ اور پر مغز تھا) سنایا مقالہ سیرت النبیؐ کے حصہ ششم پر ایک مفصل تبصرہ تھا اس میں دکھایا گیا تھا کہ سید صاحب نے اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور اخلاق نبوی پر جو کچھ لکھا ہے وہ اس موضوع پر منفرد چیز ہے اور سید صاحب کے علمی کارناموں میں اس کو خاص امتیاز حاصل ہے، اس مضمون میں انھوں نے جس فراخ دلی، فیاضی اور مسرت کے ساتھ اپنے نامور معاصر کے علمی و تصنیفی مقام اور اسکی عظمت کا اعتراف کیا تھا وہ خود مولانا کی عظمت کی دلیل اور ان کی بے نفسی و خلوص کا روشن ثبوت تھا اور علمائے سلف کی یاد تازہ کرتا تھا۔ مولانا نے میری فرمائش پر اپنی وہ نظم بھی سنائی جو انھوں نے

واقعہ کی اطلاع سن کر لکھی تھی اور بعض اخبارات میں چھپ چکی تھی جس وقت مولانا نے اپنی پر اثر آواز میں اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ وہ نظم سنائی تو سماں بندھ گیا اور بہت سی آنکھیں نم تھیں۔

اجتماع کے علاوہ جو اوقات ملتے تھے وہ مولانا کی پر بہار مجلس کے لیے وقف تھے، اساتذہ وطلبا کا ایک مجمع ہر وقت ان کے گرد رہتا اور حالت یہ تھی کہ

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

اجتماع سے فارغ ہو کر اور مولانا عبدالباری صاحب کے یہاں کچھ وقت گزار کر وہ ہمارے مرکز میں تشریف لے آئے، میں نے ایک روز ان سے ان نعتوں کے سنانے کی فرمائش کی جو انھوں نے پیاری ہندی میں لکھی ہیں اور جو سوامی دھرمی جی گیلانی والے کی طرف سے بعض اخبارات ورسائل میں چھپی ہیں، ان نعتوں میں ان کی محبت سوز اور بارگاہ نبوی سے عاشقانہ تعلق بغیر کسی تکلف کے ظاہر ہو گیا ہے، ہندی کے میٹھے بول، مولانا کا ترنم اور نعت کا موضوع اس سب نے مل کر اس میں عجب دلکشی اور دل آویزی پیدا کر دی ہے، مولانا خود بھی اپنی آنکھوں کو قابو میں نہ رکھ سکتے اور سننے والے بھی متاثر اور آبدیدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکتے، مجھے یہ نعتیں بیحد عزیز ہیں، مجھ پر ان کا ایک احسان بھی تھا، انھوں نے مجھے مدینۂ طیبہ میں بھی کیف وذوق بخشا ہے، کبھی جی چاہتا کہ صرف ان نعتوں کے سننے کے لیے گیلانی کا سفر کروں، ایک پاک قطرۂ اشک اس سفر کو وصول کرانے کے لیے بہت کافی ہے بلکہ

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز !

اب یہ دولت گھر بیٹھے مل گئی تھی اس لیے کیوں نہ اس کی قدر کی جاتی، بار بار فرمائش کی اور مولانا نے بلا کسی تکلف کے فرمائش پوری کی اور "اجلس بنا نؤمن ساعۃ" کا لطف بخشا، افسوس ہے کہ خرابی صحت کی بنا پر مولانا کا قیام طویل نہ ہو سکا، اور مولانا نے وطن کی طرف مراجعت فرمائی اور ہم سب کہتے رہ گئے کہ

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

مولانا کا تعلق خاطر اس ناچیز دبے ہنر سے بڑھتا گیا، اور واقعہ یہ ہے کہ مجھے بھی ان سے جو فکری مناسبت اور قلبی تعلق محسوس ہوتا وہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے اپنے ایک شفیق استاد اور عزیز بزرگ سے ہوتا ہے۔ سنہ ۵۴ء میں مولانا پر پہلی بار قلبی دورہ پڑا اور وہ گیلانی سے پٹنہ لیجائے گئے جہاں عرصہ تک علاج ہوتا رہا، گیلانی واپسی اور طبیعت کے سنبھلنے پر اس ناچیز نے بھی مزاج پرسی کا عریضہ لکھا، اس میں شاید اس شبہ کا اظہار تھا کہ مولانا اپنے اس نیاز مند سے کچھ ناراض یا کبیدہ خاطر تو نہیں ہیں، مولانا نے اس پر ایک نہایت پر محبت و پر شفقت مکتوب لکھا، جس سے ان کے تعلق کا پورا اظہار ہوتا ہے اور اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کیسا محبت سے لبریز دل عطا فرمایا تھا۔

" ابھی ابھی آپ کا نوازش نامہ کیا آیا کہ دیر تک بکا ئی کیفیت میں الٹ پلٹ ہوتا رہا، اللہ اللہ آپ کے قلب مبارک میں خواہ بشکل وسوسہ ہی سہی یہ خیال کیسے اور کیوں آیا کہ

اس مخلص نیاز مند کے دل میں آپکی طرف سے کسی قسم کا تغیر پیدا ہو گیا

واللہ جن ہستیوں کی محبت و اخلاص کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتا ہوں انکی طرف سے تغیر پیدا ہونے کی شکل ہی کیا ہے وانشدکم باللہ

حقہ مہر جاں مہر ونشان ست کہ بود

اپنی علالت کے ایام میں جب یہ محسوس ہوتا تھا کہ شاید اپنی یہ آخری علالت ہے تو من جملہ دوسرے خیالات کے ایک خیال آتا تھا جسے شیخ شاذلی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف لوگوں نے منسوب کیا ہے یعنی وفات کے وقت زبان مبارک پر جاری تھا

اھیم بلیلی ما حییت وان أمت
أوکل بلیلی من یھیم بھا بعدی

پہلے مصرعہ کا مصداق تو کسی حیثیت سے اپنے آپ کو قرار دینے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا لیکن دوسرے مصرعہ میں جس آرزو کا اظہار کیا گیا ہے یہ آرزو اپنے ساتھ بھی آتی اور معاً اسی کے ساتھ آپ کا وجود متمثل ہو کر سامنے کھڑا ہو جاتا، بیماری کے ان طویل دنوں میں کچھ دن بے ہوشی نیم بے ہوشی میں بھی گزرے، لیکن با ایں ہمہ آپکی نقل وحرکت کی خبریں کسی نہ کسی ذریعہ سے ملتی رہتی تھیں، رشک ضرور آتا تھا، جب کوہڑی میں مولانا عبدالقادر مدظلہ العالی کی مجلس ذکر میں شرکت کا موقعہ حق تعالےٰ کی طرف سے آپ کے لیے مہیا کیا گیا، بڑے مبارک دن تھے جو آپ کے گزرے۔

(۲۹ر ستمبر ۵۴ء)

مولانا کی علالت کا سلسلہ چلتا رہا اور ایسے وقفے بھی آتے رہے کہ مولانا بالکل صاحب فراش رہے، اور کبھی کبھی تو زندگی خطرہ میں نظر آتی، با ایں ہمہ مولانا کا علمی ذوق اپنا کام کرتا رہتا، ذرا طبیعت سنبھلتی تو لکھنے پڑھنے کا کام شروع کر دیتے، اپنے دوستوں اور نیاز مندوں کی کسی تحریر یا تصنیف سے متاثر ہوگئے تو اپنے تاثر کی اطلاع دیتے اگر کوئی اہم تصنیف شائع ہوتی اور مولانا کو نہ بھیجی جاتی تو شکایت فرماتے، اس خط سے انکے

علمی وادبی ذوق وشغف کا اندازہ ہوگا جو گویا بستر علالت ہی سے لکھا ہے

"اگر یہ خیال فرما لیا گیا تھا کہ جو بیمار، آخر بیم وامید کی کش مکش سے نجات پاکر وہاں پہونچ گیا یا پہونچا دیا گیا جہاں سے پہونچنے والوں نے یہ نعرہ بھی لگایا ہے کہ

تعالی اللہ ازیں بہتر چہ باشد
کہ از ننگ وجود خویش رستم

"سید احمد شہید" غلام رسول مہر کے تقریظی مضمون[1] کو پڑھ کر خصوصاً مہر صاحب کے حسن انتخاب کی داد فارسی اشعار کے متعلق جو دی گئی ہے، واقعہ یہ ہو کہ اکثر شعروں نے اسکو بھی زندوں کی طرح تڑپا دیا جسے مردہ تصور فرما لیا گیا ہے، بہرحال بیماری نے تو پیچھا نہیں چھوڑا ہے لیکن کش مکش سے ابھی نجات بھی نہیں ملی ہے، بلکہ ادھر کچھ مہینہ ڈیڑھ مہینہ سے کہہ سکتا ہوں کہ شکایات بے شمار کے بعض پہلوؤں میں گونہ تخفیف کی کیفیت محسوس کرتا ہوں۔

البعث الاسلامی[2] کا دوسرا شمارہ بھی باصرہ نواز ہوا، بڑے حوصلہ اور بڑی ہمت کا کام ہے، خدا کرے کہ ہمارے مدارس کے خوابیدہ بزرگوں کو جھنجھوڑنے میں یہ آواز کامیاب ہو۔"

کچھ تو مولانا کی افتاد طبع اور شاید خاندانی لینت ورفق اور کچھ جامعہ عثمانیہ کے طویل تعلق اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور نئی نسل کے مسلسل سابقہ نے مولانا کی تحریر وتعبیر میں جدید ذہن کی رعایت اور دینی حقائق کے بیان کرنے میں حکمت وتدریج کا پہلو غالب کر دیا تھا اور وہ گویا کلموا الناس علی قدر عقولھم کے مشورہ پر عمل فرماتے تھے اور ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ کی تعمیل خیال فرماتے تھے، وہ اپنے عقائد وخیالات اور علم میں پورے راسخ ومتصلب تھے، لیکن اپنے طرز بحث، اور طرز تحقیق واستدلال میں بالکل عصری اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ وہ دیوبندی العلم مگر ندوی الفکر یا ندوی القلم تھے، اور شاید یہی ہم لوگوں سے اور بالخصوص اس راقم سطور سے مناسبت کی وجہ تھی، ہمارے محترم ومخدوم مولانا عبدالباری صاحب ندوی العلم اور ندوی القلم ہونے کے باوجود اور برسوں یونیورسٹی میں فلسفہ کا درس دینے

---

[1] سید احمد شہید مصنفہ مولانا غلام رسول مہر پر مفصل تبصرہ شائع شدہ "الفرقان"

[2] عربی ماہوار رسالہ۔

کے بعد بھی تحریر و تعبیر میں بھی کسی قسم کا اوپرا او جدید اسلوب بیان یا اسلوب استدلال پسند نہیں فرماتے، مولانا گیلانی کی کتاب اسلامی معاشیات پہلے طرز فکر اور طرز تحریر کا نمونہ ہے اور مولانا عبد الباری صاحب کی کتاب "تجدید معاشیات" دوسرے طرز فکر اور طرز تحریر کا، جب وہ شائع ہوئی تو شاید مولانا گیلانی کو محسوس ہوا کہ وہ ان کی کتاب کا جواب ہو، شاید اسی سلسلہ میں دونوں مخلص دوستوں اور دیرینہ رفیقوں میں کچھ مراسلت بھی ہوئی اور ہر ایک نے اپنا نقطہ نظر پیش کیا، مجھے اس کی اطلاع نہیں لیکن مجھے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

> (تھانوی المذاق ندوی القلم) بزرگ کا معتوب بنا ہوا ہوں، کہ ان کی تازہ کتاب "تجدید معاشیات" کو اپنی کتاب "اسلامی معاشیات" کا تعریضی جواب خاکسار نے خیال کر لیا، خاکسار نے بھی اور ان کے دوست "صاحب صدق" نے بھی، مقصد میں ہم دونوں متحد ہیں، لیکن پانی مانگنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ پن بھرن سے کہا جائے ماں! ذرا پانی پلا دے لیکن ماں! کی جگہ کچھ دوسرے الفاظ دالہ علی الاموست کا ذکر کیا جائے تو یقیناً اثر بدل جائے گا، حضرت تھانوی ہی سے یہ لطیفہ سنا کرتا تھا، بہر حال حکم فاصدع بما تؤمر کا بھی ہے اور ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة کا بھی، مکلفین کے اختیار تمیزی کی یہ بات ہے کہ وقت کس کا ہے؟
>
> (۲۷ دسمبر ۱۹۵۵ء)

لیکن مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ توسع اور ان کی تمام عصریت و حکمت تحریر و تعبیر اور استدلال ہی میں تھی، عقائد و نصوص اور حدود دین کے بارے میں وہ اتنے ہی متصلب و متشدد اور ویسے ہی غیور و حساس واقع ہوئے تھے جیسے ان کے اساتذہ و شیوخ کرام اور علمائے حق، جب کبھی وہ تحریف دین کی کوئی کوشش یا دین کی ترجمانی میں کوئی بے اعتدالی یا آزادی یا غلط اجتہاد دیکھتے تو برداشت نہ کر سکتے، مولانا سندھی مرحوم جب ہندوستان واپس آئے تو ان مرحوم نے بعض ایسے خیالات اور افکار کا اظہار کرنا شروع کیا، جن میں توازن کی بڑی کمی تھی اور جو بڑی غلط فہمیوں اور مغالطوں کا باعث ہو سکتے تھے، ان کے کسی مضمون میں قرآن و حدیث و فقہ سے متعلق بعض ایسے نظریات و "تحقیقات" تھے جو جمہور اہل اسلام کے عقیدہ سے مختلف تھے یا ان کی تعبیر میں کوتاہی تھی، مولانا نے مذہبی و جماعتی عصبیت سے بالکل بے نیاز و بالاتر ہو کر اس مقالہ کی تردید میں ایک پرزور مقالہ لکھا، بعض اہل علم معاصرین مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم سے ذاتی واقفیت کی بنا پر ان کو اس شدید مخالفت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے، انھوں نے مولانا کی طرف سے کچھ صفائی پیش کی

اور اپنے ذاتی معلومات کی بنا پر ان کے ساتھ نرمی اور حسن ظن کی تلقین کی، مولانا نے اس موقع پر اپنے موقف کی حمایت کی اور مولانا سندھی مرحوم سے اظہار اختلاف اور ان کے افکار و آراء کی کھلی ہوئی تنقید و تردید کو دین کی حمایت کا تقاضا سمجھا، مندرجہ ذیل اقتباس سے ان کے دینی جذبہ اور تصلب فی الدین کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

> "میرا تو مقصود یہی اس سے ع حدی را تیز ترمی خواں چو ذوق نغمہ کم یابی تھا یہی بتانا چاہتا تھا کہ خواہ وہ ہماری جماعت ہی کا آدمی کیوں نہ ہو، لوگوں میں اسکی بڑائی جس حد تک بھی مسلم ہو لیکن حق کا قدم جب درمیان میں آئے گا تو پھر کسی کا کچھ لحاظ نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ کوئی ہو ولوان فاطمۃ بنت محمد اعاذھا اللہ تعالیٰ سرقت لقطعت یدھا ہمارے دین کا امتیازی نشان ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا مرنے سے پہلے العیاذ باللہ میں بھی اس کا قائل ہو جاؤں گا کہ ابو حنیفہؒ کی فقہ عجمیوں کے قانون سے متاثر ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سرزمین عرب کے ایک خاص تاریخی دور کی اصلاح کی حد تک محدود ہے، قرآنی قوانین کی حیثیت صرف مثالی باتوں کی ہے، بخاری و مسلم انجیل و توراۃ جیسی محرف کتابوں کے ہموزن ہیں۔ العیاذ باللہ کیا میں اپنی خودی کے اعتماد کو خدا اعتمادی سمجھنے لگوں گا، قبل اسکے کہ میرے اندر خدانخواستہ اس قسم کے خیالات کی صداقت واضح ہو، اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس دنیا سے اٹھالے"۔
>
> (۱ر نومبر ۱۹۴۵ء)

اس اقتباس سے جو اپنی حمیت اور حفاظت دین کے جذبہ میں ڈوبا ہوا ہے، اندازہ ہو سکتا ہو کہ عقائد و نصوص اور دین کی ہیئت و حقیقت کی حفاظت میں مولانا کا قدم اور قلم کسی بڑے سے بڑے عالم راسخ سے پیچھے نہیں، دراصل ان کا سارا توسع طرز تحریر و طریقۂ تفہیم میں تھا، ان کی کتابیں اور مضامین نئے اسلوب میں لکھے گئے ہیں اور کہیں کہیں تو وہ اپنی کتابوں میں تاریخی مواد اس سلیقہ اور ترتیب سے پیش کرتے ہیں، اور اپنے دعوے کو ایسے علمی و تحقیقی انداز میں ثابت کرتے ہیں کہ وہ ایک قدیم مدرسہ کے فاضل اور ایک فقیہ و محدث ظاہر ہونے کے بجائے عصر حاضر کے مصنف اور اجتماعیات و علوم عمرانیہ کے فاضل معلوم ہوتے ہیں، نمونہ کے طور پر مولانا کا مضمون[۱] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب پر اور مولانا کی محققانہ کتاب "مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت"

نیز "اسلامی معاشیات" اور "امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی" ملاحظہ ہوں، مولانا کی اسی جامعیت نے ان کو اپنے معاصر علماء میں ایک امتیاز بخشا تھا، اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو ان کی تصنیفات کا گرویدہ بنا دیا تھا،

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق

جامعہ عثمانیہ اور حیدرآباد کے قیام نے مولانا کے اندر ایک تبدیلی اور پیدا کر دی تھی، یا یوں کہیے کہ ان کے اندر کی ایک دبی ہوئی صلاحیت کو ابھار دیا تھا وہ یہ کہ نئے تعلیم یافتہ طبقہ کے بہت سے افراد کے مشاہدہ و تجربہ نے ان کو اس نتیجہ پر پہونچا دیا تھا کہ صرف ظاہری شکل و صورت پر کسی شخص کے قبح باطن یا اس کے بیدین ہونے کا فیصلہ نہ کیا جائے، نیز یہ کہ اس کے قلب و اندرون کی اسلامیت کی قدر کرتے ہوئے اس کے ظاہر کی اصلاح کی کوشش کی جائے، اس طرز فکر اور اس طرز عمل کے بغیر کوئی شخص جدید حلقہ میں کوئی اصلاحی و دینی خدمت انجام نہیں دے سکتا۔

یہ راقم حروف جب ۵۱ء میں دمشق گیا تو وہاں اس نے مسلمان نوجوانوں اور خاص طور پر جماعت اخوان سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں میں یہی دو متضاد پہلو پائے، ایک طرف ان کی ظاہری شکل و صورت ہم جیسے مذہبی اشخاص کے لیے انقباض و اعتراض کا موجب تھی، دوسری طرف ان کی ایمانی کیفیات، ان کا جذبہ اسلامی، ان کی حمیت دینی، ذوق جہاد، نمازوں کی پابندی، حرب قوم پرستی سے بیزاری اور رشتہ اسلامی پر کامل یقین، الحاد اور اہل الحاد سے عداوت موجب مسرت و انبساط تھی، اور بالآخر یہ دوسرا تاثر پہلے تاثر پر غالب آجاتا، میں نے مولانا کی خدمت میں دمشق سے جو پہلا خط لکھا اس میں اپنی اسی ذہنی کش مکش اور تاثر کا اظہار تھا، مولانا نے اس کا جو جواب دیا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

"بڑی مسرت اس بات سے بھی ہوئی کہ مسلمانوں کی نئی پود کے متعلق آپ پہلے آدمی ہیں جن کے قلم سے میری آنکھوں نے وہی لکھا ہوا پایا جس کا برسوں سے انتظار کرتا رہا، ممکن ہے کہ یہی نقطۂ نظر دوسرے ارباب فکر و بصیرت کا بھی ہو لیکن جن جنچے تلے الفاظ میں اپنے احساسات کا اس سلسلہ میں آپ نے اظہار فرمایا ہے خاکسار تو نکتہ چینوں سے اتنی جرأت بھی نہیں کر سکتا، قالب و قلب میں اختلاف کی یہ صورت جب پیش آجاتی ہے تو قلب ہی پر زیادہ نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، میرے خیال میں تو قالب و قلب یا ظاہر و باطن کے اختلاف کی یہ شکل اسلامی تاریخ میں نئی نہیں ہے، آغاز تو عہد صحابہ ہی میں معلوم ہوتا ہے کہ ہو چکا تھا، عمامہ پر "پر عقاب" لگا کر مدینہ میں داخل ہونے کا واقعہ کیا آپ کا ہے؟ اور "پر خضاب" ہو گیا آخر کے استعمال کی کثرت کے ساتھ ساتھ خود مدینہ منورہ کے باشندوں میں، تابعین و تبع تابعین ہی کے

عہد سے جو تبدیلیاں لباس میں وضع میں قطع میں رہنے سہنے کے طریقوں میں مسلسل ہوتی رہی
تاریخ ان کی شہادتوں سے معمور ہے، لیکن قلب اگر درست ہے تو قالب کی ان تبدیلیوں
کو اکابر برداشت ہی کرتے چلے آرہے ہیں، اخوان شام کے دینی جوش وخروش، اخلاص
وصداقت النصح للہ ولرسولہ وللمؤمنین کی جن قلبی خصوصیتوں کا آپ نے
ذکر فرمایا ہو اس کو جانتے ہوئے صرف قالب کے مطالبات میں ان کی کوتاہیاں اپنا
خیال تو یہی ہے کہ درگذر کے قابل نہ بھی ہوں لیکن تولیتن کا مستحق ان کو ضرور بنادیتی
ہیں، ہمارے علماء اگر فظاظت وغلظت ہی سے اس سلسلہ میں کام لینا ضروری فرماوینگے
تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کا فیصلہ محکم (لانفضوا من حولك) کی شکل میں ان
کے سامنے نہ آئے؟

(۲۸ مئی سنہ ۱۹۵۶ء)

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ مولانا کو تاریخ اسلام سے فطری ذوق اور اس سرزمین سے جہاں
اس تاریخ کی بنیاد پڑی ہے ایک فطری لگاؤ تھا، شاید اسی راستہ سے ان کو عالم اسلام بالخصوص بلاد عربیہ کی سیاحت
کا بڑا ارمان اور دیرینہ تمنا تھی، رسالہ "صبح صادق" لکھنؤ میں میرے خواہرزادہ عزیز مولوی محمد ثانی سلمہ کا سلسلۂ
مضامین "یہاں مسلمان بستے ہیں" کے عنوان سے نکلتا رہتا ہے جس میں مختلف ممالک اسلامیہ کا تعارف ہوتا ہے، مولانا
نے لکھنؤ آمد کے موقع پر بتلایا کہ وہ اس کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں، اس تقریب سے انھوں نے اپنے شوق
سیاحت کا تذکرہ اور اسکے بعض ابتدائی اقدامات کا ذکر فرمایا، راقم سطور نے دمشق پہونچ کر جس ہوٹل میں قیام کیا تھا
حسن اتفاق سے اس کا نام "الیرموك" تھا، میں نے مولانا کی خدمت میں وہیں سے خط لکھا، دمشق پھر یرموک
کے نام نے مولانا پر ایک وجد کی کیفیت طاری کردی اور باوجود آخری علالت اور نقاہت کے ان کے قلم میں
جوانی کی توانائی اور رعنائی پیدا ہوگئی اور میرے خط کے جواب میں انھوں نے یہ وجد انگیز خط لکھا، جو ان
کی ممتاز ادبی تحریروں میں شامل کیے جانے کا مستحق ہے۔

"کس نے کہاں کن حالات میں اس زار ونزار، بیمار دور افتادہ دہقانی کو یاد فرمایا،
سوچتا ہوں اور گو کھڑا ہونا بھی میرے لیے آسان نہیں ہے مگر بے ساختہ جی چاہتا
ہے کہ سجدۂ شکر یاد دلانے والے کے قدموں پر ادا کر کے رقص کروں، خدا ہی
جانتا ہے کہ الیرموک کی موجوں نے کن دبے دبائے تاریخی محفوظات اور ان سے
پیدا ہونے والے جذبات میں طوفانی ہل چل برپا کردی ہوگی، جب اپنے آپ

کو اس حال میں پا رہا ہوں کہ مکتوب گرامی میں صرف الیرموک کے لفظ پر نظر پڑتے ہی تخیل کو آپکے مشاہدے سے جو تھوڑا بہت سہارا ملا تو گھنٹوں یرموک اور جو کچھ اس کے ساحل پر گزرا اسی میں غرق ہو گیا الواقوصہ کی وادی میں پہاڑوں کے کھڈ میں ٹپک ٹپک کر کافر گر رہے ہیں اور ان کی بڑی تعداد یرموک برد ہو رہی ہے ہم آگے بڑھ رہے تھے، دنیا پیچھے ہٹتی جاتی تھی، پھر بازی پلٹی ہوا جو کچھ ہوا، یہی کیا غنیمت نہیں ہے کہ الیرموک کے کنارے مسلمانوں کا پھریرا لہرا رہا ہو، فندق الیرموک ٹھہرے چاہیے تو یہی تھا کہ کافی فاصلہ پر ہو گو اس عہد میں مسافت و فاصلہ کا سوال باقی نہیں رہا ہو یا آبادی دمشق کی پھیل کر الیرموک تک پہونچ گئی ہو۔[1]

بہرحال آپنے بڑا احسان کیا جس سرزمین برکتوں سے بھری ہوئی کا تصور سالہا سال تک پالتا رہا ہوں اسکی چشم دید جھلک آپکے موئے خامہ کے ذریعہ اس کوردہ گاؤں میں پہونچ گئی فجزاکم اللہ عنا خیر الجزاء۔

دمشق کے نام سے مولانا کے تاریخی اور علمی ذوق میں حرکت پیدا ہوئی، اور ان کے تصور نے ان کو ایک گاؤں کے گوشۂ عزلت اور بستر علالت سے اٹھا کر شام کے قدرتی مناظر، تاریخی مآثر اور علمی مراکز میں پہونچا دیا اور وہ یہ بالکل بھول گیے کہ وہ قلب کے مریض اور بقول خود ایک کہف کے گوشہ نشین ہیں، فرماتے ہیں:۔

"واقعی آپ کا وجود مسعود اس وقت کم از کم میرے لیے سراسر رشک و غبطہ بنا ہوا ہے، خیال شام کے ان مناظر کا ایک طرف ستاتا ہے جن کی تفصیل کرد علی صاحب کے خطط الشام میں پڑھ چکا ہوں، اور دھیان ان اسلامی تعمیرات کی طرف منتقل ہوتا ہو جنھیں عمر بن عبد العزیز جیسے بزرگوں نے اس لیے باقی رکھا کہ وہ غیظ القلوب الکفار نظر آتے ہیں، سب سے زیادہ تڑپ دل میں ان کتابوں کی پیدا ہو رہی ہے جن سے شام کے کتب خانے پٹے پڑے ہوں گے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ و ابن قیم، علامہ ذہبی السبکی و آلہ کے وطن میں جو کچھ مل رہا ہو اسے ملنا ہی چاہیے، یوم المحاضرہ کے بعد تو ہفتہ بھر آپ کا ان ہی چیزوں کی سیر و تماشے میں بسر ہوتا ہوگا،

---

[1] دراصل ہوٹل کا نام صرف تبرکاً الیرموک رکھا گیا ہے، ورنہ الیرموک کے نام کا دریا اور اس کے ساحل کا میدان جنگ دمشق سے بہت فاصلہ پر شرق اردن کے حدود میں واقع ہے، علی

معلوم نہیں کہ دول الاسلام ذہبی کا مکمل نسخہ اور مرآۃ الزمان ابن الجوزی السبط کی طباعت کا انتظام کیا گیا ہو، جی چاہتا تھا کہ مرنے سے پہلے کم از کم دونوں کتابوں کے مطالعہ کا موقعہ مل جاتا، ابن عساکر کی تاریخ دمشق خدا جانے مکمل ہو کر بازار میں آگئی یا نہیں، میرے پاس تو صرف ابن بدران کی تلخیص کی ساتویں جلد تک ہے، کیسی عجیب بات ہو کہ دو مختلف وادیوں کے شیخ یعنی شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور الشیخ الاکبر ابن عربی دونوں کے لیے دمشق کے آغوش میں جگہ نکل آئی، اس زمانہ میں شیخ الاسلام کے عقیدت مندوں کی تو کافی جماعت ہو گی کیا بے چارے الشیخ الاکبر کی اکبریت کو باقی رکھنے کے لیے بھی کوئی کھڑا کر دیا گیا ہے، ابن تیمیہ اور ان کے تلامذہ راشدین کی کوئی غیر مطبوعہ نادر کتاب آپ کی پسند کی کیا ملی؟ ان بزرگوں کے لیے تو یورپ کے عصری مذاق کی رو سے چاہیئے تھا کہ الگ الگ سوسائٹیاں شام میں بن جائیں جو ان کی اصل کتابوں کو بھی شائع کرتیں اور ان کے علمی و نظری اختراعات و تخلیقات کا کام کرتیں، یہ اور اسی قسم کے وساوس و اوہام میں اپنے بستر علالت پر دو ڈھائی سال سے کروٹیں بدل رہا ہوں"

(۸ مئی ۱۹۵۶ء)

اس مکتوب گرامی کا جواب دینے کی نوبت نہ آئی تھی کہ ترکی کا سفر پیش آگیا، قسطنطنیہ سے تو کسی خط کے لکھنے کی نوبت نہ آئی کہ سارا دن وہاں کے تاریخی آثار کے دیکھنے میں گزر جاتا مگر قونیہ پہونچ کر اور مولانا روم کے مزار کی زیارت کر کے بے اختیار مولانا یاد آئے اور ان کو اور مخدومی مولانا عبدالماجد دریابادی کو اپنے تاثرات لکھنے کا جی چاہا، وہیں قونیہ کے یک روزہ قیام میں خط لکھا اور ڈاک کے سپرد کیا، دمشق پہونچ کر اس کے جواب کی توقع تھی، معلوم نہیں دمشق و یرموک کی طرح مولانا اور ان کے محبوب شہر کا نام سن کر مولانا کے قلب پر کیا اثر ہوتا، اور ان کے قلم سے کیا تاثرات ظاہر ہوتے، دمشق واپس ہوا تو برادر معظم ڈاکٹر عبدالعلی صاحب مدظلہ کا گرامی نامہ ملا جس نے یہ خبر سنائی کہ مولانا سفر آخرت پر روانہ ہو گیے اور اپنے خالق سے جا ملے۔ یہ ایک دینی، علمی، ادبی حادثہ تھا اور میرے لیے ایک ذاتی حادثہ بھی، میرا تعلق مولانا سے صرف ذہنی و علمی ہی نہ تھا شخصی اور قلبی بھی تھا، سافرت میں ایسا معلوم ہوا کہ ایک بزرگ خاندان کا سایہ سر سے اٹھ گیا، جہاں تک علم و دین اور فضیلت و تحقیق کا تعلق ہے مولانا ہماری گزشتہ دینی تعلیم کے بہترین نمونوں میں تھے، اور مدارس کے دور انحطاط کو دیکھتے ہوئے

یہ کہنا صحیح ہوگا کہ

ترکش مارا خدنگ آخریں

بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے وسعت نظر، وسعت مطالعہ، رسوخ فی العلم اور ذکاوت میں ان کی نظیر اس وقت ممالک اسلامیہ میں ملنی مشکل ہے۔ والغیب عند اللہ تصنیف و تالیف کے لحاظ سے وہ عصر حاضر کے عظیم مصنفین میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں، انھوں نے اپنی کتابوں میں جو مواد جمع کر دیا ہے وہ بیسیوں آدمیوں کو مصنف اور محقق بنا سکتا ہو، اس ایک آدمی نے تن تنہا وہ کام کیا ہے جو یورپ میں پورے پورے ادارے اور منظم جماعتیں کرتی ہیں، ان جیسا آدمی برسوں میں پیدا ہوا تھا اور اب ان جیسا آدمی شاید برسوں میں بھی پیدا نہ ہو۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہو
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اللہ تعالیٰ جانے والے پر اپنی بے شمار رحمتیں نازل فرمائے، اور اپنے انعامات سے مالا مال کرے کہ وہ بڑا دردمند، بڑا پر محبت دل رکھتا تھا اور اسکے قلب و دماغ کی ساری صلاحیتیں کسی نہ کسی طرح اسی "الاسلام" کی خدمت میں (جس کے سوا کوئی دین اسکے یہاں قبول نہیں) اور اسی النبی الخاتم کی ابدی نبوت و سیادت کے ثبوت میں اور اسی کے علوم کی نشر و اشاعت میں جس کے بعد کوئی رسول آنے والا نہیں صرف ہوئیں وہ جب تک زندہ رہا اسی کے گن گاتا رہا اور اپنے دیس کی بے تکلف بولی میں اس کو خطاب کر کر کے سناتا رہا

تجھ سے توڑوں تو کس سے جوڑوں ، تیری گلی کی دھول بٹوروں

یقین کامل ہے کہ خدا کی رحمت کاملہ نے اس کو اسی محبوب کے عشاق اور اس کے دین کے مخصوص خدام میں شامل فرمایا ہوگا جس کا کام کرتا ہوا وہ زندہ رہا اور جس کا نام لیتا ہوا وہ دنیا سے رخصت ہوا،

مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میر کیا دِوانے نے موت پائی ہے

مولانا گیلانی اور الفرقان

از ——— محمد منظور نعمانی

۱۳۵۶ھ (م ۱۹۳۷ء) میں جو الفرقان کی عمر کا پانچواں سال تھا، الفرقان کا مجدد الف ثانی نمبر نکالنا طے کیا گیا۔ اسکے لیے اپنے جن بزرگوں سے مضامین کی درخواست کی گئی اُن میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم بھی تھے۔ ایک عریضہ اسی سلسلہ میں اس ناچیز نے مولانا گیلانی مرحوم کو بھی لکھا، مولانا موصوف سے اس عاجز کا اس وقت تک کوئی ایسا تعلق اور تعارف نہ تھا جس کی بنا پر درخواست کی پذیرائی کی کوئی خاص امید کی جا سکتی ——— اور اس باب میں مولانا کی سخاوت اور فیاضی کا جو تجربہ بعد میں ہوا اس کا اس وقت وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا ——— اس لیے خط تو اگرچہ لکھ دیا گیا تھا لیکن مولانا کے مقالہ کی کوئی خاص توقع نہ تھی ——— لیکن اللہ کی شان بالکل بلا قصد بلکہ بلا شعور خود مجھ سے یا دفتر الفرقان کے اس وقت کے محرر سے یہ غلطی ہو گئی کہ مولانا گیلانی کے نام لکھا ہوا خط بھی حضرت مولانا عثمانی مرحوم والے عریضہ کے ساتھ ملفوف ہو کر ان ہی کے لفافے میں چلا گیا۔ چند روز بعد ڈابھیل سے حضرت مولانا ممدوح کا جواب آیا جس میں خود کچھ لکھنے سے معذرت کے ساتھ یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ "آپ نے مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے نام کا خط میرے پاس غالباً اس لیے بھیجا ہو گا کہ میں اس پر اپنی طرف سے کچھ لکھ کر ان کو بھیجدوں، میں نے ایسا کر دیا ہے، مجھے امید ہے کہ وہ آپ کے نمبر کے لیے انشاء اللہ ضرور کچھ لکھ دیں گے۔"

بہرحال مجھے حضرت مولانا کے اس خط ہی سے معلوم ہوا کہ مولانا گیلانی کے نام لکھا ہوا میرا خط بجائے حیدرآباد جانے کے حضرت مولانا عثمانی والے خط کے ساتھ ملفوف ہو کر ڈابھیل چلا گیا، لیکن یہ معلوم کر کے کہ حضرت مولانا نے اپنی طرف سے اس پر کچھ لکھ کر حیدرآباد روانہ فرما دیا ہے، اس اتفاقی غلطی پر خوشی ہی ہوئی ——— یاد آتا ہے کہ اس کے بعد میں نے مولانا گیلانی کو دوسرا خط لکھا اور اس میں اصل واقعہ لکھنے کے ساتھ اپنے اس خیال کا بھی اظہار کر دیا کہ اگرچہ یہ غلطی بالکل بلا قصد محض اتفاق سے ہوئی تھی، لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ غلطی کرا کے میری بڑی مدد فرمائی، اگر یہ غلطی نہ ہوئی ہوتی تو صرف میرا عریضہ آپ کو لکھنے پر شاید آمادہ نہ کر سکتا ——— مولانا نے اپنے جواب میں کسی حد تک میرے

اس خیال سے اتفاق فرمایا اور لکھا کہ بہر حال آپ کے نمبر کے لیے مقالہ لکھنا شروع کر دیا ہے۔

پھر چند ہی دن بعد قریباً ۶۰ صفحے پر مولانا کا وہ تاریخی مقالہ آگیا جو مجدد الف ثانی نمبر میں بعنوان ــــ الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ ــــ شائع ہوا تھا اور جو اہلِ نظر کی نگاہ میں مولانا مرحوم کے چند منتخب شاہکار اور یادگار مضامین میں ہے اور جس نے حضرت مجدد الف ثانی کے مقام اور ان کے اصل تجدیدی کام کو سمجھنے کی ایک نئی راہ کھولی ہے۔

الفرقان میں شائع ہونے والا مولانا مرحوم کا سب سے پہلا مقالہ یہی تھا اور اسی سے الفرقان اور ناچیز مدیر الفرقان پر مولانا کی عنایتوں کا آغاز ہوا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس مقالہ کا ایک تتمہ بھی قریباً ۲۰ صفحے کا مولانا نے لکھا۔ اس کے بعد ایک دو قسطوں میں پورے ہو جانے والے متعدد مقالات کے علاوہ ایک اہم اور مبسوط مقالہ مولانا نے امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی پر الفرقان کے لیے لکھا جو ۱۳۵۸ھ و ۱۳۵۹ھ میں باقساط الفرقان میں شائع ہوتا رہا، اور بعد میں کچھ اضافہ اور تکمیل کے بعد وہ مستقل کتابی شکل میں بھی شائع ہو گیا۔ پھر ۱۳۵۹ھ میں الفرقان کا شاہ ولی اللہ نمبر نکلا، اس کے لیے مولانا نے میری گزارش پر اپنا وہ مبسوط مقالہ لکھا جس نے شاہ ولی اللہ نمبر کے قریباً سوا سو صفحات لیے۔ یہ مقالہ دراصل ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا تھا، چنانچہ پہلے کتب خانہ الفرقان کی طرف سے اور اس کے بعد بعض دوسرے اشاعتی اداروں کی طرف سے کتابی شکل میں بھی اس کو شائع کیا گیا۔

اس کے بعد سے الفرقان کے ساتھ مولانا مرحوم کا تعلق کچھ ایسا ہو گیا کہ گویا انھوں نے اس کو اپنا لیا، اور اپنی خاص سرپرستی میں لے لیا، خود بھی مسلسل لکھتے رہتے اور جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبۂ دینیات کی حیثیت سے بی اے ایم اے کے اپنے ہونہار شاگردوں کو خاص خاص موضوعات پر مواد دے کر اپنی رہنمائی اور نگرانی میں جو تحقیقی مقالات اُن سے لکھاتے ان میں سے بھی انتخاب کر کے الفرقان کے لیے بھیجتے رہتے ــــ

اس زمانہ میں میری توجہ بعض دوسرے کاموں کی طرف ہو گئی تھی جس کی وجہ سے میں الفرقان کی طرف بہت کم توجہ کر سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ٹھیک اسی زمانہ میں مولانا مرحوم کو الفرقان کی خصوصی سرپرستی کی طرف متوجہ فرما کر اور اس کے ساتھ ایک خاص لگاؤ اُن کے دل میں پیدا فرما کر اس کی زندگی کا ایک سامان پیدا کر دیا، اگر مولانا کی یہ عنایت لطیفۂ غیبی کے طور پر اس وقت الفرقان کو حاصل نہ ہوتی تو شاید اسی زمانہ میں یعنی اب سے تقریباً ۱۵۔۱۶ سال پہلے الفرقان بند ہو گیا ہوتا ــــ مولانا کی یہ نوازش اور عنایت محض لِلّٰہ فی اللہ تھی۔ جزاھم اللہ تعالیٰ احسن ما یجزی بہ عبادہ المحسنین۔

پھر سنہ ۶۱ اور سنہ ۶۲ھ میں میری صحت بہت خراب رہی، دو دفعہ بیماری کا ایسا سخت حملہ ہوا کہ صحتِ مرض کے عام تجربی قانون کے تحت زیست کی امید کے لیے بہت کم گنجائش رہ گئی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے

صحت وحیات بخشی، ان دنوں الفرقان کی اشاعت بہت ہی غیر منظم رہی، زیادہ پرچے دو دو تین تین مہینے کے مشترک ہی شائع ہوئے۔ شعبان ۱۳۶۲ھ کی آخری تاریخوں میں جبکہ میں بستر علالت سے اٹھا ہی تھا، مولانا نے ازراہ شفقت ودردمندی اپنے ایک کرم نامہ میں مجھے لکھا۔

"اس مہینے کے تمام پرچے نکل چکے...... بھی...... بھی، الفرقان بیچارہ ابھی نازل نہ ہوا، میرا تو جی چاہتا ہو کہ الفرقان کی ادارت اپنے ہاتھ میں لے لوں ..... اگر وقت پر چھاپنے کے لیے آپ آمادہ ہوں تو مضامین شذرات وغیرہ ہر مہینے تیار کر کے بھیجنے پر فقیر اپنے کو تیار کرلے۔"

مولانا کا یہ خط مجھے رمضان المبارک کی تیسری یا چوتھی تاریخ کو ملا، اس کے ملنے سے دو ہی دن پہلے میری مرحومہ اہلیہ (مولوی عتیق الرحمٰن سلمہ کی والدہ) پر اچانک مرض کا سخت حملہ ہو چکا تھا، ان کے اس مرض اور اس تکلیف کا خاتمہ پانچویں دن ان کے انتقال پر ہوا، اور وہ اس دنیا سے اٹھالی گئیں (اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ مغفرت ورحمت کا معاملہ فرمائے اور ان کی روح کو شاد رکھے)

جیسا کہ ابھی اوپر ذکر کیا گیا ہو میں خود چند ہی دن پہلے بستر علالت سے اٹھا تھا، بلکہ درحقیقت ابھی نیم بیمار ہی تھا، اس حادثہ نے پھر صحت پر اثر ڈالا اور میں پھر بیمار پڑ گیا، میرے معالجین نے اصرار کے ساتھ مجھے مشورہ دیا کہ عرصہ تک اب کسی قسم کا کوئی کام مجھے نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے مولانا مرحوم کو گھر کے اس مفاجاتی حادثہ کی اور اپنی حالت اور معالجین کے مشورہ کی اطلاع دی اور ساتھ ہی عرض کیا کہ اب معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے خط میں آپ سے شفقت و دردمندی کے یہ انتہائی لفظ کیوں لکھائے تھے، بہرحال اب تو اللہ تعالیٰ نے حالات ہی ایسے کر دیے ہیں کہ الفرقان کے زندہ اور جاری رہنے کی صورت صرف یہی ہو کہ آپ ہی اس کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالیں۔

مولانا نے یہ ذمہ داری قبول فرمالی اور اپنے افتتاحی شذرات کے لیے بجائے "نگاہ اولیں" کے "فواتح" کا عنوان پسند فرمایا۔ شوال ۱۳۶۲ھ کا پرچہ مولانا ہی کی ادارت میں نکلا، افتتاحیہ کی ابتدائی چند سطریں یہ تھیں۔

سبحان اللہ وبحمدہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ وعبدہ وآلہ وصحبہ

مخدوم ومحترم مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان صرف بیمار ہی نہیں ہیں، بلکہ ان کی تیمارداری کرنے والی جنت نصیب بی بی کو بھی اللہ میاں نے بلالیا، یہ وقت صرف ان ہی کے لیے نہیں الفرقان بیچارہ کے لیے بھی سخت تھا، اور ہے، میرے ایک مجذوبانہ خط کو مولانا نے پکڑ لیا: "المرء یؤخذ باقرارہ" جو عہد کیا گیا یا کرایا گیا ہے، بہرحال اس کی تکمیل کسی نہ کسی حد تک "تَحِلَّةَ لِلْقَسَمِ" ہی کی حد تک اب تو میرے ذمہ عاید ہو ہی گئی، مشاغل کی کثرت، درس وتدریس، تحقیقاتی کاموں کی نگرانی کے ساتھ صدارت شعبہ کے فرائض بھی انجام دینا، کچھ ٹوٹے پھوٹے علمی شغلوں میں بھی الجھے رہنا اور اسی کے ساتھ ایفاء عہد کا

یہ بوجھ، اللہ ہی جانتا ہے کہ کیسے اٹھاؤں گا، سر حاضر کر دیتا ہوں، گٹھری لاد دیجئے! اٹھ سکے گی تو اٹھا لوں گا، ورنہ پٹک کر بھاگوں گا، لیکن جس نے عہد کرا دیا ہے، امید ہو کہ وہی قوت بھی عطا کرے گا فعلی اللہ توکلتُ والیہ انبتُ والیہ المصیر ولاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

(الفرقان بابت شوال ۱۳۶۲ھ ص ۳)

مولانا کی ادارت کا یہ شرف الفرقان کو قریباً ایک سال تک حاصل رہا اور افتتاحی شذرات بعنوان "فواتح" مولانا ہی لکھتے رہے، اس کے بعد جب میری صحت بحال ہو گئی تو اگرچہ یہ خاص نوعیت باقی نہیں رہی، لیکن اپنے مسلسل مقالات کے ذریعہ میری مدد اور الفرقان کی سرپرستی مولانا مرحوم برابر فرماتے رہے۔

پھر غالباً ۱۳۶۴ھ میں ایسا ہوا کہ میرے اور مولانا کے درمیان ایک مسئلے میں اختلاف رائے ہو گیا، اور میں نے مولانا کو آزردہ کر دیا، میری اور ان کی جو نسبت تھی اور ہمارے باہمی تعلقات کی جو نوعیت تھی اس کی بنا پر مجھے ہی چاہیے تھا کہ میں مولانا کو راضی کرنے کی کوشش کرتا، لیکن مجھے اعتراف ہو کہ میں کم ظرف ثابت ہوا اور ممدوح کو راضی کرنے اور منانے کی میں نے کوئی کوشش نہیں کی، یہاں تک کہ کچھ مدت کے بعد خود مولانا مرحوم ہی نے اُلٹا مجھے منایا، سچ ہو "پھل دار درخت ہی جھکتا ہے۔"

اس کے بعد الفرقان کو انھوں نے پھر اسی طرح اپنایا اور اپنی خاص سرپرستی میں لیا ــــ بلاشبہ یہ ان کی بڑی عالی ظرفی تھی۔

قریباً ایک ہزار صفحات :-

الفرقان کی پرانی جلدوں کی ورق گردانی سے معلوم ہوا کہ مولانا مرحوم کے اس پہلے مقالہ سے لے کر جو اواخر ۵۷ھ میں مجدد الف ثانی نمبر" میں شائع ہوا تھا، سلسلہ "ہادم اللذات" کی اس آخری قسط تک جو رجب ۹۲ھ کے الفرقان میں شائع ہوئی اور جس کے بعد مرض کے تسلسل نے مولانا کو الفرقان کے لیے کچھ اور نہیں لکھنے دیا۔ یہاں تک کہ اپنے رب کے حضور میں پہونچ گئے۔ قریباً ایک ہزار صفحات خود مولانا مرحوم کے قلم کے لکھے ہوئے الفرقان میں شائع ہوئے ہیں، اور اپنے بعض شاگردوں سے لکھوا کر خود تصحیح اور نظر ثانی کر کے جو مضامین انھوں نے الفرقان کو عنایت فرمائے وہ ان کے علاوہ ہیں۔ اُن کے صفحات کی مجموعی تعداد بھی دو سو سے زیادہ ہے۔

اللہ کی شان! الفرقان کے صفحات میں سب سے آخری سلسلہ انھوں نے "ہادم اللذات" کے عنوان سے شروع فرمایا۔ گویا موت کے یاد کرنے اور یاد دلانے کو اپنا موضوع بنایا ــــ اس سلسلہ کی پہلی قسط ذی الحجہ ۱۳۸۱ھ کے الفرقان میں شائع ہوئی۔ اس کا افتتاحی نوٹ یہ تھا۔

"مشہور حدیث ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا" اکثروا ذکر ھادم اللذات"

لذتوں کو ڈھا کر رکھ دینے والی یعنی موت کو بہت زیادہ یاد کیا کرو) سچ پوچھئے تو اسی نبوی وصیت کی تعمیل اس مضمون سے مقصود ہے، ایسے واقعات جن کا موت سے تعلق ہے، انھیں کا ذکر اس عنوان کے تحت انشاء اللہ کیا جائے گا، موت کے یاد کرنے کی ایک شکل یہ بھی ہو سکتی ہو ـــــ بڑے بڑے مواعظ اور لچھے دار تقریروں کے مقابلہ میں موت کا ہلکا سا خیال زیادہ نتیجہ خیز ہو سکتا ہو۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی انگوٹھی میں کہتے ہیں کہ "کفیٰ للمرء بالموت واعظا" (آدمی کے لیے موت کافی واعظ ہو) کے الفاظ کھدے ہوئے تھے ـــــ انشاء اللہ تعالیٰ ہر مہینے میں الفرقان کے ناظرین کے سامنے یہی زندہ واعظ کھڑا ہوگا ـــــ سب سے زیادہ یاد رکھنے کی مستحق جو چیز ہے، اسی کو یہ زندہ واعظ آپ کو یاد دلاتا رہے گا۔"

جیساکہ اوپر عرض کیا گیا یہ سلسلہ ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ (م ستمبر ۱۹۵۲ء) سے شروع ہو کر برابر جاری رہا، قریباً دو سال گزرنے پر ۱۳۷۳ھ کے اواخر سے مولانا پر سخت قلبی دوروں کا حملہ شروع ہوا، جس کا سلسلہ قریباً ۶ مہینے جاری رہا، اس زمانہ میں "ہادم اللذات" کے ذکر و تذکیر کا یہ سلسلہ بھی قدرتی طور پر بند رہا، دسمبر ۱۹۵۴ء میں طبیعت کچھ سنبھلی تو مولانا نے اس سلسلہ کو پھر شروع کیا، اس افاقہ کے بعد جو پہلی قسط اس سلسلہ کی آئی اس کے ابتدائی نوٹ کی چند سطریں یہ تھیں:۔

"چھ مہینے سے زیادہ مدت گزر گئی، "ہادم اللذات" کی کہانیاں سنانے والا اس عرصہ میں خود اسی ہادم اللذات" کی پرچھائیوں کے نیچے آگیا۔ لیکن بقول اکبر مرحوم

کمزور ہی میری صحت بھی کمزور ہی میری بیماری
اچھا جو رہا کچھ کر نہ سکا بیمار پڑا تو مر نہ سکا

کچھ نہیں معلوم کہ مہلت جو ملی ہے اس کی مدت بھی کتنی ہے۔ قل إن الموت الذی تفرون منه فانه ملاقیکم ـــــ مدیر الفرقان کا اصرار ہے کہ

جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

بحول اللہ وقوتہ ساغر کو پھر ہاتھ میں اٹھا لیتا ہوں، جو پینا چاہتے ہیں ان کے لیے صلائے عام ہے۔ انسانی زندگی کے چند لازوال زندہ حقائق جن کا شعور عہد حاضر کے قلوب میں مردہ کہیے یا نیم مردہ ہو کر رہ گیا ہے، اسی شعور کا جگانا اس جھنجھوڑے مقصود ہے۔"

"ہادم اللذات" کی یہ قسط قریباً ۶۔۷ مہینے کے ناغہ کے بعد جمادی الاولیٰ ۱۳۷۴ھ (م جنوری ۱۹۵۵ء) میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد مولانا کو صرف دو قسطیں اس سلسلہ کی اور لکھنے کا موقع ملا، ایک ہندوستان کے مشہور مسلمان حکمران شیر شاہ سوری (م ۹۵۲ھ) کے کارنامہ اور اس کی وفات کے متعلق، یہ قسط جمادی الاخریٰ ۱۳۷۴ھ (م فروری ۱۹۵۵ء) میں

شائع ہوئی، اس کا عنوان تھا "ہندوستان کی ایک قدیم جیالا الکیم جس نے موت کو بھی زندگی بنادیا"۔۔۔۔ دوسری قسط میں اس چودھویں صدی ہجری کے چودھویں سال میں وفات پانے والے ہندوستان کے ایک مشہور عالم اور محدث حضرت قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے بعض خاص سبق آموز پہلوؤں کا تذکرہ کر کے ان کی وفات کا حال لکھا گیا تھا۔ یہ قسط رجب ۱۳۷۴ھ (مارچ ۱۹۵۵ء) کے الفرقان میں شائع ہوئی تھی، اس کا عنوان تھا "اسلامی رواداری اور مساوات و بے نفسی کا ایک دل آویز مرقع"۔

یہی اس سلسلہ کی آخری قسط تھی، اس کے بعد خود مولانا پھر "ہادم اللذات" کی پرچھائیوں کے نیچے آگئے، دل کے دوروں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا اور جیسا کہ عرض کیا گیا اس کے بعد مرض نے الفرقان کے لیے کچھ اور لکھنے کا موقع نہ دیا، یہاں تک کہ جون ۱۹۵۶ء میں "ہادم اللذات" نے آپ کو ہم دنیا والوں سے الگ کر کے ملاء اعلیٰ میں پہنچا دیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین۔

ان سطروں کے پڑھنے والے اور مولانا مرحوم کے اس مجموعۂ مضامین کا مطالعہ کرنے والے اپنے سب دوستوں سے اس عاجز کی عاجزانہ درخواست ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مولانا مرحوم کی مغفرت اور رفع درجات کے لیے اہتمام کے ساتھ دعا کریں، یہ اُن کا اس عاجز پر بھی بڑا احسان ہوگا، کسی مصنف اور مضمون نگار کی زندگی میں تو کسی کی داد و تحسین بھی تھوڑی دیر کے لیے اس کو خوش کر سکتی ہے۔ اور وہ اس سے کچھ ذائقہ لے سکتا ہے۔ لیکن مرنے کے بعد کام آنے والی چیز صرف دعا ہے، اور اپنے کسی محسن کا سب سے بڑا حق اور احسانمندی و شکر گزاری کا صحیح ترین ایمانی طریقہ یہی ہے کہ اس کے لیے اہتمام سے دعائیں کی جائیں اور بار بار کی جائیں۔

ایک خوشکن اطلاع

معارف الحدیث کی دوسری جلد

(کتاب الرقاق و کتاب الاخلاق)

افادات

مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ

(۱) الف ثانی (یا ہزارۂ دوم) کا تجدیدی کارنامہ ــــــ (تلخیص و تبصرہ)

(۲) حج کیا ہے؟

(۳) دجالی فتنہ اور سورۂ کہف

(۴) وفا شعاری کے دو نادر نمونے

الف ثانی (یا ہزارۂ دوم) کا تجدیدی کارنامہ

(از افادات مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ)

تلخیص و تبصرہ ——— از جناب مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہی

بلا شبہ حضرت مولانا گیلانی برد اللہ مضجعہٗ رئیس التحریر اور سلطان القلم تھے ——— وہ کیا بلحاظ تصنیف اور کیا بحیثیت تالیف و تدوین اور کیا ازروئے مقالہ نگاری ایک کامیاب اور بلند پایہ محقق و مبصر تھے ——— وہ پی، ایچ، ڈی نہ تھے لیکن اس راہ کے کتنے امیدواروں کو انھوں نے کامیاب بنایا ہے اور ایسی شاہراہ قائم فرما دی ہے کہ میدان تحقیق میں ایک ذہین طالب علم بآسانی گامزنی کرسکے اور اسلاف کی کتابوں، تاریخوں اور تذکروں کے بحر ذخارسے علم و حکمت کے موتی نکال سکے۔ سچ پوچھیے تو پی، ایچ، ڈی بننا آسان ہے ——— مناظر احسن بننا مشکل۔ ع

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

بقول سید سلیمان ندویؒ۔ "ہمارے[1] پی، ایچ، ڈی زندگی میں صرف ایک مقالہ لکھتے ہیں اور ساری عمر اُسی کو چومتے چاٹتے رہتے ہیں" ——— علامہ گیلانیؒ نے بلا مبالغہ سیکڑوں مقالے لکھے اور ان میں اپنی خداداد بصیرت اور علمی و فنی کاوش کا پورا پورا ثبوت دیا۔ ان کے خون جگر کی گلکاریوں سے چمن علم و تحقیق میں تازہ بہاریں آگئیں ——— وہ جدید و قدیم دونوں روشوں سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے تعلیم دارالعلوم دیوبند میں پائی اور معلمی جدید زاویہ نگاہ رکھنے والوں میں کی۔ وہ دونوں وادیوں کے پیچ و خم سے آگاہ تھے۔ اُن کی تحقیق سے ایک طرف قدیم طرز کے طلباء کو تسکین ہوتی تھی، دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ حضرات اطمینان

---

[1] معارف سلیمان نمبر صفحہ ۳۰۲

حاصل کرتے تھے ــــــ ان کے وجد انگیز قلم کے جتنے نمونے ہیں بہترین شاہکار کہلانے کے مستحق ہیں ــــ اُن کی اردو نثر اُن کے صاحبِ طرز انشا نگار ہونے کا پتہ دیتی ہے اُن کی زبان قلعۂ معلی، دار العلوم دیوبند، عثمانیہ یونیورسٹی اور صوبہ بہار کے علمی گھرانوں کی ملی جلی خصوصیات کی آئینہ دار تھی ــــ اُن کی تحریر میں فصاحت و بلاغت، سلاست و روانی جدید و قدیم علمی اصطلاحیں۔ جذب و کیف، جوش و خروش پیغام و طنز سب ہی کچھ موجود تھے۔ اُن کا کلام دماغ سے زیادہ دل سے اپیل کرتا تھا ان کے اکثر و بیشتر جملے الہامی ہوتے تھے ــ عبرت اور سبق حاصل کرنے والوں کے لیے ان کے یہاں بہت سی کام کی باتیں لمبی لمبی تحریروں میں چھپی ہوئی ملتی ہیں۔ اُن کے سوز و غم میں نشاط اخروی کی جھلک ہوگا ــ اور ان کے دل کی دھڑکن فلاحِ دارین کی منزل پر پہونچانے کے لیے جرسِ کاروان کا کام دیتی ہے۔

زمانۂ طالب علمی میں ان کی ایک تقریر دار الحدیث دیوبند میں سنی تھی اس کی لذت آج تک دل و دماغ پر حاوی ہے دو ایک جگہ ان کے خطوط دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا ان میں بھی عجیب لطف سخن پنہاں ہے ــــــ مرحوم نے جذبات و تحقیق کی آمیزش سے اپنی تحریروں میں ایک خاص رنگ بھر دیا تھا ــــ القاسم دیوبند میں ان کے مضامین پڑھ کر مجھے ان سے پہلا تعارف حاصل ہوا تھا۔ پھر ان کی کتاب النبی الخاتم دیکھی جس میں مکی زندگی اور مدنی زندگی کے پر کیف نظارے دکھائے گئے ہیں۔ اس میں محبت رسول ہے کہ ابل رہی ہے جذبات عقیدت کا سمندر ہے کہ ٹھاٹھیں مار رہا ہے ــــ اللہ اکبر کتنی کیف آور کوثریں تحریر ہے کہ ناظرین و سامعین کے قلوب کو غرقِ موجِ کوثر کر دیتی ہے۔ الدین القیم۔ نظام تعلیم و تربیت اور سوانح قاسمی کا بھی مطالعہ کیا سب نے متاثر کیا اور سب اپنے اپنے رنگ میں خوب ہیں ــــــ لیکن سب سے زیادہ ان کی شخصیت سے تفصیلی تعارف ان دو مقالوں سے ہوا جو الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر اور شاہ ولی اللہ نمبر کے لئے لکھے گئے تھے ــــ اس وقت میں بریلی میں موجود تھا ــــ مجدد الف ثانی نمبر والا مضمون الفرقان کے لیے پہلا مقالہ تھا جو ۵۳ھ میں آیا۔ بس یہ "ابتدائے عشق" تھی جس کے آگے سب نے دیکھا کہ بہار کے "مجذوب محقق" نے دامن الفرقان میں جذبات و تحقیقات کے کیسے کیسے موتی برسائے ــــــ غالباً ۷۵ھ تک سترہ اٹھارہ سال ان کے مضامین کی سلسلہ جنبانی رہی ــ یوں سمجھیے گویا مولانا گیلانی الفرقان کی مجلس ادارت کے بھی ایک اعلیٰ رکن تھے ــــــ ہائے مولانا گیلانی، خدا اُن کو تم بخشے ــ ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے ــــ اب اُن جیسا "حریف مے مرد افگن عشق" بن کر میخانہ راز و نیاز میں کون آئے گا؟ ع

دگر دانائے راز آید نہ آید

اب ہم ان کی تازہ تحریر کی ایک سطر بھی نہ پڑھ سکیں گے ــــ بیشک خزاں کے دور میں جب بوئے گل سے محرومی ہوجاتی ہے تو عرقِ گلاب ہی کی جستجو ہوتی ہے اسی لئے ادارہ الفرقان نے سوچا اور بہت اچھا سوچا کہ الفرقان میں شائع شدہ مضامین گیلانیؒ کا "عطرِ مجموعہ" نکال لیا جائے ــــ میرے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ میں حضرت مجدد الف ثانیؒ پر لکھے ہوئے ان کے مقالے کی تلخیص اور اس پر تبصرہ کروں ــــ یہ کام بھی کوئی معمولی کام نہیں کہ مجھ جیسا "ناآشنائے لذت پرواز" انجام دے لیکن میاں عتیق الرحمٰن سنبھلی کی فرمائش پر جیسا کچھ بھی انجام دے سکا ہوں پیش کر رہا ہوں اور روح گیلانیؒ سے شرمندہ ہوں کہ اس بادشاہ فصاحت و بلاغت کا اس کی شایان شان اعلیٰ پیمانے پر کوئی علمی تعارف نہ کرا سکا ــــ

سب سے پہلے بطور تمہید و مقدمہ چند باتیں عرض کرلوں پھر دائرہ موضوع میں آؤں گا۔

(۱) اکبری فتنہ جو دین الٰہی کے نام سے برپا ہوا تھا درحقیقت ایک خطرناک فتنہ تھا اگر بروقت اس کی خبر گیری نہ ہوتی تو اسلام کا دیوالہ نکل جاتا ــــ یہ درحقیقت ع

ایک سازش تھی فقط مذہب و ملت کے خلاف

بظاہر اسباب سلطنت مضبوط کرنے کا اچھا طریقہ ہاتھ آیا تھا لیکن سرمایۂ ملت کو برباد کر کے سلطنت کو مضبوط کیا جا رہا تھا ــــ اور بابر کا پوتا اپنے ہاتھوں اس شجر بارآور کو کاٹ رہا تھا جس کے سایے میں دین و دنیا دونوں کی کیاریاں پرورش پاتی ہیں ــــ الحاد و زندقہ کی انتہا ہوچکی تھی سب مذہبوں کا "عرقِ مرکب" نکالنے کا خیال تھا لیکن ہوا یہ کہ سب سے زیادہ مخالفانہ زد اسلام پر پڑی اس دین الٰہی کا ذکر جدید و قدیم مورخین نے کیا ہے لیکن اس کے زہریلے نتائج پر بدایونیؒ سے زیادہ کسی کی نظر نہ تھی بدایونیؒ کے بعد گیلانیؒ نے اس تفصیل کے ساتھ ان نتائج کو پیش کیا کہ بدایونی بھی ہوتے تو اُن کو داد دیتے۔

(۲) ابوالفضل اور فیضی یہ دونوں بھائی دربار اکبری پر چھائے ہوئے تھے ان میں اوّل الذکر میر منشی اور اعلیٰ منصب دار تھا، دوسرا ملک الشعراء اور معلم شاہزادگان ــــ علوم عقلیہ کا دونوں پر پورا پورا اثر تھا۔ نقلی علوم سے بہرہ وری نہ تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کے عقائد بھی تباہ کرنے کی کوشش کی اور ایسی اسکیم دربار اکبری میں تیار کی جس سے اسلام کا نام و نشان ہی مٹ جائے ــــ سچ پوچھئے تو دین الٰہی کے کنوینر دونوں بھائی ہی تھے ــــ ناخواندہ اکبر پر ان دونوں نے اپنا سکہ جما لیا تھا ــــ مورخین حال، ابوالفضل کے قتل کی وجہ لکھتے تو ہیں، لیکن ایک وہ خاص وجہ جس کو خود جہانگیر نے اپنے قلم سے تزک میں لکھا ہے چھوڑ جاتے ہیں ــــ اور تماشے کی بات ہے کہ طبع کراتے وقت تزک جہانگیری کے ایڈیٹ کرنے والے ایک ریفارم قسم کے بزرگ نے نہ معلوم کس مصلحت سے اس حصے کو حذف کردیا ہے وہ تو یہ کہیے کہ مجھے مدرسۂ اشاعت العلوم بریلی کے کتب خانے سے مستعار آیا

ہوا ایک قدیم قلمی تزک کا نسخہ دفتر الفرقان میں مطالعہ کرنے کے لیے مل گیا تھا اور یہ بات میں نے اسی وقت اپنے دل میں نوٹ کرلی تھی۔ اس وقت قلمی تزک تو میرے سامنے نہیں ہے۔ تذکرہ[1] فاتحان ملک ہند قلمی سے تزک کا مضمون نقل کرتا ہوں ممکن ہے الفاظ میں کچھ تفاوت ہو لیکن مفہوم بالکل وہی ہے۔

در کتابے کہ بر واقعات خود برنگاشتہ و تزک جہانگیری نام داشت می نگارد کہ از ابوالفضل رو گرداں بودم از آنکہ در پیرانہ سالی پدرم را از راہ مستقیم بعد داشتہ۔	جہانگیر نے اپنی خود نوشت تزک میں لکھا ہے کہ میں ابوالفضل سے اس وجہ سے ناراض تھا کہ اس نے میرے باپ (اکبر) کو بڑھاپے میں راہِ مستقیم سے ہٹا دیا تھا۔

اسی تذکرۂ فاتحان ہند سے تفصیل سنیئے جو اکثر و بیشتر تزک ہی سے ماخوذ ہے۔

زمانیکہ شہریار۔ چراغ پگاہی بود از شاہزادہ مرزا سلیم شکر رنجی کشید	جس زمانے میں اکبر بادشاہ چراغ سحری تھا شاہزادہ سلیم (جہانگیر) سے اس کی ناچاقی ہوگئی:

ناچاقی زیادہ بڑھی تو اکبر نے ابوالفضل کو دکن سے مشورہ کے لیے بلایا وہ وہاں مع اہل و عیال اقامت گزیں تھا ابوالفضل نے جلدی میں اپنے اہالی موالی وہیں چھوڑے اور خود یکہ و تنہا چل پڑا۔

جہانگیر کو جو بچند وجوہ اس سے رنجیدہ تھا ___ اچھا موقع ہاتھ آیا ___ قتل کرانے کا منصوبہ گانٹھ لیا۔ وہ وجوہ کیا تھیں؟ ___ سنیئے۔

یکے آنکہ بد کیش بود	اوّل یہ کہ ابوالفضل بد مذہب تھا
دوم آنکہ خسرو را در پیرانہ سالی بر آئینے آورد کہ بگفت قرآن نہ کلام ربّانی است از زبان رسول ایزدیست	دوسری وجہ تھی کہ ابوالفضل نے اکبر کو بڑھاپے میں یہ پٹی پڑھا دی تھی کہ قرآن عظیم کلام ربانی نہیں ہو بلکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہو (نعوذ باللہ)

پھر کیا ہوا۔ ابوالفضل گوالیار کے راستے سے آرہا تھا رانا مالدیو سے جو جہانگیر کا خُسر تھا سازش کرکے قتل کروا دیا ___ خود جہانگیر نے تاریخ قتلِ ابوالفضل یہ نکالی۔

تیغِ اعجاز جناب آنسرور صلی اللہ علیہ وسلم سر باغی برید	تیغ اعجاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سرِ باغی کاٹ دیا۔

باغی کا سر یعنی پہلا حرف (ب) کاٹ کر اچھی خاصی تاریخ نکل آتی ہے۔

یہ خدا کی طرف سے بات تھی کہ وہ جہانگیر جو ایام شاہزادگی میں کیا اپنی سلطنت کے کئی برسوں میں بھی مذہبی حیثیت سے کمزور تھا اُس جہانگیر کے دل و دماغ کے کسی گوشے میں اتنی صلاحیت موجود تھی کہ وہ اس

---

[1] اس قلمی نسخے میں مؤلف کا نام درج نہیں ہے۔ مجھے مولوی محمود احمد صاحب عباسی مورخ امروہہ نے یہ نسخہ عنایت فرمایا ہے۔

روح فرسا الحاد و زندقہ کو برداشت نہ کر سکا اگرچہ حصول سلطنت کی خواہش بھی ملی ہوئی ہو لیکن قتل ابوالفضل کی نمایاں وجہ اس کا الحاد ہے ـــــــ یہ بھی اعجاز رسولؐ ہی کا صدقہ ہے کہ اس بڑے سبب کو برہنائے مصلحت مٹانے اور چھپانے کے باوجود تاریخ نے اس حقیقت کو اپنے اندر محفوظ رکھا ـــــ آج بھی بعض "نگارخانوں" میں نام نہاد "زریں نگار" ادیب اس قسم کے راگ الاپتے رہتے ہیں۔ مولانا گیلانیؒ کی زندگی میں اُن کو یہ لکھ دیتا تو وہ بہت خوش ہوتے کہ حضرت یہ زریں نگاری جو آج بعض الحاد پسندوں کے قلم سے ادا ہو رہی ہے نئی اپج نہیں ہے یہ بھی ابوالفضل کی جھنجھوڑی ہوئی ہڈی ہے۔

حضرت مجددؒ کے صاحبزادے حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ نے اپنے مکتوبات (مرتبہ عبید اللہ) کے مکتوب نمبر۲۳ میں لکھا ہے۔ کہ۔ ابوالفضل یا فیضی دونوں بھائیوں میں سے ایک بات کہا کرتا تھا

دنیا نقد است و آخرت نسیہ	دنیا نقد ہے اور آخرت اُدھار کوئی بھی نقد کو
ابجکس نقد را بنسیہ نفروختہ است	اُدھار کی امید میں ہاتھ سے نہیں دیتا ہے۔

(نعوذ باللہ)

(۳) ملا عبد القادر بدایونی ـــــــ عہد اکبری کا مشہور مورخ ہے۔ منتخب التواریخ اس کی معرکۃ الآرا تاریخ ہے جس سے دور اکبری کا پورا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے ـــ ملا بدایونی گھر کے بھیدی ہیں۔ اکبر کے دورِ صلاحیت میں اس کے امام رہ چکے ہیں ـــ صوفی مزاج اور راست باز ہیں ـــ علماء سے تحصیل کے لیے چکر لگاتے رہیں۔ خانقاہوں میں اہل اللہ سے جا جا کر ملتے ہیں۔ سید محمد میر عدل امروہیؒ سے بھی ان کا ربط ہے وہی میر عدل جنھوں نے دربار اکبری کے علماء سوء پر ایک غلط بات سے غصہ ہو کر اپنا عصا اٹھایا تھا ـــــ میرا مقصد یہ ہے کہ ملا عبد القادر بدایونی ایک ثقہ مورخ ہے آج تک اس کی کوئی تاریخی بددیانتی ثابت نہیں کی جا سکی ہے۔ اس کے بیانات میں شبہ کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کسی معتبر تحریر میں یہ بات تھی کہ جہانگیری دور تک منتخب التواریخ اپنی صاف گوئی کی وجہ سے ممنوع الاشاعۃ رہی۔ بعد کو جب اثرات مجدد الف ثانیؒ آشکارا ہوئے تو یہ کتاب بھی عام طور پر سامنے آئی ـــــ مولانا گیلانیؒ نے اپنے مجدد نمبر والے مضمون میں اس تاریخ سے بہت کام لیا ہے اور بڑی عجیب ترتیب سے تمام واقعات کو یکجا کر دیا ہو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا گیلانیؒ کی روح، ملا عبد القادر بدایونی کی روح سے ہم آہنگ ہو کر یہ مقالہ مرتب کر رہی ہو مولانا گیلانیؒ نے جس خاص ترتیب کے ساتھ واقعات جمع کر دیے ہیں بدایونی اس ترتیب کے ساتھ کسی وقتی مصلحت سے مجبور ہو کر پیش نہ کر سکے تھے ـــــ چار سو صفحات پر پھیلے ہوئے واقعات کو اس طرح منظم کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہو۔ مولانا گیلانیؒ ایک جگہ تحریر فرما گئے ہیں:-

"خود ملا عبدالقادر جن کی کتاب سے میں نے ان واقعات کا انتخاب کیا ہے بندہ خدا نے نہ جانے کس مصلحت سے ان کو تقریباً چار سو صفحات میں انتہائی بے ترتیبی کے ساتھ پراگندہ صورت میں قلم بند کیا ہے۔ ترتیب میں مجھے کافی دقت اٹھانی پڑی تاہم ایک کام ہو گیا۔"

ملا عبدالقادر کی مصلحت کو ان کی دل کی آواز کو اور ان کے پیش کردہ نقشۂ حال کو اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ ——— بعد کے مورخین و محققین نے شاید اتنا نہ سمجھا ہوگا جتنا حضرت گیلانیؒ نے سمجھ لیا ہے ——— نتائج جو ملا عبدالقادر بدایونی بربنائے مصلحت نہ نکال سکتے تھے مولانا گیلانیؒ نے ان نتائج کو اس طرح برآمد کیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے علمی حلقوں میں اس مقالے کی بڑی دھوم مچ گئی تھی اور جوں جوں زمانہ گزر رہا ہے اس کے مندرجہ حقائق اور زیادہ دعوت غور و فکر دے رہے ہیں۔

(۴) اکبر کے متعلق اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ وہ ایک ناخواندہ مگر منتظم، بہادر اور عقل و دنیا ہی کا مالک تھا پچاس سال اس نے سلطنت کی اس کے حدود سلطنت بھی کافی وسیع تھے ——— داخلی و خارجی اثرات سے متاثر ہو کر اور متعدد اسباب کی بنا پر اس کو دین الٰہی کے قیام کی سوجھی تھی دین الٰہی قائم کرکے اس نے جو کچھ کیا وہ مولانا گیلانیؒ کے قلم نے خوب ہی واضح کر دیا ہے ——— بعض بزرگوںؒ نے فرمایا ہے کہ اکبر نے انتقال کے وقت توبہ کرلی تھی مگر اس کا مکمل ثبوت درکار ہے ——— دل ہمارا بھی یہی چاہتا ہے کہ کاش کسی طرح یہ بات صحیح ہو جائے کہ اکبر بادشاہ دنیا سے بسلامتی ایمان رخصت ہوا۔ مگر واقعات و حقائق کا کیا کیا جائے؛ یوں تو وہ بعد مرگ عرش آشیانی کے لقب سے ملقب ہو ہی گیے تھے خود عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے جن کا دیندار ہونا اظہر من الشمس ہے اپنے رقعات میں دو ایک جگہ اس لقب سے اکبر کو یاد کیا ہے ——— مگر دیکھنا یہ ہے کہ وہ پہلے کیا تھا پھر کیا بنا اور آخر تک کیا رہا۔ اسلام کو اس کے ہاتھوں کیا کیا صدمات پہونچے اور کیا کیا پہونچ سکتے تھے اگر فضل ایزدی حضرت مجدد الف ثانیؒ کی حمایت آڑے نہ آتی ———

(۵) حضرت مجدد الف ثانیؒ مشہور عالم شخصیت ہے، ہزارۂ دوم میں جو فتنہ بڑے طمطراق اور جاہ و جلال کے ساتھ شاہی نگرانی میں، بڑے بڑے فلسفیوں کو حمایتی بنا کر نمودار ہوا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کو مٹانے کے لیے ایک زبردست روحانی طاقت دے کر مجدد کی حیثیت سے آپ کو کھڑا کر دیا ——— بقول محقق گیلانیؒ اس دور کی خصوصیت کے پیش نظر ہی آپ کو مجدد الف ثانیؒ کہا جاتا ہے۔

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا اس کو خبردار

چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں ——— اکبری دور کی تاریخ ملا عبدالقادر کی مدد از مولانا گیلانیؒ

کی ترتیب سے مرتب ہو تو مجدد صاحبؒ کے کارنامے روشن ہوں۔ ایک فقیر بے نوا سرہند کی خانقاہ کے ایک گوشے میں
بیٹھے بیٹھے کر جو انقلاب عظیم۔ "اکبر اعظم" کی تحریک کے مقابلے میں برپا کرتا ہے اس کی اہمیت معلوم نہیں ہو سکتی جب تک
مولانا گیلانیؒ کا الہام خیز اور معارف ریز قلم ایک کامیاب مقالہ نہ لکھے۔

چلتے چلتے ایک بات اور بتا دوں کہ مولانا گیلانیؒ کے نزدیک فتنۂ دین الٰہی کے حسب ذیل اسباب تھے۔

(۱) حکومت (۲) علماء سو (۳) دربار رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باریافتوں اور شرف صحبت کے
سعادت مندوں کی تحقیر کرنے والی جماعت (۴) صوفیاء خام۔

ان میں سے دو اول الذکر اسباب پر اس مقالے میں بحث کی ہے اور ربیع الآخر ۵۸ھ کے الفرقان میں تیسرے
سبب کے متعلق یہ لکھ کر کہ ہمارے دوست مولانا نعمانی غالباً الفرقان میں سبب ثالث کے متعلق کافی بحث فرما چکے ہیں۔
کچھ نہیں لکھا ـــــ البتہ چوتھے سبب پر خوب دل کھول کر لکھا ہو ـــــ میں عدم گنجائش کے باعث اس دوسری قسط کا خلاصہ
اور اس سے متعلق تبصرہ نہ کروں گا ـــــ صرف مجدد الف ثانی نمبر والے مقالے پر جو ۴۵ صفحات پر مشتمل ہے یہ چند صفحات
لکھے ہیں۔ اور یہ امر ملحوظ رکھا ہے کہ جہاں تک ہو سکے ناظرین کے دل و دماغ میں وہ بات بطور خلاصہ جاگزیں ہو جائے
جس کو مولانا گیلانیؒ چاہتے ہیں کہ دل و دماغ میں جاگزیں ہو ـــــ خاص ترتیب کے ساتھ ان کی عنبرین
تحریر کے خاص خاص نمونے بھی پیش کروں گا۔

اب میں کیوں زیادہ حائل رہوں آیئے مولانا گیلانیؒ کے افادات سے براہ راست مستفیض ہو جیئے ـــــ
بعد حمد و صلوٰۃ مقالے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"وحدت وجود اور وحدت شہود کی فنی نکتہ نوازیوں یا شریعت و طریقت کی ملایانہ و صوفیانہ معرکہ آرائیوں
کے ہنگاموں میں حضرت شیخ احمد فاروقی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے واقعی اور حقیقی کارنامے کچھ اس طرح
رل مل گئے کہ آج حضرت شیخ قدس سرہ العزیز کو مجدد الف ثانی کہنا بجز ایک روایتی خوش اعتقادی
کے بظاہر اور کسی امر مہم پر مبنی نہیں معلوم ہوتا ـــــ مشہور کر دیا گیا ہے کہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ
نے حضرتؒ کو اس خطاب سے کسی خاص وقت میں مخاطب کیا تھا اور اسی خطاب خاص نے رفتہ رفتہ
عام صورت اختیار کر لی لیکن کیا حضرت کا مجدد الف ثانیؒ ہونا محض ملا عبدالحکیم کے ایک خاص خطاب و
تلقیب ہی کا نتیجہ ہے؟"

آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"شاید غور نہیں کیا گیا۔ خصوصاً ہمارے علماء اور صوفیاء نے حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جب
دیکھنا چاہا تو اس ماحول سے جدا کر کے دیکھا جس میں آپ کا وجود مسعود قدرت کی جانب سے سرزمین ہند

کو عطا کیا گیا تھا"

بعدۂ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کی ایک تقریر کا ذکر کیا ہے کہ "انھوں نے اپنی تقریر میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ کیا وجہ تھی کہ مغل حکومت کے تخت پر چار بادشاہ مسلسل ایسے بیٹھے کہ ان میں دو پہلوں کو دو پہلوں سے کوئی تعلق نہ تھا؟ شاہ جہاں اور عالمگیر کا، جہانگیر اور اکبر سے مقابلہ کرکے دیکھئے دونوں میں کوئی مناسبت ہے"؟ —— پھر لکھتے ہیں کہ:-

"نواب علامہ کا یہ سوال جو فلسفۂ تاریخ سے تعلق رکھتا ہے یقیناً ایک عجیب سوال تھا اور میں اسکا اعتراف کرتا ہوں کہ سب سے پہلے اس اہم سوال کے جواب کا علم مجھے آپ ہی کی زبان سے ہوا اور در اصل اسی مجمل جواب کی آج کچھ تفصیل اس حد تک چاہتا ہوں جس حد تک کسی مجلاتی مقالہ میں گنجائش ہو سکتی ہے"

اس کے بعد سیر المتاخرین کی ایک فارسی عبارت پیش کرکے —— جس میں دین الٰہی کا ذکر ہے اور ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ آسائش خلق اس دین میں تھی، عہد شاہجہاں میں تعصب شروع ہوا اور عہد عالمگیر میں تعصب شدت پذیر ہو گیا —— یوں رقمطراز ہوتے ہیں:-

"آج اسی مشاغبہ (پروپیگنڈا) کا نتیجہ ہے کہ عالمگیر اور مذہبی تعصب تقریباً دو مترادف الفاظ بن گئے ہیں۔ مشکل ہی سے اب کوئی تعصب کے لفظ کا تخیل اس طرح کر سکتا ہے کہ بے ساختہ اس کے ساتھ عالمگیر کی صورت بھی دماغ میں نہ کھنچ جائے۔ یہ سب کچھ کیا گیا اور اس اجمال کی تفصیل میں معلومات کے دریا بہا دیے گئے مجلدات شایع کیے گیے اور کیے جا رہے ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے باایں ہمہ ذوق بسط و تفصیل؛ دعویٰ کے دو پہلوؤں سے ایسی لاپرواہی برتی گئی کہ آج جب "ہسٹری کے شگوفوں" میں رگ گل پر بھی نشتر زنی سے نہیں چوکا جاتا۔ یہ دونوں پہلو غنچۂ دہن بستہ کی شکل میں چھوٹ گئے یا قصداً چھوڑ دیے گئے .... آج جب چیونٹی کی آنکھوں کے پردے گنے جاتے ہیں اور مکڑی کے جال کے تانوں کی بھی رپورٹ مرتب کی جاتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ایک ہی دعویٰ کے ایک پہلو کو تو آمنا و ثمن کیا جاتا ہے اور اس زور سے اس کا نرسنگھا پھونکا جاتا ہے کہ آنکھیں چیخ اٹھتی ہیں اور کان انگلیوں کے لیے بیتاب ہو جاتے ہیں — لیکن اسی دعویٰ کے دوسرے اجزاء کو اتنی کس مپرسی میں ڈال دیا جاتا ہو۔ کہ گویا علم و تحقیق کے وہ سزاوار ہی نہ تھے .... پوری تفصیل کے ساتھ بتانا چاہیئے بجا کہ الٰہی مذہب کی حقیقت کیا تھی — "خلق" جو آسائش میں تھی تاریخی حیثیت سے اس کی تحقیق کرنی چاہیئے کہ "خلق" کے تحت میں کون کون سی جماعتیں داخل تھیں اُن کی آسائش کی نوعیت کیا تھی اور آخر میں سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاہ جہاں کے عہد سے اس میں کیوں تبدیلی ہوئی اور کن موثرات کے

زیر اثر عالمگیر تک پہونچ کر اس نے شدت کی شکل اختیار کی۔ میری غرض یہ نہیں ہے کہ مورخین نے بالکلیہ ان اجزاء سے بحث نہیں کی ہو بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان میں بعض جز تو ایسے ہیں مثلاً آخری سوال، اس کو تو آج تک کسی کتاب میں اٹھانے کی کوشش ہی نہیں کی گئی اسی طرح خلق در آسائش بود کو بھی مجمل ہی رکھا گیا کسی نے نہیں بتایا کہ اس سے مراد خدا کی کونسی مخلوق ہے؟ البتہ الٰہی مذہب کا تھوڑا بہت ذکر ان کتابوں میں ضرور کیا جاتا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ جس رنگ میں کیا جاتا ہے اس سے بجائے علم کے شاید جہالت ہی میں زیادہ اضافہ ہوسکتا ہے۔ آخر دین اکبری کے متعلق جو مشہور کیا گیا ہے اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ایک صلح کل مسلک تھا اس میں تمام ادیان و مذاہب کو ایک نگاہ سے دیکھا جاتا تھا کسی مذہب والے کو دوسرے پر کوئی فوقیت نہیں دی جاتی تھی لیکن کیا یہ واقعہ ہو؟ جب واقعہ کا ذکر کیا جائیگا اسوقت معلوم ہوگا کہ واقعہ کیا تھا؟ اور اس کو کس رنگ میں پیش کیا گیا اس سے ان شاء اللہ تعالےٰ۔ الف ثانی کے کلمہ کی حقیقت بھی معلوم ہوگی:

پھر دین الٰہی کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"عہد کمپنی سے پیشتر کی کتابوں میں بھی اگر ڈھونڈا جائے تو اس مسلک کے مختلف عناصر اور اجزاء کا سراغ مل سکتا ہے لیکن بنظر احتیاط میں نے صرف یہ ارادہ کیا ہے کہ اکبری دربار کے سب سے زیادہ ثقہ راوی ملا عبدالقادر بدایونی کی مشہور کتاب منتخب التواریخ پر ہی کفایت کروں کیونکہ یہی ایک ایسا بیان ہمارے سامنے ہے جو حلفی شہادت کے بعد ادا کیا گیا ہے۔ .... کلی طور پر ان کے جزئی بیانات کی تصدیق میں خود حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت بھی ان شاء اللہ تعالےٰ پیش کی جائے گی۔ کیا اس کے بعد بھی شک کے لیے کوئی راہ ہوسکتی ہے؟"

اب مولانا گیلانیؒ واقعات کی تفصیل پیش کرنے سے پہلے وہ محضر نامہ پیش کرتے ہیں جس میں بادشاہ کو مجتہد قرار دیا گیا ہے — پھر لکھتے ہیں:۔

یہ تھی وہ پہلی منزل جہاں تقلید سے کنارہ کش ہوکر اکبر کو اجتہاد کے درجے پر پہونچایا گیا — لیکن اس کے بعد پھر کیا ہوا؟ وہی جو ہمیشہ اس کے بعد ہوا ہے — تھوڑے دنوں کے بعد علانیہ ائمہ و مجتہدین کی توہین و تحقیر ہونے لگی — دین کا بھرم اٹھ گیا۔ ملا صاحب اپنے کانوں سنی بیان فرماتے ہیں کہ ابوالفضل کی جراءت اس حد کو پہونچ گئی تھی کہ

"اگر کسی بحث مباحثے کے درمیان ائمہ مجتہدین کی بات پیش کی جاتی تو ابوالفضل اس کے جواب میں کہتا فلاں حلوائی اور فلاں کفش دوز اور فلاں چمڑے والے کے قول سے تم مجھ پر حجت قائم کرتے ہو؟"

ملا صاحب کے بیانات سے یہ دکھا کر کہ اس کے بعد صحابہ کرام کی توہین تک نوبت پہونچی اور آخر کار براہ راست اسلام اور پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخیاں ہونے لگیں ——— لکھتے ہیں:۔

"آج یورپ کے کمان سے جن تیروں کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ اب برس رہے ہیں حیرت ہوتی ہے کہ یہ سب کچھ آج سے تین سو برس پیشتر بھی ہو چکا تھا آخری کیفیت اکبر کے نفس کی یہ ہوئی کہ سن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں ملا صاحب کا بیان ہے ——— فاعتبروا یا اولی الابصار۔ ابتدا میں بات کتنی ہوتی ہے آخر کہاں تک جا کر ختم ہوتی ہے۔ ——— (دکھ) "احمد، محمد، مصطفےٰ وغیرہ نام"..... کی خاطر اور اندرونی عورتوں کی وجہ سے اس شخص (اکبر) پر گراں گذرنے لگے آخر کچھ دن کے بعد اپنے چند خاص لوگوں کے نام اس نے بدل بھی ڈالے" اور غالباً یہی وجہ ہے جیسا کہ ملا صاحب کا بیان ہے کہ اکبری عہد کے مصنفین خطبۂ کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت لکھنے سے گریز کرنے لگے .... یہاں تک کہ خود ملا صاحب کو جب مہابھارت کے ترجمے کے شروع میں خطبہ لکھنے کی فرمائش بادشاہ نے کی تو محض اس وجہ سے انھوں نے اعراض کیا کہ بغیر نعت وہ خطبہ لکھنا نہیں چاہتے تھے"

بدایونی کی زبانی عیسائی مشنری وفد کی آمد کا ذکر کر کے اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ان کی گستاخی و یاوہ گوئی کا تذکرہ کر کے مولانا گیلانی تحریر فرماتے ہیں:۔

"اللہ اکبر اتنی بدبختانہ بیہودگی کو سن کر بھی اکبر کی پیشانی پر بل تو کیا پڑتا نہایت خندہ جبینی سے ان کا استقبال کرتا ہے اور خاص اپنے شاہزادے مراد کو حکم دیتا ہے ——— (دکھ) چند اسباق ان پادریوں سے پڑھ لو۔

عقائد میں جس کا حال یہ ہو چکا اس کے اعمال کے متعلق سوال ہی فضول ہے ..... دیوان خانے میں کسی کی مجال نہ تھی کہ علانیہ نماز ادا کر سکے .... دینی شعائر کی ہجو میں اشعار بنائے گیے اور کوچہ و بازار میں وہی گائے جاتے تھے"

اس کے بعد دکھایا ہے کہ اس تخریب کے بعد ہزارۂ دوم کے نظریے اور دین الٰہی کی تعمیر کس طرح ہوئی؟ بادشاہ نے یہ خیال پکا لیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی مدت کل ایک ہزار سال تھی جو پوری ہو گئی ——— سکوں تک میں الف (ہزار) کی تاریخ لکھوائی اور بقول ملا صاحب اشارہ اس طرف تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ کے دین مبین کی عمر جو ہزار سال تھی وہ پوری ہو گئی۔

مولانا گیلانیؒ ان سب باتوں کو لکھ کر فرماتے ہیں:۔

"بہرحال آخر یہ طے کر لیا گیا کہ جدید ملت کی بنیاد رکھ دی جائے۔"

کچھ دور چل کر فرماتے ہیں:-

"القصہ اس سلسلے میں دوسروں کے بیان سے نہیں بلکہ خود ملا صاحب ہی کی دوسری عبارتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ الف ثانی، تحریف اسلام، مساوات ادیان ان تینوں نظریات کو طے کرنے کے بعد نماز روزہ اور وہ ساری چیزیں جن کا ثبوت سے تعلق ہے اُن کا نام تقلیدات رکھا گیا یعنی سب بے عقلی کی باتیں ٹھہرائی گئیں اور مذہب کی بنیاد عقل پر رکھی گئی نہ نقل پر۔"

اس زمانے میں بقول مولانا گیلانیؒ یہ ہو رہا تھا کہ

"مختلف مذاہب کی ٹولیاں یکے بعد دیگرے دھمکنے لگیں ہر ایک اپنے اپنے مذہب کو دربار میں پیش کرتا تھا۔۔۔ ملک فرنگ کے پادری آئے انھوں نے انجیل پیش کی اور ثالث ثلثہ کے متعلق دلائل پیش کیے اور نصرانیت کو حق ثابت کیا۔۔۔ ابوالفضل کو حکم دیا گیا کہ انجیل کا ترجمہ ان پادریوں سے پوچھ پوچھ کر کریں۔ گجرات کے شہر نوساری سے آتش پرست بھی آئے انھوں نے زردشت کی حقیقت ثابت کی یہ لوگ آگ کی بڑی تعظیم کرتے ہیں ان لوگوں نے بادشاہ کو اپنی جانب مائل کرنے کی کوشش کی اور کیانی بادشاہوں کے رسم و رواج سے واقف کیا۔ ان کے متعلق بھی ابوالفضل ہی کو حکم دیا گیا کہ ہمیشہ رات دن شاہی محل میں آگ روشن رکھنے کا انتظام کیا جائے۔"

۔۔۔۔۔۔" ابتداءً سب سے پوچھا جاتا تھا اور ہر مذہب والے کی رائے دریافت کی جاتی تھی جیسا کہ ملا صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے لیکن یہ ساری تعمیر جو ہو رہی تھی ظاہر ہے کہ ایک مستقل مذہبی نظام کی تخریب و تکذیب کے بعد ہو رہی تھی۔۔۔ ممکن ہے کہ ابتداءً اس عمارت منہدمہ کی چیزوں سے بھی اس جدید عمارت کی تیاری میں کام لیا جاتا ہو لیکن حالات نے تدریج کروٹ لینا شروع کیا اور نوبت آخر میں یہاں تک پہونچی کہ

> اسلام کی ضد اور توڑ پر ہر وہ حکم جو کسی دوسرے مذہب کا ہوتا اس کو بادشاہ نص قاطع اور قطعی دلیل خیال کرتے تھے بخلاف اسلامی ملت کے کہ اس کی ساری باتیں مہمل اور نامعقول، نوپید اعرب کے مفلسوں کی گھڑی ہوئی چیزیں خیال کی جاتیں۔"

اس لیے اب سلسلۂ تحقیقات میں اسلام کا نام تختے سے کاٹ دیا گیا، ''آخری طریقہ'' کار یہ رہ گیا کہ

مسلمانوں کے سوا جس شخص کی جو بات پسند آجاتی تھی اس کا انتخاب کر لیا جاتا تھا اس معاملہ میں اکبر کی رفتار جس نقطے پر پہونچ کر رہی ملا صاحب ہی اس کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں ——— پانچ چھ سال کے بعد اسلام کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا اور بات بالکل الٹ گئی ——— اور یوں مساوات مذاہب، ترجیح بلا مرجح[1] رواداری و انصاف کا سارا دعویٰ انتہائی تعصب کی شکل میں بدل گیا اور جب کبھی جس ملک اور قوم میں اس قسم کے دعاوی کا اعلان کیا گیا ہے اس کا آخر انجام یہی ہوا ہو...... ہمیشہ ارتداد و الحاد کی بنیاد رواداری کے نرم و دل کش دعوے پر قائم کی جاتی ہے لیکن اس مسلک کے سلوک کی آخری منزل وہی ہے جہاں بالآخر اکبر پہونچ گیا تھا .... اور وہی کمیٹی و انجمن جس کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ یورپ کے عہد تجدید کا نتیجہ ہے لیکن ملا صاحب فرماتے ہیں کہ اکبر نے اس کو بھی ریزولیشن کے خراد پر چڑھا کر رہا۔ چالیس آدمیوں کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی .... چہل تن کی اس مجلس میں مسائل پیش ہوتے تھے اور پھر عقل سے اس کا فیصلہ کیا جاتا تھا البتہ اس کمیٹی کی یہ ایک خصوصیت بھی تھی کہ اسلامی عقائد و اعمال کے متعلق ——— طرح طرح کے شبہے ہنسی مذاق کی شکل میں کیے جاتے اور اگر کوئی بیچارہ جواب دینے کا ارادہ کرتا تو جواب سے روک دیا جاتا۔ آزاد کمیٹیوں کا یہ عارضہ گویا نیا عارضہ نہیں ہے۔ سب کچھ بول سکتے ہو اور کچھ نہیں بول سکتے، اس تناقض کا کتنا اچھا ثبوت آج بھی قومی اور حکومتی مجلسوں میں ملتا رہتا ہے ——— یہ تھی اکبر دی گریٹ کی مسلمہ رواداری اور بیچارے اکبر کو کیا کہا جائے آج بھی مسلک "صلح کل" رواداری کے مدعیوں کا جو تجربہ ہو رہا ہے کیا اس سے اسکی تصدیق نہیں ہوتی لیکن سب کچھ سننے اور دیکھنے کے بعد جو سننا چاہتے ہوں اور دیکھنے سے آنکھیں میچے ہوں ان سے کیا کہیئے"۔

اس کے بعد دین الٰہی کے عناصر کا ذکر کرتے ہوئے مندرجہ باتوں کو حوالوں کے ساتھ بالتفصیل پیش کیا ہے۔

(۱) اکبر آفتاب کی عبادت دن میں چار وقت یعنی صبح و شام، دوپہر، آدھی رات میں لازمی طور پر کرتا تھا۔

(۲) اسی طرح آگ، پانی، درخت اور تمام مظاہر فطرت حتیٰ کہ گائے اور گائے کے گوبر تک کو پوجتا تھا اور قشقہ، جنیو سے اپنے بدن کو آراستہ کرتا تھا۔

(۳) کواکب پرستی میں غلو ہو گیا تھا۔

(۴) تناسخ کا قائل ہو گیا تھا۔

---

[1] مولانا کے مقالہ میں یہ لفظ اسی طرح ہے مگر سیاق سباق سے گمان ہوتا ہو کہ زلتِ قلم ہو شاید "بالمرجح" لکھنا چاہتے ہوں۔ ح۔ س

(۵) سوال منکر نکیر، حشر و نشر، حساب و میزان کا قائل نہ تھا۔

(۶) کلمہ میں لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ اکبر خلیفۃ اللہ پڑھا جاتا تھا۔

(۷) اس دین میں داخل ہونے کے لیے اس کلمے کے ساتھ ساتھ ایک تحریری معاہدہ بھی ہوتا تھا جس کی رو سے اسلام سے علحدگی اختیار کر لی جاتی تھی۔

(۸) اللہ اکبر خطوط کے سرناموں پر ہوتا تھا۔

(۹) بجائے اسلام کے مریدوں میں سے ایک اللہ اکبر کہتا دوسرا جل جلالہ۔

(۱۰) جو لوگ اس دین میں داخل ہوتے ان کو چیلہ کہا جاتا تھا۔

(۱۱) بارہ بارہ آدمیوں کی ٹولی نوبت بہ نوبت بادشاہ سے مرید ہوا کرتی تھی۔

(۱۲) اُن کو بجائے شجرے کے بادشاہ کی تصویر دی جاتی تھی جو مرصع جواہر نگار غلاف میں رکھ کر یہ لوگ اپنی دستاروں پر لگاتے تھے۔

(۱۳) علاوہ ان معبودوں کے جن کو پیر پوجتا تھا مریدوں کے لیے خود بادشاہ کی عبادت بھی دین کے اہم ارکان میں شمار کی جاتی تھی۔

(۱۴) سود، جوئے، اور شراب کو حلال قرار دیا گیا۔

(۱۵) داڑھی کے منڈانے کا رواج ہوا۔

(۱۶) غسل جنابت کو منسوخ کر دیا گیا۔

(۱۷) چچا اور خالہ کی لڑکی سے نکاح ناجائز قرار پایا۔

(۱۸) سولہ سال سے کم لڑکے کا اور چودہ سال سے کم لڑکی کا نکاح نہیں کیا جا سکتا تھا۔

(۱۹) ایک سے زائد نکاح نہیں کیا جا سکتا تھا۔

(۲۰) پردہ اٹھا دیا گیا تھا۔

(۲۱) بغیر نکاح کے حق مجامعت دیدیا گیا تھا۔

(۲۲) بارہ سال سے پیشتر ختنہ کرانا منع تھا۔

(۲۳) میت کو پانی میں ڈالا جائے یا جلا دیا جائے یا کسی درخت سے باندھ دیا جائے۔ اگر دفن کیا جائے تو سر مشرق کی جانب اور پاؤں مغرب کی جانب ہوں۔

(۲۴) ریشم، سونا، مردوں کے لیے حلال قرار دیا گیا۔

(۲۵) گائے کا گوشت حرام لیکن شیر اور بھیڑیے کا گوشت حلال تھا۔

(۲۶) عربی پڑھنا عربی جاننا عیب قرار دیا گیا اور فقہ و تفسیر و حدیث کے پڑھنے والے مطعون ہوئے۔

(۲۷) ان علوم کی جگہ نجوم، حکمت، طب، حساب، شعر، تاریخ و افسانہ رائج کئے گئے۔

(۲۸) ایسے حروف جو عربی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں مثلاً ث، ح، ع وغیرہ، ان کو بادشاہ نے بول چال سے باہر کر دیا اور اس پر عمل کی یہ صورت نکالی کہ اگر کوئی مثلاً عبد اللہ کو ابد اللہ بولتا تو بادشاہ خوش ہوتا۔

یہ اور انکے علاوہ بھی دشمنیٔ دین اسلام کے تمام پہلو دکھا کر اور اُن پر مفصل گفتگو کرنے کے بعد مولانا گیلانی لکھتے ہیں اور کتنے پتے کی بات لکھتے ہیں:۔

"بہر حال بات بہت طویل ہو گئی اور حرف مدعا سے پھر بھی میں اب تک دور ہوں لیکن کیا کیا جائے، روشنی کو وہی پہچان سکتا ہے جس نے اندھیرے کو دیکھا ہو .... آج جس خطرے سے ایمانیوں کے دل تھرا رہے ہیں اُن کو دیکھنا چاہئے کہ کل کا خطرہ کیا اس سے کم تھا؟ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت جو کچھ ہو سکتا تھا اب تو عقلی راہوں سے بھی اس کا ہونا بہت بعید ہے یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام کا درِ تابندہ ــــــ پروردۂ آغوش موج ہے نہ طوفانوں سے کبھی وہ گھبرایا اور نہ سیلاب اسکی رفتار کو دھیما کر سکے ــ واللہ مُتِمُّ نورہٖ ولو کرہ الکافرون"۔

اس کے بعد مولانا گیلانیؒ نے تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھانا ضروری سمجھا ہے ــــ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ــــ اس زمانے کے علماء سو نے بھی اقتدار کی ہوس میں باہمی مخالفت و عناد کی وجہ سے ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی جس کی وجہ سے بادشاہ کو اسلام سے تنفّر پیدا ہو گیا۔ اس کی تفصیل لکھتے لکھتے مولانا گیلانیؒ چیخ اٹھتے ہیں اور آہ سرد بھر کر یوں لکھتے ہیں:۔

"کیسا دردناک نظارہ ہے کہ خود دین کے معماروں کے ہاتھوں دین کی بنیاد کھُد رہی تھی اور کسی کو اس کا خیال بھی نہیں آتا تھا کہ آخر اس کا انجام کیا ہو گا علماء و مشائخ کی عام حالت تو یہی تھی لیکن اللہ کے بندوں سے زمانے کا کوئی حصہ خالی نہیں ہوتا۔ اسی ہنگامے میں کبھی کبھی ایسے نفوس بھی نظر آجاتے ہیں جن کے سامنے دنیا سے زیادہ آخرت اور نقد سے زیادہ نسیہ عزیز ہوتا ہے۔ حضرت سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے مولانا بدر الدینؒ کا کارنامہ اس سلسلے میں سب سے زیادہ ممتاز ہے .... درباری اُمرا میں ایک صاحب قطب الدین خاں تھے اکبر دین جدید کی ان کو بھی تبلیغ کیا کرتا تھا، خاں صاحب نے ایک دن فرمایا ــــــــ دوسرے ممالک کے

سلاطین مثلاً روم کے اخوندکار (سلطان ترکی) وغیرہ اگر ان باتوں کو سنیں گے تو کیا کہیں گے؟ اکبر اس فقرہ پر بگڑ گیا .... اور خوب برسا ....

لیکن بدتمیزی کے اس طوفان کا مقابلہ بھلا ان تنکوں سے کیا ہو سکتا تھا؟ قدرت ہمیشہ ایسے موقع پر ایسی عظیم ہستی کو برسرکار لاتی ہے جو وہبی کمالات اور قوتوں سے سرفراز ہوتا ہے اور دراصل یہ ساری تمہید اسی بزرگ ہستی اور اس کے محیر العقول کارنامے، آہنی عزائم و ارادے کی تفصیل ہی کے لئے تھی ——— لیکن تمہید بھی اتنی طویل ہو چکی ہے کہ اب اس کے لیے کسی دوسرے مستقل باب یا مقالے کی ضرورت ہے، بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ مذکورہ بالا واقعات ملاحظہ کرنے کے بعد اب اندازہ ہو سکتا ہے کہ مغلی تخت پر اکبر کے نام سے جو بادشاہ پچاس سال بیٹھا رہا وہ کیا تھا؟ اور پھر اچانک عہد جہانگیری میں دریا کا رخ بدلتا ہے، تا آنکہ شاہجہاں کے عہد تک پورا بدل جاتا ہو اور عالمگیری دور میں تو وہ اسی سمت غراٹے بھرنے لگتا ہے ——— صرف اتنی سی بات حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے پہچاننے کے لیے اس وقت کافی ہو سکتی ہے جب یہ بتا دیا جائے کہ جو کچھ ہوا حق تعالیٰ نے اس کا ذریعہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی ہستی گرامی کو بنایا ——— میں نے ارادہ کیا تھا کہ واقعہ کے اس رخ کو بھی تفصیل کے ساتھ لکھوں میں جانتا تھا کہ اکبری فتنہ جس کا دوسرا نام الف ثانی کا فتنہ ہے عوام تو عوام خواص بھی بجز چند مشہور باتوں کے واقف نہیں ہیں یا ان کو ناواقف رکھنے کی کوشش کی گئی ہے ——— ضرورت تھی کہ اس پہلو کو خوب اچھی طرح واضح کیا جائے۔ خدا کا شکر ہو اس پر ایک سیر حاصل بحث کرنے کا مجھے موقع مل گیا اگرچہ جو کچھ بھی لکھا ہے اس کے مقابلے میں بہت کم ہے جو واقع ہوا تھا اور جس کا مواد تاریخ کے منتشر اوراق میں بکھرا ہوا ہے ....

اکبر کی تخت نشینی کے آٹھویں سال ۹۷۱ھ میں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت باسعادت بمقام سرہند ہوئی، کم و بیش چالیس سال کا زمانہ آپ نے دور اکبری میں گذارا ——— حضرتؒ کی عمر کا یہ حصہ زیادہ تر علوم ظاہری و باطنی اور کمالات باطنی کے حصول میں صرف ہوا۔ جوانی کے ایام میں آپ اکبر آباد (آگرہ) بھی تشریف لائے تھے جہاں دربار کے ان دونوں عالموں ابوالفضل و فیضی سے آپ کی خوب خوب ملاقاتیں رہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس ارادے کا ظہور بعد کو ہوا اس کا تخم ان ہی ملاقاتوں کے سلسلے میں پیدا ہوا۔ ابوالفضل و فیضی آپ کی غیر معمولی قابلیت ذہن و ذکاوت سے بہت متاثر تھے ——— حج کے ارادے سے آپ ایک دفعہ (سرہند سے) دہلی آئے، یہاں حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ بعض غیبی اشاروں کے ماتحت ماوراء النہر سے دہلی پہونچ کر "کسی" کے

انتظار میں بیٹھے تھے کہ اتنے میں

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

دونوں میں ملاقات ہوئی پھر کیا طے ہوا خدا ہی جانتا ہے اس کے بعد دیکھا گیا کہ حضرتؒ ......
سرہند کی طرف لوٹ گئے اور وہیں اپنے مرشد کی زیر نگرانی سلوک کے مقامات طے کرتے رہے۔
ابوالفضل و فیضی کی صحبت آگرہ میں آپ کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔ ان لوگوں سے آپ کو فتنے کے اسباب اور ان کے موثرات کے سمجھنے کا موقع ملا جس نے بادشاہ اور اسکی حکومت کو اسی نقطے تک پہونچا دیا تھا ....

خلاصہ یہ کہ اکبر کا زمانہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے لیے تیاری کا زمانہ تھا ادھر اس کا انتقال ہوا اور جہانگیر تخت پر بیٹھا کہ آپ میدان میں اتر پڑے .... مکاتیب اٹھا کر دیکھو جہانگیر کے دربار کا شاید ہی کوئی ممتاز رکن ہو گا جس کے نام آپکے خطوط نہیں۔ خان اعظم خان جہاں۔ خان خاناں۔ مرزا داراب۔ قلیچ خاں۔ خواجہ جہاں اور سب سے زیادہ نواب سید فرید صاحب[1] وغیرہم کے نام خطوط ہیں۔ ان تمام خطوں کا قدر مشترک صرف ایک مقصد ہے کہ جس طرح ممکن ہو اس نقصان کی تلافی ہونی چاہیئے جو اسلام کو اکبری عہد میں پہنچ گیا ہے ......

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دربار کے ان امراء پر آخر کس طرح قابو حاصل کیا حالانکہ کوئی زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا یہ جتنے تھے اکبر ہی کی تھیلی کے چٹے بٹے تھے، ابوالفضل و فیضی کے فیض یافتہ تھے۔ ان اسباب کا احاطہ اور استقصاء اور وہ بھی اس مقالے

---

[1] یہ حضرت سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں کی اولاد میں سے تھے۔ عہد اکبری میں ڈیڑھ ہزاری اور عہد جہانگیری میں پنج ہزاری منصب دار ہوئے۔ مرتضیٰ خاں ان کا خطاب تھا۔ کتب تاریخ و تذکرہ میں "شیخ فرید" "شیخ فرید دہلوی" اور شیخ فرید بخاری دہلوی تینوں طرح سے مشہور ہیں۔ اکبر نامہ جلد ۳ ص ۴۱۲ میں شیخ فرید بخشی بیگی ــــ یہی ہیں ــــ شیخ فرید دہلویؒ کا تعلق حضرت خواجہ باقی باللہؒ سے حضرت مجددؒ سے بھی پہلے لاہور میں ہو گیا تھا۔ جامع السلاسل (قلمی) سے معلوم ہوتا ہو کہ لاہور میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ کا ظاہری تکفل انہی شیخ فریدؒ نے کیا تھا۔ گویا کہ حضرت خواجہ کے زمانۂ قیام لاہور میں یہ ان کے میزبان تھے ـــــ اور ان کے اخراجات کی کفالت اپنے لیے سعادت دارین سمجھتے تھے۔ کتنا بڑا شرف تھا جو اس سید الاصل بزرگ زادہ رئیس کو حاصل ہوا تھا ـــــ فریدی

میں مشکل ہے۔ لیکن سرسری طور پر اس عہد کے علماء اتنا تو اندازہ کر سکتے ہیں کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے لکھنے لکھانے میں کیا وہ رنگ اختیار نہیں کیا تھا جو اس عہد کے بڑے بڑے انشاپردازوں کا تھا؟ ایک طرف ابوالفضل کی سحر نگاری کو رکھئے اور دوسری طرف حضرت مجددؒ کے زورِ قلم کو دیکھئے پھر اندازہ کیجئے کہ انشاء کا زور کس میں ہے؟ اسی کے ساتھ آپ نے دینی حقائق کی تعبیر میں بھی اپنے زمانے کا ساتھ دیا ——— کہتے وہی تھے جو تیرہ سو سال پیشتر سے کہا جاتا تھا لیکن کہنے کا ڈھب وہ اختیار کیا کہ سننے والے کو محسوس ہوتا تھا کہ شاید کوئی نئی باتیں سن رہا ہے .... جن منشیانہ اور فلسفیانہ تعبیروں سے الحاد پیدا کیا گیا تھا شیخ فاروقیؒ کے خطوط میں دیکھو ٹھیک ان ہی تعبیروں سے وہ براہ راست قرآنی تعلیمات اور پیغمبرانہ سنن کی عظمت، قلوب میں اتارتے چلے جاتے ہیں۔ کیا اس زمانے کے علماء کے لیے اس میں کوئی عبرت رہی؟۔

.... علماء صرف ان لوگوں پر قناعت کیے ہوئے ہیں جو ابھی حکومت سے دور ہیں یا دوسرے لفظوں میں جن پر جدید تعلیم کا اثر نہیں پڑا ہے لیکن بکری کی ماں کب تک خیر منائے گی خصوصاً لازمی تعلیم کے بعد کیا آپ امید کرتے ہیں کہ آپ کی قوم میں پھر کوئی ایسی جماعت بھی رہ جائے گی جس کو موجودہ تعلیم کی ہوا نہ لگی ہو ——— اگرچہ قیمتی اوقات کا بہت بڑا حصہ ضائع ہو چکا ہے لیکن پھر بھی کامل مایوسی کی حد تک بات نہیں پہونچی ہے ——— لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ چیزیں بھی اسی وقت کارگر ہو سکتی ہیں جب ان سے بھی پہلے کام کرنے والا اپنے اندر اس یقین کو پیدا کر چکا ہو جو بےچین کر کر کے اس کو کام کرنے کے لیے مضطرب اور بےکل کر دے وہ کام کو نہ اٹھائے بلکہ کام ہی اس کو اٹھائے۔ ورنہ مذبذب ٹھنڈے دلوں سے آپ اس گرمی کو کہاں سے پیدا کر سکتے ہیں جن کے شعلے حضرت مجددؒ کے لفظ لفظ سے پھوٹے پڑتے ہیں ——— خدا کا شکر ہے کہ ابھی علماء کے چند افراد میں یقین کا ذخیرہ باقی ہے وہ اس کو دوسروں تک منتقل کر سکتے ہیں لیکن صرف اس کی ضرورت ہے کہ جن کو یہ یقین سپرد کیا جائے ان کو عصری اسلحہ اور آلات سے بھی تھوڑا بہت مسلح ہو جانے کا سامان کر لیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ اسی "گرد" سے کوئی سوار آج نہیں تو کل نکل پڑے"

اس کے بعد مقالہ کو اختتام کی طرف مائل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"درباری امراء کو قابو میں لانے کے بعد حضرت مجددؒ رحمۃ اللہ علیہ کو ابتداء میں بعض دشواریاں بھی اٹھانی پڑیں .... آپ پر بعضوں نے کفر کا اور بعضوں نے فسق کا فتویٰ صادر کیا بادشاہ کو بھی بدگمان کرنے کی کوشش کی گئی .... آپ کو گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کیا گیا۔ زندان کے یہ

دن حضرت مجدد کے بڑے پرلطف گزرے۔ مکتوبات میں اس کی طرف مختلف مقامات میں اشارہ بھی کیا گیا ہے۔ کما لا یخفی علی من طالعہا ــــــ لیکن "افق" کا آفتاب کب تک چھپا رہتا۔ صبح ہوئی اور اس کا دمکتا ہوا "چہرہ" لوگوں کے سامنے تھا۔"

اس کے بعد وہ مکتوب مجدد مع ترجمہ درج کیا ہے جو زنداں سے رہائی کے بعد خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ (صاحبزادگان) کے نام ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہانگیر کے دربار میں آپ کا بڑا اعزاز واکرام ہونے لگا (فتنہ اکبری کے رد عمل کے لیے آپ جن مضامین پر دربارِ جہانگیری میں گفت گو فرماتے تھے ان کی اجمالی فہرست بھی اس میں آگئی ہے) ــــــ یہ مکتوب جلد سوئم کا مکتوب ۱۳ ہے۔

آخر کار ان الفاظ پر اپنے دلچسپ اور مفید اور پراز معلومات محققانہ مقالے کو ختم کردیتے ہیں۔

"بہرحال حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اس کے بعد جہانگیر کی گرویدگی اتنی بڑھی کہ برابر اپنے ساتھ آپ کو شاہی کیمپ میں رکھتا تھا اور آخر میں اپنے ولی عہد شاہزادہ خرم (شاہجہان) کو آپ کے دست حق پرست پر بیعت کرنے کا حکم دیا اور یوں مغل امپائر کو خدا کے ایک فقیر نے بے داموں خرید لیا۔ چاہتا تو اس سے وہ اپنی بادشاہی کا کام لے سکتا تھا لیکن وہ اس کے بعد بھی فقیر ہی رہا بلکہ سچ یہ ہے کہ کتنے بادشاہوں کو بادشاہی کے ساتھ بھی فقیر ہی بنائے رکھا۔"

(از افادات مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ)

حج کیا ہے؟

[اس مضمون میں عام ناظرین کی سہولت کے خیال سے کہیں کہیں الفاظ میں کچھ حذف و اضافہ یا تبدیلی کی گئی ہے۔ یہ تصرف صرف لفظی ہے اور امتیاز کیلئے زیر خط کر دیا گیا ہے۔ مرتب]

کثرتوں کا ارتکازی مجموعہ خواہ چھوٹا ہو خواہ بڑا، ہاتھی کا کوہ پیکر جثہ ہو یا برگد کے پھلوں کا خشخاشی تخم و حبّہ، ہر ایک میں دیکھا جا رہا ہے کہ ان کے بکھرے ہوئے اجزاء کی پیوستگی اور باہمی ارتباط کو قائم رکھنے کے لیے بھی اور اپنے ذہنی کمالات کو نشو و نما، ارتقاء و بالیدگی کے آخری نقاط تک پہونچانے کے لیے بھی، ایک ایسا مرکزی نقطہ ہر ایک میں پایا جاتا ہے کہ اس مرکزی نقطے کے وجود کو اگر اس سے نکال لیا جائے تو ایک طرف سارے سمٹے ہوئے اجزاء بکھر جائیں گے اور دوسری طرف بیرونی فیوض کو جذب کر کے ارتقاء و نشو و نما کے جس عمل کو یہ مرکزی نقطہ جاری رکھے ہوئے تھا یہ عمل بھی رک جائے گا۔

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اسکو مثال سے سمجھئے، آم کی گٹھلی یا اسی قسم کے پھلوں کے تخم کو آپنے دیکھا ہوگا آپ جانتے ہیں کہ آم کا درخت اسی گٹھلی سے برآمد ہوتا ہے، پتے، شاخیں، پھول پھل کا ایک طوفان ہوتا ہے جو اس گٹھلی کی راہ سے اپنی اپنی شکلوں کے ساتھ باہر نکل نکل کر آم کے درخت کا جزء بنتا رہتا ہے۔ لیکن آم کی اسی گٹھلی کو چیریئے۔ اس میں ایک چیز آپ کو نظر آئے گی، جسے تخموں اور گٹھلیوں کا انکھوا کہتے ہیں آپ جانتے ہیں کہ گٹھلی سے اس انکھوے کو نکال لینے کے بعد خواہ کتنی ہی اچھی نرم اور پاکیزہ زمین میں اس کو بو یا جائے اور چشموں کے کیسے ہی صاف و شفاف پانی سے اس کی آبیاری کی جائے لیکن بجائے اس کے کہ اس گٹھلی سے پودا نکلے آپ دیکھیں گے کہ گٹھلی سڑتی جا رہی ہے تا اینکہ بالآخر سڑ سڑ کر اس کے اجزاء مٹی میں مل کر ادھر ادھر غائب ہو جائیں گے۔

حاصل یہی ہو کہ گٹھلیوں کا یہی مرکزی نقطہ وہ نقطہ ہے کہ دیکھنے میں خواہ کتنا بھی بے حیثیت اور معمولی چیز نظر آتا ہو لیکن کسی درخت کے شجری نظام اور اس کے سارے آثار و نتائج کا حصول یقیناً اسی مرکزی نقطہ کے ساتھ وابستہ ہے اسی کو نوچ کر گٹھلی سے الگ کر لیا جائے تو سارے فیوض جن سے درخت، کا تنا اس کی ڈالیاں، شاخیں، پتے پھول پھل جو مستفید ہوتے رہتے ہیں ان کا قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔

الغرض حیوانی و انسانی اجسام میں جو حیثیت قلب کی ہے اور نباتی حقائق کے لحاظ سے جو اہمیت گٹھلیوں کے اس مرکزی نقطے کی ہے جسے عوام گٹھلیوں کا انکھوا کہتے ہیں، دل یہ پوچھتا ہے کہ مٹی کا یہ تودہ جس کا نام زمین اور دھرتی ہے، جس سے علاوہ عناصر اور معدنی مرکبات کے نباتی، حیوانی، انسانی ہستیوں کی بے پناہ موجیں ابل رہی ہیں، ان ساری پیداواروں کے لیے زمین بھی اپنے اندر کوئی ایسی چیز رکھتی ہے جسے ارضی فیوض و برکات کا مرکزی نقطہ ٹھہرایا جائے ؟ کیا اس کا بھی کوئی دل ہے ؟ جس سے مختلف ارضی پیداواروں کی رگوں میں نشو ونما اور ارتقا و بقا کا خون دوڑ رہا ہے، یا یوں سمجھئے کہ یہ خاکی گٹھلی بھی اپنے اندر کوئی ایسا انکھوا رکھتی ہے کہ اسی کے ساتھ ان ساری چیزوں کا قیام وابستہ ہو، جو زمین سے پیدا ہو رہی ہیں اور تمام خطرات کا مقابلہ کرتے ہوئے اس خاکی کرے کی پشت پر نمایاں ہو ہو کر جب ارضی پر اپنے اقتضائی کمالات کو حاصل کرتی چلی جا رہی ہیں ؟

نہ ماننے والوں سے ابھی بحث نہیں، جنھوں نے مانا ہے کہ

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ (المائدہ) — بنایا اللہ نے الکعبہ کو جو البیت الحرام (محترم گھر) ہے سارے انسانوں کے قیام کا ذریعہ۔

یہ اسی کی خبر ہے جو زمین کا اور زمین میں جو کچھ ہے سب کا پیدا کرنے والا ہے، خود بتائیے کہ ان ماننے والوں کی نظر، ان سوالوں کے جواب میں کعبہ کے سوا کیا کسی دوسری چیز پر پڑ سکتی ہے، وہی "الکعبۃ البیت الحرام" جس کا تذکرہ کرتے ہوئے اسی قرآن میں قیام و بقا سے بھی آگے بڑھ کر۔

اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا (البقرہ) — اور دیکھو جب ہم نے بنایا اسی "البیت" (گھر) کو انسانوں کے لیے مثابہ اور امن کا ذریعہ)

کی بھی جب تصریح کر دی گئی ہو اور مثابہ، جیسا کہ علامہ راغب اصفہانیؒ نے اس کی تشریح کرتے ہوئے اپنے مفردات میں لکھا ہے، کنوئیں کی اس خاص جگہ کو کہتے ہیں جہاں سے پینے والوں کو پانی پلایا جاتا ہے۔ اب سوچئے کہ یہی حیثیت مثابہ ہونے کی جب "الکعبۃ" کو حاصل ہے تو حاصل اس کا بجز اس کے اور کیا ہو اکہ سارے فیوض و برکات جو زمین کے اس کرے پر تقسیم ہو رہے ہیں ان کے گزرنے کا مرکزی نقطہ یہی "الکعبہ" ہے اور صرف "مثابہ" ہی نہیں بلکہ اسی آیت کے لفظ "امنا" سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ امن و امان کی بھی ساری ذمہ داری قدرت نے اسی "البیت الحرام" کے ساتھ وابستہ فرما دی ہو، الغرض یہاں جس[1] کسی کو جہاں کہیں

---

[1] مجھے تعجب ہوتا ہو کہ بعض لوگ قرآن کے بعض الفاظ مثلاً "النَّاس" ہی کے معنی جو لغت میں ہیں اسی کو چھوڑ کر من مانے معنی لکھ دیتے ہیں مثلاً "النَّاس" سے مراد اہل مکہ لیتے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ لغوی معنی کو چھوڑنے کی کیا وجہ ہوئی (باقی اگلے صفحہ پر)

جو کچھ بھی مل رہا ہے اسی "الکعبہ" کی راہ سے مل رہا ہے، یہ قرآن کے نصوص صریحیہ کا اقتضاء ہے۔

گویا یوں سمجھنا چاہیئے کہ ساری کائنات کے ساتھ "العرش" کی نسبت قرآن نے جو بیان کی ہے کہ الرحمٰن اسی "العرش" کو مرکز بنا کر اپنی رحمتیں دنیا میں تقسیم فرما رہا ہے یہی نسبت زمین کے خاص کرے کے ساتھ "الکعبہ" بھی رکھتا ہے روایتوں میں "الکعبہ" کے متعلق اسی قسم کے الفاظ جو پائے جاتے ہیں مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کو خطاب کرکے رب العزت نے فرمایا کہ

یا آدم اھبطت لک بیتا تطوف به کما یطاف حول العرش وتصلی عندہ کما یصلی عند عرشی۔ (تاریخ الخمیس عن قتادہ وعطار صفحہ ۱/۴۳)	اے آدم اتارا ہے میں نے تیرے لیے ایک گھر تو اس گھر کا اسی طرح طواف کرے گا جیسے "العرش" کے گرد طواف کیا جاتا ہے اور تو اس گھر کے آگے اسی طرح نماز پڑھے گا۔ جیسے میرے عرش کے سامنے نماز پڑھی جاتی ہے۔

اور ایک یہی روایت نہیں بلکہ اسی قسم کے الفاظ دوسری روایتوں میں جو پائے جاتے ہیں ان سے بھی اس مسئلہ کی تصدیق ہوتی ہے کہ کرہ ارض کا قلب اور وہ مرکزی نقطہ جس سے سارے برکات وفیوض اس زمین پر بٹ رہے ہیں وہ یہی "الکعبہ" ہے۔

اور روایتوں کو تو جانے دیجئے .... کہ مشہور قرآنی آیت

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ	سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا وہ قطعاً وہی ہے جو "بکہ" میں ہے جو سارے جہانوں کے لیے مبارک بھی ہے اور ان کی ہدایت کا سرچشمہ بھی۔

کے بعد تو اس قسم کی روایتوں سے تائید حاصل کرنے کی بھی قطعاً ضرورت باقی نہیں رہتی، آخر روایتوں سے اور کیا معلوم ہوتا ہے یہی تو کہ زمین کے کرے پر سب سے پہلا نقطہ جو متعین کیا گیا یہ وہی حصہ ہے جسے الکعبہ کی دیواریں اس وقت

(پچھلے حاشیہ کا بقیہ) جیسے کافۃ للناس یا رب الناس، ملک الناس وغیرہ میں یہی لوگ "الناس" کے وہی معنی بیان کرتے ہیں جس کے سوا "بغتۃ" اسی لفظ کا دوسرا ترجمہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک میرا خیال ہے غیر شعوری طور پر کچھ اس قسم کا احساس ان لوگوں میں پایا جاتا ہے کہ قرآن جس ماحول میں نازل ہوا ہے اس کے لحاظ سے زیادہ وسیع معانی پر قرآنی الفاظ کا اطلاق کچھ ان کے لیے ناقابل برداشت سی بات ہوتی ہے، کاش وہ سمجھتے کہ اس قسم کا احساس ان کے ایمانی دعوے کی تکذیب تو نہیں ہو۔ بےشک جس ماحول میں قرآن نازل ہوا وہ جاہلی ماحول تھا لیکن جو نازل کر رہا تھا کیا اس کا علم محیط جاہلی ماحول کا تابع تھا؟

تنگ گھیرے ہوئے ہیں، روایتوں پر تو یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ اس واقعہ کا مشاہدہ کرنے والا اس وقت کون موجود تھا، لیکن قرآن کی خبروں کو جو یقین کرتے ہیں کہ خالق کائنات کی دی ہوئی خبریں ہیں ان کے لیے تو اس شبہ کی گنجائش بھی باقی نہیں رہتی کیونکہ یہ تاریخی شہادت تو اسی کی ہے جو اس وقت بھی موجود تھا جب نہ زمین پھیلائی گئی تھی اور نہ آسمانوں کے خیمے تانے گئے تھے، اور اس وقت بھی وہ غائب نہ تھا جب " النّاس " یعنی نسل انسانی کے لیے یہ سب سے پہلا گھر بنایا جارہا تھا بلکہ اس واقعہ کی خبر دینے والا ہی جب وہ ہے جس نے حد باری کے اس عمل سے زمین کے اسی خاص حصہ کو امتیاز بخشا ہے تو اس سے بڑھ کر یقینی خبر اور کس کی ہوسکتی ہے۔

یہی نہیں بلکہ آگے " مبارکا " کے لفظ کا اضافہ جو اس آیت میں کیا گیا ہے اس کا مطلب آپ خود سوچئے کہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ برکتوں کا خزینہ اور فیوض کا حقیقی دفینہ بھی زمین کے اسی حصہ کو بنایا گیا، یہی وہ قدرتی سرچشمہ ہے جس سے برکتیں ابل رہی ہیں اور وہیں سے چھلک چھلک کر ساری دنیا میں تقسیم ہورہی ہیں، اور یہ میں اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ " العالمین " یعنی سارے جہانوں کے لیے راہنمائی اور ہدایت کا توحیدی نظام جب قائم کیا گیا اور نبوت کو ختم کرکے " العالمین " کی ہدایت کا مرکزی مقام مکہ منتخب ہوا جیسا کہ " ھدیً للعالمین " کے الفاظ کا اقتضا ہے، تو یہ اتفاقی واقعہ نہ تھا، بلکہ مادی برکتوں کا سرچشمہ جو مقام تھا اسی کو دینی و اخلاقی تعلیمات کی اشاعت کا مرکز بھی مقرر کیا گیا، آخر " للعالمین " کے لفظ کا تعلق صرف " ھدی " ہی کے لفظ سے کیوں سمجھا جائے، میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ " مبارکا " کے لفظ کو بھی " للعالمین " سے مربوط سمجھنا چاہیئے۔

مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ ان صریح نصوص اور واضح بینات کی روشنی میں بھی " اُمّ القریٰ " (جو مکہ کا قرآنی نام ہے) اس کے سمجھنے یا سمجھانے سے لوگ کیوں گریز کرتے رہے " القری " لفظ یقیناً ایک عام اور مطلق لفظ ہے ان ساری آبادیوں کو حاوی ہے جو بسیط زمین کے کسی گوشہ میں شرقاً و غرباً، شمالاً و جنوباً پہلے پائی گئی ہوں۔ یا اب پائی جاتی ہوں یا آئندہ پائی جانے والی ہوں، وہ ایشیا میں ہوں یا افریقہ میں، امریکہ میں ہوں یا یورپ میں۔ قرآنی الفاظ کے مستند شارح علامہ راغب نے بھی " ام القریٰ " کی یہی تشریح کرتے ہوئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ان الفاظ کو نقل کیا ہے، کہ

ان الدنیا دُحِیَتْ من تحتہا   ساری دنیا اسی کے نیچے سے پھیلائی گئی ہے۔

اشارہ اسی برکاتی مرکزیت کی طرف ہے جسے قرآن میں " مبارکا " کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔

بلکہ بجائے " مکہ " کے اسی آبادی کے دوسرے نام یا تلفظ یعنی " بکّہ " کے لفظ کو قرآن نے یہاں جو اختیار کیا ہے میرے خیال میں یہ بھی کوئی اتفاقی بات نہیں ہے نزول قرآن سے صدیوں پہلے " الکعبہ " کی اسی عالمگیر اہمیت کا انکشاف کرتے ہوئے پیغمبر داؤد علیہ السلام کی کتاب زبور میں ان والہانہ تمہیدی فقرات کے بعد کہ

" اے لشکروں کے خداوند تیرے مسکن کیا ہی دلکش ہیں، میری روح خداوند کی بارگاہ کے لیے آرزومند

بلکہ گداز ہوتی ہے۔ میرا من، میرا تن زندہ خدا کے لیے للکارتا ہے"

درمیان کا یہ فقرہ چھوڑ کر ـــــ جس میں اس کی مثال دی گئی ہے کہ ہر چیز ایک مرکز رکھتی ہے ـــــ کہ

"گوریّے نے بھی اپنا گھونسلہ، اور ابابیل نے بھی اپنا آشیانہ پایا ہے جہاں وہ اپنے بچے رکھیں"

آخر میں زبور کا یہ مشہور فقرہ ہے کہ

"مبارک وہ انسان ہیں جن میں قوت تجھ سے ہے اور ان کے دلیں تیری راہیں ہیں وے بکہ کی وادی میں گذر کرتے ہیں اور اسے ایک کنواں بناتے ہیں۔ پہلی برسات اسے برکتوں سے ڈھانپ لیتی ہے"

یہ داؤد کی کتاب "زبور" کے مزبور ۸۴ کے فقرے ہیں جس میں چاہ زمزم ہی کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ قرآنی لفظ "مبارک" کے مفہوم کو بھی خاص پیرایہ میں ادا کر دیا گیا ہے، پہلی برسات الرحمٰن کی پہلی توجہ ہے جو کرۂ زمین کی آبادی کے لینے کی گئی۔

میں جانتا ہوں کہ آج کل زبور کے جو تراجم شائع ہو رہے ہیں اس میں "بکّہ" کے لفظ کو اپنی اصلی صورت پر چاہا گیا ہے کہ باقی نہ رکھا جائے۔ بعض نسخوں میں بجائے "وادی بکہ" کے "وادی بقا"[1] اور بعضوں میں "وادی بکا" کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ لیکن دور جانے کی ضرورت نہیں۔ مسلمانوں میں آج کل سیرۃ النبی صلوٰۃ اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں جو کتاب سب سے زیادہ مقبول اور عموماً ہر جگہ مل سکتی ہے اس میں آپ مشہور عیسائی عالم جو نسلاً یہودی تھا یعنی پروفیسر مارگولیوتھ کی یہ شہادت پڑھ سکتے ہیں جس میں اس نے بیان کیا ہے کہ بجز مکہ معظمہ کے زبور کا یہ "بکّہ" اور کوئی دوسرا مقام نہیں ہو سکتا۔ اور یہی میرا خیال ہے کہ بجائے عام اور مشہور نام "مکہ" کے یہ بتاتے ہوئے کہ یہی گھر سب سے پہلا گھر ہے مندرجہ بالا آیات میں "بکہ" کے نام اور تلفظ کو جو اختیار کیا گیا ہے تو یہ اشارہ اسی مزبور (۸۴) کی طرف ہی جس میں داؤد علیہ السلام نے "بکہ" ہی کے لفظ سے اس کو یاد کیا ہے جو "الکعبہ" کی قدامت کے لیے یقیناً ایک اہم تاریخی وثیقہ ہے، موجودہ زمانہ کے حساب سے تین ہزار سال سے کم پرانی شہادت یہ نہیں ہے۔

لیکن داؤد علیہ السلام کا زمانہ تو نسبتاً بعد کا زمانہ ہے ان سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب نوشتے جو بائبل کے موجودہ مجموعہ میں پائے جاتے ہیں اس میں "الکعبہ" کے متعلق آپ کو مسلسل تاریخی شہادتیں ملتی چلی جائیں گی۔

---

[1] افسوس ہے کہ زبور کا وہ نسخہ اس وقت میرے پاس موجود نہیں ہے جس میں بجائے وادی بکہ کے وادیٔ بقا کا لفظ چھپا ہوا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ۱۹۲۲ء کا یہ مطبوعہ نسخہ تھا دیوبند سے آتے ہوئے لکھنؤ کے اسٹیشن پر فقیر نے کسی عیسائی کتب فروش سے زبور کا یہ نسخہ لیا تھا۔ یہ الگ چھپا ہوا تھا، لوح اس کی سبز رنگ کی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۲

مثلاً توراۃ کا فقرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق، کہ

"اس نے بیت ایل کے پورب کے ایک پہاڑ کے پاس اپنا ڈیرہ قائم کیا۔ یم (یعنی سمندر) اس کے پچھم اور عی اسکے پورب تھا"

توراۃ کے جو عالم ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ "بیت ایل" یعنی بیت اللہ جس کے پورب طرف ابراہیم نے اپنا ڈیرہ گاڑا تھا۔ یہ وہی "الکعبہ" (بیت اللہ الحرام) کا مرکزی نقطہ تھا جہاں بعد کو حضرت ابراہیم نے اپنے صاحبزادہ اسمٰعیل علیہ السلام کے ساتھ گھر اٹھایا تھا۔ یم یعنی سمندر کا الکعبہ کے مغربی سمت میں ہونا تو ایک عام کھلی ہوئی حقیقت ہے رہا "عی" قدیم جغرافیہ عرب کا مطالعہ اس کے لیے کرنا چاہیے۔ کم از کم مقدمہ تفسیر غایۃ البرہان ہی کو پڑھ لیا جائے۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام کی کتاب استثنا یا مثنیٰ کا مشہور فقرہ

"خداوند سینا سے آیا، اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا دس[1] ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا" (باب ۳۳ درس ۲)

بائبل کی جغرافیائی تحقیق بھی اس نتیجہ تک پہونچاتی ہے کہ فاران یا پاران سے اسی خطے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں "الکعبہ" واقع ہے اور بخاری کی روایت بھی بتاتی ہے کہ کعبہ والے شہر مکہ میں دس ہزار صحابیوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے تھے، فاران کی پوری تحقیق خطبات احمدیہ مولفہ سرسید احمد مرحوم میں پڑھی جا سکتی ہے۔

بہر حال اگرچہ بگاڑنے اور چھیلنے، مشتبہ کرنے کی مسلسل کوشش کی آماجگاہ بنی اسرائیل کے پیغمبروں کے یہ نوشتے بنے ہوئے ہیں لیکن بچی کچھی جو چیزیں اس وقت تک ان کتابوں میں پائی جاتی ہیں جن میں کرۂ زمین کے اس مرکزی "مقام مبارک" کا تذکرہ کیا گیا ہے اگر سب کو جمع کیا جائے تو کافی ضخیم رسالہ بن سکتا ہے ایسا رسالہ جسے دیکھ کر اضطراراً اس قرآنی دعوے یعنی

يعرفونه كما يعرفون أبناءهم[2]　　　　(اہل کتاب) جانتے ہیں اس "الکعبہ" کو اسی طرح جیسے پہچانتے ہیں وہ اپنے بچوں کو

---

[1] دلچسپ لطیفہ یہ ہے کہ ابھی تازہ اڈیشن بائبل کا زبان اردو جو شائع ہوا ہے اس میں "دس ہزار" کی جگہ "ہزار ہا ہزار" کے الفاظ درج کیے گیے ہیں۔ [2] "اہل کتاب پہچانتے ہیں اس کو جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں" یہ دعویٰ قرآن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی کیا ہو اور الکعبہ کے متعلق بھی ۔۔۱۲

کی تصدیق و اعتراف پر آدمی مجبور ہو جاتا ہے، کاش! کسی کو توفیق ہوتی کہ اس قرآنی اشارے کی توضیح کے لیے بائبل کی ان گواہیوں کو جمع کر دیتا۔

سردست مذکورہ بالا چند شہادتوں پر قناعت کرتے ہوئے میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ "الکعبہ" کے متعلق اسلامی کتابوں میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں ان کے متعلق خواہ کچھ بھی کہا جائے لیکن عہد اسلامی سے پہلے بنی اسرائیل کے ان نوشتوں کے متعلق بھی کیا اس شبہ کی گنجائش ہے کہ مسلمانوں نے اپنی طرف سے ان الفاظ کا اسرائیلی کتابوں میں اضافہ کر دیا ہے اور یہ کتابیں تو خیر مذہب و دین سے تعلق رکھتی ہیں مگر مسلمانوں سے پہلے بہت پہلے یونان و روم کے مورخوں کی کتابوں میں سرزمین عرب کے اس پرانے معبد (الکعبہ) کا ذکر جن الفاظ میں پایا جاتا ہے یونانیوں کے قدیم مورخ ہیروڈوٹس یا رومی مورخ سیس لس کی تاریخوں میں سے لوگوں نے جو فقرے نقل کیے ہیں، مولانا شبلی مرحوم کی سیرت میں بھی آپ کو وہ مل سکتے ہیں، ان کو دیکھنے کے بعد یہ دعویٰ کیا غیر تاریخی یا بے بنیاد ٹھہرایا جا سکتا ہو کہ پشت زمین پر آج جتنے مکانات پائے جاتے ہیں ان میں کوئی مکان یا گھر قرآن کے اس "اول البیت" کے مقابلہ میں اس حیثیت سے اپنے آپ کو نہیں پیش کر سکتا کہ اس وقت تک مسلسل نہ صرف اپنے وجود کو بلکہ احترام و عزت کی مرکزیت کو باقی رکھتے ہوئے موجودہ عہد تک چلا آیا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ بعض شہر یا دنیا کی بعض آبادیاں بہت پرانی ہیں لیکن سوال کسی شہر اور آبادی کے متعلق نہیں بلکہ ایک مختصر سے گھر جیسا کہ "الکعبہ" ہے اس کے متعلق میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اتنا پرانا گھر کیا اس وقت زمین کے اس کرّے پر مل سکتا ہے، ہیروڈوٹس جو حضرت مسیح سے چھ سو سال پہلے گذرا ہے اپنی کتاب میں لکھتا ہو کہ عرب کے اس معبد کا بہت قدیم زمانے سے لوگ احترام کرتے چلے آئے ہیں، سوچئے تو اس کا مطلب کیا ہوا؟ ولادت مسیح علیہ السلام کی طرف جو سنہ منسوب ہے، قریب ہے کہ دو ہزار سال تک وہ پہونچ جائے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ ہیروڈوٹس کی شہادت ہی تقریباً ڈھائی ہزار سال کی ہے خیال کرنا چاہیئے کہ ڈھائی ہزار سال پہلے بھی جس گھر اور مکان کے متعلق یہ خبر دی جاتی ہو کہ بہت قدیم زمانے سے لوگ اس کا احترام کرتے چلے آئے ہیں، تو اس گھر کی قدامت کی تاریخ کتنی طویل ہو جاتی ہے خصوصاً اس کے ساتھ جب اس کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے کہ دنیا کے عام شہروں اور آبادیوں کے متعلق جن معلومات کو صحیح تاریخی معلومات قرار دیا جا سکتا ہے۔ انکی مدت ڈھائی تین ہزار سال سے آگے نہیں بڑھتی، کالتھیج ہو یا ایتھنز، یا پامپی[۱] ہو یا روما سب ہی کا حال یہی ہے بلکہ

---

[۱] آج کل، کھنڈر ہے، اس راکھ کے نیچے دبا ہوا تھا جو اٹنا کے آتش فشاں دہانے سے نکلی تھی۔ حال میں راکھ ہٹائی گئی۔ پورا شہر نکل آیا، بڑے دردناک مناظر اس کھنڈر میں سیاحوں کی نظر سے گذرے ہیں میرے ایک دوست کہتے تھے کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

مشرق کے موجودہ شہروں یا قصبوں میں سے ـــــ بعض کے متعلق قدامت کا دعویٰ جو کیا جاتا ہے اگر خرافاتی روایات اور اساطیری قصص و حکایات سے قطع نظر کر لیا جائے تو ان کی تاریخ بھی دو ڈھائی ہزار سال سے آگے متجاوز نہیں ہوتی۔

اور اب سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن نے اسی "الکعبہ" کا ذکر کرتے ہوئے منجملہ دوسرے صفات کے بعض مقامات میں اسی کو "البیت العتیق" (پرانے گھر) کے نام سے جو موسوم کیا ہے یہ صفت "الکعبہ" کی صرف اضافی ہی نہیں ہے بلکہ تاریخی تحقیقات کے سلسلے کو لوگ اگر جاری رکھیں تو ان پر واضح ہوتا چلا جائے گا کہ اس مکان کی "حقیقی صفت" یہی ہے، یعنی ثابت ہوگا کہ دنیا کے تمام پرانے گھروں میں جو بھی پائے گیے، یا اب بھی کہیں پائے جاتے ہیں سب کے مقابلے میں یہی مکان کرۂ زمین کا قدیم ترین پرانا گھر ہے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ بائبل کا "بیت ایل" اور قرآن کا "بیت اللہ" جس آبادی میں پایا جاتا ہے اس کی اور جس ملک سے اس آبادی کا تعلق ہے اس کی، الغرض ان سب کی متعلقہ تاریخی شہادتوں کے علاوہ ان کے جغرافیائی پوزیشن پر بھی اگر توجہ کی جائے تو اس قرآنی اشارے کا مطلب سمجھ میں آسکتا ہے جسے سورۃ البقرہ میں ہم پاتے ہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ امت اسلامیہ محمدیہ کو خطاب کرتے ہوئے جو یہ فرمایا گیا ہے کہ

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَسَطاً (البقرہ)	اور اسی طرح بنایا ہم نے تم لوگوں کو وسط اور بیچ والی امت۔

ظاہر ہے کہ اس سے پیشتر جیسا کہ ہر قرآن پڑھنے والا جانتا ہے "الکعبہ" ہی کا ذکر ہے فرمایا گیا ہو کہ

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝	قریب ہے کہ فرمایہ لوگ یہ کہیں کہ کس چیز نے مسلمانوں کو ان کے اس قبلہ سے پھیر دیا جس پر وہ پہلے تھے کہدو کہ مشرق بھی اللہ ہی کے لیے ہے اور مغرب بھی اسی کا ہے راہ نمائی فرماتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھی راہ کی طرف۔

بس حاصل یہی ہوا کہ بجائے مشرقی خطوں اور مغربی اقلیموں کے مسلمانوں کو زمین کے اس حصے میں قبلہ جو عطا کیا گیا ہے جسے پانے والے خط مستقیم اور اس راہ پر پا رہے ہیں جو نہ مشرق سے زیادہ دور ہے اور نہ مغرب سے، تو یہ خدا کا

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) چوراہوں پر راہ گیروں کی ہدایت کے لیے دیواروں پر بجائے ہاتھ کے انسانی شرمگاہ کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ حیاشی کی یہ آخری حد ہے، فاکثروا فیہا الفساد فصب علیہم ربک سوط عذاب ــــ ۱۲

فضل اور اس کی حکمت کا اقتضاء ہے۔

بہر حال اس آیت کی صحیح تفسیر کا یہاں موقع نہیں ہے بلکہ اس وقت صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کو وسط اور بیچ میں واقع ہونے والی درمیانی امت قرار دیتے ہوئے ان کے اس حال کو قبلہ سے جب تشبیہ دی گئی ہے جو ان ہی مسلمانوں کا آخری قبلہ ٹھہرایا گیا تو اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ جغرافیائی حیثیت سے قرآن مطلع کرتا ہے کہ ان کا قبلہ بھی وسط اور ایسے علاقہ میں واقع ہے جو دنیا کے معمور اور آباد علاقوں کا درمیانی حصہ ہونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے معنی یہی ہوئے، کہ روایتوں میں "الکعبہ" یا مکہ کو سُرۃ الارض (ناف زمین) کے لفظ سے جو موسوم کیا گیا ہے دراصل اسی قرآنی خبر کی یہ تعبیر اور توضیح ہے۔ اور ہم جو یہ دیکھ رہے ہیں کہ مشرق و مغرب کے سارے مواصلاتی ذرائع خواہ ان کا تعلق خشکی سے ہو یا تری سے یا فضا اور ہوا سے تقریباً عام حالات میں ہر ایک کو اسی علاقہ سے گذرنا پڑتا ہے جس میں "الکعبہ" واقع ہے۔ اسی طرح شمالی اور جنوبی حصوں کے آباد علاقے جو کرۂ زمین پر واقع ہیں جب ان کا حساب کیا جاتا ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ شمال میں اسّی درجہ تک، اسی طرح اس کے بالمقابل جنوب میں چالیس درجہ تک عموماً انسانی آبادیاں پائی جاتی ہیں، مجموعی طور پر گویا سمجھنا چاہیئے (۱۲۰) درجہ تک دنیا کی آبادی شمالاً و جنوباً پھیلی ہوئی ہے اب حساب کیجئے اسّی سے بیس کو گھٹایئے تو وہ بھی ساٹھ ہوگا اور چالیس میں ۲۰ کا اضافہ کیجئے تو اس کی جمع بھی ساٹھ ہی ہوگی، پس معلوم ہوا کہ معمورہ کے درمیانی علاقے وہی ہو سکتے ہیں جو ۲۰ اور ۲۱ درجے پر واقع ہیں اب اطلس اٹھا کر دیکھ لیجئے وہی آپ کو جواب دے گا کہ عرب کا ملک جس میں "الکعبہ" واقع ہے اس کا محل وقوع اس سلسلے میں کہاں ہے۔

اس کے ساتھ کیا کم اچنبھے کی بات ہے کہ رنگ اور قد و قامت، شکل و صورت کی خصوصیتوں کے لحاظ سے بنی آدم چار قسموں میں جو بٹے نظر آتے ہیں مثلاً یورپ کے بے رنگ اور پھیکی جلد والے لوگ، اور ان ہی کے ساتھ کالے حبشی اور افریقہ کے عام باشندے ان دونوں قسموں کو اگر ہم ان حصوں میں پاتے ہیں جو "الکعبہ" سے بجانب مغرب واقع ہیں تو ٹھیک اسی کے مقابل چین کے زرد رو، اور ہندوستان کے گندم گوں سانولے لوگ ان علاقوں میں آباد ہیں جو "الکعبہ" کے مشرق میں واقع ہیں۔ گویا اس طریقہ سے "الکعبہ" اپنے آگے پیچھے دو دو قسموں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن نے اس "اول البیت" کا تذکرہ کرتے ہوئے جہاں یہ بتایا ہے کہ "العالمین" کی ہدایت و ارشاد کا نظام اسی مقام میں قائم ہوگا۔ یعنی "ھدی للعالمین" کا مرکز ساڑھے تیرہ سو سال سے یہ جگہ جو بنی ہوئی ہے اور اس سے پہلے اسی عالمگیر تبلیغی نظام کی تمہید میں یہ ابراہیم کا مقام بنا ـــــ اسی کے ساتھ "فیہ آیات بینات" (یعنی اسی گھر میں اور بھی کھلی کھلی نشانیاں ہیں) ان آیات بینات اور کھلی کھلی نشانیوں کو

آپ تلاش کرتے چلے جائیے، زمانہ کے بعد رازہ کا مسلسل انکشاف آپ پر ہوتا چلا جائے گا۔ تاریخ کے اوراق بھی اس باب میں آپ کی مدد کریں گے۔ جغرافیہ کے اطلسوں سے بھی آپ اس سلسلے میں اعانت حاصل کر سکتے ہیں۔ اقوام و امم کے آسمانی رہنماؤں کے کلام میں بھی اس "البیت العتیق" کے متعلق ان سے پتے ملتے چلے جائیں گے، اور یہ ساری نشانیاں آپ پر واضح کریں گی کہ اس گھر کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق نری خوش اعتقادی پر مبنی نہیں ہے بلکہ قدرت کے مقررہ طبعی قوانین کا یہ منطقی نتیجہ ہے۔ مسلمان اگر سمجھتے ہیں کہ نسل انسانی کا پہلا ابتدائی قبلہ بھی "الکعبہ" ہی تھا پھر مختلف علاقوں کے بکھرے ہوئے انسانوں کو باہم ایک دوسرے سے قریب تر ہو جانے کی صورت جب نکل آئی تو پھر مختلف مقامی قبلوں[۱] سے ہٹا کر سب کو اسی پرانے واحد مرکزی قبلہ پر جمع کر دیا گیا۔ تو یہ ایک ایسی بات ہے جس کی تائید ان ہی "آیات بینات" سے ہو رہی ہے جن کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے میں مانتا ہوں کہ اس قسم کی روایتیں مثلاً اسرائیلیات کے مشہور اسلامی عالم وہب بن منبہ کے حوالہ سے کتابوں میں نقل کیا گیا ہے کہ مکہ کی ایک وادی میں جس کا نام الرقطیح ہے حضرت آدم سے فرشتوں نے ملاقات کی اور خوش آمدید کہا، پھر بولے کہ اے آدم اسی گھر کا حج تم سے دو ہزار سال پہلے ہم لوگوں نے کیا تھا۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے بعد

قدم بہ الملائکۃ مکۃ فطاف	حضرت آدم کو فرشتہ مکہ لایا پھر سات دفعہ کعبہ کا
بالبیت اسبوعا ثم رجع الی	طواف حضرت آدم نے کیا اور اس کے بعد ہندستان
ارض الھند فمات بھا۔ (خمیس ص۹ ج۱)	واپس ہو گئے جہاں ان کی وفات ہوئی۔

یا اس کے قریب قریب دوسری روایت ابن عباس رضؓ کی طرف منسوب کی گئی ہو، فرماتے تھے کہ

---

[۱] تاریخ کا ایک ایسا دور بھی نسل انسانی پر گذرا ہے جب قوموں کے قبلے مقامی بھی تھے، یہ ایسا مسئلہ ہے جس کی طرف خود قرآن میں بھی اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً ما انت بتابع قبلتھم وما بعضھم بتابع قبلۃ بعض سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ نیز سیرت کی کتابوں میں یہ روایت جو نقل کی جاتی ہے کہ قبلوں کی تعداد پندرہ تھی۔ سات نچلے حصے میں اور سات بالائی حصے میں (دیکھو الخمیس ص۹ ج۱) ہو سکتا ہے کہ کرۂ زمین کے دونوں حصوں فوقانی و تحتانی جس میں امریکہ وغیرہ بھی واقع ہے الخمیس ہفت اقلیم میں سے ہر ہر اقلیم کے لیے ایک قبلہ ہو، اسی کی طرف اس روایت میں اشارہ کیا گیا ہو بہر حال وہ قبلے تو مقامی ہوئے اور پندرھواں مرکزی قبلہ "الکعبہ" ہوا۔ مگر یہ سارے قصے اسی وقت کے تھے جب مختلف امصار و بلاد کے باشندوں کا ایک ہی کتاب، ایک ہی قبلہ پر جمع ہونا عملاً دشوار تھا۔ پر جب اس کا امکان پیدا ہو گیا تو سارے مقامی قبلے وقتی کتابوں کا قصہ ختم کر کے آدم کی اولاد پھر ایک کر دی گئی، جیسے بکھرنے سے پہلے سب ایک تھے۔

حج آدم من الهند اربعين حجة .	ہندوستان سے الکعبہ کا حج حضرت آدم نے چالیس دفعہ فرمایا۔

.... سنداً اس قسم کی روایتوں کا ذخیرہ بہت محل اشتباہ ہے لیکن جب قرآن کے نص قطعی سے معلوم ہوتا ہے کہ "الناس" یعنی آدمیوں کے لیے سب سے پہلا گھر "بکہ" ہی میں بنایا گیا تو ان روایتوں کا جو حاصل ہے یعنی حضرت آدم علیہ السلام وادی بکہ کے اسی اول البیت سے تعلق رکھتے تھے آخر اس کو مشتبہ قرار دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

.... بہر حال .... الکعبہ کی مرکزیت کے اظہار کے لیے قرآن نے ان تمام حقائق سے .... پردہ اٹھا دیا ہے جن کے متعلق ممکن ہے کہ غیر ایمانی عامیانہ فطرتوں میں ہچکچاہٹ پیدا ہو۔ اس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کیا ہو کہ "الناس" کے قیام و بقار کا تعلق بھی اسی الکعبہ سے ہے وہی الناس کے لیے مثابہ (پن گھٹ) ہے اور ان کا امن و امان بھی اسی کے ساتھ وابستہ ہے۔ "العالمین" یعنی سارے جہانوں کے لیے وہ مبارک بھی ہے اور ان میں ہدایت کی عمومی روشنی کی تقسیم کا مرکز بھی یہی گھر بنے گا، اسی بنار پر ایسی روایتوں کو کہ مثلاً آیا ہے ......

انزل الله خيمة من خيام الجنة فوضعها بمكة موضع البيت (الخمیس ص۹۱ ج۱)	اتارا اللہ نے جنت کے خیموں میں سے ایک خیمہ پھر خدا نے اسکو رکھا اس جگہ پر جہاں البیت یعنی "الکعبہ" واقع ہے۔

میں مذکورہ بالا قرآنی حقائق کی تعبیر و تفسیر سمجھتا ہوں، مآل ان روایتوں کا بھی وہی ہے کہ انسان کو خلیفہ بنا کر زمین پر آباد کرنے کا خالق کائنات نے جب فیصلہ فرمایا تو اس کے قیام و بقار نشوونما، امن و ارتقار کے لیے "الکعبہ" کو مرکز قرار دیا گیا اور جیسے سارے عالم میں اپنی رحمتوں کو تقسیم کرنے کے لیے "العرش العظیم" پر "الرحمٰن" مستوی ہوا اسی طرح کرۂ زمین کی رحمتوں کی تقسیم کے لیے الکعبہ کو اس نے اپنی تجلی کی فرودگاہ خاص ٹھہرایا۔ اور بقول حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز اگرچہ آفتاب آئینے میں نہیں اترتا لیکن خاص قسم کی تجلی آفتاب کی آئینے میں جو ہوتی ہے اسی کا نتیجہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہوبہو کامل آفتاب آئینے میں جھلکتا اور چمکتا نظر آرہا ہے کچھ اسی طرح سمجھنا چاہیئے کہ جو آسمان و زمین میں بھی نہیں سما سکتا وہی خالق ارض و سماوات "الکعبہ" کی "تجلی گاہ خاص" میں کچھ اس طرح نمایاں ہے کہ آئینے کو جیسے بیت الشمس کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح "الکعبہ" پر بھی بیت اللہ کا اطلاق ایک صحیح مشاہداتی یافت ہی کا یہ اعتراف ہوگا، ذات حق کی یہی تجلی کامل درحقیقت بنیاد ہے ان سارے دینی اور روحانی تعلقات کی جن کو "الکعبہ" کے ساتھ اسلام قائم کرنا چاہتا ہے۔

(۲)

کیسی عجیب بات ہے کہ مختلف قطعاً دو مختلف نوعیت کے تعلقات اسی ایک تجلی گاہ ربانی کے ساتھ اسلام نے قائم کیے ہیں یعنی ایک طرف ہم دیکھتے ہیں کہ الصلوٰۃ (نماز) کے لیے دن کے چوبیس گھنٹوں میں پانچ پانچ دفعہ سارے جہاں کے

مسلمانوں کا رخ اسی "الکعبہ" کی طرف پھیرنے کو اسلام ضروری قرار دیتا ہے۔ مسلمانوں کو دن کے ان پانچ وقتوں میں اسلام جب "الکعبہ" کے سامنے لاکر کھڑا کرتا ہے تو اس وقت یہ دیکھا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ زور جسم کی صفائی اور لباس کی صفائی بلکہ ہر اس عضو کی صفائی اور پاکیزگی پر دیتا ہے جو عام حالات میں گرد و غبار، گندگی، میل کچیل سے محفوظ نہیں رہ سکتے، باضابطہ کامل وردی میں پھر حکم دیا جاتا ہے کہ کمالِ متانت اور سنجیدگی کے ساتھ دربارِ الٰہی کی حاضری کی سعادت حاصل کریں۔ عرض و معروض میں بھی لجاجت سماجت کے آخری حدود تک پہونچنے کی کوشش کریں۔ الغرض اپنی ایک ایک حرکت اور ایک ایک سکون سے اس احساس کو اپنے اندر زندہ اور بیدار کریں کہ اقتدار و اختیار کی آخری قاہرانہ قوتوں کے سرچشمے کے آگے اپنے آپ کو وہ ذلت و مسکنت کی ممکنہ شکلوں کے ساتھ ڈالے ہوئے ہیں۔ الغرض بجائے شور و ہنگامہ کے ہر قول اور ہر عمل کو نظم و ضبط کے انتہائی دباؤ کے نیچے رکھنا نماز کی جان اور حقیقی روح ہو۔

پس "الکعبہ" کے سامنے آنے کی ایک شکل تو یہ ہے جس کا نظارہ ہر مسجد میں پانچوں وقت کیا جاتا ہے لیکن یہی "الکعبہ" اور خدا کی بارگاہ "تجلی گاہ ربانی" ہے اسکے آگے اسلام ہی ان مسلمانوں کو لاتا ہو جنھیں وہ مسجد میں لے جاتا ہے برکس شان کے ساتھ؟ تمدن و تہذیب کے ماحول کا سارا لباس اتروا لیا جاتا ہو سلی ہوئی معمولی دو پلی ٹوپی تک سر پر رکھنے کا اب وہ روادار نہیں ہو، جو سب کچھ پہنتے تھے اور اسلام ہی ان کو سب کچھ پہنتا رہا تھا، اچانک آج وہی اصرار کر رہا ہو کہ بجز ان دو کفنیوں یا لنگیوں کے جنھیں حاجی احرام کے نام سے گلے میں ڈالے رہتے ہیں کسی دوسرے کپڑے کا اضافہ ان کے لیے اس حال میں درست نہ ہوگا، حد یہ ہے کہ ان کفنیوں کے پلوں کو جوڑنے کے لیے گرہ تک ڈالنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے[1]۔

اب ذرا مسجد کے ان ہی نمازیوں کو دیکھیے جو قبا در بر، عمامہ بر سر، وقار و متانت کی انتہائی سنجیدگیوں کے ساتھ نماز کی صفوں میں اسی "الکعبہ" کے سامنے کھڑے ہوئے تھے آج حج کے میدانوں میں ان ہی نمازیوں کا کیا حال ہو، سر کھلا ہوا ہے، بال بڑھے ہوئے ہیں، ناخنوں کی درازی حد سے گذری ہوئی ہے، گرد میں سارا جسم اٹا ہوا ہے۔ وہی اسلام جو دن کے چوبیس گھنٹوں میں پانچ دفعہ اگر غسل نہیں تو ہر نمازی کو نیم غسل (وضو) کا حکم دیا کرتا تھا آج...... اصرار کر رہا ہے کہ اُلجھے ہوئے بالوں کو سلجھانے کے لیے کنگھے کے استعمال کی بھی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ بہ ضرورت نہانے پر مجبور بھی ہوں تو جس اسلام کو مسجدوں میں دیکھا جاتا تھا کہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایک ایک عضو سے میل کچیل کے ازالہ کو فرض ٹھہرا رہا تھا البراجم والمغابن[2] تک کو ملواتا تھا وہی فتویٰ

---

[1] فقہانے لکھا ہو کہ کسی کانٹے یا اسی قسم کی چیز وغیرہ سے ان کو جوڑ لیا جائے۔ [2] انگلیوں کی پشت کی گرہوں کے سامنے سکڑی ہوئی کھال کے جو حصے ہیں ان ہی کو براجم کہتے ہیں، اور مغابن جسد انسانی کے ان حصوں کو کہتے ہیں جو عمیق اور پوشیدہ رہتے ہیں مثلاً بغل، بن ران وغیرہ

دے رہا ہے کہ

ازالۃ التفث حال الاحرام حرام (مناسک ملا علی قاری)

احرام کی حالت میں میل کچیل اور بدن سے کثافتوں کا دور کرنا ناجائز ہے۔

"قوموا للہ قانتین" (کھڑے رہو (نماز میں) چپ چاپ) کے قرآنی مطالبہ سے جب اسلام کی مسجدیں گونج رہی ہیں، جماعت تک میں شریک ہونے کے لیے تیز قدمی اور لپک کر جھپٹنے تک کو دربار الٰہی کی ادب شناسی سے محرومی قرار دیا گیا ہے، وہی اسلام اعلان کر رہا ہے کہ حج کی راہ میں جتنا زیادہ چیخ سکتے ہو، چیختے چلے جاؤ، پیغمبر کا بیان ہو (صلی اللہ علیہ وسلم) کہ "افضل الحج العج" (بہترین حج وہ ہے جس میں شور و غل مچایا جائے) یعنی لبیک الخ کے کہنے میں جتنا زور لگا سکتے ہوں لگائیں۔

جمعہ کی نماز کے سلسلے میں خطبہ کے وقت کنکریوں سے کھیلنے والوں تک کو لغویت کا مرتکب قرار دیا گیا ہے لیکن حج کے میدان میں وہی اسلام حکم دیتا ہے کہ چلاتے اور چیختے ہوئے ایک وادی سے دوسری وادی کی طرف ایک پہاڑ کے دامن سے دوسرے پہاڑ کے دامن تک دوڑتے ہوئے آؤ بھی اور دوڑتے ہوئے جاؤ بھی، انتہا یہ ہے کہ ان ہی حاجیوں سے ایسا فعل بھی کرایا جاتا ہے جس پر رقص کا شبہ اگر کیا جائے تو بے محل شبہ نہیں ہو سکتا۔ آخر طواف جو حج کا ایک رکن رکین ہو اس میں ایک ٹولی کے بعد دوسری ٹولی "الکعبہ" کے چاروں طرف جو گھومتی رہتی ہے، خواہ اصطلاحاً رقص کا اطلاق اس پر صحیح نہ ہو لیکن جو نہیں جانتے ہیں وہ مسلمانوں کے اس طریقۂ عمل کو آپ خود سوچیے کہ کیا سمجھیں۔ بعضوں نے اس پر تعجب بھی کیا ہے لیکن اسی تعجب میں تو سارا راز چھپا ہوا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انسانی شائستگی کے معیار کو اسلام نے اتنا بلند کر دیا ہے کہ طواف خواہ واقعہ کے لحاظ سے کچھ بھی ہو لیکن رقص یا ناچ کے لفظ کے اطلاق پر اپنے تو اپنے شاید دل پر جبر کے بغیر غیر بھی آمادہ نہیں ہو سکتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسجدوں کے برعکس حج کے میدانوں میں جو کچھ کیا جاتا ہے، دوڑایا جاتا ہے، گھمایا جاتا ہے، کنکریاں چنوائی جاتی ہیں اور اس حال میں رہنے کا حکم دیا جاتا ہے جس حال میں دیوانوں اور سرگشتوں کو دیکھا جاتا ہے، سر کھلے ہیں، ناخن بڑھے ہیں، بال الجھے ہیں، بدن میل کچیل میں ڈوبا ہوا ہے۔

کیا بات ہے کہ ایک ہی اسلام اچانک سنجیدگی و متانت و وقار کے سارے قصوں کو ختم کر کے مسلمانوں پر اس حالت کو...... طاری کراتا ہے، ان کے کانوں میں اس نے کیا پھونک دیا ہے کہ دیوانوں کی طرح کبھی ادھر جاتے ہیں، کبھی ادھر جاتے ہیں۔ کبھی دوڑتے ہیں، کبھی روتے ہیں، گڑگڑاتے ہیں، چلاتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر کبھی اس تودے پر کنکریاں پھینکتے ہیں، کبھی اس پتھر پر سنگریزے برساتے ہیں۔ چکر کاٹتے ہوئے ان ہی کو دیکھا جاتا ہے کہ ناچ بھی رہے ہیں گا بھی رہے ہیں۔ رہ رہ کر بوسے کے لیے لبوں کو بھی کسی چیز پر ملتے ہیں۔ نہ سر پہ ٹوپی ہے نہ پاؤں میں جوتا ہے ایک بن سلی چادر

پیٹھ پر پڑی ہوئی ہے اور دوسری ٹانگوں کے ساتھ لپٹی ہوئی ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا لباسی سامان ان کے پاس نہیں ہے، آخر ان ہی کپڑوں کو وہ کیوں استعمال نہیں کرتے جن کے بغیر وہ مسجدوں میں جانا نہیں پسند کرتے تھے، اپنے بدن کو کثافتوں سے پاک کیوں نہیں کرتے، ناخن کیوں نہیں ترشواتے، بال کیوں نہیں سنوارتے خوشبو کیوں نہیں لگاتے، بربریت اور وحشت کی بچی کھچی یادگاروں کو مٹا کر اسلام ہی نے تو مسلمانوں کو تہذیب و شائستگی کی راہوں پر ڈالا تھا۔ پھر آگے بڑھانے کے بعد اسی اسلام نے ان کو پیچھے کیوں ڈھکیل دیا۔ اور ڈھکیل دینا کیا معنی؟ اس نے تو مسلمانوں کی دینی زندگی کا ایک جوہری عنصر حج ہی قرار دیا ہے۔

بلاشبہ یہ ایک سوال ہے اور بڑا اہم سوال، مگر "الکعبہ" کیا ہے، ارضی کائنات کے ساتھ اس کا جو بنیادی رشتہ ہے جن کے لیے یہ راز راز باقی نہیں رہا ہے، کیا نماز اور حج کے اعمال و افعال آداب و فرائض کے ظاہری تناقض تعارض کی یہ بوالعجبی ان کے لیے بھی بوالعجبی باقی رہتی ہے؟

بلاشبہ فطرت انسانی قدرت کے حاکمانہ اقتدار کے آثار کو اپنے اوپر طاری کرنا چاہتی ہے اس میں یہ جبلی جستجو پائی جاتی ہے کہ قدرتی قوانین کی پابندیوں سے ساری کائنات، شجر و حجر، پرندے درندے وغیرہ اپنے نوعی کمالات تک پہونچنے میں جیسے کامیاب ہو رہے ہیں اسی طرح اس کی کامیابیوں کا راز بھی ان ہی پابندیوں میں پوشیدہ ہے۔ اور یہ جو دیکھا جا رہا ہو کہ عموماً بنی آدم مذہب کے نام سے احکام و قوانین کے کسی مجموعہ کی پابندی کو اپنے لیے ناگزیر قرار دیئے ہوئے ہیں۔ درحقیقت اسی اندرونی سوال کا یہ جواب ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ پیدا کرنے والے کی طرف احکام و قوانین کے جس مجموعہ کو منسوب کیا جاتا ہو، واقعی وہ خالق کائنات کی مرضی کی صحیح نمائندگی کرتا ہے یا نہیں، لیکن ہر پیدا ہونے والا آدمی باور یہی کرتا ہے کہ مذہب کے نام سے وہ اپنے خالق کی مرضی ہی پانے میں کامیاب ہوا ہی، بہرحال یہ ایک مستقل علیٰحدہ بحث ہے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مذاہب و دیانات کے متعلق جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ خدائی احکام و قوانین کی پابندی کا ان میں مطالبہ کیا گیا ہے اس میں شک نہیں کہ اسلام کو بھی اسی مطالبہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے کی مرضی کے مطابق اس کے نافذ کردہ احکام و قوانین کی تعمیل و امتثال میں زندگی بسر کرنا، بندوں کی زندگی کا سب سے پہلا نصب العین ہے، نشوونما کی جو قدرتی صلاحیتیں فطرت انسانی میں پائی جاتی ہیں ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور ان کو بار آور کرانے کی قدرتی راہ یہی ہے کہ خالق کردگار کو اپنا حاکم تسلیم کرکے بندہ اسی کا محکوم بن جائے، بندگی اور عبدیت اسی فرض کو طبعاً ہم پر عائد کرتی ہے اس فرض سے عہدہ برا ہونا اور عہدہ برا ہونے کی کوشش یہی ہمارے وجود کا حاصل اور آخری غایت ہے۔

سچ پوچھیے تو بار بار ہر چوبیس گھنٹے میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد "حی علی الصلوٰۃ" کی پکار،

لاہوتی ادب گاہوں اور ان کے بلند میناروں سے فضا میں جو گونجتی رہتی ہے درحقیقت حکومیت اور بندگی غلامی عبدیت کے اسی فرض کو یاد دلانے اور اس کے احساس کو قلب میں مسلسل جگائے رکھنے کی یہ عملی تدبیر ہے۔ آپ دیکھئے ان کو جنھوں نے اس لاہوتی پکار سے بہرے بنے رہنے کا فیصلہ نہیں کیا ہے ـــــ جب پکارنے والے کی پکار پر چل پڑنے کے لیے وہ آمادہ ہوتے ہیں، وہ اپنی وردی درست کرتے ہیں، اس کی دیکھ بھال کر لیتے ہیں کہ صفائی اور پاکیزگی کے برخلاف ان کے لباس کے کسی حصے میں گندگی اور نجاست کا کوئی داغ اور دھبہ تو نہیں ہے۔ سکینت و وقار کی تصویر بن کر انتہائی اطمینان اور سنجیدگی کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے پہلے اس مقام میں آتے ہیں جہاں کپڑوں سے آگے بڑھ کر اپنے جسد اور بدن کی کثافتوں کا جائزہ لیتے ہوئے ایک ہی دفعہ نہیں بلکہ کم از کم تین تین بار بدن کے ان حصوں کو دھوتے ہیں جن کی آلودگی کا عام حالات میں اندیشہ کیا جا سکتا ہے۔ شست و شو کے اس شغل سے فارغ ہونے کے بعد دیکھئے وہ اپنے پیدا کرنے والے خالق و حاکم کے سامنے کھڑے ہیں۔ تجزیہ کیجئے ان اعمال اور مشاغل کا جن میں اب وہ منہمک اور مستغرق ہو جاتے ہیں۔ دست بستہ قیام، قیام کے اسی حال کے بعد سر کو جھکا دینا اور اس سے بھی آگے بڑھ کر اپنا ماتھا ٹیک دینا، یہ اور اسی کے ساتھ دوسرے قولی و فعلی اجزاء و عناصر جن کی ترکیب سے مسلمانوں کی نماز کا قوام تیار ہوتا ہے۔ ان سب میں بتائیے کہ احکم الحاکمین، آقائے علی الاطلاق کے حاکمانہ شئون اور اقتداری تجلیوں کے سوا کیا کوئی اور چیز بھی جھانک رہی ہے؟ عقیدت و نیاز یا احساس محکومیت و بندگی کو تصویری پیکر میں لانے کی جو آخری شکل ہو سکتی ہے کیا الصلوٰۃ یا نماز اس کے سوا اور بھی کچھ ہے؟ فقر و مسکنت، احتیاج و تذلل کے جذبات کے اظہار کا زندہ قالب یہی ہو سکتا تھا، میں نہیں سمجھتا کہ اس سلسلے میں اور بھی کچھ سوچا جا سکتا ہے۔

الصلوٰۃ اسلام کے چار اہم ستونوں میں ایک ستون ہے، اسی طرح الزکوٰۃ کے نام سے جس محصول کو امراء اور تونگروں سے وصول کر کے غرباء اور نا مستطیع باشندوں میں اسلام تقسیم کراتا ہے، تو کیا یہ وہی فرض نہیں ہے جسے ہر حکومت اپنے باشندوں پر عائد کر کے اپنے حاکمانہ اقتدار کو ظاہر کرتی ہے ـــــ اور الصلوٰۃ والزکوٰۃ تو دینی اسلامی رکن ہونے کی حیثیت رکھتے ہیں ان کے سوا بھی اسلامی مطالبات کے بڑے، بہت بڑے ذخیرے کی بنیاد مطالبہ کرنے والے کے حاکمانہ اقتدار ہی پر قائم ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے:

مگر سوال یہی ہے کہ ہستی کی اس تجلی گاہ کے آخری سرچشمے کے متعلق جن جستجوؤں کو انسانی فطرت اپنے اندر پاتی ہے۔ کیا حاکم و محکوم کے ان تعلقات اور ان تعلقات کے اقتضاؤں کی تکمیل کے بعد ہمارے اندر کی ڈھونڈھ کا یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ ہماری پیاس کیا بجھ جاتی ہے، آخر ؎

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں عشوہ و غمزہ و ادا کیا ہے

بحر وجود کے ان تموجات اور لہروں کی توجیہ میں کیا کہا جائے؟ کیا پایا تھا ایران کے کج کلاہ اور خراسان کے آہن گر سیاہ نے گوشت و پوست، چربی اور استخوان کے اس مجموعہ میں جس کا نام شیریں تھا کہ آہن گر نے تو سر پھوڑ لیا، اور خسرو خود سر اپنے ہوش و حواس، عقل و خرد، شوکت و ابہت کے سرمایہ کو کھو بیٹھا۔

اس خلش اور تپش، قلق اور بے چینی، اضطراب و التہاب کے اسباب کا سراغ کیسے لگایا جائے، اور کہاں لگایا جائے جو عامری دیوانے کو بن بن میں پھراتے تھے اور بیابانوں کے پتھروں کی ٹھوکروں کے ساتھ اس کو راضی کئے ہوئے تھے، وادیٔ نجد کی ہرنیوں کی لمبی گردنوں اور بڑی بڑی آنکھوں میں وہ کسے ڈھونڈھ رہا تھا۔ وہ کتوں کے پاؤں کو اس لیے کیوں چومتا تھا کہ اسکی لہریں اس چوکھٹ تک پہونچ جائیں گی جس کا بوسہ اسکی زندگی کا آخری مقصود تھا۔

بہرحال آپ اس کا نام حسن رکھیے یا جمال، یا جو جی میں آئے جس لفظ سے بھی اس کی تعبیر کیجیے، لیکن وجود کے اس تلاطم میں ایسی لہریں بھی یقیناً گھلی ملی، رچی بسی ہیں، جن کے غیر معمولی دباؤ کا فطرت انسانی انکار نہیں کر سکتی، دباؤ اور عجیب و غریب دباؤ جس کے نیچے بسا اوقات حکومت اور سلطنت کا اقتدار بھی کھوکھلا بن کر رہ گیا ہے۔ مطلق العنان جباروں کو بھی اس کی گرفت کے اندر تڑپتے اور پھڑکتے دیکھا گیا ہے۔

انسانی قالب اور بشری پیکر میں حسن و جمال کے ظہور کے بعد جو کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں ان کے متعلق تو ایک حد تک "جنسی میلانات" کے شعوری یا غیر شعوری اشاروں کو بھی دخیل ٹھہرایا جا سکتا ہے، لیکن بہتی ہوئی نہروں، لہلہاتے ہوئے مرغزاروں، چہچہاتی ہوئی چڑیوں، کھلے ہوئے شگفتہ و نیم شگفتہ پھولوں، وادیوں کے نشیب و فراز، دامن کوہ کی ابھرتی ہوئی بلندیوں اور ڈھلتی ہوئی پستیوں، الغرض انسانی پیکروں سے ہٹ کر جمادی، نباتی و حیوانی سانچوں میں حسن و جمال کی تجلیاں ڈھل ڈھلا کر جب سامنے آتی ہیں تو اس وقت گدھوں اور بکروں کو نہیں، گھوڑوں اور ہاتھیوں کو نہیں بلکہ صرف آدم کے بچوں اور حوا کی بچیوں ہی کو بہجت و نشاط، سرور و وجد کے گردابوں میں چکر کھاتے ہوئے کیوں پایا جاتا ہے؟

پس واقعہ یہ ہے کہ جمال پرستی کہیے، یا حسن پسندی یہ انسانی سرشت کا ایسا جوہری عنصر ہے کہ اسی پر اس کے نوعی امتیاز کی بنیاد قائم ہے، وہ حسن کی جستجو اور جمالی تجلیوں کی تلاش کے جذبہ کے ساتھ پیدا بھی ہوتا ہے اور جب مرتا ہے تو اسی جذبہ کو ساتھ لیے ہوئے مرتا ہے۔

بہرحال جستجوئے حسن یا تلاش جمال کا جو جذبہ انسانی فطرت میں پایا جاتا ہے نہ اس کا انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ یہ مانا جا سکتا ہے کہ جمال و حسن کی جو تجلیاں برگ گل اور نغمہ بلبل سے جھلک رہی ہیں اور جن کی روشنی سے جمادی و نباتی، حیوانی و انسانی مظاہر سے بھری ہوئی یہ کائنات جگمگا رہی ہو، ان کے وجود کے اس بحر متلاطم میں کوئی آخری سرچشمہ نہیں ہے۔ ہمارا ابتدائی لاہوتی سبق ہی الحمد للہ سے شروع ہوتا ہے کمال ہو یا جمال، الغرض وجود کا ہر وہ پہلو جو مستحق مدح و ستائش ہو

ہم مان ہی نہیں سکتے کہ وہ نہ تھا پھر ہوا ہے "ہستی نیستی سے بھی پیدا ہو سکتی ہے" عقل بھی اس تجویز سے جھنجھلاتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ "الاسماء الحسنیٰ" نص قطعی کے رو سے جس ذات میں منحصر ہیں ان کے معنی کے سوا، بتایا جائے کہ حسن کے سرچشمے کو اور کہاں ڈھونڈا جائے۔

(۳)

ان تمہیدی مقدمات کے بعد اب سوچئے کہ ناقص انسانوں کے ناقص عقول کا گڑھا اور تراشا ہوا دستور و آئین نہیں بلکہ عالم الغیب والشہادۃ خدائے کامل کا بخشا ہوا دین کیسے کامل ہو سکتا تھا جب تک فطرت انسانی کی جستجوئے جمال اور تلاش حسن کے جذبہ کی تسکین کا سامان بھی اس میں نہ کیا جاتا۔ مجھے دنیا کے دوسرے مذاہب و ادیان سے اس وقت بحث نہیں لیکن اپنے اسلامی اسلاف سے جو دین ہم تک پہونچا ہے اور جن لوگوں نے ہم تک اس کو پہونچایا ہے، ان کا بیان ہے، محدث الدیار الہندیہ، استاذ الکل فی الکل حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فارسی زبان کی اپنی تفسیر میں حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کے حج کا ذکر کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:۔

"باز ایشاں را حکم شد کہ در ہر سال یک بار خود را والہ و شیدا ساختہ دیوانہ وار و عاشق کردار، برائے گردشتن خانۂ محبوب خود برہنہ سر، و برہنہ تن، و برہنہ پا، ژولیدہ مو، پریشاں حال و گرد آلودہ از شام بہ زمین حجاز رسیدہ گاہے بر کوہ و گاہے بر زمین رو بہ سوئے خانہ کردہ استادہ شوند"

پھر حضرت ابراہیم کو حکم دیا گیا کہ سال میں ایک دفعہ اپنے آپ کو سرگشتہ و شیدا بنا کر دیوانوں کی طرح اور عشق بازوں کا وطیرہ اختیار کر کے محبوب کے گھر کے گرد ننگے سر، ننگے پاؤں، اُلجھے ہوئے بال، پریشاں حالی کے ساتھ گرد میں اَٹے ہوئے سرزمین حجاز میں پہونچیں اور وہاں پہونچ کر کبھی پہاڑ پر کبھی زمین پر محبوب کے اس گھر کی طرف رُخ کر کے کھڑے ہوں۔

اسی قسم کی تفصیلات کے بعد بیان کو ان فقروں پر ختم کرتے ہوئے، کہ

"گرد خانۂ تجلی آشیانۂ او طواف کنند و بار بار کنجہائے آن خانہ را بہ بوسند و بہ لیسند"

اسی تجلی خانہ کے اردگرد گھومیں، اور اس کے گوشوں کونچوں میں چاٹیں۔

حج کا جو مقصد ہے اسی کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں، فرماتے ہیں:۔

"تا معنی عشق و محبت کہ در باطن ایشاں کامن ست در لباس صورت جلوہ گر شود،"

تاکہ عشق و محبت کا جو جذبہ ان کے باطن میں پوشیدہ ہے وہ ظاہری شکل و صورت

وشہور خاص وعام گرد دو ر ... بین بآواز بلند لبیک گویاں نعرہ ہا زنند وآتش محبت اندرونی راآں نعرہا برافروزند"

کا قالب اختیار کرے اور اس کے اس حال کا چرچا دنیا میں پھیلے۔ اسی سلسلے میں یہ حکم بھی دیا گیا کہ بلند آواز کے ساتھ لبیک کہتے ہوئے نعرے لگائیں اور ان نعروں کی راہ سے محبت کی چھپی دبی آگ کو بھڑکائیں۔

آخر میں شاہ صاحب نے لکھا ہے، کہ:۔

"ایں کیفیت مناسک حج برائے ایشاں مقرر شد وطواف وسعی بین الصفا والمروہ وآمد ورفت مزدلفہ وعرفات و اقامت در منیٰ وذبح وقربانی وتلبیہ واحرام شروع گشت۔"

حج کے مناسک میں یہی کیفیت ان کے لئے مقرر ہوئی اور اسی بنیاد پر طواف کعبہ، مروہ وصفا کے درمیان تگ و دو (سعی) مزدلفہ کی آمد ورفت عرفات میں قیام، منیٰ میں ذبح وقربانی احرام وغیرہ اعمال کا حکم دیا گیا ہے۔

اور ایک یہی کیا، آپ کو اسلامی بزرگوں کی مختلف کتابوں میں یہ اور اسی قسم کی ملتی جلتی باتیں مل سکتی ہیں، اردو میں سیدنا قاسم العلوم والخیرات بانی دار العلوم دیوبند کی کتابوں خصوصاً "حجۃ الاسلام" میں حج کے ایک ایک جزو کی تشریح اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے جو کی گئی ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے اور قربانی اگرچہ میرے نزدیک دینی نظام میں اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے تاہم حج کے موقع پر جو قربانی کی جاتی ہے صاحب "غایۃ الشعو" نے لکھا ہے:۔

"قربانی نمودن مخبریست کہ خود را براہ دوست ایں چنیں فدیہ نمودن شاید"

حج کے موقع پر قربانی کا مطلب یہ ہے کہ دوست کے لیے چاہیئے قربانی کرنے والا اسی طرح اپنے آپ کو تیار کرے کہ وہ بھی قربانی کے جانور کی طرح ہر وقت اپنی جان فدا کرنے کے لیے تیار ہے۔

بہرحال حسن ازل اور جمال مطلق کی جستجو وتلاش یہی الحج کی روح ہے، اگرچہ حج کے اعمال اور مناسک کے تجزیہ وتحلیل ہی سے، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اسلاف اس نتیجے تک پہونچے ہیں، جیسے الصلوٰۃ یعنی نماز میں جو کچھ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ خالق کائنات کے حاکمانہ اقتدار اور اس کے آثار کو بندے اپنے اوپر طاری کرتے ہیں۔ ان اسلامی ارکان کے پھل ہی ایسے ہیں جن کو دیکھ کر معمولی عقل کا آدمی بھی درختوں کو پہچان سکتا ہے،

لیکن سچی بات یہ ہے کہ حج کے مطالبہ کا ذکر جن الفاظ میں قرآن کے اندر پایا جاتا ہے، قرآنی طرز کے اداشناسوں کے لئے ان ہی میں کافی اشارے ہیں، خصوصاً آخری الفاظ جن پر یہ آیت ختم ہوئی، یعنی

ومن کفر فان اللہ غنی عن العالمین ۝ — اور حج کے مطالبہ کا ناشکری کے ساتھ جس نے انکار کیا تو اس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ سارے جہانوں سے بے نیاز ہے۔

عشق و محبت کی راہ و رسم کا جو تجربہ رکھتے ہیں اور سوز و ساز سے کچھ حصہ جنہیں میسر آیا ہے ان ہی کے چوٹ کھائے قلوب اس طریقۂ بیان کے اثر کو محسوس کر سکتے ہیں، سیدنا الامام الحاج امداد اللہ المہاجر المکی قدس اللہ سرہ العزیز قرآن کی دھمکی

لا یکلمھم اللہ ولا ینظر الیھم یوم القیمۃ — نہ حق تعالیٰ ان سے بات کریں گے اور نہ ان کی طرف دیکھیں گے قیامت کے دن۔

(آل عمران)

کا جب ذکر فرماتے تو کہتے کہ ساری دھمکیوں میں سب سے زیادہ جانگداز روح گسل دھمکی میرے لیے تو یہی ہے۔

عمیق حکیمانہ نفسیاتی نکتہ اس کے بعد یہ ارشاد فرماتے کہ کسی چیز سے محرومی کی دھمکی اسی وقت دی جا سکتی ہے جب اس کا مطالبہ ہمارے اندر موجود ہو، مجنوں ہی کو لیلیٰ دھمکا سکتی ہے کہ میں تجھ سے نہ بولوں گی، تجھے نہ دیکھوں گی ورنہ جو مجنوں نہیں ہے اس کے لیے لیلےٰ کی ان دھمکیوں کی کیا قیمت ہو سکتی ہے۔ حاجی صاحبؒ کے متعلق میں نے سنا ہے کہ آب دیدہ ہو جاتے اور فرماتے کہ آدمی کی فطرت میں اگر کسی کی ہمکلامی اور نظر لطف و کرم کا مطالبہ پوشیدہ نہ ہوتا تو یقین کرو کہ اس کو یہ دھمکی کبھی نہ دی جاتی۔

اس نفسیاتی نکتہ کو پیش نظر رکھ کر اب سوچئے کہ حج کی قدر و قیمت کے نہ پہچاننے والوں اور اس کی اہمیت کے انکار کرنے والوں کی طرف رخ کرکے بجائے اس قسم کی باتوں کے کہ ان کا ٹھکانا جہنم میں ہوگا، یا ان کو آگ میں جھونکا جائے گا۔ یا اسی قسم کی مادی سزاؤں کی جگہ

ومن کفر فان اللہ غنی عن العالمین۔ — اور جس نے ناشکری کے ساتھ انکار کیا (اس کو معلوم ہونا چاہیئے) کہ اللہ سارے جہانوں سے بے نیاز ہے۔

کے چند قرآنی الفاظ کیا اس ساری داستان کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے نہیں ہیں جو اس سلسلے میں اب تک آپ ہم سے اور بزرگوں کے حوالہ سے سن چکے، ہم جو کچھ کہنا چاہتے تھے شاید نہ کہہ سکے، لیکن قرآن نے ان چند ہی لفظوں میں سب کچھ کہہ دیا، ان سے کہدیا جو سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں، لیکن بے نیازی اور لاپرواہی کی یہ دھمکی ان کو ان کی

روح اور جان کو پگھلا دینے کے لیے کافی ہے "چشم لاپروا" اور "نظر تغافل" کی بھڑکائی ہوئی آگ اور بھڑکتے ہوئے انگاروں میں لوٹنے کا موقع جنھیں خدانخواستہ کبھی مل چکا ہے وہی کچھ اندازہ کر سکتے ہیں کہ "ان اللہ غنی عن العالمین" کی دھمکی کس مہیب جگر خراش منظر کو سامنے لاکر (العیاذ باللہ) کھڑا کر دیتی ہے۔

صحاح کی مشہور حدیث جس میں جتلایا گیا ہے کہ "قابو رکھنے کے باوجود حج کی سعادت سے جو محروم رہا اور اسی حال میں مرگیا خدا کو اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرا یا نصرانی ہو کر" اس میں حج کی وہی روح جھانک رہی ہو جس کے بغیر یہ تو ممکن ہے کہ "حج" کا قالب تیار کر لیا جائے لیکن اس "روح" سے بے گانگی "قلب" سے اس "قالب" کو محروم رکھے گی۔

"روح" "حج" سے بیگانگی ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ جماعت اور جمعہ و عیدین کی نمازوں کے ساتھ حج کا رشتہ جوڑتے ہوئے آج کل پھیلایا جا رہا ہے کہ روزانہ اور ہفتہ واری، سالانہ کمیٹیوں کے ساتھ اسلام نے مسلمانوں کے اجتماع عام کی کمیٹی یا کانفرنس کی تشکیل کی ایک عملی صورت حج کے ذریعہ سے نکالی ہے۔ رسیان بافوں نے تو نہ جاننے کی وجہ سے اس طلال بھکڑانہ توجیہ کو دنیا کے سامنے پیش کیا، پر حیرت ہے کہ آسمان والوں نے بھی جاننے کے باوجود ان ہی کے ساتھ اپنی آواز ملانی شروع کی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ انسانیت کا جو بے نظیر طوفان ہر سال حجاز کے ریگستانوں میں ٹھاٹھیں مارتا ہے یقیناً بے نظیر کہ زمین کے کسی حصے میں مختلف ممالک و امصار سے بھانت بھانت کی بولیوں کے بولنے والے مرد و زن اس خاص شان کے ساتھ کہیں بھی جمع نہیں ہوتے، حج ہی کا موسم ایک واحد موسم ہے جس میں ایک ہی میدان میں آپ شرق بعید چین و جاوہ ملایا کے باشندوں کے ساتھ مغرب اقصیٰ کے گورے چٹے آدمی ملی جلی شکلوں میں ہر سال مل سکتے ہیں، ان ہی میں آپ کو ہندی و سندی، بخاری و تاتاری، مصری و طرابلسی، الغرض ایشیا، اور افریقہ کے مسلمانوں کے ساتھ یورپ اور امریکہ کے مسلمانوں کو بھی آپ پا سکتے ہیں، اور ان سب کو جمع کر کے کسی خاص نصب العین تک پہونچنے کی دعوت بھی دے سکتے ہیں۔ بغیر کسی اشتہار و اخبار، پروپگنڈا، شور و شغب کے بکھری ہوئی انسانیت ہر سال ایک نقطہ پر جمع ہو جاتی ہے، آپ چاہیں تو معاشرتی، تمدنی، بلکہ ضرورت ہو تو سیاسی الجھنوں کے سلجھانے کا ذریعہ بھی اس اجتماع کو بنا سکتے ہیں، لیکن کام لینا، یا لے سکنا یہ دوسری بات ہے اور جس کام کے لیے حج کی عبادت مسلمانوں پر فرض کی گئی ہو یہ الگ مسئلہ ہے، آپ آم کی گٹھلی جب بوتے ہیں تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ درخت بن جانے کے بعد آپ اس درخت کے پتوں، اور لکڑیوں سے ایندھن کا کام بھی لے سکتے ہیں، لیکن بجائے پھلوں کے ایندھن میں پتوں اور لکڑیوں سے کام لینے کو گٹھلی بونے کی غایت ٹھہرانا، آپ ہی بتائیے کہ جنون کے سوا اور کیا ہے، سیدنا المعنوی نے سچ فرمایا ہے۔

ہر کہ کارد قصد گندم بایدش
کاہ خود اندر تبع می آیدش

گیہوں کی کاشت تو دانۂ گندم کے فراہم کرنے ہی کے لیے کی جاتی ہے، اور طفیل میں اس کے پتوں اور ڈنٹھلوں کو چور کر کے بھوسہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے، لیکن بھوسہ ہی حاصل کرنے کے لیے آجتک کسی نے گیہوں کی کاشت کی ہے؟ بقول حکیم الامت تھانوی نور اللہ ضریحہ "اسلامی عبادات" کی فلاسفی نکالنے کا عصری طریقہ اس سے زیادہ نہیں ہے کہ عرق گلاب کے قرابوں کا بھی استعمال استنجا بتا دیا جائے، فرمایا کرتے تھے کہ اپنی مائیت اور صفت سیلان کی وجہ سے ازالۂ نجاست کا کام یقیناً گلاب کے اس عرق سے بھی اگر چاہا جائے لیا جا سکتا ہے، لیکن اسی کو عرق گلاب کے وجود کی غائت ٹھہرانا عقلی گندگی اور ذہنی غباوت کے سوا اور کیا ہو؟

اور میں تو کہتا ہوں کہ دین میں ان عباداتی عناصر کے شریک کرنے کی جو واقعی غرض وغائت ہے اس کے ساتھ اپنی من مانی خود غرضیوں کے حصول کا ذریعہ ان کو بنا لینا، ممکن ہے کہ بعض حالات میں مضر نہ ہو، بلکہ مفید ہی ہو مگر مشاہدہ اور تجربہ بتاتا ہے کہ اس قسم کی بے احتیاطیوں اور بے باکیوں نے کبھی کبھی خطرناک نتائج کو بھی پیدا کر دیا ہے۔

خیر میں کیا کہنے لگا، ذکر یہ ہو رہا تھا کہ حج اور اس کے اعمال و اشغال کی تجزیہ و تحلیل ہی سے نہیں بلکہ خود قرآنی الفاظ کے اشاروں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ فطرت انسانی میں حسن و جمال کی جستجو و تلاش کا جو جبلی جذبہ ہے اسی جذبہ کے صحیح استعمال کی راہ حج کے ذریعہ کھولی گئی ہے، اسی حسن و جمال کے لازوال سرچشمے سے ربط قائم کرنے کی یہ حکیمانہ تدبیر ہے۔-------

---

دجالی فتنہ
اور
سورۂ کہف

اس مضمون میں عام ناظرین کی سہولت کے خیال سے کہیں
کہیں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں تقدیم و تاخیر، تبدیلی یا
اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ تصرف صرف لفظی ہے معنوی بالکل نہیں۔
اور اس کو ممتاز کرنے کے لیے اس [ ] علامت کے اندر
کر دیا گیا ہے، دو چار جگہ توضیحی حواشی لکھے گئے ہیں ان
کے آخر میں بھی "مُرتّب" یا "ع" لکھ دیا گیا ہے۔ علیٰ ہذا مضمون
کی، مختلف عنوانات میں تقسیم اور تمام بغلی سرخیاں یہ سب بھی
مرتّب کی جانب سے ہیں، اس میں کوئی سقم نظر آئے تو اس کا ذمہ دار
وہی ہے۔

_______ مُرتّب

مشہور حدیث جو ابو داؤد، مسلم، ترمذی، نسائی، مسند احمد، بیہقی وغیرہ محدثین کی کتابوں میں پائی جاتی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ دجّال کے فتنے سے جو محفوظ رہنا چاہتا ہو، اس کو چاہیے کہ سورۂ کہف کی ابتدائی یا خاتمے کی آیتوں کی تلاوت کرے۔ بعض روایتوں میں ابتدا یا خاتمہ کا ذکر نہیں ہے، بلکہ فرمایا گیا ہے کہ مطلقاً سورۂ کہف کی دس آیتوں کی تلاوت، پڑھنے والوں کو دجّال کے فتنے میں مبتلا ہونے سے بچا لیتی ہے، حضرت ابو سعید خدری، ابو درداء، ابن عمر، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم صحابیوں سے الفاظ کی کمی و بیشی کے ساتھ مندرجۂ بالا کتابوں میں یہ حدیث مروی ہے۔

اسی حدیث کی بنیاد پر سمجھا جاتا ہے کہ سورۂ کہف کے مضامین کا دجّال کے فتنے سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق ضرور ہے۔ آئیے نبوت کے اسی اشارہ کی روشنی میں اس سورہ کے مشتملات پر غور کریں۔ مجھ سے پہلے بھی بعض بزرگوں اور عزیزوں نے اس مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے، کچھ حرج نہیں کہ افادات سابقہ کے ساتھ جو کچھ اس وقت پیش کیا جا رہا ہے اس کا بھی مطالعہ کر لیا جائے۔ ممکن ہے کہ قرآن کی اس خاص سورہ کو سمجھنے میں تھوڑی بہت مدد ان معروضات سے بھی مل جائے پہلے بطور مقدمہ کے چند تمہیدی باتیں سن لیجئے۔

موضوع بحث "المسیح الدجّال" کی شخصیت اور حقیقت سے بحث نہیں، یہ ایک مستقل جداگانہ مسئلہ ہے، یہاں مقصود صرف وہ "فتنہ" ہے جسے "المسیح الدجال" کی طرف پیغمبرانہ پیشین گوئیوں میں منسوب کیا گیا ہے۔

دجّال کی علامات دجّال کے متعلق آپ نے جو کچھ سنا ہوگا یا کتابوں میں جن چیزوں کا انتساب اس کی طرف کیا گیا ہے سب کو پیش نظر رکھنے کے بعد کلی تعبیر ان کی یہی ہو سکتی ہے کہ بعض قدرتی قوانین پر غیر معمولی اقتدار اس کو بخشا جائے گا۔ مثلاً مسافت یعنی مکانی فاصلوں کو صفر کے درجہ تک گویا اس کے زمانے میں پہونچا دیا جائے گا۔

تیز رفتاری اس کی تیز رفتاری کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ جو فرمایا گیا ہے کہ "جیسے بارش کو تیز آندھی اڑائے لیے جاتی ہو" کچھ

یہی صورت اس کی رفتار کی ہوگی۔[1] صحیح مسلم کے الفاظ "کالغیث استدبرته الریح" کا مطلب یہی ہے، اور یہ کہ کرۂ زمین کے ملکوں اور شہروں میں نہیں بلکہ ایشیا، افریقہ، یورپ و امریکہ وغیرہ کے ایک ایک گاؤں تک رسائی اس کی کل چالیس دن میں ہو جائے گی، نواس بن سمعان والی روایت کے الفاظ "فلا تدع قریة الا ھبطتھا فی اربعین لیلة" (مسلم) سے یہی سمجھ میں آتا ہے:

مشرق سے مغرب تک آواز کی رسائی

اور یہ حال تو اس کی تیز رفتاری کا ہوگا [آواز کی رسائی کا حال سنئے!] حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف کنز العمال میں جو خطبہ منسوب کیا گیا ہے، اس میں آئندہ پیش آنے والے حوادث کے سلسلہ میں آپ نے دجال کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ یہ بھی فرمایا تھا کہ

ینادی بصوت له یسمع به ما بین الخافقین — پکارے گا دجال ایک ایسی آواز سے جسے خافقین (مشرق و مغرب) کے درمیان رہنے والے سنیں گے۔

(خلاصہ کنز العمال ج ۲ ص ۔۔۔، برمسند احمد)

جس سے معلوم ہوا کہ نہ صرف رفتار بلکہ "آواز" کے سلسلہ میں بھی فاصلہ کا مسئلہ دجال کے زمانہ میں غیر اہم ہو کر رہ جائے گی۔ اسی کتاب میں مستدرک حاکم کے حوالہ سے عبداللہ بن عمرو کی ایک روایت دجال ہی کے متعلق جو پائی جاتی ہے

---

[1] آج لوگوں کے سامنے ہوائی جہاز کی شکل میں جو سواری آچکی ہو ان کے لیے نبوت کی بیان کی ہوئی اس تشبیہ کے سمجھنے میں شاید کچھ دشواری نہ ہوگی، باقی اسی سلسلے میں دجال کے گدھے کا عام چرچا عوام میں جو پھیلا ہوا ہے، اس میں شک نہیں کہ عام شہرت اس گدھے کو ضرور حاصل ہو گئی ہے۔ لیکن صحاح کی کتابوں میں دجال کے متعلق حدیثوں کا جو ذخیرہ پایا جاتا ہے اس کو اس گدھے کے ذکر سے ہم خالی پاتے ہیں۔ البتہ ابن عساکر وغیرہ کی ایسی کتابیں جن کی روایتوں کا معیار صحت بہت کچھ بحث طلب ہے، ان میں حمار کے لفظ سے ضرور دجال کی سواری کا ذکر آیا ہے۔ مگر آگے جو تشریحی صفات اس حمار گدھے کے بیان کیے گئے ہیں مثلاً یہی کہ اس گدھے کے دونوں کانوں کے بیچ کا فاصلہ ستر ہاتھ ہوگا، یعنی ۔۔ باع ہوگا۔ اور حضرت علی کے خطبہ میں تو اس گدھے کے ایک ایک کان کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ تیس تیس ہاتھ کے برابر ہوں گے، اور اس سے بھی عجیب تر اس کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ اس گدھے کی ایک ٹاپ کا فاصلہ دوسری ٹاپ سے اتنا طویل ہوگا کہ عام حالات میں اس فاصلہ کو لوگ ایک دن اور ایک رات یعنی ۲۴ گھنٹوں میں طے کر سکتے ہیں الفاظ عربی کے یہ ہیں "ابین حافر حماره الی الحافر الآخر مسیرة یوم ولیلة" (ج ۔۔ خلاصہ کنز) اسی صورت میں گدھے والی روایتوں کی صحت اگر تسلیم بھی کر لی جائے جب بھی "حمار" کے لفظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے دجال کے گدھے کی حقیقت یقیناً اس سے مختلف ہو، بظاہر تفہیم کا یہ ایک تمثیلی طریقہ معلوم ہوتا ہے، ورنہ ہمارے سامنے جو گدھے ہیں ان میں یہ خصوصیتیں کہاں مل سکتی ہیں۔ آج مچھلی کی شکل ہوائی جہازوں کی بنائی جاتی ہے، اگر کبھی گدھے کی شکل یا قالب ان ہی کو عطا کر دیا جائے تو کیا تعجب ہے۔ ۱۲

اس میں بھی ہے کہ "دجّال کی آواز کو مشرق و مغرب کے باشندے سُنیں گے۔" (ص ۲۴۹ ج ۲ کنز)

علاج و معالجہ کی ترقی

اسی طرح روایتوں میں بیان کیا گیا ہے کہ علاج و معالجہ کے طریقے ترقی کرکے اس حد تک پہونچ جائیں گے کہ الاکمہ (مادر زاد اندھوں) الابرص (کوڑھی) تک کو چنگا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ (کنز ص ۲۴۲ ج ۲)

دریاؤں اور ہواؤں پر قابو

یہ بھی بیان کیا گیا ہو کہ "مسخرت لہ انہار الارض" (یعنی زمین پر بہنے والے دریاؤں اور نہروں پر بھی اس کو قابو عطا کیا جائے گا، جس سے معلوم ہوا کہ سیرابی کے ذرائع میں غیر معمولی ترقیاں رونما ہوں گی۔ اسی کے بعد ہے "وآثارھا" یعنی زمین کی پیداواروں پر اس کو قابو بخشا جائے گا، ظاہر ہے کہ سیرابی کے ذرائع پر قابو یافتہ ہونے کا یہ لازمی نتیجہ ہے، اور یہی نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مون سونی (برساتی) ہواؤں سے بھی کام لینے کی تدبیر اس پر منکشف ہو جائے گی، حدیث کے الفاظ ہیں کہ

یامر السّماء فتمطر والارض فتنبت (ج ۲ ص ۳۰ کنز برسند)

بادل کو حکم دے گا تو برسنے لگے گا، اور زمین کو حکم دے گا تو اگانے لگے گا۔

معدنیات پر اقتدار

اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ نباتاتی پیداواروں کے سوا زمین کے پیٹ کے معدنی ذخیروں کو بھی برآمد کرنے میں غیر معمولی کرشموں کا دجّال اظہار کرے گا، حدیث کے الفاظ ہیں کہ

ویمر بالخربۃ فیقول لہا اخرجی کنوزک فتتبعہ کنوزھا (ج ۲ ص ۳۰ کنز)

اُجاڑ زمینوں پر گذرے گا اور کہے گا کہ نکال اپنے ذخیروں کو، بس یہ ذخیرے اس کے پیچھے ہو لیں گے۔

احیاء موتیٰ

اور ان ہی روایتوں میں دجال کی طرف جو "یُحیی الموتیٰ" (یعنی وہ مردے کو زندہ کرے گا)، کے الفاظ منسوب کیے گئے ہیں اُن سے تو ثابت ہوتا ہے کہ مردوں کو زندہ کرنے کی بھی قدرت اس میں پیدا ہو جائے گی، یہ بھی ہو کہ مردے کو زندہ کرکے دکھائے گا بھی، صحاح میں ہے کہ ایک زندہ آدمی کو چیر کر رکھ دے گا اور پھر دونوں ٹکڑوں کو جوڑ کر اسی کو زندہ کرے گا۔

مردوں سے مکالمہ

اور کچھ قصہ اسی نقطہ پر ختم ہوتا ہوا نظر نہیں آتا، بلکہ روایتوں کے اس حصے پر بھی غور کیجئے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ دجال لوگوں کو ایک کرشمہ یہ بھی دکھائے گا کہ "بعض خبیث روحیں یعنی شیاطین لوگوں کے سامنے نمودار ہو کر کہیں گے کہ ہمارا یہ نام ہے، اور تمہارے ہم مرے ہوئے باپ، یا مری ہوئی ماں، یا دوسرے عزیز ہیں۔" الفاظ روایت کے یہ ہیں کہ

ویبعث معہ الشیاطین علی صورۃ من قد مات من الآباء والاُمہات والاخوان والمعارف فیاتی احدھم

اور اٹھائے جائیں گے دجال کے ساتھ بعض شیاطین ان لوگوں کی شکلوں میں جو مر چکے ہیں۔ یعنی باپ، ماں، بھائی اور جانے پہچانے لوگ

الیٰ ابیہ او اخیہ فیقول الست فلانا الست تعرفنی
پھر کوئی اپنے باپ یا بھائی کے پاس آئے گا، تب وہی پوچھے گا کہ میں فلاں آدمی کیا نہیں ہوں، کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟

(کنز ص۲۰۰)

بعض روایتوں کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے کہ

"دجال کے ساتھ کچھ شیاطین ہوں گے جو مُردوں کی سی شکل بنا کر زندوں سے کہیں گے کہ مجھے تم پہچانتے ہو، میں تمہارا بھائی یا تمہارا باپ یا تمہارا فلاں رشتہ دار ہوں، کیا تم نہیں جانتے کہ ہم مر چکے ہیں۔" (صفحہ ۲۱۱)

الغرض اس کا بھی سراغ ملتا ہے کہ مُردوں کے ساتھ زندوں کا تعلق پیدا کرانے کا دعویٰ بھی اسی طریقہ سے کیا جائے گا جیسے سُنا جاتا ہے کہ یورپ و امریکہ میں آج کل مردوں کو حاضر کرانے اور ان سے مکالمہ کے مواقع ان مُردوں کے زندہ عزیزوں کے لیے اسپرچولزم والوں کی طرف سے مہیا کیے جاتے ہیں۔ حضرت ابو سعید الخدری صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے مسند احمد میں دجال ہی کے متعلق ایک طویل حدیث پائی جاتی ہے جس کا ایک جز یہ بھی ہے۔

"دجّال کسی دیہاتی سے کہے گا کہ تمہارے ماں باپ کو زندہ کر کے میں کھڑا کر دوں تو تم مجھے اپنا رب مانو گے؟ دیہاتی کہے گا کہ اچھا ایسا کر کے دکھاؤ، تب دو خبیث روحیں اس دیہاتی کے سامنے اس کے ماں باپ کی شکل اختیار کر کے نمایاں ہوں گی اور دیہاتی سے کہیں گی کہ اے میرے بیٹے تم دجال کا ساتھ دو اور اس کی پیروی کرو، یہی تمہارا رب ہو۔" (صفحہ ۲۰۱ کنز العمال)

بہر حال قدرتی قوانین پر غیر معمولی اقتدار جو دجال کو عطا کیا جائے گا وہ یہی یا اس قسم کی دوسری باتیں ہیں جن کی تفصیل دجال کی متعلقہ حدیثوں میں پڑھی جا سکتی ہو۔

دجال کو دجال بنانے والی چیز

لیکن جہاں تک میرا خیال ہو دجال کو دجال بنانے والا اس کا وہ طرزِ عمل ہو گا جو اپنے اس غیر معمولی اقتدار کے استعمال میں وہ اختیار کرے گا۔

میرا مطلب یہ ہو کہ قوانین قدرت پر غیر معمولی اقتدار بجائے خود ایسی چیز نہیں ہو جو آدمی کو دجّال بنا دے بلکہ پرانی تعلیم کی رو سے تو قدرت کے قوانین سے استفادہ نسلِ انسانی کے مقام خلافت کا اقتضاء ہے۔ آدم علیہ السلام کو اسماء کا جو علم بخشا گیا تھا اسی اجمالی علم کی یہ تفسیر ہے، ماسوا اس کے کون نہیں جانتا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو بھی اسی قسم کا غیر معمولی اقتدار بخشا گیا تھا، علوی اجرام یا سفلی اجسام کی تسخیر کی مثالوں سے ان کی زندگی معمور نظر آتی ہے، سمندر کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ضرب سے پھٹ جانا، یا شق القمر کا معجزہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی طرف منسوب ہے، خود قرآن میں ذکر کیا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اکمہ وابرص کو چنگا بھی کرتے تھے بلکہ مردوں کو زندہ کر کے بھی دکھاتے تھے۔ بہر حال پیغمبروں کی زندگی میں اس قسم کی چیزوں کی کیا کمی ہے، مگر پیغمبروں کو یہی اقتدار جب بخشا گیا تو اپنے ان اقتدارے جو کام وہ لیتے تھے، اس سے دنیا واقف ہو۔ یعنی اقتدار بخشنے والے قادر و توانا کے شکرے ان کے قلوب بھی معمور ہو جاتے تھے اور دوسروں کو بھی اسی خدائے بخشائندہ مہربان کی طرف کھینچتے تھے۔ تسخیری مظاہر کو حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے سامنے پا کر فرمایا کرتے تھے کہ

هذا من فضل ربي ليبلوني أأشكر ام اكفر ومن شكر فانما يشكر لنفسه ومن كفر فان ربي غني كريم۔ (النمل)

یہ میرے پروردگار کی مہربانی ہے، مجھے وہ جانچتا ہو کہ میں اس کا گن گاتا ہوں یعنی شکر کرتا ہوں، یا ناشکری کرتا ہوں، جو شکر کرتا ہے خود اپنے لیے کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے اسے معلوم ہو کہ میرے رب کی ذات سب سے بے پروا اور عظمت والی ہے۔

لیکن بالکل اس کے برعکس جیسا کہ سب جانتے ہیں دجال اپنے اقتداری کرشموں کو اقتدار بخشنے والے خدا سے خود باغی بننے اور دوسروں کو بھی خدا سے بیزار و باغی بنانے میں استعمال کرے گا۔ اس کی یہ خصوصیت اتنی نمایاں ہو گی کہ عوام و خواص ہر ایک پر بشرطیکہ مومن ہو حدیثوں میں آیا ہے کہ پہلی نظر میں اس کے مشن کا یہ امتیازی نصب العین خود بخود واضح ہو جائے گا۔ صحیح بخاری وغیرہ میں یہ مشہور روایت جو دجال ہی کے متعلق پائی جاتی ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

انه مكتوب بين عينيه ك ف ر يقرءه كل مومن كاتب او غير كاتب۔

دجال کی دونوں آنکھوں کے بیچ ک، ف، ر (کفر) لکھا ہوا ہو گا جسے ہر مومن پڑھ لے گا۔ خواہ وہ کاتب ہو یا غیر کاتب"

کاتب" یعنی لکھنے پڑھنے والے لوگ اور "غیر کاتب" یعنی نوشت و خواند کا سلیقہ جن میں نہ ہو کسی سے بھی دجال کی یہ خصوصیت مخفی نہ رہے گی۔ گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ کفر یعنی "ک، ف، ر" یہی دجالی تمدن و تہذیب کا امتیازی چھاپ ہو گا۔ ماحول ہی ایسا پیدا ہو جائے گا کہ دنیا بے ایمانی، الحاد، بے دینی کی شکار ہوتی چلی جائے گی۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر کرتے ہوئے ایک دن فرمایا کہ "دجال کے دیکھنے کا موقع جسے مل جائے، اس کو چاہیے کہ اس سے دور ہی دور رہے"۔ اسی کے بعد یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ

فوالله ان الرجل ليأتيه وهو

تو اللہ کی قسم ہے کہ دجال کے پاس آدمی آئے گا

یحسب انہ مومن فیتبعہ مما یبعث بہ الشبہات

(ابوداؤد وغیرہ)

یہ خیال کرتے ہوئے کہ وہ مومن ہو (مگر دلنے کے ساتھ ہی) اس کا پیرو بن جائے گا، جس کی وجہ وہ شبہے اور شکوک ہوں گے جو دجال سے ملنے کے ساتھ ہی پیدا ہو جائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دوسروں کو اپنے خیالات سے متاثر کرنے کی غیر معمولی مہارت اس میں پائی جائے گی۔ اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ مردوں سے آگے بڑھ کر عورتوں کو بھی وہ متاثر کرے گا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

اٰخر من یخرج الیہ النساء حتی ان الرجل لیرجع الی امہ وابنتہ واختہ وعمتہ فیوثقہا رباطاً۔

دجال کے ساتھ آخر میں عورتیں بھی نکل پڑیں گی۔ حالت یہ ہو جائے گی کہ آدمی اپنی ماں بہن بیٹی، پھوپھی کو اس اندیشے سے باندھے گا کہ کہیں دجال کے ساتھ نہ نکل پڑیں۔

بہرحال قدرتی قوانین پر غیر معمولی اقتدار کا غلط بلکہ قطعی معکوس استعمال یہی وہ "فتنہ" ہے جس میں المسیح الدجال خود بھی مبتلا ہوگا، اور کوشش کرے گا کہ اس کی بھڑکائی ہوئی، فتنے کی اس آگ میں دوسرے بھی جھونک دیے جائیں۔

دجال کی کرشمہ نمائیوں کے ذرائع؟ باقی یہ مسئلہ کہ اپنی کرشمہ نمائیوں میں وہ کن ذرائع سے کام لے گا؟ ظاہر ہے کہ جب تک "المسیح الدجال" خود دنیا کے سامنے نہ آ جائے، اس سوال کا صحیح جواب نہیں دیا جا سکتا۔ کیا سحر و جادو یا اسی قسم کے غیر مادی ذرائع پر اس کو قابو بخشا جائے گا۔

حافظ ابن حزم کا خیال یا جیسا کہ حافظ ابن حزم محدث کا خیال ہے۔

انما ہو حیل یتحیل بحیل معروفۃ کل من عرفہا عمل مثلہ

(الملل والنحل ج ۲ ص ۱۲۱)

دجال حیلوں سے کام نکالے گا، ایسے حیلے جن کا علم جو بھی حاصل کرے گا وہی سب کچھ کر کے دکھا سکتا ہو جو دجال دکھائے گا

جس کا حاصل یہ ہوا کہ ابن حزم کے نزدیک دجال "حیل" سے کام لے گا، جو "حیلہ" کے لفظ کی جمع ہے۔ عام طور پر میکانکی طریقوں کی تعبیر عربی زبان میں "حیل" کے لفظ سے کی جاتی ہے۔ مثلاً جر ثقیل کے طریقوں کا ذکر "حیل" کے ذیل میں کرتے ہیں۔ "علم الحیل" نام ہی اس علم کا ہے جس میں میکانکی طریقوں سے چیزوں پر قابو حاصل کرنے کی تدبیریں بتائی جاتی ہیں۔ اور یہی ابن حزم کا مقصود بھی ہے۔ انھوں نے دوسری جگہ "دجالی کرشموں" کا تذکرہ کرتے ہوئے بعض مثالوں سے "دجالی کرتبوں" کو سمجھانا چاہا ہے۔ مثلاً لکھا ہے کہ اس کی نوعیت دیکھا ہوگی جیسے بعض لوگ مرغیوں کو ہڑتال کھلا کر دکھا دیتے ہیں، کہ گویا مرغیاں مر گئیں، ان کی حس و حرکت غائب ہو گئی۔ پھر ان ہی مرغیوں کے حلق میں زیتون کا تیل

جب ٹپکاتے ہیں تو پھڑ پھڑا کر اُٹھ بیٹھتی ہیں۔ بھڑوں کے متعلق بھی اپنا ذاتی تجربہ نقل کیا ہے کہ پانی میں ان کو ہم ڈال دیا کرتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب مر گئیں۔ پھر ان ہی مردہ بھڑوں کو دھوپ میں لاکر تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دیتے تو وہ زندہ ہو جاتی تھیں۔ اسی سلسلے میں اپنے وطن (اندلس) کے ایک آدمی محمد محرق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہو کہ بند کمرے میں یہ تماشہ دکھاتا تھا کہ کوئی دوسرا بولنے والا اس کمرے میں موجود نہیں ہے۔ لیکن بولنے کی آواز اسی کمرے میں گونجتی تھی، حافظ کا بیان ہو کہ اس کمرہ کی دیوار کے مخفی تگان میں نلکی لگی ہوئی تھی جس سے لوگ ناواقف تھے، اسی نلکی کے دوسرے سرے پر کمرے سے باہر بات کرنے والا بات کرتا تھا مگر محرق باور کراتا تھا کہ کسی بولنے والے کے بغیر اسکے سامنے آوازیں آتی ہیں۔ (الملل والنحل جلد ا صفحہ ۹)

راہِ صواب | اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حدیثوں میں بھی اس کی تصریح نہیں کی گئی ہو کہ "دجال" اس راہ میں کن ذرائع سے کام لے گا۔ نہ اس کی تصریح پائی جاتی ہے کہ سحر و شعبدہ وغیرہ سے وہ کام لے گا، اور نہ یہ بیان کیا گیا ہو کہ قدرتی قوانین کا علم حاصل کر کے ان کو اپنے قابو میں لائے گا۔

اور یہ قصہ کچھ دجالی کرشموں ہی تک محدود نہیں ہو۔ قیامت سے پہلے آئندہ پیش آنے والے جن واقعات کا حدیثوں میں ذکر کیا گیا ہو، سب ہی کے متعلق یہ مناسب ہو کہ دیکھنے سے پہلے خواہ مخواہ اپنی طرف سے ان کے اسباب و علل کے متعلق فیصلہ نہ کر دیا جائے[لہ]۔

ایک عاجلانہ فیصلہ | پچھلے دنوں بعض لوگوں نے عجلت سے کام لے کر یورپ و امریکا کے موجودہ تمدن و تہذیب کو دجالی

لہ۔ مثلاً روایتوں میں آتا ہو کہ یاجوج و ماجوج کے اچانک مرجانے اور ختم ہو جانے کے بعد جب زمین ان کی گندگیوں سے صاف ہو جائے گی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اہل ایمان کے ساتھ پہاڑ سے اتر کر زمین پر آئیں گے تو بیان کیا گیا ہو کہ نشو و نما کی قوت زمین کی اتنی زیادہ بڑھ جائے گی کہ ایک ایک انار سے بڑی بڑی ٹولیاں سیر ہو جائیں گی، اور انار کا خول دانوں کے نکالنے کے بعد جو رہ جائے گا وہ اتنا بڑا ہوگا کہ یہی بڑی ٹولیاں اس کے سائے میں قیام کریں گی۔ ایک طرف اس خبر کو رکھیے اور دوسری طرف غور کیجیے ان تجربات پر جو جاپان میں ایٹم بم کے چلنے کے بعد کیے گئے، کہتے ہیں کہ جس علاقہ میں بم چلایا گیا تھا وہاں کی زمین میں جو چیزیں بعد کو بوئی گئیں تو اپنی مقدار میں حیرت انگیز طور پر دیکھا گیا کہ وہ بڑھی ہوئی ہیں۔ شلجم، مولی وغیرہ کی جو جسامت اس سلسلہ میں بیان کی گئی ہو، عام حالات میں اس کا باور کرنا مشکل ہو۔ علیٰ ہٰذا "دخان مبین" یعنی قرآن میں جس کھلے ہوئے دھوئیں کا ذکر ہو اور فرمایا گیا ہو کہ لوگ خدا کے متعلق جب شک میں کھیلنے لگیں گے اور ان کے پاس "رسول مبین" کھلا ہوا رسول جو آیا تھا اس پر معلّم اور مجنون ہونے کا اتہام لگائیں گے (یعنی اس کو دوسرے مذاہب کے علماء سے باتیں سیکھ کر بیان کرتا ہو، یا اس کے دماغ میں فتور ہو) ان دونوں جرائم کی سزا میں دھمکی دی گئی ہو کہ تب کھلے ہوئے دھوئیں کا انتظار کیجیو۔ خاکسار نے اپنے ایک مضمون میں عرض کیا تھا کہ یورپ ان جرائم کا مجرم بھی ہو۔ اور آپس میں جن آتشیں ہتھیاروں سے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تمدن و تہذیب نشر. دیتے ہوئے یہ فیصلہ بھی جو کر دیا کہ "المسیح الدجال" جس کی حدیثوں میں پیشین گوئی کی گئی ہو وہ گیا اور اب مسلمانوں کو "دجال" کے انتظار کی زحمت نہ کھینچنی چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ فیصلہ بھی زود نشری اور زود بیانی کے عارضہ کا نتیجہ تھا، اور اب بھی جن لوگوں کو اس خیال پر اگر اصرار ہو تو سمجھنا چاہیے کہ زود نشری کے مرض سے وہ شفایاب نہیں ہوئے ہیں۔

یورپ اور امریکا میں ابھی دجال کی علامات پوری طرح موجود نہیں ہیں

یہ صحیح ہو کہ قدرتی قوانین پر غیر معمولی اقتدار پچھلی دو ڈھائی صدیوں میں یورپ و امریکا والوں کا مسلسل قائم ہوتا چلا جا رہا ہو اور اپنے اس اقتدار کو ان ممالک کے باشندے بھی ان ہی "دجالی اغراض" میں جیسا کہ دیکھا جا رہا ہو استعمال کر رہے ہیں۔" ک. ون.. "یعنی کفر و الحاد یا خدا سے بیزاری یا انحراف موجودہ مغربی تہذیب کا ایسا عام چھاپ ہے، جسے ہر جاہل و عالم بشرطیکہ ایمان کی کوئی کرن اپنے اندر رکھتا ہو، جانتا اور پہچانتا ہو، خالق کی مرضی کے مطابق اس کے بندوں کے آگے زندگی کا جو نظام خدا کے پیغمبروں نے پیش کیا ہے اس نظام زندگی سے پژمردگی اور افسردگی پیدا کرنے میں آج یورپ جن چابکدستیوں سے کام لے رہا ہو ان کو دیکھتے ہوئے نبوت کی وہ پیشین گوئی سمجھ میں آتی ہے کہ مومن دجال کے پاس جائے گا، لیکن جب واپس لوٹے گا تو طرح طرح کے شکوک و شبہات کی چنگاریاں اپنے اندر بھڑکتی ہوئی پائے گا، یہ بھی دیکھا جا رہا ہو کہ مردوں سے متجاوز ہو کر عورتوں کو بھی فتنہ کی یہ آگ گھیرتی چلی جا رہی ہے۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اسپرچولیزم کے شیطانی تجربات کے دعوے پیش کر کے اس معیار ہی کو یورپ والوں نے چاہا ہے کہ مشتبہ کر دیں، جس پر مذاہب و دیانات کے سلسلہ میں حق و باطل کو جانچا جا سکتا تھا، اگر واقعی یہ مان لیا جائے کہ جن مخفی روحوں سے مکالمہ کا ادعا اس طبقہ کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے یہ شیاطین نہیں بلکہ گزشتہ مرے ہوئے لوگوں کی واقعی روحیں ہیں تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ مرنے کے بعد والی زندگی کی بھلائی اور برائی، خیر و شر کا تعلق ان امور سے نہیں ہے جن کے ساتھ خیر و شر کے نتائج کو مذاہب وابستہ قرار دیتے ہیں، اور یہ بھی صحیح ہے کہ گو صاف صاف و صریح لفظوں میں خدائی کا دعویٰ یورپ کی طرف سے ابھی دنیا کے سامنے نہیں رکھا گیا ہے۔ لیکن جس فطری رفتار کا لوگوں کو اس زمانے میں عادی بنا دیا گیا ہے، اس رفتار کا آخری نتیجہ یہی ہے اور یہی ہو رہا ہے کہ بجائے خدا کے سب سے آخری اقتداری قوت کائنات کی بنی نوع انسانی ہی کو تسلیم کر لیا جائے، مسئلہ ارتقاء جو مغربی طریقۂ فکر کی نہا مخصوص راہ ہو وہی اسی نتیجہ تک سوچنے سوچنے والوں کو پہنچا دیتا ہے، بلکہ انسانوں میں بھی چوں کہ آج ہر قسم کی طاقتوں اور قوتوں کا مرکز یورپ و امریکا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

رو کر شباہ ہو رہا ہو (اگر غور کیا جائے تو) ان میں "دخان" یعنی دھواں مشترک نظر آئے گا، اور ایٹم بم نے تو دنیا کو "مبین" بنا کر دکھا دیا جس سے دنیا واقف ہے۔

ہی بنا ہوا ہے، اس لیے "سوراخ" کے لفظ کا اطلاق خواہ مغربی تہذیب و تمدن کے نمائندوں پر نہ کیا جائے، لیکن خدا اگر اس طاقت کا نام ہے جس کے اوپر کوئی طاقت نہیں ہے، تو آج ان دلوں کو چیر کر دیکھئے جو مغربی تمدن کے زیر اثر ہیں یہی عقیدہ اور احساس باہر نکل آئے گا کہ یورپ امریکا والوں سے بڑا کوئی نہیں ہے ان ہی پر سارے کمالات کی انتہا ہوتی ہے، جو کچھ اس تہذیب و تمدن کے متعلق لکھا پڑھا جاتا ہے اور جس قسم کی گفتگو یورپ کی اس نشاۃ جدیدہ کے متعلق عوام و خواص کی مجلسوں میں کی جاتی ہے، رسالوں، اخباروں، سنیماؤں اور تھیٹروں میں جو کچھ سنایا اور دکھایا جاتا ہے شعوری و غیر شعوری طور پر یہی اثر ان سے دماغوں اور دلوں میں جاگزیں ہوتا چلا جا رہا ہے، کوئی شک نہیں کہ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

مگر بایں ہمہ جیسا کہ میں نے عرض کیا کھلے اور صاف لفظوں میں خدائی کا دعویٰ بھی ابھی نہیں کیا گیا ہو اور قوانین قدرت پر بھی ان کا اقتدار بلندی کے اس نقطہ تک ابھی نہیں پہونچا ہے، جس پر حدیثوں میں بیان کیا گیا ہو کہ "المسیح الدجال" کی نادرہ نمائیاں پہونچ جائیں گی، اس کی کوشش جیسا کہ سنا جاتا ہے ان ممالک میں ہو رہی ہو کہ مردوں کو زندہ کرنے کا راز بھی دریافت کر لیا جائے۔ ایسی خبریں بھی کبھی کبھی آجاتی ہیں کہ بعض حیوانوں بلکہ شاید انسانوں کے متعلق احیاء موتی (مردوں کو زندہ کرنے) کا عمل کامیاب ہو چکا ہے، یہ بھی سننے میں آتا ہو کہ بادلوں پر بھی قریب ہو کہ قابو پا لیا جائے مگر انصاف کی بات یہی ہے کہ صحیح کامیابی جیسی کہ چاہیے اس راہ میں مغرب کی جدید تہذیب اور ارتقائی و صنعتی کوششوں کو ابھی نہیں ہوئی ہے، اور اس کے سوا بھی ایسے مختلف وجوہ و اسباب ہیں جن کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا چاہیئے کہ نبوت کی پیشین گوئیوں میں جس "المسیح الدجال" کا ذکر جن خصوصیتوں کے ساتھ کیا گیا ہو، اس کے خروج و ظہور کا دعویٰ ابھی قبل از وقت ہو۔

ہاں! اتنی بات صحیح ہے کہ مغرب کا جدید تمدن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "المسیح الدجال" کے خروج کی زمین تیار کر رہا ہے۔ کیونکہ اپنی اقتداری قوتوں سے وہی کام یورپ کی اس نشاۃ جدیدہ میں بھی لیا جا رہا ہے، جس میں "المسیح الدجال" اپنی اقتداری قوتوں کو استعمال کرے گا، خدا بے زاری یا خدا کے انکار کو ہر دلعزیز بنانے کی راہ یورپ صاف کر رہا ہے یا کر چکا ہے، لیکن بجائے خدا کے خود اپنی خدائی کے اعلان کی جرأت اس میں ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے، "المسیح الدجال" اسی قصے کی تکمیل کر دے گا۔

خروج دجال کا دعویٰ تو ابھی قبل از وقت ہو
مگر دجالی فتنہ کی ابتدا ہو چکی ہو

کچھ بھی ہو، صحیح اور صاف جچی تلی ہوئی بات جس میں خواہ مخواہ نبوت کے الفاظ میں کھینچ تان اور رکیک تاویلوں کی ضرورت نہیں ہوتی، یہی ہو کہ "المسیح الدجال" کے خروج کا دعویٰ تو قبل از وقت ہو، مگر "المسیح الدجال" جس فتنے میں دنیا کو مبتلا کرے گا، اس فتنہ کا ظہور کسی نہ کسی رنگ میں مان لینا چاہیے کہ ہو چکا ہے، دوسرے لفظوں میں چاہیئے تو کہہ سکتے ہیں کہ دجال آیا ہو یا نہ آیا ہو، لیکن "دجالیت"

کی آگ یقیناً بھڑک چکی ہو، آخر حدیثوں ہی میں یہ بھی تو آیا ہو کہ "المسیح الدجال" سے پہلے "دجاجلہ" کا ظہور ہوگا بعض روایتوں میں ان کی تعداد تیس اور بعض میں ستر چھتیر تک بتائی گئی ہے "دجال" سے پہلے ان "دجاجلہ" کی طرف "دجالیت" کا انتساب بلا وجہ نہیں کیا گیا ہو، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ "المسیح الدجال" جس فتنے کو بیدار کرے گا، کچھ اسی قسم کے فتنوں میں اس سے پہلے پیدا ہونے والے "دجاجلہ" دنیا کو مبتلا کریں گے۔

سورۂ کہف ہر دجالی فتنہ کے لیے تریاق ہے

اسی بنیاد پر میرا خیال ہو کہ "المسیح الدجال" کے زہر کا علاج جیسے بتایا گیا ہے کہ سورۂ کہف کی آیتوں میں پوشیدہ ہو اسی طرح اگر چاہا جائے تو ہر "دجالی فتنے" کے زہر کا ازالہ بھی اسی سورہ کی آیتوں اور جن معارف و مضامین پر یہ آیتیں مشتمل ہیں، ان میں تلاش کیا جا سکتا ہو۔

موجودہ دجالی فتنہ اور سورۂ کہف

چونکہ موجودہ مغربی تہذیب و تمدن جس کے زیر اثر دنیا کی اکثریت آچکی ہے اور آتی چلی جا رہی ہے دجالی جراثیم، کا جیسا کہ دنیا دیکھ رہی ہو سرچشمہ بنی ہوئی ہو، تقریباً وہی فتنے جن کے ظہور کی خبر "المسیح الدجال" کے عہد میں دی گئی ہو، یورپ کی اس تہذیب و تمدن سے ابل رہے ہیں

اسی حقیقت کو پیش نظر رکھ کر فقیر نے سورۂ کہف کے مضامین اور تمثلات میں جب غور کیا تو بعض حیرت انگیز نتائج سامنے آئے۔ شاید دوسروں کو بھی اس سے کچھ فائدہ ہو ان کو قلم بند کر لیا گیا۔ آج ان ہی کی اشاعت کی سعادت حاصل کی جاتی ہے۔ واللہ ولی الامر والتوفیق۔

دجالی فتنہ، جسے چاہیں تو آپ "حمارٹی تہذیب و تمدن" بھی کہہ سکتے ہیں، اس فتنے کے نمایاں خط و خال، آثار و لوازم آپ کے سامنے پیش ہو چکے، اگر ان نشانیوں اور علامتوں سے آپ اس فتنے کو پہچاننے میں کسی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں، تو اس کے بعد میں خیال کرتا ہوں کہ سورۂ کہف کے ان اشاروں سے انشاء اللہ مستفید ہونے کی صلاحیت آپ میں پیدا ہو چکی ہوگی جو آپ کے سامنے رکھے جاتے ہیں۔

(1)

سورۂ کہف کے مضامین کی اجمالی فہرست

سورۂ کہف کے مشتملات اور مضامین کی اجمالی فہرست کا پہلے جائزہ لے لیا جائے تو مناسب ہے۔

۱۔ ابتدائی رکوع اور خاتمہ کی رکوع میں چند کلیاتی اشارے پائے جاتے ہیں، جیسا کہ انشاء اللہ معلوم ہوگا، دجالی فتنے سے ان اشاروں کا کافی گہرا تعلق ہے۔

له حمار عربی میں گدھے کو کہتے ہیں۔ "المسیح الدجال" کی طرف جس گدھے کا انتساب کیا گیا ہے، روایۃً و درایۃً اس کا حال جو کچھ بھی ہو وہ پہلے عرض کر چکا ہوں، اسی کے ساتھ اگر اس کو بھی سوچا جائے کہ تمدن جدید کے ائمۂ اجتہاد کارل مارکس کو سب سے بڑی کارفرما جوہری قوت انسانی جد و جہد میں پیٹ اور پیٹ کے تقاضے جو نظر آئے ہیں، اور اسی کے ساتھ فرائڈ نے "جنسی میلان" کی نشان دہی، بنی آدم کی ساری تگ و دو میں جو کی ہو، ان دونوں نظریات کو اگر ملا لیا جائے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ انسانیت جن جذبات کی رو میں تمدن جدید کے ان محققوں کو بہتی نظر آئی ہے ان کی مثالی صورت کے لیے گدھے کے قالب سے بہتر قالب شاید کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ آخر شکم پروری اور خر نفسی کے سوا غریب گدھا اور بھی کچھ ہے؟ عہد جدید کا انسان جب ان ہی دو کارفرما قوتوں کی سواری پر سوار ہو کر آسمان کے قلابے زمین سے اور زمین کے قلابے آسمان سے ملا رہا ہے، کد و کاوش، جد و جہد کے تمام شعبے چھوٹے پیمانے پر ہوں یا بڑے پیمانے پر، جب ان ہی دو محرک قوتوں کے زیر اثر گردش کر رہے ہیں، نسل انسانی کی ساری اچھل پھاند جب ان ہی دونوں جذبات سے زور حاصل کر رہی ہے تو گدھے کی سواری کے سوا، "المسیح الدجال" کی ران کے نیچے آپ ہی بتائیے کہ اور نظر ہی کیا آتا، سوار جب خود کہہ رہا ہو کہ میں گدھے پر سوار ہوں، تو دیکھنے والوں نے کیا غلطی کی جب اس کو گدھے پر سوار دیکھا۔ ۱۲

۲۔ ان کلیاتی اشاروں کے سوا چند قصص اور حکایتیں ہیں۔ یعنی اصحاب کہف کا قصہ، لدنی (خدا کے حضور سے علم و رحمت پانے والی ایک شخصیت سے موسیٰ کی ملاقات، ذوالقرنین کا قصہ (اسی قصہ کے ضمن میں یاجوج و ماجوج کا ذکر بھی پایا جاتا ہے) دو آدمیوں کی مثالی سرگذشت اور مکالمہ جن میں ایک کے قبضے میں قدرتی پیداواروں کے حصول کے بڑے اہم ذرائع و وسائل تھے اور دوسرے کا دامن ان ذرائع و وسائل سے خالی تھا۔ دنیا کی موجودہ پست زندگی کی ایک تمثیل آدم اور شیطان کے قصے کا اعادہ بعض جدید اضافوں کے ساتھ۔

ان قصص کی نوعیت اور مقصد بیان

ان تمثیلی قصص و حکایات کو بیان کرتے ہوئے، بعضوں کے شروع میں تو صراحۃً یہ کہہ دیا گیا ہو کہ اس کا ذکر بطور مثال اور نمونہ کے لوگوں کے سامنے کیجئے۔ مثلاً فرمایا گیا ہو:۔ واضرب لهم مثلا رجلين (اور بیان کر بطور مثال کے دو آدمیوں کا حال الخ) یا دنیا کی اس پست زندگی کی مثال کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا:۔ واضرب لهم مثل الحيوة الدنيا (اور بیان کر ان کے لیے اس پست زندگی کی مثال) اور بعضوں میں اس کی تصریح تو نہیں کی گئی ہو، مگر سباق و سیاق، اور قرآن کے شیوۂ بیان کے جو مذاق شناس ہیں وہ جانتے ہیں کہ محض کسی گذرے ہوئے واقعہ کا دہرانا، یعنی افسانہ گوئی کا انتساب قرآن کی طرف خود اپنی عقل و تمیز کا مضحکہ ہے، اسی لیے قرآنی قصص و حکایات کی تاریخی جستجو کم از کم میرے نزدیک ایک غیر ضروری شغلہ ہے۔

قرآن کا عام دستور

قرآن کا عام دستور ہے کہ بڑے بڑے تاریخی واقعات سے صرف ان ہی اجزاء کا وہ انتخاب کر لیا ہو جن سے کسی خاص مقصد کے ذہن نشین کرانے اور سمجھانے میں مدد ملتی ہو، نہ صرف گذرے ہوئے واقعات و حوادث بلکہ جس زمانے میں قرآن نازل ہو رہا تھا اور ایک عالمگیر تاریخی انقلاب کے متعلقہ حوادث مسلسل یکے بعد دیگرے پیش آتے چلے آ رہے تھے، ان کے ذکر کی بھی ضرورت کہیں اگر پیش آگئی ہے تو اس وقت بھی حسب دستور ذکر کے لیے ان ہی اجزاء کو اس نے چن لیا ہے جن سے اس خاص مقام میں کسی قسم کا تفہیمی کام وہ لینا چاہتا تھے۔ بدر و احد، فتح مکہ، جیسے اہم فیصلہ کن معرکوں کا تذکرہ آپ کو قرآن میں اگر ملے گا بھی تو اسی نوعیت کے ساتھ جو میں نے عرض کیا۔ ورنہ بعض اہم واقعات مثلاً شعب ابی طالب میں نظربندی، ہجرت حبشہ، فتح خیبر اور از ایں قبیل بیسیوں چیزیں اسی سلسلے کی ایسی ہیں کہ اُن کے ذکر سے ہم قرآن کو خالی پاتے ہیں، یا ذکر ملتا بھی ہے تو اتنا مجمل کہ جب تک واقعہ کی تفصیلات کا علم نہ ہو۔ ان اجمالی اشاروں سے واقعہ کا علم نہیں ہو سکتا، اور اس کی وجہ وہی ہے کہ قرآن نہ قصے کہانی کی کوئی کتاب ہو اور نہ وہ کوئی تاریخی یادداشت یا ریکارڈ ہے، اس کا ایک متعین موضوع ہے۔[۱]

---

[۱] یعنی جس کی استدعا "اهدنا الصراط المستقيم" کی دعا میں کی جاتی ہے، وہ سیدھی راہ جس پر چڑھ کر انسانیت قدرت اور اس کے قوانین سے وفاقی تعلق پیدا کر لیتی ہو، قرآنی تعبیر جس کی "انعام" کے لفظ سے کی گئی ہے۔

لیے اس کے سارے مباحث اسی ایک موضوع کے گرد گردش کرتے ہیں، اسی موضوع خاص کے لیے جہاں جہاں مناسب تھا، بعض گذرے ہوئے واقعات اور قصص کا بھی اس نے ذکر کیا ہے مگر اسی التزام کے ساتھ، یعنی صرف اسی حد تک اپنے بیان کو محدود رکھتا ہے جس کی اس خاص مقام میں ضرورت ہوتی ہے، اسی لیے آپ پائیں گے کہ ایک ہی قصہ کا افادہ مختلف مقامات میں مختلف طریقوں سے قرآن میں جو کیا گیا ہو تو کہیں نسبتاً تفصیل و بسط کا رنگ پایا جاتا ہے، اور کہیں اسی قصے کے کسی خاص جز کا ذکر کرتے ہوئے آگے نکل جاتا ہے۔

قرآن کے اس اسلوب کی ایک مثال

مجھے تو اپنے تجربہ کی بنیاد پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "ہڈی" جیسے ایک ہی ہوتی ہے، مگر جسدی نظام میں وہی "ہڈی" کسی جگہ کافی طویل و عریض نظر آتی ہے، اور دوسری جگہ بھی ہڈی ہی ہوتی ہو مگر ایک انچ ڈیڑھ انچ سے زیادہ بڑی نہیں ہوتی، کچھ یہی طریقہ قرآنی قصص کے استعمال میں اختیار کیا گیا ہے [یا یوں سمجھئے کہ] ایک ہی لکڑی ہوتی ہے، بڑھئی مختلف پیمانوں اپنا اسی ایک لکڑی سے ٹکڑے بنا بنا کر اپنی اپنی جگہ پر ان چھوٹے بڑے ٹکڑوں کو فٹ کرتا چلا جاتا ہے۔ قرآنی قصص کے متعلق، قرآن پڑھنے والے اس خاص نقطۂ نظر کو اگر سامنے رکھیں گے تو ان پر قرآن کا ایک عجیب غریب اعجازی نظام واضح ہو گا۔

بہرحال مجھے کہنا یہ ہو کہ سورۂ کہف کی ان قصص و حکایات کی تاریخی تحقیق یعنی کہاں کب یہ واقعات پیش آئے، تاریخی آثار اور کتابوں سے ان کے متعلق کس قسم کے معلومات فراہم ہو سکتے ہیں یا ہو چکے ہیں۔ یہ بالکل ایک جداگانہ بحث ہو، جیسا کہ میں نے عرض کیا، جس غرض سے قرآن اتارا گیا ہے اس کے لحاظ سے بحث و تحقیق کے اس جھگڑے میں پڑنا غیر ضروری ہے، یوں علمی نقطۂ نظر سے جیسے دوسرے تاریخی واقعات کی سراغ رسانی علم کی خدمت ہے، [اسی طرح قرآنی قصص سے متعلق] اس خدمت کو بھی کوئی انجام دے تو علمی حلقوں میں یہ خدمت بھی یقیناً قدر و قیمت کی مستحق ہو گی۔ لیکن جس نتیجے تک پہونچانے کے لیے قرآن کی روشنی عام کی گئی ہو اس کے لیے تو صرف قرآن ہی کافی ہے۔

۲

جو براہ راست عربی زبان میں قرآن سے استفادہ نہیں کر سکتے، ان کے سمجھانے کا مرحلہ کافی دشوار ہے پہلے قرآنی الفاظ نقل کروں، پھر ان کا ترجمہ کروں، مطلب بیان کروں، اس کے بعد بتاؤں کہ دجالی فتنے کی سمیت کے ازالہ میں سورۂ کہف کے اس جزء سے مدد لینے کی کیا شکل ہے، دماغ میں مختلف تجویزیں آئیں مگر دل کسی پر جما نہیں حق تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کر کے میں کچھ کہنا شروع کرتا ہوں، آپ پڑھتے جائیے، دیکھئے اسی راہ سے فائدے کی صورت کھلا چاہے گا تو نکل آئے گی۔

موجودہ دجالی فتنہ کا پہلا سبق

سب سے پہلی بنیادی بات دجالی فتنے سے ماؤف فطرتوں کی آپ جانتے ہیں کیا ہے؟ باور کرایا جاتا ہو کہ جس میں کچھ نہ تھا، یقین کرو کہ سب کچھ اسی سے ملا ہو۔ سب کچھ تا اینکہ زندگی بھی اسی سے ملی ہے جس میں زندگی نہ تھی، علم اسی سے ملا ہے جس میں علم نہ تھا، الغرض جس میں بینائی نہ تھی اس سے بینائی، جس میں شنوائی نہ تھی اس سے شنوائی، جس میں ارادہ نہ تھا اس سے ارادہ، جس میں اختیار نہ تھا اقتدار نہ تھا، اسی سے اختیار واقتدار سب کچھ ——— یہی بنیادی احساس ہے جسے ہر اس دل اور دماغ میں آپ آج پائیں گے، جس پر دجالی فتنے کی عفریتی پرچھائیاں پڑ چکی ہیں۔ ان کے تاریک سائے میں آنے کے ساتھ ہی، پانے والے کچھ اسی قسم کا احساس اپنے اندر پاتے ہیں۔

نظریۂ ارتقاء

صرف ایک لفظ "ارتقار" جادو کا کوئی چمچہ ہے جس میں بھر بھر کر وہ سب کچھ پلا دیا جاتا ہے جسے انسان کی فطرت کسی طرح پینے پر آمادہ نہیں ہو سکتی تھی، ہستی ہی سے ہستی کی پیدائش کا سلسلہ جس کے سامنے جاری ہو "کچھ نہیں" سے "کچھ" بھی پیدا ہو سکتا ہے، جو اس کے تصور سے بھی عاجز ہے، اسی غریب انسان کو ہضم کرا دیا جاتا ہے کہ کمالات و صفات کا یہ بحر بے کراں جو کائنات کے نباتی، حیوانی، انسانی طبقات میں ٹھاٹھیں مار رہا ہے، ابتداءً یہ سب کچھ نیست و نابود تھا، پھر وہی کمالات وصفات جو "نیست و نابود" تھے، ارتقائی عمل کی راہ سے ہست و بود کے قالب میں جلوہ گر ہوتے چلے گئے اور چلے جا رہے ہیں۔ گویا جو نہ تھے وہ ہو گئے اور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہی منوایا بھی جاتا ہے اور ماننے والے اسی کو مان بھی رہے ہیں۔ جس خیال کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے اسی کے نگلوا دینے میں کامیابی کیسے ہو گئی؟ خصوصاً اس دعوے کے ساتھ کہ عقل و مشاہدے کے سوا دلیل و حجت کی حیثیت سے کوئی تیسری چیز پیش نہیں ہو سکتی۔ اسی عقل و مشاہدے کے برخلاف یہ کیسے مان لیا گیا کہ جس مادے میں کچھ نہ تھا اسی سے سب کچھ نکل آیا۔ حالانکہ نہ باور کرنے والوں کے سامنے کی یہ بات ہو اور نہ باور کرانے والوں کے سامنے کی۔ دنیا جب پیدا ہو رہی تھی اُس وقت نہ یہ موجود تھے نہ وہ۔ مگر جو دعویٰ کرتے ہیں کہ جانے بغیر ہم کسی چیز کو مان نہیں سکتے، وہی ایک ایسے بنیادی مسئلہ میں جانے بغیر ماننے پر خود بھی تیار ہو گئے اور دوسروں کو بھی تیار کرنے کی کوششوں میں منہمک ہیں۔

بہرحال جس میں کچھ نہ تھا اسی سے یہ سب کچھ کیسے نکل آیا، صفر سے عدد کیسے پیدا ہوا۔ نابود نے بود کا، نیستی نے ہستی کا لباس کیسے اختیار کر لیا؟ ان قصوں کو تو جانے دیجئے، زیادہ تفصیل مطلوب ہو تو میری کتاب "الدین القیم" کا مطالعہ کیجئے۔ یہاں میں ایک دوسرے نفسیاتی مسئلے کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں[1]۔

---

[1] اگلے پیراگراف میں اسی "نفسیاتی مسئلہ" کی تشریح ہے، جو ہمارے خیال میں عام ناظرین کے فہم کے لحاظ سے کچھ مشکل ہے۔ مولانا کا

(باقی اگلے صفحہ پر)

عہد حاضر کے انسان کی نفسیاتی بے چینی اور سورۂ کہف کا پہلا جز

"جس میں کچھ نہ تھا اسی سے سب کچھ نکل آیا" جس کی فکری تعمیر اس بنیاد پر قائم ہوگی مادے کی کیچڑ سے اُبل کر باہر آنے والے[1] اس شخص کے احساسات کیا ہوں گے؟

کائنات کے اس بحرِ مواج کی ہر موج میں اَحد کام نہنگ کے پھیلے ہوئے حلقوں کو توڑتے پھوڑتے ہوئے [وہ] سمجھتا ہے کہ موجودہ زندگی کے پانے میں وہ کامیاب ہوا ہو۔ کس زندگی کے پانے میں؟ جو خود مستقل "قیدِ غم" ہے اور "غم کی اس قید" پر بھی مسلسل حوادث و آفات کے ہتھوڑے پڑتے چلے جاتے ہیں، تا اینکہ بالآخر غم ہی کی شکل میں جو زندگی ملی تھی، جب تک ساتھ رہی سوزش بن کر ساتھ رہی، جس دن سوزش اس کی ختم ہوئی زندگی بھی ختم ہو گئی۔ الغرض ایک بے سہارے تنکے کی طرح ہستی کے سمندر میں "کچھ نہیں سے نکل کر" سب کچھ بن جانے والا یہ انسان تیرتا رہتا ہے۔ جس کا کوئی محافظ کوئی نگراں نہیں، جس کی سعی کا کوئی حاصل، اور جس کے وجود یا زندگی کا کوئی انجام نہیں۔

"دجالیت" کے اس عہد میں ساری بے قراریاں، جن میں آدمی کا دل تہ و بالا ہوتا رہتا ہے، سچ پوچھیے تو ان کی ضمانت درحقیقت بے کسی کے اسی احساس میں پوشیدہ ہے، جو زندگی کی اس ارتقائی توجیہ کا لازمی نتیجہ ہے۔

اب ایک طرف دجالی ذہنیت کے اس قدرتی نتیجے اور لازمی احساس کو رکھیے اور سورۂ کہف کی پہلی سطر کے پہلے جزء "الحمد للہ" پر ٹھہر جائیے۔ میں آپ سے بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ آگے پڑھیے یا نہ پڑھیے، صرف

بقیہ حاشیہ صد ۱۰۲

مطلب یہ ہو کہ اس عہد کے انسان میں بے کسی کا جو ایک عام احساس پایا جاتا ہے جس کی بدولت پوری زندگی بے قراری اور بے اطمینانی کی تصویر بنی ہوئی ہو وہ درحقیقت نتیجہ ہو اس نظریۂ ارتقار کا۔ کیونکہ ایک طرف تو یہ حقیقت ہو کہ زندگی ایک مستقل "قیدِ غم" ہو، اور قید بھی پرسکون نہیں! بلکہ مسلسل حوادث و آفات کا بھی اس میں سامنا ہو۔ اور دوسری طرف اس نظریہ (ارتقاءِ حیات) کی رو سے انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ بغیر کسی خالق و پروردگار کے حیات کے مختلف مراحل سے گزرتا اور کشمکش کرتا ہوا اس مرحلہ تک پہونچا ہے۔ پس قدرتی طور پر اس کا یہ احساس ہونا چاہیے کہ اس قیدِ غم اور بحرِ الم میں وہ اکیلا اور بے سہارا ہو نہ اس کا کوئی نگراں ہو نہ محافظ۔ اور پھر اس احساس سے لازمی طور پر وہی اندرونی بے اطمینانی اور بے قراری ہونی چاہیے جس میں اس عہد کا انسان مبتلا ہے ———— اب پڑھیے مولانا کی عبارت! — مرتب

[1] نظریۂ ارتقار کی رو سے کائنات کے اندر زندگی کے اولین آثار اس کیچڑ میں نمودار ہوئے تھے جو سطحِ ارض پر سمندروں کے وجود میں آجانے کے بعد ان کے کناروں پر پیدا ہو گئی تھی، اس کیچڑ میں نمودار ہونے والے زندگی کے ابتدائی آثار کہا جاتا ہے کہ ترقی کرتے کرتے انسانی قالب میں جلوہ گر ہو گئے۔ — مرتب

"الحمدللہ" سے علم کی جو روشنی پیدا ہوتی ہے، وہ تاریکی کے ان مہیب بادلوں کو چھانٹنے کے لیے کافی ہے۔

الحمدللہ کا مطلب

"سمجھا آپ نے "الحمدللہ" کا کیا مطلب؟ کھولا گیا ہے [یعنی "الحمدللہ" فرما کر انکشاف کیا گیا ہے] کہ ہر وہ کمال یا صفت جو تعریف و توصیف کی مستحق نظر آتی ہے یہ "اللہ" یعنی اس ذات کے ساتھ مختص ہے جس کی کارفرمائیوں کی یہ کائنات جلوہ گاہ ہو، جس کا حاصل یہی تو ہوا کہ جس میں کچھ نہ تھا اس سے نہیں! بلکہ جس میں سب کچھ ہو اسی سے ملا ہے جس کسی کو جو کچھ بھی ملا ہے! جس کا سب کچھ ہے اور جس میں سب کچھ ہے، حیات ہو، علم ہو، قدرت ہو، ارادہ ہو، رحم ہو، رأفت ہو، جو اس سے پیدا ہوا ہو، خیال تو کیجئے کہ ان مادیوں اور دوسری محرومیوں سے اس کو کیا واسطہ؟

نزول کے بعد ارتقاء

جس کے پاس سب کچھ ہے وہ اگر دستگیری کے لیے ان کی طرف ہاتھ بڑھائے جن کے پاس کچھ نہیں ہو۔ اور یوں وہ بے یاروں کی یاوری، غمخواروں کی غمخواری، ناداروں کی دارائی کرے اور ان کی خالی جھولیوں کو بھر سے بھر دے، بھرتا چلا جائے تو سوال یہ ہو کہ (پستی سے نکال کر بلندی کی طرف چڑھانے کے لیے) کچھ نہ رکھنے والوں کی طرف سب کچھ رکھنے والی ہستی کی اپنے مقام رفیع سے یہ نزولی توجہ کیا کسی حیثیت سے کوئی ایسی بات ہو سکتی ہے جس کے تسلیم کرنے میں انسانی فطرت اپنے اندر کسی قسم کی ہچکچاہٹ یا جھنجھلاہٹ محسوس کرے؟۔

الحمد للہ (یعنی تمام قابل تعریف خوبیوں اور زیبائیوں کے سرچشمہ اور اسی کامل وجود) کو بنیاد بنا کر نزول کے بعد ارتقاء کا یہی وہ قرآنی نظریہ ہو جسے سورۂ الکہف کی پہلی سطر میں الحمد للہ کے بعد ان الفاظ میں ہم پاتے ہیں۔[1] فرمایا گیا ہو:۔

اَلَّذِیٓ اَنْزَلَ الْکِتَابَ عَلٰی عَبْدِہٖ جس نے اتاری کتاب، اپنے بندے پر۔

• ان الفاظ سے یہی علم تو بخشا گیا ہو کہ عبد یا بندہ جس کے پاس اپنا کچھ نہیں ہوتا، اس پر، الحمد والے اللہ نے (یعنی جس کے پاس سب کچھ ہو)، اپنی کتاب اتاری، اور یوں جو نیچے تھے ان کو اونچا کرنے کی راہ اس نے کھولی۔

قرآن کے ارتقائی نظریہ کا مقابلہ موجودہ ارتقائی دعوے سے

نزول اور اتار کے بعد ارتقاء اور چڑھاؤ کے اس فطری اور طبعی طریقے کا مقابلہ عہد دجالیت کے اس ارتقائی وسوسہ سے کیجئے جس میں "کچھ نہیں" سے باور کرایا جاتا ہو کہ "سب کچھ" نکل آیا ہے۔ سمجھایا جاتا ہے کہ مادہ جس میں کچھ نہ تھا، نہ زندگی تھی، نہ علم، نہ ارادہ، وہی ان کمالات

---

[1] یعنی الحمدللہ کے ذریعہ جو حقیقت منکشف فرمائی گئی ہو، اسی کو بنیاد بنا کر، اگلے الفاظ میں نزول کے بعد ارتقاء کا یہی قرآنی نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ مرتب

وصفات کی تلاش میں اُٹھ کھڑا ہوا، جو اس کے لیے نامعلوم اور مجہول ہی نہیں تھے، بلکہ بذاتِ خود معدوم قطعاً معدوم تھے، جاہل طالب اور مجہول بلکہ مطلق معدوم مطلوب، یہ عجیب و غریب اور تماشائی لطیفہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ کتنی پیچ در پیچ الجھنوں میں گتھا ہوا ہو، جس میں کچھ نہ تھا اس میں ان مجہول و معدوم کمالات وصفات کی طلب کیسے پیدا ہوئی، اس طلب کے بعد اپنی انتخابی قوت سے کام لے کر ناقص صفات کو چھوڑتے ہوئے، کامل صفات کو چنتے ہوئے وہ آگے آخر کس بل بوتے پر بڑھ رہا ہے، اور اسی بے جان، بے عقل و تمیز طالب کو یہ معدوم مطلق معدوم صفات آخر کیسے مل گئے، کہاں سے مل گئے، جن سے آج مادّے کا وجود آراستہ و پیراستہ نظر آرہا ہے۔

ٹیڑھی راہ اور کجرو طبائع یہ کتنی ٹیڑھی کبڑی پیچ و خم والی راہ ہے جس پر "کچھ نہیں سے سب کچھ نکل آنے" کے فلسفہ یا دسوسہ نے ان کو ڈال دیا جس معمہ کو اس توجیہ سے آج حل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، وہ تفہیم کے اس طریقہ سے، انصاف شرط ہے، سلجھتا ہے، یا اس کی الجھنیں اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں؟ اس کا اندازہ وہی کرسکتے ہیں جن کی فطرت ابھی سلامتی کے نقطۂ نظر سے زیادہ دور نہیں ہوئی ہو۔ ورنہ توڑی اور مڑوڑی طبیعتوں میں یہی الٹی باتیں "سیدھی" بن بن کر اُترتی چلی جارہی ہیں [اور اسی بناپر] وہ سمجھتے ہیں کہ عہدِ جاہلیت کی یہ باتیں سیدھی ہیں۔ لیکن سرشتِ بشری کے سب سے بڑے نبّاض عارف رومی کا فیصلہ تو یہ ہے کہ: ؎

چوں فسونِ دیو در دلہائے کج
می رود چوں کفش کج در پائے کج

[پس] ٹیڑھے پاؤں میں ٹیڑھا جوتا اگر فٹ ہوجائے تو آپ ہی بتائیے اس کے سوا اور ہوتا کیا؟

الکتاب کی پہلی خصوصیت بہرحال میں تو سمجھتا ہوں کہ سورۂ کہف کے مذکورۂ بالا الفاظ میں الحمدللہ پر بنیاد قائم کرکے نزول کے بعد ارتقاء کی جو راہ پیش کی گئی ہو اس پر چلانے والی "الکتاب" یا قدرتی دستور العمل اور ہدایت نامے کی پہلی خصوصیت:۔

"وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا" اور نہ رکھی (کتاب کے اتارنے والے اللہ نے)
اس میں کسی قسم کی کوئی کجی

جو بیان کی گئی ہے اس کا مطلب جیسا کہ میں سمجھتا ہوں یہی ہے کہ عوج یعنی پیچ و خم، کجی اور ٹیڑھ سے اس کتاب کا کوئی رشتہ نہیں ہو۔ وہ خود سیدھی ہے، سیدھی بات بتاتی ہو، سیدھی راہ پر لے چلتی ہے۔

اس کی اسی خصوصیت نے اس کو موجودہ دماغوں کے لیے ناقابل قبول بنادیا ہے فکر و نظر کی مصنوعی ورزشوں اور سوفسطائیت کے مغالطی کرتبوں سے جن کے دل، جن کے دماغ الٹے پلٹے دسلے وسلے نہیں گئے ہیں۔ تجربہ کرکے دیکھ لیجئے۔ ان کے اندر یہ کتاب اتر جائے گی، اُترتی چلی جائے گی، ان کو ایسا معلوم ہوگا کہ وہ اس کتاب کے لیے پیدا

کیے گئے ہیں اور یہ کتاب ان کے لیے پیدا کی گئی ہو، مگر دجالی فتنوں کی آنچ سے پگھلائی ہوئی ٹیڑھی ترچھی ذہنیتوں اور "عصری تقاضوں" کے مطابق ڈھالے ہوئے کج دماغوں، پھرے ہوئے سروں سے یہ کتاب اُچٹ جاتی ہے، نہ وہ اس کے وزن کو محسوس کر سکتے ہیں، اور نہ یہ کتاب اپنے واقعی وزن کو انھیں محسوس کرا سکتی ہے۔

موجودہ دماغوں کی ساخت ان کے لیے بھینس کے انڈے اور انڈے سے روغن گل، روغن گل سے ساری دواؤں کا نکلنا اور نکالنا آسان ہے[۱]، جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا، صفر سے عدد کی پیدائش کا تو وہ تصور کر سکتے ہیں، بلکہ اسی کو واقعہ ٹھہرا رہے ہیں، مگر جس تھیلی میں سو روپے ہوں اُن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے دس یا بیس روپے کیسے نکلے[۲]؟

کانٹوں کی سیج پر نیند کا منظر خود جن مسئلوں میں الجھنوں کے کانٹوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے، انھیں کانٹوں کی سیج پر انھیں نیند آگئی ہو اور یقین کیے بیٹھے ہیں کہ زندگی کے سارے اساسی سوالوں کی گرہیں الجھنوں کے ان ہی کانٹوں کی نوک سے کھل چکی ہیں اور آئندہ بھی کھلتی چلی جائیں گی، اور یہ سب اسی لیے ہو رہا ہو کہ پاؤں کو ٹیڑھا بنا لینے کے بعد ان کو نظر آ رہا ہے کہ ٹیڑھا جوتا ان کے لیے سیدھا بن گیا ہو۔

دوسری خصوصیت مگر ان کی ذہنیت و فکر کی یہ مصنوعی کجی، جو ہر ٹیڑھی بات کو آج سیدھی پا رہی ہو، اور سیدھی باتیں ان کو ٹیڑھی نظر آ رہی ہیں، یہ ایک مرض ہو جو باہر سے ان کے اندر آیا ہے، شاید اسی کو بتانے کے لیے اور اسی خارجی سمیت کو نکالنے کے لیے دوسری خصوصیت اس "الکتاب" اور زندگی کے قدرتی دستور العمل کی ایک اور صرف ایک لفظ "قیما" سے ظاہر کی گئی ہو، دیکھنے میں ہے تو بظاہر یہ ایک لفظ جس کا حاصل یا ترجمہ جیسا کہ فقیر کا خیال ہو اور مفسرین کی کافی تعداد اس خیال کی مؤید ہے، یہ ہو کہ لازوال، غیر فانی، اَبٹ اٹل حقائق اور اصول پر یہ کتاب مشتمل ہے، قیام و بقاء کی شدت اور حد سے زیادہ استحکام و استواری پر "قیم" کا یہ لفظ دلالت کرتا ہے جس کے سوا کچھ نہ رہے گا، جو ایسا برقرار باقی رہنے والا ہے، اور ہر چیز جو کچھ بھی اس کے سوا ہو سب کے قیام و بقا کی ضمانت جس کی قدوس پاک ذات کے ساتھ وابستہ ہے، اس کو "القیوم" بھی اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ خود قائم و برقرار ٹھہرا ہوا ہو، اور سب کو وہی، اس کا ارادہ قائم و برقرار رکھے ہوئے، ٹھہرائے ہوئے اور تھامے ہوئے ہو، خیر یہ تو "قیم" کے

---

[۱] آخر جس مادے میں کچھ نہ تھا، جب یہ مانا جاتا ہو کہ اس سے سب کچھ نکل آیا تو اس میں اور بھینس کے مذکورۂ بالا مشہور لطیفہ میں کیا فرق ہے؟

[۲] الحمد للہ کو خشت اول قرار دے کر قرآن کائنات کی تعبیر کی جو توجیہ پیش کر رہا ہے وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ لامحدود کمالات والے خدا نے اپنے کمالات کو محدود پیمانوں پر نمایاں کیا ہے۔

اس قرآنی لفظ کی گویا لفظی تحقیق تھی، اب غور کیجئے اس لفظ کی معنویت کے اس پہلو پر جس کی وجہ سے اس خاص مقام پر وہ داخل اور شریک کیا گیا ہے۔

لفظ "قیم" کی معنویت جیسا کہ میں نے عرض کیا، طبائع میں کجی اور ٹیڑھ پن پیدا کرنے کے بعد ٹیڑھی باتوں کے آثار دینے میں کامیاب ہو جانا، اس میں شک نہیں کہ تجربہ کی اور سامنے کی بات ہو۔ کامیابی حاصل کرنے والے آج اسی راہ سے کامیابی حاصل کر رہے ہیں، مگر اسی کے ساتھ دوسری بات بھی جس کی طرف میرے خیال میں "قیم" کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہو، یہ بھی تو دور کی نہیں بلکہ قریب کی ایسی بات ہو جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، آخر ہم ہوں یا آپ کیا یہ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ وہ سارے اعوجاجی خرافات اور دجالی نظریات جن کا چرچا دنیا میں آج پھیلا ہوا ہو۔ تعمیر کے ساتھ ہی خرابی کی صورتیں بھی کتنی سرعت کے ساتھ اس میں مضمر ہوتی چلی جاتی ہیں، مشرق میں کسی پرانے از کار رفتہ مسئلہ کو دقیانوس کی طرف منسوب کر کے کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ تو دقیانوسی خیال ہے، دقیانوس بے چارا خدا ہی جانتا ہو کہ کتنے ہزار سال پہلے دنیا کا بادشاہ ہوا تھا، مگر آج عصری نظریات کی دقیانوسیت کے لیے کون نہیں جانتا کہ غریب ملکہ وکٹوریہ کے عہد کی طرف منسوب کر کے کہہ دیا جاتا ہو کہ یہ تو "وکٹورین ایج" یعنی عہد وکٹوریہ کی بات ہو، حالانکہ ولادت کے نہ سہی، مگر اس ملکہ کی موت کے زمانے کے پانے والوں کی تعداد کروڑہا کروڑ کی تعداد میں ابھی زندہ ہو۔ "قیم" کے برعکس بے ثباتی کی اس خصوصیت کے لیے اس سے زیادہ عصری شہادت اور کیا ہو سکتی ہو۔ ع "مردہ زاید از بطون الامہات" یہی دجالی عہد کے نظریات کا سب سے بڑا طغرائے امتیاز ہے، کلیات تو کلیات جن کی بنیاد صرف تخمینی ٹٹول، یا ان تیروں پر عموماً قائم ہے، جنہیں چلانے والے اندھیرے میں چلاتے رہتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ایسے دیکھے بھالے جزئیات، مثلاً آدمی کے لباس کا مسئلہ کہ سوچ سمجھ کر آرام و آسائش زیب و زیبائش کے عام پہلوؤں کا لحاظ کر کے اس کی وضع و قطع متعین کی جاتی ہے، مگر سنتے ہیں کہ بسا اوقات بازار سے گون یا ٹوپی، یا اسی قسم کی کوئی چیز خریدنے والوں کو دیکھا گیا ہے کہ گھر کی طرف بھاگے یا بھاگی چلے یا چلی جا رہی ہو، تاکہ جہاں تک جلد ممکن ہو اس کو استعمال کر لیں، ورنہ گھر پہونچنے تک ممکن ہو کہ اس خاص لباس کا فیشن اور چلن نہ رہے۔

دھوپ چھاؤں کا فلسفہ جن سیمابی بے قراریوں پر "تمدن جدید" اور "دانش نو" کی بنیاد قائم ہو اس کی یہ کتنی دلچسپ مثال ہو۔ ممکن ہے کہ یہ لطیفہ ہو، مگر زود فربہی اور زود لاغری کی اس خصوصیت کے اظہار کی یہ بہت اچھی تمثیل ہے، بعض کارٹونی تصویروں میں اسی لطیفہ کو مصور کر کے دکھایا گیا ہے، میں نے اس کو دیکھ کر کہا کہ عہد دجالیت کے صرف لباسی جزئیات ہی کا یہ حال نہیں ہو، بلکہ دجالیت کا سارا فلسفہ، سارا تمدن، دھوپ چھاؤں کا فلسفہ اور دھوپ چھاؤں کا تمدن ہے، اس کے نیچے پناہ ڈھونڈھنے والوں کو نہ دھوپ ہی سے استفادہ کا

موقع میسر آسکتا ہے اگر وہ دھوپ کھانا چاہتے ہوں، اور نہ چھاؤں کے سایہ میں آرام ہی کی امید لگانی چاہیے اگر اس سایہ کے نیچے کوئی آرام لینا چاہتا ہو۔

ارتقاء کا مطلب

"قیم" کے مقابلہ میں "غیر قیم" ہونا، اس فلسفہ یا تمدن کی یہی خصوصیت اس پیچ و خم یا ٹیڑھ اور کجی کے راز کی غمازی کر رہی ہے جو "دجالی" یا "ارتقائی تمدن" کی ہر شاخ اور ہر شعبہ کی رگوں اور ریشوں میں رواں دواں ہو۔ "ارتقار" نام ہی اس کا ہو کہ ہر آنے والے دن میں گذرے ہوئے کل کی مسلمہ مانی ہوئی بات غلط ثابت ہو جائے، کل تک جمہوریت کا نظام انسانیت کے ارتقار کا آخری نقطۂ عروج تھا، لیکن آج سرمایہ داری کے رسوا کن طوق کو گلے میں ٹانگے ہوئے، گلی کوچوں کے بچوں کی تالیوں کا وہ نشانہ بنا ہوا ہو۔ اور اب انسانیت کا "فردوس گم گشتہ" باور کرایا جا رہا ہو کہ اشتراکی نظام میں مل جائے گا۔ ....

خیر میں کیا کہنے لگا، عرض کر رہا تھا کہ "قیم" کا یہ لفظ جس سے بندے پر نازل ہونے والی "الکتاب" کے مشتملات و تعلیمات کی خصوصیت ظاہر کی گئی ہو، [اس کی رو سے یہ کتاب] لازوال، غیر فانی حقائق کا وہ مجموعہ ہو، تاریخ کے نامعلوم عہدے جس پر انسانیت کی تعمیر و ترقی کی بنیاد قائم کرنے کی دعوت دی گئی ہو۔ نوحؑ نے بھی ان ہی کی طرف بلایا اور ابراہیمؑ نے بھی، موسیٰؑ نے بھی اور عیسیٰؑ نے بھی، سارے "النبیون" اور اللہ کے رسولوں نے ہر عہد اور ہر زمانہ میں، ہر بستی کے رہنے والوں کو ان ہی کی طرف پکارا، جس کے پاس کچھ نہیں ہو، مگر سب کچھ کے پانے اور حاصل کرنے کی فطری آرزو اپنے اندر وہ رکھتا ہے، چاہیے کہ وہ آگے بڑھے اور جس کے پاس سب کچھ ہو اسے جو کچھ پانا چاہتا ہے پاتا چلا جائے، پہلوں کو جو "الکتاب" دی گئی اس میں بھی یہی تھا اور اسی الکتاب کی آخری شکل میں بھی، اسی کا صلائے عام دیا گیا ہو۔

الکتاب کی مذکورہ خصوصیات اور موجودہ دجالی ادبیات

بہر حال "لَمْ يَجْعَل لَّهُ عِوَجًا" نہ رکھی اس میں کسی قسم کی کجی، کی سلبی یا منفی خصوصیت اور اسی کے ساتھ "قَيِّمًا" (لازوال، غیر فانی، اٹل اور اٹل) ہونے کی ایجابی و مثبت خصوصیت، قانونِ نزول کے تحت ناقصوں کو ساحلِ کمال تک پہونچانے کے لیے وجود کامل یا الحمد والے اللہ کی طرف سے "الکتاب" یعنی زندگی کا جو دستور العمل دیا گیا ہو اسی دستور العمل کی مذکورۂ بالا دونوں منفی و مثبت یا سلبی و ایجابی ایسی دو خصوصیتیں ہیں کہ ان کی روشنی میں "دجالی ادبیات" کی تاریکیاں خود بخود نمایاں ہو جاتی ہیں۔

دجالی نقطۂ نظر کے پیچ و خم

آپ جائزہ لیتے چلے جائیے، واضح ہوتا چلا جائے گا کہ ہر سیدھی سادی بات تک عہد دجل میں پیچیدہ ترین راہوں سے پہونچنے اور پہونچانے کی کوشش کی جاتی ہے، دل کا سکون، قلب کی

راحت، جو مٹی کے لوٹے میں بھرے ہوئے پانی سے وضو کر لیجئے اور وضو کے بعد کسی کے قدموں پر سر ڈال دینے سے جس وقت چاہیے حاصل ہو سکتی ہے (مگر غم غلط کرنے لگے)، اسی مقصد کے لیے دیکھئے کروڑہا روپے کی سنیمائی تصویریں تیار ہو رہی ہیں۔ اربوں کی لاگت سے ملک کے طول و عرض میں "تماشا گھروں" کا جال بچھا دیا گیا ہو، اور ملک نہیں ایک ایک شہر بلکہ اب تو قصبات تک کے باشندوں کی کمائی کا معقول حصہ روزانہ غم غلط کرنے کے اسی قصے میں بھسم ہو رہا ہے۔ اور پھر بھی جو خنکی وضو کے مفت پانی اور بغیر کسی ٹکٹ کے لاہوتی دربار کی باریابی سے دلوں کو میسر آ رہی ہو، تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ خنکی اور ٹھنڈک کی اس کیفیت کو اس ساحرِ جال جنجال سے حاصل کرنے میں آپ قطعاً کامیاب نہیں ہو سکتے۔

امن و امان کے ساتھ زندگی گذارنے کے لیے اخلاقی تصحیح کی ضرورت کا احساس آج بھی کیا جا رہا ہو جیسے پہلے کیا جاتا تھا، لیکن اسی غرض کو حاصل کرنے کے لیے پیچ و خم کی کتنی ٹیڑھی ترچھی راہ اختیار کی گئی ہو، آئندہ دنیا میں جو نسلیں پیدا ہونے والی ہیں، پیدا ہونے سے پیشتر ان کو [بلکہ] ان کے خیال (صرف خیال) کو دماغوں میں ابھار ابھار کر دھمکیاں دی جا رہی ہیں، کہ موجودہ نسلوں کو اپنی اخلاقی غلطیوں کا جواب ان ہی آئندہ پیدا ہونے والی نسلوں کو دینا پڑے گا۔ (اس وقت دینا پڑے گا جب جواب دینے والے دنیا سے ناپید ہو جائیں گے) کبھی تاریخ کے فن کو پیشہ بنانے والے یعنی مورخین سے ڈرایا جاتا ہے، کہ جب وہ کتابیں لکھیں گے، یا مدرسوں میں سبق پڑھائیں گے تو تمہارا ذکر اچھے لفظوں میں نہیں کریں گے، کیسی عجیب بات ہے، امید باندھی جاتی ہے کہ اخلاقی بدکاروں کو ان دھمکیوں کے دباؤ سے دبا لیا جائے گا۔ کامیابی کی یہ راہ ان کو سیدھی راہ نظر آئی، اور پیدا ہونے والوں کو اپنے پیدا کرنے والے خالق کے سامنے کھڑا کر کے جواب دہی کی ذمہ داری ان میں جو ابھاری جاتی تھی، یہی راہ ان کو ٹیڑھی دکھائی دے رہی ہو، وہم اور صرف وہم سے زیادہ جو اور کچھ نہیں ہو، باور کرایا جا رہا ہو کہ وہی واقعہ ہو، اور واقعہ ہی کو وہم ٹھہرایا جا رہا ہو، بغیر کسی معاوضے کے جس نے وجود بخشا، وجود کے کمالات بخشے، اسی بخشنے والے ارحم الراحمین، "علیٰ کل شیءٍ قدیر" کی رحمتوں اور دستگیریوں پر بھروسہ کرنے والے وہم کے شکار ٹھہرائے گئے، مگر وہم کے ان ہی الزام لگانے والوں کی زبانوں سے جب یہ یا اسی قسم کے فقرات نکلتے ہیں کہ "میں تو فطرتاً رجائی پیدا ہوا ہوں" "پُر امید رہنا اور مستقبل سے مایوس نہ ہونا، یہی ہماری جبلت ہو"۔ [وغیرہ] پوچھا جاتا ہے کہ اس رجا اور امید کی بنیاد کیا ہے، تو پھر ان کی احوجاجی لذہنیوں اور الجھی ہوئی توجیہوں کی گتھیاں اتنی دلچسپ ہوتی ہیں کہ سننے والا مشکل ہی سے اپنی ہنسی کو روک سکتا ہو۔

اور میں کہاں تک گناؤں، مجھے تو دجالی زندگی کے ہر پہلو میں "پیچاپیچ" اور گرہ در گرہ کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آتا، عدالت ہو یا انصاف، علاج ہو یا معالجہ، تعلیم ہو یا تعلّم یا اسی قبیل کی کوئی اور چیز، پہلی نظر

میں اس کی سب سے بڑی خصوصیت وہی "عوج" "وہی پیچاپیچ" "کا گورکھ دھندا سامنے آجاتا ہے۔[1]

فلسفۂ ارتقاء اور مستقبل کی بے یقینی

اور یہ تو عرض بھی کر چکا ہوں کہ "قانون ارتقاء" کو بنیاد بنا کر زندگی کا جو دستور العمل بھی مرتب کیا جائے گا اس کا مطلب بھی یہ ہوگا کہ آج جو کچھ مان لیا گیا ہے کہ وہی سچ اور صرف سچ ہے، کل تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہی جھوٹ اور صرف جھوٹ تھا، ورنہ جو کچھ آج مانا جا رہا ہے اگر کل بھی وہی مانا گیا تو ارتقاء کا یہ لفظ ہی بے معنی اور بے جان ہو کر رہ جاتا ہے، گویا ارتقائی اصول پر ساحلِ مراد تک پہونچانے کے لیے انسانیت کے آگے نجات کی جو "کشتی" پیش کی جاتی ہے اس کی پیشانی پر یہ لکھا ہوتا ہے کہ ساحل تک پہونچانے کا سوار ہونے والوں کو یقین نہیں دلایا جا سکتا، بلکہ ممکن ہو کہ منجدھار میں پہونچ کر وہی چیز جس کا نام آج نجات کی کشتی ہو، ممکن ہے کہ کل وہی "گرداب بلا" اور "لقمۂ موت" کی شکل اختیار کر لے۔

کامیاب مستقبل کی ضمانت

اور اسی کے مقابلہ میں دوسرا "جہاز" بھی کھڑا ہوا ہے جس میں ضمانت کی جاتی ہے کہ سیدھی راہ سے لے جاتے والوں کو لے جائے گا، اور قطعی طور پر ہر ایک کو ڈگمگائے بغیر، ساحل تک پہونچا

---

[1] اس موقع پر ایک دلچسپ مثال کا خیال آ رہا ہے، حاشا وکلا کسی کی دل شکنی مقصود نہیں ہے بلکہ جو سمجھانا چاہتا ہوں اسکی صرف توضیحی مثال کی حیثیت سے اس واقعہ کا ذکر کر رہا ہوں، سر سید مرحوم نے جب علی گڑھ کالج قائم کیا تو انھوں نے اعلان فرمایا کہ

"ہم اس دن خوش ہوں گے جب کہ ہماری قوم نہ خدا کے واسطے نہ اپنے ثواب کے لیے بلکہ اپنی قوم کے لیے کوشش کرے گی، اور کہے گی کہ میں اپنے ہاتھ اپنے پاؤں، اپنی جان، اپنی محنت سے، اپنے روپے کے بدلے نہ خدا کو خریدنا چاہتا ہوں، اور نہ بہشت کو، بلکہ اپنی قوم کو۔"

(تہذیب الاخلاق ص۵۷۵ و ص۵۰۰)

الغرض یہ سیدھی سادی راہ کہ بغیر کسی معاوضہ کے جھکے دینے کا تجربہ تم کر چکے ہو، اسی کی راہ میں دو، معاوضہ میں جتنا تم دو گے اس سے بہت زیادہ پاؤ گے۔ سید صاحب بیچارے نے اس کا انکار کیا، آمدنی مسلمانوں سے جتنی توقع تھی وصول نہ ہوئی تو ان ہی سید صاحب نے جو فرماتے تھے کہ "اللہ کے لیے، ثواب کے لیے، جنت کے لیے جو دے گا میں اس سے خوش نہ ہوں گا۔" ان کو دیکھا گیا کہ کالج کی آمدنی کی توفیر کے لیے جیسا کہ مولوی طفیل احمد صاحب نے "روشن مستقبل" میں لکھا ہو (سر سید نے) روپیہ حاصل کرنے کے لیے یورپ کے طریقے مثل لاٹری مینا بجمی وغیرہ کے اختیار کیے۔" اور اسی پر بس نہیں فرمایا "بلکہ ایک بار علی گڑھ کی سالانہ نمائش میں قومی تھیٹر کے نام سے ٹکٹ لگا کر ایک قومی ناچ ہوا" یعنی باضابطہ تماشے کا نظم کیا گیا اور خود سر سید اور ان کے شرکاء کار کا جس میں حصہ تھا، اور بڑی بڑی ڈاڑھیوں والے ان بزرگوں نے ایکٹروں کا فرض انجام دیا، مگر سیدھی راہ کو چھوڑ کر اس ٹیڑھی ترچھی راہ میں بھی جیسا کہ طفیل احمد صاحب نے لکھا ہے "ان تمام طریقوں میں کوئی حسب دلخواہ کامیابی نہ ہوئی۔" (ص۲۰۹ روشن مستقبل)

دیا جائے گا، اس ضمانت نامے پر تاریخ انسانی کے ہر دور کی برگزیدہ ترین ہستیوں کی تصدیقی مہریں ثبت ہیں، نوحؑ کی ابراہیمؑ کی، موسیٰؑ کی، عیسیٰؑ کی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم، الغرض سارے انبیاء اور بنی آدم کے سامنے رہ نماؤں کے دستخط روشن حروف میں اس ضمانت نامے پر جگمگا رہے ہیں۔ اب آپ کو اختیار ہو کہ ان دونوں سفینوں میں سے اپنی "نجات" کے لیے جس کا جی چاہے انتخاب فرمالیجئے۔

سورۂ کہف کی تلاوت اور دجالی فتنے سے حفاظت کا ربط

اب سمجھ میں آتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کی ان حدیثوں کا مطلب جن میں فرمایا گیا ہو کہ سورہ کہف کی ابتدائی آیتوں کے یاد رکھنے والے دجال کے فتنے سے محفوظ رہیں گے۔ حالانکہ ابھی آپکے سامنے کہف کے ابتدائی حصے کی پہلی سطر سے حاصل کیے ہوئے صرف ان ہی نتائج کو پیش کیا گیا ہو جن کے متعلق یہ امید کی جاتی ہو کہ خواص کے ساتھ عوام بھی اگر غور کریں گے تو مستفید ہو سکتے ہیں۔

اسی سطر کے بعض الفاظ سے کچھ اور بھی چیزیں سمجھ میں آ رہی ہیں، خصوصاً عبد کے لفظ کی اضافت بجائے ذاتی یا صفاتی اسم کے "ہ" کے ضمیر غائب کی طرف جو کی گئی ہو اپنے خاص مقام کے لحاظ سے یہ مسئلہ بھی خصوصی توجہ کا مستحق ہو۔ مگر اس کی تشریح میں غیر معمولی طوالت بھی ہوگی، اور عوام بے چاروں کی رسائی سے اندیشہ ہے کہ کہیں دور نہ ہو جائے۔ بس، الکہف کی پہلی سطر یا پہلی آیت کے متعلق جو کچھ بھی ادا کر دیا گیا۔ اسی پر قناعت کر کے آئیے اب آگے بڑھئے۔

دوسری آیت کا آغاز لِيُنذِرَ (تاکہ دھمکائے) کے لفظ سے دوسری آیت کا آغاز کیا گیا ہو، اور بجائے کنائے اور اشارے کے نسبتاً زیادہ واضح اور صاف لفظوں میں قرآن کا یہ بیان شروع ہوتا ہے۔

تین سوال جیسا کہ میں نے عرض کیا دھمکی سے اس بیان کی ابتدا کی گئی ہو، قدرتی طور پر تین سوال اس دھمکی کے متعلق پیدا ہو سکتے ہیں، یعنی

۱۔ کس چیز کی دھمکی دجالی فتنے سے تعلق رکھنے والی اس سورہ میں دی گئی ہے۔

۲۔ کیا یہ دھمکی عام ہے یا کسی خاص طبقہ اور خاص قسم کے صفات و احساسات رکھنے والوں کی طرف اس دھمکی کا رُخ ہو۔

۳۔ اگر عام نہیں بلکہ دھمکی کا رُخ کسی خاص طبقہ کی طرف ہو، اور یہی بیان بھی کیا گیا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہو کہ جن کی طرف دھمکی کا رُخ ہے اُن کے خصوصیات کیا ہیں، . . . .

. . . .

ان تینوں سوالوں کا جواب بعد کی آیتوں میں دیا گیا ہو۔ اب میں آپکے سامنے قرآنی الفاظ کی روشنی میں

ان ہی تینوں سوالوں کے جوابوں کو پیش کرتا ہوں۔

(۱)

کس چیز کی دھمکی دی گئی ہو؟ یہی پہلا سوال تھا، دجّالی فتنے کی جن خصوصیتوں کو بیان کر چکا ہوں، ذرا ان کو دماغ میں تازہ کر لیجئے، میں تو سمجھتا ہوں کہ آپ کو بھی حیرت ہوگی کہ تیرہ سو سال پیشتر سرزمین عرب کی بیابانی آبادی میں اس پیشین گوئی کا اعلان الہامی امداد کے بغیر کیسے ممکن تھا۔

کلیدی لفظ جس کے سمجھ لینے کے بعد واقعہ خود آپ کے سامنے آکر کھڑا ہو جائے گا وہ "باس" کا لفظ ہو یوں تو لغت میں مثلاً قاموس کے فارسی ترجمہ منتہی الارب میں "باس" کے لفظ کو لکھ کر حسب ذیل معانی درج کیے ہیں، یعنی "بیم و عذاب" و سختی و قوت در حرب و دلیری" مگر سارے معانی جو اس لفظ کے نیچے درج کیے جاتے ہیں، قدر مشترک ان کا، اگر نکالا جائے تو یہی ہو سکتا ہو کہ فطرت انسانی میں ناگواری جن حالات و واقعات سے پیدا ہوتی ہے، منجملہ دوسرے الفاظ کے عربی میں اس کی ایک تعبیر "باس" بھی ہے، مگر یہ تو "باس" کی لغوی تشریح ہے، قرآن میں ایک سے زائد مقامات میں اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہو، مثلاً عرب کے یہود کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہو۔ "باسھم بینھم شدید" یا عذابوں کا ذکر کرتے ہوئے کہ کبھی وہ اوپر سے آتے ہیں اور کبھی نیچے سے، اسی طرح عذاب ہی کی ایک شکل یہ بھی ہو کہ مختلف ٹکڑیوں میں بانٹ کر "یذیق بعضھم باس بعض" کا منظر قدرت کی طرف سے قائم کر دیا جاتا ہو۔ جس کا مطلب یہی ہو کہ ایک کی چوٹ دوسرے کو لگائی جاتی ہے۔ اسی طرح سورۃ البقرہ میں صبر کرنے والوں کی تعریف کرتے ہوئے "وحین الباس" بھی فرمایا گیا ہے، الغرض یہ اور اسی قسم کے دوسرے مقامات میں "باس" کے لفظ کی جو تفسیر کی گئی ہے، اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حسب روقتال یا جنگ کی وجہ سے جو دکھ اور تکلیف لڑائی کے ہر فریق کو پہونچتی ہو، قرآن اسی دکھ اور تکلیف کو "باس" کہتا ہے گویا یہ ایک قسم کا قرآنی محاورہ ہو۔ اس محاورے کو پیش نظر رکھیے، اب سوچیے ان قرآنی الفاظ کو۔

لینذر باسا شدیدا من لدنہ　　　تاکہ دھمکائے باس شدید سے جو لدنی ہے۔

"باس" کا مفہوم تو متعین ہی ہو چکا، جو جنگ اور جنگ سے پیدا شدہ مصائب اور تکلیفوں کی تعبیر ہو آگے "شدید" کی قید کا اضافہ کیا گیا ہو جس کا مادہ شدت سے ہو، شدت سختی کو کہتے ہیں، معلوم ہوا کہ جنگ اور اس کے لائے ہوئے مصائب جن کی دھمکی دی گئی ہو وہ معمولی نہ ہوں گے، اور بات اسی پر ختم نہیں ہوتی، قرآن میں شدید کے بعد "من لدنہ" کا لفظ ہو۔ "لدنی" اسی کا اردو ترجمہ کیا گیا ہو [جس کا مطلب ہو غیر اسبابی طور پر براہ راست قدرت کی طرف سے پہونچنے والی چیز یہ اسی طرح ہے جس طرح کہ علم کی ایک

قسم کو "علم لدنی" کہا جاتا ہے] ایک قسم علم کی تو وہ ہوتی ہے جسے تعلیم کے مقررہ طریقوں سے حاصل کیا جاتا ہو، اور دوسری قسم علم ہی کی ایک یہ بھی سمجھی جاتی ہو جو عالم کو اسباب کے توسط کے بغیر براہ راست حق تعالیٰ کے حضور سے عطا کیا جاتا ہو، اسی قسم کا نام اردو میں بھی "علم لدنی" مشہور ہوگیا ہو، بہ ظاہر یہ محاورہ اسی سورۂ کہف کے دوسرے مقام سے ماخوذ ہو، یعنی موسیٰ (علیہ السلام) کی ملاقات جس شخص سے ہوئی تھی، سمجھا جاتا ہو کہ ان کا نام خضر (علیہ السلام) تھا، ان ہی کی دوسری خصوصیتوں کے ساتھ ایک خصوصیت

اٰتَيْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۔	دیا تھا میں نے اس کو (یعنی حضرت خضر علیہ السلام کو) اپنے حضور سے علم!

بھی بتائی گئی ہے۔

بہرحال "بأساً شديداً" کے ساتھ "من لدنه" کا اضافہ دھمکی میں جو کیا گیا ہے، بغیر کسی تاویل کے اس کا یہی مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ یہ شدید جنگ جس کی دھمکی دی گئی ہے: اسباب وعلل سے بالاتر ہوگا اور براہ راست قدرت کی طرف سے ایسے "من لدنی" حالات پیش آئیں گے کہ اسباب کی راہ سے مقابلہ کرنے والوں کے سامنے عقلی داؤ پیچ اور فکری تگ ودو، ذہنی ادھیڑ بُن سب بے کار ہو کر رہ جائے گی، کیونکہ اسباب کی راہ سے تو ان ہی چیزوں کا مقابلہ ممکن ہے جو اسباب ہی کی راہ سے ہو رہی ہوں، لیکن اسباب کا حجاب جب اٹھا دیا جائے، اور من لدنی قانون کے تحت براہ راست جن حالات کو قدرت کا ہاتھ پیدا کرے اُن کا مقابلہ کس کے بس کی بات ہے[1]۔

---

[1] قرآن کے جن الفاظ پر بحث کرتے ہوئے مولانا یہاں تک پہونچے ہیں اُن کے بعد یہ آیت آتی ہے

وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا مّٰكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا	اور بشارت دیتا ہے اُن ماننے والوں کو جو بھلے کام کرتے رہتے ہیں۔ بلاشک وشبہ ان کے لیے اجر حسن ہو۔ مگن رہیں گے اس میں ہمیشہ ہمیش۔

اس آیت کا تعلق چونکہ نہ تو دجالی فتنہ کے علمبرداروں پر تنقید یا ان کے طرز فکر کی تغلیط اور اُن کے لیے کسی وعید وتحذیر سے ہو نہ اس فتنہ کے ایام میں اہل ایمان کے لیے کسی ہدایت و رہنمائی سے، بغرض سورۂ کہف کے جن خاص اشارات کی طرف متوجہ کرنا اس مضمون کا مقصود ہے اُن سے آیت کا بظاہر کوئی تعلق نہیں ہو اس لیے طوالت سے بچنے کی خاطر مناسب تو یہی تھا کہ مضمون کے اس حصہ کو حذف کر دیا جاتا، مگر آگے ایک موقع پر چونکہ مولانا نے اس حصہ کا حوالہ دیا ہو اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہو کہ اس موقع پر مولانا نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے

(۲)

من لدنی باس شدید کی دھمکی کا نشانہ

"تاکہ دھمکائے ان لوگوں کو جنھوں نے کہا کہ اللہ نے صاحبزادہ بنالیا"
"نہیں ہے اس کا علم ان کو کچھ بھی نہ اُن کو ہے اور نہ ان کے باپ دادوں کو ہے"
"بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے"
"نہیں بول رہے ہیں وے مگر صرف جھوٹ"

تقریباً یہ لفظی ترجمہ ہے قرآن کی [سورۂ کہف کی] ان آیتوں کا، یعنی:-

"لِيُنْذِرَ الَّذِينَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا"
"مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ وَلَا لِآبَائِهِمْ"
"كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ"
"إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا"

اور اب آپ کے سامنے سورۂ کہف کے ان ہی چار فقروں پر بحث کی جائے گی۔

عرض کرچکا ہوں کہ من لدنی باس شدید (خود حضوری سخت جنگ) کی (جس دھمکی سے اس سورۃ کی گویا ابتدا کی گئی ہو، اس دھمکی کے متعلق یہ سوال کہ اس کا رُخ آیا ساری انسانیت کی طرف ہو یا بنی آدم کے کسی خاص طبقہ کو اس دھمکی کا قرآن نے نشانہ ٹھہرایا ہے؛ دراصل اسی سوال کا جواب مذکورۂ بالا آیات میں دیا گیا ہے۔[1]

جیسا کہ ظاہر ہے کہ خالقِ عالم کی طرف ولدیت کے عقیدے کا انتساب یہ عیسائیوں کا صرف عقیدہ ہی نہیں، بلکہ اسی "اعتقاد" پر عیسائیت یا کرسچنٹی کی بنیاد قائم ہے۔ عیسائیت کا اول بھی یہی ہے اور آخر بھی

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ

اس کا خلاصہ ذکر کردیا جائے

اس آیت کے ذیل میں مولانا نے یہ ارشاد فرمایا ہو کہ من لدنی باس شدید کی دھمکی نہ ماننے والوں کو دینے کے بعد اہل ایمان کو اطمینان دلایا گیا ہو کہ ان کے لیے اس میں لدنی عذاب کے دور میں کوئی پریشانی کی بات نہیں ہو بلکہ اسبابی کاروبار کا قصہ ختم ہو جانے کے بعد چاہیے کہ تم "خوش ہو جاؤ کہ تمھاری سعی و عمل جس کا رخ "مسبب" ہی کی طرف تھا۔ اب اس کی قیمت تمھارے سامنے آئے گی" اور وہ غیر فانی ہوگی۔ مرتب۔

[1] ناظرین کو یاد ہوگا کہ گزشتہ صفحات میں مولانا نے تین سوال قائم فرمائے تھے۔ ایک کا جواب تو گزر چکا، باقی سوال ۲ و ۳ چونکہ حقیقت میں ایک ہی سوال کے دو جزو تھے اسلئے مولانا نے ان دونوں کے جوابات کو ایک ہی میں ملا دیا ہے۔ مرتب۔

یہی ہے، اور آج عیسائیوں کی بڑی اکثریت یورپ و امریکا میں آباد ہے، جس کا حاصل دوسرے لفظوں میں یہی ہوا کہ براہ راست رُخ اس من لدنی بأس شدید کا ان ہی ممالک اور ان کے آباد کاروں کی طرف ہے۔

قابل غور بحث | یہ ہو سکتا تھا کہ کسی مختصر لفظ مثلاً "نصاریٰ" یا اسی قسم کے دوسرے الفاظ سے اسی مفہوم کو قرآن ادا کر دیتا مثلاً کہہ دیا جاتا کہ دھمکایا جاتا ہے، نصاریٰ کو یا عیسائیوں کو، مگر باوجود شدید اختصار پسندی کے ان ہی عیسائیوں کی تعبیر مذکورہ بالا الفاظ سے جو کی گئی ہو اور ساتھ ہی ان کے اہم عقیدے کی تنقید میں ایک سے زیادہ فقرے جو قرآن نے اس موقع پر استعمال کیے ہیں، کیا صرف یہ نذر خطابت ہو؟ ایسے الفاظ ہیں کہ ان پر غور کیے بغیر صرف یہ کہتے ہوئے کہ مراد ان الفاظ سے عیسائی ہیں، ہم بھی اسی طرح گذر جائیں، جیسے عموماً لوگ گذر رہے ہیں۔

کسی آدمی کی کتاب کے ساتھ تو اس قسم کا سلوک شاید قابل برداشت بھی ہو سکتا ہے، مگر علام الغیوب، الحکیم الخبیر کے کلام کے ساتھ اس کی جسارت دلوں میں کیسے پیدا ہوتی ہے؟ میں تو اس کو سوچ کر کانپ اٹھتا ہوں، یہ خالق عالم کا کلام ہے، اسی خالق عالم کا کلام ہے جس کا کام عالم کا موجودہ نظام ہے، جب اس کے کام کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہ ہے کہ بظاہر دیکھنے میں خواہ وہ جتنا بھی مختصر اور چھوٹا نظر آئے، ایٹم کے حقیر ذرات ہی کیوں نہ ہوں؟ لیکن ان ہی ذرات میں سے کسی ذرے کو لے کر لوگوں نے جب سوچا اور سوچنے کا جو حق تھا اسے ادا کیا۔ تو کون نہیں جانتا کہ اسی ایک ذرے سے قوت کا طوفان اُبل پڑا، کیسا طوفان؟ ——— جس کے کام کا یہ حال ہو، انصاف شرط ہے، اسی عجیب و غریب نرالے کام والے کا کلام جب ہمارے سامنے آئے تو کیا اس کے ساتھ یہ انصاف ہوگا کہ جس مطلب کو چار مستقل فقروں میں اس نے ادا کیا ہے اسی مطلب کو ایک لفظ "عیسائیوں" یا "النصاریٰ" یا اسی قسم کے لفظ دو لفظ سے ادا کر کے اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جائیں کہ خدا کے کلام کو ہم نے سمجھ لیا، اور اس کے سمجھنے کا جو حق تھا اُسے ادا کر دیا؟ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ۔

بہر حال اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے آیئے اور قرآن کی مندرجہ بالا ان چار آیتوں اور جن الفاظ پر یہ آیتیں مشتمل ہیں اُن پر غور کیجیے۔

(ا)

خاص توجہ کا مستحق لفظ | يُنْذِرَ الَّذِينَ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا (تاکہ دھمکائے اُن لوگوں کو جنھوں نے کہا کہ اللہ نے ولد بنا لیا) یہی پہلا فقرہ ہے، جن الفاظ میں عیسائیوں کے بنیادی عقیدے کی تعبیر قرآن نے اس مقام کی ہو، ان میں سب سے زیادہ توجہ کا مستحق میرے نزدیک وَلَد کا لفظ ہو۔ اردو میں عموماً لڑکا، بیٹا، بچہ وغیرہ الفاظ سے ولد کا ترجمہ کر دیا جاتا ہو، شاید کچھ ایسا سمجھا جاتا ہو کہ عربی ہی میں ابن کا جو دوسرا لفظ ہو اس میں اور ولد ان لفظ میں معنی کے اعتبار سے کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے گویا دونوں ہم معنی مرادف الفاظ ہیں۔

بگر باد نیٰ تامل واضح ہو سکتا ہے کہ ولد کا لفظ ولادت سے ماخوذ ہے، فارسی میں زادن اور اردو میں جننا جِکے
معنی ہیں۔ جس کا مطلب یہی ہوا کہ ولد کسی کا جب کسی کو ہم ٹھہراتے ہیں تو گویا ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ولد اس شخص
ہے جس کا وہ ولد ٹھہرایا گیا ہو، ولادت اور زائیدگی، یعنی جننے کا تعلق رکھتا ہے، اب ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ
دن، یا جننے یعنی ولادت کے اس لفظ کا اطلاق حالی کی جس صورت پر کیا جاتا ہے اس کی واقعی حقیقت
یا ہوتی ہے؟۔

والد اور ولد کے تعلق کی نوعیت

فرض کیجیے کہ زید ولد ہو اور عمرو مثلاً اس کا والد ہے، ان دونوں کے باہمی تعلق کی نوعیت کیا
ہوتی ہے؟۔

کیا عمرو والد اپنے ولد زید کا خالق ہوتا ہے، یعنی زید کو کتم عدم، اور مطلق نیستی کے پردے سے نکال کر
و اس کو وجود عطا کرتا ہے؟ یقیناً واقعہ کی یہ قطعاً غلط تعبیر ہوگی۔ زید جوینہ کی شکل میں والد کے اندر نمودار ہوتا
اور عمرو جو والد ہے صرف اسی جوینہ یا نطفہ کو زید کی ماں کے رحم میں منتقل کر دیتا ہے، ولد یعنی زید ....،
و، وجود کے سارے صفات، صفات کے ثمرات و نتائج، ان میں سے کسی چیز کو اپنے والد عمرو سے نہیں پاتا،
بقول شخصے والد کی حیثیت ولد کے حساب سے صرف ایک گذرگاہ ہوتی ہو جس سے اپنی ہستی کی ایک خاص
ل (یعنی عالم جوینیت یا نطفیت) میں ولد کو گذرنا پڑتا ہے۔ "نیست کو ہست کرنا" اگر خلق کے یہی معنی ہیں تو
عنی کی رو سے قطعاً اپنے ولد کا کوئی والد خالق نہیں ہوتا، اور خلق کا ترجمہ اگر گھڑنا کیا جائے جیسے سنار سونے چاندی
زیور گھڑتا ہے، یا پتھر پر تراش خراش کا عمل کرکے بُت تراش مجسمہ یا بُت وغیرہ بناتا ہے تو اس معنی کے رو سے
و ولد اپنے والد کی مخلوق نہیں ہوتا۔ کیونکہ ولد میں صفات و کمالات کا جو سرمایہ بھی پایا جاتا ہے، اس میں والد کو
اگر سب جانتے ہیں قطعاً دخل نہیں ہوتا، والد بیچارہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ جس نطفہ کو اس نے منتقل کیا ہے
رد بن کر پیدا ہوگا، یا عورت بن کر، اس کی ظاہری شکل و صورت کیا ہوگی اور باطنی صفات اس کے کیا
گے؛ ظاہر ہے کہ جن چیزوں کو وہ جانتا ہی نہیں ان ہی کو وہ غریب بنائے گا کیا؟۔

اپنے والد کا مخلوق نہیں ہوتا

یہ پہلی قابلِ غور بات ہو جو ولد کے اس خاص لفظ سے سمجھ میں آتی ہو، حاصل جس کا یہی
ہوا کہ ولد ٹھہرانے کا مطلب یہ ہو کہ ولد اپنے والد کا مخلوق نہیں ہے، کسی معنی اور کسی حیثیت
مخلوق نہیں ہے۔

اپنے والد کا ... ہوتا ہو

اب دوسری بات جو اسی ولد کے لفظ کا قدرتی اقتضاء ہے، اسے بھی سوچیے، آپ جانتے ہیں کہ
گھوڑے سے جو چیز قانون ولادت کے تحت پیدا ہوگی وہ گھوڑا ہی ہوگی، اور جیسے گھوڑے سے
نہیں، بلکہ گھوڑا ہی پیدا ہوتا ہے، یہی حال ہر اس چیز کا ہے جس میں والد و ولد ہونے کا تعلق پایا جاتا ہو،

آخر بطن سے چھچھوندر، اور چوہے سے چیل، گدھے سے لومڑی کی ولادت کا تماشا کس نے دیکھا ہے؟

عقیدۂ ولدیت کے لوازم یہ دونوں مقدمات جو بداہۃً بغیر کسی تاویل و توجیہ کے لفظ ولد سے سمجھ میں آتے ہیں ان کو سامنے رکھ لیجئے، اور اب سوچئے کہ اللہ یا خالق عالم (تعالیٰ عما یقولون علوا کبیرا) کے لیے ولد ٹھہرانے والوں نے ولدیت کے اس دعوے کو اپنا عقیدہ بنا کر درحقیقت کیا مانا ہے، اور اپنے دین و ایمان کی بنیاد انھوں نے کس چیز پر قائم رکھی ہے؟ یقیناً یہی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسری ہستی بھی ایسی ہو جو خدا کی مخلوق نہیں ہے، نہ خود خدا کی مخلوق ہو اور نہ اس کے صفات و کمالات خدا کے پیدا کیے ہوئے ہیں، یہ تو عقیدۂ ولدیت کا سلبی پہلو ہوا یعنی ولد، ولد کی ذات، اس کے صفات و کمالات، اللہ تعالیٰ کے عمل تخلیق کے رہین منت نہیں ہیں، یعنی خدا کے وہ مخلوق نہیں ہیں، یہ تو پہلے مقدمہ کا اقتضا رہا۔

اور دوسرا مقدمہ، یعنی وہی بات کہ گھوڑے سے گھوڑا، ہاتھی سے ہاتھی، اونٹ سے اونٹ ہی پیدا ہوتا ہے، تو قانون ولادت کے تحت خدا سے (العیاذ باللہ) پیدا ہونے والا ولد بجز خدا کے اور کیا ہوگا؟

"گھوڑے سے گھوڑا ہی پیدا ہوتا ہے" اس کا مطلب جیسے یہ ہے (اور اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے) کہ پیدا ہونے والے (ولد) گھوڑے میں گھوڑاپنے کے ان سارے صفات و لوازم کا ظہور ضروری اور ناگزیر ہو جو اس کے والد گھوڑے میں پائے جاتے ہیں، تو خدا کے لیے ولد [کا عقیدہ رکھنے] کے کیا یہی معنے نہ ہوئے کہ خدائی کے سارے کمالات کے متعلق ہم یہ مان رہے ہیں کہ خدا کے اس ولد میں بھی پائے جاتے ہیں۔

لفظ "ولد" کا فائدہ یہ ہے وہ مہیب دہشت شکل اس عقیدے کی جس پر عیسائیت کی بنیاد قائم ہے، اس حقیقت سے سچ پوچھئے تو "ولد" ہی کا یہ لفظ پردہ ہٹا سکتا تھا۔ ورنہ ابن کا لفظ جسے عموماً ولد کا مرادف سمجھا جاتا ہے، خود اس لفظ کی ساخت میں ایسی کوئی چیز شریک نہیں ہے جس کے سوراخ سے عیسائیت کی اس بھیانک اور مکروہ ترین شکل کو ہم جھانک سکتے۔ ....

ابن اور ولد کا فرق بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اپنے ولد یعنی زائیدہ اولاد سے محبت اور شفقت وغیرہ کے جس تعلق کو آدمی نظر انداز رکھتا ہے، یہی تعلق کسی ایسی ہستی سے اگر پیدا ہو جائے جو ولد نہ ہو تو ابن کے لفظ سے اس کو مخاطب کرنے کا عربی میں معلوم ہوتا ہو، کہ عام رواج تھا، خود قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ نحن ابناء اللہ (ہم لوگ خدا کے بیٹے ہیں) یہود بھی اس کا دعویٰ کیا کرتے تھے۔ مطلب ان کا یہ ہوتا تھا کہ دوسری نسلوں کے مقابلہ میں اسرائیل کی اولاد یعنی بنی اسرائیل سے خدا اسی قسم کا ربط اور تعلق رکھتا ہو جو کسی بیٹے کے ساتھ باپ کا ہوتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ اپنے آپ کو یہودی "خدازادہ" یا ولد اللہ (العیا

باللہ، نہیں سمجھتے تھے، بلکہ "بارگاہِ رب العزت میں غیر معمولی امتیازی مقام ہم رکھتے ہیں" وہ اس کے مدعی تھے اور اسی کی تعبیر نحن ابناء اللہ سے کرتے تھے، قرآن میں صرف یہ فرماتے ہوئے کہ :-

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُم بِذُنُوبِكُم بَلْ أَنتُم بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ -

کہہ دو کہ پھر تمھارے گناہوں کی وجہ سے خدا تمھیں سزا کیوں دیتا ہو، بلکہ تم آدمی ہو، ان ہی چیزوں میں سے ایک جز ہو جنھیں خدا نے پیدا کیا۔

ان کے اس دعوے پر اور کوئی تنقید نہیں کی ہے۔

آخر "ابن اللہ" کا دعویٰ اور "ولد اللہ" کا دعویٰ دونوں کا مآل ایک ہی اگر قرار دیا جائے تو پھر عیسائیوں کی اس عقیدے کے ساتھ خصوصیت ہی کیا باقی رہتی ہو۔ "ابناء اللہ" ہونے کے مدعی تو قرآن ہی کے رو سے خود یہودی بھی تھے۔

عیسائیوں کے عقیدے میں لفظ ولد کے استعمال سے قرآن کا مقصد

کچھ بھی ہو، ولد کا قرآنی لفظ جس کا بار بار اعادہ تقریباً ہر اس موقع پر کیا گیا ہو جہاں جہاں عیسائیوں کے اس عقیدے کا ذکر اس کتاب میں پایا جاتا ہو، میرے نزدیک براہ راست قرآن کا یہی ایک لفظ سمجھا رہا ہے کہ درحقیقت عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہو کہ خالق عالم کے سوا ایک اور ہستی بھی ہو جو خدا کی مخلوق بھی نہیں ہو، اور سارے خدائی صفات و کمالات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہو، اگرچہ عیسائی اس کو اللہ نہیں، بلکہ ولد اللہ کہتے ہیں، مگر ولد اللہ ہونے کا مطلب ہی یہ ہو کہ وہ بھی اللہ ہے۔

شرک کے تمام مذاہب میں توحید خالق کا اعتقاد

اس میں شک نہیں کہ الٰہیات (یا دوسرے الفاظ میں چاہیے تو کہیے کہ حق تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے مسائل) میں طرح طرح کے شاخسانے مختلف زمانوں میں نکالے گئے، شرک و بت پرستی اور ان کی بے شمار گوناگوں پیچیدہ شکلوں میں قومیں ان ہی شاخسانوں کی راہ سے الجھتی رہی ہیں، مگر تاریخ کی شہادت یہی ہو کہ شرک کی بدترین شکلوں میں بھی اس کا یقین کہ اس عالم کا پیدا کرنے والا صرف ایک ہی ہے، دلوں سے کبھی نہیں نکلا، تاریخ مذاہب کا جو طومار آج دنیا میں موجود ہو اس میں صرف ایران کے ایک فرقہ مجوس نامی کے متعلق کچھ اہرمن و یزدان یا نور و ظلمت کے عقیدے کو منسوب کرکے کہنے والے کہتے ہیں کہ بجائے ایک کے دو ہستیاں مجوسیوں کے نزدیک ایسی مانی جاتی ہیں جن میں کوئی ایک دوسرے کا خالق نہیں، بلکہ کائنات کی بعض چیزوں کو کہتے ہیں کہ یزدان نے پیدا کیا ہو اور بعضوں کو اہرمن نے، یا ان میں بعض نور سے پیدا ہوئی ہیں اور بعض ظلمت سے، اگرچہ مجوسیوں کی طرف اس عقیدے کے انتساب کو تحقیق نے افترا قرار دیا ہے، لیکن مان بھی لیا جائے کہ مجوسی کسی زمانے میں اس کے قائل بھی رہے ہوں، تاہم ان کی بات اتنی

بودی اور پھسپھسی تھی کہ ہلکی سی ذہنی چوٹ چونکانے کے لیے کافی ہو سکتی تھی۔ لہ

[بہرحال] "شرک" کی پوری تاریخ ایک سے زائد خالق کے ذکر سے خالی نظر آتی ہے، بحر و بر کے کونے کونے کو لوگوں نے چھان مارا، مگر جہاں کہیں انسانی آبادی ملی وہاں خالقِ عالم کی توحید کا عقیدہ بھی ملا، اور خالق کے سوا جن چیزوں کو بھی بنی آدم نے مختلف زمانوں میں پوجا یا اپنی امیدوں کا ماویٰ و ملجا اور ٹھکانا ان کو ٹھہرایا تو [اس مغالطہ کی بنا پر] ٹھہرایا کہ باوجود مخلوق ہونے کے زندگی کے مشکلات کے حل میں ان کو دخل ہو۔

مشرکین کے مغالطہ کی بنیاد

مگر اس مغالطہ کی بنیاد بھی صرف ایک لفظ کے نہ سمجھنے پر موقوف ہے۔ یعنی خود "مخلوق" کا لفظ۔

مخلوق کا غیر مخلوق پر قیاس

ایسی ہستی جو مخلوق ہو اس کے تعلق کی نوعیت اپنے خالق کے ساتھ کیا ہوتی ہے؟ یا اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہیے؟ لوگوں نے سامنے کی مثالوں کو دیکھ کر ایک رائے قائم کر لی اور یہی بے بنیاد رائے سارے مغالطوں کی بنیاد بنی ہوئی ہو، یعنی ان کے سامنے یا تو ایسی چیزیں ہیں، جن میں کوئی دوسرے کی مخلوق نہیں ہے، مثلاً زید اور عمرو دو آدمی ہیں، ظاہر ہے کہ نہ زید ہی عمرو کا مخلوق ہے اور نہ عمرو زید کا، ہم اسی قسم کی چیزوں کو دیکھ کر فیصلہ کر لیتے ہیں کہ زید و عمرو ان دو ہستیوں کے تعلق کی جو نوعیت ہو، کچھ یہی نوعیت یا اسی قسم کی

لہ ان کی طرف اس عقیدہ کی توجیہ میں بڑی سے بڑی بات جو منسوب کی گئی ہے وہ یہی ہے کہ عالم کا موجودہ نظام خیر و شر یا بھلائیوں اور برائیوں سے بھرا ہوا ہے، پس خدا یا یزدان، جو خیر مطلق ہے اس سے یہ کیسے منسوب کیا جائے کہ تمام شرور اور برائیوں کا پیدا کرنے والا بھی یہی ہے؟ کہتے ہیں کہ ان ہی شرور اور برائیوں کی پیدائش کی تصحیح کے لیے اہرمن کے وجود کا یزدان کے ساتھ اضافہ کیا گیا تھا، مگر ذرا سوچئے بھلائی اور برائی کے جن صفات کو ہم دنیا کی چیزوں کی طرف منسوب کرتے ہیں ان کی واقعی حالت کیا ہے، دراصل ایک ہی چیز ہوتی ہے، مثلاً "آگ" ہے، جب تک ہمارا کھانا پکاتی ہے، ہمیں روشنی بخشتی ہے تو ہم اس کو خیر ٹھہراتے ہیں، مگر اسی آگ سے جب ہمیں کبھی نقصان پہنچتا ہے، گھر جل اٹھتے ہیں، جانور یا آدمی بھننے لگتے ہیں تو اسی آگ کو ہم بدترین چیز ٹھہرانے لگتے ہیں۔ الغرض استعمال کے اختلاف سے ایک ہی چیز ہوتی ہے جو کبھی خیر، کبھی شر بنی رہتی ہے، غریب مجوسیوں نے خیال کر لیا کہ شر و خیر کے الفاظ جیسے الگ الگ ہیں۔ اسی طرح واقع میں بھی شر کا وجود خیر سے اور خیر کا وجود شر سے الگ ہو کر اس عالم میں پایا جاتا ہے، مگر اس لفظی مغالطہ پر متنبہ ہو جانے کے بعد کہ ایک ہی چیز اس عالم کی شر بھی بنتی رہتی ہے، اور خیر بھی، کیا ایک مخلوق کے دو خالق کی تلاش کا جذبہ ان میں زندہ رہ سکتا ہے؟

نوعیت خالق و مخلوق کے تعلق کی بھی ہوگی، یا زیادہ سے زیادہ ہم یہ سوچتے ہیں کہ اسی قسم کی چیزیں جن میں کوئی دوسرے کا خالق تو نہیں ہے، لیکن ان میں صنعتی تعلق کبھی جو پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً پتھر کو صنعتی کاریگری سے بُت تراش مجسمہ بنا لیتا ہے، یا اینٹ چونے گچ کو جوڑ کر معمار مکان تیار کر لیتا ہے، لکڑی کے ٹکڑوں کو خراش تراش کے عمل سے بڑھئی کرسی کی شکل میں ڈھال دیتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ صانع اور مصنوع میں جو تعلق اور رشتہ پایا جاتا ہے سمجھ لیا جاتا ہے کہ خالق و مخلوق کے رشتہ اور تعلق کی نوعیت بھی کچھ یہی ہوگی حالانکہ پہلی صورت ہو یا دوسری، خالق و مخلوق کے تعلق کو سمجھنے میں جب ان سے مدد لی جائے گی تو حقیقت نظر کے سامنے سے اوجھل ہو جائے گی۔ اور طرح طرح کی الجھنوں میں آدمی مبتلا ہو کر رہ جائے گا۔

جس کی وجہ کھلی ہوئی ہے کہ صانع ہو یا مصنوع، یا صانع و مصنوع کا تعلق نہ ہو، کسی حال میں بھی ایک کا وجود دوسرے سے پیدا نہیں ہوتا، جن چیزوں میں صانع و مصنوع کا تعلق نہیں ہو ان کا حال تو ظاہر ہی ہے، باقی خود صانع و مصنوع میں بھی دیکھئے، پتھر یا لکڑی، یا اینٹ چونا وغیرہ، جن پر صانع صنعتی عمل کرتا ہے ان میں کوئی بھی ایسا ہے جسے صانع اور کاریگر وجود اور ہستی عطا کرتا ہو، یعنی نیست سے ہست یا جو چیز معدوم اور نیست مطلق تھی اس کو موجود کیا ہو؟ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان چیزوں میں جو قدرتی صلاحیتیں پہلے سے پائی جاتی ہیں صانع اور کاریگر ان ہی صلاحیتوں کو صنعتی عمل سے ظاہر کر دیتا ہے۔ پتھر میں بت بننے کی صلاحیت پہلے سے موجود تھی، بُت تراش اسی صلاحیت کو فعلیت کا رنگ عطا کر دیتا ہے، آخر اسی صنعتی عمل سے کیا ہوا کے کسی ٹکڑے سے وہ بت بنا کر دکھا سکتا ہے؟

خالق و مخلوق کی صحیح مثال | خالق و مخلوق کی کوئی مثال چونکہ سامنے کی چیزوں میں نہیں پائی جاتی، اسی لیے غلط مثالوں کا سہارا لے کر شعوری یا غیر شعوری فیصلہ ہر شخص خالق و مخلوق یا خدا اور عالم کے متعلق اپنے اندر رکھتا ہے حالانکہ مثل نہ سہی، مثال اس کی آدمی کے باہر میں نہ سہی، اندر میں خود پائی جاتی ہے، یعنی خیالی قوت سے بحالت بیداری یا [بحالت] خواب جن خیالی چیزوں کو اپنے اندر آدمی پیدا کرتا رہتا ہے، کچھ ہلکی سی جھلک خالق و مخلوق کے تعلق کی اگر پائی جاتی ہے تو اسی خیالی مثال میں پائی جاتی ہے، تخیل کی قوت سے بغیر کسی مادہ کے جس وقت ہم کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتے ہیں تو پیدا کرنے کا ارادہ اس خیالی مخلوق کی پیدائش کے لیے کافی ہوتا ہے، بڑی سے بڑی عمارت، پہاڑ، سمندر، آفتاب، ماہتاب کو عالم خیال میں آدمی پیدا کرتا رہتا ہے، گویہ بھی ایک ہلکی سی نامکمل مثال ہو۔ مگر ذرا سوچئے کہ ان خیالی مخلوقات کا تعلق ان کے خالق سے کیا ہوتا ہے، اتنی بات تو کھلی ہوئی ہے کہ مخلوق بنا کر ہم جن چیزوں کو اپنے خیال میں پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً دلی کی جامع مسجد کا خیال کیجئے

یعنی اپنے تخیل کی قوت سے اس کو پیدا کیجئے، اور دیکھئے آپ کی یہ خیالی مخلوق اپنی ذات اپنے صفات اور حالات ہر اعتبار سے اپنی پیدائش میں بھی آپ کے تخلیقی ارادے کی محتاج نظر آئے گی" اور پیدا ہو جانے کے بعد بھی مسلسل اپنے قیام و بقاء میں اس کی ذات بھی، اس کے صفات بھی، حالات بھی آپ کی تخلیقی توجہ اور التفات کے دست نگر دکھائی دیں گے، جب تک اپنے تخیل کی قوت سے آپ اس کے قیوم بنے ہوئے اور اسے تھامے ہوئے ہیں وہ موجود ہوگی، جوں ہی توجہ و التفات کے اس سہارے سے وہ محروم ہوئی، اسی وقت وہ ناپید ہو کر رہ جائیگی۔

مخلوقیت کی حقیقت کمزور آدمی کی مخلوق کا حال جب یہی ہے تو اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ قادر و مقتدر واقعی جو عالم کا خالق حقیقی ہے، اس کے ساتھ اس کے مخلوقات کے احتیاجی تعلق کی نوعیت یقیناً اس سے بھی کہیں زیادہ شدید ہوگی، اس کے مخلوقات میں خود مخلوقات کا کچھ نہیں ہوتا، سب کچھ خالق کا ہوتا ہے، ان کا وجود بھی، ان کی ذات بھی، ان کے صفات بھی، ان کے افعال بھی ہر لمحہ ہر لحظہ مسلسل صرف خالق کے فیض توجہ کے ساتھ بندھے پھندے رہتے ہیں۔ "مخلوقیت" کا حقیقی ترجمہ یہی احتیاج مطلق ہے، جس پر "مخلوقات" کی یہ حقیقت کھل جاتی ہے، وہ ان سے اسی حد تک بے نیازی اپنے اندر پانے لگتا ہے کہ ان سے لین دین کے مراسم تو بڑی بات ہے، ان مخلوقات کے وجود تک میں اس کو شبہ ہونے لگتا ہے، اور شبہ کیا بعض تو ایسی یافت کے بعد چیخ اٹھے ہیں، کہ ع

گر اوہست حقا کہ من نیستم[۱]

بہرحال باوجود اجمال کے پھر بھی یہ ذیلی گفتگو کچھ زیادہ طویل ہوگئی، ورنہ یہ عرض کر رہا تھا کہ "مخلوق" کو مخلوق مان کر اس کو "معبود" بنانے کی غلطی میں آدمی اسی وقت تک شاید مبتلا رہ سکتا ہو جب تک کہ اس پر "مخلوقیت" کی اصل حقیقت صحیح معنوں میں منکشف نہ ہوئی ہو، مگر "خالق و مخلوق" کے باہمی تعلق کو سمجھ لینے کے بعد جب اس پر واضح ہو جاتا ہے کہ "مخلوقیت" دراصل خالص بے چارگی، اور حد سے گزری ہوئی بے بسی کا نام ہو تو جن مثالی مغالطوں سے پھسل کر شرک کی اندھیری کھائی میں آدمی گر پڑتا ہے، اس سے اچانک باہر نکل آتا ہے، آخر ایسے "معبود" کو آدمی کب تک پوجتا چلا جائے گا، جس کے متعلق جانتا ہو کہ وہ خود اپنے وجود اپنی ذات، اپنے صفات، اپنے افعال، سب میں دوسرے کا دست نگر اور دوسرے کے ارادے کے ساتھ جکڑا ہوا ہے۔

عیسائیوں کے شرک کی انفرادیت اور پیچیدگی اسی لیے شرک اور مشرکیت کے وہ سارے قصے جن میں خالق کے سوا ہر

---

۱ یہ بڑا تفصیل طلب مسئلہ ہے "مخلوقیت" کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے مسئلہ کے صرف ایک پہلو کا اجمالی تذکرہ بیان کر دیا گیا زیادہ تفصیل مطلوب ہو تو خاکسار کی کتاب "الدین القیم" میں مطالعہ فرمائیے۔"

معبود کو مخلوق مان کر معبود بنایا گیا ہے، ان کا مسئلہ چنداں دشوار بھی نہیں ہو، کم از کم اتنا دشوار تو نہیں ہے جتنی دشواری "شرک" کی اس عجیب و غریب قسم کی وجہ سے پیش آگئی جس کی بنیاد "ولدیت" کے عقیدے پر قائم ہے کہ اس میں خالق کے سوا کسی ایسی ہستی کو معبود بنا لینے کی کوشش کی گئی ہو جو مخلوق نہیں بلکہ (العیاذ باللہ) خدا کا مولود ہے اور تماشا یہ ہے کہ "مولود" مان کر یہ بھی باور کرایا جاتا ہے کہ خدا یعنی خالق عالم کی ذات تو ہمارے ہاں بھی ایک ہی ہے، حالانکہ آپ دیکھ چکے کہ "ولد اللہ" اللہ کی مخلوقیت سے بھی باہر ہو جاتا ہے، اور ولدیت کا لازمی اقتضا یہ ہو کہ اللہ کا ولد بھی (العیاذ باللہ) اللہ ہی ہو

دوسرا شرمناک پہلو | اور قصہ کچھ اسی نقطہ پر ختم نہیں ہو جاتا، اب تک تو اس پر بحث کی گئی کہ "نظریۂ ولدیت" کی بنیاد پر ولد کے متعلق ماننے والوں کو کن باتوں کے ماننے پر مجبور ہونا پڑا، مگر دوسرا پہلو یعنی اسی "نظریۂ ولدیت" کے لحاظ سے خود والد کی طرف کن ناگفتہ امور کے منسوب کرنے پر اس کے قائل بے بس ہیں، اب اسے [صرف چند لفظوں میں] ملاحظہ فرمائیے۔

ظاہر ہے کہ ولد کا لفظ والد کے ساتھ قدرتاً والدہ کے مسئلہ کو بھی آدمی کے سامنے کر دیتا ہے، جس کے بعد اب آگے میں کیا عرض کروں ہم جن کے ذکر سے کیا معنے؛ خیال سے بھی کانپ اٹھتے ہیں، مگر ولدیت کے اسی حیرت انگیز بیہودہ، گھنونے نظریہ کا یہ نتیجہ ہو کر ماننے والوں نے ولد کے ساتھ والد کو مانا اور والد کے ساتھ والدہ کو اور والدہ کے ساتھ (العیاذ باللہ) والدین کے سارے فرائض کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے۔

یہاں تک تو مطلب ہوا، پہلی آیت، یعنی "لینذر الذین قالوا اتخذ اللہ ولدا" کا اب آگے چلئے۔

(۲)

ارشاد ہوا ہے:۔

مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ وَلَا لِآبَائِهِمْ　　نہیں ہو ان کو اس کا کچھ بھی علم، نہ ان کے باپ دادوں کو:

بلا علم بے دریے دعوے | سوچئے قرآن کیا کہہ رہا ہو؛ کھلی ہوئی بات ہو کہ کسی چیز کے علم اور جاننے کی دو ہی صورتیں ہیں یعنی براہ راست جاننے والے کو اس کا علم حاصل ہوا ہو، یا براہ راست نہیں، بلکہ بالواسطہ، یعنی براہ راست جاننے والوں سے اس کی خبر پہونچی ہو، بالواسطہ یا بلا واسطہ علم کی یہی دو قسمیں ہیں، اب غور فرمائیے کہ "نظریۂ ولدیت" یعنی بجائے مخلوق قرار دینے کے کسی شخص کو خالق عالم جل مجدہٗ کا "مولود" ٹھہرا لینا اور مولود ٹھہرا لینے کے بعد

نسانیت کے اس متفقہ کلی فیصلے کے خلاف کہ خدا کے سوا جو کچھ بھی ہے سب مخلوق ہے .... ایک خاص
ات کو خدا کی "مخلوقیت" کے دائرے سے خارج کر دینا، اور اللہ کے ساتھ ولد اللہ کا اضافہ کر کے درحقیقت
یف اور اللہ کو مان لینا، پھر والد کے ساتھ والدہ بنانے کے لیے انسانی گھرانے کی ایک عورت کے متعلق یہ تسلیم
لینا کہ والدہ ہونے کے فرائض اسی نے انجام دیئے، اور اس سلسلہ میں جن ناگفتہ بہ تصورات سے دل و دماغ کو
لدنا پڑتا ہے۔ ان کو دینی عقیدے کی حیثیت دینی ایک پورا فلسفہ اسی ولدیت کا بنا لینا ہزاروں لاکھوں کتابوں
کے سوا اسی عقیدے کی خیالی صورتوں کو معابد اور گرجوں کے در و دیوار پر تصویری لباس بھی عطا کرنا اور جہاں جہاں
موقع ملتا چلا گیا، وہاں مجسموں اور سنگی و برنجی پیکروں میں بھی ان کو ڈھالنا۔

سوال یہی ہے کہ اس سارے اعتقادی طوفان کے نیچے کسی حیثیت سے کسی جگہ، کسی منزل میں کوئی ایسی
ت بھی نظر آتی ہے جس کے متعلق اعتقاد رکھنے والوں کا یہ گروہ اس کا دعویٰ کر سکتا ہو کہ براہ راست اس بات کا
علم اسے حاصل ہوا، یا اسے نہیں تو اس کے باپ دادوں میں کوئی ایسا گزرا جسے اس سلسلہ میں کسی قسم کے مشاہدے
تجربے کا کسی حیثیت سے کبھی موقع میسر آیا تھا۔

کتنے مہیب، کتنے دہشت ناک، کتنے مکروہ اور گھناؤنے، ناگفتہ بہ دعووں پر "ولدیت" کا یہ عقیدہ
ئم ہے، لیکن عقیدہ رکھنے والے انصاف سے بتائیں کہ ان میں سے کل نہیں کسی ایک ہی جزء کے جاننے کا
واسطہ یا بالواسطہ دعویٰ وہ کر سکتے ہیں؟ انھوں نے اپنے اوپر کتنی بڑی بڑی ذمہ داریاں لادی ہیں، خدا کی
مخلوقیت سے ایک شخص کے خارج ہونے کے مدعی ہیں، اللہ کے ساتھ معناً ایک نئے اللہ کا اضافہ کر رہے ہیں۔
للہ الملک القدوس کی طرف وہ ایسی باتوں کو منسوب کر رہے ہیں جنھیں صحیح معنوں میں شاید وہ خود بھی سوچ نہیں
سکتے۔ مگر ان ذمہ داریوں کی بنیاد کس چیز پر قائم ہے، آپ دیکھ رہے ہیں "کچھ نہیں" کے سوا اور بھی کچھ ہے؟

زیادہ سے زیادہ

زیادہ سے زیادہ کچھ کہنے کی یہ جرأت اگر کر سکتے ہیں تو یہی کہ حضرت مسیح علیہ السلام جب "بغیر والد"
کے "والدہ" (مریم علیہا الصلوٰۃ والسلام) سے پیدا ہوئے تو آخر ان کا والد کس کو ٹھہرایا جائے؟ سوال تو
ایک حد تک پیدا ہو سکتا ہے، مگر ابھی سوال سے نہیں، بحث جواب سے ہے، یعنی یہ کہہ دینا کہ جب انسانوں
میں ان کا کوئی والد نہ تھا، تو ہم نے اللہ تعالیٰ ہی کو ان کا والد مان لیا۔ اسی جواب کے متعلق میں یہ پوچھتا ہوں کہ
اس دعوے کی بنیاد کیا ہے؟ کیا زید کا باپ، اگر عمرو نہ ہو تو اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ زید کا باپ بکر ہے، خود سوچئے
ایسا دعویٰ علم پر مبنی ہو گا؟ پھر اتنی بات کہ کوئی آدمی حضرت مسیح (علیہ السلام) کا باپ نہ تھا، محض اس سے
منطقی نتیجہ کیسے نکل آیا کہ آدمی جس کا باپ نہ ہو اس کا باپ یقیناً خدا ہی ہے؟

(۳)

عقیدۂ ولدیت پر قرآن کی پرزور تنقید

اور اب اس کے بعد اندازہ کیجئے اس تیسری آیت[1] کے صحیح وزن کا جو مذکورۂ بالا دو آیتوں کے بعد ہے یعنی نظریۂ "ولدیت" کے متعلق یہ بتانے کے بعد کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی قسم کے علم پر اس کی بنیاد قائم نہیں ہے۔ قرآن نے

كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا ۔

بہت بڑی بات ہے جو ان کے (عیسائیوں) کے منھ سے نکل رہی ہے، نہیں بول رہے ہیں یہ مگر صرف جھوٹ۔

کے پرزور الفاظ میں جو تنقید کی ہے، کیا یہ واقعہ کی صحیح تعبیر نہیں ہے؟ اس سے بڑی بات خود سوچئے اور کیا ہوگی کہ ایک ایسی بے پادر ہوا بات جس کی قطعاً کسی قسم کی کوئی علمی بنیاد نہ تھی، اور انسانیت کی ساری تاریخ میں جو کبھی سوچی نہیں گئی تھی اسی کو مان کر الٰہیات کے سارے نظام ہی کو درہم برہم کر کے رکھ دیا گیا۔

یقیناً حق تعالیٰ کے متعلق جتنی غلط سے غلط، جہل سے جہل باتیں اب تک منسوب کی گئی ہیں، ان میں سب سے بڑی بات وہ ہے جو نظریۂ ولدیت کے معتقدوں کے منھ سے نکل رہی ہے، اور کمال یہ ہے کہ حقیقت سے ذرہ برابر بھی لگاؤ ان کے اس ادعائی عقیدے کو نہیں ہے، بالواسطہ یا بلاواسطہ علم کی کسی قسم کی تائید اس خیال کی یہ حاصل نہیں کر سکتے، نہ خود اپنے حواس کی شہادت کو دلیل میں وہ پیش کر سکتے ہیں، اور نہ اپنے باپ دادوں کی شہادت کو، اور عقل سے تائید تو خیر بڑی بات ہے، واقعہ یہ ہے کہ جس طریقے سے بھی سوچا جائے، بجز تردید کے عقل کی راہ میں بھی ان کو اور کچھ نہیں مل سکتا۔

اور یہ تو خیر "نظریۂ ولدیت" کی وہ باتیں ہیں، جو "ولدیت" کے اس لفظ سے پیدا ہو رہی ہیں، باقی اس عقیدے سے خود اس عقیدے کے ماننے والوں کی آئندہ تاریخ کو، اور ان کی وجہ سے دنیا کی قوموں کو جن روح گداز، جاں فرسا، حوادث و واقعات سے گزرنا پڑا اور گزرنا پڑے گا۔ اس کی تفصیل اس اشارے میں ملے گی جو اسی کے بعد والی آیت میں کیا گیا ہے۔

---

[1] واضح رہے کہ ان آیات پر بحث شروع کرتے وقت مولانا نے ان کو چار الگ الگ آیتیں قرار دیا تھا مگر یہاں "تیسری آیت" میں وہ فقرہ بھی شامل ہے جسکو وہاں چوتھی آیت قرار دیا تھا۔ مرتب

عقیدۂ ولدیت کے روح فرسا آثار و نتائج

"تو کیا ایسا ہوگا کہ تم اپنی جان کے کھونے والے بن جاؤ گے، ان کے (یعنے عقیدۂ ولدیت کے ماننے والوں کے) آثار پر، اگر نہ ایمان لائے وہ اس بات (قرآن) پر، مارے غم و اندوہ کے۔"

سورۂ کہف اٹھایئے، آگے آپ کو یہ آیت ملے گی، یعنی

"فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا"

پیشانی کی عبارت اس قرآنی آیت کا حاصل اور ترجمہ ہے۔

پوری سورت کی اہم ترین آیت اور اہم ترین لفظ یوں تو سورۂ کہف اوّل سے آخر تک عجیب و غریب اشارات پر مشتمل ہے، لیکن کم از کم میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ اس سورہ میں بھی یہ آیت اور آیت میں بھی "آثارهم" کا جز و غیر معمولی توجہ کا مستحق ہے۔

آثار کی لغوی تشریح آثار کا لفظ اثر کی جمع ہے، جو اردو میں بھی مستعمل ہے، جس [کی وجہ] سے شائد وہ صحیح مفہوم دماغوں میں نہ آئے، جو خالص عربی زبان میں اثر کے اس لفظ سے سمجھا جاتا ہے، لغت میں اس کی تشریح فارسی کے ان الفاظ سے کی گئی ہے "منتہی الارب" میں ہے۔

"اثر بقیہ چیزے و نشاں"

آگے بیان کیا ہے کہ نقشِ قدم کو بھی اسی لیے اثر کہتے ہیں، پھر عربی کا ایک محاورہ نقل کیا ہے، کہتے ہیں "اثرا بعد عین" و در حق کسے گویند کہ حاصل از دست دادہ و آثار و نشان او طلب نماید" یعنی اپنی چیز کوئی کھو بیٹھا ہو، اور اس کے بعد اس چیز کے آثار اور نشانیوں کو تلاش کرتا ہو۔

حاصل یہی ہے کہ اپنے بعد چیز اپنے جن نتائج اور نشانوں کو چھوڑتی ہے، ان ہی کی تعبیر عربی زبان میں آثار کے لفظ سے کرتے ہیں، یہ لغوی تشریح تو آثار کے لفظ کی ہوئی۔

"باخع" کی تشریح دوسرا لفظ آیت میں باخع کا ہے، جس کا مادہ بخع ہے، عام طور پر بخع کا ترجمہ ہلاک کرنا کر دیا جاتا ہے، مگر عربی زبان کے ایسے محاورے اور زبان زد فقرے مثلاً "بخع الارض بالزراعة" جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زمین پر اتنی کاشت کی گئی کہ روئیدگی کی صلاحیت جاتی رہی، اسی طرح "بخع الركية" اس وقت بولتے ہیں جب

کھودتے ہوئے زمین کے اس طبقہ تک آدمی پہونچ جائے جہاں سے پانی اُبلنے لگے، بہر حال کسی معاملہ میں جد وجہد کو اس کے آخری حدود تک پہونچا دینا، بخع کے عربی لفظ کا صحیح مفہوم یہی ہے۔

لفظ "اسف" کی تشریح تیسرا لفظ اسف کا ہے، غم واندوہ اس کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے، مگر سچی بات یہ ہے کہ غم واندوہ حزن وملال کی ایک تو عام کیفیت ہوتی ہے، لیکن یہی کیفیت جب آخری شکل اختیار کر لیتی ہے جس کے بعد قلبی کلفت اور بے چینی کا کوئی درجہ سوچا نہیں جا سکتا، تب اسف کے لفظ سے قلب کی اس کیفیت کا اظہار کیا جاتا ہے، اسی لئے ایسی زمین جس میں روئیدگی کی صلاحیت قطعی طور پر فنا ہو گئی ہو، عربی میں، اس کو ارض اسفہ کہتے ہیں۔

خلاصہ آیت ان لغوی تشریحات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ سیدھے اور سادہ الفاظ میں مندرجہ بالا آیت کا خلاصہ یہی ہو سکتا ہے کہ قرآن پر ایمان لا کر قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اپنے علم وعمل کی تصحیح سے عیسائی قوم اگر محروم رہ گئی، تو خود [اپنے اوپر] نہیں بلکہ عقیدۂ ولدیت رکھنے والی اور اس پر اصرار کرنے والی یہ امت، اپنے پیچھے جن نتائج وعواقب یا آثار کو پیدا کر کے دنیا میں چھوڑتی چلی جائے گی ان پر، ان کے تصور سے صاحب وحی هبطِ قرآن محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اندر غم والم کرب وقلق کی ایسی غیر معمولی کیفیت کا طوفان برپا تھا کہ اس راہ میں اپنا سب کچھ حتیٰ کہ اپنی زندگی اور جان تک کو قربان کرنے پر آپ آمادہ تھے۔

یہ ہے حاصل اور خلاصہ قرآنی الفاظ کا، اب ظاہر ہے کہ قرآن میں العیاذ باللہ شاعری نہیں کی گئی ہے بلکہ جو حقیقت تھی صحیح صحیح جنچے تلے الفاظ میں اسی کا اظہار کیا گیا ہے، اور اسی سے آگاہی بخشی گئی ہے۔

"آثارہم" کی تاریخی تفصیل پس آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ نفسیاتی کیفیت اگر واقعہ تھا، اور واقعہ کے سوا کسی دوسرے پہلو کا احتمال ہی کیا ہے، تو سوال یہ ہوتا ہے کہ "عقیدۂ ولدیت" کے وہ مہیب روح فرسا، جان گداز آثار ونتائج کیا تھے، جن سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس حد تک متاثر تھے، یقیناً وہ چلتی پھرتی کوئی معمولی بات نہیں ہو سکتی۔ اور اسی لیے میں نے عرض کیا کہ اس آیت میں سب سے زیادہ توجہ وتامل کا مستحق "آثارہم" کا جزو ہے، اور اب میں اسی "آثارہم" کی تھوڑی بہت تفصیل کرنا چاہتا ہوں، جس سے معلوم ہوگا کہ آثار، اور ہم ان دو لفظوں میں درحقیقت نسلِ انسانی کے ایک خاص طبقہ کی ایک طویل تاریخ کو بند کر دیا ہے۔

عقیدۂ ولدیت کو کیسے منوایا گیا؟ مطلب یہ ہو کہ "عقیدۂ ولدیت" یا کسی مخلوق کو خدا کا بیٹا ٹھہرانا خواہ آدمی کے عقلی اور جذباتی اقتضاؤں کے لیے جس حد تک ناقابل برداشت ہو، دماغ سے بھی ٹکرا کر یہ خیال واپس ہو جاتا ہو، اور دل بھی اسے اگل دیتا ہو۔[1]

---

[1] کلمة تخرج من افواههم (بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہو) اس میں (باقی اگلے صفحہ پر)

مگر کیا کیجئے آدمی جب طے ہی کر لیتا ہے کہ ہم کسی چیز کو بہر حال مان ہی کر رہیں گے، تو کوئی نہ کوئی راہ اس کی نکال ہی لیتا ہے۔

مذہب کے متعلق ایک مسلّمہ مذہب کے متعلق اتنی بات تو بہر حال مسلّم ہے کہ حواس و عقل کے حدود جہاں ختم ہو جاتے ہیں وہیں سے راہ نمائی کا فرض مذہب ادا کرتا ہے، فطرتِ انسانی کے جن بنیادی سوالوں کے جواب عقلی دسترس سے باہر ہیں، ان کے حل کا ذمہ دار مذہب ہے، یہ ایک واقعہ ہے اور مذہب کی ضرورت اس کے اسی فرض کی بجا آوری میں پوشیدہ ہے، اسی واقعہ کی تعبیر میں عموماً کہنے والے اس قسم کی باتیں کہہ دیتے ہیں کہ "مذہب یا دین وراء طور عقل ہے" یعنی عقل سے بالاتر حدود کے سوالوں کے جواب سے اس کا تعلق ہے، لیکن ظاہر کہ اس کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا اور نہ ہے کہ بشری جبلت کی بے چینیوں کی تسکین کا جو سامان اپنے پیش کردہ جوابوں سے مذہب کرتا ہو یہ ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کے ماننے کی گنجائش آدمی کی عقل اپنے اندر نہیں پیدا کر سکتی۔

[بلکہ مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ] جن بنیادی سوالوں کو ہم مذہب کی روشنی میں حل کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ، ان سوالوں کے جوابوں کے علم یا جاننے کا ذریعہ نہ ہم اپنے حواس کو بنا سکتے ہیں اور نہ اپنی عقل کو، لیکن ایمان یعنی ان جوابوں کے ماننے کی صلاحیت ہم میں ہونی چاہیئے، ورنہ جن باتوں کے ماننے کی بھی صلاحیت ہم میں نہ ہو گی تو ان ہی پر ایمان لانے یا ان کے ماننے کا مطالبہ مذہب کی طرف سے کیسے پیش ہو سکتا ہو؟ کیا آنکھ کو سننے کا اور کان کو دیکھنے کا مکلّف بنایا جا سکتا ہے؟

مسیحیوں کا نرالا اصول مذہب اور مذہبی حقائق و امور کے متعلق مذکورہ بالا اصول ایک ایسی جانی بوجھی بات ہے کہ مختلف مذاہب کے مقابلہ و موازنہ میں عموماً دنیا اسی اصول سے کام لیتی رہی ہے لیکن اسی یورپ میں [جس نے پچھلے دنوں، مذہبی امور کو ماننے کے لیے، عقل و حواس سے ان کو جاننے کی شرط کا فتنہ اٹھایا ہے] اسی مسئلہ کا سہارا لے کر کہ مذہب میں عقل کو دخل ہے یا نہیں، ایک مدت تک نفی کے پہلو کو متعین کر کے یہ باور کرایا جا رہا تھا کہ مذہب کی سچائی کی دلیل یہ ہے کہ اس کی تعلیمات کے ماننے کی صلاحیت بھی آدمی کی عقل و فطرت میں نہ ہو۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰) "افواہ" یعنی منھ کی طرف جو اس کو منسوب کیا گیا ہے، اس میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہو کہ اس عقیدہ کا تعلق نہ دل سے ہو اور نہ دماغ سے، بلکہ عقیدہ رکھنے والوں کے منھ سے ایک بات نکلتی ہے، ابتدا بھی اس کی منھ سے ہو اور انتہا بھی منھ سے آگے اس کی نہیں ڈھونڈی جا سکتی۔

کہا جاتا تھا کہ اس معیار پر سب سے بڑی صداقت "عقیدۂ ولدیت" ہے اسی کی جامع تعبیر یہ تھی کہ "تین ایک ہے اور ایک تین ہے" یہی دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے، اس لیے سب سے بڑی سچائی ہے کہ عقل ہو یا فطرت اس کے ہضم کرنے سے قطعاً معذور ہے۔ یوں سب سے بڑے جھوٹ کو سب سے بڑی سچائی کا قالب عطا کر دیا گیا۔

بہرحال اسی کا نتیجہ یہ ہوا اور اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا تھا کہ ایسا مسئلہ جو دماغ کے لیے بھی ٹھیس اور دل کے لیے بھی صرف ٹھوکر ہو، وہ ماننے والوں کے "افواہ" یا دہنی دائرے ہی میں گھومتا رہے۔

عقیدۂ ولدیت اور کلیسا — اگر خود یہ مسئلہ تو "افواہ" کے چکروں ہی میں گھومتا رہا، لیکن اس سے پھوٹ کر جڑوں، جڑوں کے باریک باریک ریشوں اور رگوں کا ایک طویل سلسلہ اندر ہی اندر ماننے والوں میں بڑھتا اور پھیلتا رہا، اور جوں ہی کہ کچھ سازگار حالات میسر آئے ان ہی جڑوں سے شاخیں نکلیں، برگ و بار آئے، آخر میں

"کلیسا"

کے نام سے مذہبی دنیا میں ایک ایسے تناور بلند و بالا گھنے درخت کی شکل اس نے اختیار کر لی جس کی نظیر مذاہب و ادیان کی تاریخ میں نہ پہلے ملتی ہے اور شاید اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے بعد کو بھی اس کی مثال مشکل ہی سے ڈھونڈھی جا سکتی ہے۔

بظاہر عیسائی دنیا کلیسا کی اس چھاؤں کے نیچے سمٹی ہوئی سمجھی جاتی تھی، لیکن درحقیقت وہ ان جڑوں میں جکڑی ہوئی تھی، جو اندر ہی اندر پھوٹتی اور بڑھتی ہوئی زنجیروں، لوہے کی زنجیروں کی طرح سر سے کر پاؤں تک عیسائیوں کے ظاہر و باطن کے ساتھ چمٹ گئی تھی۔

کلیسائی نظام اور یورپ میں دین صلیبی کے داخلہ کی سرگزشت — "کلیسا" کا نظام کیسے قائم ہوا، ابتداء اس کی کس شکل میں ہوئی، یہودیوں یا اولادِ اسرائیل کے محدود دائرے سے نکال کر عیسائیت کے پیغام کو یورپ کی غیر مختون غیر اسرائیلی قوموں میں پہونچانے میں تدبیر کرنے والوں نے کن کن گفتہ و ناگفتہ بہ تدبیروں سے کام لیا۔ شاؤل جس کا نام بعد کو پولس اور آج کل سینٹ پال ہے، یہ شخص کون تھا، ایشیا کوچک کے صوبہ کلکیہ کے شہر ترسیس (اپنے مولد) سے یہ فلسطین کیسے پہونچا، اور وہاں یہودی علماء کے وفادار شاگرد کی صورت اختیار کر کے مسیح کے ماننے والوں پر مظالم کے پہاڑ پہلے جو اس نے توڑے، اور آخر میں عیسائیوں کو ستانے کے لیے ہیکل کے یہودی علماء کے تصدیقی خطوط لے کر جب وہ دمشق جا رہا تھا تو اچانک اس کا یہ دعویٰ کہ مسیح علیہ السلام کی روح اس پر متجلی ہوئی، اور غیبی آواز آئی۔

"اے شاؤل اے شاؤل تو مجھے کیوں ستاتا ہے"

پھر جیسا کہ اس کا بیان ہے اُس کے یہ پوچھنے پر اے خداوند تو کون ہے؟ اُسے یہ جواب ملا، کہ:۔

"میں یسوع ہوں، جسے تو ستاتا ہے، مگر اُٹھ شہر میں جا، اور تجھے
جو کرنا چاہیئے، وہ تجھ سے کہا جائے گا۔" (اعمال ۹/۱-۵)

پھر بجائے دشمن کے مسیحیت کا مبشر اور منادی کرنے والا وہ کیسے بن گیا؟ کہاں کہاں پھرا، اور آخر میں بعہد شاہ نیرو رومیوں کے دارالسلطنت رومۃ الکبریٰ میں قیدیوں کی شکل میں وہ کیسے پہونچا، وہیں وہ مارا گیا، دفن ہوا، پھر اس کے مدفن اور اس کے ساتھ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواری پطرس[1] کی جعلی قبر کا دعویٰ کر کے رومہ میں عیسائیت کا مرکز کیسے قائم کیا گیا، جس نے آخر میں "کلیسائے رومہ" کا نام پایا۔ اور اسی رومی کلیسا کی اجتماعی طاقت کا شخصی مظہر یا اقتدار اعلیٰ پوپ کے نام سے گدی پر کیسے آگیا۔ پھر ایک کے بعد ایک اسی طرح پوپوں کی جانشینی کا سلسلہ شروع ہوا، رفتہ رفتہ بالآخر کلیسائے روم کے پوپ کا اقتدار مطلق، اور اسکے غیر محدود اختیارات عروج کے اس نقطہ تک پہونچ گئے کہ ان کے آگے عوام تو عوام سلاطین اور بادشاہوں کی بھی نہیں چلتی تھی، یورپ کے عیسائیوں کی جان ومال عزت وآبرو کے مالک پوپ اور پوپ کے وہ نمائندے تھے جو اس ملک کے طول وعرض میں گرجے بنا بنا کر کیڑوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے، سب کماتے تھے، اور وہ کھاتے تھے۔

یہ سارے سوالات ایسے ہیں جن کے جواب کے لیے ہزارہا ہزار صفحات کی ضرورت ہے، تفصیل کے لیے تو یورپ کی عام تاریخ اور کلیسائے رومہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیئے، لیکن بطور نمونہ کے چند تاریخی شواہد کا پیش کر دینا غالباً ان لوگوں کیلئے مناسب ہوگا جنھوں نے "دین صلیبی" اور یورپ جس صورت حال سے اس دین کے داخل ہونے کے بعد دوچار ہوا، اس کی تاریخی تفصیلات کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔

---

[1] کلیسائے رومہ کی عظمت کا زیادہ تر دارومدار مدت تک پطرس کا مصنوعی مدفن تھا، لیکن حال میں اس خیال کو غلط ٹھہرایا گیا ہے، اب سمجھا جاتا ہے کہ پطرس عراق اور ایران کے درمیانی علاقوں میں عیسائیت کا پرچار کرتے ہوئے کہیں مر گیا، سینٹ پال اور پطرس میں اختلافی نقطۂ نظر یہی تھا کہ پال کے نزدیک "حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا مان لینا" محض یہی نجات کے لیے کافی ہے۔ لیکن پطرس موسوی شریعت کے احکام کی تعمیل ضروری قرار دیتا تھا، جرمنی کے ارباب تحقیق کچھ دن ہوئے اس نتیجہ تک پہونچے ہیں کہ سینٹ پال کی ساختہ پرداختہ عیسائیت، حضرت مسیح علیہ السلام کی پیش کردہ عیسائیت سے مختلف تھی، اور یہ اختلاف شروع ہی سے چلا آرہا تھا۔

(دیکھو تاریخ بائبل ٹیلکی ترجمہ طالب الدین ص۱۰۵)

کلیسا کا غیر معمولی اقتدار اور عجیب و غریب ہتھکنڈے

مختصر یہ ہے کہ تقریباً تین سو سال تک تو سینٹ پال کا پھیلایا ہوا "صلیبی دین" اور نظریہ ولدیت کے ساتھ کفارہ کا مسئلہ[1]، اندر ہی اندر یورپ کے باشندوں میں پھیلتا رہا۔ بت پرست رومی حکومت نے اس جدید دینی تحریک کی مخالفت میں اپنا آخری زور صرف کر دیا، مگر جتنا اس کو دبایا جاتا تھا اسی قوت کے ساتھ یہ تحریک آگے بڑھتی چلی جاتی تھی۔ تا اینکہ تین سو سال بعد کہتے ہیں کہ بت پرست رومی بادشاہ قسطنطین نے بالآخر یہی فیصلہ کیا کہ خود اس دین کو وہ قبول کر لے، گویا یوں رومی حکومت بجائے دشمن کے صلیبی دین کی دوست اور پشت پناہ بن گئی۔ حکومت کی اسی پشت پناہی کے زیر اثر رومہ کے کلیسا کا اقتدار غیر معمولی طور پر بڑھنے لگا۔

جعلی وثیقہ یورپ کی مستند تاریخ جس کے مصنف گرانٹ صاحب ہیں اپنی کتاب میں انھوں نے چند وثائق کا تذکرہ کیا ہے جن کے متعلق کلیسائے رومہ کا دعویٰ تھا کہ وقتاً فوقتاً رومی حکومت کی طرف سے اسے عطا ہوئے جن میں ایک مشہور قدیم وثیقہ وہی ہے جس کا نام "عطیہ قسطنطین" تھا، گرانٹ صاحب نے اس کا ترجمہ یہ درج کیا ہے :۔

> "شاہنشاہ کانس ٹن ٹائن (قسطنطین) وفادار، رحمدل، قادر و نیک منش بادشاہ اقوام المانی و سریانی و جرمانی و برطانی و ہونی، پارسا و خوش نصیب و فتح و غازی و ذی شان، مرض جذام میں مبتلا تھا، اور بت پرست پجاریوں نے اس کو مشورہ دیا تھا کہ معصوم بچوں کے خون میں نہائے بغیر اسے صحت نہیں نہیں ہو سکتی، مگر سینٹ پال اور سینٹ پیٹر کی دعاؤں سے اُسے صحت حاصل ہوئی، اور صحت یابی کے شکریہ میں اس نے حکم دیا کہ کلیسا رومہ کا "قسیس اعلیٰ" تمام دنیا کے قسیسوں کا سردار ہوگا، اور پوپ سلوسٹر ہمارے محلات رومہ

---

[1] کہا جاتا تھا کہ ایک گناہ کی دو سزائیں خدا کی طرف سے نہیں مل سکتیں، اپنے ماننے والوں کے گناہ کی سزا میں مسیح جب ایک دفعہ صلیب پا کر سزا جھیل چکا تو ماننے والوں کو ان کے اِن ہی گناہوں کی سزا دوبارہ کیسے دی جا سکتی ہے۔ یہی کفارہ کا مسئلہ ہے ـــــ مسیحی دنیا میں یہ سوال و جواب یعنی "میں کیا کروں کہ نجات پاؤں؟" "تو مسیح یسوع پر ایمان لا تو بچ جائے گا" ایک عام زبان زد خلق کی حیثیت سے مشہور ہو۔ ۱۲ [یہ حاشیہ اس سے پہلے ایک مقام پر کفارے کے متعلق مولانا مرحوم نے تحریر فرمایا تھا وہ مقام حذف کر دیا گیا ہے اور وہاں کے حاشیہ کو مسئلہ کفارہ کی توضیح کے لیے یہاں درج کر دیا گیا ہے۔ ع]

اور خود شہر رومہ اور اطالیہ کے تمام اضلاع اور صوبوں اور ممالک غرب (یورپ) پر قابض رہے گا"۔

گرانٹ صاحب نے لکھا ہے، اسی عطیۂ قسطنطین کے آخر میں یہ الفاظ بھی تھے:۔

"ان احکام میں ختم عالم تک کسی قسم کی ترمیم یا تغیر نہ کیا جائے"

(دیکھو گرانٹ کی تاریخ یورپ صـــ۲۰۲ــ ترجمہ اردو دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ)

مطلب یہ تھا کہ رومہ جہاں دعویٰ کیا جاتا تھا کہ، حضرت مسیح علیہ السّلام کے براہ راست صحابی یا حواری پطرس جن کا اصلی نام شمعون تھا، اُن کی درگاہ ہے، اور اسی کے ساتھ پولس یعنی سینٹ پال کا مدفن بھی وہیں بتایا جاتا تھا۔ [ان] دونوں درگاہوں کے مجاوروں کی طرف سے بادشاہ کو خوش خبری صحت کی سنائی گئی، صحت کے بعد یہ صلہ شاہی دربار سے ملا ـــ گرانٹ صاحب نے لکھا ہے کہ:۔

"پندرھویں صدی عیسوی تک جب تک یورپ میں پھر علوم کا دور دورہ نہ ہوا کسی میں ہمت نہ تھی، کہ اس تحریر کو جعلی قرار دے، یا اس کی صحت میں شک و شبہ کرے"۔

(صـــ۲۵۱ــ کتاب مذکور)

بعد کو جو کچھ ہوا اس کا قصہ تو آگے آرہا ہے، اتنی بات تو عرض بھی کر چکا ہوں کہ عیسیٰ علیہ السّلام کے حواری پطرس کی درگاہ ہی کو اس زمانے میں غرضی قرار دیا گیا ہے۔ لیکن بقول گرانٹ صاحب ۸۶۰ئـ جس میں مذکورہ بالا وثیقہ کا اعلان کلیسا کی طرف سے کیا گیا تھا، اس وقت سے ہزار بارہ سو سال تک اس کے متعلق شک کا خیال بھی ارتداد و کفر کے ہم معنے تھا۔

اقتدار کی انتہا | اور ایک یہی کیا، اسی قسم کے بیسیوں ذرائع مسلسل اختیار کیے گئے تا آنکہ بقول گرانٹ صاحب گیارھویں صدی عیسوی کے مشہور پوپ گریگوری ہفتم کے زمانہ میں کلیسا کی طرف سے یورپ کے حکمرانوں اور سلاطین و امراء عام باشندوں کو خطاب کرکے یہ اعلان شائع کردیا گیا، کہ:۔

"پاپائے رومہ کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں، اس کے افعال پر حرف گیری کرنے والا کوئی نہیں، کلیسائے رومہ کو نہ کبھی دھوکہ ہوا ہے اور نہ ہوگا"۔

اسی میں یہ بھی تھا کہ:۔

"پوپ کو شہنشاہوں کے معزول کرنے کا اختیار ہے، انسانی نخوت نے بادشاہوں کی قوت پیدا کی، اور خدا کے رحم نے بشپوں کی قوت پیدا کی"۔

"پوپ شاہنشاہوں کا آقا ہے۔"

(کتاب مذکور ص ۲۶۹)

اور یہ صرف دعوی ہی نہ تھا جنھوں نے یورپ کے قرون متوسطہ کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہی واقعہ بھی تھا، اس قسم کی تحریریں جیسا کہ گرانٹ ہی نے لکھا ہو عموماً پوپوں کی طرف سے بادشاہوں کو دھمکانے کے لیے شائع ہوتی رہتی تھیں، کہ:۔

"خدا نے ہمیں (یعنی پوپ اور پوپ کے چیلے چانٹوں کو) بادشاہوں اور شہنشاہوں کا سرتاج بنایا ہے تاکہ ہم اس کے نام سے جسے چاہیں اکھاڑ پھینکیں، تباہ کر دیں، اور اگر چاہیں تو تخم ریزی کریں، اور نئی عمارت بنائیں۔"

یہ دعوی بھی کیا جاتا تھا، کہ:۔

"اگر دنیاوی حکومت سے غلطی ہو جائے تو روحانی حکومت اس کی اصلاح کر سکتی ہے، اور اگر روحانی حکومت سے کوئی غلطی سرزد ہو، تو اس کا انصاف کرنے والا خدا ہے۔"

اور یوں یورپ کی ساری دنیاوی حکومتوں کے حکمران، روحانی حکمران یعنی پوپ اور پوپ کے نمائندوں کے آہنی پنجوں میں اس طرح دبے ہوئے تھے کہ بلا چون وچرا پوپ کے احکام کی تعمیل کرتے چلے جائیں، اس کے سوا ان کے لیے کوئی چارہ باقی نہ رہا تھا۔

عام رعایا برایا ان ہی حکمرانوں کے قبضے میں تھی، اس لیے نتیجۃً یورپ کے عام باشندے کلیسا کے احکام سے سرتابی کی جراءت نہیں کر سکتے تھے۔

عوام کو براہ راست قابو میں لانے کے ہتھکنڈے

ماسوا اس کے "اعتراف گناہ" کا ایک طریقہ بھی کلیسا کی طرف سے عوام میں جاری کیا گیا تھا پوپ کے نمائندے ملک کے طول وعرض میں بیس بیس دو دو میل کے فاصلوں سے اپنے تھانے "چرچ" بنائے بیٹھے رہتے تھے، ان کا کام یہی تھا کہ توبہ کرنے والوں کے گناہوں کی فہرست کی خلوت میں ساحت کریں اور جو معاوضہ طے ہو جاتا تھا اس کو لے لے کر مغفرت اور بخشش کا لائسنس توبہ کرنے والوں کو عطا کیا جاتا تھا، اس مغفرت نامہ کو تاریخوں میں آج بھی لوگ نقل کرتے ہیں جو مقامی گرجوں سے توبہ کرنے والوں کو عطا کیا جاتا تھا، جو یہ ہوتا تھا کہ:۔

"ہمارا رب مسیح تجھ پر رحم کرے، اور جن مقدس تکلیفوں کو اٹھا کر حقوق مسیح کو

جو حاصل ہوئے ہیں، ان کے معاوضہ میں تیرے گناہ معاف ہوں۔"

مغفرت نامہ کی پیشانی کی اس عبارت کے بعد آگے یہ ہوتا تھا کہ:۔

"پس معلوم ہو کہ مسیح کے رسولوں پطرس و پولس اور جلیل القدر پوپ کی حکومت نے اس خاص علاقے میں جو یہ اقتدار مجھے بخشا ہے کہ تمہارے ان گناہوں کو میں معاف کر دوں، جو تم سے صادر ہو چکے ہیں، یا کلیسا کی طرف سے تم پر عائد ہوتے ہیں، خواہ وہ جیسے کچھ ہوں، اور جو کچھ بھی ہوں، نیز ایسے سارے گناہ جن کے بخشنے اور جن کی بندش سے کھولنے کا اختیار پوپ صاحب کو ہے، وہ سب تیرے بخشے گئے۔ اسی طرح "کلیسائے رومہ" کی کنجی جتنی دراز ہے، اسی کی نسبت سے تیرے ایسے گناہ بھی معاف کیے گئے جو آئندہ تجھ سے سرزد ہوں۔ اب میں تجھے کلیسا کے رموز اور اسرار میں شریک کرتا ہوں، اور جس وحدت کو کلیسا نے پیدا کیا ہے، وحدت کے اسی دائرے میں تجھے داخل کرتا ہوں۔

آخر میں لکھا ہوتا تھا، کہ:۔

اب جو تو مرے گا، تو عذاب کے دروازوں کو اپنے اوپر بند پائے گا، اور فردوس بریں کے دروازوں کو اپنے اوپر کھلا پائے گا۔ بہر حال جس زمانہ میں بھی تو مرے گا تو اس "مغفرت نامہ" کی تاثیری قوت سے، ہمیشہ باپ، بیٹے اور روح القدس کے نام سے تو مستفید ہوتا رہے گا۔" (۱)

(منقول از اظہار الحق عربی ص ۳۹/۲)

مغفرت ناموں پر باضابطہ فیس کی ابتدا اگرچہ صلیبی لڑائیوں کے زمانہ میں کہتے ہیں کہ ہوئی، لیکن جب رواج پڑ گیا تو اس کی تجارت نے رفتہ رفتہ سارے یورپ میں غیر معمولی فروغ حاصل کیا۔

خلاصہ یہ ہو کہ سلاطین کے عزل و نصب کے مسئلہ کو قابو میں لانے کے ساتھ "اعتراف جرم" کے پردے میں لوگوں کی شخصی زندگی کی کمزوریوں کا علم کلیسا کے پاس ایک ایسا شکنجہ تھا کہ پادری سب کچھ کر رہے تھے، عوام دیکھتے تھے، مگر کچھ بول نہیں سکتے تھے، عوام کا مال، ان کی جان، اور آخر میں عزت و ناموس سب پر اطلاقی تصرفات کا اقتدار پادریوں کو حاصل تھا۔

گندی رہبانیت | کلیسائی رہبانیت کا تذکرہ کرتے ہوئے، قرآن میں

کا جو اعلان کیا گیا ہے، اس قرآنی آیت کی تفسیر سے یورپ کی تاریخیں معمور ہیں۔ موشم نے تاریخ کلیسا میں لکھا ہو کہ:۔

"متاہل اور شادی شدہ لوگوں پر مانا جاتا تھا، کہ شیطان کا اثر ہے اس لیے جو لوگ کلیسا میں عہدہ حاصل کرتے تھے، وہ شیطانی اثر سے محفوظ رہنے کے لیے شادی نہ کرتے تھے، اسی طرح عورتیں بھی تجرد کی زندگی اختیار کرتی تھیں۔"

مگر اس ابتداء کی انتہا کیا ہوئی، موشم ہی کا بیان ہے:۔

"لیکن یہ ساری باتیں صرف دکھاوے کی تھیں، مجرد مردوں کے بستر رات کو مجرد عورتوں سے آباد نظر آتے تھے، یہ عورتیں مردوں کی ناجائز خواہشوں کو پورا کرتی تھیں۔"

اسی نے لکھا ہے، کہ:۔

"ایک عورت معمولاً ایک مرد کے تصرف میں نہیں رہتی تھی، آج ایک عورت آئی تو کل دوسری، اسی طرح درپردہ یہ سلسلہ قائم رہتا، مگر بظاہر یہی کہا جاتا تھا کہ مجرد مرد اور مجرد عورتیں اپنی پارسائی اور عفت کو قائم رکھتی ہیں۔"

"مقدس کلیسا" کی ان اندرونی غلاظتوں اور گندگیوں کا مشاہدہ اور تجربہ کبھی کبھی بعض نیک دل پادریوں کو بھی بے چین کر دیتا تھا۔ برنردوس نامی اسقف کی ایک نظم اس سلسلہ میں خاص طور پر مشہور رہی ہے، جس کے ایک شعر کا ترجمہ ہے:۔

"نکاح کے معزز اور پاک آئینی طریقہ کو کلیسا سے خارج کر دیا گیا، جس سے پاک خوابگاہ آدمی کو میسر آتی تھی، اور بجائے اس کے کلیسا کی خوابگاہوں کو عیاشی کا چکلہ بنا دیا گیا ہے، .... جن چکلوں میں مرد اور عورتیں جو ماں اور بہنیں ہیں، ہر قسم کے گندہ حرکات کا ارتکاب کرتے ہیں۔"

ایک پرتگالی پادری الفاروس بلاجوس نامی نے مغربی ممالک کے عام کلیساؤں کی ان ہی اخلاقی زبوں حالیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے، خصوصاً اسپین کے متعلق لکھا ہے، کہ:۔

"کاش! ایسا ہوتا کہ کنوارے رہنے کا جو عہد کلیسا میں شریک ہونے والوں سے لیا جاتا ہو، یہ عہد نہ لیا جاتا، آج اسی عہد کا نتیجہ یہ ہے کہ اسپین کے عام باشندوں کے بچوں میں زیادہ اکثریت کلیسا کے مذہبی خدام کی ہے۔" (اظہار الحق ج۔۲۔ عربی)

الغرض کلیسا کی "رہبانیت" باہر سے جیسی کچھ بھی نظر آتی ہو، لیکن بہ تدریج اندر ہی اندر یہی "رہبانیت" "فسق کی اکثریت[عہ]" کے قالب میں ڈھل گئی۔ قرآن کا یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی تائید سے کلیسا کی تاریخیں لبریز ہیں۔

پوپ کا فرعونی اقتدار | ان اندرونی گندگیوں، اور غلاظتوں کے ساتھ اسی کلیسا کی قوت کے بدولت باہر میں "پوپ" کا لاہوتی اقتدار بڑھتے ہوئے اس نقطہ تک پہونچ گیا تھا کہ کلیسا کی طرف سے فرنسیس زابادلا جو پوپ کی مجلس خاص (ڈیکن) کا کرڈینال[لہ] تھا، اسی نے یہ اعلان عام کر دیا تھا، کہ:-

"پوپ کو حق حاصل ہے کہ جو کچھ اس کے جی میں آئے کرے، تا اینکہ خدا نے جن چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے، پوپ چاہے تو ان کو حلال قرار دے سکتا ہے۔"

آخر کے الفاظ (العیاذ باللہ) اس "اعلان عام" کے یہ تھے، کہ:-

"پوپ (کا اقتدار) خدا سے بھی بڑھا ہوا ہے[سہ]۔"

اور آئے دن پوپ اپنے اس فرعونی اقتدار سے عموماً کام لیا کرتا تھا۔ پروفیسر میکائیل (میخائل)، کی عربی کتاب جو بیروت میں سنہ ۱۸۵۲ء میں چھپی ہے، اس میں آپ کو طویل فہرست ان چیزوں کی ملے گی، جن میں پوپ نے اپنے اقتدار سے ردوبدل کیا تھا۔ میخائل نے لکھا ہے، کہ:-

"روپیہ لے کر حرام کو حلال، حلال کو حرام کر دینا یہ پوپ کا عام دستور تھا۔"

کمائی کے طریقے | مغفرت نامہ کی تجارت، یا حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرانے کا مقدس معاوضہ، اور عام نذور و نقود اوقاف وغیرہ وغیرہ کی آمدنی کے بے شمار ذرائع کے سوا "یہ شاعری نہیں واقعہ ہے کہ خدا کی رحمت تبرا اور بآؤ کے حساب سے کلیسا اور کلیسا کے نمائندوں کی طرف سے عموماً بکتی تھی۔ عام قاعدہ تھا کہ سکرات موت کے وقت علاقہ

عہ دکثیر منہم فاسقون۔ ع

لہ کلیسائی نظام میں مختلف عہدوں کے مختلف نام تھے، اسقف جو یونانی لفظ کا معرب ہے، یہ سب سے بڑا عہدہ تھا، انگریزی میں اسی کو "آرچ بشپ" کہتے ہیں۔ اسقفوں کے بعد قسیس، قسیس کے بعد بشپ اور پریسٹ کا درجہ تھا۔ پوپ کی کونسل اعلیٰ کا نام ڈیکن تھا، جس کے ارکان کی تعداد ستر تھی، اس کونسل اعلیٰ کے ہر رکن کو "کارڈینال" کہتے تھے۔ ۱۲

سہ اظہار الحق عربی ج ۲ ص ۳۷ ۔ ۱۲

سہ چرچ کے ساتھ کسی سینٹ (ولی)، یا شہیدوں کی قبروں کا جال ملک کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا، اور یہ عجیب بات تھی کہ ہر تازہ مردہ بہ نسبت پرانے مرنے والوں کے عقیدت و نیاز کی مرکزیت میں آگے بڑھ جاتا تھا۔ انگلستان کی تاریخ میں لکھا ہو کر ص ۱۳۶ پر)

کے پادری کا مرنے والے کے سرہانے رہنا ضروری تھا۔ کوئی جاگیردار مر رہا ہے، پادری صاحب بلائے گئے ہیں مراقبہ میں ان کو محسوس ہوا کہ مرنے والے کی روح کو لینے کے لیے سیاہ سیاہ آتشیں آنکھوں والی خبیث روحیں اتر رہی ہیں۔ پادری اس حال سے لوگوں کو مطلع کرتا ہے، پھر کیا کیا جائے؟ کلیسا کے نام سے جائداد وقف کی جائے، اور منت مانی جائے، یہ کیا جائے وہ کیا جائے! جب سارے مراحل طے ہو جاتے تب پھر پادری سر بگریباں ہو جاتا، اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ بشارت سناتا کہ خبیث روحیں واپس ہو گئیں، اور مجھے دکھایا گیا کہ نورانی ہستیاں پاک روحیں اب اتر رہی ہیں۔

الغرض گوناگوں نت نئے طریقے کلیسا کی طرف سے اس لیے تراشے جاتے تھے کہ ملک کے باشندوں کی کمائی ہوئی آمدنی کسی نہ کسی طرح کلیسا کے حکام اور خدام کے پیٹ میں اترتی چلی جائے۔

بالکل نرالی ابلہ فریبیاں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غریب عوام کی مذہبی زود اعتقادیوں سے ناجائز نفع اٹھانے والے دنیا کے اکثر مذاہب و ادیان میں پیدا ہوتے رہے ہیں، اور کسی نہ کسی شکل میں آج تک ابلہ فریبیوں کا یہ سلسلہ دنیا میں جاری ہے، لیکن دین صلیبی میں کلیسا اور پوپ کے نام سے جو نظام قائم ہوا تھا اس کی نوعیت "ابلہ فریبیوں" کے اس عام قصے سے قطعاً الگ تھلگ تھی، اسی لیے باوجود اہتمام اختصار کے مجھے کچھ تفصیل سے کام لینا پڑا جس سے کلیسا اور پوپ کے غیر معمولی اقتدار کا کچھ اندازہ پڑھنے والوں کو ہو سکتا ہے۔

دوسرے مذاہب و ادیان میں زیادہ سے زیادہ یہ دیکھا گیا ہے کہ وقت کے حکمرانوں پر کسی "مذہبی شخصیت" کا اثر قائم ہوا، اور اس "اثر" سے اچھا یا برا کام اپنے اپنے وقت پر لینے والے لیتے رہے۔ لیکن یورپ کے "دین صلیبی" کا کلیسائی نظام شخصی نظام نہ تھا، بلکہ وہ باضابطہ ایک ایسا مستقل نظام تھا کہ ہزار بارہ سو سال تک بقول مسجوک

"شہنشاہی اور پاپائی کی مثال علی الترتیب "چاند اور سورج" سے دی گئی ہو"۔

(کتاب ارتقائے نظم حکومت صفحہ ۲۶۲ ج ۱)

(صفحہ ۱۳۵ کا بقیہ حاشیہ) صلیبی لڑائیوں کے بھگوڑوں نے "خیرے بدھو گھر کو آئے"، اسی خوشی میں انگلستان کی قربان گاہوں یادگاہوں اور چرچوں میں جو نذریں چڑھائیں، تو طامس بکٹ اسقف جو تازہ مردہ تھا، اسکی قبر پر تو اسّی ہزار تین سو چھبیس [۸۰۳۲۶] روپے چڑھاوے کی آمدنی ہوئی، لیکن اسی کے مقابلہ میں حضرت مریمؑ کی قربان گاہ کے چڑھاوے کی میزان کل تین سو تیس [۳۳۳] روپے تھی، اور اس سے بھی طرفہ ماجرا یہ تھا کہ خود خدا کے بیٹے مسیحؑ کی قربان گاہ پہ اکتیس روپے کی آمدنی ہوئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کے باپ کے نام سے ایک پیسہ بھی نہ آیا۔

جس کا مطلب یہ تھا کہ یورپ کے عام سلاطین و ملوک ہی نہیں بلکہ شہنشاہی کا اقتدار رکھنے والی ہستیوں کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کی قوت، کا نور کلیسائے روم کے پوپ کے نور اقتدار کا عکس ہے، جیسے چاند کا نور آفتاب کے نور کے ساتھ وابستہ ہے۔

مسجوک ہی نے لکھا ہے کہ:-

"سیاسی حکمرانوں کو کلیسا کے مذہبی حکمران کے ماتحت رکھنے کے لیے یہ طے کر دیا گیا تھا کہ اس کا فریضہ نائب عیسیٰ (پوپ) کے ہاتھ میں ہونا چاہیے، کیوں کہ وہی تنہا بادشاہوں اور حکمرانوں سے بالاتر تھا"

کہا جاتا تھا کہ پوپ حضرت مسیح کے حواری کا جانشین ہے، اور پطرس حضرت مسیح کا جانشین تھا، بقول مسجوک

"اس سے یہ دعویٰ نکلا کہ جو حکمران (اور بادشاہ) مقدس پطرس کے جانشین کے احکام کی خلاف ورزی کرے پوپ اسے معزول کر دے، اور اس سے مزید یہ ادعا پیدا ہوا کہ جو صاحب اقتدار معزول کر سکتا ہے وہ نصب اور تقرر سے انکار بھی کر سکتا ہے"

یہی ایک ایسی صورت حال ہے جس کی نظیر یورپ کے "دین صلیبی" کے سوا اور کسی دین میں نہیں مل سکتی۔

ایک ضرورت جسے پورا کرنے کے بجائے اقتدار کو نفسانی اغراض کا آلۂ کار بنایا گیا

اگر کلیسا کے اس اقتدار سے کام لینے والے صحیح کام لیتے تو اس میں شک نہیں جیسا کہ مسجوک نے لکھا ہے کہ:-

"اس بے لگام خود غرض (یعنی شاہی اقتدار کے مطلق العنان حکام) کے لیے کسی نہ کسی تدارک کا ہونا ضروری تھا اور اس کا صاف و سہل علاج یہی معلوم ہوتا تھا کہ قسیسوں (حکام کلیسا) کی طرف سے زجر و توبیخ ہوتی رہے"

مگر آپ دیکھ چکے کہ "کلیسا" کی آڑ لے کر صلیبی دین کے ان نمائندوں نے کتنی گھنونی قسم کی بے دینیوں سے یورپ کو بھر دیا، جان و مال، عزت و ناموس اس ملک کے ہر باشندے کی مذہب کے ان نمائندوں کی حیوانی اور نفسانی خواہشوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔

اہل یورپ کی قدرتی بےچینی لیکن بےبسی کا طویل عرصہ

سال دو سال نہیں، بلکہ چوتھی صدی عیسوی سے مذہبی غارتگریوں کا یہ سلسلہ شروع ہوا، اور ہزار سال سے زیادہ مدت تک دن دونی ترقیوں کے ساتھ اس کے ظلم و تعدی کا دائرہ بڑھتا ہی چلا گیا، فطرت انسانی قدرتاً ان حالات سے جس حد تک بے چین اور مضطرب ہو سکتی ہے اس کا اندازہ ہر

یورپ کے یہ باشندے جنہوں نے صلیبی دین قبول کر لیا تھا، وہ شخص کر سکتا ہے جو انسانی احساسات لے کر پیدا ہوا ہے۔ وہ یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے، دیکھتے رہتے تھے، تڑپتے تھے، تڑپنا چاہتے تھے، لیکن تڑپنے کی بھی گنجائش ان کے لیے باقی نہ چھوڑی گئی تھی، ایک طرف سلاطین و ملوک کی فوجی قوتوں کا دباؤ ان کو ہلنے نہیں دیتا تھا جس کی وجہ ظاہر تھی کہ فوج کی قوت ہو، یا پولیس کی قوت، حکمراں اقتدار کے منشار کی تعمیل کرتی ہے، اور حکمرانی کے اقتدار رکھنے والی طاقتیں چونکہ پوپ یا کلیسا کے غیر مسئول اقتدار کی چٹان کے نیچے ہر جگہ دبی ہوئی تھیں، اس کا لازمی منطقی نتیجہ تھا کہ کلیسا یا پوپ یا پوپی نظام کے تحت کام کرنے والوں کے متعلق لب ہلانے کی جرأت خود اپنے خون اور اپنی جان کے ساتھ بازی گری بنجاتی تھی۔

ایک طرف کلیسا کے ہاتھ میں اس طریقہ سے ملک کی سیاسی باگ آگئی تھی، اور دوسری طرف "اعتراف جرم" کے قصے کی بدولت ہر پادری انفرادی شخصیتوں کی کمزوریوں، جرائم اور لغزشوں کا محرم اسرار بنا ہوا تھا، کلیسا کے خلاف کچھ بولنے کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ اپنے پوشیدہ جرائم کا راز فاش ہو جائے۔ افراد و اشخاص کی گرفت کا یہ ایک ایسا جال تھا جس میں لوگ اپنے آپ کو جکڑا ہوا پاتے تھے۔ پھر رسم و رواج و عادت اس قسم کے عام قوانین کا اقتضا یہ بھی ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ہونے دو، عمومیت[1] میں اسی نوعیت کے اثرات بتدریج پیدا ہو جاتے ہیں، یوں ہی کلیسا کو اپنی من مانی کارروائیوں کے جاری رکھنے کا موقع قرنہا قرن تک ملتا رہا۔

ردعمل کا نشوونما لیکن آخر ہر چیز کی ایک حد بلکہ یوں سمجھئے کہ عمر ہوتی ہے، قدرت جو تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے نشیب و فراز سے گذارتے ہوئے نسل انسانی کو آگے کی طرف بڑھاتی چلی آ رہی ہے، وہی قدرت ہر عمل کے ردعمل کے اسباب و وجوہ کو پیدا کرتی رہتی ہے۔

کلیسا کے بڑھتے ہوئے مذکورہ بالا غیر معمولی اقتدار کے مقابلہ میں ردعمل کا اسباب و علل کے کن کن قالبوں میں قدرت کی طرف سے نشوونما ہونے لگا، اس کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ہے، تاہم اتنی بات تو کھلی ہوئی ہے کہ مظالم اور چیرہ دستیوں کا جو سلسلہ ڈاکوؤں اور چوروں، رہزنوں اور غارتگروں کی طرف سے نہیں، بلکہ دین اور مذہب کے مدعیوں کی طرف سے شروع ہوا تھا، خود اس کی تعبیر ہی میں خرابی کی صورت مضمر تھی، آدمی چوروں اور ڈاکوؤں سے بھی نفرت کرتا ہے، اور ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے، لیکن شیطان شیطان کے لباس میں نہیں بلکہ فرشتوں کے جبوں میں جب سامنے آئے، اور معلوم ہو جائے کہ ان ملکوتی جبوں کے نیچے ابلیسی روحیں پوشیدہ ہیں تو یہ واقعہ ہے کہ جرم و طغیان کے خلاف انسانی فطرت کی برہمی کا پارہ غیر معمولی طور پر زیادہ بہت زیادہ چڑھ جاتا ہو۔ جیسے جیسے کلیسا کے بھیس میں شیطان اپنے پروگرام کو آگے بڑھا رہا تھا، اندر ہی اندر عمومیت کی فطرت میں آتشیں لاوے تیار ہوتے چلے جاتے تھے، اگر جیسا کہ میں نے عرض کیا اندر میں تیار ہونے والے ان لاووں کو باہر نکلنے کے لیے کوئی دہانہ نہیں ملتا تھا، سوراخ پیدا ہوتے تھے لیکن ان کو فوراً جبر و استبداد کی قوتوں سے بند کر دیا جاتا تھا۔

---

[1] عام لوگوں میں۔ ع

صلیبی لڑائیوں کا اثر اسی عرصہ میں کروسیڈ وار یعنی مولد مسیح علیہ السلام کو مسلمانوں کے ہاتھ سے چھڑانے کے لیے صلیبی لڑائیوں کا جو سلسلہ کلیسا کی طرف سے چھیڑا گیا، اور اس راہ میں کامیابیوں سے زیادہ ناکامیوں ہی سے پرستاران صلیب کو عموماً دوچار ہونا پڑا، اور کلیسا کے نمائندوں کی طرف سے بعض ایسی مذبوحی حرکتیں بھی سرزد ہوئیں، جس نے عوام کے پیمانۂ صبر کو لبریز کر دیا[۱]۔ کہتے ہیں کہ ان ہی صلیبی لڑائیوں میں ایک نئے دین اسلام کے نظام کا تجربہ کرنے کا بالواسطہ یا بلاواسطہ موقع یورپ کے کلیسائی باشندوں کو ملا، اسی کے ساتھ یورپ کے بعض قوی پنجہ ذی العزم والارادہ سلاطین (یعنی امرا) کلیسا اور پوپ میں مزاحمت بھی شروع ہوئی، اور یہ مزاحمت آگے بڑھتے ہوئے اپنی آخری شکل تک پہونچ گئی، جس نے کلیسائی نظام کے استحکام کو گونہ متاثر کیا[۲]۔

الغرض یہ اور اسی قسم کے گوناگوں پیچیدہ اسباب پے در پے یکے بعد دیگرے مسلسل پیدا ہوتے چلے گیے کہ اندر اندر کلیسا کے خلاف جو آگ عوام کے سینوں میں سلگ رہی تھی، اور جو آتشیں لاوے پیدا ہو رہے تھے، ان کو منھ بنانے کا موقع مل گیا۔

---

[۱] مطلب یہ ہو کہ پوپ اور اس کے جانشین مسیح کے نام پر یوں تو رفتہ رفتہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں عیسائیوں کو کٹوا ہی رہے تھے۔ اسی سلسلہ میں اسٹیفن نامی گڈریے کے ایک لڑکے نے بعض پادریوں کے مخفی اشاروں سے دعویٰ کیا کہ خدا کا دیدار اس کو نصیب ہوا، اور روٹی ملی، اور حکم دیا گیا ہو کہ کمسن لڑکوں کی فوج تیار کر کے مولد مسیح کی تطہیر کی کوشش کرے۔ یہ ۱۲۱۲ء کا واقعہ ہو۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یورپ کے ہر ہر علاقہ کے خاندانوں سے لڑکے اور لڑکوں کے ساتھ لڑکیاں بھی چنی گئیں، جن کو مردانہ لباس پہنایا گیا، اور جہاد کا اعلان کر کے لڑکوں اور لڑکیوں کی یہ فوج یورپ سے روانہ ہوئی۔ باور کرایا گیا تھا کہ راستہ میں جو سمندر بھی ملے گا، خود بخود خشک ہو جائے گا۔ بہرحال مارسیلز میں عیسائی سوداگروں نے لڑکوں کی اس فوج کو جہازوں پر لاد دیا، اور بے درد تاجروں نے ان غریب بچوں کو مصر میں لے جا کر بیچ دیا۔ دو جہاز نذر طوفان ہوئے۔ لکھا ہے کہ لڑکوں کے ماں باپ روتے تھے، مگر ان کی کوئی کچھ نہیں سنتا تھا۔ اور لڑکوں کی یہ فوج ایک سے زیادہ مرتبہ تیار کی گئی جو راستہ ہی میں تباہ ہوتی رہی ۔۔ ۱۲

[۲] مثلاً جرمنی کے شاہنشاہ فریڈرک، یا انگلستان کے بادشاہ ہنری چہارم، اور اسی قسم کے مختلف سلاطین و ملوک کے جن واقعات کا تذکرہ تاریخوں میں کیا گیا ہے۔ ہنری چہارم کے متعلق لکھا ہو کہ جب ہلڈی براِنڈ نامی پوپ نے ہنری کو ملعون ٹھہرا کر کلیسا بدر ہونے کا حکم دیا، تو ہنری نے بھی پوپ صاحب کو لکھا کہ "تو بظاہر تو پوپ ہو لیکن درحقیقت ایک بدکردار راہب۔ الخ" (دیکھو گرانٹ کی تاریخ یورپ صفحہ ۲۲)

اسی طرح فرانس کے بادشاہ فلپ خوب رونے یا نفیس ہشتم نامی پوپ کے اس فرمان کو جلا ڈالا کہ "پوپ جسے چاہے اکھاڑے، اور جس بادشاہ کو چاہے باقی رہنے دے۔" (ارتقائے نظم حکومت یورپ صفحہ ۲۲۱)

پروٹسٹنٹ فرقہ

پروٹسٹ یعنی احتجاج کی طرف منسوب کرکے صلیبی دین کی تاریخ میں پروٹسٹنٹ فرقہ کا جو ذکر آتا ہے، دراصل یہی اندرونی آگ اور لاوے کے ان دہانوں کی تعبیر ہے جن کی راہ سے کلیسا کی مخالفانہ آگ باہر نکلنے لگی۔ ایک ہی ملک میں نہیں بلکہ یورپ کے مختلف علاقوں میں آگے پیچھے مختلف شخصیتیں جرأت سے کام لے کر کلیسا اور پوپ کے خلاف علانیہ اٹھ کھڑی ہوئیں جن میں جرمنی کے مارٹن لوتھر سوئٹزرلینڈ کے زونگ لی، فرانس کے کالون نامی وغیرہ افراد نے غیر معمولی شہرت حاصل کی، جن کے تفصیلی حالات کا مطالعہ یورپ اور کلیسا کی تاریخوں میں کرنا چاہیئے۔

پروٹسٹ کی ابتدائی نوعیت

حاصل ہر ایک کے احتجاج اور پروٹسٹ کا یہی تھا کہ صلیبی دین کی ٹھیکہ داری، یا بائبل (توراۃ وانجیل وغیرہ) کی تشریح کا استحقاق کلیسا نے اپنے ساتھ جو مختص کر رکھا ہے، یہ صحیح نہیں ہے، اور نہ نجات کے لیے کلیسائے روم اس کے پوپ، پوپ کے نمائندوں کو واسطہ بنانے کی ضرورت ہے، یہ ہزارہا ہزار صفحات کی داستان کا خلاصہ ہے۔

کلیسا کا ردِ عمل

واقعہ یہ ہے کہ ابتداءً احتجاج اور پروٹسٹ کے اس قصے کا تعلق صرف کلیسا، پوپ، پوپ کے نمائندوں اور ان لوگوں پیش کردہ صلیبی دین کی شکل سے تھا۔ شروع میں یہی غنیمت تھا، مگر کلیسا کے لیے یہ مختصر احتجاج بھی ظاہر ہے کہ کسی حیثیت سے بھی قابلِ برداشت کیسے ہو سکتا تھا۔ چاہا گیا کہ "گربہ کشتن" کے ساتھ کشتنی" کے فعل کو پہلے ہی شروع کر دیا جائے، ورنہ "پیل" (ہاتھی) سے بھی اس سیلاب کا رد کرنا ممکن نہ ہوگا جس کی روانی ابھی صرف میل یعنی سلائی سے روکی جا سکتی ہے۔

کشمکش کی ابتداء

کلیسا اور عوام میں کش مکش کی ابتدا ہو گئی، یورپ کی تاریخوں میں عدالت ہائے تحقیق مذہبی (INQUISITION) اور "لاشا مبرار دانت" یا "ایوان آتشیں" وغیرہ کی اصطلاحیں جو ملتی ہیں، درحقیقت ان ہی الفاظ میں اس منحوس کش مکش کی خونیں اور آتشیں داستانیں چھپی ہوئی ہیں۔

کلیسا کے خلاف صراحۃً ہی نہیں بلکہ اشارۃً وکنایۃً تحریراً و تقریراً کسی قسم کا کوئی لفظ زبان سے نکالنا جرم ٹھہرایا گیا، کلیسا نے فتویٰ صادر کیا، اور سارے سلاطین و امراء جن کی سلطنت و امارت کی بنیاد صرف کلیسا کے رحم و کرم پر منحصر تھی، انھوں نے اس فتویٰ کی تعمیل کے لئے نیاموں سے تلواریں باہر نکال لیں، ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مجرموں کو زندہ در آتش کرنے کے لیے "مقدس الاؤ" جوڑ دیے گئے۔

مخالفانِ کلیسا کے خون کی ہولی

پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ سال دو سال کا قصہ ہو تو بیان کیا جائے، واقعہ یہ ہے کہ کش مکش کی یہ کیفیت، رومن کیتھولک یعنی حامیانِ کلیسا اور پروٹسٹنٹ مخالفانِ کلیسا ان دونوں فرقوں کے درمیان پانچ چھ صدیوں تک انتہائی قساوتِ قلبی، سنگدلی کے ساتھ جاری رہی۔ قدرتاً پروٹسٹنٹ خیال کے

حامیوں کی تعداد شروع میں کم تھی، ہر علاقہ اور خطہ میں کیتھولک اکثریت غریب پروٹسٹنٹوں کی اقلیت کے ساتھ جو جی میں آیا کرتی رہی۔ عدالتہائے مذہبی' یا مجلس تحقیقات ارتداد میں مقدمہ پیش ہوتا، ہلکی سی رسمی کارروائی کے بعد قتل یا زندہ جلا دینے کا فیصلہ صادر کر دیا جاتا، اور کیتھولک فرقہ کے عیسائی بڑی دلچسپیوں کے ساتھ خون اور آگ کی ان ہولیوں کا تماشا دیکھا کرتے تھے۔

طرزِ ستم لکھا ہے کہ الحاد یا ارتداد کے فتوے کے بعد دیکھا جاتا تھا کہ مجرم کو پلنگ کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے، غریب چت لٹا دیا جاتا، چھت میں باڑھ دار ہتھیار لٹکا دیا جاتا، جو آہستہ آہستہ کئی دن [تک] لیٹے ہوئے مجرم کے سینے پر ضرب لگاتا، اور یوں اس غریب کی جان نکالی جاتی یا گھٹ گھٹ کر نکل جاتی۔

اس سلسلے میں کن کن شہروں میں قتل عام کے واقعات کتنی دفعہ پیش آئے، اور قتل عام کے ان واقعات میں کتنی جانیں کام آئیں، انکی فہرست یورپ کی تفصیلی تاریخوں میں مل سکتی ہے۔

ہنگامۂ بارتھلمی فرانس کا مشہور ہنگامہ 'بارتھلمی' کے ہنگامے کے نام سے جو مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ (۹) دن تک پروٹسٹنٹ فرقہ کے مردوں اور عورتوں کے قتل عام کا حکم نافذ رہا۔ لکھا ہے کہ حاملہ عورتوں کے پیٹوں کو چاک کر کر کے کلیسا کی کیتھولک بھیڑیں زندہ بچوں کو نکالتیں اور کتوں کے آگے ڈال کر ان کے پھاڑے اور کھائے جانے کا تماشہ دیکھتیں۔ پیرس کے دریائے سین کا پانی مقتولوں کے خون سے سرخ ہو گیا تھا۔[۵]

دس لاکھ کا خونِ ناحق خلاصہ یہ ہے کہ کش مکش کے اس سلسلہ میں تخمینہ کیا گیا ہے کہ جو مارے گئے، زندہ جلائے گئے، یا دوسرے طریقوں سے ان کو قتل یا ذبح کیا گیا، تخمیناً دس لاکھ افراد تک ان کی تعداد پہونچتی ہے۔

اور یہ سب کس لیے ہوا؟ صرف اس لیے کہ خدا کے بیٹے مسیحؑ' اور ان کے حواری پطرس، پطرس کے جانشین پوپ کے ہاتھ میں ان ہی مذہبی ناموں کے وسیلہ سے سیاسی باگ جو آ گئی تھی' یہ باگ ہاتھ سے نکلنے نہ پائے۔

مظلوم فرقہ پر اس جبر و تعدی کا اثر پروٹسٹنٹ خیال کے حامیوں کی طرف سے جب پوپ اور پوپ کے نمائندوں پر اعتراض کیا جاتا، تو کہنے والے پطرس کا نام لیتے، کہ تم حواری مسیح کے جانشین پر زبان کھولتے ہو۔ جواب میں کہنے والے پطرس ہی پر اعتراض کرتے، بالآخر اسی اعتراض نے تحقیق کی وہ شکل اختیار کی جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے یعنی ثابت کیا گیا کہ "پطرس حواری کی قبر یا لاش رومہ میں ہے"، سرے سے یہ دعویٰ ہی غلط اور بے بنیاد جعلی ہے۔

نوبت بایں جا رسید بہرحال پطرس کے تقدس میں زور پیدا کرنے والے جب مسیحؑ اور خدا کے بیٹے کے نام سے

---

(۵) انگریزی زبان جو نہیں جانتے ہیں وہ علامہ فرید وجدی کی عربی کتاب "کنز العلوم واللغۃ" میں ان واقعات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ۱۲

زور پہونچاتے، توجو ذرا زیادہ آزاد مزاج تھے انھوں نے خود مسیح کی عظمت وجلالت میں اشتباہ ڈالنا شروع کیا، نوبت یہاں تک پہونچی کہ مسیح کے وجود تک کو فرضی ثابت کرنے کی کوشش ہونے لگی۔ مسیح کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لیے "خدا" کا نام لیا جاتا، لیکن جن پوپ، جس کلیسا، جس پطرس، اور جس مسیح کے نام لینے والوں کے خونیں کارناموں سے یورپ کا چپہ چپہ رنگین ہو رہا تھا، اسی مسیح کے خدا پر بھی زبانیں اگر کھلنے لگی ہوں تو اس پر تعجب کیوں کیا جائے؟ اور یہی مطلب ہے ہنری ہسجوک کے اس فقرے کا، کہ:-

"جس وقت نشاۃ جدیدہ کا (یورپ) میں زور شور تھا، جس نے ان مذہبی عقائد ہی کو کمزور کر دیا تھا، جن کے اوپر پاپائیت کا انحصار تھا"
(ارتقائے نظم حکومت یورپ صفحہ ۲۶۶)

یہاں تک بات کیوں پہنچی؟
اب سوال یہی ہے کہ "مذہبی عقائد کی اس کمزوری" کی بنیاد کیا تھی؟

یورپین مورخین کا شاطرانہ انداز اور صاف بیانی سے گریز
افسوس ہے کہ یورپ کی تاریخ لکھنے والوں نے نہ اس سوال ہی کو زیادہ اہمیت دی" اور نہ سوال کے جواب ہی میں وہ صاف بیانی سے کام لیتے ہیں۔ وہ کچھ ملی جلی باتیں کرتے ہیں، جن میں کچھ تو وقت، وقت کے سیاسی حکمرانوں کے کارناموں اور حکومت کے متعلق دستوری خیالات کے پیش کرنے والے مصنفین کے نظریات وافکار کا تذکرہ کیا جاتا ہے، اور ساتھ ہی کچھ سائنس، کچھ فلسفہ، اور ان فنون کی ترقیوں کا اظہار ایسے پیرایہ میں بیان کیا جاتا ہے، کہ "مذہبی عقائد کی کمزوری" کے صحیح اسباب سامنے آنے نہیں پاتے اور ان کتابوں کے سطحی مطالعہ کرنے والے اس خبط میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ شائد فلسفہ اور سائنس کے چرچوں نے مذہب کی بنیادوں کو یورپ میں سست کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ اپنی ان ہی تاریخوں میں وہ کلیسا اور پوپ، ان کے طرز عمل اور اس طرز عمل سے عوام کی ذہنیت بہ تدریج جو متاثر ہوتی چلی جاتی تھی بیچ بیچ میں اسکے ذکر سے بھی کلی گریز کی راہ تو اختیار نہیں کرتے، اور ایسا وہ کر بھی نہیں سکتے تھے، ورنہ ماضی وحال کے تعلقات کے زنجیرے کی کڑیاں پڑھنے والوں کے سامنے سے اچانک غائب ہو جاتیں، لیکن "تاریخ نویسی" میں جس صفائی اور بے لاگ بیان کی ضرورت ہے، اس سے ان کی کتابیں خالی ہیں، عموماً وہ باتیں بناتے ہیں، جس مذہب کی طرف ان کا ملک یا ان کی قوم منسوب ہے، چاہتے ہیں کہ کھلے بندوں اس کے پیدا کئے ہوئے نتائج لوگوں کے سامنے نہ آئیں۔

شائد اسی لیے ممکن ہے کہ جس نظریہ کو اس وقت میں پیش کر رہا ہوں، ان لوگوں کو بھی کچھ اجنبی معلوم ہو، جنھوں نے یورپ کی تاریخ کا کافی اور گہرا مطالعہ کیا ہے، کیونکہ عموماً اس راہ میں وہ ان ہی راہوں پر پڑ چکے،

ہیں جن پر یورپ کے شاطر مورخین ان کو چلانا چاہتے ہیں، تاہم شکر ہے کہ سلسلہ وار نہ سہی، پراگندہ، منتشر حالات میں یہ سارے معلومات یورپ ہی کی عام تاریخوں میں پائے جاتے ہیں، جن میں تسلسل پیدا کرنے کی کوشش قرآنی لفظ "آثارہم" کی تشریح و تفسیر میں کی گئی ہے۔

یورپ کی اس بے دینی کا بنیادی سبب عقیدۂ ولدیت ہے

واقعہ یہ ہے کہ مذہب اور مذہبی عقائد کی یہ ساری کمزوریاں جو یورپ میں پیدا ہوئیں براہِ راست نہ سائنس کے جدید انکشافات کی رہینِ منت ہیں، اور نہ سیاسی و دستوری تبدیلیوں سے ان کا براہِ راست تعلق ہے، جن سے گذرتے ہوئے یورپ کی تاریخ موجودہ دور تک پہونچی ہے۔ بلکہ مذہب کی ساری کمزوریاں خود اُس مذہب اور مذہب کی تاریخ سے پیدا ہوتی ہیں جس کی طرف اپنے آپ کو اور اپنی دینی زندگی کو یورپ کے یہ باشندے منسوب کرتے رہے ہیں یا اس وقت تک کر رہے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ وہی "عقیدۂ ولدیت" جس کی بدولت سمجھایا جاتا تھا کہ مخلوق کے پیکر میں خالق ہمارے سامنے آگیا، اسی کے ساتھ غیر معمولی شغف اور انہماک و استغراق نے یورپ کو کلیسائے روم اور کلیسائے روم کے پاپاؤں کا غلام بنایا، پھر کلیسا اور کلیسا کے نمائندوں کی حد سے گذری ہوئی چیرہ دستیوں نے عوام کے قلب میں ردعمل کی کیفیت پیدا کی، جو ترقی کرتے ہوئے شروع شروع میں تو پروٹسٹنٹ فرقہ کے قالب میں نمایاں ہوئی، اور جب ردعمل کی اس نہ رکنے والی تحریک کا مقابلہ آگ اور تلوار کی دھار سے کلیسا اور کلیسا کے رحم و کرم پر جینے والے حکمرانوں نے کرنا چاہا، تو یہی پروٹسٹنٹی تحریک جس کے بانی لوتھر کی کرخت ترین تنقید یہ تھی جیسا کہ جانسن نے اس کے رسالہ "اسیریٔ بابل" نامی کے حوالہ سے نقل کیا ہو کہ:۔

> "اس نے (مارٹن لوتھر نے) نہ صرف پوپ کے اقتدار سے انکار کر دیا، بلکہ مقدس ادارۂ کہانت و نذر روایات پر اور راز منہ وسطی کے اصول استحالہ[1] و تبدیل لحم پر حملہ کرنے لگا"

(یورپ سولھویں صدی میں ص۱۹۹)

[اور] جیسا کہ جانسن ہی نے لکھا ہے، کہ:۔

> "اس نے (لوتھر نے) گو نہایت بے پروائی کے ساتھ کلیسا کے

---

[1] یہ عشاء ربانی کی تقریب کی ایک اصطلاح ہے، جو شراب اور گوشت اس تقریب میں عیسائی استعمال کرتے تھے اس کے متعلق یقین تھا کہ مسیح کا وہ خون اور گوشت ہے۔۱۲

روایات کو ترک کر دیا۔"

مگر اسی کے ساتھ

"اس کو کامل اور پختہ یقین تھا کہ حصولِ نجات اور تنظیمِ کلیسا کے لیے جو کچھ درکار ہے وہ انجیل ہی میں مل سکتا ہے۔"

(یورپ سولھویں صدی میں صفحہ ۲)

بہرحال آخر وقت تک لوتھر خود بھی عیسائی ہی رہا، اور اس کے ماننے والے عیسائی بھی انجیل ہی کو ذریعۂ نجات یقین کرنے والے تھے۔

لیکن ان پروٹسٹنٹ، اور احتجاج کرنے والوں کا پیچھا کلیسا کے حامی عیسائیوں یعنی رومن کیتھولک فرقہ کی طرف سے حد سے گذرے ہوئے بہیمانہ تشدد کے ساتھ کیا گیا جس کا ایک ہلکا سا نقشہ آپ کے سامنے گذر چکا۔ خود سوچئے کہ اس کا منطقی نتیجہ اس کے سوا اور بھی کچھ ہو سکتا تھا جو ہوا۔

میں دوسروں کے متعلق کیا کہوں خود اپنے متعلق سوچتا ہوں کہ مذہب کے نام سے میرے سامنے بھی وحشت و بربریت کے وہی مہیب و دردناک مناظر اگر پیش ہوتے، جو کلیسا اور عیسائیت کے نام سے یورپ میں صدہا سال تک پیش آتے رہے، تو ایسے مذہب کے مقابلہ میں لا مذہبیت اور دین کے مقابلہ میں لا دینیت کے قبول کر لینے پر اپنے آپ کو مجبور اور شاید بے بس پاتا۔

پس سچی بات یہی ہے کہ یورپ کی موجودہ لامذہبیت یا بے دینی خود اس مذہب اور دین کی پیداوار ہے[۱] جسے یورپ نے قبول کیا تھا، اور یہ مذہب یا دین کیا تھا، وہی

---

[۱] غریب سائنس یا سائنس کی راہ سے پیدا ہونے والے جدید انکشافات مثلاً ہوائی جہاز، ریل، فون، انجن یا اسٹیم، برق، پٹرول وغیرہ کی قوتوں کو بدنام کرنا اور یہ سمجھنا کہ ان جدید انکشافات نے مذہب کی بنیادوں کو کمزور کر دیا۔ اس قسم کا دعویٰ وہی کر سکتا ہو جو نہ مذہب کی اساسی بنیادوں سے صحیح واقفیت رکھتا ہو اور نہ یہ جانتا ہے کہ سائنس ہے کس علم کا نام، اور اس کے مباحث کا تعلق کن امور سے ہو۔ قطع نظر اس بھونڈی شاکے ایک عامی کو یوں بھی تو سوچنا چاہیے کہ "گراموفون جب بجنے لگا تو اب جہنم کا وجود نا ممکن ہے، یا ہوائی جہاز یا موٹر جب سفر کرنے لگا تو برزخی عذاب قبر میں مبتلا ہونے کا امکان جاتا رہا، یا ریل جب جاری ہو گئی تو فرشتوں کا وجود اب آدمی کیسے مان سکتا ہے۔" ذرا سوچئے تو دعویٰ و دلیل کی ان شکلوں میں کسی قسم کا کوئی دور کا بھی تعلق ہے۔ پھر جدید ایجادات و انکشافات اسی قسم کی چیزیں تو ہیں۔ ان سے مذہب کے اصول تو اصل میرے نزدیک تو مذہب کے فروع بھی کسی حیثیت سے متاثر نہیں ہوتے۔ والقصۃ بطولہا۔

"نظریۂ ولدیت"

تھا جس کی تعبیر قرآن میں

قالوا اتخذ اللہ ولدا ... انھوں نے کہا کہ خدا نے (مسیح) کو بیٹا بنایا۔

سے کی گئی ہے۔

آمدم برسرِ مطلب | اور اب آیئے قرآن میں "آثارہم" کا لفظ جو فرمایا گیا ہے اس کا کیا مطلب ہے، اس پر غور کیجئے۔ جیسا کہ ظاہر ہے "آثار" اثر کی جمع ہے۔ منتہی الارب میں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اس لفظ اثر کی تشریح فارسی کے ان لفظوں سے کی ہے، یعنی :-

"بقیہ چیزے، ونشان .... ونشان قدم منہ قطع اللہ

اثرہ، یعنی بہ برد خدائے نشان قدم او را۔"

جس کا حاصل یہی ہوا کہ اپنے پیچھے کوئی چیز جن نشانوں کو چھوڑ جائے اُن ہی کو اس چیز کا اثر یا آثار عربی میں کہتے ہیں۔

یہ تو "آثار" کے لفظ کی لغوی شرح ہوئی، آگے "ہم" کی ضمیر سو ظاہر ہے کہ اس کا مرجع اور اس سے مراد وہی لوگ ہیں جو "عقیدۂ ولدیت" کے قائل تھے۔

اس کے بعد اب ان اجمالی تفصیلات کو اپنے سامنے لایئے جن سے گذرتے ہوئے "عقیدۂ ولدیت" موجودہ دور تک پہونچا ہے۔

"آثارہم" کی تفصیلات اجمال کے پیرایہ میں | جن لوگوں نے شروع شروع میں خالقِ عالم کے متعلق ولدیت کے اس عقیدہ کو تراشا وہ تو دنیا سے چلے گیے، ان کے بعد کلیسا، اور کلیسا سے پوپ، پوپ سے پوپ کی ذریت پادری پیدا ہوئے۔ پھر اس نظام کے تحت جن ناگفتہ بہ حالات سے یورپ کے عوام کو گذرنا پڑا، جس سے احتجاجی ذہنیت پیدا ہوئی، اور وہی احتجاجیت آگے بڑھتے ہوئے یہی نہیں کہ صرف پوپ اور کلیسا کے اقتدار کی منکر ہو گئی، بلکہ جوں جوں ایک فریق کا تشدد بڑھتا جاتا تھا، فریق مقابل کی سختیاں اور منھ زوریاں بھی اسی نسبت سے ترقی پذیر ہوتی رہیں، تا اینکہ مسیح کے حواری پطرس کے وجود کا بھی انکار کیا گیا، آخر میں مسیح کا وجود بھی مشکوک ٹھہرایا گیا، اور بالآخر اس کی انتہا العیاذ باللہ اس شک پر ہوئی جس کے بعد انسان کے لیے اپنی انسانیت کو باقی رکھنے کے لیے کوئی ٹیک ہی باقی نہیں رہتی، یعنی خود مسیح کے باپ کا یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ حضرت حق سبحانہٗ تعالیٰ کے وجود میں شک اندازیوں کی راہیں یورپ میں درست ہونے لگیں،

اور گو عمومیت کی زبان پر خدا ابھی باقی رہا بلکہ خدا کا مسیح بھی، مسیح کی انجیل بھی، لیکن اس طویل و عریض آبادی کے
اکابر کے دل میں سچ پوچھئے تو کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔

کمیونسٹ تحریک بھی انہیں آثار میں داخل ہے

دل کی بات دل ہی تک محدود کب تک رہتی، آخر مشرقی یورپ میں شیوعی یا بالشو کی
نظام نے سر اٹھایا جس میں زبانوں سے بھی وہی کہلوایا جاتا ہے اور کہنے پر مجبور کیا
جاتا ہے، جسے مغربی یورپ کے باشندے اب تک اپنے دلوں میں چھپائے بیٹھے تھے۔

کمیونزم کے نتیجہ میں انسانیت کی پستی

اور اس کے بعد قدرۃً انسانی نسلوں اور دوسرے حیوانی سلسلوں میں کسی فرق کا باقی رہنا
یا رکھنا ناممکن ہو گیا، جیسے ایک مکھی پیدا ہوتی ہے، جان لے کر پیدا ہوتی ہے، احساس
لے کر پیدا ہوتی ہے، اور اپنے جیسی ہی چند مکھیوں کو پیدا کر کے ناپید ہو جاتی ہے۔ آدمی کی قدر و قیمت،
کوئی وجہ باقی نہ رہی کہ اس سے زیادہ کسی امتیاز خاص کی مستحق قرار دی جائے۔ مکھیوں کی جتنی تعداد بھی
مر جائے، مار ڈالی جائے، جیسے یہ کوئی اہم واقعہ نہیں ہے، آج بھی تصور ان لوگوں کے متعلق یہی ہے جو
آدمی بن کر دنیا میں پیدا ہوئے ہیں ——— قرآن کا مسجود ملائکہ "عقیدۂ ولدیت" کی چوٹ
کھائے ہوئے آپ دیکھ رہے ہیں کہ ذلت و خواری کے کتنے تاریک و مہیب خندق میں گر پڑا۔

اور یہ ہے میرے نزدیک قرآنی لفظ "آثارہم" کا مطلب، جس کے لیے چاہیئے تو تھا کہ کئی جلدیں لکھی
جائیں، لیکن اس کام کو دوسروں کے لیے چھوڑ کر[1] اپنے ٹوٹے پھوٹے پیش کردہ اشارات پر قناعت کرتے
ہوئے میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جس کی پیغمبرانہ بصیرت کے سامنے "عقیدۂ ولدیت" کے ان جاں گداز
روح فرسا، آثار کا ہر پہلو نمایاں ہو، جس کا کچھ حصہ تو سامنے آچکا ہے، اور نہیں کہا جا سکتا کہ کیڑوں
اور مکوڑوں، مکھیوں اور پتنگوں، کی صفوں میں شریک ہونے والے اس انسان پر آئندہ ولدیت کا
یہی عقیدہ اور کن آثار کو لانے والا ہے۔ الغرض جو کچھ گذر چکا، یا گذر رہا ہے اور آئندہ گذرنے والا
ہے ان سے آگاہی کے بعد اگر

"انسانیت"

کے سب سے بڑے غم خوار، بہی خواہ پر یہ حال طاری ہو جائے کہ ان "آثار" سے بچانے کے لیے وہ

---

[1] خاکسار کی تعلیم جیسا کہ معلوم ہے قدیم طرز کے مدارس میں ہوئی، نیز تاریخ میرا خاص مضمونِ مطالعہ ..... بھی نہیں رہا، اسی
لیے چاہتا ہوں کہ یورپ کی تاریخ کا تفصیلی مطالعہ جن لوگوں نے کیا ہے، کاش! میرے اجمالی اشاروں کو تفصیل کا قالب
عطا کرتے ——— وعلی اللہ اجرہ

اپنا سب کچھ حتیٰ کہ اپنی جان تک کی بازی لگانے کے لیے تیار تھے تو کسی حیثیت سے یہ بات محلِ تعجب ہو سکتی ہے؟[۱]

---

[۱] یہ آخری بات بعض لوگوں کو کچھ تشنہ سی محسوس ہو گی۔ مولانا کہنا یہ چاہتے ہیں کہ حقیدہ ولدیت کے آثار کی یہی وہ جاں گسل نوعیت تھی جس کے غم سے، زیر بحث آیت ("فلعلّك باخع نفسك على آثارهم" الخ) کے بیان کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جان گھلائے لے رہے تھے۔ مرتب

عقیدۂ ولدیت کے آثار اور دنیا کیلئے ایک مہیب انجام کا خطرہ

۱۔ ہم نے بنایا، (ان ساری چیزوں کو) جو زمین پر ہیں، زمین کے لئے زیب و زینت،
تاکہ ہم جانچیں کہ ان میں (انسانوں میں) عملاً سب سے اچھا کون ہے۔
۲۔ اور ہم بنا دینے والے ہیں (ان ساری چیزوں کو) جو زمین پر ہیں، میدان اُجاڑ۔

الحمد للہ کہ سورہ کہف کا پہلا عشرہ کہئے یا رکوع کی آخری دو آیتوں پر ہم پہونچ گیے ہیں؛ [پیشانی کی عبارت میں] ان ہی دو آیتوں کا حاصل اور ترجمہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ اصل الفاظ قرآن مجید کے یہ ہیں:۔

(۱) انا جعلنا ما علی الارض زینۃ لہا، لنبلوھم ایہم احسن عملاً۔

(۲) وانا لجاعلون ما علیہا صعیداً جرزا۔

پہلی آیت کا مفہوم

ان میں پہلی آیت میں اگرچہ بظاہر تخلیق کائنات کی اسی عام توجیہ کا ذکر ہے جس کا قرآن میں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے مختلف الفاظ میں اعادہ کیا گیا ہے، اپنے الفاظ میں جس کا خلاصہ خاکسار نے یہ کر دیا ہے، یعنی:۔

"یہاں جو کچھ ہے سب انسان کے لیے، اور انسان اس کے لیے ہو جس کا سب کچھ ہے"

لیکن تخلیق کائنات کی اس عام توجیہ کی تعبیر جن خاص الفاظ میں یہاں کی گئی ہے اور جس موقع و محل پر ہم اسکو پاتے ہیں، ان دونوں باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے سوچیے۔

"ماعلی الارض" میں انسانی وجود بھی داخل ہو

ظاہر ہے کہ ماعلی الارض یعنی وہ ساری چیزیں جو زمین پر پائی جاتی ہیں، جن سے مٹی اور کیچڑ کے اس ڈھیر کو جس کا نام زمین ہے، زینت بخشی گئی ہے۔ ان میں جہاں اونچے اونچے پہاڑ، سرسبز وادیوں کے آغوش میں بہنے والی ندیاں، غرانے بھرنے والے سمندر، لہلہاتے ہوئے پھول، پھلوں سے لدے درخت، ہرے بھرے باغ، گھنے جنگل، کھلے پُر فضا میدان، یہ اور اسی قسم کی بے شمار چیزیں ہیں، ان ہی میں یقیناً گرد و غبار کے اس تودہ کی آرائش و زیبائش کی ضمانت خود انسانی وجود میں کبھی مستور ہے۔

وہ خود بھی زمین کی زینت ہو، اور اس کے اندر قدرتی سلیقہ اس بات کا بھی رکھا گیا ہو کہ معمولی معمولی چیزوں کو اپنی ذہانت اور صنعتی چابکدستیوں کی مدد سے حسن وجمال کے بہترین دل آویز سانچوں میں ڈھال کر رکھ دیتا ہے۔ بلاشبہ زمین کی سجاوٹ وبناوٹ وحسن ورعنائی کو انسان کے اس فطری سلیقہ سے غیر معمولی فروغ حاصل ہوا ہے، اور ہوتا چلا جا رہا ہے ہمیں یہ ماننا چاہیے کہ "ما علی الارض" یا پشت زمین کی دوسری چیزوں کے ساتھ خود انسانی وجود کے اس پہلو نے جنت نکالے ہوئے یا جنت کا وارث انسان کے رہنے بسنے کے قابل زمین کے اس کرے کو بنا دیا، گویا یوں سمجھئے کہ گونہ اشک شوئی کی ایک صورت عارضی مستقر کی اس شکل میں اس آدمی کے لئے نکل آئی جو بہشت بریں کا باشندہ اور متوطن تھا۔

کچھ بھی ہو "ما علی الارض" یعنے زمین پر جو کچھ ہے اس کے جھمیلے میں شریک ہو کر آدمی کا وجود بھی زمین کی حسن افزائیوں اور جمال آرائیوں میں کافی حصہ لے رہا ہو، اگر اپنے اس سلیقہ سے جیسا کہ قرآن توجہ دلا رہا ہے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کس چیز کے حسن وجمال میں وہ اضافہ کر رہا ہے، ظاہر ہے کہ وہ خود انسان نہیں بلکہ خاک اور دھول کا یہی مجموعہ زمین ہے، جس کے حسن وجمال میں وہ اضافہ کر رہا ہے یہی حاصل ہے اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا کے الفاظ کا۔

اسی لئے آگے فرمایا گیا ہے کہ محاسن وکمالات کے جو لامحدود ذخیرے زمین میں نہیں بلکہ خود انسانی فطرت کے اندر دبے ہوئے ہیں، ان کو بروئے کار لانے کی تدبیر یہ ہے کہ انسان لامحدود کمالات والے خالق کائنات سے ربط پیدا کرے اور اپنے اعمال کے حسن وقبح، بھلائی برائی کا واحد معیار اسی کی مرضی مبارک کو ٹھہرا لے۔ اور یہی مطلب ہے لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا کا، یعنی (تاکہ جانچیں رنمایاں کریں) ہم اس بات کو کہ ان میں (انسانوں) میں عملاً سب سے اچھا کون ہے)۔

ایک خاص اشارہ | بلکہ اگر غور کیا جائے تو مجموعی طور پر آیت کے ان دونوں ٹکڑوں سے اد ھر بھی گویا اشارہ مل سکتا ہے کہ انسان کی طرف منسوب ہو کر اور اس کے لئے وقتی مستقر یا قیام گاہ بننے کی نسبت نے جب زمین کو حسن وجمال سے مالا مال کر دیا اور اس کی بہت سی پوشیدہ صلاحیتیں انسانی وجود کے ساتھ مربوط ہو کر منصۂ شہود وظہور پر جلوہ گر ہو رہی ہیں، تو اسی سے اندازہ کرنا چاہیے کہ خالق کائنات کے ساتھ وابستگی، اور ربط، انسانی وجود کے کن مخفی ذخیروں کو باہر لا سکتا ہے۔

آیت کا قابل غور پہلو | خیر اب آیئے اور اس پر غور کیجئے کہ انسانی وجود کے ان دو پہلوؤں یعنی ایک پہلو تو وہ ہے جس سے زمین کے حُسن وجمال کے اضافہ اور فروغ میں مدد مل رہی ہے، اور دوسرا پہلو وہ جس کے ساتھ خود انسانی وجود کے باطنی محاسن اور معنوی کمالات کے ظہور وبروز کا مسئلہ وابستہ ہے، ان دونوں پہلوؤں کا تذکرہ عقیدۂ ولدیت کے چھوڑے ہوئے آثار کے بعد کیوں کیا گیا ہے۔

عقیدہ ولدیت کے آثار نے ایک پہلو کو دبا کر دوسرے پہلو کو ابھار دیا ہے۔ | عرض کر چکا ہوں کہ دین سے بے دینی کی پیدائش کا جو حادثہ عیسائی ممالک اور کلیسائی علاقوں میں پیش آیا ہو کشمکش اور تصادم کے اس قصے میں بڑھتے ہوئے لوگوں کا جذبۂ ضد وعداوت، بغض ونفرت، صرف خدا انکار ذہنیت ہی تک پہونچ کر نہیں ٹھہرا، بلکہ مذہب اور دین کے

نام سے لامذہبیت اور بے دینی کی فرعونی حرکتوں اور طاغوتی شرارتوں کی جو جہنم عوام پر بھڑکائی گئی اس نے لوگوں کو یہ واقعہ ہے کہ بالآخر "خدا بے زاری" کے حدود تک ڈھکیل کر پہونچا دیا۔ پھر نتیجہ کیا ہوا؟ وہ آپ کے اور ہمارے سب کے سامنے ہے، انسانی وجود کا خدائی پہلو مفلوج و مردہ ہو کر رہ گیا، لے دے کر جو چیز باقی رہ گئی ہے، وہ اب صرف یہی ہے کہ اسی مٹی اور کیچڑ کے تودے کے ساتھ انسانیت لپٹ پڑی ہے اور اس کے سوا اور کوئی دوسرا کام آدمی کا نہیں رہ گیا ہے کہ زمین کی گری پڑی چیزوں کو اٹھا اٹھا کر ان کے حسن میں حسن کا، قیمت میں قیمت کا اضافہ کرتا چلا جائے۔ لامحدود توانائیوں کا جو گراں قدر بیش قیمت ذخیرہ اس کی فطرت میں قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے، اس کے استعمال کا اول بھی یہی ہے اور آخر بھی یہی ہے۔ انجام یہ ہے کہ زمینی رعنائیوں کے بڑھانے میں خواہ اڈیسن ہی بن کر کوئی کیوں نہ مرتا ہو، لیکن انسانی محاسن و کمال کے لحاظ سے ایک نومولود بچہ کی جو حالت ہوتی ہے وہی حال اس بڈھے کا اس وقت بھی ہوتا ہے جب زندگی کے تمام مرحلوں کو طے کر کے زمین سے وہ رخصت ہوتا ہے گویا اس لحاظ سے اسی حال میں وہ مرتا ہے جس حال میں پیدا ہوا تھا خواہ زمینی حسن و زیبائش اور سج دھج میں کسی قسم کے غیر معمولی کارنامے اس سے کیوں نہ ظاہر ہوئے ہوں۔

مٹی چمک رہی ہے انسان بجھ رہا ہے | عقیدۂ ولدیت کے آثار نے دنیا میں جس حشر کو آج برپا کر رکھا ہے وہ یہی ہے مٹی بڑھ رہی ہے بڑھتی چلی جا رہی ہے، چمک رہی ہے، چمکتی چلی جا رہی ہے، اس کے حسن و جمال میں اضافہ پر اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، مگر انسان گر رہا ہے گرتا چلا جا رہا ہے، بجھ رہا ہے بجھتا چلا جا رہا ہے اور میں نے شاید غلط کہا کہ جس حال میں پیدا ہوا تھا اسی حال میں مرتا ہے، بلکہ صحیح یہ ہے کہ پیدائش کے وقت کم از کم معصوم حیوان، یا غیر مضر جانور تو وہ رہتا ہے لیکن اس "خدا بے زار تمدن" کے زیر اثر زندگی بسر کرنے والوں میں خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے مرنے والے مرنے کے وقت شیطان کی بھی ناک کاٹ کر مرتے ہیں، آج ان ہی شیطانی انسانوں نے اسی "جنت نما" زمین کو اذیت رسانی میں قریب قریب جہنم کے حدود تک پہونچا دیا۔

اس صورت حال کا مہیب انجام | لیکن یہ تو وہ ہے جو ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے، مگر آئندہ یہی صورت حال کس مہیب ڈراؤنے انجام کو آدمی کے سامنے لانے والی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے مذکورۂ بالا دو آیتوں میں سے آخری آیت میں شاید اسی کا جواب تلاش کرنے والوں کو مل سکتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ خالق کائنات سے قطعی بے تعلق و بے گانہ ہو کر اپنی خدا بے زار زندگی کے ساتھ جو راضی اور مطمئن ہو چکے ہیں ان کے اس اطمینان کا نتیجہ یہ ہوا کہ توانائیوں کا وہ سارا سرمایہ، صلاحیتوں کا سارا ذخیرہ جو انسانی وجود میں بھرا گیا تھا خالق تعالیٰ سے ٹوٹ کر کلیتہً زمین ہی کے بناؤ سنگار کی طرف اس کا رخ مڑ گیا ایک طرف اس یکسوئی یکتا پن کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ ارضی بناؤ سنگار آرائش و زیبائش کے نت نئے سامانوں سے دنیا جیسے اس عہد میں بھری

اور بھرتی چلی جارہی ہے، انسانیت کی تاریخ میں یا کم از کم تاریخ معلوم میں اس کی قطعاً کوئی نظیر نہیں ہے، ہر نیا دن نئے انکشافات جدید مصنوعات وایجادات کو اپنے جلو میں لا رہا ہے، ابھی ایک تماشا ختم بھی نہیں ہو پاتا کہ دوسرا نظارہ دعوتِ نظر دینے لگتا ہے۔

اس سلسلہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے ہم بھی دیکھ رہے ہیں اور آپ بھی دیکھ رہے ہیں لیکن زمین کی زیب وزینت کے قصوں میں ڈوب کر خود اپنے اور اپنے محاسن وجمال کو فراموش قطعاً فراموش کر دینے والا انسان ایجادات واختراعات کی ان ہی راہوں سے زیب وزینت کے ساز وسامان کے ساتھ ساتھ اسی زمین کی ویرانی وبربادی کے سامانوں کو بھی غیب سے گھسیٹ گھسیٹ کر دائرہ ظہور ووجود میں جو لا رہا ہے دنیا کی آنکھوں سے کیا وہ اوجھل ہیں، دیکھئے وہ ایٹم بم کے جہنمی ذرات ہیں، اور یہ ہائیڈروجن کے ان دیکھے کرامات ہیں۔ یہ ان آتش بداماں ایجادات واختراعات کے سوا ہیں، جن کا دنیا اب تک تجربہ کر چکی ہے، دیکھئے ان کو اور پڑھئے قرآن میں:۔

وَاِنَّا لَجَاعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا	اور ہم بنا دینے والے ہیں (ان ساری چیزوں) کو جو زمین پر ہیں، میدان اُجاڑ

خود سمجھ میں آ جائے گا کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے۔

الانسان خالق سے ٹوٹ کر صرف زمین کے ساتھ لپٹ کر رہ گیا، اور اب جناب سے بڑا کمال یہی سمجھ بیٹھا کہ زمین کے زیوروں میں ایک زیور، اور اس کے گلے کا ہار بن کر اسی کے سینے پر لوٹ پوٹ کر ختم ہو جائے (اپنے خیال میں ختم ہو جائے) جو خالق کے لئے تھا، وہ "گردن خر" کا طوق بن کر بھی رہ جاتا تو کہا جا سکتا تھا۔ ایک زندہ جانور کی گردن کا تو ہار ہے مگر وہ تو اسی خیال سے مست ہو سرور ہے کہ کیچڑ اور مٹی کے لئے زیور بن گیا ہوں۔ انفرادی ہستیوں کا حشر اسے نہیں چونکا سکا تھا کہ نسل کے تسلسل کا بھروسہ اس کے سینے کا مرہم جھوٹا مرہم بنا ہوا تھا، لیکن (خالق کا یہ انتباہ کہ)

"ہم بنا دینے والے ہیں (ان چیزوں کو) جو زمین پر ہیں میدان اُجاڑ"

کیا طفل تسلی کے اس مرہم کو مجروح سینوں پر دیر تک باقی رہنے دے گا، بس۔ ع "چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما" انشاء اللہ تعالیٰ اسی چیست کا جواب آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے قرآنی روشنی میں رکھا جائے گا اور اصحاب کہف کا قصہ اور اس کے نتائج اسی وقت آپ کے سامنے آئیں گے۔ واللہ ولی الامر والتوفیق

عقیدۂ ولدیت کے آثار کے پیدا کردہ حالات میں

ایمان اور ایمانی زندگی کی حفاظت کی راہ

قصۂ اصحاب کہف اب آپ کے سامنے "اصحاب کہف" کا مشہور قصہ قرآن میں آئے گا، جس کی طرف منسوب ہو کر سورۂ کہف کے نام سے یہ سورہ موسوم ہوئی۔

جہاں تک میرا ناچیز خیال ہے "اصحاب کہف" کا قصہ اسی سوال کا جواب ہے، جو پہلے رکوع کے ختم کرنے کے بعد دلوں میں پیدا ہو سکتا ہے، لیکن اس پر بحث کرنے سے پہلے ایک بات سن لیجئے۔ اب تک جو کچھ آپ کے سامنے گزرا، یاد ہوگا اسی "من لدنی جنگ شدید" کی دھمکی کے ساتھ ساتھ ایک بشارت بھی قرآن نے سنائی تھی، فرمایا گیا تھا کہ

وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا

اور بشارت دیجئے ان ایمان لانے والوں کو جو اچھے کام کر رہے ہیں (اس بات کی) کہ ان کے لئے اچھا معاوضہ ہو، ٹھہرے رہیں گے اس میں ہمیشہ ہمیش۔

جو ایمان اور عمل صالح کی زندگی گذار رہے ہیں، اس آیت میں ان کو تسلی دی گئی ہے کہ ان کو ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ جیسے ولدیت کا عقیدہ اپنے آثار و نتائج کو پیدا کرتا چلا جائے گا تا اینکہ "صعید جرز" (اجاڑ میدان) کے بیب مستقبل کو زمین پر منسخ کردہ لے آئے۔ اسی طرح ایمان و عمل صالح کے نتائج "اجر حسن" اور اچھے معاوضہ کی صورت میں بھی مسلسل ان لوگوں کے سامنے بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے جنھوں نے عمل صالح پیدا کرنے والی ایمانی زندگی کے بسر کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے "ماکثین فیه ابداً" (یعنی ڈٹے رہیں گے اسی اجر حسن اور اچھے معاوضہ کی نشاط آفرینیوں اور نشاط انگیزیوں میں ہمیشہ ہمیش) اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مسرت و نشاط کی اس کیفیت میں کسی قسم کا خلل واقع نہ ہوگا، خواہ ما علی الارض (زمین پر جو کچھ ہے) اس کے ساتھ جو صورت حال بھی پیش آجائے۔

مژدہ بنانے کو قرآن نے یہ مژدہ سنا تو دیا ہو اور ماحول کے حالات سے بے تعلق ہو کر پڑھنے والے جب خالص ایمانی احساسات کے تحت قرآن میں اس کو پڑھتے ہیں تو دل میں اطمینان کی خنکی بھی پاتے ہیں اور جو مومن ہو چاہیئے کہ اس خنکی کو اپنے اندر پائے اور قرآن کے الفاظ چونکہ مطلق ہیں یعنی اجر حسن کے ظہور کو موجودہ دنیاوی زندگی یا آخرت کی زندگی کسی ایک کے ساتھ قرآن نے چونکہ محدود و مقید نہیں کیا ہے، اس لئے بظاہر الاولیٰ والآخرۃ دونوں پر اس قرآنی ضمانت اور بشارت کو چاہیئے کہ وہ حاوی ہو۔

مگر ایمان کے ساتھ عقل ماحولی تقاضوں کے زیر اثر ہو کر جب سوچتی ہے، تو اجر معاد منہ تو بڑی بات ہے، خود ایمان ہی کے قیام و بقا کی طرف سے مایوسی کی کیفیت دل پر چھا جاتی ہے، عقیدۂ ولدیت کے آثار نے حالات ہی ایسے پیدا کر دیے ہیں کہ ایمان کو دل میں رکھنا گویا انگاروں کو مٹھی میں بند کئے رہنا ہے۔

(پس) جہاں تک خاکسار کا ذاتی تاثر ہے، اصحاب کہف کے قصے کی ابتدا کرتے ہوئے قرآن میں جو یہ سوالی فقرہ ہے، یعنی۔

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ؕ	کیا تم سوچتے ہو کہ اصحاب کہف اور رقیم والے ہماری نشانیوں میں کوئی عجیب (نشانی) تھے۔

(جس) میں مخاطب کو تعجب اور حیرانی کا مرتکب قرار دینے پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تعجب کا اظہار کیا کس نے تھا؟ اس کے جواب میں بیرونی روایتوں سے استفادہ کی ضرورت بظاہر نہیں (ہے) بلکہ پہلے رکوع کی یہی تبشیری ضمانت آدمی کو حیرت اور تعجب میں مبتلا کرنے کے لئے کافی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ عقیدۂ ولدیت کے آثار جن حالات کو دنیا میں کھینچ کر لانے والے تھے (جن میں ہم اس وقت مبتلا ہیں) (ان کے پیش نظر) سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانے میں آدمی اپنے ایمان کی اور ایمانی قوت سے عمل صالح کے حدود کی حفاظت میں کیا کامیاب ہو سکتا ہے؟ اسی سوال کے جواب میں قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ تم عقیدۂ ولدیت کے آثار ہی کو دیکھ دیکھ کر خفقان میں مبتلا ہوتے چلے جا رہے ہو۔

لہ تفسیری روایات جو بقول امام احمد بن حنبل "غیر معتبر گزرہ روایتوں کا ایک بڑا انبار ہے" ان ہی میں آیا ہے کہ قریش نے مدینہ کے احبار یہود کے پاس نضر بن حارث کی سرکردگی میں ایک وفد بھیجا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی جانچ کے لئے کچھ باتیں بتائیں۔ کہتے ہیں کہ ان علماء یہود نے منجملہ دوسرے سوالوں کے ایک سوال یہ بھی دیا تھا کہ کہف والوں کا قصہ محمدؐ سے پوچھنا، وفد نے واپس آکر باتیں پوچھیں جواب میں قرآن نازل ہوا اسی لئے ابتدا جواب کی اس فقرہ سے کی گئی کہ کہف والوں کے قصے کو تم بہت عجیب بات سمجھتے ہو، وہ تو یہ ہے میں کیا عرض کروں کہ عجبًا کے لفظ کے لئے یہ روایت کس حد تک مفید ہو سکتی ہے جب کہ دوسرے سوالوں کے جوابات جن کی نوعیت یہی تھی، ان میں تعجب کا ذکر نہیں کیا گیا میری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ ایک عام مشہور قصہ کو نبوت کے جانچنے کا معیار علماء یہود نے کس بنا پر ٹھہرایا تھا اور فرض کیجئے کہ قصہ کا علم افواہی ہی سہی آپ کو بھی کسی ذریعہ سے ہو گیا ہو تو اس کا علم نبوت کی دلیل کیسے بن سکتا ہے۔

باہم ایک دوسرے سے گھبرا گھبرا کر پوچھتے ہو کہ آج ایمان کو کیسے بچالیا جائے؟ .... (حالانکہ) ایمان اس قسم کی آزمائشوں سے گزرتا ہی رہا ہے، کہف والے بیچارے جن حالات سے دوچار ہو گئے تھے اور ان ہی حالات میں ایمان و عمل اور اس کے نتائج کے بچالینے میں وہ کامیاب ہوئے، کیا تم اس کو کوئی ایسا عجیب و غریب اور شاذ واقعہ خیال کرتے ہو جو کسی اصول و قانون کے تحت نہیں بلکہ محض اتفاق سے پیش آگیا تھا۔ اور یہی ہو میرے نزدیک اصحاب کہف کے قصہ کا اپنے ماقبل کی آیتوں کے مضمون سے تعلق اب اس کے بعد میں اصحاب کہف کا قصہ اور جن الفاظ میں قرآن نے اس قصہ کو بیان کیا نیز جو نتیجے ان الفاظ سے پیدا ہوتے ہیں، پھر یہ کہ ان نتیجوں سے اس تعجب کا ازالہ کیسے ہو سکتا ہے جس میں ہم اور آپ (جو ایسے ناسازگار ماحول میں ایمان و عمل صالح کی زندگی کو بچالینے کو عجیب بات سمجھے ہوئے ہیں) مبتلا ہیں، بہر حال اب میں ان ہی باتوں کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ شارح الصدور سے دعا ہو کہ دلوں کو کھولے اور جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں دوسروں کی سمجھ میں بھی وہ آجائے۔ وما توفیقی الا باللہ

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت

(۱)

قرآن اٹھا لیجئے، عربی سمجھ میں نہ آتی ہو تو کسی ترجمہ کو پڑھ لیجئے، اصحاب کہف کے قصہ میں سب سے پہلی بات آپ کو یہ نظر آئے گی کہ بجائے ایک کے مجمل و مفصل دو مستقل تعبیروں میں قرآن نے اس قصہ کو بیان کیا ہے۔

جب پناہ لی جوانوں نے کہف (کھوہ) میں تو کہا انہوں نے اے ہمارے پروردگار! عطا کر اپنے پاس سے ہمیں رحمت اور مہیا فرما ہمارے کام کے متعلق ہمیں سوجھ بوجھ، تب تھپک دیا ہم نے ان کے کانوں پر کھوہ میں گنتی کے چند سال، پھر اٹھایا ہم نے ان کو تاکہ ہم یہ جانیں کہ دونوں جتھوں میں سے کس نے احصا کیا اس مدت کا جس میں وہ ٹھہرے (اس غار میں)

یہ قریب قریب ترجمہ ہو ان قرآنی الفاظ کا یعنی "إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَا آتِنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا. فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا. ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصَىٰ لِمَا لَبِثُوا أَمَدًا" قصہ کی یہ پہلی تعبیر ہو جس کا نام میں نے اجمالی تعبیر رکھا ہو گویا کل چار فقروں یا آیتوں پر یہ تعبیر مشتمل ہو، اس کے بعد یہ فرماتے ہوئے کہ "میں ان کا قصہ حق کے ساتھ تمہیں سناتا ہوں" قصہ کی تفصیلی تعبیر قرآن میں پائی جاتی ہو جو کافی طویل ہو، عام طور پر چھوٹی تقطیع والے قرآن کے ڈیڑھ صفحہ سے زیادہ جگہ اس نے لی ہے۔

تفصیلی اور اجمالی دو تعبیروں کی مصلحت

جاننے والے جانتے ہیں کہ اختصار پسندی قرآن کی ایک بڑی خصوصیت ہو لیکن اس خاص قصہ کے متعلق یہ طریقہ کہ پہلے اجمالی تعبیر میں قصہ کو ادا کیا گیا اور پھر اجمال کے بعد اسی قصہ

کو تفصیلی رنگ عطا کیا گیا بجائے خود ایک نئی بات ہے۔ اجمالی اور تفصیلی تعبیروں کے مشتملات پر غور کرنے سے پہلے سوچنے کی بات یہی ہے کہ ایک ہی قصہ کو اجمالی اور تفصیلی دو تعبیروں میں ادا کرنے کی آخر کیا مصلحت ہے؟ اس مصلحت کا صحیح علم تو خود قرآن کے نازل کرنے والے ہی کے پاس ہوگا۔ خاکسار کی جو کچھ یافت اس سلسلہ میں ہے اسے پیش کر دیتا ہے۔

تفصیلی تعبیر کی اس آیت سے یعنی۔

إِنَّهُمْ إِن يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوكُمْ أَوْ يُعِيدُوكُمْ فِي مِلَّتِهِمْ

اگر تمہارے دشمن) تم سے واقف ہو جائیں گے تو تم کو سنگسار کر دیں گے یا اپنے دین سے تم کو مرتد بنا لیں گے۔

سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ایمانی آزمائش اس حد تک پہونچ چکی تھی کہ یا جان سے ہاتھ دھو لیں یا اپنے دین سے تعلق قطع کر کے مرتد بن جائیں۔ غالباً ایمانی آزمائش کی شدت کا یہ آخری نقطہ ہو سکتا ہے لیکن اس جز کا اضافہ تفصیلی تعبیر میں کیا گیا ہے۔ برخلاف اس کے اجمالی تعبیر میں صرف اس کا ذکر ہے کہ پناہ لینے کے لئے کہف والے غار میں چلے گئے تھے لیکن کس چیز سے پناہ لینے کے لئے انہوں نے ایسا کیا تھا۔ اس کا ذکر اجمالی تعبیر میں نہیں ہے صرف ماسبق کے نحوی سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ایمانی آزمائش ہی کا یہ قصہ تھا۔

میرا خیال یہی ہے کہ دنیا میں جیسے عموماً چیزوں کی دو حدیں ہوتی ہیں ایک ابتدائی اور ایک انتہائی اسی طرح ایمانی آزمائش میں دیکھا جاتا ہے کہ انتہائی حد تو اس کی وہی ہے کہ جان دیجئے یا ارتداد اختیار کیجئے اور ابتدائی حال اس کا اس ماحول سے شروع ہوتا ہے جس میں گمراہی، ضلالت کا تسلط اکثریت پر ہو جاتا ہے۔ جان یا مال کا خطرہ تو پیش نہیں آتا، مرتد ہونے پر خواہ مخواہ مجبور تو کسی کو کوئی نہیں کرتا لیکن ملک کی عام سوسائٹی اور مجلسی ماحول سے کنارہ کشی اختیار کئے بغیر دین وایمان اور ان کے اقتضاؤں کی تکمیل بظاہر ناممکن یا کم از کم سخت ترین قسم کی دشواریوں کی زنجیروں میں جکڑی نظر آتی ہو۔ سمجھ میں یہی آتا ہے کہ شاید تفصیلی تعبیر میں ایمانی آزمائش کی آخری حد کے مشکلات پیش نظر ہیں، اور اسی کے مقابلہ میں ایمانی آزمائش کی ابتدائی کیفیت کی دشواریوں سے نجات یابی کی طرف اجمالی تعبیر میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اب آیئے اس نکتہ کو سامنے رکھتے ہوئے قصہ کی اجمالی تعبیر کے مشتملات اور جو نتائج ان سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان پر غور کریں۔

اجمالی تعبیر کے مشتملات و نتائج ظاہر ہے کہ پہلی بات اس تعبیر میں یہی بیان کی گئی ہے کہ ایمانی آزمائش میں مبتلا ہونے والوں نے اپنے علاقے کی عام سوسائٹی سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا، اور اسی فیصلہ کے مطابق وہ "الکہف" (کھوہ) میں پناہ لینے کے لئے چلے گئے، یعنی ایسے مقام کا انتخاب بود و باش کے لئے کیا جہاں اس عہد کی عام بے ایمان، ادھرم سوسائٹی کی گندہ لہروں سے محفوظ رہنے کی ان کو توقع ہو سکتی تھی، واقعہ یہ ہے کہ ایمانی آزمائش کے ان حالات میں علیحدگی اور کنارہ کشی کی یہ تدبیر بذات خود کوئی اہم بات نہیں ہے بلکہ پہلی بات ان حالات میں دل میں اگر آتی ہے تو یہی آتی ہے کہ۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو،

ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو،

مگر ایں شاعرانہ خیال کی خوش گواری اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک کہ خیال صرف خیال ہو لیکن خیالی حدود سے نکل کر عمل کی سرحد میں قدم جس وقت رکھا جاتا ہے اس وقت محسوس ہوتا ہے کہ یہ خیال اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ شاعروں نے اس کو مشہور کر رکھا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ انسان فطرۃً اُنس پسند پیدا ہوا ہے۔ تنہا کسی ایسی جگہ زیادہ دن تک وہ ٹھہر نہیں سکتا جہاں اُنس حاصل کرنے کے لئے اسی کے ہم جنس اور ہم مذاق افراد کا ملنا ناممکن ہو جائے۔ "آدمی فطرۃً مدنی الطبع ہے" اس کا بھی یہی مطلب ہے اور اس سے بھی زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ عام سوسائٹی سے کنارہ کشی کے بعد معاشی سہولتوں کے بھی دروازے عموماً بند ہو جاتے ہیں حالانکہ سدِ رمق ہی کی حد تک سہی جس سے جان کا رشتہ بدن کے ساتھ باقی رہے، کم از کم اس کی ضرورت تو ہر اس شخص کو ہوتی ہے جو فرشتہ نہیں بلکہ آدمی بنا کر دنیا میں پیدا کیا گیا ہے، اور تیسری بات تجربہ کی اس سلسلہ میں وہی ہے جس کا مشاہدہ بداوت کی زندگی رکھنے والوں میں ہمیشہ کیا گیا ہے، قرآن میں بھی بداوت کی اسی زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ذہنی پستی اس حد تک زوال پذیر ہوتے ہوئے پہونچ جاتی ہے کہ

أَجْدَرُ أَلَّا يَعْلَمُوا حُدُودَ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ	زیادہ مستحق ہو جاتے ہیں (بدوی زندگی رکھنے والے) اس امر کے کہ اللہ کی اتاری ہوئی باتوں کے حدود کو نہ پہچانیں

حدیث "دہ مردہ مرد را احمق کند" مشہور بات ہے۔

تہذیب و تمدن کے ماحول سے عزلت گزینی اسی لئے ایک طرف اگر اس ماحول کے سمی اثرات اور زہریلے نتائج سے محفوظ رہنے کی ایک کارگر تدبیر ہے تو دوسری طرف اس قسم کی زندگی قدرتاً دماغ کو کند، عقل کو تاریک بنانے والی بھی چلی جاتی ہے۔

آپ ان باتوں کو اپنے سامنے رکھ لیجئے اور اب غور کیجئے کہ اصحاب کہف کے قصہ کی اجمالی تعبیر کی آیتوں میں سب سے پہلی بات تو آپ کو یہی نظر آئے گی کہ کہفی زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کرنے والوں کو قرآن بجائے فرد واحد کے "فتیہ"[1] (یعنی نوجوانوں کی ایک ٹولی) قرار دیتا ہے۔ آپ چاہیں تو اس سے یہ نتیجہ پیدا کر سکتے ہیں کہ ایمانی آزمائش کے زمانے میں

---

[1] یہ خیال کرکے کہ سن رسیدہ ہونے کے بعد آدمی جس ماحول کا عادی ہو جائے اس سے الگ ہونا اس کے لئے بہت دشوار ہو جاتا ہے بعض حضرات نے فتیہ "نوجوانوں" کے لفظ سے نکتہ پیدا کیا ہے کہ سن رسیدہ سال لوگوں کو کہفی زندگی کی رفاقت کے لئے نہ لینا چاہئے مگر میرا خیال یہ ہے کہ رفاقت پر اگر کہنہ سال لوگ آمادہ نہ ہوں تو یہ الگ بات ہے۔ لیکن اگر وہ ساتھ دینے پر تیار ہوں تو محض کہنہ سالی کی وجہ سے ان کو چھوڑنا نہ چاہئے قرآن میں "فتیہ" کا لفظ ضرور آیا ہے لیکن کہف کے رفقاء جب نوجوان ہی تھے تو قرآن ان کی تعبیر اگر فتیہ کے لفظ سے نہ کرتا تو اور کس سے کرتا۔ بہر حال میرے نزدیک یہ واقعہ کا اظہار ہے خواہ مخواہ اس سے نکتہ آفرینی کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ ۱۲

جب یہ محسوس ہو رہا ہو کہ تہذیب و تمدن کے عام ماحول میں رہ کر ایمان و عمل صالح کی زندگی کے اقتضاؤں کی تکمیل میں کامیابی نہیں ہو سکتی اور نجات کی راہ یہی نظر آتی ہو کہ اس ماحول سے رشتہ منقطع کر کے بود و باش کے لئے کسی ایسی جگہ کا انتخاب کیا جائے جو اس قسم کے خبیث شیطانی ماحول سے دور ہو، تو قرآن سے یہ اشارہ ملتا ہو کہ اپنے ہم مذاق ہم مشرب افراد کو آمادہ کیا جائے کہ اس کہفی زندگی میں ساتھ دیکر ایک دوسرے کے لئے باعث انس بھی ثابت ہوں اور ضرورت کے وقت باہم ایک دوسرے کی دست گیری و غمگساری بھی کر سکتے ہوں۔ دوسری بات قصہ کی اسی اجمالی تعبیر سے جو سمجھ میں آتی ہو

وہ کہفی زندگی کا فیصلہ کرنے والوں کا یہ نقطۂ نظر ہو کہ انہوں نے اس زندگی میں قدم رکھتے ہوئے ہر طرف سے ٹوٹ کر اپنی پرورش کے حقیقی سرچشمہ کے ساتھ لو لگائی تھی فرمایا گیا ہو کہ فقالوا ربنا (انہوں نے کہا کہ اے ہمارے پروردگار!) جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہو کہ ربوبیت اور پرورش کے جو جھوٹے یا مجازی مظاہر ہیں ان سے یک لخت بے تعلق ہو کر اس نئی زندگی کی راہ میں اپنے "رب صادق" اور "سچے پروردگار" کے دامن کو انہوں نے تھام لیا تھا، وہ عام اسباب کی دنیا سے کنارہ کش ہو رہے تھے، لیکن جو اسباب کا محتاج بنا کر پیدا کیا گیا ہو وہ ان سے الگ ہو کر کیسے جی سکتا ہو اسی لئے آپ دیکھ رہے ہیں کہ انھوں نے مجازی اسباب سے تو علیحدگی اختیار کی تھی لیکن جو مسبب الاسباب اور اسباب کا پیدا کرنے والا ہو اس کو پوری طاقت کے ساتھ پکڑے ہوئے تھے اور اسی کے ساتھ اپنے احتیاجی تعلقات کو وابستہ کر کے دعا کر رہے تھے۔ (کہ)

رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً	اے ہمارے پروردگار عطا فرما اپنے پاس سے ہمیں "رحمت"
وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا	اور فراہم فرما! ہمارے معاملہ میں "رشد"

الفاظ دعا کی معنویت | "رشد" عربی زبان کا لفظ ہو جسے قرآن میں بار بار استعمال کیا گیا ہو۔ خصوصاً "غی" کے مقابلہ میں "رشد" کے اسی لفظ کو استعمال کر کے قرآن یہی بتا رہا ہو کہ انسان کی فکری و نظری قوت سے اس کا تعلق ہو۔ یہی فکری و نظری قوت جب غلط نتیجہ تک پہونچتی ہو تو اس کا نام "غی" ہو اور ٹھیک اصل حقیقت تک فکر و نظر کی رسائی کی صلاحیت کا نام "رشد" ہو بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دعا کے دوسرے فقرے کا تعلق چونکہ باطنی احساسات اور معنوی رجحانات سے ہو تو مطلب اس کا یہی ہوا کہ سوسائٹی کے گندے اور خبیث رجحانات کے مقابلہ میں جس ایمانی مسلک کی توفیق ان کو میسر آئی تھی جس کی تعبیر امرنا کے لفظ سے دعا میں کی گئی ہو، اپنے اسی ایمانی مسلک کے متعلق حق تعالیٰ سے وہ آرزو کر رہے تھے کہ غی اور گمراہی سے بچاتے ہوئے ان کی فکر و نظر کی قوتوں میں رشد کی روشنی پیدا کی جائے یعنی ایمانی ترقی اور باطنی سلوک کی راہ میں چاہتے تھے کہ جو قدم بھی اٹھے سچا قدم اٹھے رشد کی یہی معنوی روشنی ان کو آگے بڑھاتے ہوئے لئے چلی جائے۔

اس تشریح کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی دعا کے پہلے فقرے میں "رحمت" کا لفظ جو پایا جاتا ہو اس کا مطلب بھی متعین ہو جاتا ہو مطلب یہ ہو کہ یوں تو رحمت اور وہ بھی رب السماوات والارض کی رحمت قرآن ہر چیز میں سمائی ہوئی ہو

"وَسِعَتْ رَحْمَتِی کُلَّ شَیْءٍ" (ہر شے میں میری رحمت پھیلی ہوئی ہے) قرآن ہی کی آیت ہے، مگر یہاں "رحمت" کے اس لفظ کا استعمال جب "رشد" کی معنوی و باطنی صفت کے مقابلہ میں کیا گیا ہے تو اس قرینہ سے یہی سمجھنا چاہیے کہ معنوی و باطنی ضرورتوں کے مقابلہ میں ان حاجتوں کے متعلق پروردگار عالم کی رحمت کی استدعا وہ کر رہے تھے جن کی تعبیر ہم ظاہری اور معاشی ضرورتوں سے کر سکتے ہیں، حاصل یہی ہوا کہ ملک کی عام سوسائٹی سے علیحدگی کے بعد قدرتاً جیسا کہ عرض کر چکا ہوں یہی دو باتیں سب سے زیادہ اہم ہوتی ہیں۔ یعنی معاشی ضرورتوں کا مسئلہ اور فکری و نظری قوتوں کے انحطاط و زوال کا خطرہ، الغرض ظاہر و باطن کی ان ہی دونوں اہم ضرورتوں میں حق تعالیٰ کی غیبی پشت پناہیوں کی درخواست پر ان کی یہ دعا کم از کم اس خاکسار کو مشتمل نظر آرہی ہے۔

<u>قدرت کی طرف سے انتظامات</u> اس کے بعد میرا خیال ہے کہ "رشد" کی درخواست دعا کے دوسرے فقرے میں جوان کی طرف سے پیش ہوئی ہے اگرچہ یقینی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی اس آرزو کی تکمیل کے لئے قدرت کی طرف سے کہفی زندگی میں کیا کیا انتظامات کئے گئے تھے۔ مگر بظاہر جہاں تک سمجھ میں آتا ہے کہ ایمانیوں کی یہ ٹولی ایک دوسرے کے ساتھ حق[1] اور صبر کی تواصی کے فرض کو ادا کر کے جیسا چاہیئے ان کے "رشد" کی حفاظت کرتی ہوگی وہیں اس پر کیوں تعجب کیا جائے کہ ایمانی راہ کے دوسرے چلنے والے جوان سے پہلے گذر چکے تھے ان کے تعلیمات اور مشوروں سے بھی مستفید ہونے کا موقع ان کی رقمی یادگاروں سے ان کو عزلت اور کنارہ کشی کی زندگی میں مل گیا ہو، بالفاظ دگر ان کے پاس دوسرے انبیاء علیہم السلام کے صحیفوں میں سے کچھ صحائف و مخطوطات اور ان ہی پیغمبروں کے ماننے والوں کی لکھی ہوئی کچھ کتابیں ہوں جن سے ان کی رشدی بصیرت روشنی حاصل کرتی ہو تو اس کے انکار کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی بلکہ یہ جو "الکہف" کے ساتھ "الرقیم" کے لفظ کی طرف بھی ان کی اضافت کی گئی ہے، تفسیر کی عام کتابوں میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی طرف جن کے متعلق اگرچہ یہ قول بھی منسوب کیا گیا ہے کہ۔

لا ادری ما الرقیم — میں نہیں جانتا کہ "الرقیم" کیا چیز ہے

تو ان ہی تفسیر طلب ان ہی کا یہ قول بھی ملتا ہے، درمنثور میں ابن المنذر اور ابن ابی حاتم کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ۔

من طریق علی عن ابن عباس قال الرقیم الکتاب (ص ۲۱۱ ج ۴) — علی کی روایت ابن عباس سے یہ ہے کہ "الرقیم" کتاب ہے۔

علی جن کا پورا نام علی بن ابی طلحۃ الہاشمی ہے، سمجھا جاتا ہے کہ ابن عباس کے تفسیری اقوال کی روایت میں ان کا کیا مرتبہ ہے،[2] وہ سمجھ سکتے ہیں کہ الکتاب کے ساتھ الرقیم کی تفسیر میں کتنی قوت ہے۔

بہر حال میری غرض یہی ہے کہ "الرقیم" سے کیا مراد ہے؟ اگر اس کا تعین کرنا ضروری ہو، تو لغت سے بھی یہی معلوم ہوتا

---

[1] حق اور صبر کی ایک دوسرے کو وصیت دینا اہل ایمان کی قرآنی خصوصیت ہے سورۂ والعصر میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۱۲
[2] [illegible]

ہو کہ کتاب اور لکھی ہوئی چیز کو "الرقیم" کہتے تھے، اور صحابہ کے اقوال میں بھی مستند ترین قول یہی ہو کہ الرقیم سے مراد الکتاب ہو۔ ایسی صورت میں کیوں نہ سمجھا جائے کہ ان کی دعاء کے دوسرے فقرے یعنی اپنے امر کے متعلق "رشد" کی جس روشنی کے مہیا کرنے کی درخواست انھوں نے بارگاہ الٰہی میں پیش کی تھی اسی درخواست کی منظوری "الرقیم" کو مہیا کر کے قدرت کی طرف سے ہوئی تھی۔

خلاصہ یہ ہو کہ کہفی زندگی کی یہ دونوں اہم ضرورتیں یعنی معاشی سہولتیں ان کے لئے "من لدنی" طور پر فراہم کی جائیں اور باطنی روشنی کی بقا وارتقاء ان دونوں ضرورتوں کا انتظام اپنے "رب" کے سپرد کر کے کہفی زندگی میں وہ داخل ہو گئے اس کے بعد قصہ کی اجمالی تعبیر میں دو فقرے اور پائے جاتے ہیں۔ پہلا فقرہ تو یہ ہو کہ۔

فَضَرَبْنَا عَلَىٰ اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا	پس تھپک دیا ہم نے ان کے کانوں پر کہف میں چند سال گنتی کے۔

بظاہر اس سے یہی سمجھ میں آتا ہو کہ "رشد" کی معنوی بصیرت ہی کی حفاظت کا یہ سامان بھی قدرت کی طرف سے ان کے لئے کیا گیا تھا مطلب یہ ہو کہ فاسد اور بگڑی ہوئی سوسائٹی سے جسمانی طور پر علاحدگی عموماً اس وقت تک چنداں مفید ثابت نہیں ہوتی جب تک کہ سوسائٹی کے فساد اور بگاڑ کے اس عہد کے ذکر و اذکار گپ شپ جھوٹ خرافات سے بھی اپنے آپ کو بے تعلق نہ کر لیا جائے۔ .... اوروں کا خیال کچھ ہی ہو لیکن اپنا تجربہ تو یہی ہو کہ "رشد" و "ہدایت" کی لاہوتی روشنی سے صحیح طور پر استفادہ ان لوگوں کے لئے مشکل ہو جاتا ہو جنھوں نے "اسی روشنی" کے ساتھ ان ظلمات اور تاریکیوں کی موجوں کو بھی اپنے اندر گذرنے کے لئے آزادی دے رکھی ہو جو فاسد سوسائٹی کے دل و دماغ سے نکل نکل کر ماحول کو متاثر کر رہی ہوں۔

کچھ بھی ہو اپنا ذہن تو مذکورۂ بالا آیت جس میں فرمایا گیا ہو کہ چند سال کے لئے ان کے کانوں کو ہم نے تھپک دیا تھا، یعنی فضربنا علیٰ اذانہم فی الکھف سنین عددا۔ اس سے ادھر منتقل ہوتا ہو کہ رشد کی جس روشنی کی فراہمی کی استدعا بارگاہ ربانی میں ان لوگوں نے پیش کی تھی اسی کے سلسلہ میں اور جو قدرتی تائید یں ان کو میسر آئی ہوں گی ان ہی کے ساتھ شاید یہ بھی کیا گیا کہ اپنے ملک کی سوسائٹی کے جس متعفن اور سڑے ہوئے ماحول سے نکل کر کہفی زندگی کے نیچے انھوں نے پناہ لی تھی اس سوسائٹی میں گزرنے والے حوادث و واقعات اور اس میں پیدا ہونے والے گندے افکار و خیالات سے بھی ان کے کانوں کا رشتہ توڑ دیا گیا تھا، اور بجائے اس کے اس کہفی زندگی میں ان کے "رشد" کی بقاء اور ارتقا کا جو سامان کیا گیا تھا اسی میں وہ مگن تھے۔

حاشیہ متعلقہ صفحہ ۱۵۸۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ امام احمد بن حنبل فرمایا کرتے تھے کہ مصر میں علی ابن ابی طلحہ کی روایت سے ابن عباس کی تفسیر کا جو نسخہ پایا جاتا ہو اگر بغداد سے صرف اسی نسخہ کو حاصل کرنے کے لئے مصر کا سفر کوئی کرے تو یہ کوئی بڑی بات نہ ہوگی (اتقان) بخاری نے بھی ابن عباس کے تفسیری اقوال کے نقل کرنے میں اسی طریقہ کو ترجیح دی ہو ۱۲۔

ایمان اور عمل صالح کے نتائج و ثمرات

اجمالی تعبیر کا مفاد اصحاب کہف کے قصہ کی اجمالی تعبیر سے قرآن کی جن آیتوں کا تعلق ہے ان سے صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ ناموافق حالات پر غالب آنے یا ان سے مقابلہ کرنے کا امکان جب محسوس ہو کہ باقی نہیں رہا ہے تو اس وقت ایمان و عمل صالح کی زندگی کے بچا لینے کی تدبیر یہ ہے کہ کہفی زندگی اختیار کر لی جائے، اور یہ کہ کہفی زندگی میں معاشی دشواریوں کے ساتھ فکری جمود اور ذہنی خمود کا خطرہ قدرتاً جو پیدا ہوتا ہے، توجہ دلائی گئی ہے کہ حق تعالیٰ سے ان دونوں خطروں سے محفوظ رہنے کی دعا کی جائے۔ اور یہ وہی مشورہ ہے جس کی طرف ان صحیح حدیثوں میں اشارہ کیا گیا ہے جن میں آیا ہے کہ ایک ایسا وقت بھی آنے والا ہے جس میں القاعد (بیٹھنے والا) القائم (کھڑا رہنے والے) سے، اور الماشی (معمولی چال چلنے والا) الساعی (دوڑنے والے) سے بہتر ہوگا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حکم دیا ہے کہ اس زمانہ میں بجائے میدان میں آنے کے، چاہیئے کہ مومن اپنے گھر کا ٹاٹ بن کر پڑ جائے۔ بخاری کی مشہور روایت ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:۔

یوشک ان یکون خیر مال المسلم غنم یتبع بھا شعف الجبال ومواقع القطر یفر بدینہ من الفتن۔

قریب ہو کہ مسلمان کا بہترین مال بکریاں ہوں گی، جن کے پیچھے پیچھے پہاڑوں کی چوٹیوں، اور پانی کے چشموں کی طرف اپنے دین کو فتنوں سے بچانے کے لیے بھاگا کا پھرے گا۔

[اس] کا مفاد بھی یہی ہے، پیشین گوئی کی گئی ہے کہ مستقبل میں بھی مسلمانوں کو اس قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑے گا جیسے کی زندگی کے دورے نبوت کبری عامہ جب گذر رہی تھی تو قرآن ہی میں اسی عہد کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔

ان الذین اجرموا کانوا من الذین ... جو مجرم ہیں وہ ایمان لانے والوں سے ہنستے ہیں

امنوا یضحکون، واذا مرّوا بھم یتغامزون، واذا انقلبوا الیٰ اھلھم انقلبوا فکھین، واذا راؤھم قالوا ان ھؤلاء لضالّون ۔ (المطففین)

اور جب ان پر گذرتے تو ان کے متعلق باہم ایک دوسرے چشمک زنی کرتے ہیں، اور جب واپس لوٹتے ہیں اپنے گھر والوں کی طرف تو باتیں بناتے ہیں، اور جب ایمان والوں کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہی لوگ گم کردہ راہ ہیں۔

صحابہ کرامؓ کے سامنے اس قسم کے واقعات گذر رہے تھے کہ سنگ و خشت سے بنی ہوئی مسلمانوں کی کوئی عبادگاہ نہیں بلکہ اسلام کے سارے احترامی عناصر کا تقدس جس ذات گرامی کے احترام و تقدس کے ساتھ وابستہ ہے، یعنی خود سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وسلم) سجدے میں ہیں، پشت مبارک پر اونٹنی کی بچہ دانی ڈال دی گئی ہے، اور صحابہ کرامؓ جیسے تر و تازہ ایمان و اسلام رکھنے والے حضرات پیغمبر کو اس حال میں دیکھتے ہیں۔ ابن مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابی کا بیان امام بخاری ہی نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس حال کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ۔

وانا انظر ولا اغنی عنہ لو کانت لی منعۃ۔

میں رسول اللہؐ کو اس حال میں دیکھتا اور کچھ کام نہ آسکتا، کاش! میرے پاس مدافعت کی قوت ہوتی۔

تفصیلی تعبیر کے اشارات

بہرحال قصہ کی اجمالی تعبیر سے صرف اتنی بات معلوم ہوئی کہ اپنی دینی زندگی کو چاہا جائے تو ہر حال میں بچالیا جاسکتا ہے، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا اصحاب کہف کی [تفصیلی] سرگذشت کا تعلق جہاں تک میرا خیال ہے اس بشارت سے ہے جس میں اطمینان دلایا گیا ہے کہ ایمان و عمل صالح کی زندگی کے اجر حسن یا نتائج و ثمرات سے اہل ایمان ہر حال میں مستفید و متمتع ہوتے رہتے ہیں۔

اصحاب کہف کے قصہ کی تفصیلی تعبیر قرآن کے جس بیان کو میں قرار دے رہا ہوں اگر غور کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ اسی دعوے کے ثبوت کی گویا یہ ایک تاریخی مثال ہے، بتایا گیا ہے کہ ....

انھم فتیۃٌ امنوا بربھم

(یہ کہف والے) چند نوجوان تھے، ایمان لے آئے تھے وہ اپنے رب پر۔

"اپنے رب پر ایمان لانا" یہی ان نوجوانوں کا اختیاری فعل تھا، چاہتے تو جیسے ان کی قوم کی اکثریت اپنی اس پرورش کرنے والی قوت سے لاپروائی اور بے اعتنائی کا طریقہ اختیار کیے ہوئے زندگی گذار رہی تھی، وہ بھی اسی طریقہ کو اختیار کرلیتے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا، اور اپنے رب کی یافت کا جو قدرتی طریقہ ایمان کا ہے اس کا رشتہ "رب" سے قائم کرکے مومن بن گیے، یہاں تک تو ان کا کام تھا جسے ان نوجوانوں نے انجام دیا، اب سنئے اسی ایمان کا اجر حسن ان کے سامنے کن کن شکلوں میں مسلسل آتا چلا گیا، اس کے بعد اطلاع دی گئی ہو:۔

وَزِدْنَاهُمْ هُدًى — اور ہم نے ہُدیٰ یعنی (راست بینی اور حق یابی) میں ان کو بڑھا دیا۔

باطنی نعمت | سمجھ آپ نے یہ کیا کہا گیا؟ نوجوانوں نے اپنے رب پر ایمان لانے کے فرض کو پورا کیا تھا، تب اس کا معاوضہ اور اجرِ حسن ان کو ان کے رب کی طرف سے ایک معنوی دولت، اور باطنی نعمت کی شکل میں عطا کیا گیا، یعنی باہر میں تو بظاہر کسی قسم کی کوئی ایسی چیز ان نوجوانوں کے سامنے نہیں آئی، جسے دیکھنے والے ان کے ایمان کا اجر و معاوضہ قرار دیتے، لیکن اندر ہی اندر ان کی بصیرت کی روشنی میں قدرت کی طرف سے اضافہ شروع ہوا، ایمان سے پہلے جن باتوں کا تصور بھی ان کے لیے دشوار بلکہ شاید ناممکن تھا اب ان ہی کو وہ پا رہے تھے اور قدرت کی پیدا کی ہوئی اس معنوی روشنی میں ان ہی چیزوں کو وہ دیکھ رہے تھے، تا اینکہ باطنی سلوک کی اس راہ میں چلتے ہوئے وہ ایک ایسے مقام تک پہونچ گئے، جس کی خبر قرآن نے اسی کے بعد ان الفاظ میں دی ہے:۔

وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ۔ — اور باندھ دیا ہم نے ان کے قلوب یعنی دلوں پر۔

"قلوب" قلب کی جمع ہے، یہ وجودِ انسانی کے اس عنصر کی تعبیر ہے، جس کا کام ہی انقلاب یا یہ کہ الٹنا پلٹنا رہے یہی ہے، لامحدود اسباب کا یہ گھنا جنگل جس کا نام عالم یا دنیا ہے، اس عالم کے رب سے جب تک انسانی وجود کا یہ چنچل حصہ بیگانہ اور نامانوس رہتا ہے، اس وقت تک [برابر] ایک سبب سے منتقل ہو کر دوسرے سبب اور دوسرے سے تیسرے سبب کی وادی میں سراسیمہ ہو کر بھٹکتا [رہتا] ہے، ....

لیکن ایمان کی راہ سے، اپنی پرورش کرنے والی قوت کو جو پا لیتے ہیں اور اس ایمان کے معاوضہ میں معنوی بصیرت کی جو روشنی ان کو رب کی طرف سے ارزانی ہوتی ہے اس باطنی روشنی کی شدت جس حد تک بڑھتی جاتی ہے اسی حد تک ان کے آگے اصل حقیقت اور "ربوبیت" کا صادق نظارہ بے نقاب ہونے لگتا ہے تا اینکہ وہی "قلب مضطرب" یا انسانی وجود کا "بے چین عنصر" سکون و قرار کے ایک ایسے خنک برف خانے میں اپنے آپ کو پاتا ہے جس کی صحیح تعبیر یہی ہو سکتی ہے کہ ہر طرف سے توڑ کر اسی قلب کو "ربوبیت" کے حقیقی سرچشمہ کے ساتھ گویا باندھ دیا گیا ہے۔

طمانیت و سکون کی اسی کیفیت کو لوگ روپے کے ڈھیروں، بینک کے پاس بکوں، اور سرمایہ کی دوسری منقولہ وغیر منقولہ جائدادوں کے اندر ڈھونڈھتے ہیں، اگر ان چیزوں کے پا لینے کے بعد بھی وہ ڈھونڈھتے ہی رہتے ہیں، لیکن قلب کے مربوط ہو جانے کی مذکورۂ بالا باطنی نعمت سے جو سرفراز کیا جاتا ہے اس کے پاس باہر میں خواہ کچھ ہو یا نہ ہو لیکن اپنے باطن کو ہر چیز سے کسا کسایا پاتا ہے، دماغ نام رکھئے یا دل، عقل کہیے یا دانش، ڈانواڈول رہنے کی لعنت سے اسکو نجات مل جاتی، اور اسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے اقدامات کی جرأت اس میں پیدا ہو جاتی ہے جن کو

غیر مربوط قلب والے شاید سوچ بھی نہیں سکتے۔ خود ان ہی "فتیہ" یعنی نوجوانوں کے متعلق [یہ خبر دیکر] کہ

اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا۔	(اور دیکھو) جب وہ کھڑے ہوئے، پھر بولے، ہمارا پالنے والا آسمانوں اور زمین کا پالنے والا ہے، ہرگز نہیں اس کے سوا ہم کسی الٰہ کو پکاریں گے اگر ایسی

بات ہم نے کہی تو (حقیقت سے) یہ ہٹی ہوئی بات ہوگی۔

هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍ بَيِّنٍ ؕ	اس ہماری قوم نے (خالق عالم) کے سوا دوسروں کو اپنا معبود ٹھہرالیا ہو، کیوں نہیں لاتی (اپنے اس دعویٰ) پر کوئی ایسی کھلی ہوئی دلیل جو عقل پر چھا جائے۔

قرآن نے بیان کیا ہے کہ انھوں نے کہا:۔

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ؕ	اور جب تم لوگ (اے نوجوانوں) کنارہ کش ہو گئے ان سے (یعنی اپنی قوم سے) اور ان چیزوں سے جنھیں اللہ (خالقِ عالم) کے سوا وہ پوجتے ہیں، تو آؤ پناہ لو الکہف (کھوہ) میں، کھول دے گا تمھارے لیے تمھارا پروردگار اپنی رحمت کو اور مہیا کرے گا تمھارے معاملہ میں سہولتیں۔

جس سے معلوم ہوا کہ اپنی پوری قوم جن میں ان کے اعزہ و رشتہ دار بھی ہوں گے، وہ بھی ہوں گے جن سے معاشی ضرورتوں کے حل میں ان کو امداد ملتی ہوگی، دوست ہوں گے، احباب ہوں گے، مگر ایمان کی بدولت (اسی کا اجر و معاوضہ) ان کو اس بلند ہمتی کی شکل میں ملا کہ اپنی تمام ضرورتوں اور دلچسپیوں کے ساز و سامان کو ٹھکرا کر اٹھ کھڑے ہوئے ان کو بھی چھوڑا، اور جن مفروضہ معبودوں کے ساتھ ان کی قوم بلاوجہ الجھی ہوئی تھی ان سے بھی قطعی بے تعلق ہو کر اب ان میں اس کی صلاحیت بھی پیدا ہو گئی کہ آبادی کو چھوڑ کر پہاڑ کے کھوہ میں بھی اپنے پالنے والے رب کی پروردگاری کا تماشا دیکھیں، ان کی اسی صلاحیت کو دیکھ کر ایک نے دوسرے کے آگے "الکہف" (کھوہ) کی تجویز پیش کی، اور کتنی قوت کتنی طاقت کے ساتھ پیش کی، بغیر کسی جھجک اور تذبذب کے

باہم ایک دوسرے کو یقین دلا رہے تھے کہ آبادیوں میں پالنے والے رب کی پروردگاری اور اس کی مہربانیوں کا تجربہ ضرور ضرور وہاں بھی ہم لوگوں کو کرایا جائے گا جہاں عالم اسباب کے چکروں میں پھڑپھڑانے والی عقل ان کا تصور بھی نہیں کر سکتی، گویا وہ کہہ رہے تھے جہاں کچھ نظر نہیں آرہا ہو وہیں سب کچھ تمہیں میسر آئے گا۔ . . .

قصہ کی اجمالی تعبیر میں تو ان کی دُعا ر کا تذکرہ کیا گیا تھا، لیکن یہاں ان کے ایمان کے بعد اس یقین و اعتماد کی قرآن خبر دے رہا ہو جس سے اپنے رب پر ایمان لانے کے بعد وہ سرفراز ہوئے تھے، سچ پوچھیے تو یہ بھی ایمان ہی کے اجر حسن اور اچھے معاوضہ کا ایک قالب تھا جو دوسرے معاوضوں کے ساتھ ساتھ قدرت کی طرف سے اُن کو عطا ہوا تھا، ایمان سے محروم بدبخت بے ایمان تک کے روگی غریب کو اس یقین اس اذعان و اطمینان کی ہوا بھی چھو سکتی ہو؟ اور جیسے قصہ کی اجمالی تعبیر میں ان کی دعا ر دو اجزاء پر مشتمل تھی، ایک کا تعلق جیسا کہ خاکسار نے عرض کیا تھا، بظاہر معاشی سہولتوں سے معلوم ہوتا ہو اور دوسرے جزء میں استدعا کی گئی تھی کہ رشد یا فکری و ذہنی سوجھ بوجھ کی حفاظت کی جائے۔ اسی طرح قصہ کی تفصیلی تعبیر میں بھی بجائے ایک کے دو چیزوں کی فراہمی کا یقین باہم ایک دوسرے کو دلا رہے ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ یہاں بھی ان دونوں اجزاء سے وہی دو باتیں مراد نہ ہوں جن کی آرزو اپنی دعا میں انہوں نے کی تھی۔

بہر حال اس وقت تک تو اصحاب کہف کے ایمان کا اجر و صلہ ان کے اندر پیدا ہو ہو کر ان کی تقویت و حفاظت کا ذریعہ بن رہا اور اسی کی پشت پناہی میں ایک ایسی جگہ کو چھوڑ کر جو ان کا وطن مالوف تھا، اور جیسا کہ قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہو کہ وہ المدینہ یا ایسا شہر تھا جس کے بازاروں میں "اَزْکٰی طَعَامًا" (صاف ستھرا کھانا) خریداروں کو مل جاتا تھا اور بیان کرنے والوں کا بیان اگر صحیح ہو کہ یہ ایشیاء کوچک کی قدیم حکومت ایونیا کا مشہور پایۂ تخت انفیسس[1] تھا، تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہاں وہ سب کچھ مل رہا تھا

---

(۱) عام طور پر اصحاب کہف کے وطن کا نام اسلامی ذخیرہ اسلامی کتابوں میں انفیسس یا افسوس بتایا گیا ہو، بیکی صاحب نے اپنی کتاب ... دی آن بائبل ہسٹری میں لکھا ہو کہ یہ شہر ایونیا کا دارالخلافہ تھا اور ارتمس دیوی کے مندر نیز اپنے فلسفہ اور بدکاری کی وجہ سے بہت مشہور تھا، ان ہی کا بیان ہو کہ اس شہر کی آبادی کچھ آسٹریا گٹ کے یوروپین باشندوں پر اور کچھ مشرقی قوموں کے افراد پر مشتمل تھی، اسی لئے یہاں کی بُت پرستی میں مغربی و مشرقی دونوں علاقوں کے مشرکانہ رسوم کا اثر تھا۔ ارتمس دیوی یورپ کی مشرک قوموں کی دیوی تھی، اس کا مندر شہر انفیسس میں تھا، کہتے ہیں کہ دو سو بیس سال میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی تھی، ۱۲۷ سنگی ستونوں پر اس مندر کی چھت قائم تھی، ایک ایک ستون اس مندر کا مختلف بادشاہوں کی طرف سے بطور نذرانہ کے مندر پر چڑھایا گیا تھا، ہر ستون ساٹھ فٹ اونچا تھا۔ خود ارتمس دیوی کی مورتی تو لکڑی کی بنی ہوئی تھی اور عقیدہ تھا کہ آسمان سے نازل ہوئی ہو۔ لیکن بازاروں میں اسی لکڑی کی مورتی بھی بکثرت فروخت ہوتا تھا، تیرتھوں میں آنے والے خرید خرید کر اپنے ملک میں اسے بطور تحفہ لے جاتے تھے۔ فلسفہ کا زور بھی اس شہر میں اس حد تک ترقی کر کے پہونچ گیا تھا کہ آج تک گریک کا فلسفہ ایونیا کی طرف منسوب ہو کر یونانی فلسفہ کے نام سے موسوم ہو۔ سحر اور جادو میں بھی اس شہر کے باشندے مشہور تھے، اسی کے ساتھ عیاشی اور خود نفسی میں بھی یہ اپنی آپ ہی نظیر تھے اب کھنڈر کی صورت میں دنیا نے جس شہر کے دانے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جس کا آدمی اپنا سکوں و زمینی زندگی میں محتاج ہو۔

لیکن سب کچھ چھوڑ کر جہاں کچھ نہ تھا، وہیں جانے کے لئے اس یقین کے ساتھ آمادہ ہو گئے کہ سب کچھ وہیں مل جائے گا وہ بھی جس کے بغیر جسدی نظام قائم نہیں رہ سکتا اور وہ بھی جس کے بغیر آدمی کی روحانی زندگی موت بن جاتی ہو۔

خارجی مقامات | ان کے ایمان نے اس یقین کو تو ان کے اندر پیدا کیا تھا، اور اب ان سے باہر دیکھئے قرآن دکھا رہا ہو۔

وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَت تَّزَاوَرُ عَن كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَإِذَا غَرَبَت تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ (الکہف)

اور دیکھتا ہو تو آفتاب کو جب طلوع ہوتا ہو تو کترا کر گزرتا ہو ان کے کہف سے داہنی طرف، اور جب غروب ہوتا ہو تو کاٹتا ہو بائیں طرف، اور وہ لوگ (مقیم ہیں) اسی کہف کے فجوہ میں۔

سائنٹفک آرام گاہ | دیکھ رہے ہیں آپ ایمان کے اجر حسن کو، جس کوہستانی ملاوے میں سر چھپانے کا سوال بھی بڑا اہم سوال تھا، دیکھئے پہنچنے کے بعد قرآن کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہو کہ ایک بہترین صحت بخش سائنٹفک آرام گاہ ان نوجوانوں کو مل گئی۔

سرسری طور پر اگرچہ قرآن کے مذکورہ بالا بیان کا خلاصہ یہ کہہ دیا جاتا ہو کہ ایک غار میں وہ چلے گئے تھے، جس میں دھوپ کی گذر نہ تھی [لیکن اس بارے میں زیادہ نہیں] اتنا تو بہر حال لوگوں کو سمجھنا چاہیئے تھا کہ کہف بھی عربی ہی زبان کا لفظ ہے اور غار بھی، قرآن نے بجائے غار کے کہف کا لفظ یہاں استعمال کیوں کیا؟

واقعہ یہ ہو کہ کہف کا تعلق بھی اس میں شک نہیں کہ عموماً پہاڑوں ہی سے ہوتا ہو جیسے غار کا لیکن اپنی حقیقت کے لحاظ سے دونوں مختلف چیزیں ہیں۔ حرا یا ثور کے تاریخی غار بلاشبہ غار تھے جن میں بمشکل چند آدمیوں کے لئے گنجائش پیدا ہوتی ہو اسی لئے ثور کے غار کو قرآن نے بھی غار ہی کے نام سے موسوم کیا ہو لیکن ان ہی پہاڑوں کے شکم میں خاص قسم کا خلاء قدرتی عوامل کے تحت پیدا ہو جاتا ہو جس کی وسعت کبھی میلوں کی ہوتی ہو، جنوبی ہند میں "بیجانگر" کی راجدھانی جن پہاڑوں کے درمیان تھی ان میں[۱] بیان کیا گیا ہو کہ ایسے قدرتی طویل تہ خانے پائے جاتے تھے جن میں ہزارہا ہزار آدمی غائب ہو جاتے تھے اور مہینوں ان

۱؎ بیجاپور کی تاریخ میں زبیری نے لکھا ہو: "در اصل شہر بیجانگر و حوالی آں کوہ ہا ست مشتمل بر رخنہ و غار ہائے عمیق کہ سہ فرسخ (۹ میل) چہار فرسخ (۱۲ میل) اندرون رخنہا راہ تواں رفت" یہ بھی ہو کہ کہیں کہیں اندرونی حصے ان کے بہت وسیع اور روشن ہیں اور کہیں بہت تنگ، بیجانگر کا جب سقوط ہوا تو شہر کی آبادی کی بڑی تعداد ان ہی کوہستانی تہ خانوں میں پناہ گزین ہو گئی تھی، مسلمانوں کو مہینوں کے بعد اس کی خبر ہوئی کہ [illegible] ۱۲۔

(مسٹر) امیر شکیب ارسلان نے بھی اپنے وطن لبنان کے ایک کہف کا تذکرہ کیا ہو جس میں ایک پوری فوج چھپ گئی تھی ۱۲۔

صفحہ ۱۶۴ کا بقیہ حاشیہ: ... دور تک پھیلا پڑا ہو، ترک مسلمانوں کا ایک گاؤں جو ایاسلک ان ہی کھنڈروں کے درمیان اس وقت تک آباد ہو۔ امام رازی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہو کہ ان کے زمانے میں افیسوس کو لوگ طرطوس کہتے ہیں ۱۲۔

ہی میں رہتے کھاتے پکاتے تھے اس قسم کے کھوہ دنیا کے دوسرے پہاڑوں میں بھی پائے جاتے ہیں، عربی زبان میں کہف دراصل ان ہی زیر زمین طویل و عریض تہ خانوں کو کہتے ہیں۔

قرآن نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اسی کہف میں فجوہ تھا جسے اُن نوجوانوں نے اپنا مسکن بنایا تھا، فجوہ کے لغوی معانی کو پیش نظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ باضابطہ وسیع ہال، یا دالان ہی اُن کو اپنے قیام کے لئے اس جبلی تہ خانے میں مل گیا تھا۔

اس قسم کے زیر زمین تہ خانوں میں سب سے بڑی مصیبت تاریکی، رطوبت، ٹھنڈک اور ان کی وجہ سے پیدا ہونے والی کثافت اور جراثیم کی ہوتی ہے، یہ ان کے ایمان ہی کے اجر حسن کا نتیجہ تھا کہ ان سارے مضرت بخش خطرات کے ازالہ کی ضمانت جس چیز میں پوشیدہ ہے "یعنی آفتاب کا آتشیں کرہ"، اس کے متعلق قرآن کا بیان ہے کہ ایک خاص قسم کا تعلق قدرتی طور پر اس کو اس کہف سے پیدا ہو گیا تھا۔ طلوع و غروب کے وقت آفتاب اور اس کی شعاعوں کی دو مختلف نسبتیں جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے روزانہ قائم ہوتی تھیں۔ طلوع کے وقت بیان کیا گیا ہے کہ خود کہف کے ساتھ تزاور کی نسبت پیدا ہوتی تھی یعنی اس کہف سے آفتاب کترا جاتا تھا، لیکن چونکہ عن کے ساتھ تزاور کی اس نسبت کو قرآن نے ظاہر کیا ہے اس سے عربی محاورے کے رو سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ تعلق پیدا ہونے کے بعد آفتاب اور اس کی دھوپ اس کہف سے گزر جاتی تھی۔ میرا خیال یہی ہے کہ جس وقت آفتاب طلوع ہوتا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہف کے دہانے پر اس کی شعاعیں پڑ کر گزر جاتی تھیں، حاصل یہی ہے کہ دیر تک دھوپ ان کے کہف میں نہیں ٹھہرتی تھی، بلکہ رات کی تاریکی کی وجہ سے رطوبت و برودت اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کو صاف کر کے گزر جاتی تھی، چاہیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ طلوع کے وقت کہف کے لئے اور کہف والوں کے لئے آفتاب کی بالائی بنفشی شعاعوں سے استفادہ کا موقع فراہم کیا گیا تھا، برعکس اس کے جس وقت آفتاب غروب ہونے لگتا تھا تو قرآن نے کہف کے ساتھ نہیں بلکہ اصحاب کہف کے متعلق یہ اطلاع دی ہے کہ آفتاب ان کو کاٹ جاتا تھا یہاں عن کا صلہ نہیں ہے، جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ کہف والے غروب کے وقت کی دھوپ سے کلیتاً محفوظ رہتے تھے جس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ غروب سے پہلے دن بھر دنیا دھوپ سے گرمائی رہتی ہے اسی لئے شام کی دھوپ نہ مرغوب ہی ہوتی ہے نہ مفید، تاہم ایک نکتہ یہاں بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ غروب کے وقت دھوپ سے بے تعلقی کو قرآن نے کہف کی طرف نہیں بلکہ براہ راست اصحاب کہف کی طرف منسوب کیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود کہف میں غروب کے وقت بھی کچھ نہ کچھ دھوپ پہونچتی تھی، لیکن جس فجوہ (یا کمرے) میں اصحاب کہف مقیم تھے وہاں تک اس کی رسائی نہ تھی اور اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ کہف دو رخا تھا، ایک رخ اس کا بظاہر سمت جنوب مائل بہ شرق تھا اور دوسرا سمت شمال مائل بہ غرب رخ تھا، اگر یہ صورت نہ ہوتی تو شمال و جنوب کے ساتھ غروب و طلوع کے وقت آفتاب کے ساتھ نسبت و تعلق کو بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی، بلکہ اسی بنیاد پر میں تو یہی خیال کرتا ہوں کہ ہوا کی آمد و رفت کا راستہ کہف

میں کھلا ہوا تھا گویا یوں روزانہ آفتابی شعاعوں اور ہوائی لہروں سے کہف کی صفائی (DISINFECT) کا کام قدرت لے رہی تھی۔

خدا ہی جانتا ہے کہ ان غریب نوجوانوں کے گھر شہر کے کس حصہ میں تھے، اور صحت و راحت کے لحاظ سے اس محلہ کی کیا حالت تھی، لیکن دیکھئے قرآن دکھا رہا ہے کہ ان کے ایمان نے اسی بیابان میں جہاں سر چھپانے کا نظم بھی دشوار تھا گویا ایک بالائی سینا ٹوریم صحت بخش، قیام گاہ کا مفت بغیر کسی کرایہ کے انتظام کر دیا، آگے اسی کے بعد فرمایا گیا ہے:-

ذٰلِكَ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ؁

یہ ہے اللہ کی نشانیوں سے، جس کو دکھائے راہ اللہ وہی راہ پانے والا ہے، اور جسے اللہ گمراہ کردے تو ہرگز وہ پائے گا تو اس کا کوئی پشت پناہ، راہ بتانے والا۔

واقعہ سے سبق | جس کا مطلب میری سمجھ میں تو (واللہ اعلم بالصواب) یہی آتا ہے کہ آیات اللہ (اللہ کی نشانیوں) کو پاکر جو اللہ کو پاتا ہے اور خدا کے [illegible] پتوں کو پڑھ کر خدا پر ایمان لاتا ہے اس کے نزدیک سب کچھ "اللہ" ہی ہوتا ہے جہاں اللہ ہے یہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ اپنی آیتوں کو بھی ظاہر کرے گا، جیسے کہف والوں نے اللہ پر ایمان لا کر دیکھا کہ جہاں سر چھپانے کے سامان کی بھی صورت نہ تھی وہیں ان کے لئے اللہ نے ان کے رہنے سہنے کا معقول نظم کر دیا۔ مگر یقین کی یہ کیفیت ایمان کے معاوضہ میں ارزانی ہوتی ہے، مومن کو خدا اس کے ایمان کا یہ اجر دیتا ہے کہ ہدایت کی راہ اس پر کھول دیتا ہے لیکن اللہ سے بیگانہ اور بے تعلق ہو کر جو صرف آیت اللہ کی زنجیروں میں الجھے ہوئے ہیں وہ اپنی بے ایمانی کی یہ سزا بھگتتے رہتے ہیں کہ آیت اللہ سے ان کا ذہن اللہ کی طرف منتقل نہیں ہوتا، وہ آیت اللہ یا اسباب کے جنگلوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں، ایسوں کو اولاً تو کوئی پشت پناہ (ولی) ہی نہیں ملتا اور بفرض پناہی کسی کی مل بھی جائے تو صحیح راہ کی طرف راہ نمائی کرنے والے (مرشد) سے تو وہ ہمیشہ محروم ہی رہتے ہیں، دیکھ لیجئے کہ ایمان کی راہ سے ہٹ کر جو زندگی گزار رہے ہیں، حالانکہ بڑے بڑے مفکرین، ارباب نظر و فلسفہ کی کتابیں وہ پڑھتے ہیں لیکن بجائے پانے کے صحیح راہ سے وہ دور ہی ہوتے چلے جاتے ہیں اور جب تک "اللہ" سے توڑ کر "آیات اللہ" کا مطالعہ کیا جائے گا یہ لعنت آدمی پر مسلط رہے گی۔

یہاں تک تو ایمان کے اجر حسن کے ایسے مظاہرے اور اللہ کی ایسی آیتیں اور نشانیاں تھیں جن سے بے ایمانی کے مجرموں کو اللہ کے پانے کی توفیق تو نہیں میسر آتی لیکن بذات خود ان نشانیوں اور آیات کو دیکھنے کا مخاطب ان کو بنایا جا سکتا ہے، کیونکہ یہ ایسی باتیں ہیں جن کی توجیہ بخت و اتفاق سے بھی کرنے والے چاہیں تو اپنی بدبختی سے کر سکتے ہیں، کہہ سکتے ہیں کہ ان نوجوانوں کو اس قسم کی سہولتیں اتفاقاً مل گئیں۔

ناقابل قیاس انعامات | لیکن ان کے بعد ایمانی معاوضوں کے جن کرشموں کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے ان کی حالت تو یہ ہے کہ مومن ہوئے بغیر شاید ان کے سننے پر بھی کوئی مشکل ہی سے آمادہ ہو سکتا ہے۔

مقصد یہ ہو کہ کہف والے کہف میں جس وقت داخل ہوئے تو جیسا کہ قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہو اپنے ساتھ "ورق" (چاندی) کی کوئی مقدار بھی لائے تھے، غالباً یہ چاندی سکے کی شکل میں تھی، اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ جن چیزوں کو کھنی یرگی میں ساتھ رکھنے کا امکان تھا ان کے رکھنے اور کہف میں ساتھ لے جانے سے خواہ مخواہ احتراز اور پرہیز کا طریقہ انھوں نے اختیار نہیں کیا تھا' (الغرض) عام طور پر اس قصہ کو لوگ جس شکل میں بیان کرتے ہیں اس کی بنیاد پر تو خواہ کچھ کہا جائے لیکن جہاں تک قرآنی آیات کا تعلق ہو ان کی روشنی میں یہ دعویٰ آسانی کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا کہ کہف میں داخل ہونے کے ساتھ ہی وہ سو گئے، بلکہ میرا خیال ہو کہ اپنے ساتھ جو کچھ وہ لائے تھے جس میں کھانے پینے کی خشک اور تر چیزوں کو سب سے پہلے ہونا چاہئے تو جب تک انھیں اس سے مدد ملتی رہی اس وقت تک اس طویل گہری نیند کی ان کو ضرورت ہی نہ تھی جس کا ذکر بعد کو خود قرآن نے کیا ہو۔ ہاں جب لایا ہوا ذخیرہ ختم ہو گیا تو اس تاپو میں یہ اہم سوال تھا کہ خورد و نوش کی چیزیں کہاں سے مہیا ہوں گی ایک صورت تو اس کی یہ تھی جیسا کہ بیدار ہونے کے بعد انہوں نے اس پر عمل بھی کیا کہ چھپ چھپا کر شہر ہی سے کھانے پینے کا سامان منگوا لیں، لیکن جن حالات میں دشمنوں کے پنجوں سے نکل کر نکل جانے میں وہ کامیاب ہوئے تھے شاید ان حالات میں شہر کی طرف رخ کرنا ان کے لئے مناسب نہ تھا۔

عجیب وغریب نیند | پس ان ہی نازک ترین گھڑیوں میں اب ان کا ایمان ان کے آگے اعجاز و معاوضہ کی ایک ایسی صورت کو پیش کرتا ہو جس کے سننے کی تاب بھی ایمان سے محروم عقل نہیں لا سکتی، قرآنی آیت

وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۚ — اور تم خیال کروگے کہ وہ بیدار ہیں حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں

میں اطلاع دی گئی ہو کہ ان پر نیند طاری ہوئی، عجیب وغریب نیند ایک طرف تو اس کی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہو کہ دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں اور دوسری طرف اسی نیند کا ایک پہلو یہ بھی قرآن ہی نے اسی کے بعد بیان کیا ہو کہ

نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۚ — اور ہم ان کو الٹتے پلٹتے رہے، داہیں اور بائیں پہلو پر۔

جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہو کہ ایسی گہری نیند ان پر طاری ہوئی تھی کہ نیند میں بھی تھوڑا بہت احساس یا اختیار کروٹ بدلنے کا آدمی میں جو باقی رہتا ہو اس احساس اور اختیار سے بھی وہ قطعی طور پر خالی ہو چکے تھے اور کروٹ بدلنے کا انتظام بھی براہ راست قدرت کی طرف سے کیا گیا۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس گہری نیند کی مدت کتنی تھی، قرآن میں قصہ کو ختم کرتے ہوئے خبر دی گئی ہو کہ تین سو سال اور نو سال تک اس کہف میں ان کا قیام رہا، لیکن ظاہر ہو کہ یہ ان کے قیام کی مدت ہو نہ کہ نیند کی، بہر حال اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہو کہ ان پر گہری نیند طاری ہوئی" اور اسی نیند کی بدولت جب تک وہ سوتے رہے کھانے پینے کی ضرورت سے بے نیاز رہے۔

حفاظت کا عجیب انتظام | البتہ ایک ایسی جگہ جہاں وہ سوئے تھے نیند کی حالت میں طرح طرح کے خطرات کا اندیشہ تھا، موذی حشرات الارض، یا درندے، یا چور وغیرہ جیسی چیزوں کا اندیشہ تھا، غالباً ان ہی خطرات سے حفاظت کے لئے یہ کیا گیا کہ دیکھنے

والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں، اسی کے ساتھ جیسا کہ قرآن ہی میں ہے:۔

وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ ۚ — کتا اُن کا دونوں ہاتھوں کو پھیلائے در پر (کہف کے) پڑا ہوا تھا۔

اور یہ بھی کتے کے جاگنے کی ہیئت ہے، دیکھنے والوں کو گویا معلوم ہوتا تھا کہ کتا بھی بیٹھا ہوا ہے۔

من ربکے سوا ان کے ایمان کا اجر حسن ایک یہ بھی تھا جس کی قرآن نے تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے کہ:۔

لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ۚ — اگر ان کی طرف تو جھانکے تو پیٹھ پھیر کر بھاگے، اور بھر جائے تو رعب سے (ان کو دیکھ کر)۔

اسی ایمانی اجر کی رومی تعبیر ہے۔ ؎

ہیبت حق ست ایں از خلق نیست	ہیبت آں مرد صاحب دلق نیست
ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید	ترسد از وے جن و انس ہر کہ دید

واقعہ یہ ہے کہ بے ایمانوں کی عقل ایمانی معاوضوں کے ان تذکروں کو خواہ برداشت کرے یا نہ کرے مگر اس وقت تک کہف والوں کے ایمانی اجر کے جن قوالب و مظاہر کو قرآن نے بیان کیا ہے کسی نہ کسی رنگ میں آج بھی چاہا جائے تو ایمانیوں کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کا مشاہدہ اور تجربہ کیا جا سکتا ہے، اگرچہ روز بروز اب ان کی تعداد گھٹ رہی ہے تاہم اب بھی دنیا ان قدسی نفوس سے قطعی طور پر خالی نہیں ہوئی ہے، ڈھونڈنے والے چاہیں تو اب بھی دنیا کے دور دراز گوشوں میں ان کو پا سکتے ہیں۔

البتہ اس کے بعد قرآن نے:۔

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ — اور اسی طرح اٹھایا ہم نے ان کو

کے تمہیدی الفاظ کے ساتھ اصحاب کہف کے ایمانی اجر کے جس رخ کو بے نقاب کیا ہے اور اس تمہید کے بعد جو باتیں بیان کی گئی ہیں عامی آدمی کے لئے تو شاید اس کا سمجھنا بھی دشوار ہو۔

نیند کی غیر معمولی طوالت اور اصحاب کہف کا احساس مطلب یہ ہے کہ کہف میں کہف والوں کے قیام کی مدت جو دو تین صدیوں سے بھی متجاوز ہے اولاً عام حالات کے لحاظ سے بجائے خود یہی ایک غیر معمولی حادثہ ہے .... (لیکن) قصہ اسی پر ختم نہیں ہوا ہے، بلکہ بیدار ہونے کے بعد اپنے سونے کی مدت ان کو ایک دن، یا دن کے کچھ حصہ سے زیادہ محسوس نہیں ہوئی، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں صحیح طور پر قرآن سے یہ ثابت کرنا تو مشکل ہے کہ ان کے سونے کی مدت کتنی تھی، تاہم قرآن میں اسی تمہیدی بیان وکذالک بعثناھم کے بعد جو یہ الفاظ ہیں کہ:۔

لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ۚ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۚ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۚ — تاکہ باہم ایک دوسرے سے پوچھیں، ایک کہنے والے نے ان میں سے کہا کہ کتنے دن تم ٹھہرے، بولے کہ ٹھہرے ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔

. . . .

(الکہف) معلوم ہوتا ہو کہ نیند کی جو واقعی مدت تھی، جاگنے کے بعد صحیح احساس اس مدت کا ان میں نہیں پایا جاتا تھا، حاصل جس کا یہی ہوا کہ ایک دن یا دن کے کچھ حصہ سے جس وقت کی وہ تعبیر کر رہے تھے واقع میں وہ وقت اتنا مختصر نہ تھا . . . .

بہر حال زندگی کی غیر معمولی طوالت اور پھر اس طویل مدت کو کہف کے ان نوجوانوں کا حد سے زیادہ مختصر محسوس کرنا یہ دونوں باتیں ان کے ایمان کے اجر و معاوضہ کی ایسی غیر معمولی شکلیں ہیں، جن کی عام حالات میں آدمی توقع نہیں کر سکتا اور جہاں تک میرا خیال ہے یہی بتانا یہاں مقصود بھی ہو کہ ایمان کے اجر و صلہ، یا ثمرات و نتائج کا پیمانہ محدود معلومات و مشاہدات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی عقل کو نہ قرار دینا چاہیے بلکہ سمجھنا چاہیے کہ عقل جن باتوں کو سوچ سکتی ہو ایمان ان آسانیوں کو بھی مومن کے سامنے لاتا ہے، اور عام حالات میں جن امور کا تصور بھی دشوار معلوم ہوتا ہے، جس رب پر آدمی کو ایمان لانے کی سعادت حاصل ہوتی ہے وہی رب جب چاہتا ہے تو ان کو بھی پیدا کر کے مومن کی دستگیری فرما سکتا ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ . . . . عقل جن باتوں کو سوچ نہیں سکتی، اصحاب کہف کا ایمان ان کو بھی کھینچ کر ان کے سامنے لایا، ان کی زندگی دراز ہو گئی، اور کتنی دراز؟ پھر اس وقت کی درازی سے آدمی کو جو ذہنی تکلیف ہوتی ہے اس تکلیف سے بھی ان کو ان کے ایمان نے بچا لیا، اور باوجود دراز ہونے کے وہی طویل وقت ان کو محسوس ہوا کہ حد سے زیادہ مختصر تھا۔

آب و خور سے بے نیازی | اور اسی کے ساتھ اس کا بھی ان کو تجربہ کرایا گیا کہ اتنے طویل زمانے کو بغیر آب و خور کے انہوں نے گزار دیا۔ خدا ہی جانتا ہو کہ وہ کتنے دنوں تک سوتے رہے مگر جس وقت بیدار ہوئے تو جیسے رات کو سونے والے صبح بیدار ہو کر کچھ کھانے پینے کی ضرورت یا خواہش عام طور پر محسوس کرتے ہیں، انہوں نے بھی محسوس کی، قرآن میں اسی کے بعد جو یہ الفاظ ہیں کہ

قالو اربکم اعلم بما لبثتم فابعثو ا
احدکم بورقکم ھذہ الی المدینۃ
فلینظر ایھا ازکی طعاما فلیاتکم
برزق منہ (الکہف)

(وقت کے متعلق باہم) بولے تمہارا رب ہی زیادہ جاننے والا ہو کہ تم کتنی دیر ٹھہرے، پھر (انہوں نے کہا) کہ بھیجو تم اپنے میں سے کسی کو شہر کی طرف اس ورق (چاندی) کو لے کر جو تمہارے پاس ہے، چاہیئے کہ وہ دیکھے صاف ستھرے کھانے کو، اور لائے تمہارے لئے روزی۔

ان سے یہی معلوم ہوتا ہو کہ بھوک کا تقاضا بھی چنداں سخت نہ تھا، ورنہ ازکی طعاماً (صاف ستھرے لذیذ کھانے) کی تلاش کا حکم وہ نہ دیتے، اور یہ بھی ان کے ایمان کے کرشموں میں سے ایک حیرت انگیز کرشمہ تھا۔

کذٰلک کے لفظ سے ان کے ان ایمانی نتائج کو قرآن نے جو الگ کر دیا ہو، غالباً ان کی اہمیت ہی کی طرف اس میں اشارہ

کیا گیا ہو یعنی ایمانی اجر ہونے میں تو سب ساوی ہیں، لیکن غیر معمولی ہونے کی وجہ سے ان کی نوعیت گزشتہ آثار سے جو کچھ مختلف تھی، اس لیے ان کو پہلی فہرست سے قرآن نے جدا کر دیا۔

اسی کے ساتھ ذیلی طور پر ایک سبق تو اس سے یہ ملتا ہو جیسا کہ امام رازیؒ نے بھی لکھا ہو:۔

وهذه الآية تدل على ان السعى فى امساك الزاد امر مهم مشروع وانه لا يبطل التوكل ؎

یہ آیت بتاتی ہو کہ زاد راہ کا ساتھ رکھنا شریعت کا ایک اہم مسئلہ ہو اور توکل پر اس سے زد نہیں پڑتی

نیز ازکی طعاما کی تفسیر اگر یہ کی جائے، امام ہی نے دوسرے اقوالؒ کے ساتھ اس کا تذکرہ بھی با ایں الفاظ کیا ہو:۔

ایما اطیب والذ

(ص ۶۹۹ ج ۲)

یعنی غرض ان کی یہ تھی کہ کھانوں میں جو سب سے زیادہ لذیذ کھانا ہو، اس کو حاصل کریں۔

تو اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ "طیبات من الرزق" یا ایسی غذا جو آدمی کے ذائقہ کے مناسب اور لذت بخش ہو، خواہ مخواہ اس سے نفرت یا چڑ پیدا کرنے کی مشق دینی راہ کے سلوک میں قطعاً غیر ضروری ہو۔

دشمنوں کی محبت دگر دیدگی | اسی کے بعد آگے قرآن کے الفاظ یہ ہیں:۔

وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ۝ انهم ان يظهروا عليكم يرجموكم او يعيدوكم فى ملتهم ولن تفلحوا اذا ابدا ؎

اور چاہیے کہ کھانا لانے والا شہر جوجائے وہ نرمی سے کام لے اپنے متعلق کسی کو پتہ چلنے نہ دے، (کیونکہ) اگر وہ تم سے واقف ہو جائیں گے تو سنگسار کر دیں گے تمہیں، یا اپنی پلٹا لیں گے اپنے کیش و ملت کی طرف جس کے بعد تم کبھی کامیاب نہ ہوگے

اور یہ وہی بات ہو جس کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں یعنی اپنی قوم اور اپنے وطن کو چھوڑ کر کہفی زندگی بسر کرنے کے لیے نوجوانوں کی یہ ٹولی شہر سے جس حال میں نکلی تھی، قرآن نے ان ہی کی زبانی اس حال کے متعلق ان کے اعترافی الفاظ کو یہاں نقل کیا ہو، جس سے معلوم ہوتا ہو کہ اپنی قوم سے ان کی مخالفانہ کشمکش شدت کی اس آخری حد تک پہونچ چکی تھی کہ یا اپنی جان سے ہاتھ دھولیں، یا اپنے دین کے لیے وہ سب کچھ برداشت کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے (العیاذ باللہ) اسی سے دست بردار ہو جائیں اور اس کا خطرہ کہف میں داخل ہونے کے بعد بھی ان کے دلوں میں باقی رہا۔

لیکن دیکھیے خالص ایمان کے تحت جو جی رہے تھے ان کو تجربہ کرایا جا رہا ہو کہ ان ہی کا ایک حال تو یہ تھا کہ ان کی قوم ان کے خون کی پیاسی اور ان کے دین کی دشمن بنی ہوئی تھی کہ اچانک ایک نیا انقلاب شروع ہوتا ہو، وہی شہر جس کے باشندوں

کی تفسیر میں یہ کہنا کہ غیر ذبیحہ یا بتوں پر چڑھائی ہوئی چیزوں سے بچنے کا مشورہ دے رہے تھے، یہ شہر، اصحاب کہف کی جماعت کے کسی رکن کو ظاہر دینے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، اتنی باتیں تو ہر معمولی مومن آدمی بھی جانتا ہے۔ ۱۲۔

کے خوف سے کہف میں ان نوجوانوں نے پناہ لی تھی، اسی شہر کے رہنے والوں میں ایک نیا جذبہ ابھرتا ہے، آگے کی آیتوں میں اس نئی انقلابی تحریک کا قرآن نے ذکر کیا ہے، جس کا حاصل یہی ہے کہ دشمنوں کی جو آبادی تھی اور اسی شہر میں دیکھا جا رہا تھا کہ انہی کی مظلومیت اور بے کسی کے حال میں ان کے شہر کے نوجوانوں کی یہ ٹولی جو نکلی تھی ان ہی کے وہ نادیدہ عاشق بنے ہوئے ہیں صرف یہی نہیں کہ اپنے شہر کے باشندوں کے ظالمانہ طرز عمل پر وہ ندامت کا اظہار کر کے پچھتا رہے ہیں، بلکہ مافات کی تلافی کے لئے چاہتے ہیں کہ جن پر ظلم کیا گیا تھا اور صحیح دین کے قبول کرنے کے جرم میں ان بے بس ہونے پر تعقیب شدید کیا گیا تھا ان کی کوئی دوامی یادگار قائم کریں۔ اور طرفہ تماشا یہ ہوا کہ ٹھیک جن دنوں میں یہ انقلابی ہلچل اس شہر کے اندر برپا تھی، اچانک یہ عجیب و غریب حادثہ پیش آیا کہ جن سے ملاقات کا لوگوں کو سان و گمان بھی نہ تھا کہف کے ان ہی نوجوانوں کے متعلق شہر والوں کو یہ خبر ملی کہ وہ تو اس وقت تک اس کہف میں جیتی جاگتی حالت میں پائے جا رہے ہیں۔ یہ صورت کیسے پیش آئی؟ قصوں میں تو عموماً یہ بیان کیا گیا ہے اور مشہور ہے کہ بازار میں جب کھانا لینے کے لئے کہف سے آدمی آیا، اور جو سکہ اس نے نانبائی کے حوالے کیا وہ دقیانوس نامی بادشاہ کے ٹھپہ کا سکہ تھا جو تین سو سال پیشتر اس شہر میں حکمرانی کرتا تھا، نانبائی نے اس نئے سکہ کو دیکھ کر پوچھ گچھ کی، لوگوں میں اس کا چرچا پھیلا، آخر اس آدمی کو اقرار کرنا پڑا کہ ہمارا تعلق نوجوانوں کی اس جماعت سے ہے جو دشمنوں کے خوف سے کہف میں روپوش ہو گئے ہیں۔ اسی ذریعہ سے لوگ کہف میں ڈھونڈتے پھرتے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں نجوہ میں یہ لوگ بیٹھے ہوئے کھانے کا انتظار کر رہے تھے، ارباب حکایات و قصص اسی روایت کو کافی رنگ آمیزیوں کے ساتھ کتابوں میں نقل کرتے ہیں، لیکن قرآن میں ہم ان تفصیلات کو نہیں پاتے اور سچ پوچھئے تو اس قسم کی دور از کار تفصیلات سے قرآن کا عام دستور ہے کہ عموماً تعرض نہیں کرتا، وہ تو صرف ایمانی اجر کی مختلف شکلوں کو اس موقع پر پیش کرنا چاہتا ہے چونکہ کہف والوں کے ایمانی اجر و معاوضہ کی یہ شکل بھی اپنی علیحدہ مستقل نوعیت رکھتی تھی، اس لئے "وکذلک" کے لفظ سے شروع کرتے ہوئے (یعنی یہ بتاتے ہوئے کہ جیسے گزشتہ قالبوں میں ایمانی اجر کہف والوں کے سامنے آیا، اسی طرح ایک نیا مظاہرہ ان کے ایمانی اجر کا اس شکل میں بھی ہوا) [فرمایا گیا] کہ

اعثرنا عليهم ليعلموا ان وعد الله حق وان الساعة لا ريب فيها اذ يتنازعون بينهم امرهم فقالوا ابنوا عليهم بنيانا ربهم اعلم بهم، قال الذين غلبوا على

اچانک ان پر (یعنی کہف والوں پر) مطلع کر دیا ہم نے، تاکہ (لوگ) جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے، اور قیامت کی گھڑی آنے والی ہے، قطعاً اس میں کوئی شک نہیں ہے، (اور کہف والوں پر مطلع ہونے کا قصہ اس وقت پیش آیا) جب دیکھو! (شہر والے) باہم جھگڑ رہے تھے ان ہی کہف والوں کے متعلق پس

امرھم لنتخذن علیھم مسجدا ؁
(الکہف)

(بعض) بولے کہ بناؤ ان پر کوئی عمارت ان کا رب خوب جانتا تھا ان کو، کہا ان لوگوں نے جو ان کے معاملہ پر قابو یافتہ تھے کہ ہم بنا کر رہیں گے ان پر مسجد۔

بہرحال اصحاب کہف پر اعثار یعنی اچانک ان پر واقف ہونے کی صورت جو پیش آئی اس کی تفصیلی وجہ قرآن نے نہیں بیان کی ہو، بلکہ بجائے عداوت و دشمنی کے اسی شہر کے باشندوں میں کہف والوں کے ساتھ غیر معمولی دلچسپی بلکہ نادیدہ عشق کا انقلابی سانحہ جو پیش آیا اور اسی جذبۂ عشق سے سرشار ہو کر لوگ ان کی یادگار کی تعمیر کے متعلق مختلف تجویزیں جو پیش کر رہے تھے۔ قرآن نے صرف یہ خبر دی ہو کہ عین اسی زمانے میں ان سے واقف ہونے کا حادثہ اچانک رونما ہوا۔ اس سلسلہ میں اسی حد تک قرآن نے اپنے بیان کو محدود رکھا ہو، کیونکہ وہ تو صرف یہ بتانا چاہتا ہو کہ ایمان مومن کا ساتھ کہاں تک دیتا ہو، اور یہ کہ ایمانی اجر کے ظہور کی شکلیں صرف ان ہی منطقی حدود تک محدود نہیں ہوتیں جہاں تک سوچنے والوں کی عقل عام معلومات و مشاہدات کی راہ نمائی میں پہنچتی یا پہونچ سکتی ہو، الغرض یہ جو دعویٰ قرآن میں کیا گیا ہو، یا اہل ایمان کے لئے صلائے عام دیا گیا ہو کہ:۔

وبشر المومنین الذین یعملون الصالحات ان لھم اجرا حسنا ماکثین فیہ ابدا ؁

اور بشارت دے دو، ایمان والوں کو جو اچھی باتوں پر عمل کرتے ہیں کہ یقیناً ان کے لئے اچھا اجر و معاوضہ ہو جس میں وہ رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔

اسی دعویٰ یا اسی صلائے عام کے عملی تجربات کی یہ مثالی شکلیں ہیں جو مختلف رنگوں میں کہف کے ان مومن نوجوانوں کے سامنے مسلسل پیش آتی چلی گئی ہیں۔

حیات جاوید | اتنی دراز مدت جو کہف میں ان پر گزری، چاہیئے تو یہ تھا کہ دنیا ان کو بھول جاتی، حافظوں سے لوگوں کے وہ نکل جاتے، مگر آپ دیکھ رہے ہیں، بجائے بھلانے کے قدرت ان کی یاد کے نقوش کو چمکاتی ہی چلی گئی، نہ صرف دلوں اور دماغوں میں بلکہ جس شہر کے باشندوں کے مظالم سے تنگ آکر بیابان اور غار کی زندگی انہوں نے اختیار کی تھی اسی شہر کے رہنے والے ان کے لئے یادگار قائم کرنے کی کوششوں میں مست ہیں۔

اور صرف یہی نہیں کہ جس شہر سے وہ نکلے تھے اسی کی حد تک یا اسی شہر کے باشندوں کی حد تک اصحاب کہف کے ساتھ دلچسپیوں کے یہ قصے محدود رہے بلکہ قرآن میں اسی کے بعد جو یہ خبر دی گئی ہو کہ:۔

سیقولون ثلاثۃ رابعھم کلبھم ویقولون خمسۃ سادسھم کلبھم

اور قریب ہو کہ وہ کہیں گے کہ (کہف والے) تین ہیں جو تھا ان کا کتا ہو، اور کہیں گے کہ وہ پانچ ہیں، چھٹا

رجماً بالغیب ویقولون سبعۃ — ان کا کتا ہے، اٹکل پچو طریقہ پر ہے، اور کہیں گے سات ہیں

وثامنہم کلبہم — اور آٹھواں ان کا کتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے بعد بھی جب اچانک لوگ ان سے واقف ہوئے، کہف کے ان نوجوانوں کو آئندہ نسلوں میں بھی کافی اہمیت کا مقام حاصل رہا، اور کیسی اہمیت؟ کہ خود پوچھو ہی نہیں، بلکہ ان کے ساتھ جو کتا تھا، تاریخ انسانی کا ایک ایسا کتا بن گیا کہ کہف والوں کی تعداد اس کتے کے بغیر اور کتے کے ساتھ مختلف مکاتب خیال کی بنیاد بن گئی، امام رازی نے اپنی تفسیر میں ایک روایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سینکڑوں سال بعد عرب میں بھی عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے باہمی اختلافات کے سلسلہ میں ایک بڑا اہم اختلافی مسئلہ "کتے کے ساتھ اور کتے کے بغیر" اصحاب کہف کی تعداد کا مسئلہ تھا۔[1]

اصحاب کہف کے قصہ کی حد تک قرآنی بیان گویا سمجھنا چاہیے کہ ختم ہو چکا ہے، اگرچہ آگے کی آیتوں کا بھی براہ راست ان کی سرگزشت سے خواہ تعلق نہ ہو لیکن کلیتہً اس قصہ سے وہ جدا بھی نہیں ہیں بلکہ اسی قصہ سے پیدا ہونے والے نتائج میں ہم ان کو بھی شمار کر سکتے ہیں۔ انشاء اللہ اس کا ذکر تو آئندہ کیا جائے گا، سر دست اصل قصہ کو ختم کر کے ایک ذیلی مسئلہ کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

کہنا یہ ہے کہ اس وقت تک تو عموماً میں نے اپنے بیان کو قرآنی الفاظ کی حد تک محدود رکھنے کی کوشش کی ہے، ارباب قصص و حکایات نے کہف والوں کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے میں نے قصداً اس سے تعرض ہی نہیں کیا ہے یا ضرورةً بعض چیزوں کا ذکر اگر آ گیا ہے تو اس کی حیثیت ایک ذیلی بیان کی ہے، اس وقت بھی ایک ذیلی بات ہی کا ذکر مقصود ہے۔

اصحاب کہف کا یہ قصہ کس زمانہ کا ہے

اصحاب کہف کے لبث (یا مدت قیام) کو بتاتے ہوئے قرآن نے جو یہ طریقۂ تعبیر اختیار کیا ہے کہ تین سو سال وہ ٹھہرے اور بڑھا دیا انہوں نے ۹ سال، امام رازی کی تفسیر میں ایک قول نقل کیا گیا ہے کہ [illegible] اور قمری سالوں کے تفاوت کی طرف اس پیرایۂ بیان سے اشارہ کیا گیا ہے[2] لیکن خود امام نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ حساب کے رو سے یہ دعویٰ صحیح نہیں معلوم ہوتا، ایسی صورت میں یہ سوال رہ جاتا ہے کہ آخر اس خاص طریقہ بیان کی مصلحت کیا ہے اسی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

قرآن کے الفاظ سے تو اس کا پتہ نہیں چلتا کہ اصحاب کہف کا یہ قصہ کس زمانے میں پیش آیا، لیکن اسلامی و غیر اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں نے جب منادی شروع کی اور دنیا کے مختلف حصوں میں وہ

---

[1] عیسائیوں میں جو فرقہ اس زمانہ میں "یعقوبیوں" کے نام سے موسوم تھا، اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے قول کا قائل اور معتقد تھا، کہتا تھا کہ تین تو اصحاب کہف تھے چوتھا ان کا کتا تھا۔ اور "نسطوریوں" کے نام سے جو فرقہ ملقب تھا وہ پانچ تعداد کہف والوں کی بتاتا تھا اور کتے کو چھٹا قرار دیتا تھا (تفسیر کبیر جلد ۵ ص [illegible]) [2] جلد ۵ ص [illegible]

پھیل گئے، تو ایشیاء کوچک کے اس مرکزی شہر انسیس میں بھی بعض لوگ پہونچے، اور حضرت عیسیٰؑ کے پیغام کی وہاں کے باشندوں میں تبلیغ شروع کی، عرض کر چکا ہوں کہ انسیس کے باشندے بت پرست تھے، ان ہی بت پرستوں میں سے چند نوجوان بھی پیغام سے متاثر ہوئے، قوم سے جھگڑا شروع ہوا اسی کش مکش سے تنگ آکر کہف میں پناہ لینے کے لئے وہ داخل ہو گئے اب یہ ایک تاریخی واقعہ ہے، قدیم و جدید ہر قسم کے مورخوں نے اس کا ذکر کیا ہے، حتیٰ کہ مشہور محدث جلیل علامہ ابن حزم اندلسی نے (جن کی وفات سنہ ۵۲۸ھ میں ہوئی ہے) اپنی کتاب "ملل و نحل" میں یہ بیان کرتے ہوئے کہ دین عیسوی کے ماننے والوں پر رومی بت پرستوں نے شروع شروع میں مظالم کے پہاڑ توڑے، لکھا ہے کہ:۔

فبقوا على هذه الحالة لا يظهرون البتة ولا لهم مكان يامنون فيه ثلاثمائة سنة بعد رفع المسيح عليه السلام۔
(ص ۲۲ ج ۲)

(مظلومیت کے اسی حال میں عیسائی مبتلا رہے) دنیا کے سامنے ظاہر نہیں ہو سکتے تھے، نہ ان بیچاروں کو ایسی جگہ مل سکی جس میں امن کے ساتھ زندگی بسر کریں (اور یہ صورت حال) عیسیٰ کے اٹھائے جانے کے تین سو سال بعد تک باقی رہی۔

آگے ابن حزم نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ تین سو سال گزرنے کے بعد کس طرح قسطنطین شاہ قسطنطنیہ نے عیسائی دین قبول کر لیا، اور اسی کے بعد عیسائیوں کو آزادی کے ساتھ رہنے سہنے چلنے پھرنے اور علانیہ تبلیغ کرنے کا موقع ملا بلکہ تبلیغ کے ساتھ ساتھ جبر و زبردستی سے کام لے کر بھی لوگوں کو عیسائی بنانے لگے۔

اب ایک طرف تاریخ کے اس بیان کو رکھیے اور اس کو قرآن کی اس خبر سے ملائیے کہ کہف والوں کے قیام کی مدت کہف میں وہی تین سو سال مزید نو سال کے اضافہ کے ساتھ تھی، اگر اس سے یہ نتیجہ پیدا کیا جائے کہ مظلومیت اور روپوشی کی جو مدت عام عیسائیوں پر گزری اسی زمانے میں کہف والے بھی کہف میں پناہ گزیں رہے، اور ان کے شہر کے باشندوں میں جو مذہبی انقلاب رونما ہوا، تا اینکہ اپنے شہر سے بھاگنے والے ان نوجوانوں کے ساتھ نادیدہ عشق و محبت عظمت و احترام کا تعلق پیدا ہوا، یہ سارے قصے اسی تین سو سال کے اندر پیش آئے، اس کے بعد اچانک لوگ ان سے جب واقف ہوئے تو ۹ سال کا زمانہ اس واقفیت کے بعد گزرا اور دونوں زمانوں کے اسی اختلاف کی طرف قرآن نے اپنے پیرایۂ بیان میں اشارہ کیا ہے، جہاں تک میرا خیال ہے دوسری توجیہوں سے یہ توجیہ زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔ سمجھ میں یہ آتا ہے کہ کہف والوں کو ایمان اور ایمانی اجر کا تجربہ کرانا مقصود تھا اسی لئے اتنی طویل زندگی ان کو عطا کی گئی اور جہاں سے بے حد بیکسی بے نوائی میں نکلے تھے اسی مقام کے باشندوں کی عجیب و غریب گرویدگیوں اور اپنے ساتھ غیر معمولی دلچسپیوں کا تماشا ان کو کرایا گیا، شاید اس کے بعد ۹ سال جینے کا موقع ان کو اور ملا، اور پھر کل نفس ذائقة الموت کے کلی قانون کے تحت ان کی وفات[1] ہو گئی واللہ اعلم۔

حاشیہ متعلق صفحہ ۱۷۵

لـــه مرزائی جماعت کے لاہوری اور قادیانی دونوں گروہوں کی تفسیروں میں اصحاب کہف کی شخصی و انفرادی زندگی کی جگہ تین سو نو سال کی اس مدت کو عیسائیوں کی قوم کی طرف منسوب کرکے یہ دعویٰ کیا گیا ہو کہ یہ مدت اشخاص و افراد کی نہیں بلکہ عیسائی اُمت یا قوم کی زندگی کا کوئی دور تھا جو قسطنطین کے عیسائی ہونے سے پہلے ان پر گزرا۔ مرزا بشیر صاحب نے عیسوی سن کے موجودہ کلنڈر کی غلطیوں کا ذکر کرکے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ (۹) سال کا تذکرہ قرآن نے خاص طریقہ سے جو کیا ہو اس میں اشارہ کلنڈر کی ان ہی غلطیوں کی طرف ہو جو بالکل ایک اٹل بے جوڑ سی بات معلوم ہوتی ہو اور اس میں بھی زیادہ تعجب ان کی اس تحریفی جرأت پر ہو، قرآن کے واضح الفاظ سے معلوم ہوتا ہو کہ کہف میں نوجوانوں کی جوڑلی پناہ لینے کے لئے داخل ہوئی تھی وہی نیند سے اٹھی ایانک لوگ ان ہی سے واقف ہوئے ان ہی کی یادگار قائم کرنے پر لوگ اصرار کررہے تھے، ان ہی کے متعلق آئندہ عددی مکاتب خیال قائم ہوئے اور رہی تین سو نو سال اس کہف میں قیام پذیر رہے۔ مگر معلوم نہیں قرآن کے کس لفظ سے ان انفرادی شخصیتوں کو قادیانی ذہنیت نے قوم اور امت کا رنگ دے دیا۔ شاید اپنی اس تحریفی حرکت سے ان کی غرض یہ ہو کہ شخصی زندگی کی اتنی غیر معمولی طوالت کو جو کچھ عام عقلیت برداشت نہیں کرسکتی، اس لئے غلط عقلیت کی تصحیح سے زیادہ مناسب ان کو یہ معلوم ہوا کہ قرآن کی غلطی کی تصحیح کردی جائے، حالانکہ ایمانی اجر کے متعلق جن غیر معمولی توقعات کو قرآن مومن کے دل میں قائم کرنا چاہتا ہوا اس غرض کی تکمیل ہی اس وقت تک نہیں ہوسکتی تھی جب تک کہ ایمانی اجر کی عام شکلوں کے ساتھ ساتھ اسی کے غیر معمولی مظاہر کا تذکرہ نہ کیا جاتا۔ ان کی سرگذشت سے ایسے عناصر جن کا عام حالات میں تجربہ نہیں ہوتا اگر نکال دیے جائیں تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ کبوتر کے اسی پر کو گرا دیا گیا جس میں دستبر کا نامہ بندھا ہوا تھا گویا جس مقصد کے پیش نظر ان کے قصے کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہو اس کی روح ہی اس تحریفی طریقہ کار سے نکل جاتی ہو یہی تو بتانا مقصود ہو کہ ناموافق سے ناموافق حالات میں بھی ایمان بہرحال ایک ذریعہ نجات کا ایسا رہ جاتا ہو کہ مومن جس سے ہر حال میں مدد حاصل کرسکتا ہو، ہاں قصہ کو اصحاب کہف کی انفرادی سرگذشت قرار دیتے ہوئے عیسائیوں کے عہد مظلومیت کی طرف بھی گو اشارہ اگر اسے ٹھہرایا جائے تو "باب الاشارہ" کے لحاظ سے تھوڑی بہت گنجائش اس کی پیدا ہو سکتی ہو لیکن بجائے جزئی اور شخصی واقعہ کے کسی قوم کے کلی حادثے کی تعبیر قرآنی الفاظ سے نکالنی تحریفی خواب پریشاں کے سوا اور کچھ نہیں ہو۔ ۱۲۔

[اصحاب کہف کا قصہ ختم ہو چکا، اور یہاں تک کی آیتوں سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ جو کچھ سمجھانا چاہتے تھے وہ خود مولانا ہی کے الفاظ میں آپ کے سامنے آ چکا، مگر سورت کا ابھی خاصا حصہ باقی ہے اور اس بقیہ حصہ کے متعلق بھی مولانا کا خیال ہو کر اس کی آیتوں کا خواہ اصحاب کہف کی سرگذشت سے براہ راست تعلق نہ ہو۔

"لیکن کلیۃً اس قصہ سے وہ جدا بھی نہیں ہیں، بلکہ اسی قصہ سے پیدا ہونے والے نتائج میں ہم ان کو بھی شمار کر سکتے ہیں"۔

اور اسی خیال کے ماتحت مولانا نے آخری دو قسطوں میں، اس بقیہ حصہ کے مشتملات سے بحث فرمائی ہے، مگر قصہ کے بعد متصلاً جو تین چار آیتیں احکام کی شکل میں ہیں ان کی توضیح و تشریح سے فارغ ہو کر مولانا رقمطراز ہیں کہ:۔

"بہرحال واقعہ یہ ہے کہ کہفی زندگی کی ضرورت جن حالات میں پیش آتی ہے، ان حالات کی پیدائش کے اسباب، ان کے نتائج و عواقب، پھر خود کہفی زندگی کے لوازم و آثار، اسی زندگی کے فرائض و واجبات یہ اور اسی قسم کے تمام سوالات جن کا کہفی زندگی سے تعلق ہو سکتا تھا، اگر سوچا جائے تو بلا ضرورت ان باتوں کے جوابوں کو ہم ان آیتوں میں پا سکتے ہیں جن پر اب تک بحث ہو چکی ہے، اسی لیے اب تک یہ التزام کیا گیا تھا کہ ایک ایک آیت کے تمام پہلوؤں کو تفصیل کے ساتھ سمجھنے والوں کے آگے پیش کر دیا جائے، اسی التزام کی وجہ سے مضمون میں کافی طوالت پیدا ہو گئی...... لیکن اب میں انہیں اس کی خوشخبری سناتا ہوں کہ قرآن کی ایک ایک آیت اور ایک ایک لفظ پر غور و فکر کا بار ان پر نہ ڈالا جائے گا، کیونکہ مقصد پورا ہو چکا ہے"۔

مولانا کے اصل مضمون کی طوالت اور الفرقان کے اس نمبر کی محدود ضخامت کے پیش نظر یہ تو ممکن نہیں ہے کہ جس طرح اب تک تقریباً پورا مضمون لفظ بلفظ لیا گیا ہے، بقیہ حصہ میں بھی یہی روش برقرار رکھی جائے، اس لیے اب ہم یہاں سے روش بدل کر اولاً ان تین چار آیتوں سے متعلق مولانا کے افادات کا تو خلاصہ پیش کرتے ہیں، جو قصہ اصحاب کہف کے خاتمہ کے بعد متصلاً آئی ہیں اور جن کی تشریح کے بعد مضمون کا مقصد کہنا چاہیے کہ پورا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد بقیہ حصہ سے متعلق افادات میں سے صرف وہ خاص علمی نکات اور فکر افروز ذہنی انتقالات پیش کیے جائیں گے، جو مولانا مرحوم کی ندرت نگاہی اور دقیقہ رسی کی یادگار کی حیثیت سے محفوظ کر دیے جانے کے قابل ہیں۔

واللہ ولی الامر والتوفیق!]

قصۂ اصحاب کہف سے فراغت کے بعد مولانا فرماتے ہیں۔

"اصحاب کہف کی سرگذشت کو ختم کر کے آگے چند احکام ہیں، آئیے اور ان کا مطلب سمجھئے، اور دیکھئے کہ

کہف والوں کے قصہ سے ان احکام کا کیا تعلق ہے۔ پہلا حکم اس سلسلہ کا یہ ہے کہ

اور پڑھ جتنا رہ جو وحی کی گئی تجھ پر تیرے رب کی کتاب سے، نہیں ہے کوئی بدلنے والا اس کی باتوں کا اور ہرگز نہ پائے گا اس کے سوا تو یکسوئی کی کوئی جگہ۔	وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُونِهِ مُلْتَحَدًا۔

اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ حرف عطف واؤ سے سلسلۂ کلام کی ابتدا، اس بات کی دلیل ہو کہ یہ سلسلۂ کلام ماقبل کی آیات کے مضمون سے مربوط ہے۔ اس ربط کو اگر تلاش کیا جائے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اصحاب کہف کے قصہ کی ابتداء میں جو ایک لفظ "الرقیم" آیا تھا جس کی تفسیر "کتاب" سے کی گئی تھی اور دوسرا لفظ "فتیۃ" تھا جس کا ترجمہ "نوجوانوں کی ٹولی" سے کیا گیا تھا، اور ان دونوں سے یہ اشارہ حاصل کیا گیا تھا کہ کہفی زندگی میں فکر و نظر کے جمود اور تعطل کا جو خطرہ ہو اس سے حفاظت کی تدبیر یہ ہے کہ اس زندگی کے دور میں اولاً تو کتاب سے شغل رکھا جائے، اور دوسرے تنہائی کے بجائے یہ عرصہ چند رفیقوں کی رفاقت میں گزارا جائے۔ مگر سوال یہ رہ جاتا ہے کہ مطالعہ میں کتابیں کس قسم کی رکھی جائیں اور رفاقت کے لیے کس قسم کے رفیقوں کا انتخاب کیا جائے؟ ـــ اس لیے کہ فتنہ کے جن ایام میں کہفی زندگی کی ضرورت پیش آتی ہے، تجربہ اور مشاہدہ بتا رہا ہو کہ "خود رائی" کی عام وبا بھی ان دنوں میں پھوٹ پڑتی ہے اور جن لوگوں میں تھوڑا بہت سلیقہ بھی لکھنے لکھانے کا ہوتا ہو۔ وہ اپنے فتنہ انگیز افکار سے کتابوں کے ڈھیر لگانے لگتے ہیں، پس ان ایام میں اگر مطالعہ کا دائرہ ہر قسم کی کتابوں کے لیے وسیع کر دیا جائے تو ظاہر ہے کہ کہفی زندگی کا مقصد ہی فوت ہو کر رہ جائے گا۔

اسلیے مذکورہ بالا پہلے حکم میں غالباً "الرقیم" کے اجمال و ابہام ہی کے دور کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے کہ کہفی زندگی میں صرف اپنے پروردگار کی نازل کی ہوئی کتاب سے شغل رکھو جو اٹل اور لازوال سچائیوں پر مشتمل ہے ـــ اور اسی بنا پر فکری یکسوئی کی واحد ضامن ہے۔

علیٰ ہذا اس کے بعد والے دوسرے حکم کے الفاظ

اور تھامے رکھ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو پکارتے رہتے ہیں اپنے پالنے والے کو صبح و شام اور مراد بنائے ہوئے ہیں اسی کے رخ کو	وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ۔

سے غالباً رفقاء کے انتخاب کے معیار کا مسئلہ حل کرنا اور یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ کہفی زندگی کی رفاقت کے لیے کس قسم کے رفقاء کا انتخاب کیا جائے ـــ اس کی تشریح خود مولانا کے الفاظ میں سنئے، فرماتے ہیں۔

"دوسری اہم اس مسئلہ میں رفقاء کے انتخاب کا معیار ہے، یعنی رفاقت کے لیے جن رفقاء کے انتخاب کا

قرآن نے حکم دیا ہے ان کو ہم کن نشانیوں اور علامتوں سے پہچانیں، اسی کے جواب کو آپ آگے ان الفاظ میں پا سکتے ہیں۔ فرمایا گیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ وَالْعَشِیِّ	جو پکارتے رہتے ہیں اپنے پالنے والے کو صبح و شام
یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ۔	مراد بنائے ہوئے ہیں اسی پالنے والے کے رُخ کو

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ اس قسم کے مواقع پر شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآنی الفاظ کا کوئی خود ساختہ خلاصہ لوگ نکال کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ مثلاً مذکورۂ بالا الفاظ کا مطلب یہ نکال لیا جاتا ہے کہ رفاقت کے لیے حکم دیا گیا ہو کہ دینداروں کا انتخاب کیا جائے۔ لیکن کم از کم قرآنی الفاظ کے ساتھ تو اس قسم کی لاپروائیاں بڑی محرومی ہے۔

یہ سچ ہے کہ جن میں یہ صفات پائے جاتے ہیں وہ دیندار بھی ہوتے ہیں، لیکن ہر دیندار میں ان صفات کا پایا جانا جہاں تک میرا خیال ہے یہ ضروری نہیں ہے، دینی زندگی رکھنے والوں کا ایک بڑا طبقہ ہر زمانہ میں پایا گیا ہو جو آئین و قانون کی شکل میں زندگی کی دینی تنظیم ہی کو مذہب کا آخری مطالبہ سمجھتا ہے اور توقع رکھتا ہے کہ بہشتی زندگی بطور طبعی نتیجہ کے اس کے سامنے اسی طرح آجائے گی، جیسے تریاق کا استعمال صحت کے نتیجے تک مریض کو پہونچا دیتا ہے، ان کی نظر صرف قانون کی اہمیت تک محدود رہتی ہے، اور قانون کے مقنن سے بجز قانونی تعلق کے نہ کوئی رشتہ وہ رکھتے ہیں اور نہ رکھنا چاہتے ہیں۔ جیسے مریض صرف طبیب کی بتائی ہوئی دواؤں سے اپنا تعلق رکھتا ہے اور صحت کے لیے جانتا ہے کہ براہ راست طبیب سے تعلق پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اور اسی کے مقابلہ میں دینداروں کا ایک طبقہ وہ بھی ہے جن کی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت وہی ہوتی ہے، جسے نشانی اور علامت ٹھہراتے ہوئے مذکورۂ بالا الفاظ میں قرآن نے ان کو روشناس کرایا ہو۔

یدعون ربھم بالغدوۃ والعشی	پکارتے رہتے ہیں اپنے پالنے والے کو صبح و شام

یہ ان لوگوں کی شناخت کی پہلی قرآنی علامت و نشانی ہے، علامہ شوکانی ان الفاظ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

کنایۃ عن الاستمرار علی الدعاء فی جمیع الاوقات۔ (ج ۲ ص ۲۷۱)	سارے اوقات میں دعا کرتے رہنا اسی کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہو۔

جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں عربی زبان کے محاورے کا اقتضاء بھی یہی ہے، حاصل جس کا یہی ہوا کہ پرورش کرنے والی قوت یعنی رب کے ساتھ اپنے احتیاجی تعلق کے احساس کو ہمہ دم مسلسل، بغیر کسی انقطاع کے اپنے اندر زندہ اور بیدار رکھنا اور اسی احساس کے زیر اثر چھوٹی بڑی ضرورت میں اسی کی طرف پلٹنا اور

اسی کو پکارتے۔ بہنا، یہی ان کی زندگی کا مشغلہ اور یہی ان کا اوڑھنا بچھونا بنا ہوا ہوتا ہے، اور فقر تام، احتیاج مطلق، فقط سوال، صرف بھیک کی اس لیستی میں جو بلندی ان کو حاصل ہوتی چلی جاتی ہو اور اس کمتری سے جو برتری پیدا ہوتی ہے۔

مراد بنائے ہوئے ہیں وہ اسی رب کے رخ کو۔ یریدون وجھہ

کے الفاظ میں اسی کی تصویر پیش کی گئی ہو، جس کا مطلب یہی ہوا کہ .... ان کی نگاہ کسی حال میں وجہ اللہ (رب کے رخ کو) سے نہیں ہٹتی، حتیٰ کہ بہشت بھی ان کے سامنے جب آئے گی تو وہ بھی رضوان اللہ ہی کا قالب ان کو محسوس ہوگا، وہ محسوس کریں گے کہ وہی اپنی رضامندیوں کے ساتھ ان کے آگے بے نقاب ہو کر آگیا ہے، الغرض ربؐ کے ساتھ فقر و احتیاج کا دوامی تعلق، اور ہر حال میں "وجہ اللہ" ہی کو مراد بنائے ہوئے رہنا، ان ہی دوؐ علامتوں سے ان رفقاء کی قرآن میں شناخت کرائی گئی ہو، جن کی ضرورت کا اشارہ اصحاب کہف کے قصہ میں "فتیۃ" کے لفظ سے کیا گیا تھا۔

واقعہ بھی یہی ہے کہ "کہفی زندگی" جس کا مشورہ فتنہ کے خاص زمانہ میں دیا گیا ہو۔ اس میں ایمانی زندگی کے بچانے میں کچھ امداد اگر مل سکتی ہو تو اسی قسم کے دیندار رفیقوں سے مل سکتی ہو جن کی زندگی کا دین ناگزیر اندرونی اقتضاء بن گیا ہو، ورنہ باہر سے لادے اور عاید کیے ہوئے آئین و قانون کی شکل میں دینی زندگی کو جو نباہ رہے ہوں، فتنہ کے طوفانی دور کے ان تھپیڑوں کی چوٹ کو صحیح معنوں میں وہ مشکل ہی سے برداشت کر سکتے ہیں۔

یہ حکم اسی مذکورۂ بالا فقرہ پر ختم نہیں ہو بلکہ آگے تین چار فقرے اور ہیں، پہلا فقرہ ہے۔

وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ اور نہ پھریں تیری آنکھیں ان رفیقوں سے چاہتے ہوئے حیات دنیا کی زینت کو۔

اس فقرہ سے مولانا نے رفقاء کے تعلقات کی نوعیت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن ان الفاظ سے یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ اہل دین کو اسکی تو اجازت نہیں ہو کہ وہ زینتِ[1] حیات دنیا کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں اور صرف اسی کی جستجو میں اپنی ساری توانائیاں صرف کر دیں، البتہ اپنی خاص افتادِ طبع اور شخصی ذوق و رجحانات کے زیر اثر اگر دینی زندگی کی رفاقت میں کوئی رفیق

---

[1] زینۃ الحیوٰۃ الدنیا سے مولانا کے الفاظ میں وہ چیزیں مراد ہیں جن کے استعمال پر آدمی مجبور تو نہ ہو مگر التذاذی احساسات کی تسکین کا سامان ان سے فراہم ہوتا ہو" جسے موجودہ معاشی اصطلاح میں (luxury) کہتے ہیں۔

زینت کی مد کی چیزوں کو زندگی کے مختلف شعبوں مثلاً لباس و طعام وغیرہ میں نصب العین بنائے بغیر، استعمال کرتا ہو یا استعمال کرنے کا عادی ہو تو اس کے اس طرز عمل کو دینی رفاقت کے رشتہ کے منافی نہیں قرار دینا چاہیے۔ اس لیے کہ اس معاملہ میں ذوق و طبائع کا اختلاف ایک حقیقت ہے اور اس کی رعایت اگر نہ کی جائے گی تو رفاقت کے رشتہ کا نبھنا مشکل ہے۔

کوئی شبہ نہیں کہ بات اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہو مگر ان الفاظ قرآنی کا مقصد یہ سمجھنا ہمارے خیال میں محض مولانا کا انتقال ذہنی ہے۔ بظاہر اس فقرہ کا مقصد یہ نہیں معلوم ہوتا، بلکہ (جیسا کہ خود مولانا نے بھی آگے چل کر اس پہلو کو لیا ہے) زیادہ قرین قیاس یہی ہو کہ "عوامی معیار زندگی کی بلندی" وغیرہ جیسی معصوم اور خوشنما تعبیروں کے پردہ میں حیات دنیا کی زینت کو نصب العین بنا لینے کا جو فتنہ جیسا کہ دیکھا جا رہا ہے دجالی عصر میں پیدا ہو جاتا ہے، قرآن کے ان الفاظ میں اسی فتنہ سے خبردار کیا گیا ہے، اور اس کے بعد والے فقرے

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔

اور مت مان اس شخص کی بات جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل بنا دیا ہے اور وہ پیچھے چل پڑا ہو اپنی "ہوا" کے اور ہے کام اس کا غیر متوازن، بے ڈھنگا۔

میں جن لوگوں کی اطاعت سے منع کیا گیا ہو، وہ درحقیقت وہی لوگ ہیں جو اپنی زندگی کا نصب العین "زینة الحیٰوة الدنیا" کو بنا لیں۔ اس لیے کہ یہ اوصاف جو مذکورۂ بالا فقرہ میں بیان ہوئے ہیں انہیں لوگوں کے خصوصی اوصاف ہیں جن کا نصب العین حیات دنیا کی زینت بن جائے۔ —— اس اجمال کی تفصیل مولانا کے الفاظ میں پڑھیے۔ فرماتے ہیں:۔

"عوامی زندگی کی بلندی و برتری کا صور انسانی آبادیوں میں آج جو پھونک رہے ہیں اور اسی کا شور دنیا میں مچائے ہوئے ہیں اُن کی پیشانی کی یہ قرآنی لکیریں کیا ایسی لکیریں ہیں جن کے لیے کچھ زیادہ غور و تامل کی ضرورت ہے وہ جو بھی ہوں اور جہاں بھی کھڑے ہوں ان کے تمام خصوصیات میں شاید سب سے نمایاں یہی خصوصیتیں ہیں جنہیں ہر دیکھنے والا دیکھ سکتا ہے، اور ان ہی قرآنی الفاظ سے ان کو پہچان سکتا ہے۔

بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ حدیثوں میں جیسے المسیح الدجال کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ "ک ف ر" "کفر" اس کی پیشانی کی ایسی نمایاں خصوصیت ہوگی جسے پڑھنے والے اور ان پڑھ دونوں ہی پڑھ لیں گے، کچھ یہی خیال ان الفاظ کا نظر آتا ہے جنہیں پڑھنے والے اور ان پڑھ دونوں ہی اس قول کے قائلین کی پیشانیوں میں چاہیں تو پڑھ سکتے ہیں۔

دیکھئے یہ فقرہ تین اجزا پر مشتمل ہے۔ اور مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر پچھلا جزء پہلے جز کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے:

جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل بنا دیا ۔۔ من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا

یہ اس فقرے کا پہلا جزء ہے، ارادی طغیانیوں اور اختیار واقتدار کی بدمستیوں کے عذاب کی یہ عام قرآنی تعبیر ہے، ان مجرموں کو پہلی سزا قدرت کی طرف سے یہی ملتی ہے کہ زندگی کے بنیادی حقائق کی تلاش و جستجو کا جو احساس انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے وہی احساس بتدریج معطل و مفلوج ہوتے ہوئے تباہی کے ان حدود تک پہونچ جاتا ہے جن کے مختلف مدارج کو قرآن نے ختم و رین، غشاوہ و اضلال و اغفال کے ناموں سے موسوم کیا ہے، قرآن میں انسانی نفسیات کے جو مسائل ہیں ان میں ذہنی اور فکری سزاؤں کی ان شکلوں اور ان کے باہمی امتیازات کو خاص اہمیت حاصل ہو جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہو۔

بہرحال سزایابی کی اس نفسیاتی گرفت کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہو کہ جینے کا جو دستور بھی ذہنی عذاب کی اس حالت میں بنانے والے بنائیں گے اس کا زندگی کے بنیادی حقائق سے کوئی تعلق نہ ہوگا، جیسا کہ معلوم ہو عربی زبان میں اسی قسم کے بے بنیاد، بادِ ہوا، من مانی باتوں کو "ھوی" کہتے ہیں۔ فقرۂ بالا کے دوسرے جز

اور پیچھے چل پڑا وہ اپنی "ہوا" کے ۔۔ واتبع ھواہ

کے الفاظ سے اسی لازمی نتیجہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے .. ..

تیسرا جزء فقرے کا

اور ہے کام اس کا "فرط" ۔۔ وکان امرہ فرطا

ہے، ہر وہ بات یا چیز جو اپنی قدرتی حدود مقدار سے ہٹ گئی ہو، بالفاظ دگر ہر بے ڈھنگے، غیر متوازن امر کو عربی میں "فرط" کہتے ہیں، اور جب بنیاد سے الگ ہو کر "ہوائی ضابطہ" کے تحت زندگی گزاری جائے، تو یقین مانئے کہ اس کا انجام فرط اور غیر متوازن ہی شکل میں سامنے آئے گا، آج دنیا افراط و تفریط کے ان ہی ہچکولوں میں جھول رہی ہے۔

"عوامی زندگی کے برتری" کی نصب العین والوں ہی کو دیکھئے، سرمایہ داری کے خبط میں فیصلہ کیا گیا، کہ ایک کی امیری کے لیے سارے غربا کو مرنا پڑے تو ان کو مر جانا چاہیے۔ اور اشتراکیت کا بھوت جب سے سوار ہوا ہو تو اب دھمکایا جا رہا ہو کہ ایک غریب کے لیے سارے امیروں کو غریب بنا دیا جائے گا اور عدم توازن یا فرطیت کی یہ کیفیت زندگی کے کسی ایک شعبہ ہی کے ساتھ مختص نہیں ہو، بلکہ جس راہ میں بھی ان کا جو قدم "ہوائی دستور" کے زیر اثر اٹھا ہو وہ قرآن کی بیان کی ہوئی صفت "فرط" کی خصوصیتوں ہی کے ساتھ اٹھا ہے۔"

بہرحال جو لوگ حیات دنیا کی زینت کو مقصود بنا کر زندگی گزاریں، ان کے متعلق ایک تو یہ منفی حکم (اطاعت نہ کرنے کا) دیا گیا ہو جس کا حاصل مولانا کے الفاظ میں یہ ہے کہ

"انھیں کو دیکھ دیکھ کر قدم اٹھانا اور زندگی کے ہر پہلو میں ان ہی کے عملی نمونوں اور علمی مشوروں کی طرف تاکتے جھانکتے رہنا، اس کی ممانعت فرمائی گئی ہے"۔

اور اس کے مطابق مومن کا فرض ہو کہ ان لوگوں کی جو علامات بیان کی گئی ہیں وہ جن لوگوں میں بھی پائی جاتی ہوں خواہ ان کی پیروی کی طرف بلانے والے "شائستہ و متمدن اقوام" جیسے کتنے ہی خوشنما عنوانوں سے انھیں روشناس کرائیں، ان کی نافرمانی کے "ربانی فرمان پر عزم و ارادہ کی پوری قوت کے ساتھ ڈٹ جائے"۔

اور مومن کا فرض "پرہیز و گریز" کے منفی عمل ہی پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ آگے ایک مثبت حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

قُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ — کہہ! جو حق ہو تمھارے پالنے والے کی طرف سے

"جس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حالات کیسے ہی گئے گزرے ہوں، اور جو کچھ بھی ہو رہا ہو لیکن بہرحال الحق اور زندگی کی جو حقیقی سچائیاں ہیں، ان کا اعلان بھی کیے چلا ہی جانا چاہیے، تقریر سے ہو یا تحریر سے، یا قول کا جو بھی ذریعہ ہو، مومن مکلف ہے کہ وہ ان سچائیوں اور صداقتوں کو دوہراتا رہے"۔

فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ — پھر جس کا جی چاہے مانے اور جس کا جی چاہے (نہ مانے) انکار کر دے۔

یہ تھیں قصۂ اصحاب کہف کے بعد کی وہ آیتیں جن کے بعد مولانا نے تحریر فرمایا تھا کہ "مقصد پورا ہو چکا ہے"۔ لہٰذا اب ہم طوالت سے بچنے کے لیے بقیہ مضمون میں سے مولانا کے صرف اہم اور خصوصی افادات پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

بقیہ مضمون کے اہم افادات

(۱)

گزشتہ آیات کے بعد صرف دو تین ہی آیتوں کو چھوڑ کر اس سورت میں "وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ" کے الفاظ سے دو آدمیوں کا ایک تمثیلی قصہ شروع ہوا ہے، جن میں سے ایک کے پاس دو سرسبز و شاداب باغ تھے، جن کے بیچ میں ایک نہر بھی جاری تھی، جو ان کی سرسبزی و بارآوری کی بڑی ضمانت تھی۔ ان باغات کے علاوہ بھی کافی مال و دولت اور جاہ و عزت اللہ تعالیٰ نے اس کو بخش رکھی تھی۔ دوسرے کا حال اس سے مختلف تھا، غربت تھی یا نسبتاً قلت، بہرحال اول الذکر جو اپنے تمول اور خوش حالی کے متعلق اس خبط میں مبتلا ہو گیا تھا کہ یہ سب بجائے اس کے خالق و مالک کے فضل و کرم کے، اس کی اپنی دماغی اور جسمانی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اور جب تک اس کے جسم و دماغ کی قوت باقی ہے یہ سب یوں ہی رہے گا، اس نے ایک موقع پر اپنے باغ پر نظر ڈالتے ہوئے اپنی ذہانت و قوت کے پندار میں ڈوب کر ثانی الذکر کے سامنے ان خیالات کا اظہار کیا، دوسرا شخص جسے ایمان و عرفان کی دولت نصیب تھی اس نے اسے اس پندار بے جا پر ٹوکا اور کہا کہ یہ سب اللہ کا فضل سمجھنا چاہیے۔ اصل قدرت اسی کی قدرت ہے، وہ اگر چاہے تو تمہاری ساری حکمت و جد و جہد کے باوجود ان ہرے بھرے باغات کو چٹیل میدان میں تبدیل کر دے اور تم دیکھتے رہ جاؤ۔

آگے فرمایا گیا ہے کہ اس کے ساتھ ایسا ہی ہوا اور پھر بیچارہ نے کف افسوس ملتے ہوئے کہا۔

يَا لَيْتَنِي لَمْ أُشْرِكْ بِرَبِّي أَحَدًا — اے کاش! نہ شریک کرتا میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو

ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شرک کی گمراہی میں مبتلا تھا، اور اپنی تباہ حالی کو وہ اپنے اس جرم کی سزا سمجھ رہا تھا، مگر قصہ میں جو باتیں اس کی طرف منسوب کی گئی ہیں اُن میں کوئی بات بھی بظاہر مشرکانہ قسم کی نہیں ہے پھر اس شرک کی آخر کیا حقیقت تھی جس پر وہ اس بُری طرح پچھتا رہا تھا؟ یہ ایک سوال ہے جس پر بقول مولانا مرحوم "مفسرین بھی حیران ہیں"۔

مولانا اس سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اس شخص کا شرک غیر خدائی قوتوں کی پوجا پاٹ والا شرک نہیں تھا۔ بلکہ اس کا شرک یہ تھا، جو قصہ میں پوری طرح مذکور ہے، کہ اُس نے کارخانۂ کائنات کے اندر بجائے خالق کائنات کے اسباب اور انسانی تدابیر کو کارفرما ٹھہرا لیا تھا، چنانچہ وہ اپنے باغات کی سرسبزی و شادابی اور اپنی دولتمندی کو محض

اپنی اسبابی تدابیر کا نتیجہ سمجھ رہا تھا اور ان کے بھروسے پر یہاں تک کہنے کی جرأت کر رہا تھا کہ۔

مَا أَظُنُّ أَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖ أَبَدًا ۞ میں نہیں سمجھتا کہ میری محنت و تدبیر کا یہ پھل کبھی برباد ہوگا۔

جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اُس کے خیال میں کاروبار دنیا میں مشیت الٰہی کو کوئی دخل ہی نہیں تھا جو حقیقت میں شرک کی بدترین قسم ہے، کیونکہ پوجا پاٹ والے شرک میں صرف عبادت و دعا میں غیر خدائی قوتوں کو شریک کیا جاتا ہے، باقی اس عالم کے نظام کو اللہ تعالیٰ ہی کے مشیت کے تابع سمجھا جاتا ہے۔

اس عقدہ کو حل کرنے کے بعد مولانا نے اس ذیل میں ایک اور بصیرت افروز بات فرمائی ہے — فرماتے ہیں کہ دیکھئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورت کا دجّالی فتنہ سے جو خاص تعلق بتایا ہے وہ اس موقع پر کتنا صاف نظر آرہا ہے، ادھر جب سے دجالی فتنہ کی ابتدا ہوئی ہے۔ پرانے قسم کے پوجا پاٹ والے شرک کا رواج تو گھٹ رہا ہے مگر یہ ماڈرن قسم کی مشرکانہ ذہنیت برابر لوگوں پر مسلط ہوتی جا رہی ہے۔ جس کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اسی سورت میں کیا گیا ہے، اور پھر تمثیلی انداز میں اس کا انجام دکھا کر کم از کم اہل ایمان کو متنبہ کر دیا گیا ہو کہ

"دنیا ہو یا آخرت، کسی میں [بھی] بہترین نتائج اور بہترین انجام کی ضمانت صرف اس یقین میں پوشیدہ ہے کہ عالم کی ولایت اور کارفرمائی صرف حق تعالیٰ کی ذات پاک کے ساتھ محدود و مختص ہے۔۔۔۔ یہی مفاد و مطلب ہو قصہ کے آخری فقرہ کا هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا"

---

(۲)

اس سورت کے مشتملات میں حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام کا مشہور قصہ بھی ہے۔ یہ قصہ تین اجزاء پر مشتمل ہے۔

(۱) حضرت خضر علیہ السلام کا غریب ملاحوں کی کشتی کو ایک ظالم حکمراں کی دستبرد سے بچانے کے لیے اس میں شگاف ڈالنا۔

(۲) ایک بے گناہ لڑکے کو اس اندیشہ سے قتل کرنا کہ یہ اپنے کفر و سرکشی کے حال سے اپنے والدین کو مغلوب نہ کرلے۔

(۳) ایک نیک آدمی کے یتیم بچوں کے موروثی خزانے کی حفاظت کے خیال سے ایک شکستہ دیوار کی بلا معاوضہ مرمت کر دینا جس کے نیچے ان کا خزانہ دبا ہوا تھا۔

مولانا نے قصہ کے ان تینوں اجزاء کو عملی درس کے تین نمونے قرار دے کر قریبی دور کی ایک مثال کے ذریعہ دکھلایا ہے کہ دجالی فتنہ کے عہد میں ان نمونوں کے مطابق عمل کر کے فتنہ کے بعض پہلوؤں کی پیدا کردہ مشکلات کا حل

کس طرح کیا جا سکتا ہے۔۔

یہ مثالی واقعات سے مولانا کی نکتہ آفرینی کی خوب ہی مثال ہے۔ فرماتے ہیں۔

"جب یورپ و امریکا سے موجودہ دجالی فتنہ کا سیلاب مشرق کی طرف اُمنڈا، اور اس کے رُوح کُش، ایمان رُبا تھپیڑوں کی زد میں شاید سب سے پہلے ہمارا ملک ہندوستان ہی آیا۔ اور مسلمانوں کی حکومت اس ملک میں تہہ و بالا ہوگئی۔ چاہنے والوں نے پہلے تو یہی چاہا کہ ظلم ہی کا ازالہ کیا جائے، لیکن تجربے نے بتایا کہ ظالم کے ہٹنے کا وقت ابھی نہیں آیا ہے، تب کہیں زندگی کے مذکورہ بالا مشاغل کے لیے دینی مدارس کا نظام ملک کے مختلف گوشوں میں قائم کیا گیا، اور ایسے زمانہ میں قائم کیا گیا، جب اسی ہندوستان میں یورپ کے علوم جدیدہ کی تعلیم کے لیے ملک کے طول و عرض میں اسکولوں اور کالجوں کا جال مختلف یونیورسٹیوں کے تحت بچھایا جا رہا تھا، ان جدید جامعات اور کلیات مدارس کے طویل و عریض وفاتوں کے مقابلے میں غریب عربی مدارس کی جو حیثیت تھی وہ تو خیر تھی ہی، ماسوا اس کے عربی کی ان تعلیم گاہوں کے قیام میں نہ اخباروں میں پروپگنڈے سے کام لیا گیا، نہ پریس کی دنیا میں ہلچل پیدا کی گئی، دیواروں اور نمایاں مقامات پر نہ لمبے چوڑے پوسٹر آویزاں اور چسپاں کیے گئے۔ نہ شہروں اور قصبوں میں کانفرنسوں اور سالانہ اجتماعات کے سالانہ تماشوں کا نظم کیا گیا، نہ ان کے لیے اپنا کوئی خاص لٹریچر تیار کیا گیا، بلکہ انتہائی کس مپرسی کے حالات میں گمنام قصبوں اور دیہاتوں کی مسجدوں کے گوشوں میں کچھ پڑھنے والے اور پڑھانے والے سمٹ گئے تھے، تعلیمی نصاب نہ صرف نقائص و عیوب سے معمور تھا، نہ عصری تقاضوں کے مطابق علوم و فنون کی کتابیں اس میں شریک تھیں، اور نہ دنیا کی موجودہ علمی زبانوں میں سے کسی زبان کو اس نصاب میں جگہ دی گئی مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جن علوم کی وحی کی گئی تھی) ان کے ساتھ عہد قدیم کے بعض قدیم فرسودہ فنون کی کتابیں اور وہ بھی انتہائی بے دلی کے ساتھ ان عربی مدرسوں میں پڑھائی جا رہی تھیں، الغرض ظاہر ہو یا باطن اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ان مدارس میں ژنگاف ہی ژنگاف اور خرق ہی خرق دیکھنے والی آنکھوں کو نظر آ رہے تھے، اسی کا نتیجہ یہ تھا اور شاید اب تک ہو کر یورپ و امریکہ جیسے ترقی یافتہ ممالک و اقالیم تک ہی نہیں، بلکہ یہ واقعہ ہو کر خود ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ان سے یا کم از کم ان کی قدر و قیمت سے ناآشنا ہی رہا، میں دوسروں کے متعلق کیا کہوں اپنے دینی مدارس کی ان شکستہ حالیوں اور پڑھنے پڑھانے والوں کی شکستہ بالیوں ان کی کس مپرسیوں، ناقدریوں کو دیکھ دیکھ کر خود میرا جی بھی ہمیشہ کڑھتا رہا، اور جو عیوب و نقائص ان میں ہیں ان کو میں اب بھی عیوب و نقائص ہی سمجھتا ہوں، لیکن جیسے کھلے دماغ کے ساتھ ان کوتاہیوں کا

مجھے اعتراف ہے، اسی کے ساتھ اس واقعہ اور مشاہدہ کا بھی کیسے انکار کروں کہ ہمارے ان مدارس کے جن شگافوں اور کوتاہیوں کو دیکھ دیکھ کر بہی خواہوں کی طرف سے نوحہ خوانیوں اور ماتم سرائیوں کا سلسلہ اس قسم کے الفاظ اور تعبیروں میں جاری تھا۔ کہا جاتا تھا کہ یہاں سے پڑھ پڑھ کر نکلنے والے ؎

نہ سرکار میں کام پانے کے قابل۔ نہ دربار میں لب ہلانے کے قابل
نہ بازار میں بوجھ اٹھانے کے قابل نہ جنگل میں ریوڑ چرانے کے قابل (حالی)

اسی لیے بعض فیصلہ کرنے والوں نے یہ فیصلہ تک کر دیا تھا کہ:۔ ؎

ان سے تو اب تلافیِ مافات ہو چکی
بس لوٹ دو بساط کہ یاں مات ہو چکی (ڈپٹی نذیر احمد)

جہاں تک میرا خیال ہے، بجائے معاندانہ تعریضوں، رقیبانہ طنز اور طعنوں کے اس قسم کی تنقیدوں کی نوعیت بھی اگر وہی قرار دی جائے جو موسیٰ علیہ السلام کے اس اعتراض کی تھی جب کشتی کے شگاف اور خرق کو دیکھ کر انھوں نے خضر علیہ السلام کو مخاطب بنا کر فرمایا تھا، کہ:۔

اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا۔ — کیا تم نے کشتی میں شگاف اس لیے پیدا کر دیا کہ کشتی والوں کو ڈبو دو، تم نے بڑا نامناسب کام کیا۔

لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ مذکورۂ بالا عیوب و نقائص سے پاک کر کے ان مدارس کو بھی عصری جامعات اور کلیات کے مطابق اگر بنا دیا جاتا اور جن صلاحیتوں کے فقدان کا مرثیہ ان کے متعلق پڑھا جا رہا تھا اگر ان میں ان صلاحیتوں کے پیدا کرنے کا سامان بھی کر دیا جاتا، تو دینی فتنے کے پچھلے تاریک ترین دنوں میں بچی کھچی نجات کی کچھ کشتیاں ان لوگوں کو جو میسر آتی رہی ہیں، جو ایمان و عمل صالح کی زندگی کے ساتھ قبر کے کنارے تک پہونچنے میں اب تک کامیاب ہوئے ہیں، کیا ہم نجات کی ان کشتیوں کو پا سکتے تھے، یہ ان ہی کس مپرس دینی مدارس کا طفیل ہے کہ اسلامی گھرانوں کے چند ایسے افراد کی دینی تربیت و پرداخت کا موقع مل گیا، جو سرفرازی اور سربلندی کے عصری سامانوں سے اگر لیس ہوتے، تو بجائے پرانے قصبات کی اجڑی ہوئی مسجدوں سونی خانقاہوں کے یقین مانئے کہ لندن کے انڈیا آفس اور پارلیمان میں وہ نظر آتے، یا کم از کم ہندستان کی اسمبلیوں، کونسلوں ہائی کورٹوں کی زیب و زینت بن کر وہ ختم ہو جاتے۔

بلکہ تجربہ یہ بتا رہا ہو کہ دین کے جن مدارس میں وقت کے تقاضوں کی رعایت کی گئی، حکومت کی نگاہوں میں وہ چڑھ گئے، پھر ان کے ختم ہی کر دینے کا ارادہ کیا گیا، یا ان کو بھی اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنا لیا گیا، چل تو وہ رہے ہیں اب بھی دینی مدارس ہی کے نام سے۔ لیکن جاننے والے

ہی جانتے ہیں کہ ان مدارس سے فارغ ہونے والے کام کس کے آ رہے ہیں۔ یہ سامنے کے واقعات اور مشاہدات ہیں۔ ہر دیکھنے والی آنکھ ان نتائج کو دیکھ رہی ہے۔ اور اس وقت سمجھ میں آتا ہے کہ کہنی لنگ کے دینی مدارس کے خضر صفت بانیوں نے خرق و شگاف کے ان عیوب و نقائص کو ان میں کن مصلحتوں کے تحت باقی رکھا۔ صرف یہی نہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مسلمان باپوں اور مسلمان ماؤں کے بچوں کو ان کی گودوں سے چھین چھین کر عصری جامعات اور یونیورسٹیوں میں داخل کر کر کے طغیان و سرکشی، الحاد و ارتداد کے کافرانہ جراثیم ان کے دل و دماغ میں ایک طرف جہاں پرورش کرنے والے پرورش کر رہے تھے، تو دوسری طرف ان کے مقابلے میں ہمارے یہی کہنی مدارس تھے جنھوں نے مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کے ایک طبقے کو خواہ ان کی تعداد جتنی بھی کم ہو، اعتقادی و اخلاقی گندگیوں سے پاک رکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ میں کلی طہارت و زکوٰۃ و پاکیزگی کا مدعی نہیں ہوں، لیکن بایں ہمہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ کہنی سلسلہ کی تعلیم گاہوں میں تعلیم پانے والوں میں ایسے افراد عموماً پیدا ہوتے رہے ہیں جو قرآنی الفاظ "خَیْراً مِّنْهُ زَکٰوۃً" (بہتر ہو، اس سے (اعتقادی اخلاقی) پاکیزگی میں) کے مصداق بن سکتے ہیں، یعنی اعتقادی و اخلاقی پاکیزگی جیسی چاہیے اس کے وہ مالک ہوں یا نہ ہوں، لیکن فتنہ زدہ، دجالی یونیورسٹیوں کے طیلسانیوں کی اکثریت کے مقابلے میں نسبتاً اضافی پاکیزگی کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اور گو معاشی نقطۂ نظر سے جدید تعلیم گاہوں کے پڑھنے والوں کی حالت بظاہر بہتر ہی کیوں نہ نظر آتی ہو لیکن دین کے متعلق ان کی کافی تعداد نے اپنے طرز عمل سے خود یہ ثابت کر کے دکھایا کہ اسلام کے لیے ان کا عدم ان کے وجود سے بہتر تھا، جس قسم کے شکوک و شبہات کی چنگاریاں عام مسلمانوں میں ان کی طرف سے اڑائی گئیں، اسلامی عقائد و اعمال کی تحقیر و توہین کے سلسلہ میں جن ناگفتنیوں اور ناکردنیوں کے وہ مرتکب ہوئے، خود ان ہی نے ان کو اس فیصلہ کا مستحق بنا دیا کہ اسلام کے ان کپوت فرزندوں کی نیستی ان کی ہستی سے یقیناً بہتر تھی۔

اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام نے اجر و مزد کے خیال سے بالاتر ہو کر تعمیر دیوار کا جو عملی نمونہ اس آبادی میں پیش کیا تھا، جس کے باشندوں نے ان کی تحقیر و توہین کو آخری حد تک پہونچا دیا تھا، آپ

---

[1] ڈاکٹر اقبال مرحوم ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلاتے رہتے تھے، مسلمانوں کو چونکاتے کہ ؎

الحذر از دستبرد روزگار — گیر فرزندان خود را در کنار

چاہیں تو ان ہی گمنام مدارس میں جو دجالی فتنے کے استیلاء و تسلط کے بعد اس ملک میں قائم ہوئے ان میں اس نمونے اور اس کے سارے پہلوؤں کا کسی نہ کسی شکل میں مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

کیسی عجیب بات ہو کہ مسلمانوں ہی کے اسلاف نے معارف و علوم کا جو متروکہ سرمایہ دنیا میں چھوڑا تھا اور حکومت کی دیوار جس وقت اس ملک میں منہدم ہو رہی تھی اس وقت مسلمانوں کا یہ موروثی ترکہ بدترین خطرات سے دوچار ہو گیا تھا، آنے والی نسلیں جدید جامعات اور یونیورسٹیوں میں بھیڑیا دھسان شکل میں دھنستی چلی جا رہی تھیں، مسلمانان در گور، و مسلمانی در کتاب کا دردناک نظارہ بے نقاب ہو کر دھمکیاں دے رہا تھا کہ کچھ دن اور ابھی غفلت سے اگر کام لیا گیا تو کتابوں والی مسلمانی بھی کیڑوں کے پیٹوں ہی میں دفن ہو جائے گی۔

لیکن چند خضر وش، خضر خصال بزرگوں نے کمر ہمت چست کی، اور یہ تو نہ کر سکے کہ جیسے تیرہ سو سال سے جو کتابیں حکومت کے آئین و دستور کی حیثیت سے استعمال ہو رہی تھیں، ان کی اس حیثیت کو باقی رکھیں، لیکن مسلمانوں کے صالح اسلاف کے اس موروثی ترکہ کی حفاظت اور ایک نسل سے دوسری نسلوں تک اس کو مسلسل منتقل کرنے کا ایسا بندوبست بہر حال انھوں نے کر دیا کہ جب کبھی مسلمانوں کی آئندہ نسلوں میں سے کسی نسل کو اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہو جانے کا موقع کبھی مل گیا اور ایمانی جوش دینی جو اس بحران میں کبھی واپس ہوا تو اس وقت بالکل تر و تازہ حالت میں اپنے اس موروثی ترکہ کی ایک ایک چیز انشاء اللہ تعالیٰ ان کو مل جائے گی۔ جس طرح چاہیں گے ان سے وہ اس وقت مستفید ہو سکتے ہیں۔ اور گو خود مسلمانوں کی طرف سے ان کی عزت و آبرو کی دھجیاں اڑائی گئیں، ان کا نام مسجد کے ملّانے، خیرات کی روٹیاں توڑنے والے، قل اعوذئیے، از قبیل تنابز بالالقاب کی جو صورتیں بھی ممکن تھیں شاید ہی کوئی صورت ایسی باقی رہ گئی ہے جسے اختیار کرنے والوں نے اس راہ میں اختیار نہ کیا ہو۔

لیکن بایں ہمہ اجر و معاوضہ کے خیال سے بلند و بالا ہو کر یہ میرا مشاہدہ ہو کہ اس خدمت کو جس کی قیمت دوسری جگہ سیکڑوں اور ہزاروں کی شکل میں مل رہی تھیں، اسی خدمت کو، بخدا اسی خدمت کو اللہ کے یہ وفادار بندے اور رسول علیہ السلام کے سچے راست باز جاں باز خدام بغیر معاوضہ یا قلیل ترین معاوضہ کے [ساتھ] بصد خندہ جبینی انجام دینے میں مشغول رہے۔[۱]

---

[۱] مثلاً حضرت الاستاذ مولانا انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہٗ ہی کو میں نے دیکھا ہی، جب دیوبند میں حدیث کا درس بغیر کسی تنخواہ کے دہ برسوں سے دے رہے تھے، اسی زمانہ میں ڈھاکہ یونی ورسٹی کے شعبہ اسلامیات کی صدارت ہزار روپے ماہوار کی تنخواہ کے ساتھ پیش ہوئی، لیکن یہی نہیں کہ خاموشی کے ساتھ، انھوں نے اس کو مسترد کر دیا، بلکہ زمانہ تک خود مدرسہ کے ارکین کو بھی اس کی خبر نہ ہوئی۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۳)

قصۂ موسیٰ و خضر علیہما السلام کے بعد ذوالقرنین کا قصہ آتا ہے۔ جس میں "یاجوج و ماجوج" اور دیگر اقوام پر ان کی مفسدانہ کارروائیوں کی روک کے لیے ایک دیوار بنائے جانے کا تذکرہ بھی ہو۔ اس ذیل میں یہ الفاظ آئے ہیں۔

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ.	اور چھوڑ دیا ہم نے (ان کو اس حال میں) کہ اس عرصہ میں بعض ان میں سے موج مارتے تھے بعض کے ساتھ۔

یعنی جب دیوار قائم ہو جانے کی وجہ سے دوسری قوموں تک ان کی رسائی بند ہو گئی تو اس عرصہ میں ان کا جو حال رہا قرآن اسے "بعضہم یموج فی بعض" کے ذریعہ ادا کرتا ہو ـــــ اس تعبیر کا مدعا کیا ہے، آیا وہ غیروں سے مایوس ہو جانے کے بعد باہم دست و گریبان رہنے لگے یا باہم امداد و مواساۃ کی زندگی بسر کرتے تھے؟ مولانا فرماتے ہیں کہ ان دونوں میں سے ہر ایک مفہوم کے لیے عربی زبان میں بیسیوں تعبیریں مل سکتی تھیں۔ لہٰذا

"ان میں سے کسی ایک ...... کے ساتھ قرآنی الفاظ اور تعبیر کو محدود کر دینا غالباً صحیح نہ ہوگا۔"

اس کے بعد اس سوال کا کہ "پھر ان الفاظ کا مطلب کیا سمجھا جائے؟" جواب دیتے ہیں۔

"ظاہر ہے کہ موج کا لفظ سمندر اور دریا کی متلاطم سطح اور اس پر ابھرنے والی موجوں کی جس تصویر کو بے نقاب کر رہا ہے اسی تصویر کو ہم اپنے سامنے رکھ کر قرآن جو کچھ سمجھانا چاہتا ہے اسے کیوں نہ سمجھیں، کوئی مانے یا نہ مانے لیکن فقیر کا ذہن تو یہی پاتا ہے کہ غیروں سے ہٹ جانے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے اس دور میں یاجوج و ماجوج کی قوم کی زندگی صرف اضطراب و بیقراری، ہنگامہ اور لغزش و جنبش بن کر رہ گئی تھی۔ ایسے مشاغل میں وہ مبتلا تھے جن میں صبح و شام، شب و روز، تگ و دو، دوڑ دھوپ، آمد و رفت، چلنے پھرنے، دوڑنے بھاگنے کے ہنگامے ہی برپا رہتے ہیں۔

یہ تو ان کی عام زندگی کا غالباً نقشہ تھا، اور باہم اس قوم کی مختلف ٹولیاں ایک دوسرے کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)
حضرت شیخ الہند کے متعلق یہ کون باور کرے گا کہ ماہوار پچھتر روپے ان کے نام سے جو درج تھے ان میں سے کل پچاس روپے لے کر پچیس روپے ہر چندہ مدرسہ کو واپس فرما دیتے تھے اور اسی پچاس میں مسرت و نشاط کی قابل رشک زندگی تقریباً نصف صدی تک بسر کرتے رہے۔ کوئی چاہے تو طویل فہرست دیوبند کے ان معماروں کی تیار کر سکتا ہو جنھوں نے مسلمانوں کے صالح اسلاف کے موروثی ترکہ کو آئندہ نسلوں تک بغیر کسی معاوضہ کے یا قلیل ترین معاوضہ کے ساتھ پہونچانے کا انتظام کیا۔ نور اللہ ضریحہم۔

ساتھ الجھی بھی رہتی تھیں، لیکن اسی کے ساتھ ان میں کوئی ٹولی دوسری ٹولی کو کلیۃً ختم کرنے کا بھی فیصلہ اس لیے نہیں کرسکتی تھی کہ اس میں خود اپنے وجود کے اختتام کا خطرہ اس کو محسوس ہوتا تھا، کچھ حالات اس قوم کے ایسے تھے، کہ نہ ایک دوسرے سے کلیۃً الگ ہی ہوسکتے تھے اور نہ ان میں سے کوئی دوسرے سے ٹوٹ کر یا جدا ہوکر فنا ہونے ہی کے لیے تیار تھا، گویا ان میں وہی تعلقات قائم تھے جو باہم دریا کی موجوں میں ہوتے ہیں۔ بایں طور کہ باہم ایک دوسرے کو دھکیلتے بھی رہتے ہیں، لیکن اسی کش مکش میں ارادی یا غیر ارادی طور پر ایک کو دوسرے سے آگے بڑھ جانے میں مدد بھی مسلسل ملتی چلی جاتی تھی۔

اسی کے ساتھ میرا دھیان بعضہم یومئذ یموج فی بعض کے الفاظ سے کچھ ادھر بھی جاتا ہے کہ تبعیض و تجزی یعنی باخود یاجوج و ماجوج کی تقسیم بھی محدود نہ تھی، بلکہ موجوں کا جو حال ہوتا ہے کہ ان کو کوئی گننا چاہے تو گن نہیں سکتا، ان میں بڑی موجیں بھی ہوتی ہیں اور چھوٹی بھی، کچھ یہی حال معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے اس دور میں ان کا ہوگیا تھا کہ ان گنت، بے شمار ٹولیوں میں وہ بٹے ہوئے تھے۔

خلاصہ یہ کہ غیروں میں تو فساد اور بگاڑ پیدا کرنا یہی یاجوج و ماجوج والوں کا شیوہ تھا اور خود باہم ایک دوسرے کے ساتھ موجی تعلقات رکھتے تھے۔"

اس کے بعد ان الفاظ میں کے پہلے لفظ "ترکنا" پر غور فرماتے ہیں اور یاجوج و ماجوج کے متعلق روایات کے ذخیرہ میں یہ جو روایت پائی جاتی ہے کہ

یاجوج وماجوج لم یکن فیھم صدیق قط ولا یکون ابدا •	یاجوج و ماجوج میں نہ کبھی کوئی "صدیق" ہوا اور نہ کبھی ہوگا۔

(درمنثور جلد ۴ صفحہ ۲۵۰)

اس روایت کی مدد سے یہ نکتہ لاتے ہیں کہ

زندگی کے اس دور میں جب وہ [یاجوج ماجوج] سراپا اضطراب اور ہمہ تن حرکت و گردش بن کر رہ گئے تھے قدرت نے بھی ان کو چھوڑ دیا تھا اور آسمانی راہنمائی نے ان کی دست گیری نہیں کی۔ اسی لیے ان کی تاریخ کا یہ عہد نبوات و رسالات اور ان کے آثار سے بالکل خالی ہوگیا۔"

دیوار کی بندش کے ذریعہ غیر قوموں سے یاجوج و ماجوج کا رشتہ منقطع کیے جانے کے بعد دوبارہ ان کو غیر قوموں کی طرف رُخ کرنے کا موقع دیا جائے گا یا نہیں؟ قرآن اس بارے میں کیا کہتا ہے؟

مولانا فرماتے ہیں۔

"سورۂ کہف میں تو نہیں، بلکہ سورۂ انبیار کی مشہور آیت ہے، یعنی

حتّٰی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَھُمْ — تا اینکہ کھول دیے گئے یاجوج و ماجوج اور وہ ہر

مِنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ — حدب سے تیزی کے ساتھ چل نکلے۔

سے معلوم ہوتا ہو کہ غیر قوموں سے منقطع اور بے تعلق ہو جانے کے بعد پھر ان کو ایک موقع غیر قوموں کی طرف رُخ کرنے کا دیا جائے گا۔"

اور متعدد دلائل و شواہد سے اس امر کو واضح فرماتے ہیں کہ یہ موقع قیامت سے کافی پہلے دیا جائے گا، بلکہ بقول مولانا کے "کوئی کہنا چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ [ان کے] ظہور کے آغاز کی کرن گویا عہد نبوت میں پھوٹ چکی تھی"۔

رہا اس ظہور اور خروج کی تکمیل کا سوال کہ کب جاکر یہ مکمل ہوگا؟ اس بارے میں خود قرآنی الفاظ "مِنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ" کی جانب توجہ دلاتے ہوئے "یوحنا عارف کے مکاشفہ" کا ذکر فرماتے ہیں جو ایک چھوٹے سے رسالے کی شکل میں "نیا عہد نامہ" یعنی انجیل کے نام سے جو مجموعہ اہل کتاب میں موسوم ہے۔ اس کے آخر میں لگایا ہوا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"کتاب کی ابتدائی عبارت سے معلوم ہوتا ہو کہ یہ یوحنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری ہیں، اور ان کو کچھ غیبی مکاشفات ہوئے ہیں، جنھیں قلمبند کر کے ساتوں کلیسا کے نام ایک ایک نسخہ روانہ کیا گیا تھا، بہرحال آئندہ پیش آنے والے واقعات ہی سے زیادہ تر ان مکاشفوں کا تعلق ہو، منجملہ دوسرے مکاشفات کے ایک مکاشفہ کے الفاظ یہ ہیں، کہ:-

"پھر میں نے آسمان کو کھلا ہوا دیکھا، اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید گھوڑا ہو، اور اس پر ایک سوار ہو جو سچا اور برحق کہلاتا ہو، اور وہ راستی کے ساتھ انصاف اور لڑائی کرتا ہو، اور اس کی آنکھیں آگ کے شعلے ہیں اور اسکے سر پر بہت سے تاج ہیں اور اس کا ایک نام لکھا ہوا ہو جسے اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا، اور وہ خون کی چھڑکی ہوئی پوشاک پہنے ہوئے ہو، اور اس کا نام کلام خدا کہلاتا ہو، اور آسمان کی فوجیں سفید گھوڑوں پر سوار اور سفید صاف مہین کتانی کپڑے پہنے اس کے پیچھے پیچھے ہیں اور قوموں کے مارنے کے لیے اس کے منھ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہو اور وہ لوہے کی عصا سے ان پر حکومت کرے گا، اور قادر مطلق خدا کے سخت غضب کی مے کے حوض میں ان کو روندے گا، اور اس کی پوشاک اور ران پر یہ نام لکھا ہوا ہے

بادشاہوں کا بادشاہ اور خداوندوں کا خداوند"

(یوحنا کا مکاشفہ ۱۹ آ ۱۱-۱۶)

نہیں کہا جا سکتا، کہ سچا اور برحق "کن الفاظ کا ترجمہ کیا گیا ہے، مگر "الصادق الامین" (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کون واقف نہیں ہے، ان سے بھی، ان بادشاہوں سے بھی جن کے سر کے تاج ان کے نہیں، بلکہ اسی کے مقدس فرق مبارک کے تاج تھے، گھوڑوں پر چڑھے ہوئے فرشتوں کو بھی لوگوں نے بدر کے میدان میں دیکھا تھا جو الصاف کے مستحق تھے، ان کے ساتھ الصاف، اور جنھوں نے لڑنے کا ارادہ کیا ان کے ساتھ لڑائی، اور ان ہی لڑائیوں میں خون کے چھینٹوں کا دامن پر پڑنا، انھیں پہونچنے کے ساتھ ایسی حکومت قائم کرنا کہ شریروں کے حوصلے پست ہو گئے، اور جو مقابلے کے لیے کھڑے ہوئے وہ گرائے گئے، روندے گئے، بادشاہوں کے اس بادشاہ اور خداوندوں کے اس خداوند کو کون نہیں پہچانتا،

صلوات اللہ علیہ وسلامہ

اسی مکاشفہ کے بعد دوسرا طویل مکاشفہ اور ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک فرشتہ آسمان سے اُترا، اور اس نے:-

"پرانے سانپ کو جو ابلیس اور شیطان ہے پکڑ کر ہزار برس کے لیے باندھا، اور اسے اتھاہ گڑھے میں ڈال کر بند کر دیا، اور اس پر مہر کر دی تاکہ وہ ہزار برس پورے ہونے تک قوموں کو پھر گمراہ نہ کرے۔" (رب ۲۔۲-۳)

آگے اسی کے بعد یہ کہتے ہوئے، کہ:-

"اس کے بعد ضرور ہے کہ تھوڑے عرصہ کے لیے کھولا جائے۔"

اسی تھوڑے عرصہ کے متعلق جس میں شیطان کا کھلنا بیان کیا ہے کہ ضروری ہے، اسی مکاشفہ میں اسی کی یہ تفصیل بھی پائی جاتی ہو۔ لکھا ہے۔ کہ

"اور جب ہزار برس پورے ہو چکیں گے تو شیطان قید سے چھوڑ دیا جائے گا۔"

چھوٹ کر کیا کرے گا، مکاشفہ میں ہے:-

"ان قوموں کو جو زمین کی چاروں طرف ہونگی یعنی یاجوج وماجوج کو گمراہ کر کے لڑائی کے لیے جمع کرنے کو نکلے گا۔"

قرآن کے روسے تو "من کل حدب" کے مفہوم کو ادا کرنے والے الفاظ چاہیے تھا کہ یہاں ہوتے واللہ اعلم اصل مکاشفہ کی عبارت کیا تھی، جس کا مترجم نے "زمین کے چاروں طرف" کے الفاظ سے ترجمہ کیا ہے۔

اس تفصیل کے بعد فرماتے ہیں:-

"اب بادشاہوں کے بادشاہ، خداوندوں کے خداوند "الصادق الامین" کو جو پہچانتے ہیں، وہ حساب کر کے دیکھ سکتے ہیں، کہ یاجوج وماجوج والوں کی قومی زندگی کے اس تیسرے دور کی تکمیل کا زمانہ کیا ہونا چاہئیے۔"

اور پھر اس موقع پر حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس موقع پر بے ساختہ الفرڈ ویبر کا قول یاد آجاتا ہے، اُس نے اپنی کتاب "تاریخ فلسفہ" میں لکھا ہے کہ:۔

"پندرھویں صدی کے وسط سے مغربی یورپ میں یکے بعد دیگرے متعدد حیرت انگیز واقعات ہوئے۔" (مترجمہ خلیفہ عبد الحکیم ص ۲۴۴)

چھٹی صدی کے وسط (۵۵۰ء) سے پندرھویں صدی کے وسط تک جوڑ لیجئے کہ اوسط مدت کیا ٹھہرتی ہے، کاش! تاریخ کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا جائے، یقیناً نشأت ثانیہ کے نام سے جو دور "مہذب ممالک" کا موسوم ہے اس کی ابتداء اور تدریجی ارتقاء کا مطالعہ اس نظر سے بڑا دلچسپ ہوگا۔"

اور پھر اس آخری سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ خروج کا موقع پاکر یاجوج وماجوج کے مشاغل کیا ہوں گے؟ مولانا اسی مکاشفہ کے یہ الفاظ پیش کرتے ہیں کہ:۔

"وہی فتنہ وفساد، لڑائی جھگڑوں کے قصوں کو یہ چھیڑ دیں گے تا اینکہ "عزیز شہر"٭ کو چاروں طرف سے گھیر لیں گے۔"

اور اس طرح مولانا اپنی خداداد ذکاوت اور استخراج نتائج کی غیر معمولی قوت سے یاجوجیت وماجوجیت کی (بقول خود) ایک ٹوپی" تیار کر دیتے ہیں۔ جسے ہم دیکھ رہے ہیں کہ انھیں قوموں کے سر پر فٹ آرہی ہے جنھیں مولانا نے موجودہ عہد میں جاہلیت کا علمبردار یا "دجاجلہ" قرار دیا ہے۔

---

(۴)

سورت کے آخری حصہ میں ایک آیت آتی ہے۔

اَفَحَسِبَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَنْ یَّتَّخِذُوْا عِبَادِیْ مِنْ دُوْنِیْٓ اَوْلِیَآءَ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْکٰفِرِیْنَ نُزُلًا۔	کیا وہی لوگ جنھوں نے انکار کیا خیال کرتے ہیں کہ بنالیں میرے بندوں کو میرے سوا پشت پناہ۔ ہم نے تیار کر رکھی ہو جہنم ان کی مہمان نوازی کے لیے۔

٭ "عزیز شہر" کے متعلق مولانا فرماتے ہیں کہ "عزیز" کا مادہ عزت ہے۔ "البلد الحرام" کے عربی لفظ کا ترجمہ اگر کیا جائے تو بھی "عزیز" ہو سکتا ہے۔"

اس پر مولانا رقمطراز ہیں :-

"خالق عالم حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کی یاد اور ذکر سے کلی انحراف اور بغاوت کے بعد فطرت انسانی کے ایک خاص رجحان کی طرف ایک خاص قسم کا اشارہ جو چاہئے آپ کو اس آیت میں مل سکتا ہو، کم از کم خاکسار کا ناچیز احساس یہی ہو، مطلب یہ ہو کہ اپنے پیدا کرنے والے خالق کی عائد کی ہوئی آئینی ذمہ داریوں سے بچ نکلنے یا نکل بھاگنے کا زندگی کے موجودہ ابتلائی دعبوری دور میں یہ ایک آسان طریقہ ہے کہ اپنے خالق سے اپنا رشتہ توڑ لیا جائے۔ اور

"خدا کو کیا پڑی، میرے تمہارے درمیاں کیوں ہو"

کہتے ہوئے جو جی میں آئے آدمی کرتا چلا جائے۔ عموماً الحادی زندگی کے نیچے کچھ اسی قسم کی شعوری یا غیر شعوری ذہنی چالاکیاں اور بے باکیاں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ الحاد اور بے دینی کی زندگی کا ایک پہلو تو یہ ہو، لیکن اسی کے ساتھ وہی انسان جو سراسر احتیاج اور اپنے خاص حالات کے لحاظ سے صرف فقر اور کہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ مجسم بھیک اور صرف سوال ہی سوال کے سوا وہ اور کچھ نہیں ہو، اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی بیرونی امداد کے بغیر وہ بسر نہیں کر سکتا، کھانے، پینے، پہننے، حتیٰ کہ سانس تک لینے میں غیر کی محتاجی، غریب آدمی کی زندگی کا ایسا کھلا ہوا خاصہ ہو جس سے قطع نظر کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں، وہ بیمار پڑتا ہو، جس علاقے میں رہتا ہو وہاں عموماً وبائیں پھوٹتی رہتی ہیں، قحط اور خشک سالی کے حملے ہوتے رہتے ہیں، جنگوں کا خلفشار مچا رہتا ہے بے آئینی اور بد امنی کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے، یہ اور اسی قسم کے پیش آنے والے حوادث و واقعات کے مقابلہ میں کیا کیا جائے؟ ایک سوال ہے جو تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے بنی آدم کے دل و دماغ میں ہلچل مچائے ہوئے ہو۔ خالق عالم کی طرف توجہ کی جائے اور اس کی پشت پناہی یا ولایت میں اپنی زندگی کو ڈال دیا جائے، یہ حل تو اس سوال کا بظاہر آسان نظر آتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ انسان کو جس نصب العین کی تکمیل کے لیے پیدا کرنے والے نے پیدا کیا ہو، اس کی ذمہ داریاں اس راہ میں قدرتاً عاید ہو جاتی ہیں، قرآن میں اس کا اعلان کرتے ہوئے کہ

اذا سألك عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوة الداع اذا دعان	میرے بندے جب پوچھیں میرے متعلق تو کہہ دو کہ میں قریب اور پاس ہی رہتا ہوں اور پکارنے والوں کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔

آگے جو یہ فرمایا گیا ہے کہ

فلیستجیبوا لی ولیومنوا بی لعلہم	بس چاہیے کہ وہ بھی مجھے جواب دیں، اور مجھے

یرشدون   مانیں تاکہ وہ سیدھی راہ پر چل پڑیں۔

اس میں کارروائی کے اسی دو طرفہ پہلو کی طرف راہ نمائی فرمائی گئی ہو، حاصل یہی ہے کہ مجھ سے کچھ لینا چاہتے ہو تو جو کچھ تم سے میں چاہتا ہوں اسے تم بھی پیش کرتے رہو "لعلہم یرشدون" تاکہ وہ سیدھی راہ پر چڑھ جائیں کا مطلب یہی ہے، راہ یابی کا فطری طریقہ یہی ہے، لیکن جو خود تو سب کچھ لینا چاہتے ہوں مگر خود کسی قسم کی ذمہ داری اپنے اوپر اپنے پیدا کرنے والے کی لینا نہیں چاہتے، ان میں ایک طبقہ تو ان لوگوں کا ہو جنھوں نے خالق عالم اور اپنے درمیان آلہہ یعنی دیوتاؤں اور مخلوق معبودوں کا ایک سلسلہ فرض کر لیا، شعور اس کا ان کو ہو یا نہ ہو لیکن واقعہ یہی ہے کہ اس تدبیر سے اپنی کاربر اریوں کی ایک ایسی راہ اپنے خیال میں انھوں نے نکال لی ہو، جس میں ان کے زعم یا وہم کے مطابق ان کی ضرورتوں کی تکمیل کا تو انتظام ہو جاتا ہو، مگر خود ان پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، لیکن ان درمیانی وسائط اور مخلوق معبودوں کے متعلق ان کا احساس ہوتا یہی ہے کہ نذر و نیاز وغیرہ چڑھاوے کی وقتی پیش کشوں سے خوش ہو کر ہماری حاجتوں کو ہمارے یہی آلہہ یا دیوتا پوری کرا دیتے ہیں، لیکن ان کے معبودوں کی طرف سے کسی قسم کا کوئی آئینی مطالبہ ان پر عاید نہیں ہوتا، اور غرض ان کی ہوتی بھی یہی ہے کہ آئینی ذمہ داری کے بغیر ان کی ضرورت پوری ہوتی رہے، اپنے ان معبودوں کی نذر و نیاز کے سلسلے میں پیش قرار قوم صرف کر دینا ان کو اس سے زیادہ آسان معلوم ہوتا ہو کہ اپنے آپ پر اور اپنے نفس کی خواہشوں پر پابندیاں عائد کریں، یہ مشاہدہ کی بات ہو کہ مشرکانہ کاروبار کرنے والوں میں کسی قسم کی ایسی اخلاقی اور آئینی ذمہ داری جو ان کے دیوتاؤں کی طرف سے ان پر عاید کی گئی ہو اس کا احساس نہیں پایا جاتا۔ خواہ ان معبودوں کی پوجا پاٹ میں ان کا جتنا بھی خرچ ہو جائے، گویا خدا کی ذمہ داریوں کے احساس کو دبانے کی یہ ترکیب اس طبقہ نے تراش لی ہو کہ خدا کے سامنے انھیں آنا ہی نہ پڑے، بلکہ خود تو وہ اپنے خود تراشیدہ معبودوں کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ان معبودوں سے چونکہ خدا راضی ہو اسلیے اللہ میاں سے ان کی ضرورتوں کی تکمیل وہ کرا لیں گے۔

اس طریقہ کے مقابلہ میں ایک دوسری تدبیر یہ بھی ہو کہ خدا کے سامنے سے تو اپنے آپ کو مطلق العنان اور آزاد رکھنے کے لیے وہ بھاگ جاتے ہیں، بھول کر بھی نہ خدا کا نام لینا چاہتے ہیں، اور نہ ان کو وہ یاد ہی آتا ہو، باقی زندگی کی ضرورتوں اور حاجتوں کے لیے مشرکوں کے نادیدہ و خود تراشیدہ اور ان کے خیال کے مطابق خدا رسیدہ معبودوں کی جگہ انھوں نے ہر ضرورت اور ہر حاجت کے لیے فنی حذاق یا ٹیکنیکل اکسپرٹوں کا طبقہ کھڑا کر لیا ہے، جس کی تعلیم و تربیت پر اس سے زیادہ توجہ اور زیادہ خرچ کرتے ہیں، جتنی توجہ اور جتنے مصارف کا بار مشرکانہ کاروبار والے اپنے معبودوں کو راضی رکھنے کے لیے برداشت کرتے ہیں اور ہر پیش

آنے والی ضرورت کے لیے وہ ان ہی حذاق، ایکسپرٹوں کی طرف رجوع ہوتے ہیں، ان ہی کی ولایت اور پشت پناہی میں ان کی ساری زندگی بسر ہوتی ہو، کسی ایسی جگہ قیام ان کے لیے دو بھر بلکہ شاید ناقابل تصور ہوتا ہے جہاں اپنے ان اولیا، یا پشت پناہوں کے دستیاب ہونے میں کسی قسم کی دشواری کا خطرہ ہو: ان ہی ایکسپرٹوں کے ساتھ ساتھ ایک طبقہ ان میں لیڈروں اور قائدوں کا بھی ہوتا ہے، اور عموماً اجتماعی حاجات میں ان ہی پر بھروسہ کیا جاتا ہو، الغرض خدا کی ذمہ داریوں سے بچتے ہوئے ضرورتوں اور حاجتوں کی بھی تکمیل میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ پیش آئے۔ اس کے لیے انہی مذکورۂ بالا دو طریقوں میں سے کسی ایک یا دونوں کو ساتھ ساتھ اختیار کرنے والوں نے اختیار کر رکھا ہے، قرآن میں مشرکانہ کاروبار والوں کے طرز عمل کی تعبیر کے سلسلے میں عموماً اس قسم کے الفاظ پائے جاتے ہیں، مثلاً

اتخذوا من دونہ آلھہ — انھوں نے میرے سوا معبود بنا لیے ہیں۔

خلاصہ یہ ہو کہ اپنی ضرورتوں اور حاجتوں میں جن پر مشرکین بھروسہ کیا کرتے تھے اور جس کی طرف اس راہ میں رجوع ہوتے تھے ان کو آپ دیکھیں گے، عموماً "آلھہ" کے نام سے قرآن کو موسوم کرتا ہے: لیکن سورۂ کہف کی مذکورۂ بالا آیت میں بجائے اسکے ہم "عبادی من دونی اولیاءً" کے الفاظ پاتے ہیں یعنی یہاں بجائے آلہہ کے اولیاء کا لفظ استعمال کیا گیا ہو۔ اسی کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مشرکوں کے عام معبودوں اور آلہہ کے متعلق قرآن میں جتلایا گیا ہو کہ عموماً وہ نام ہی نام ہوتے ہیں لیکن ان ناموں اور اسمار کو مسمّے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بایں معنی کہ درحقیقت ان ناموں سے جن چیزوں کی تعبیر کرتے ہیں، وہ معدوم اور کچھ نہیں ہوتیں، زیادہ تر مشرکوں کے معبودوں کی عام نوعیت یہی ہوتی ہو کہ وہ صرف مفروضہ اسمار اور نام ہی نام ہوتے ہیں۔ اور کبھی یہ ہوتا ہو کہ جن کمالات و تصرفات کو ان معبودوں کی طرف اپنے خیال میں مشرکین منسوب کرتے ہیں، ان سے قطعاً ان کو کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، گویا پتھر کا نام جیسے پانی رکھ لیا جائے اور نام رکھ کر توقع دلائی جائے کہ پانی کا کام اس پتھر سے لیا جا سکتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ بھی فرضی نام یا اسم بے مسمی ہی کی ایک شکل ہے، اور مشرکوں کے معبودوں پر قرآنی تنقید کے یہ الفاظ یعنی

ان ھی الا اسماء سمیتموھا انتم واباءکم — نہیں ہیں وہ لیکن صرف چند نام جو رکھ لیے ہیں خود تم نے یا تمھارے باپ دادوں نے۔

ہر حال میں صادق آتے ہیں۔

لیکن اس کے مقابلے میں حق تعالیٰ کی عائد کی ہوئی آئینی ذمہ داریوں سے بچ نکلنے والوں نے پشت پناہوں اور اولیاء کا جو طبقہ ایکسپرٹس (حذاق)، اور لیڈرس (قواد) وغیرہ ناموں سے بنا لیا ہے، ظاہر ہو کہ

اس کی نوعیت مشرکوں کے معبودوں سے اس باب میں مختلف ہوتی ہو، یعنی حذاقِ وقواد کا یہ گروہ اسی طرح خدا کے واقعی بندے اور مخلوقات ہیں جیسے ان پر بھروسہ کرنے والے خدا کے بندوں اور مخلوقات میں شامل ہیں، اور جن ضرورتوں اور حاجتوں میں ان پر اعتماد کیا جاتا ہو ان سے ان کی بے تعلقی کا حال بھی وہ نہیں ہوتا جو مشرکوں کے معبودوں کا ہے، بلکہ قدرتی قوانین کا علم حاصل کر کے اسی علم کے مطابق عملی نتائج حاصل کرنے کا طریقہ ان فنی ماہرین کو سکھایا جاتا ہو، اور خواہ ہر حال میں ان سے متوقعہ ضرورتیں پوری ہوں یا نہ ہوں لیکن ان ضرورتوں سے مشرکوں کے خود تراشیدہ معبودوں کی طرح ان کو قطعاً بے تعلق بھی نہیں قرار دیا جا سکتا۔

بہرحال جہاں تک میرا خیال ہو مذکورۂ بالا آیت میں بجائے" آلھۃ من دونی "کے" ان یتخذوا عبادی من دونی اولیاء" (یعنی میرے بندوں کو میرے سوا یا مجھے چھوڑ کر انھوں نے اپنے اولیاء اور پشت پناہ بنا جو رکھا ہو) یہ الفاظ جو پائے جاتے ہیں ان میں بظاہر حق تعالیٰ کی آئینی ذمہ داری سے آزاد رہنے کی جیسا کہ میرا ناچیز خیال ہو اسی دوسری تدبیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہو، جس میں بجائے خود تراشیدہ، نام نہاد آلہہ اور معبودوں کے ایکسپرٹوں اور لیڈروں کو بنانے والے اپنا پشتیبان، اور اولیاء بنا لیتے ہیں اور یوں اپنے پیدا کرنے والے خالق تعالیٰ جل مجدہ سے بے تعلق وقطعاً بے تعلق رہ کر زندگی بسر کرنے کی ایک راہ انھوں نے نکال لی ہے۔"

---

(۵)

آخری آیت جس پر سورہ کہف ختم ہو، یعنی

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا۔

کہدو کہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو کہ میں بھی آدمی تم ہی جیسا ہوں، مجھ پر یہ وحی نازل ہوتی ہو کہ تم لوگوں کا الٰہ (معبود) ایک ہو، پھر جو امیدوار ہو اپنے رب کی ملاقات کا تو اسے چاہیے کہ کرے بھلے اور سلجھے ہوئے کام اور ساجھی نہ بنائے اپنے رب کی عبادت میں کسی کو

اس پر مولانا رقمطراز ہیں ــــــ اور انھیں سطروں پر افادات عالیہ کا اختتام ہے ــــــ کہ

"جو کچھ اس سے پہلے بیان کیا گیا ہے، بظاہر اس آیت کا..... اس سے چنداں تعلق نظر نہیں آتا،

لیکن غور کیجئے اپنے پیدا کرنے والے کی آئینی ذمہ داریوں سے بچنے کے لیے. بجائے مشرکانہ کاروبار کے ایکسپرٹوں اور لیڈروں کی ولایت اور پشت پناہی کا نظریہ جو تراشا گیا تھا اور قرآن نے اس پر جو تنقید کی تھی بس. تنقید کو پیش نظر رکھتے ہوئے قدرتاً کیا یہ سوال نہیں پیدا ہوتا؟ یا نہیں ہو سکتا کہ دون اللہ (اللہ کے سوا) کسی دوسرے کو اولیاء بنانا، اور ان ہی کی پشت پناہی ڈھونڈنی اگر جرم ہو تو اسی جرم کے مجرم وہ بھی تو ہیں جو رسولوں اور پیغمبروں کو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ اور ایلچی مانتے ہیں اور ان کی ولایت اور پشت پناہی سے امداد حاصل کرتے ہیں. خود قرآن میں فرمایا گیا ہو کہ

تمہارا ولی (پشت پناہ) اللہ اور اللہ کے رسول ہیں۔ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ

یقیناً یہ ایک شبہ ہے اور چاہئے تھا کہ جو واقعہ ہو اس کو واشگاف کر دیا جائے۔

حقیقت یہ ہو کہ بندوں اور ان کے خالق میں واسطہ کا مسئلہ ایسا مسئلہ ہو جس کی واقعیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا. ہر ایک دیکھ رہا ہو کہ روشنی میں آفتاب کو، دودھ میں مثلاً گائے کو بھینس کو واسطہ بنایا گیا ہو. اس لیے بندوں اور خدا میں واسطہ نہیں، اس کا دعویٰ تو چشم دید بدیہی واقعہ کا انکار ہوگا، لیکن سوال اس واسطہ کے استعمال میں ہو. مشرکانہ کاروبار والوں کے طریقۂ عمل کی جو خصوصیت ہو اس کی تفصیل گزر چکی، یعنی خدائی ذمہ داریوں سے بھاگنے کی راہ، انھوں نے یہ نکالی کہ ضرورتوں اور حاجتوں کے لیے وہ ان ہی درمیانی وسائط کو آگے بڑھا دیتے ہیں، اور خود ان ہی درمیانی واسطوں کو کھلے ڈُلے کر، ان ہی کی اپنے خیال کے مطابق منت سماجت کر کے فرض کر لیتے ہیں کہ ان کا کام نکل جائے گا.

اور ان کے مقابلہ میں ان ہی ذمہ داریوں سے گریز کی دوسری راہ یہ ہو کہ انسانوں ہی کو زندگی کے مختلف شعبوں میں ماہر اور حاذق بنا کر اپنی ساری ضرورتوں میں خدا سے قطعاً بے تعلق رہتے ہوئے ان ہی ایکسپرٹوں اور لیڈروں کی ولایت پر بھروسہ کر لیا جاتا ہو. چونکہ دونوں صورتیں اپنے پیدا کرنے والے سے باغیانہ انحراف اور اپنے وجود کے نصب العین کی تکمیل سے گریز ہو. اس لیے درمیانی وسائط کی ولایت کی ان شکلوں کو قرآن نے مسترد کر دیا ہو اور ولایت کا وہ طریقہ جس میں اپنے خالق اور اس کی مرضی کے پانے کی ضمانت پوشیدہ ہو اور اپنی پیدائش کے قدرتی نصب العین تک جس ذریعے آدمی پہونچ جاتا ہو...... یہ طریقہ موجودہ ہبوطی زندگی کی ایک ایسی ناگزیر ضرورت ہو جس سے الگ ہو کر کامیابی تک انسانی زندگی پہونچ ہی نہیں سکتی. زمین کی طرف رخصت کرتے ہوئے انسان اول یعنی ہمارے پدر اول کو اسی لیے یہ وصیت کی گئی تھی [اور اس میں اسی طریقہ کی طرف اشارہ ہو] کہ

پھر آتے رہیں گے میری طرف سے تمھارے پاس راہ بتانے والے ان راہ بتانے والوں کے پیچھے پیچھے

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

جو چلیں گے نہ انکو ڈر ہو اور نہ وہ کبھی کڑھیں گے۔ یَحْزَنُوْنَ۔

بہرحال اسی حقیقت کا اظہار جہاں تک میرا خیال ہو، سورۂ کہف کی اس آخری آیت میں کیا گیا ہو، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہو کہ صاف صاف کھلے لفظوں میں کہہ دیجئے کہ میں بھی تم ہی جیسا ایک آدمی ہوں ..... قدرت نے صرف اپنے اس منشار کے اظہار اور ترجمانی کے لیے میرا انتخاب فرمایا ہو جسکی جوہری روح اور مرکزی عنصر یہ ہو کہ خالق کائنات ہی کو ساری انسانیت کا الٰہ اور چھوٹی بڑی دینی و دنیاوی ضرورت کا مرجع و ماویٰ بنایا جائے اور وہی سب کا آخری ٹھکانا بن جائے۔

یہ تو

اِنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ

کا مطلب اور خلاصہ ہوا، لیکن آخر میں جو یہ فرمایا گیا ہو کہ

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا

صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا

جہاں تک میرا خیال ہو خالق کائنات کو صحیح معنوں میں اپنا تنہا معبود اور واحد الٰہ بنانے کے عملی طریقہ کی طرف ان الفاظ سے جو توجہ دلائی گئی ہو اس کا حاصل بظاہر یہی معلوم ہوتا ہو کہ واقعی ذات حق کے ساتھ براہ راست رشتہ پیدا کرنے کی جن لوں میں اُمنگ و آرزو ہو، ان کو اپنی دینی زندگی میں اس ترتیب کی پابندی پر اصرار کرنا چاہیے کہ ان کی زندگی عمل صالح کی زندگی بن جائے۔ اگرچہ عمل صالح عام لفظ ہو لیکن آگے خالق کی عبادت اور خالق کے ساتھ بندوں کو جو تعلق رکھنا چاہیے اس کا ذکر چونکہ کیا گیا ہو اسلیے مقابلۃً یہی سمجھنا چاہیے کہ [یہاں عمل صالح سے مخلوقات کے ساتھ تعلقات کی درستی اور استواری مراد ہو۔ اور] مخلوقات کے ساتھ تعلقات کو سلجھاتے ہوئے خالق کی عبادت میں سرگرمی ہی صحیح نتیجہ تک آدمی کو پہونچائے گی۔

گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ خالق کی عبادت (نماز روزہ) وغیرہ میں جو چوکس نظر آتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ مخلوقات کے تعلقات میں لاپرواہیوں سے کام لیتے ہیں یا اس کے برعکس مخلوقات یا حقوق العباد کو اہم قرار دیتے ہوئے خالق کے ساتھ صحیح تعلق قائم کرنے کے ذوق سے جو محروم ہیں، یہ دونوں ہی طبقے انسانی سلوک کی صحیح فطری راہ سے ہٹے ہوئے ہیں، ٹھیک راستہ پر وہی چل رہے ہیں جن کی نگاہوں میں دونوں کی اہمیت ہو۔

ھذا والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

خاکسار مناظر احسن گیلانی

یوم الجمعہ ۱۲ ربیع الثانی سنہ ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۱ جنوری سنہ ۱۹۵۲ء عند اذان العصر بمقام کہف الایمان المشہور بہ "کمرہ" سورۂ کہف کے متعلق ایک ظلوم وجہول کے واردات و احساسات پورے ہوئے ـــــ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔"

وفاشعاری کے دو نادر نمونے

ازافادات مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ

حجّاج

طائف کے مکتب خانے میں بچوں کو پڑھاتا تھا، لیکن معلم الصبیانی کے اس پیشہ سے اتنی آمدنی جو ضروریات کے لئے کافی ہوتی، نہیں ہوتی تھی، پھر کیا کیا جائے، طائف سے اٹھا، دمشق پہونچا، وقت کے حکمراں کا جو وزیر باتدبیر تھا اس کے باڈی گارڈ کے سپاہیوں میں بھرتی ہو گیا، وزیر کا نام روح بن زنباع تھا، مروانی حکومت کے پہلے حکمران عبدالملک بن مروان نے روح کو اپنا وزیر بنا لیا تھا، بھرتی ہونے والا سپاہی، یوسف ثقفی باشندۂ طائف کا لڑکا تھا، نام اس کا حجاج تھا، یہ وہی حجاج ہے، جس کی یاد کو مسلمان اپنے حافظہ سے مٹانا چاہتے ہیں، لیکن بجائے مٹنے کے وہ تازہ ہی ہوتی رہتی ہے، امت اسلامی کے جگر کا وہ گھاؤ ہے جو صدیاں گزر جانے کے بعد بھی، اسی طرح ہرا ہے، نہ اس کی ٹیس ہی کم ہوتی ہے اور نہ دکھ ہی اس کا بھلایا جا سکتا ہے، عمر بن عبدالعزیز فرمایا کرتے تھے۔

دنیا کی ہر قوم اپنے اپنے فرعونوں کو لے کر کھڑی ہو، اور ان سارے فرعونوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی طرف سے حجاج اگر پیش کر دیا جائے۔ تو مسلمانوں کا یہ فرعون سب پہ بھاری ہو جائے گا۔ (ابن عساکر جہ)۔

مگر باوجود بے دینی اور حد سے گزری ہوئی بے دینی کے یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے مورخین نے جو کچھ لکھا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ بے آئینی کا الزام حجاج پر مشکل ہی سے لگایا جا سکتا ہے، غلط ہو یا صحیح، لیکن ایک ضابطہ اور آئین کو طے کر لینے کے بعد کرتا تھا جو کچھ بھی وہ کرتا تھا۔ اس کا شاید یہ فطری رجحان تھا کہ وقت کی حکومت خواہ کسی طرح قائم ہو گئی ہو رعایا کو چاہیئے کہ بے چون وچرا اس کے احکام کی پابندی کرے ظاہراً و باطناً اس کے وفادار رہیں۔ وہ اپنے نزدیک سمجھتا تھا کہ قرآنی آیت

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَاَطِيعُوا
(التغابن)

ڈرو اللہ سے، جہاں تک تمہارے بس میں ہو، سنو اور فرمانبردار بنے رہو۔

کا مطلب یہ ہو کہ اللہ سے ڈرنے کے لئے استطاعت کی شرط لگا دی گئی ہو یعنی جہاں تک آدمی کے بس میں ہو خدا سے ڈرے لیکن حکومت کے احکام کے متعلق صرف یہی حکم دیا گیا ہو کہ سننے والے ان کو سنیں اور بے چون وچرا اس کے فرمانبردار بنے رہیں۔ اسی لئے کہتا تھا کہ میں جو حکومت کا نمائندہ ہوں اگر حکم دوں کہ لوگ مسجد کے فلاں دروازے سے نکلیں، اس حکم کے بعد بھی کسی دوسرے دروازے سے جو نکلے گا، میرے لئے اس کا خون بھی حلال ہو جائے گا اور اس کا مال بھی، یہی وہ کہتا بھی تھا اور اسی کے مطابق عمل بھی کرتا تھا عمر بن عبدالعزیز کے سامنے ایک صاحب عنبسہ بن سعید نامی نے اپنی بعض چشم دید شہادتیں بیان کی تھیں، حجاج نے حکم دے رکھا تھا کہ رات میں کسی کو کوچوں گلیوں اور سڑکوں پر فلاں وقت سے صبح تک نکلنے کی اجازت نہیں، گویا کرفیو آرڈر نافذ کر دیا گیا تھا، عنبسہ کہتے ہیں کہ صرف ایک رات جب میں حجاج کے پاس بیٹھا تھا، لوگ گرفتار ہو ہو کر آتے تھے، بے چارے وجہ بھی بتاتے لیکن کسی کی شنوائی نہ ہوتی، اور یہ کہتے ہوئے کہ

نهیناکم و تعصونا — ہم تم کو منع کرتے ہیں اور تم ہماری نافرمانی کرتے ہو،

حجاج حکم دیتا کہ اس کی گردن اڑا دی جائے، بے چارے قتل کر دیئے جاتے تھے، حجاج نے اپنے عہد حکومت میں واسط نامی شہر آباد کیا تھا جس میں میونسپلٹی کا قانون نافذ تھا، برسر راہ پیشاب کرنے والوں کی سزا حبس دوام تھی۔

حکومت کے ساتھ وفاداری کے اسی جذبہ کی شدت نے ترقی کی راہ بھی اس کے لئے ہموار کی تھی جس زمانے میں عبدالملک کے وزیر کے باڈی گارڈ کا حجاج سپاہی تھا، وزیر نے یہ کہتے ہوئے عبدالملک کے سامنے پیش کیا تھا کہ نظم وضبط کے قائم کرنے میں میرا خیال ہو کہ اس شخص سے آپ کو مدد ملے گی۔ عبدالملک سفر میں تھا، حجاج کو حکم دیا کہ جس وقت میں سوار ہو جاؤں تم اس کی نگرانی کرو کہ کوئی میرے سوار ہونے کے بعد بیٹھا نہ رہے، حکم سن کر حجاج چلا گیا، کوچ کا نقارہ بجا، حجاج بھی سب کو سوار ہونے کا حکم دے رہا تھا، اور لوگ سوار ہوتے چلے جاتے تھے، لیکن جب وزیر کے ان ہی آدمیوں کے سامنے آیا جنہیں کا ایک سپاہی وہ بھی تھا تو لوگوں نے اس سے کہا کہ آؤ! ابھی کچھ کھا پی لیں تب روانہ ہوں گے یہ سننا تھا کہ حجاج نے ایک ایک کی پیٹھ کوڑے سے پھاڑ دی۔ وزیر کے خیمہ میں آگ لگا دی، یہ خبر وزیر نے خود روتے ہوئے عبدالملک تک پہونچائی، حجاج بلایا گیا تو "یہ کیا کیا"؟ کے جواب میں جس وقت وہ کہہ رہا تھا۔

"امیر المومنین! میں نے تو کچھ نہیں کیا، میرا کوڑا میرا کوڑا نہیں آپ کا کوڑا تھا، میرا ہاتھ میرا ہاتھ نہیں آپ کا ہاتھ تھا۔" (الاغانی ص۔)

عبدالملک کی باچھیں کھل گئیں، جس آدمی کی تلاش تھی گویا وہی اس کو مل گیا، ترقیوں کی راہ حجاج پر کھل گئی، پہلے حجاز کا گورنر ہوا اور عبدالملک کی وفاداری میں عبداللہ بن زبیر صحابی رضی اللہ تعالیٰ کو صحن کعبہ میں شہید کیا، مکعبہ تک میں آگ لگنے کی پرواہ اس نے عبدالملک کے حکم کے مقابلہ میں نہ کی تب عراق اور خراسان کی گورنری سے سرفراز ہوا گیارہ سال تک عبدالملک کی حکومت میں اور عبدالملک کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے اور جانشین ولید کے زمانہ میں ۹ سال تک مسلسل مروانی حکو

کے سب سے بڑے علاقہ میں حکومت کرتا رہا، اسی زمانہ میں دو سال کی مدت میں واسط کا شہر کوفہ اور بصرہ کے درمیان اس نے تعمیر کیا جو اس زمانہ میں دنیا کے حسین ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا، اور خضراء واسط یعنی واسط کے سبزہ زار کے نام سے مشہور تھا جسے دیکھ کر بکھا ہو بے ساختہ زبانوں پر قرآنی آیت

اَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ ○ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ ○

ہر ٹیلے پر نشانی کی عمارتیں جن کا کوئی فائدہ نہیں کھڑی کرتے ہو، اور ایسے مکانات تعمیر کرتے ہو، کہ شاید تم ہمیشہ دنیا میں رہوگے۔

. . . آجاتی تھی معلم الصبیانی کے مکتب خانے سے نکل کر عراق، ایران، خراسان جیسے ممالک کی حکومت تک پہونچنے کے بعد بھی حکومت کے ساتھ وفاداری کا جذبہ حجاج کا ترقی پذیر ہی تھا۔ اس نے بڑے بڑوں کی بھی اس راہ میں پرواہ نہ کی جنگ کے بالڑائی کے مقتولوں کے سوا اس راہ میں بیان کیا گیا ہو کہ ایک لاکھ ۲۰ ہزار تعداد حجاج کے ان مقتولوں کی ہو جو اس کے سامنے باندھ کر قتل کئے گئے، اور جیل خانے سے حجاج کے مرنے کے بعد

(۸۱) ہزار قیدیوں کو رہائی بخشی گئی، جن میں ۳۳ ہزار تعداد ایسے لوگوں کی تھی جنھوں نے نہ چوری کی تھی اور نہ کوئی ایسا جرم کیا تھا جس کی سزا اصولی وغیرہ ہو۔ (ابن عساکر ص۵۰)

حکومت کے حکم سے بال برابر تجاوز اس کے نزدیک قتل جس کا مستحق لوگوں کو جب بنا دیتا تھا تو اس سلسلہ میں جو کچھ بھی اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہو بظاہر اس سے انکار کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی قانون بنا لینے کے بعد جو فعل بھی کیا جائے آئینی بن جاتا ہو، یہی اس کا خیال بھی تھا پوچھنے والے نے ایک دفعہ اس سے پوچھا بھی کہ اپنے ضمیر میں تم اپنا خونریزیوں اور سفاکیوں کے متعلق کسی قسم کی خلش بھی محسوس کرتے ہو تو جواب میں اس نے کہا تھا۔

لبنان اور سنیر (شام کے دو پہاڑوں) کے برابر سونا خیرات کرنے سے زیادہ میں ثواب کا کام اپنے ان اعمال و افعال کو سمجھ رہا ہوں جو حکومت کی فرمانبرداری اور وفاشعاری کے سلسلہ میں مجھ سے اب تک بن پڑے ہیں۔ (ابن عساکر ۶۸/۴)

اس راہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کی صحابیت کے شرف کی بھی پرواہ نہ کرتا تھا، حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی گردن میں جیسا کہ مشہور ہو اس نے مہر لگائی تھی جو علامت تھی اس بات کی کہ ان کی وفاداری مشکوک رہی، اس نے بڑے جلیل القدر تابعی حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کو جس بے دردی اور قساوت قلبی سے قتل کیا، عام طور سے درد کی اس داستان کو لوگ بیان کرتے رہتے ہیں، کہتے ہیں کہ اسی کے بعد اس کا پیمانہ لبریز ہو گیا کچھ ایسے خواب دیکھنے لگا جو اس کی موت کی خبر دے رہے تھے، مگر بایں ہمہ اس نے اس کے بعد بھی جو وصیت نامہ . . . . . لکھوایا تھا، وہ یہ تھا،

"حجاج یوسف کا بیٹا (مرنے کے وقت) یہ وصیت نامہ لکھوا رہا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہو اس کی بھی میں گواہی دیتا ہوں، اور یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے بندے اور اللہ کے رسول ہیں"۔

اس رسمی تمہیدی فقرے کے بعد "وصیت نامہ" کے الفاظ یہ تھے۔

انہ لا یعرف الا طاعۃ الولید بن عبد الملک علیہا یحیا و علیہا یموت و علیہا یبعث
(ابن عساکر ص ۶۶ ج ۴)

اور حجاج ولید بن عبد الملک (وقت کے حکمراں) کی اطاعت (فرمانبرداری) کے سوا اور کچھ نہیں جانتا اسی پر وہ زندہ رہا، اسی پر مرے گا، اور اسی پر قیامت کے دن اٹھایا جائے گا۔

اور اس سے بھی دلچسپ لطیفہ "ضمیری مغالطہ" کا یہ ہو، حجاج ایک دفعہ بیمار ہوا، اور اتنا سخت بیمار، کہ کوفہ میں اس کے مرنے کی خبر مشہور ہو گئی، قدرتاً لوگوں نے اطمینان کی سانس لی، مگر بجائے مرنے کے حجاج چنگا ہو گیا، جمعہ کے دن منبر پر آ کر اس نے تقریر کی، جس کا ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ

"تم نے مشہور کر دیا کہ حجاج مر گیا، خدا کی قسم اپنے متعلق ہر طرح کی بہتری اور بھلائی کی، امید مجھے اپنی موت ہی سے ہو"! (ابن عساکر ص ۶۲/۲۳۰)

اسی لئے پسند بھی وہ ان ہی لوگوں کو کرتا تھا جو حکومت کے مفاد کی حفاظت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتے تھے اور اس راہ میں سب کچھ کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے، اصفہان کا گورنر بنا کر حجاج نے ایک بدوی عرب کو اس لئے بھیجا تھا کہ خراج کا بقایا سالہا سال سے اصفہان والوں پر چڑھا چلا آتا تھا، وصول نہیں ہوتا تھا، المسعودی نے لکھا ہو کہ اصفہان پہونچ کر نمبرداران اور مقدموں کو گورنر نے جمع کیا، آٹھ مہینوں کی مہلت ان لوگوں نے طلب کی، اس نے بجائے آٹھ کے دس مہینے تک کی مہلت دیتے ہوئے کہا کہ دس آدمیوں کی ضمانت پیش کرو، ضمانت دینے والوں نے ضمانت تو دے دی، لیکن مقررہ مدت تک رقم جب وصول نہ ہوئی، تو ضمانت دینے والوں کو طلب کر کے اس گورنر نے حکم دیا کہ خالی تھیلیاں خزانے سے لائی جائیں، اور ان ضمانت دینے والوں میں سے ایک ایک کی منڈی کاٹ کاٹ کر تھیلی بھری جائے، حکم کے مطابق ابھی دو ایک منڈیوں تک نوبت پہونچی تھی، تھیلیاں جو بھری گئیں، اور منہ ان کا بند کر دیا گیا تھا مہر لگائی گئی، اور پشت پر گورنر نے لکھا۔

"فلاں ابن فلاں کے ذمہ جتنی رقم واجب الادا تھی وہ وصول ہو گئی"۔

لوگوں میں ہلچل مچ گئی، اور چند گھنٹوں میں سالہا سال کا بقایا وصول ہو گیا۔

حجاج تک وصول کرنے کے اس طریقہ کی خبر جب پہونچی تو اپنے انتخاب کی داد خود دے رہا تھا۔ لکھا ہو کہ جب تک حجاج زندہ رہا، اصفہان پر اس کا یہی بدوی گورنر مسلط رہا، حالانکہ عبادت میں حال اس کا یہ تھا کہ چار درم دے کر حجاج

نے حکم دیا کہ تین آدمیوں پر اس کو تقسیم کر دو، تین درم تک تو حساب صاف تھا لیکن چوتھے درم کو کیا کرے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

(المسعودی صـ۱۰۳)

اسی سے سمجھ میں آتا ہو کہ "ضمیر" کو دینی حدود سے آزاد کر دینے کے بعد بآسانی دھوکہ دیا جا سکتا ہو، حجاج کی زندگی اس مغالطہ کی ایک عبرتناک تاریخی مثال ہو، وہ دین کا نہیں بلکہ آئین کا پابند بن کر حکومت کرنا چاہتا تھا، ظاہر ہو کہ آئین کے بنانے والے خود انسانی عقول اور دماغ ہوتے ہیں، اپنی خواہش کے مطابق عقل اور دماغ سے مشورہ حاصل کرنا کچھ بھی مشکل نہیں، دین کی خصوصیت یہ ہو کہ اس کا سرچشمہ عقل و دماغ نہیں، بلکہ عقل و دماغ کا خالق حق سبحانہ وتعالیٰ کی ذات پاک ہوتی ہو اسی لئے شعوری اور غیر شعوری خواہشوں کی آلودگیوں سے دین کے دفعات پاک ہوتے ہیں۔

حجاج نے حکومت کی بہی خواہی اور وفاداری کے سلسلہ میں یہ واقعہ ہو کہ وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتا تھا، دین کے ساتھ ایسا معلوم ہوتا ہو کہ اسی نصب العین پر اپنی دنیا بھی اس نے قربان کر دی تھی۔ ابن عساکر نے لکھا ہو۔

مات الحجاج ولم یترک الا ثلاثمائة درهم ومصحفا وسيفا وسرجا ورحلا ومائة درع موقوفة

(صـ۸۳)

حجاج جب مرا تو اس نے نہ چھوڑا مگر صرف تین سو درم (نقد کی شکل میں) ان کے سوا ایک قرآن، ایک تلوار، ایک زین، ایک کجاوہ، اور سو عدد زرہیں جو جنگ کے لئے وقف تھیں۔

اس کا خیال تھا اور کلیۃً بے بنیاد خیال نہ تھا کہ اسلام کی وجہ سے دولت و ثروت کا جو طوفان عربوں میں امنڈ پڑا تھا، اس نے عربی قبائل اور ان کے شیوخ منچلے لوگوں کے قلوب میں طرح طرح کی امنگیں پیدا کر دی تھیں، ابتداء تو ان کی عہد نبوت ہی میں ہو چکی تھی، ملک کے مختلف حصوں میں متنبی (زبردستی جھوٹی نبوت) کے دعوے کرنے والے) اٹھ کھڑے ہوئے، ان کے بعد حکومت کے باغیوں کا ایک طویل الذیل سلسلہ تھا، جو کسی طرح رکتا ہی نہ تھا، اسلامی تاریخوں میں حکومت کے ان ہی باغیوں کو الخوارج کہتے تھے۔ در اصل مربع میل بادیۂ عرب کے مختلف حصوں میں طرح طرح کے لوگ تھے۔ ان کی نظر اسلامی فتوحات پر جب پڑی اور محسوس ہوا کہ بظاہر عربی نوجوں کے یہ کارنامے ہیں تو طرح طرح کے خیالات ان میں پیدا ہونے لگے۔

آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

قسمت آزمائی کے میدان میں لوگ اترنے لگے، ان میں عجیب و غریب صلاحیتوں کے لوگ تھے، علاقہ نجد کا ایک خارجی ڈاکو جحدر کے متعلق لکھا ہو کہ گرفتار ہو کر جب حجاج کے پاس وہ لایا گیا اس کی صلاحیتوں کو دیکھ کر حجاج مبہوت سا رہ گیا، ایک بھوکے شیر سے حجاج نے مقابلہ کا حکم دیا۔ ابن عساکر کی روایت ہو کہ جحدر ڈاکو کا سیدھا ہاتھ حالانکہ بیڑیوں سے جکڑا ہوا تھا، صرف بایاں ہاتھ کھلا ہوا تھا، تلوار اسی ہاتھ میں جحدر کے تھی، شیر چھوڑا گیا۔ حجاج جحدر کے سے دیکھ رہا تھا، شیر جحدر پر

چھپا اس نے تلوار پر اس کو روکتے ہوئے ایسی ضرب لگائی کہ۔

خر لاسندل کانہ خیمۃ صرعتھا الریح۔ (ص۶۴)

شیر جکرا کر اس طریقے سے گر پڑا جیسے آندھی نے کسی خیمہ کو اکھاڑ کر زمین پر گرا دیا ہو۔

جس کے بائیں ہاتھ میں اتنی قوت تھی، اور حجاج کا حال جس کے یہ تھا کہ ایسی حالت میں بھی غضبناک ہو کے شیر سے لڑنے پر آمادہ ہو گیا، اندازہ کیجئے کہ امکانات کے کیسے کیسے طلسمی ایوان اس کے دل و دماغ میں تیار ہوتے ہوں گے، خدا ہی جانتا ہو کہ جحدر جیسے خارجی اور باغی کتنے تھے جن کی حجاج بیخ و بنیاد سے ان عناصر کو ختم کر دینے کا تہیہ کر چکا تھا کہتے ہیں کہ کوفہ اور بصرہ کے قرا، (یعنی علما، کی اکثریت) ابن اشعث کو لیڈر بنا کر حجاج کے مقابلہ میں جب کھڑے ہوئے تو خواجہ حسن بصری فرماتے تھے۔

ان الحجاج عقوبۃ سلطہ اللہ علیکم فلا تستقبلوا عقوبۃ اللہ بالسیف (ص۲۷)

حجاج ایک قدرتی سزا ہو جسے خدا نے تم لوگوں پر مسلط کیا ہو، تم تلوار سے اللہ کی اس سزا کا مقابلہ مت کرو۔

خود بھی دوہی کہتے تھے اور حضرت علی کرم اللہ وجہ کے حوالہ سے ایسی روایتیں نقل کیا کرتے تھے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کوفہ کے باشندوں کی سرکشیوں سے تنگ آکر حضرت علی نے بددعا کی تھی۔

اللّٰھم سلّط علیھم غلام ثقیف یحکم فی دمائھم واموالھم بحکم فیھم بحکم الجاھلیۃ" (ابن عساکر ص۴۲)

اے اللہ ان پر ثقیف قبیلہ کے لونڈے (یعنی حجاج) کو مسلط فرما جو ان کے خون اور ان کے مال کے متعلق جاہلیت کے فیصلے کرے گا۔

مطلب خواجہ حسن بصری کا یہی تھا کہ بجائے باہر کے چاہیے کہ ایسے مواقع میں مسلمان اپنے اندر کو ٹٹولیں باہر کی آگ کو دیکھیں کہ خود ان ہی کے اندر سے تو کہیں بھڑک نہیں اٹھی ہو، لیکن یہ عجیب بات ہو کہ جو بات اپنے بس کی ہوتی ہو عموماً اسی سے لاپروائی اختیار کی جاتی ہے، اور بظاہر جس کا مقابلہ ناممکن نظر آتا ہو اسی سے مقابلہ کرنے کے لئے لوگ تیار ہو جاتے ہیں۔ ممکنات سے اعراض کرتے ہیں۔ اور ناممکنات کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں جسے کر سکتے ہیں وہی نہیں کرتے اور جو نہیں کر سکتے اسی کے کرنے کی تجویزوں میں اپنا وقت بھی ضائع کرتے ہیں مال بھی برباد کرتے ہیں، آبرو بھی لٹاتے ہیں اور اپنے خون کو بھی رائگاں کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، خواجہ حسن بصری کی تلقین عرب کے گرم خون رکھنے والے نوجوانوں کو پسند نہ آئی، لکھا ہو کہ

نطیع ھذا العلج

اس گنوار پردیسی کی بات کیا ہم مان لیں؟

کہتے ہوئے لوگ آپ کے پاس سے اٹھ کر چلے گئے، حالاں کہ اس سے پہلے یہی خواجہ حسن بصری باوجود غیر عربی النسل مسلمان ہونے کے بصرہ کے سب سے بڑے عالم، سب سے بڑے متقی پرہیزگار، اور سب سے بہتر تقریر کرنے والوں میں شمار ہوتے تھے مگر ان پر بزدلی کا الزام لگایا گیا جو کچھ ہو سکتا تھا، وہ تو نہ کیا گیا اور جو نہیں ہو سکتا تھا اسی کو کرنے کے لئے میدان میں اتر گئے

مروانیوں کی بے پناہ فوجی طاقت سے جنھنے مسلمانوں کو ٹکرا دیا گیا، اس کا جو انجام ہو سکتا تھا وہی ہوا۔ خواجہ حسن بصری ایک طرف عام مسلمانوں کو یہ سمجھاتے سمجھاتے تھکے چلے جاتے تھے کہ "تلوار سے یہ مصیبت نہیں ٹلے گی جو تم پر ٹوٹ پڑی ہے" بلکہ

استقبلوها بالدعاء والتضرع　　اس مصیبت کا مقابلہ چاہیے کہ دعا، اور خدا کے حضور نالہ وزاری سے کرد۔

(صفحہ ۱۶۴)

دوسری طرف حجاج کو بھی جب موقع ملتا، یہ نصیحت فرماتے کہ

دیکھنا اللہ کے نیک بندوں سے بچتے رہنا۔　　(الاغانی جلد ۱۹ ص ۱۴۰)

لیکن اس پر تو خون سوار تھا، وہ اعلان ہی کئے ہوئے تھا، کہ غیر مجرم لوگوں کو مجرموں کے بدلہ میں پکڑوں گا۔ اور وہ لوگوں کو پکڑ رہا تھا بے دھڑک قتل کر رہا تھا، حکومت کے ساتھ جس کی وفاداری میں ہلکا سا شبہ کسی وجہ سے پیدا ہوتا ان پر علانیہ غداری کا الزام لگا دیا جاتا تھا، لوگ مارے جا رہے تھے، قید خانوں میں سڑ رہے تھے، ان کے گھر گرا دیئے جاتے تھے، ان کے بچے یتیم، عورتیں بیوہ ہو رہی تھیں، لیکن حکومت کی طاقت کو سب کچھ یقین کرتے ہوئے، حجاج بغیر کسی دغدغہ کے یہ سب کچھ کر رہا تھا کہتے ہیں کہ جیل خانے جو حجاج نے بنائے تھے کسی میں چھت نہ تھی، کھلے میدانوں میں چار دیواریوں کے اندر گرمی، سردی رات دن لوگ گزارنے پر مجبور کئے جاتے تھے، جو مر جاتے کتوں کی طرح ان کی لاش پھنکوا دی جاتی تھی اور یہ سب اس لئے کیا جا رہا تھا کہ اپنی حکومت کی بے پناہ طاقت پر بھی اس کو بھروسہ تھا، اور اسی کے ساتھ باور کئے ہوئے تھا کہ مروانیوں کی حکومت کے استحکام و استواری کی سیاسی تدبیر بھی یہی ہو۔ بظاہر حجاج کے زمانہ میں حکومت کی قوت میں قوت کا اضافہ جس طرح سے ہو رہا تھا اس کو دیکھتے ہوئے ہر دیکھنے والا شاید یہی باور کئے ہوئے تھا جو حجاج کا خیال تھا، لیکن اچانک واقعات کا رخ بدلنے لگا، حجاج نے خواب میں دیکھا کہ اس کی پیشانی سے دونوں آنکھیں اکھڑ کر باہر نکل آئی ہیں، بیدار ہونے کے بعد اپنے اس خواب سے کافی متاثر تھا، چند ہی دنوں کے بعد اس کے سامنے اس کے بیٹے محمد نامی نے دم توڑ دیا، ابھی اس کا جنازہ شاید اٹھا بھی نہ تھا کہ یمن سے قاصد پہونچا، خبر لایا کہ حجاج کا بھائی محمد بن یوسف جو یمن کا گورنر تھا، مر گیا ان جانگداز دو حادثوں کی خبر سے متاثر ہی تھا کہ دربار میں اتفاقاً کہیں سے ایک نجومی پہونچا حجاج نے پوچھا کہ اس سال کسی والی ملک کے مرنے کی خبر بھی تیرے زائچہ سے ملتی ہے، نجومی نے کہا ہاں ملتی تو ہے، لیکن میرے حساب سے اس مرنے والے کا نام "کلیب" (کتیا) ہو۔ حجاج چیخ اٹھا۔

"کہ اسی نام (یعنی کلیب یا میری کتیا) کے نام سے میری ماں مجھے پکارتی تھی"۔

(الاغانی جلد ۱۹ ص ۱۴۳)

اب دنیا حجاج پر اندھیر تھی اسی عرصہ میں حضرت سعید بن جبیر رئیس الصالحین کی شہادت کا حادثہ فاجعہ پیش آیا، وہ زمانہ تھا کہ بڑے بڑے لوگ حجاج کے جور و ظلم سے تنگ آ کر روپوش ہو چکے تھے۔ خود خواجہ حسن بصری بھی ان ہی

لوگوں میں تھے، کہتے ہیں کہ سعید بن جبیر کو قتل کرنے کے بعد حجاج پر ایک قسم کے جنون کا دورہ پڑنے لگا۔ نیند میں بھی چیخ اٹھتا۔

"سعید سعید تم میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو"

اور بیداری میں بھی کبھی چلا اٹھتا، دیکھو دیکھو! سعید مجھے قتل کرنے کے لئے میری طرف چلا آرہا ہو۔ سر میں جنون کے ساتھ ساتھ پیٹ میں درد کی سی کیفیت پیدا ہوئی، اور وہی حجاج جس کے متعلق دیکھنے والوں کا بیان ہو کہ کھاتے ہوئے ہم نے دیکھا تھا کہ

"کف دست میں بھر بھر کر روٹی میں مکھن کو لپیٹتا اور ایک لقمہ اس کا بنا لیتا"

راوی کا بیان ہو کہ

عددت .... اربعة وثمانين لقمة (ابن عساکر ص ۴۲/۴) (۸۴) لقمے میں نے گنے۔

الله الله جو مکھن اور روٹی کے لقموں کو بغیر کسی دغدغہ کے یوں ہی ہڑپ کرتا جاتا تھا، اچانک اسی حجاج کو پایا گیا کہ پیٹ کے درد سے تڑپ رہا ہو، حلق کے پار کوئی چیز اتار نہیں سکتا، طبیب نے گوشت کے ایک ٹکڑے میں دھاگا باندھا، اور بولا۔

"اے امیر! اللہ آپ کو شفا بخشے، ذرا اس لقمہ کو کسی طرح فرو کرنے کی کوشش کیجئے"

بمشکل لقمہ فرو ہوا۔ طبیب نے دھاگہ کو پکڑ کر کھینچا، گوشت کا ٹکڑا باہر نکل آیا، مگر کس حال کے ساتھ باہر نکلا کہا ہو

علق به دود كثيرة (اغانی ص ۱۹۵ ج ۱) بہت سے کیڑے گوشت کے اسی ٹکڑے میں لپٹے ہوئے تھے۔

طبیب نے عرض کیا، معدے میں سرطان کا پھوڑا ہو جس میں کیڑے پڑ چکے ہیں، درد اور بے چینی اسی کی وجہ سے ہو۔ علاج ہو رہا تھا، لیکن بجائے فائدہ کے ایک نیا قصہ شروع ہوا، زخم کی وجہ سے یا خدا ہی جانتا ہو کیا اسباب تھے اچانک زمہریرہ (سخت سردی) کا احساس حجاج میں باشدت پذیر ہونے لگا، پہلے تو کمل اڑھا اڑھا کر لوگوں نے اندر سے ابھرنے والی سردی کو دبانا چاہا، لیکن وہ بڑھتی ہی چلی جاتی تھی، آخری حال یہ تھا کہ

كانت الكوانين تجعل حوله مملوة نارا وتدنى منه حتى يحرق جلده وهو لا يحس. (اغانی ص ۱۹۵ ج ۲)

انگیٹھیاں دہکتے ہوئے انگاروں سے بھری ہوئی چاروں طرف سے حجاج کے لگائی جاتیں، مگر کچھ اثر نہ ہوتا، لوگ بدن سے انگیٹھیوں کو اتنا قریب کر دیتے کہ کھال حجاج کی جل اٹھتی، مگر اس کو خبر بھی نہ ہوتی۔

حالانکہ اسی حجاج کو اسی کوفہ میں دیکھا گیا تھا کہ موسم گرما میں تازہ تازہ بید کی سرسبز شاخوں سے قبہ بنواتا تھا اور بید

کی ان شاخوں کے ساتھ کوئی ذہنی تدبیر کی جاتی تھی کہ پھاڑ پھاڑ کر بیچ بیچ میں برف کا چورا ان میں بھرا جاتا تھا حجاج اسی قبہ میں آرام کیا کرتا تھا۔ (ابن عساکر ص۸۰ ج ۴)

اور گرمیوں میں سردیوں کا لطف اٹھایا کرتا تھا، مگر آج اس کے اندر کی سردی کو گرمی سے بدلنے کی ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی۔

کہتے ہیں کہ بری سے بری بات کو اچھی سے اچھی تعبیروں میں پیش کرنے کی مہارت میں حجاج اپنی آپ نظیر تھا، اہم معاملات کو اپنی منہ زوری سے غیر اہم اور غیر اہم کو اہم بنا دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا، موت کی پرچھائیاں شروع شروع میں جب اسے محسوس ہوئیں تو کہتا تھا۔

"اوہ، مرنا اگر کوئی اچھی بات ہوتی، تو شیطان کو خدا کبھی اتنی دراز زندگی عطا نہ کرتا۔" (ابن عساکر ص۸۴)

یعنی ابلیس کی دعا "انظرنی الیٰ یوم یبعثون" (مہلت دیجئے اس دن تک جب لوگ اٹھائے جائیں) اس کی قبول نہ ہوتی مگر جب تکمی سرطان، اور زمہریرہ نے ہوش و حواس اس کے بگاڑ دیئے۔ تو اب نہ اسے حکومت ہی یاد آتی تھی اور نہ حکومت کا وہ حکمراں جس کی اطاعت و فرمانبرداری کو سب کچھ ٹھہرائے ہوئے تھا، عبدالملک جس نے اس کو آگے بڑھایا تھا وہ تو مر چکا تھا، ولید بن عبدالملک کا عہد تھا، بیعت نامہ میں اسی لئے ولید کا نام اس نے درج کیا تھا، لیکن اب ولید اور اس کی حکمرانی سب خواب خیال ہو چکی تھی، صرف ایک آدمی کو ڈھونڈ رہا تھا جو اس کے خوف سے روپوش تھے یعنی خواجہ حسن البصری تلاش کرنے والوں نے آخر حضرت والا کا پتہ چلا لیا، عرض کیا گیا کہ حجاج بڑی بےچینی کے ساتھ آپ کو ڈھونڈ رہا ہے، آپ باہر نکل آئے، جہاں پڑا کراہ رہا تھا، پہونچے، دیکھنے کے ساتھ رونے لگا، اور گڑگڑا کر کہہ رہا تھا حسن! اللہ میری مشکل آسان ہو، اس کی دعا کرو، دیکھ رہے ہو میں کس حال میں مبتلا ہوں۔

خواجہ رحمۃ اللہ نے فرمایا، "دیکھ اللہ کے نیک بندوں کو نہ چھیڑنا، ہمیشہ اس کی تاکید تجھے میں کرتا رہا، لیکن تو نے نہ مانا" پھر فرمایا کہ میں تیرے لئے دعا کروں گا، بلبلا کر حجاج نے کہا

حسن! شفا کی نہیں، اب شفا کی بھلا کیا امید ہے، تم دعا کرو کہ موت میری تکلیف کا جلد خاتمہ کر دے۔

آئینی بنا لینے کے بعد ہر فعل قانوناً جائز ہو جاتا ہے، "ضمیر" کو اسی مغالطہ سے دھوکہ دینے والے پر اب واضح ہوا کہ یہ صرف مغالطہ تھا جب دم نکل رہا تھا، تو لوگوں کا بیان ہے، زبان پر تھا کہ

"اللّٰھم اغفرلی فان الناس یقولون انک لا تفعل"

یعنی اللہ میرے گناہوں کو بخش دے، لوگ کہتے ہیں کہ تو ایسا نہیں کرے گا"

اس کی طرف دو شعر بھی منسوب کئے گئے ہیں، جو لمحات کے وقت اس کی زبان پر جاری تھے، ترجمہ جن کا یہی ہے کہ

"لوگوں کا فیصلہ ہے کہ میں جہنمی ہوں مگر وہ یہ فیصلہ بے دیکھے کر رہے ہیں، ان کو کیا معلوم کہ بہت بڑے درگزر کرنے والے آمرزگار کے دربار میں حاضر ہو رہا ہوں۔"

اس کی سوانح عمریوں میں تو نہیں، لیکن دوسری کتابوں میں نظر سے یہ بھی گزرا ہے کہ حجاج کی ماں اس کے مرنے کے وقت زندہ تھی اور کہتی تھی، ہائے بچے تو نے زندگی بھر یہ کیا کیا، کہتے ہیں کہ حجاج نے آنکھیں کھول دیں اور بولا: ماں میرا فیصلہ قیامت کے دن اگر تیرے ہاتھ میں دے دیا جائے، تو سب کچھ جاننے کے باوجود میرے ساتھ تو کیا سلوک کرے گی۔ ماں نے کہا بیٹا! اگر ایسا ہوا تو جہنم میں بھلا اپنے لخت جگر کو میں جلنے دوں گی، حجاج نے خدا ہی جانتا ہے کہاں تک یہ روایت صحیح ہے، ماں سے یہ سن کر کہا تھا کہ

"تو ماں! تو مطمئن رہ، جس کے ہاتھ میں میرا فیصلہ ہے، وہ تجھ سے کہیں زیادہ اپنے بندوں پر مہربان اور ترس کھانے والا ارحم الراحمین ہے"۔

بیان کیا جاتا ہے کہ سیدنا امام جعفر صادق کے سامنے حجاج کے اس آخری فقرے کو کوئی نقل کر رہا تھا کہ اپنی جگہ سے آپ اچھل پڑے اور فرمایا کہ رجاء (امید) کے اسی حال میں اگر وہ مرا ہے تو کون کہہ سکتا ہے، کہ نامراد مرا۔ (اوکما قال)

ہر حال تنگی سرطان اور زمہریرہ کی اسی بیماری میں حجاج کا کام تمام ہو گیا، اور جس حکومت کی بنیادوں کو استوار کرنے کے لئے لاکھوں لاکھ انسانوں کے خون کو بے دردی کے ساتھ اس نے بہایا تھا اپنی ساری قوتوں اور لامحدود وسائل کے باوجود حجاج کی موت کے بعد سال کا ایک چلہ بھی وہی حکومت پورا نہ کر سکی یعنی، ۴۰ سال کے اندر اندر مروانیوں کا سارا جاہ و جلال خاک و خون میں مل گیا۔ مورخین کا بیان ہے کہ دمشق پایہ تخت میں۔

"مروانی حکومت کے نوے شہزادوں کو ایک ساتھ ساتھ گرز اور لاٹھیوں سے مار مار کر زمین پر لٹا دیا گیا تھا، اور ان ہی کی نیم مردہ لاشوں پر چرمی دسترخوان بچھا کر عباسی خاندان کے لوگ کھانا کھا رہے تھے، دسترخوان کے نیچے سے آہ و نالہ کی آوازیں آ رہی تھیں، کھانا جب ختم ہوا تو ان کی جانیں بھی ختم ہو گئیں"۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ دمشق پایہ تخت ہی تک قصہ محدود نہ تھا، بلکہ ملک کے طول و عرض میں جہاں کہیں بنی امیہ اور بنی مروان کے کسی فرد کا بھی پتہ چلتا تھا حکم تھا کہ ختم کر دیے جائیں، یہی کیا گیا حتیٰ کہ

لم یفلت منھم الا رضیع، ومن ھرب الی الاندلس۔ (کامل ابن اثیر ص ۱۶۱)

بجز شیر خوار بچے کے ان میں کوئی باقی نہ رہا اور یہ کہ اندلس کی طرف جو بھاگ گئے۔

بصرہ میں دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ

"کمخواب کے پائجاموں اور زربفت، زرتار، زردوزی کے لباس میں بنی امیہ کے خاندان کے شہزادے مرے ہوئے گھوڑوں پر پڑے ہوئے ہیں، اور کتے ان کی لاشوں کو چیر پھاڑ کر کھا رہے ہیں"۔

اور غضب تو زندوں سے ہو تو ہو کہ حجاج بے چارا جس حکومت کا دامن قیامت کے دن سے باندھنے کے لئے ہر کردنی اور ناکردنی کا مرتکب ہوا تھا، اسی حکومت کے حکمرانوں کی مردہ لاشیں قبروں سے اکھاڑی گئیں۔ ان میں ہشام بن عبد الملک جس کی

لاش واللہ اعلم سڑنے سے کس وجہ سے محفوظ رہ گئی تھی، باہر نکال کر اس جرم کی سزا میں کہ امام زین العابدین کے صاحبزادے زید بن علی کو بلا وجہ سولی کی سزا دے کر ان کی ننگی لاش سال بھر تک بطور تشہیر کے لٹکا رکھا تھا اور آخر میں جلا کر ہشام نے حکم دیا تھا کہ ان کی خاک ہوا میں اڑا دی جائے۔ بجنسہٖ یہ ساری کارروائیاں ہشام کی اس لاش کے ساتھ بھی کی گئیں ہو شاید اسی لئے محفوظ رہ گئی تھی۔

ابراہیم تیمی

بہر حال یہاں سوچنے کی بات نہ حجاج کی موت ہے اور نہ لرزہ بر اندام کرنے والی اس کی بیماری، بجائے خود ان کی حیثیت بھی کچھ ہو، لیکن بروں کے ساتھ اچھوں کو بھی مرنا ہی پڑتا ہے۔ امراض کے شکار سب ہی ہوتے ہیں، نیک ہوں یا بد، اور کیسے کیسے امراض، کیسی کیسی بیماریاں کتابوں میں پڑھئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جلیل القدر صحابی جن سے بالاتفاق لوگوں نے لکھا ہے ملائکہ مصافحہ کرتے اور سلام کیا کرتے تھے، نام ان کا عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھا، بصرہ کے دینی علوم کے ایک بڑے اہم سرچشموں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہاں کے قاضی بھی تھے لیکن مہینہ دو مہینے نہیں ابن جوزی نے لکھا ہے کہ

سقی بطنہ فبقی ثلاثین سنۃ علی سریر منقوب (ص ۲۸۳)

گمی استسقاء کے مرض میں مبتلا تھے۔ اسی لئے تیس سال تک ایسے کھاٹ پر رہے، جو بیچ سے کاٹ دیا گیا تھا۔

الذہبی نے لکھا ہے کہ ان کو بواسیر کا مرض بھی تھا (تذکرۃ الحفاظ) غالباً خونی بواسیر تھی، خون بہتا رہتا تھا۔ ان کے حال کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ ان کے خاص شاگرد مطرف نے ان سے کہا

"آپ جس حال میں رہتے ہیں۔ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا، اسی لئے عیادت و مزاج پرسی کی ہمت بہت کم ہوتی ہے"۔
مگر باوجود ان تمام باتوں کے ان ہی مطرف (اپنے شاگرد سے) خود حضرت عمران فرماتے تھے۔

"میاں! ایسا نہ کیا کرو، میرا یہ حال خود مجھے بھی محبوب ہے، اور میرے مالک کو بھی پسند ہے" صفوۃ الصفوۃ ص ۲۸۳ ج ۱
صحابہ کے دیکھنے والوں میں ایک بڑے نامی بزرگ ابو قلابہ نامی گزرے ہیں۔ علم حدیث کے اساطین میں شمار ہوتے ہیں حکومت قاضی بننے پر اصرار کرتی رہی، لیکن اس عہدے کے قبول کرنے سے عمر بھر گریز ہی کرتے رہے غیر معمولی فضائل و کمالات سے معمور تھے، آخر عمر میں بیمار پڑے اس کا تو علم نہ ہو سکا کہ مرض کیا تھا، لیکن الذہبی کا بیان ہے،

مات بعرش مصر سنۃ اربع ومائۃ — عرش (علاقہ مصر) میں آپ کی وفات سنہ ۱۰۴ھ

وقد ذهبت یداه ورجلاه وبصره
وهو مع ذالک حامد شاکر
(ص۴۰۳)

میں ہوئی، آپ کے دونوں ہاتھ، دونوں پاؤں غائب ہو چکے تھے، اور بینائی بھی جاتی رہی تھی مگر اس حال میں بھی خدا کے شکر گزار تھے۔

ابن سعد وغیرہ میں لکھا ہو کہ ابو قلابہ کی مزاج پرسی کو عمر بن عبد العزیز خلیفہ اور ابو العالیہ جیسے اکابر آتے، ان کو اس حال میں دیکھتے تو کہتے۔

"ابو قلابہ! جھوٹ اور نامردی سے کام لو، ارباب نفاق کو (اخلاص والوں) پر ہنسنے کا موقع نہ دینا" (ابن سعد ج۷ ص۱۳۵)

اسی کی طرف الذہبی نے اشارہ کیا ہو کہ ہاتھوں، ٹانگوں، آنکھوں سب ہی کو کھو دینے کے بعد بھی وہ اپنے مالک مولیٰ تعالیٰ جل مجدہ کا شکر ہی ادا کرتے رہے اور اس کی حمد کا گیت ہی گاتے رہے۔ رحمہم اللہ

اور سچ تو یہ ہو کہ موت سے چارہ جب کسی کے لئے نہیں ہو، ہر سانس لینے والی زندہ جان موت کا مزہ بہر حال چکھ کر رہتی ہو تو موت کے مقدمات امراض میں نیکوں اور بدوں میں امتیاز کی وجہ ہی کیا ہو سکتی ہو، نتائج کے لحاظ سے اختلافات کے حدود تو مرنے کے بعد شروع ہوتے ہیں۔ اسی لئے حجاج کے حالات میں سب سے زیادہ توجہ کا مستحق یہ پہلو ہو کہ اپنے سیاسی ماحول کی سازگاریوں کو دیکھ کر آئندہ اور مستقبل کے متعلق دھوکہ میں مبتلا ہو گیا۔ ذہن اور زبان کے زور سے ہر غیر آئینی فعل پر آئین کا خول چڑھا دیتا تھا، اور درحقیقت پس پردہ اپنی فوجی قوت پر اس کو بھروسہ تھا جس کی منطق کا جواب غریب نہتے عوام کے پاس نہیں ہوتا۔ تاریخ کا یہ سبق ہو، کہ اس قسم کی بے باکیوں کا انتقام قدرت کی طرف سے عموماً غیر معمولی مہیب شکلوں میں لوگوں کے سامنے آیا ہو، اپنی فوجی قوت کے بل بوتے پر اس وقت تو وہ منہ زوریوں سے کام لیتے ہیں ڈھیٹ بن کر جو جی میں آتا ہو کر گزرتے ہیں، لیکن بہت جلد اس کا خمیازہ بھی ان کو اسی طرح بھگتنا پڑا، جیسے مروانی حکومت کے حکمرانوں اور کارندوں کو بھگتنا پڑا حجاج اس لحاظ سے اس کا مستحق ہو کہ تو میں اس کا مطالعہ کریں اور سیاسی طاقت کے استعمال میں جن غیر معمولی محتاط و نازک ذمہ داریوں کی ضرورت ہو، اس کا سبق سیکھیں۔

کچھ بھی ہو، حجاج اور حجاج کی ظالمانہ چیرہ دستیاں تو اتنی مشہور ہیں کہ تفصیلاً نہیں اجمالاً اس کے طرز عمل کی خصوصیتوں سے مسلمانوں کا پڑھا لکھا طبقہ عموماً واقف ہو، دنیا کی ایک حکومت کے ساتھ اس کی حد سے گزری ہوئی وفاشعاری کے مقابلہ میں اگرچہ ہم حضرت عمران بن حصین صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابو قلابہ تابعی رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگوں کے حالات سے بھی عبرت حاصل کر سکتے ہیں، آدمی چاہے تو خدا کا بھی ایسا وفادار بندہ بن کر رہ سکتا ہو کہ تیس تیس سال کٹے ہوئے کھاٹ پر لگے دونوں ہاتھ دونوں پاؤں، دونوں آنکھیں غائب لیکن ہر حال میں شاکر ہیں، اسی کو اپنا محبوب حال یقین کرتے ہیں، اسی کے مقابلہ میں حجاج تھا کہ خدا کے چند بندوں یعنی مروانی حکومت کے حکمرانوں (عبد الملک اور ولید) کی وفاداری میں اپنا سب کچھ تج دیا۔ اپنی زندگی، اپنی موت سب یہ ہو کہ آخرت تک کو ان ہی کے قدموں پر نچھاور کرتے ہوئے مطمئن تھا کہ یہی کرنے کا کام تھا۔

لیکن درحقیقت جن صاحب کی عجیب و غریب موت کا ذکر اس قسط[عه] میں میرے پیش نظر ہے وہ حجاج ہی کے عہد کے ایک گمنام غیر مشہور آدمی کی موت ہے، ان کا نام ابراہیم تھا، اپنے قبیلہ کی طرف منسوب ہو کر ابراہیم تیمی کے نام سے لوگ ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ان کی موت میں وفاداری ہی کا دوسرا پہلو آپ کے سامنے آئے گا۔ صورت یہ پیش آئی کہ کوفہ جس کے دارالامارہ میں بیٹھ کر حجاج اپنی من مانی کارروائیوں میں مشغول تھا، یہیں ایک اور بزرگ ابراہیم ہی نامی تھے جو ہماری علمی اور فقہی تاریخ میں ابراہیم نخعی کے نام سے مشہور ہیں جاننے والے جانتے ہیں کہ فقہ حنفی کا اساسی نقشہ دراصل ابراہیم نخعی ہی کی اجتہادی کوششوں سے تیار ہوا تھا، امام ابوحنیفہ نے جو بیک واسطہ ان کے شاگرد ہیں چونکہ اپنے زمانہ میں باضابطہ ایک آزاد مجلس وضع قوانین قائم کر کے ابراہیم نخعی کے قائم کئے ہوئے نقشہ کو مکمل کیا اور آب و رنگ اس میں بھرا اس لئے حنفی مسلمانوں کی دینی زندگی جن فقہی مسائل کے زیر اثر گزر رہی ہے ان کو "حنفی فقہ" کے نام سے لوگوں نے موسوم کر رکھا ہے، ورنہ صحیح معنوں میں اس کا نام چاہیے تھا "ابراہیمی حنیفی"[ئه] فقہ رکھا جاتا۔

امام شعبی کے یہ الفاظ جو ابراہیم نخعی کی وفات کے بعد ان کی زبان سے نکلے تھے یعنی

واللہ ماترک بعدہ مثلہ بالکوفہ	خدا کی قسم ابراہیم نے اپنا جیسا آدمی اپنے بعد
ولا بالبصرۃ ولا بالشام ولا بکذا ابکذا	کہیں نہیں چھوڑا، نہ کوفہ میں نہ بصرہ میں نہ شام
ولا بالحجاز ص۱۹۰/۵ (طبقات ابن سعد)	میں، نہ یہاں، نہ وہاں، نہ حجاز میں۔

امام شعبی کی جلالت قدر سے واقفیت کے بغیر ان الفاظ کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا بہر حال ابراہیم نخعی کے تفصیلی حالات کا مطالعہ تو تفصیلی کتابوں میں کرنا چاہیے، اس وقت میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ حجاج کی وجہ سے رست و خیز کا جو عالم کوفہ میں برپا تھا، حالانکہ حضرت ابراہیم سیاسی معاملات سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے تعلیم و تدریس کے ساتھ زہد و ریاضت کی زندگی گزارتے تھے۔ اب واللہ اعلم کیا صورت پیش آئی کہ حجاج کی نگاہوں پر وہ بے چارے بھی چڑھ گئے شاید اس قسم کے فقرے جو کتابوں میں ابراہیم نخعی کی طرف منسوب کئے گئے ہیں، مثلاً جبابرہ (ڈکٹیٹر بن کر حکومت کرنے والوں پر) کبھی کبھی لعنت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ یہ فقرہ بھی ان کی زبان پر جاری ہو گیا کہ

"اندھے ہونے کے لئے یہی کافی ہو کہ حجاج کے معاملہ میں کوئی اندھا پن سے کام لے"

(طبقات ص۱۹۵/۵)

عه یہ مضمون دو قسطوں میں شائع ہوا تھا، اشارہ دوسری قسط کی طرف ہے۔ مرتب

ئه فقہ حنفی کی یہ تعبیر واقعہ کے مطابق بھی ہوتی، اور بطور تفاؤل کے واتبع ملۃ ابراہیم حنیفا کی قرآنی آیت کی طرف ذہنی انتقال کا ذریعہ بھی بن سکتی تھی، مگر لوگوں نے ابراہیم کی نسبت کو تو خیر حذف ہی کر دیا۔ ابوحنیفہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے بجائے حنیفی کے سہولت پسندوں نے حنفی کہنا شروع کر دیا۔ "حنیفہ" کے لفظ کی "یا" بھی مکمول ساقط ہو گئی بظاہر اس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ ۱۲

حجاج کے جاسوسوں نے شاید ان ہی باتوں کو حجاج تک پہونچا دیا۔ بھلا ان باتوں کو کہاں برداشت کر سکتا تھا' ابراہیم نخعی کے نام سے وارنٹ جاری ہو گیا کسی طرح وارنٹ کی تعمیل ہونے سے پہلے ان کو خبر ہو گئی۔ بے چارے اپنے بعض مخلصوں کے مکان میں روپوش ہو گئے۔ طبقات میں ہو کر

جمعہ اور عیدین کی نمازوں سے بھی روپوشی کے اس زمانہ میں ابراہیم کو محروم ہونا پڑا۔

ج ۵ ص ۱۵۳

حکومت کے نمایندے ان کے سراغ میں لگے ہوئے تھے' اب یہیں سے سننے کی بات ہو۔ جس زمانہ میں یہ واقعہ میری نظر سے کتابوں میں گزرا حیران ہو کر رہ گیا' سوچتا تھا کہ دین اور دینی علوم کی وفاداریوں میں لوگ کیا اس حد تک بھی جا سکتے ہیں؟ عرض کر چکا ہوں کہ اسی کوفہ میں ابراہیم نخعی کے ایک ہم نام بزرگ ابراہیم تیمی بھی رہتے تھے۔ غریب آدمی تھے بسا اوقات گزر جاتے اور باقاعدہ کھانا کھانے کا موقع نہ ملتا جو کچھ بھی مل جاتا' اسی سے سد رمق کا کام لیتے' آخر میں کوفہ کی مسجدوں میں گھوم گھوم کر وعظ کہا کرتے تھے' ان کی عبادت زہد و ریاضت کے قصے کتابوں میں نقل کئے گئے ہیں۔ یہاں جس چیز کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہو کہ حجاج کے کارندے جو ابراہیم نخعی کی تلاش میں تھے ایک دفعہ ابراہیم تیمی کے پاس پہونچے اور بولے کہ ابراہیم کو تم جانتے ہو۔ امیر یعنی حجاج کا حکم ہو کہ ان کو گرفتار کر کے حاضر کیا جائے' ابراہیم تیمی کا بیان ہو کہ میں یہ جانتا تھا کہ ابراہیم نخعی کے متعلق مجھ سے یہ پوچھ رہے ہیں بلکن نخعی کے لفظ کا اضافہ انہوں نے نہیں کیا تھا اس لئے جواب میں میں نے کہا کہ۔

انا ابراھیم۔ ابراہیم کو پوچھتے ہو' تو وہ میں ہوں' یعنی میرا نام ابراہیم ہو۔

پکڑنے والوں نے آپ کو پکڑ لیا' اور گرفتار کر کے خونی حجاج کے دربار کی طرف لے چلے۔ حجاج کے سامنے پیش کر دیئے گئے جانتے ہیں کہ صرف اتنی بات کہ میں "نخعی ابراہیم نہیں ہوں" ان کی برأت کے لئے کافی ہو سکتی ہو' لیکن خاموش حجاج کے سامنے کھڑے رہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ واسط کے جیل خانہ دیماس نامی میں ان کو قید کر دیا جائے۔ واسط روانہ کر دیئے گئے بیان کیا گیا ہو طبقات میں بھی ہو کہ واسط کا یہ جیل خانہ اس طریقہ سے بنایا گیا تھا کہ نہ اس پر چھت ڈالی گئی تھی اور نہ ایسے حجرے اور مکانات بنائے گئے تھے جن میں قیدیوں کو کم از کم دھوپ' بارش' سردی سے پناہ ملتی۔ بلکہ صرف چار دیواری تھی' اسی کے میدان میں لوگوں کو ڈال دیا جاتا تھا' خصوصیت اس قید خانے کی یہ بھی تھی کہ ایک قیدی کے ساتھ دوسرے قیدی کو زنجیروں سے جکڑ دیا جاتا تھا بے چارے ابراہیم تیمی کے ساتھ یہ سب کچھ کیا گیا کسی اجنبی قیدی کے ساتھ ان کو بھی باندھ دیا گیا اور اسی حال میں وہ جیل کے اندر ڈال دیئے گئے۔ ماں کو ان کی خبر ہوئی' بچے کی محبت میں بیچاری کوفہ سے کسی نہ کسی طرح جیل تک پہونچیں' جیل والوں کی اجازت سے بیٹے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کی اجازت مل گئی لیکن اسی عرصہ میں ابراہیم تیمی کی شکل و صورت اتنی بدل چکی تھی کہ ماں بھی اپنے بیٹے کو پہچان نہ سکی ماں کو دیکھ کر خود ہی ابراہیم نے ان کو مخاطب

گیا" تب آواز سے انہوں نے اپنے بچے کو پہچانا، ناقابل برداشت حد سے گزری ہوئی ان تکلیفوں کے بعد بھی ماں کے کہنے پر
راز انہوں نے ظاہر نہیں کیا کہ نام سے دھوکا کھا کر ابراہیم نخعی کی جگہ اس جیل میں مجھے لوگوں نے ٹھونس دیا ہے۔ بس ماں
اپنے بچے کو دیکھ رہی تھی اور بچہ اپنی ماں کو، ابراہیم تیمی کو چھوڑ کر ان کی والدہ مایوس و روتی ہوئی واپس ہو گئیں۔ ان کی اس
کے بعد کہتے ہیں کہ اپنے سینے میں اسی راز کو دبائے ہوئے ابراہیم تیمی کا جیل خانے ہی میں انتقال ہو گیا۔ حجاج واسط
ہی میں تھا، خواب میں دیکھا کہنے والا کہہ رہا ہے۔

"آج واسط میں ایک جنتی آدمی مر گیا"

صبح کو معلوم ہوا کہ جیل میں ابراہیم نامی قیدی کا انتقال ہو گیا۔ ہٹ دھرم حجاج جھنجھلا کر بولا۔

"شیطانی خواب تھا جو رات میں نے دیکھا"

لکھا ہے کہ ابراہیم تیمی بے چارے کو ابراہیم نخعی باور کرتے ہوئے شتر کینہ حجاج نے حکم دیا کہ واسط کے گھورے
پر ابراہیم کی لاش پھینک دی جائے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ حجاج کی اس مذبوحی حرکت پر ابراہیم کی بہشتی روح جنتی ہو گی۔
جو ابراہیم نہیں تھا ابراہیم کا خاکی لباس تھا۔ حجاج اسی کو گھورے پر ڈال کر خوش ہو رہا تھا۔ المسعودی نے مروج
میں نقل کیا ہے کہ جس وقت ابراہیم تیمی واسط کے جیل خانے میں داخل ہوئے تو سامنے ایک ٹیلہ تھا جس پر چڑھ گئے اور
بلند آواز سے پکار رہے تھے۔

جو آج اللہ کی آزمائش میں ہیں ان لوگوں کو خدا ہی کی طرف سے عاقبت و راحت کی خوش خبری ہو اور آج
اپنے آپ کو جو عافیت میں پا رہے ہیں خدا کی آزمائش کا ان کو انتظار کرنا چاہئے۔ لوگو! ذرا صبر سے کام لو، ذرا
ٹھہر جاؤ۔"

(ابن کامل ۶ ص ۱۰۵)

حجاج بھی چلا گیا اور ابراہیم بھی چلے گئے۔ حجاج نے دنیا کی حکومت کے حکمرانوں کے ساتھ وفاداری کا ایک ریکارڈ
قائم کیا، لیکن دیکھا گیا کہ حجاج اور جس حکومت کے لئے اس نے یہ سب کچھ کیا تھا، ایک چلہ بھی سالوں کے حساب سے پورا نہ
کر سکی اور جو کچھ انجام اس کا ہوا اسے بھی دنیا دیکھ چکی، اجمالی الفاظ میں اس کا ذکر گزر چکا اور ابراہیم تیمی نے اپنے آپ کو
ختم کر کے ابراہیم نخعی کو اور ان کے فقہی کارنامہ کو بچا لیا۔ شاید کہا جا سکتا ہے کہ کرۂ زمین کے کروڑہا کروڑ حنفی مسلمانوں کی دینی زندگی
کے نظام کی بقا میں دوسرے اسباب کے ساتھ ابراہیم تیمی کی یہ حیرت انگیز تاریخی وفاداری بھی شریک ہے۔ لمثل
ھذا فلیعمل العاملون۔

شاید دنیا کی قوموں میں ابراہیم تیمی کی استقامت و تحمل و رازداری کی مثال مشکل ہی سے مل سکتی ہو ـــــ و فی
ذالک فلیتنافس المتنافسون۔

شائقین الفرقان کے لیے

مژدہ

جنوبی افریقہ کے ایک صاحب خیر نے یکصد روپیہ بد زکوٰۃ دفتر کو ارسال فرمایا ہے، الفرقان کے جو شائقین پورا چندہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے وہ اگر صرف تین روپے ارسال کریں گے تو ان کے حساب میں ما،ا اس رقم سے شامل کر کے انکے نام الفرقان سال بھر کے لیے جاری کر دیا جائے گا۔ اس طور پر پچاس اشخاص اس رقم سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

تین روپے منی آرڈر سے پیشگی آنے چاہئیں اور کوپن پر اس اعلان کا حوالہ ہونا چاہیے۔

منیجر الفرقان لکھنؤ

مختصر فہرست کُتب خانۂ الفرقان۔ لکھنؤ

پہلے یہ چند باتیں ضرور مُلاحظہ فرمالیجئے!

(۱) اپنا پتہ ہمیشہ صاف اُردو میں ضرور لکھئے، اور اگر ہو سکے تو انگریزی میں بھی لکھ دیجئے!۔
(۲) اگر آپ صرف ایک دو روپئے کی کتابیں منگوائیں گے تو محصولڈاک کا بار بہت زیادہ پڑ جائے گا اور اگر زیادہ منگوائیں گے یا اگر چند ساتھی مل کر اور زیادہ منگوائیں گے تو محصول کا بوجھ اسی حساب سے بہت کم ہو جائے گا اور آپ نفع میں رہیں گے۔

پاکستانی احباب کی خدمت میں!

(۳) آپ حضرات کو جو کتابیں منگوانی ہوں اُن کی قیمت اس فہرست میں دیکھ لیجئے، پھر اس قیمت پر فی روپیہ دو آنے کے حساب سے محصول بک پوسٹ اور دس آنے رجسٹری فیس و صرفہ پیکنگ کا اضافہ کر کے کل رقم ذریعۂ منی آرڈر" ناظم ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگس لاہور" کے نام روانہ کر دیجئے اور ڈاک خانہ کی ابتدائی رسید تفصیلی فرمائش کے ساتھ ہم کو بھیجدیجئے یہاں سے کتابیں رجسٹرڈ آپ کو روانہ کر دی جائیں گی۔
(۴) یاد رکھئے کہ ایک بنڈل میں مختلف کتابوں کے چند نسخے ہندوستان سے پاکستان جاسکتے ہیں، لیکن ایک کتاب کے دو نسخے بھی نہیں جاسکتے۔

ہماری مطبوعات ایک نظر میں

جلد اوّل معارف الحدیث مجلد للعہ غیر مجلد ۱۲ ے	اسلام کیا ہے؟ نیا اڈیشن قسم اعلیٰ مجلد ۱۲ر قسم دوم غیر مجلد ۴ر	کلمۂ طیبہ کی حقیقت قیمت :- ۶ر آنے	نماز کی حقیقت قیمت :- ۱۲ر آنے	آپ حج کیسے کریں قسم اول مجلد ۱۲ر دوم غیر مجلد ۱۰ر	آسان حج حج کیسے کریں کا خلاصہ جیبی سائز قیمت :- ۱ر آنے

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور اُن کی دینی دعوت قیمت :- ۳ر	ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ قیمت :- ۸ر	امام ولی اللہ دہلویؒ از مولانا سندھی مرحوم قیمت :- عمر	اسلام اور نظام سرمایہ داری قیمت :- ۸ر	بوارق الغیب حصۂ دوم قیمت :- عہر

دیوبند اور بریلی کے اختلافی ہر فیصلہ کن مناظرہ اکابر جماعت دیوبند پر سنگین الزامات مولانا احمد رضا خان صاحب کے قلم سے اور تشفی بخش جوابات مولانا نعمانی کے قلم سے قیمت ۱ر	قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ قادیانی مذہب اور اسکے بانی کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے مولانا نعمانی کا یہ مختصر رسالہ کافی ہے قیمت صرف :- ۶ر

کلمۂ طیبہ کی حقیقت

از افادات مولانا محمد منظور نعمانی

اس رسالہ میں اسلام کے کلمۂ دعوت کلمۂ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ ایسے دلنشین اور مؤثر انداز میں کی گئی ہے کہ سطر سطر کے مطالعہ سے نورِ یقین میں اضافہ ہوتا ہے اور ایمان تازہ ہوتا ہے۔ اُردو زبان میں کم از کم ہمارے علم میں تو کلمۂ رسالت کے متعلق کوئی اور ایسا محققانہ اور عارفانہ رسالہ موجود نہیں ہے جس سے عقل اور جذبات اور دل و دماغ یکساں طور پر متاثر ہوں۔

تازہ اڈیشن ——— قیمت: ۶/

نماز کی حقیقت

از افادات مولانا محمد منظور نعمانی

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے مقام اور اس کی رُوح و حقیقت سے واقف ہونے کے لئے اور اپنی نمازیں روحانیت اور نورانیت پیدا کرنے کیلئے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔ نماز کے متعلق کتاب و سنت کے لطیف اشارات، اور ائمہ دین و معرفت خصوصاً امام غزالیؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے عارفانہ افادات کا عطر کھینچ کر اس رسالہ کی صورت میں پیش کر دیا گیا ہے۔ کاغذ و طباعت اعلیٰ قیمت ۱۲/

آپ حج کیسے کریں؟

مرتبہ
مولانا محمد منظور نعمانی و مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

حج و زیارت کے موضوع پر اب اُردو میں بیشمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن یہ کتاب اپنی اس خصوصیت میں اب بھی ممتاز اور منفرد ہے کہ حج کے احکام اور اس کا پورا طریقہ بھی یہ بہت آسان اور دلنشین طریقے پر بتاتی ہے۔ اور ذوق و شوق اور عشق کا وہ جذبہ بھی پیدا کرتی ہے جو حج کی رُوح اور جان ہے۔ قیمت: مجلد قسم اول (۱۲/۴) غیر مجلد قسم دوم (۲/)

آسان حج

یہ آسان زبان میں "آپ حج کیسے کریں" کا مکمل خلاصہ ہے، کم تعلیم یافتہ حضرات کیلئے اپنے موضوع پر یہ بہترین کتاب ہے۔ قیمت: ۶/

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کی دینی دعوت

"تالیف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی"

اس کتاب میں مولانا مرحوم کے ذاتی حالات اور سوانح کے علاوہ ان کی مشہور دینی و اصلاحی دعوت کو بھی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے، جو بلاشبہ اس دور کی نہایت وسیع اور گہری دینی و اصلاحی تحریک ہے۔

شروع میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا مبسوط مقدمہ ہے جس میں کتاب و سنت کی روشنی میں انبیاء علیہم السلام کے اصول دعوت کی تشریح کر کے دکھلایا ہے کہ اس دینی تحریک کو اسوۂ انبیاء سے کس درجہ مطابقت ہے۔ کتابت و طباعت اعلیٰ، کاغذ نفیس۔

قیمت: [illegible]

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ

مرتبہ
"مولانا محمد منظور نعمانی"

آج مولانا مرحوم اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن اگر کوئی انھیں جاننا اور ان کی باتیں اور ہدایتیں سننا چاہے تو حضرت مرحوم کے اس مجموعۂ ملفوظات کا مطالعہ کرلے جو دین کے حقائق اور معارف کا عجیب و غریب گنجینہ ہے ——— اس سے مولانا مرحوم کی دینی دعوت کی روح و حقیقت اور اس کے اصول و مقاصد اس کی گہرائیاں بھی معلوم ہوں گی اور یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ تفقہ فی الدین اور معرفت و بصیرت میں مولانا کا مقام کتنا بلند تھا، اور امت مسلمہ کے امراض کی مولانا نے کیسی صحیح تشخیص کی تھی۔ کاغذ، کتابت، طباعت اعلیٰ۔

قیمت: [illegible]

قرآن مجید سے متعلق کتابیں

تفسیر ابن کثیر (اردو)

حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ کی تفسیر جو عربی تفسیروں میں بھی بے نظیر اور مستند ترین تفسیر سمجھی جاتی ہے، اور جو سلف صالحین کی تفسیری محنتوں کا قابلِ اعتماد ذخیرہ ہے، اور جس میں یہ التزام ہے کہ آیات کی تفسیر پہلے دوسری آیتوں سے کرتے ہیں، اسکے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے، پھر صحابۂ کرام اور تابعین اور بعد کے ائمہ تفسیر کے ارشادات سے، یہ اس کا مکمل اردو ترجمہ ہے، پانچ ضخیم جلدیں ہیں۔ قیمت مجلد مکمل سیٹ (۔۔۔ روپے)

تفسیر بیان القرآن

(از حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ)

مکمل بارہ جلد۔ طبع ہندوستان ۔/۶۰ روپیہ

بیان القرآن مطبوعہ تاج کمپنی پاکستان

لاہور کی تاج کمپنی اپنے خاص طرز پر نہایت اہتمام کے ساتھ بیان القرآن کو چھاپ رہی ہے اب تک چھ جلدیں شائع ہوئی ہیں، ہر جلد میں ڈھائی پارہ کی تفسیر ہے۔ قیمت فی جلد ۔۔۔ (واضح رہے کہ اس میں بیان القرآن کا عربی حصہ نہیں لیا گیا ہے)۔

تفسیر ماجدی

مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کی اردو تفسیر قرآن کی دو جلدیں تاج کمپنی لاہور کی طرف سے چھپ گئی ہیں جن کی طباعت کیلئے تاج کمپنی کا نام ہی کافی ہے۔ قیمت جلد اول مجلد ۔۔۔ جلد دوم مجلد ۔۔۔ جلد سوم ۔۔۔

قصص القرآن

(از مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی)

قرآن پاک میں انبیاء علیہم السلام کے سوانح حیات، ان کی امتوں اور مختلف قوموں اور شخصیتوں کے جو قصص و واقعات مذکور ہیں اس کتاب میں انھیں پوری تفصیل اور تحقیق کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، بلاشبہ یہ کتاب ایک مذہبی و تاریخی شاہکار ہے ———

جلد اول:۔ حضرت آدمؑ سے حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کے حالات تک۔ قیمت:۔ ۔۔۔

جلد دوم:۔ حضرت یوشعؑ سے حضرت یحییٰؑ تک کے واقعات۔ قیمت:۔ ۔۔۔

جلد سوم:۔ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ باقی تمام قصص قرآن کا بیان۔ ۔۔۔

جلد چہارم:۔ حضرت عیسیٰؑ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور متعلقہ واقعات۔ قیمت:۔ ۔۔۔

الحیوانات فی القرآن

(از مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی)

قرآن مجید میں جتنے حیوانات کا کہیں ذکر آیا ہے، ان کے متعلق لغوی تحقیقات اور تاریخی و تفسیری مباحث کا ایک علمی مرقع۔

قیمت:۔ ۔۔۔

قرآنی جغرافیہ:۔ از مولانا موصوف قیمت ۔۔۔

رہنمائے قرآن

اسلام اور پیغمبر اسلام کی صداقت کو سمجھنے کیلئے اپنے انداز کی بالکل ہی نئی کتاب۔ اصل کتاب انگریزی میں تھی۔ اردو ۔۔۔ اکرم ۔۔۔

لغات القرآن

(تالیف مولانا عبد الرشید صاحب نعمانی)

اردو زبان میں قرآن شریف کے تمام الفاظ و لغات کی نہایت مفصل اور مبسوط تشریح کی گئی ہے، اپنے موضوع میں بے نظیر اور محققانہ کتاب ہے ——— چار جلدیں تیار ہیں آخری پانچویں جلد عنقریب تیار ہونے والی ہے۔ قیمت جلد اول (۔۔۔) جلد دوم (۔۔۔) جلد سوم (۔۔۔) جلد چہارم (۔۔۔)۔

قاموس القرآن

(از مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی)

اس میں تمام الفاظِ قرآنی کا صحیح اردو ترجمہ اور ان کی مکمل صرفی و نحوی تشریح درج کی گئی ہے، نیز قرآن کریم کے تمام وضاحت طلب الفاظ پر سلیس و شیریں زبان میں مختصر مگر جامع اور مستند نوٹ لکھے گئے ہیں۔ قیمت ۔۔۔

ترجمۂ قرآن کا مکمل نصاب

(از جناب مولانا محفوظ الرحمٰن نامی)

مفتاح القرآن حصہ اول ۔۔۔ دوم ۔۔۔ سوم ۔۔۔ چہارم ۔۔۔ پنجم ۔۔۔

معلم القرآن ۔۔۔ ۔۔۔

مصباح اللغات اردو میں عربی زبان کا سب سے زیادہ جامع اور مبسوط لغت۔ مجلد ۔۔۔

اردو عربی ڈکشنری ۔۔۔ ۔۔۔

قرآن اور تعمیر سیرت از ڈاکٹر میر ولی الدین قیمت ۔۔۔ مجلد ۔۔۔

قرآن اور تصوف از ڈاکٹر ۔۔۔

حدیث شریف سے متعلق کتابیں

صحیح بخاری شریف (مکمل اُردو)

سات ہزار سے زائد صحیح حدیثوں کا مجموعہ یہ بخاری شریف کا مکمل اُردو ترجمہ ہے جو بہت اہتمام سے چھاپا گیا ہے۔ تین ضخیم جلدیں ہیں۔ قیمت کامل مجلد / ۲۷ روپیہ

جامع ترمذی شریف (اُردو)

ترمذی شریف کو صحاح ستہ میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ امام ترمذی نے اس کا التزام کیا ہے کہ ہر باب میں حدیثیں درج کرنے کے ساتھ وہ ائمۂ امت کا مذہب بھی لکھتے ہیں ——— یہ اس کا مکمل اُردو ترجمہ ہے۔ دو ضخیم جلدیں۔
قیمت مجلد / ۱۸ روپیہ

مشکوٰۃ شریف (اُردو)

چھ ہزار سے زائد حدیثوں کا مجموعہ
مشکوٰۃ شریف کو بجا طور پر حدیث کے کتبخانہ کا جامع انتخاب کہا جاسکتا ہے۔ اس میں حدیث کی گیارہ کتابوں، بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی، موطا، امام مالک، مسند شافعی، مسند احمد، بیہقی و دارمی کی چیدہ چیدہ حدیثیں آگئی ہیں۔ یہ اس کا مکمل ترجمہ ہے جو پورے اہتمام سے چھاپا گیا ہے۔ دو ضخیم جلدیں۔ قیمت مجلد: [illegible] روپیہ۔

الابواب والتراجم

صحیح بخاری شریف کے تراجم ابواب پر حضرت شیخ الہند کا قابل قدر رسالہ۔ اُردو زبان میں۔
قیمت: عـــہ
افادات محمود از شیخ الہند قیمت ۸

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ کی

حُجّۃ اللّٰہ البالِغہ

مع ترجمہ اُردو

اسلامی اسرار و حقائق کے بیان اور احادیث نبویہ کی عارفانہ اور حکیمانہ تشریح میں یہ کتاب بلاشبہ پورے اسلامی کتبخانہ میں بے نظیر ہے۔ علامہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اسکے بارہ میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ

"ایں کتاب اگرچہ در علم حدیث نیست اما شرح احادیث بسیار کردہ و حکم و اسرار آں بیان نمودہ تا آنکہ در فن خود غیر مسبوق واقع شدہ"

اس کتاب کے دو اُردو ترجمے پہلے بھی شائع ہوئے تھے، لیکن اب اصح المطابع کراچی نے اس کو تفسیر حقانی کے مصنف مولانا عبدالحق حقانی مرحوم کے بہترین ترجمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اصل عربی متن بھی ساتھ چھاپا گیا ہے۔ علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے بہترین علمی تحفہ ہے۔ اعلیٰ کاغذ اعلیٰ کتابت و طباعت۔ دو ضخیم جلدیں
قیمت مجلد: ۲۰ عـــہ

نصرۃ الحدیث

از حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی

حدیث پر منکرین حدیث کے حملوں کے جواب میں اب بہت سی کتابیں لکھی جاچکی ہیں، لیکن اپنی علمی اور تحقیقی خصوصیات کے لحاظ سے یہ کتاب اس موضوع پر اب بھی ممتاز ہے۔ بہترین کتابت و طباعت۔
قیمت: عـــہ

ترجمان السنّۃ

از حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مقیم مکۂ مکرمہ

حدیث کی ایک نہایت مبسوط اور جامع کتاب اردو ترجمہ اور تشریح کیساتھ ہر جلد بجائے خود بھی علوم و معارف کا ایک مستقل خزانہ ہے۔ قیمت جلد اوّل عـــہ جلد دوم عـــہ جلد سوم بھی تیار ہو کر آگئی ہے۔ قیمت:- عـــہ
حدیث کا ایک اہم تاریخی مجموعہ

صحیفۂ ہمّام بن مُنبّہ

ہمام بن منبہ، مشہور صحابی حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد ہیں، انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے سنی ہوئی حدیثوں کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کرلیا تھا، اور یہ اسی سے روایت کیا کرتے تھے، حدیث کی کتابوں میں اس کا صرف تذکرہ ملتا تھا، ہمارے زمانہ کے مشہور محقق ڈاکٹر حمیداللہ صاحب نے بڑی تلاش اور جستجو سے اس کا نسخہ کسی طرح حاصل کیا اور اپنے فاضلانہ مقدمہ اور ترجمہ اور تشریحی نوٹوں کے ساتھ شائع کیا ہے۔ قدر دانوں کیلئے بڑا قابل قدر تحفہ ہے۔ قیمت: عـــہ

زادِ سفر

امام نوویؒ کی بہترین کتاب ریاض الصالحین کا ترجمہ محترمہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کے قلم سے (دو جلدوں میں)۔ شروع میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ قیمت جلد اول مجلد کاغذ بہتر عـــہ۔ غیر مجلد کاغذ معمولی (عـــہ) جلد دوم مجلد کاغذ بہتر عـــہ

غیر مجلد کاغذ معمولی عـــہ

ALFURQAN (Regd. No. A-353) LUCKNOW.